1707 — 1857
تاریخ پاک و ہند
مغل سلطنت کا زوال
قدر آفاقی
نیو بک پیلس
اردو بازار لاہور

(1707ء تا 1857ء)

تاریخ پاک و ہند

(مغل سلطنت کا زوال)

قدر آفاقی

نیو بک پیلس اردو بازار لاہور

(042 - 7224925)

تالیف ــــــــ تاریخ پاک و ہند

مولف ــــــــ قدر آفاقی

ناشر ــــــــ نیو بک پیلس اردو بازار لاہور

پرنٹرز ــــــــ ندیم یونس پرنٹرز لاہور

قیمت ــــــــ =/90 روپے

فہرست

1707ء تک برصغیر کی سیاسی صورتحال

سیاسی دھڑے بندیاں مختلف امرائے
سلطنت کا ذکر 'اور دیگر موضوعات پر سیر حاصل بحث اور تبصرہ جات
1707ء تا 1757ء تک کا تفصیلی جائزہ
مغل امراء کی تنظیم
قرون وسطیٰ میں ہندوستانی سماج کے دو بااثر طبقات
(1) زمیندار (2) جاگیردار
جاٹ اور مغل
مغل اور سکھ
مغل اور پٹھان
راجپوت اور مراٹھے (مرہٹے)
اٹھارہویں صدی میں مغل دربار میں سیاسی دھڑے بندیاں
پہلا گروہ (اسد خاں اور ذوالفقار خاں)
دوسرا گروہ (نظام الملک وغیرہ)
نظام الملک
خانہ جنگی بسلسلہ تخت نشینی اور امراء کا کردار
شاہ عالم اور دکن کا مسئلہ
سکھوں کی بغاوت اور بہادر شاہ کا زمانہ
منعم خاں کی وفات اور وزارت کیلئے کشمکش کا آغاز
بعہد بہادر شاہ طرز حکومت اور انتظام سلطنت
بے ضابطگیوں کا چلن
مالی بحران اور بہادر شاہ کا دور
عہد وزارت کیلئے ذوالفقار خاں کی جدوجہد
ذوالفقار خاں اور تینوں شہزادوں کا وفاق
بعہد جہاندار شاہ ــــ ذوالفقار خاں بطور وزیر اعظم
ذوالفقار خاں کا طرز سیاست اور انتظام
جہاندار شاہ اور ذوالفقار کی شکست اور ان کا زوال
ذوالفقار خاں کے نظریہ حکومت پر ایک

باب 12

سکھوں کی بارہ مثلیں (مسلیں)

برصغیر پاک و ہند کا مختصر جغرافیہ

(برصغیر پر مسلمانوں نے صدیوں تک حکومت کی۔ مسلمانوں کو اپنے بزرگوں کی راجدھانی کی وسعت کا علم ہونا چاہئے اس لئے برصغیر کا جغرافیہ بھی دیا جا رہا ہے جو انشاء اللہ معلومات افزاء ثابت ہوگا۔)

قدیم مصر کے مسلم جغرافیہ دانوں نے لفظ ہند اور سندھ کو الگ الگ استعمال کیا ہے۔ ہند سے مراد سندھ کے مشرقی علاقے لئے ہیں جن میں ہندوستان کے علاوہ انڈونیشیا اور ملایا وغیرہ بھی شامل سمجھے جاتے تھے اور جب سندھ کہا جاتا تھا تو اس میں سندھ' مکران' بلوچستان' پنجاب کا کچھ حصہ اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کے علاقے شامل سمجھے جاتے تھے چنانچہ ان کے ہاں ایسا کوئی ایک نام نہ تھا جس کا اطلاق پورے ہندوستان پر ہو سکے۔ پس ہند اور سندھ مل کر ہی برصغیر پاک و ہند (سابقہ مشترکہ ہندوستان) کو ظاہر کرتے تھے۔ عربی اور فارسی میں ہندوستان کے جغرافیائی حالات بیان کرتے وقت ہند اور سندھ کو شامل کیا جاتا تھا۔ عربوں نے سندھ کو سند ہی کہا اور اس کے علاوہ والے ہندوستان کے علاقے کو ہند کا نام دیا۔ دنیا میں ہند کا "ہ" الف میں بدل کر فرنچ میں "Ind" اور انگریزی مین "INdia" کی صورت میں مشہور ہے۔

درہ خیبر کے راستے جو لوگ اس علاقے میں داخل ہوئے انہوں نے اس کا نام "ہندو استھان" رکھا اور فارسی تلفظ میں یہی لفظ ہندوستان بن گیا۔ (عرب و ہند کے تعلقات ص 12، 13)

ہندوستان کی حدود : برصغیر کے شمال میں کوہ ہمالیہ' کوہ قراقرم' کوہ ہندو کش کے ناموں سے طویل سلسلہ کوہ ہے جس کی لمبائی 1655 میل ہے اور چوڑائی تقریباً 250 میل ہے۔ یہ پہاڑ برف پوش بھی ہیں اور بلند و بالا بھی۔ ان کے پار چین' سطح مرتفع تبت' افغانستان اور مغرب میں ایران کے ممالک ہیں۔ ہمالیہ کا مشرقی حصہ کھاسی' گارو اور لوشائی وغیرہ پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ شمال مغرب میں کوہ قراقرم' کوہ ہندوکش' کوہ سفید اور کوہ سلیمان واقع ہیں۔ ہمالیہ کی سب

سے اونچی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ نیپال میں واقع ہے جو دنیا کی بلند ترین چوٹی ہے۔
پاکستان میں کوہ قراقرم واقع ہے جہاں دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو (K-2) واقع ہے۔ شمالی پہاڑ ہندوستان کی قدرتی سرحد ہیں اور فصیل کا کام دیتے ہیں جو ہندوستان کو چین اور تبت سے جدا کرتے ہیں۔ چنانچہ اس طرف سے کبھی ہندوستان پر کسی قوم نے حملہ نہیں کیا۔ پاکستان کے علاقے میں کوہ قراقرم میں سے چین تک شاہراہ ریشم کا سلسلہ گزرتا ہے جسے اب جدید خطوط پر تعمیر کیا گیا ہے پہلے بھی یہی راستہ چین کے ساتھ تجارت کیلئے استعمال ہوتا تھا۔
شمالی مغربی پہاڑوں میں کوہ سلیمان کا سلسلہ ایسا ہے جس میں چند درے واقع ہیں۔ یہ درے خیبر، ٹوچی، گومل، بولان اور کرم کہلاتے ہیں۔ ان دروں کی راہ سے آرین، ایرانی، یونانی، یوچی، سیتھین، ہن، منگول، ترک اور چغتائی وغیرہ مختلف اقوام نے مختلف وقتوں میں ہندوستان میں داخل ہو کر اس کے باشندوں کو زیر کیا اور اپنی حکومتیں قائم کیں۔ پشاور کے قریب درہ خیبر اور کوئٹہ کا درہ بولان اس سلسلے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ پہاڑوں پر برف باری کی وجہ سے یہ پہاڑی سلسلے مختلف دریاؤں کے قدرتی منابع ہیں جو میدانی علاقوں کو سیراب کرتے ہیں نیز مون سون ہواؤں کو روک کر بارش برسانے کا ذریعہ بھی یہی پہاڑی سلسلہ ہے۔
برصغیر کے جنوب میں بحر ہند، جزائر مالدیپ اور سری لنکا واقع ہیں۔ مشرق میں خلیج بنگال، تھائی لینڈ، ویت نام، کمبوچیا اور چین ایسے ممالک ہیں۔ مغرب میں بحیرہ عرب، مسلم ممالک ایران اور افغانستان واقع ہیں۔ برصغیر کے اندر ہی پاکستان واقع ہے اور دوسری طرف بنگلہ دیش ہے۔ یہ دونوں ملک پاکستان کی صورت میں 1947ء میں منصہ شہود پر آئے لیکن 1971ء میں گہری سازش کے تحت پاکستان کو دولخت کر دیا گیا اور پھر مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کے نام سے نیا اسلامی ملک بن گیا جبکہ مغربی پاکستان کو پاکستان کا نام دے دیا گیا۔ برصغیر کا رقبہ 18 لاکھ مربع میل سے زیادہ ہے۔

سیاسی تقسیم : آج کل برصغیر سیاسی طور پر سات خودمختار ممالک پر مشتمل ہے یعنی (1) ہندوستان (بھارت) (2) پاکستان (3) بنگلہ دیش (4) نیپال (5) بھوٹان (6) سری لنکا (7) اور جزائر مالدیپ + ان ممالک کی مشترکہ انجمن (سارک) کے نام سے کام کر رہی ہے۔

برصغیر کا مختصر جغرافیہ : (نوٹ: یہ معلومات جغرافیہ ہند سے لی گئی ہیں جس کا چوتھا ایڈیشن محکمہ تعلیم پنجاب نے 1909ء شائع کیا تھا۔ جس کے ناشر رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز تھے۔ اس کی قیمت 2 آنے 2 پائی تھی (قدر آفاقی)

ہندوستان کی شکل تکون کی طرح ہے۔ قدرتی طور پر یہ چار حصوں میں منقسم ہے:
(1) کوہستان ہمالیہ کا علاقہ۔
(2) وہ علاقہ جس میں دریائے گنگا اور اس کے معاون بہتے ہیں۔
(3) وہ علاقہ جسے دریائے سندھ اور اس کے معاون دریا سیراب کرتے ہیں۔

(4) دکن کا علاقہ۔

بڑے بڑے پہاڑ :

(1) کوہ ہمالیہ : یہ سلسلہ کوہ دنیا میں سب سے بلند ہے اس کی لمبائی پندرہ سو (1500) میل ہے اور عرض دو سو میل ہے۔ اس کی تین چوٹیاں مشہور ہیں :

(1) ماؤنٹ ایورسٹ سطح سمندر سے 29002 فٹ بلند ہے۔
(2) کنچن جنگا۔
(3) دھولکری۔

ہمالہ کے معنی سنسکرت میں برف کا گھر ہیں۔

(4) کوہ شوالک : یہ گنگا اور بیاس کے درمیان واقع ہے۔ اس پہاڑ میں بڑے بڑے دریائی جانوروں کی ہڈیاں ملتی ہیں۔

(5) کوہ ہندوکش : کوہ ہندوکش چترال کے شمال میں واقع ہے۔ کوہستان سوات' پنج کوڑا اور علاقہ پشاور میں اتمان خیل اور مہمند قوم کے علاقہ کی پہاڑیاں اسی کی شاخیں ہیں۔

(6) کوہ سیاہ : چلاس اور بنیر کے علاقوں پر مشتمل ہے۔

(7) کوہ سفید : کوہ سفید میں آفریدی قبائل بستے ہیں۔

(8) کوہ سلیمان : افغانستان کو پاک و ہند سے جدا کرتا ہے۔ اس کی سب سے بلند چوٹی تخت سلیمان سطح سمندر سے گیارہ ہزار تین سو فٹ (11300) بلند ہے۔

(9) کوہ اراولی : راجپوتانہ میں واقع ہے اس کی بلند ترین چوٹی کوہ آبو 5650 فٹ بلند ہے۔

(10) کوہ بندھیاچل : خلیج کھمبائت سے لے کر ضلع بھاگل پور میں گنگا کے کنارے تک چلا گیا ہے۔ اس کی بلندی پانچ ہزار فٹ سے زیادہ نہیں۔

(11) کوہ ست پڑا : نربدا اور تاپتی کے درمیان واقع ہے۔

(12) کوہ سہادری : بندھیاچل کے مغربی سرے سے سمندر کے کنارے کنارے راس کماری تک چلا گیا ہے۔ اس کو مغربی گھاٹ بھی کہتے ہیں اسی کے بالمقابل ہندوستان کے مشرقی کنارے پر پہاڑوں کا سلسلہ دریائے کاویری سے شمال میں بندھیاچل کی حد تک چلا گیا ہے۔ جسے مشرقی گھاٹ کہتے ہیں۔ دونوں گھاٹوں کے درمیان کوہ نیل گری ہے جس کی اوسط بلندی ساڑھے چھ ہزار فٹ سے زیادہ نہیں۔

میدان :

(1) **گنگا کا میدان** : دنیا کا زرخیز اور آباد ترین علاقہ ہے اس میدان کا ڈھلان جنوب مشرق کی طرف ہے۔

(2) **دریائے سندھ کا ریتلا میدان** : اس کا ڈھلان جنوب کی طرف ہے۔

(3) **مشرقی ساحل کا میدان** : یہ دکن کے مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ دور تک چلا گیا ہے۔

(4) **مغربی ساحل کا میدان** : دکن کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے۔

دریا : برصغیر پاک و ہند کے دریا اپنے نکاس اور بہاؤ کے لحاظ سے پانچ قسم کے ہیں:

1۔ کوہ ہمالیہ سے نکلنے والے دریا جنوب مغرب کی طرف بہتے ہیں اور بحیرہ عرب میں جا گرتے ہیں۔ اس میں دریائے سندھ اس کے معاون پنجاب کے دریا ستلج' بیاس' راوی' چناب اور جہلم اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے دریا شامل ہیں۔ ان میں دریائے کابل افغانستان سے نکل کر دریائے سوات اور کوہیز کو ساتھ لیتا ہوا اٹک کے قریب دریائے سندھ میں مل جاتا ہے۔

2۔ کوہ ہمالیہ سے نکلنے والے یہ دریا مغرب سے مشرق اور جنوب کی طرف ہوتے ہوئے خلیج بنگالہ میں جا گرتے ہیں۔ ان میں دریائے برہم پتر' گنگا' جمنا' گومتی گھاگھرا' گنڈک' کوسی اور تشتا وغیرہ شامل ہیں۔

3۔ وہ دریا جو جنوب کی طرف سے شمال کو بہہ کر تنہا یا اور دریاؤں سے مل کر گنگا میں شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً دریائے ستون' بیتوا' کالی سندھ اور چنبل وغیرہ۔

4۔ وہ دریا جو خلیج کھمبائت میں داخل ہوتے ہیں۔ ان میں سے مہاندی اور سابرمتی شمال مشرق سے جنوب مغرب کی طرف بہتے ہیں جبکہ نربدا اور تاپتی مشرق سے مغرب کو بہتے ہیں۔

5۔ دکن کے وہ بڑے بڑے دریا جو مشرق کی طرف بہہ کر خلیج بنگالہ میں جا گرتے ہیں مثلاً مہاندی' گوداوری' کرشنا' پنار' پالار اور کاویری۔

راس : برصغیر میں ایک ہی مشہور راس ہے یہ برصغیر پاک و ہند کا جنوبی سرا ہے جس کا نام راس کماری ہے۔

جھیلیں :

1۔ چلکا جھیل کٹک کے پاس ہے۔ اس کا پانی کھاری ہے جس سے نمک پیدا کیا جاتا ہے۔

2۔ کولر جھیل : دریائے کرشنا اور گوداوری کے درمیان ہے۔ اس کا پانی میٹھا (غیر کھاری) ہے۔

3۔ پلی کٹ : کرناٹک میں کھاری پانی کی جھیل ہے۔

87117

4۔ سانبھر جھیل : بھرت پور' جے پور اور جودھ پور کی حدوں کے بیچ میں کھاری پانی کی جھیل ہے جس سے عمدہ نمک کافی مقدار میں حاصل کیا جاتا ہے۔
5۔ ولر جھیل : کشمیر میں ہے جو تازہ پانی کی بہترین جھیل ہے جس کی گہرائی تاحال نامعلوم ہے۔

بحیرے' خلیجیں اور آبنائیں : بحیرہ عرب ہند کے مغرب میں واقع ہے۔ خلیج کچھ اور کھمبائت مغرب میں خلیج منار سری لنکا اور ہندوستان کے درمیان اور خلیج بنگالہ مشرق میں واقع ہے جبکہ "آبنائے پاک" ہند کو سری لنکا سے جدا کرتی ہے۔

جزائر :
1۔ جزائر لکادیپ : یہ ساحل مالا بار سے ڈیڑھ سو میل کے فاصلہ پر ہے۔
2۔ جزائر مالدیپ۔
3۔ جزائر انڈیمان : ان کو کالا پانی بھی کہتے ہیں یہاں جلاوطنی کیلئے سیاسی قیدیوں کو بھیجا جاتا تھا۔
4۔ جزائر نکوبار جو خلیج بنگالہ میں واقع ہیں۔
5۔ جزائر رامیشور : لنکا اور ہندوستان کے درمیان واقع ہے جہاں ہندوؤں کا بہت بڑا تیرتھ ہے۔ روایت ہے کہ اس پل کو راجہ رام چندر نے بنوایا تھا جس پر سے اس کی فوج لنکا کے راجہ راون پر حملہ کیلئے پار اتری تھی اور اسے شکست دیکر رام کی بیوی سیتا کو واپس اجودھیا لے آئی تھی۔

باشندے اور نسلیں : (1) آریہ نسل کے ہندو (2) دراوڑ نسل کے ہندو (3) ہندوستان کے اصلی باشندے یعنی سنتھال' گونڈ' بھیل' بھر' ٹوڈے' ککر' وغیرہ (4) مسلمان کچھ تو صوفیائے اسلام کی تبلیغ سے مقامی لوگ مسلمان ہوئے اور باقی باہر سے آنے والے مسلم حملہ آوروں کی اولاد ہیں (5) پارسی (6) عیسائی وغیرہ۔

زبانیں : مشہور زبانیں یہ ہیں :
(1) بنگالی (2) ہندی (3) اردو (4) پنجابی (5) پشتو (6) سندھی (7) مرہٹی (8) گجراتی (9) تامل (10) تلگو (11) کناری وغیرہ۔

مذاہب : (1) ہندو مت کے پیروکاروں کی اکثریت ہے۔ ان میں بدھ' جینی' سکھ' آریہ' برہمو اور مقامی لوگوں کے دیگر فرقے شامل سمجھے جاتے ہیں لیکن بدھ اور جینی اور سکھ اپنے آپ کو ہندوؤں سے الگ تصور کرتے ہیں۔ (2) مسلمان (3) عیسائی (4) پارسی وغیرہ

ملکی تقسیم : برصغیر کے مشہور مقامات اور صوبجات کی تفصیل اس لئے دی جا رہی ہے کیونکہ ان کا تاریخ سے بھی گہرا تعلق ہے۔ 9 نومبر 1901ء کو برصغیر کی انتظامی تقسیم کچھ اس

طرح مقرر کی گئی تھی۔

پنجاب : پنجاب میں پانچ ڈویژن بنائے گئے تھے جن میں مندرجہ ذیل علاقے اور ضلع شامل تھے:

(1) **دہلی ڈویژن** : اس میں ضلع دہلی، گوڑ گاؤں، رہتک حصار، کرنال، انبالہ اور شملہ کے اضلاع شامل تھے۔

(2) **جالندھر ڈویژن** : اس میں ضلع جالندھر، لدھیانہ، فیروزپور، ہوشیار پور اور کانگڑا شامل تھے۔

(3) **لاہور ڈویژن** : میں گورداسپور، امرتسر، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، منٹگمری (ساہیوال) اور لاہور کے اضلاع شامل تھے۔

(4) **ملتان ڈویژن** : اس میں اضلاع جھنگ، لائل پور (فیصل آباد) ملتان، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خاں اور میانوالی شامل تھے۔

(5) **راولپنڈی ڈویژن** : میں ضلع شاہ پور، گجرات، جہلم، راولپنڈی اور اٹک شامل تھے۔

ضلع وار تحصیلوں کی تفصیل :

ضلع	تحصیلیں
دہلی	دہلی، سونی پت، بلم گڑھ
گوڑ گاؤں	گڑگاؤں، پلول، فیروزپور، نوح، ریواڑی
رہتک	رہتک، جھجر، سانپلہ، گوہانہ
حصار	حصار، بھوانی، ہانسی، فتح آباد، سرسہ
کرنال	پانی پت، کیتھل، تھانیسر، کرنال
انبالہ	جگادھری، نرائن گڑھ، کھرڑ، روپڑ اور انبالہ
شملہ	بھرولی، کوٹ کھائی، شملہ اور کوٹ گڑھ
جالندھر	نکودر، پھلور، نواں شہر اور جالندھر
ہوشیارپور	ہوشیار پور، گڑھ شنکر، اونہ، دسوہہ
کانگڑہ	کانگڑہ، پالم پور، کلو، ہمیر پور، ڈیرہ، نور پور

لدھیانہ	سمرالہ' جگراؤں لدھیانہ
فیروزپور	فیروزپور' مکتسر' فاضلکا' موگہ' زیرہ
لاہور	لاہور' شرق پور' قصور' چونیاں
منٹگمری (ساہیوال)	منٹگمری' پاک پتن' دیپال پور' گوگیرہ
گوجرانوالہ	سیالکوٹ ظفروال' رعیہ' پسرور' ڈسکہ
امرتسر	امرتسر' ترن تارن' اجنالہ' پٹھان کوٹ
جھنگ	جھنگ' چنیوٹ' شورکوٹ
لائل پور (فیصل آباد)	لائل پور' ٹوبہ ٹیک سنگھ' سمندری
مظفرگڑھ	مظفرگڑھ' سناواں' علی پور
ڈیرہ غازی خاں	راجن پور' سنگھڑ' جام پور' ڈیرہ غازی خان
میانوالی	عیسیٰ خیل' بھکر' لیہ' میانوالی
راولپنڈی	راولپنڈی' گوجر خاں' کہوٹہ' مری
اٹک	اٹک' فتح جنگ' پنڈی گھیپ' تلہ گنگ
جہلم	جہلم' پنڈ دادنخاں' چکوال
گجرات	گجرات' پھالیہ' کھاریاں
شاہ پور	شاہ پور' خوشاب' بھیرہ' سرگودھا

شمال مغربی سرحدی صوبہ : 9 نومبر 1901ء سے یہ نیا صوبہ بنایا گیا جس کا رقبہ ساڑھے سولہ ہزار مربع میل ہے۔ 1901ء کی مردم شماری کی رو سے اس کی آبادی اکیس لاکھ پچیس ہزار چار سو اسی تھی۔ اس میں پنجاب کے اضلاع ہزارہ (ایبٹ آباد)' پشاور اور کوہاٹ کے علاوہ ڈیرہ اسماعیل خاں کی دو تحصیلیں ڈی' آئی خان اور ٹانک (پوری جبکہ تحصیل کلاچی کے 32 گاؤں پنجاب میں رہنے دیئے گئے اور باقی سب اس نئے صوبے میں شامل کر دیئے گئے۔ بنوں کی دو تحصیلیں بنوں اور لکی مروت بھی اس صوبہ میں شامل کی گئیں نیز دیر' سوات' چترال' مجکوڑہ' بنیر' کرم' خیبر' ٹوچی' گرنال اور شیرانی وغیرہ علاقے بھی اس صوبہ کا حصہ بنا دیئے گئے۔

ممالک متحدہ آگرہ و اودھ : اس کا رقبہ ایک لاکھ مربع میل سے زیادہ ہے۔ اس میں دریائے گنگا' جمنا' رام گنگا' گھاگھرا' گومتی' بیتوا' چنبل کالی سندھ اور کین بہتے ہیں۔ گنجان آباد صوبہ ہے۔ آگرہ کا علاقہ 83198 مربع میل کے رقبہ پر مشتمل ہے۔ اس میں بنارس' الہ آباد'

آگرہ' میرٹھ' روہیل کھنڈ' کماؤں' گورکھ پور' غازی پور' مرزاپور' جون پور' باندہ' کان پور' میرپور' جالون' کالپی' جھانسی' سہارن متھرا' اٹاوہ' فرخ آباد' ایٹہ' فتح پور سیکری' علی گڑھ' بلند شہر' مظفر نگر' سہارن پور' ڈیرہ دون رڑکی' روہیل کھنڈ' بجنور' مراد آباد' بدایوں' بریلی' شاہجہان پور' پیلی بھیت' المورڑہ' گڑھوال نینی تال وغیرہ مشہور شہر اور قصبے ہیں۔

: اودھ کا علاقہ دریائے گنگا اور نیپال کے درمیان واقع ہے اس میں لکھنؤ' اناؤ' ہردوئی' رائے بریلی' سیتاپور' کھیڑی' سندیلہ' فیض آباد' گونڈا' بھڑائچ' سلطان پور' پرتاب گڑھ اور بارہ بنکی مشہور شہر ہیں۔ فیض آباد کے پاس اجودھیا' سرجو ندی کے کنارے واقع ہے۔ جو کسی زمانے میں راجہ رام چندر جی کا دارالسلطنت تھا۔ یہاں لچھمن اور سیتا کے نام سے بہت سے قدیم مندر اور دیگر عمارتوں کے کھنڈرات ہیں۔

بنگال : پہلے یہ صوبہ بہت بڑا تھا۔ 16 اکتوبر 1905ء سے صوبہ بنگال کا کچھ علاقہ آسام کے ساتھ ملا کر اسے علیحدہ صوبہ بنادیا گیا۔ اس میں بردوان' بھاگل پور' پٹنہ' اڑیسہ' چھوٹا ناگپور' ہگلی' ہوڑا' میدنی پور' بانکوڑا' بیربھوم' کلکتہ' کالی گھاٹ' نوبپ' شانتی پور' چوبیس پرگنہ' ندیا' میسور' کھلنا' مرشد آباد' جمال پور منگیر' پورنیا' دارجیلنگ' سارن' گیاہ شان آباد' چمپارن' دربھنگا' مظفر پور' بالاسور' کٹک' پری' انگل' سنبل پور' ہزاری باغ' رانچی مان بھوم سنگھ بھوم' پالامور وغیرہ مشہور شہر اور قصبے ہیں۔

گیا : میں بدھ اور ہندو مذہب کے تیرتھ ہیں مرشد آباد سے تیس میل پر پلاسی کا مقام ہے یہاں 1757ء میں سراج الدولہ کو انگریزوں نے شکست دی تھی۔ پٹنہ کا پرانا نام پاٹلی پتر تھا یہاں مگدھ خاندان کے راجے رہا کرتے تھے۔

مشرقی بنگال و آسام : 16 اکتوبر 1905ء کو یہ صوبہ الگ قرار دیا گیا۔ اس میں ڈھاکہ' چاٹ گام' راج شاہی' فرید پور' باقر گنج' میمن سنگھ' سفیر آباد' ٹپرا' نواکھلی' راج شاہی' دیناج پور' رنگ پور' پبنہ' بوگرا' جلپائیگوری' مالدہ' سلہٹ' کچھار' لوشائی' ناگا' کھاسیا' جینتیا' کامروپ' ڈورانگ' لوگام' سب ساگر' لکھیم پور' گوالپاڑہ' شیلانگ' گوہاٹی' چراپونجی وغیرہ مشہور شہر ہیں۔ 1947ء میں بنگال کے معتدبہ حصے کو مشرقی پاکستان بننے کا شرف حاصل ہوا۔ جو دسمبر 1971ء میں بنگلہ دیش بن گیا۔

ممالک متوسط ہند : اس صوبے میں جبل پور' ساگر' دموہ' مانڈلا' سیونی' ناگر پور' بھنڈارا' وردھا' چاندا' بالا گھاٹ' سیتابلدی' ہنگن گھاٹ' رائے پور' بلاس پور' نربدا' نرسنگھ پور' چھندواڑا' ہوشنگ آباد' بیتول' نیماڑ وغیرہ مشہور شہر اور قصبے ہیں۔

احاطہ بمبئی : اس میں موجودہ صوبہ سندھ کا علاقہ بھی شامل تھا۔ اس میں بمبئی' احمد آباد' کیرا' پانچ محل' بھڑوچ' سورت' ناسک' خاندیس' احمد نگر' پونا' شولاپور' ستارا' بلگام' دھارواڑ'

بیجاپور، رتنا گری، کولابا، کراچی، شکارپور، سکھر، حیدر آباد، تھر اور پارکر مشہور شہر اور مقامات تھے۔ کہتے ہیں کہ ناسک کے مقام پر لچھمن جی نے راون کی بہن سروپ نکھا کی ناک کاٹی تھی اس وجہ سے اس کا نام ناسک پڑ گیا۔ سورت میں انگریزوں نے پہلے پہل تجارتی کوٹھیاں قائم کی تھیں۔ ستارا کبھی مرہٹوں کا دارالخلافہ تھا۔ احمد نگر بھی مسلمانوں کی راجدھانی تھا۔ بیجاپور عادل شاہی بادشاہوں کا دارالسلطنت تھا۔ آج کل صوبہ سندھ پاکستان کا حصہ ہے۔

بلوچستان : اس کا رقبہ 53821 مربع میل اور 1901ء کی مردم شماری میں یہاں کی آبادی 308200 (تین لاکھ آٹھ ہزار دو سو) تھی۔ کوئٹہ صدر مقام تھا۔ سطح سمندر سے 5600فٹ بلند ہے۔ یہ صوبہ کوئٹہ، پشین، تھل چٹیالی، ژوب، بولان اور بگٹی کے اضلاع پر مشتمل تھا۔ یہ صوبہ آج کل پاکستان کا حصہ ہے۔

احاطہ مدراس : اس میں گنجام، وزیگا پٹم، گوداوری، کرشنا، نلور، مدراس، چنگل پت، کوچین، تنجور، مدورا، ٹینولی، کڈاپا، جنوبی ارکاٹ، شمالی ارکاٹ، ترچنا پلی، سلیم، قائم بٹور، نیلگری، کرنول، بلاری، اننت پور مشہور مقامات تھے۔ ترچنا پلی، تنجور، مدورا، ٹینولی وغیرہ علاقہ کرناٹک میں شامل ہیں۔ شمالی ارکاٹ شمال میں "چتوڑ" کا مشہور قلعہ اور شہر ہے جسے اکبر نے فتح کیا تھا۔ مدراس بڑا شہر، بندرگاہ اور دارالخلافہ ہے۔ مدورا قدیم شہر ہے جہاں قدیم عمارات اور مندر ہیں۔ منگلور، کلیان پور، قندپور بھی مشہور مقامات ہیں۔ مالا بار کوچین کے شمال میں ہے۔ کالی کٹ، پال گھاٹ، کنانور اور مہی بھی مشہور شہر ہیں۔

برما : اس کے دو حصے ہیں شمالی برما اور جنوبی برما۔ کل رقبہ 168573 مربع میل ہے۔ لوگ آج کل بھی بدھ مت کے پیروکار ہیں۔ سفید ہاتھی کو معتبر مانا جاتا ہے۔ بدھوں کے عالیشان مندر تقریباً ہر شہر میں ہیں۔

جنوبی برما : جنوبی برما کا رقبہ 81160 مربع میل ہے۔ یہاں ایراوتی، ستانگ اور سابون نامی دریا بہتے ہیں۔ رامری اور چڈوبا شمال میں دو جزیرے ہیں اس میں اراکان، اکیاب، سنڈوئی، کیوک، پیو، پیگو، رنگون، ہتھاوتی، تھاراوتی، پروم، ایراوتی، تھونگوا، بسین، ہینزڈا، میانگ میا (برمی میں مے میو بولتے ہیں) ٹونگو، سالون، تھاٹن، امہرسٹ، ٹووئی، مرگوئی مشہور مقامات ہیں۔ رنگون جنوبی برما کا صدر مقام ہے۔

شمالی برما : شمالی برما کا رقبہ 83390 مربع میل ہے۔ اس میں مشہور مقامات مندرجہ ذیل ہیں۔ منبو، پکوکو، مگوے، تھیٹ میو، بھامو، مانڈلے، مائیٹ کینا، کتھا، سگائی، شبو، کیوک سی، میکھن اور مے انگین وغیرہ۔ برما 1886ء میں انگریزوں کے قبضہ میں آیا تھا اس سے پہلے یہ خودمختار تھا۔

باجگزار ہندوستانی ریاستیں : ان کی تعداد ایک سو ساٹھ سے زیادہ تھی۔

(1) صوبہ بنگال کی ریاستوں میں سکم' کوچ بہار' منی پور زیادہ مشہور ہیں۔
(2) ممالک متحدہ' آگرہ و اودھ کے علاقے میں رام پور (روہیل کھنڈ میں چھوٹی سی ریاست) اور گڑھوال مشہور ریاستیں تھیں۔
(3) پنجاب میں ریاست کشمیر کو ملا کر کل 34 ریاستیں تھیں۔ ریاست کشمیر 1846ء میں انگریزوں نے مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ ایک کروڑ روپے میں بیچ دی تھی۔ سری نگر صدر مقام ہے یہ 1947ء سے متنازعہ چلی آ رہی ہے۔ بہاولپور مسلمان ریاست ہے جہاں نہروں سے آبپاشی ہوتی ہے۔ مالر کوٹلہ پٹھانوں کی ریاست تھی۔ پٹیالہ سکھوں کی ریاست تھی' جیند' نابھہ' کپور تھلہ' فرید کوٹ' بھی سکھ ریاستیں تھیں۔ چمبہ کی ریاست جموں کے مشرق میں بلاس پور ستلج کے کنارے اور سرمور کوہ شوالک کی بڑی بڑی پہاڑی ریاستیں تھیں۔

راجپوتانہ میں بیس ریاستیں تھیں اس علاقہ کا شہر اجمیر انگریزوں کے ماتحت تھا۔ یہاں معین الدین چشتی کی درگاہ ہے۔ راجپوتانہ میں بیکانیر' الور' کشن گڑھ' جے پور' بھرت پورہ' دھول پور' ٹونک' بوندی' کوٹہ' پرتاب گڑھ' بنسواڑا' میواڑیا' اودے پور' ماواڑ یا جودھ پور اور جیسلمیر کی مشہور ریاستیں تھیں۔

بھرت پور کو 1826ء میں انگریزوں نے فتح کیا تھا اس کے شہر ڈیگ میں لال پتھروں کی کان ہے۔ اودے پور میں راجہ کا محل سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ جے سمندر کہتے ہیں۔ چتوڑ اودے پور سے 70 میل کے فاصلہ پر مشہور قلعہ ہے۔ وسط ہند میں بندیل کھنڈ' با گھیل' پنا' بھوپال' اندور' گوالیار' اور ریوا کی ریاستیں ہیں۔ بندیل کھنڈ کے مغرب میں مالوہ کی ریاست بڑی وسیع ہے۔ بیگم بھوپال' مہاراجہ ہلکر اور مہاراجہ سیندھیا کی عملداریاں اسی میں تھیں۔ گوالیار مہاراجہ سیندھیا کی ریاست تھی۔ اس کے جنوب میں اجین کا قدیم شہر ہے جس کے کھنڈرات عبرت کیلئے موجود ہیں۔ یہ شہر کسی زمانے میں مالوے کے مشہور راجہ بکرما جیت کا دارالخلافہ تھا۔

ریاست حیدر آباد (دکن) : یہ سب سے بڑی اور مشہور مسلم ریاست تھی۔ حیدر آباد کے قریب گولکنڈہ کبھی ہیروں کیلئے مشہور تھا۔ سکندر آباد' بولا رام' وارنگل مشہور شہر ہیں۔ بیدر کا شہر پچھلے وقتوں میں مسلمانوں کا دارالخلافہ تھا۔ گلبرگہ مشہور بادشاہی شہر ہے۔ جہاں مقبرے بہت ہیں۔ اورنگ آباد اور دولت آباد مشہور مقامات ہیں۔ نمکین پانی کی جھیل رن میں ہے۔ بڑودہ کی ریاست گجرات میں ہے۔ کاٹھیاوار کا علاقہ پہاڑی ہے۔ اس علاقے میں جین مت کے پیروکار دیگر تمام علاقوں سے زیادہ رہتے ہیں۔ دوار کا اور سومناتھ کے مندر بھی اسی علاقے میں ہیں۔ جونا گڑھ بھی ایک ریاست ہے یہاں گرنار نامی پہاڑی پر جین لوگوں کا بڑا تیرتھ ہے صرف اس ریاست کے جنگلوں میں ببر شیر ملتے تھے۔ کھمبائت کی ریاست ایک نواب کے تحت تھی کولاپور اور سادنت واڑی دو مرہٹی ریاستیں تھیں۔

میسور : یہ ریاست وہی ہے جو سلطان ٹیپو کے حوالے سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہ مدراس کے مغرب میں دکن کے میدان میں واقع ہے یہاں کناری زبان بولی جاتی ہے۔ بنگلور اور سرنگا پٹم مشہور شہر ہیں۔ احاطہ مدراس کی ریاستوں میں ٹراونکور' کوچین' پدوکوٹا کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔

برما کی ریاستوں میں نیپال کی خودمختار ریاست بڑی اہم ہے۔ حکمران گورکھے اور صدر مقام کھٹمنڈو ہے۔ بھوٹان کی ریاست سکم کے مشرق کی طرف ہے۔ اس کا صدر مقام پنکھا ایک قدرتی مضبوط قلعہ لگتا ہے۔ عام لوگوں کا مذہب بدھ مت ہے۔ کھٹمنڈو میں بھی لکڑی کے بے شمار مندر بنے ہوئے ہیں۔ پانڈی چری' کاریکل' ینانوں' چندرنگر ہندوستان میں فرانسیسی مقبوضات تھے جبکہ گوا اور دامان اور ڈیو۔ پرتگیزوں کے حوالے سے شہرت رکھتے تھے۔

بندرگاہیں : ہندوستان کے مشرقی ساحل کو کورو منڈل کہتے ہیں اس میں کوئی کام کی بندرگاہ نہیں تھی۔ مغربی ساحل کو مالابار کہتے ہیں۔ کراچی' بمبئی' گوآ' کالی کٹ' ٹیوٹی کارن' مدراس' وزیگا پٹم اور کلکتہ یہاں کی مشہور بندرگاہیں ہیں۔ برما میں رنگوں اور کولمبو کی بندرگاہیں ہیں۔

نوٹ : یہ مختصر جغرافیہ دینا اس لئے بھی ضروری تھا تاکہ قارئین کو جب برصغیر کی تاریخ پڑھنے کا موقع ملے تو وہ کسی نہ کسی حد تک مشہور اور قدیم مقامات کے محل وقوع سے واقف ہوں نیز ان کو یہ بھی پتہ چل جائے کہ علاقوں کی انتظامی اکھاڑ پچھاڑ صدیوں سے جاری ہے اور دنیا میں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا قانون ہی آخری قانون ہے جس کے سامنے اخلاقی اور مذہبی اقدار کم از کم وقتی طور پر تو ضرور دم توڑ دیتی ہیں۔ پس ہمیں چاہئے کہ اپنی صفوں میں اتحاد اور یگانگت پیدا کریں اور سچی اقدار کو اپنانے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر اس قدر قوت مجتمع کر لیں کہ کوئی قوت ہمیں نقصان نہ پہنچا سکے کیونکہ

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

باب 1

آخری عظیم مغل بادشاہ

اورنگ زیب عالمگیر کے مختصر حالات

1707ء تک برصغیر کی سیاسی صورت حال جس کی کوکھ سے اسلامی حکومت کے زوالی دور نے جنم لیا

اورنگ زیب آخری خودمختار مغل اور عظیم مسلمان حکمران تھا۔ اس لئے اس کے عہد کے ضروری واقعات سامنے لائے جاتے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر مرحوم صحیح معنوں میں ایک محی الدین و الملت مسلم حکمران تھا اس کا دور گزرتے ہی مغل سلطنت کی چولیں ہل گئیں اور جو دشمن اس کے ڈر سے دبکے بیٹھے تھے آہستہ آہستہ باہر آگئے اور خودغرض سیاست کاروں' امراء اور شہزادوں نے اسلامی حکومت کے مقاصد کو یکسر نظرانداز کرنا شروع کر دیا جو سلاطین غزنوی کے دور سے ہر اسلامی حکومت کا طرہ امتیاز رہا تھا۔

حالات زندگی : محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر 15 ذیقعد 1027ھ بمطابق 24/اکتوبر 1618ء کی رات شہزادہ خرم کی بیگم ممتاز محل کے بطن سے پیدا ہوئے۔ خرم نے جہانگیر کی خدمت میں حسب رواج ایک ہزار اشرفیاں بطور نذرانہ پیش کیں۔ جہانگیر نومولود کی خبر سن کر بہت خوش ہوا اور اس کا نام "سلطان اورنگ زیب" رکھا (تزک جہانگیری صفحہ 252) 1037ھ / 1627ء میں جہانگیر وفات پا گیا اور شہزادہ خرم شاہجہان کے لقب سے ہندوستان کا بادشاہ بنا جس کی رسم تاجپوشی 1037ھ میں آگرہ میں ادا کی گئی۔

شاہجہان نے شہزادوں کی تعلیم کیلئے خاص اہتمام کیا۔ چنانچہ اورنگ زیب نے سعد اللہ خاں (متوفی 1656ء) ملاں عبداللطیف سلطانپوری (م 1626ء) سید محمد قنوجی اور ملا احمد جیون (م 1717ء) اور محمد صالح اور میر محمد ہاشم وغیرہ سے تعلیم و تربیت حاصل کی اور متداولہ علوم حاصل کئے۔ 8 جون 1633ء کو غضبناک ہاتھی نے اورنگ زیب پر حملہ کیا لیکن آپ کے جوابی حملے میں وہ مارا گیا اور شہزادے کی بہادری کی دھاک بیٹھ گئی۔ اسے سونے میں تولا گیا اور جشن شجاعت منایا گیا۔

اٹھارہ سال کی عمر میں اورنگ زیب کو بندھیل کھنڈ (یو پی) کی مہم پر بھیجا اور دو سال تک مختلف تجربات اور پختگی اور ٹریننگ کے بعد اسے کامیابی ملی۔ اس کے بعد اسے 29 اپریل 1636ء کو دکن کی صوبیداری مل گئی۔ 8 مئی 1637ء کو اورنگ زیب کی شادی شاہ نواز خاں صفوی کی بیٹی دل رس بیگم سے ہوئی جو غالبًا اورنگ زیب کی تخت نشینی سے پہلے ہی وفات پا گئی۔ اس سے

تین بیٹیاں اور دو بیٹے محمد اعظم اور محمد اکبر پیدا ہوئے۔ دوسری شادی کشمیر کی ریاست راجوری کے راجہ راجو کی بیٹی نواب بائی سے ہوئی جس کا نام رحمت النساء تھا۔ اس سے خیر النساء اور اودے پوری محل (بیوی) سے کام بخش پیدا ہوا۔ (مقدمہ رقعات عالمگیر صفحہ (156 تا 154) 6 ستمبر 1657ء کو شاہجہان سخت بیمار ہوگیا اور اس کے چاروں بیٹے داراشکوہ' شجاع' اورنگ زیب اور مراد بخش تخت نشینی کیلئے لڑنے لگے۔ اصل جنگ داراشکوہ اور اورنگ زیب کے درمیان تھی۔

داراشکوہ : وسیع المشرب صوفی منش وحدت الوجود کا قائل' میاں میرلاہوری کا عقیدت مند اور ملا شاہ بدخشی کا مرید تھا۔ نیز وہ مجذوب سرمد اور جوگی لال داس کا بھی عقیدت مند اور معتقد تھا۔ قرآن حکیم اور بھگوت گیتا میں کوئی فرق نہ سمجھتا تھا۔ قرآن مجید کا ماخذ وہ سنسکرت میں ایک اپنشد کو قرار دیتا تھا جس کا اس نے فارسی میں ترجمہ بھی کرایا تھا۔ اس لحاظ سے وہ اکبر اعظم ثانی بننے کا آرزو مند تھا لہٰذا غیر مسلم رعایا اس کی عاشق تھی جبکہ اہل اسلام اس کی ملحدانہ باتوں سے نالاں تھے۔ 1658ء سے 1659ء تک کے عرصہ میں شاہجہان کی وفات کی افواہ اڑ گئی حالانکہ وہ محض بیمار تھا اگر داراشکوہ اس کی بیماری کو خفیہ نہ رکھتا تو معاملہ الجھنے کی نوبت نہ آتی۔

داراشکوہ نے بادشاہ کی بیماری کے دنوں میں سارا نظم و نسق اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ بھائیوں کے درباری وکیلوں کو نظربند کر دیا نیز دکن' گجرات اور بنگال کو جانے والے راستے بند کرا دیئے گئے۔ مراد بخش اور اورنگ زیب میں جھگڑا کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ شجاع نے وقت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں بنگال میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اس بہانے سے کہ دارا نے شاہجہان کو زہر دلایا ہے اس سے لڑنے کیلئے آگرہ کی طرف بڑھا اور بنارس کے قریب شاہی فوج سے شکست کھائی۔ مراد بخش نے سورت کی بندرگاہ کو لوٹا اور گجرات میں احمد آباد کے مقام پر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور دارا کو شکست دینے کیلئے اورنگ زیب سے امداد طلب کی۔ جسے بادشاہ کی وفات والی افواہ پر یقین نہ تھا البتہ وہ دارا کی زیادتیوں سے نجات چاہتا تھا جس کی فوجیں مالوہ تک پہنچ گئی تھیں چنانچہ حالات کے تحت اورنگ زیب نے مراد بخش کی امداد کا فیصلہ کر لیا اور لکھوا بھیجا کہ اگر تم آخر تک وفاداری نبھاتے رہے تو تمہیں کامیابی کی صورت میں کابل' کشمیر' شمالی پنجاب اور سندھ کے صوبے دے دیئے جائیں گے۔ (رقعات عالمگیر' جلد اول' و آداب عالمگیری صفحہ 375)

مراد بخش اورنگ زیب اور دارا شکوہ کی فوجوں میں 15۔ اپریل 1658ء کو "دھرمٹ" کے مقام پر جنگ ہوئی جس میں دارا شکست فاش کھا گیا۔ اس جگہ فتح کی خوشی میں قصبہ فتح آباد بسایا گیا۔ اس پر دارا نے دہلی میں پوری جنگی تیاریاں کی اور اپنے والد کی مصالحانہ کوششوں کو یکسر رد کر دیا۔ 29 مئی 1658ء کو ساموگڑھ کے مقام پر اورنگ زیب اور دارا کی فوجوں میں گھمسان کارن پڑا یہاں بھی دارا شکست کھا گیا۔ اورنگ زیب کی فتح دراصل راسخ العقیدہ مسلمانوں کی فتح تھی جو دل و جان سے اس کے ساتھ تھے۔ خزینۃ الاصفیاء (ج 1 صفحہ

640) میں لکھا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بیٹے خواجہ محمد معصومؒ نے روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جاکر اورنگ زیب کی فتح کی دعا کی تھی۔ شیخ آدم بنوریؒ نے اپنی وفات سے کچھ عرصہ پیشتر اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو اورنگ زیب کا ساتھ دینے کی تلقین کی تھی۔ اس طرح برہانپور کے قطب ہانسی نے بھی اورنگ زیب کی علانیہ حمایت کی نیز قصور کے پٹھان بھی اس کے کھلے حمایتی تھے۔ (ماہنامہ المعارف بابت ماہ اگست 1968' صفحہ 31 تا 42)۔

دارا شکست کھا کر چپکے سے بیوی بچوں اور جواہرات وغیرہ لیکر پنجاب کی طرف بھاگ نکلا کہ شاید مدد مل جائے ادھر اورنگ زیب کامیاب ہوا تو عمائدین و امرا مبارکبادیں اور اطاعت نامے پیش کرنے لگے۔ خود شاہجہان نے بھی اسے مبارک باد کا پیغام بھیجا اور ایک مرصع تلوار بھجوائی جس پر خطاب "عالمگیر" کندہ کرا دیا تھا۔ (بحوالہ ماثر عالمگیر' صفحہ 7,6) اور ملنے کا اشتیاق ظاہر فرمایا۔ مولانا ہدایت اللہ یہ پیغام لائے تھے چنانچہ اورنگ زیب حاضری کیلئے تیار ہوگئے لیکن شائستہ خاں وغیرہ نے روک دیا۔ شاہجہان کے ایلچی بطور سفیر اورنگ زیب کو لینے گئے تو وہ اس کے استفسار پر قلعہ کے حالات کے بارے میں انہیں مطمئن نہ کر سکے اور اورنگ زیب نے حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ رقعات عالمگیر کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ دراصل اورنگ زیب کو ایک سازش کے تحت قلعہ آگرہ آتے ہی گرفتار کرکے دارا سے حوالے کئے جانے کا پروگرام تھا۔ (صفحہ 446 ۔ 447) اور اس خطرناک سازش کے جواب میں قلعہ آگرہ پر فوجی پہرا بٹھا دیا جو دراصل بادشاہ کی معزولی کا اعلان تھا جس کے بعد اسے نظر بند تصور کیا جانے لگا۔ یہ واقعہ 8 جون 1657ء بمطابق 17 رمضان المبارک 1068 ھ کو پیش آیا۔ 10 جون کو جہاں آراء بیگم نے صلح کا منصوبہ پیش کیا کہ چاروں بھائی سلطنت کو چار حصوں میں تقسیم کر لیں لیکن ایک اور سازش پکڑی گئی چنانچہ اورنگ زیب دارا کے تعاقب میں دہلی جانے لگا تو پتہ چلا کہ مراد بخش بھی اندر خانے شاہجہان سے خط و کتابت میں مصروف ہے اور اورنگ زیب کی فوجوں کو لالچ دیکر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہا ہے جسے سمجھانے کی تگ و دو جاری رہی لیکن وہ اپنی اوقات سے بڑھ کر ہاتھ مارنے لگا چنانچہ 25 جون کو اورنگ زیب نے اسے گرفتار کر کے پہلے سلیم گڑھ اور بعد ازاں گوالیار کے قلعے میں قید رکھا اور شاہی دیوان علی نقی خاں کے قصاص میں آخر اسے 4 دسمبر 1661ء / 21 ربیع الاول 1072 ھ کو تہ تیغ کروا دیا گیا۔

عالمگیر کی پہلی تخت نشینی : 21 جولائی 1658ء بمطابق یکم ذویقعد 1068 ھ بروز جمعہ تخت نشینی کی پہلی رسم دہلی کے قریب باغ اغر آباد (بعد ازاں نام شالیمار باغ) میں سادگی سے ادا کی گئی اور اس موقع پر ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب کا لقب اختیار کیا۔ پھر اورنگ زیب داراشکوہ کے تعاقب میں پنجاب کی طرف بڑھا لیکن وہ نکل چکا تھا۔ پھر اسے خبر ملی کہ شجاع بنگال سے تازہ لشکر کے ساتھ دہلی کی طرف بڑھ رہا ہے چنانچہ الہ آباد کے قریب اورنگ زیب نے اس کی فوجوں کا "استقبال" کیا اور اسے زبردست شکست دی۔ یہ واقعہ 5 جنوری 1669ء کا ہے۔ پھر میر جملہ کی سالاری میں شجاع کا تعاقب جاری رہا حتیٰ کہ وہ اسے 22 مئی 1660ء تک بنگال

سے بے دخل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ شجاع یہاں سے بھاگا تو آسام کے راجہ کے پاس پناہ گزین ہوا۔ اس سے بات بگڑ گئی تو "اراکان" بھاگ گیا۔ پھر وہ غالباً جنوری 1661ء میں پہاڑی قبائیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

ادھر داراشکوہ گجرات پہنچا جہاں عالمگیر کا سسر (دلرس بانو کا باپ) شاہنواز خاں صوبیدار تھا لیکن اس نے دارا کا ساتھ دیا کیونکہ اسے جنگ تخت نشینی میں عالمگیر کی طرف سے اپنی نظر بندی کا رنج تھا۔ نیز جسونت سنگھ نے بھی دارا کی پیٹھ ٹھونکی اور اسے راجپوتوں کی مدد کا یقین دلا کر اجمیر کی طرف بڑھنے کو کہا۔ دوسری طرف اورنگ زیب بھی 11 مارچ 1659ء بمطابق 16 جمادی الآخر 1069ھ اجمیر کے قریب پہنچ گیا جہاں دیواری کے مقام پر دونوں فوجیں ٹکرا گئیں۔ تین دن کی لڑائی کے بعد دارا شکست کھا گیا اور عالمگیر 18 مارچ 1659ء کو دہلی واپس آ گیا۔ دارا بھاگ گیا اور بنوں کے قریب 23 جون 1659ء کو ایک بلوچ سردار ملک جیون کے ہاتھوں گرفتار ہوکر شاہی حکام کی تحویل میں پہنچ گیا۔ جہاں سے اسے 23 اگست کو دہلی لایا گیا اور 29 اگست کو علماء نے اس کے کفر و الحاد کی بنا پر اس کے قتل کا فتویٰ دے دیا چنانچہ 30 اگست 1659ء کو اسے سزائے موت دے دی گئی۔ (بمطابق 21 ذوالحج 1069ھ)

دوسری رسم تخت نشینی : اورنگ زیب عالمگیر کے سارے شاہی مخالفین کا قلع قمع ہونے کے بعد اس کی دوسری رسم تخت نشینی مورخہ 5 جون 1659ء (بمطابق 24 رمضان 1069ء) کو ادا کی گئی۔ اورنگ زیب برصغیر پر پچاس سال دو ماہ اور ستائیس دن حکومت کرکے 21 فروری 1707ء (28 ذیقعدہ 1118ھ) بروز جمعہ عالم بالا کو سدھار گیا۔

وفات : کہتے ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیر دکن کے آخری سفر میں علیل ہوئے تو وزیر دربار نے برہان پور (اورنگ آباد) کے مقام پر بادشاہ سلامت کی خدمت میں عرض کیا کہ اس سفر کی آخری منزل کون سا شہر ہوگا تاکہ سفر کے پیش نظر ویسا ہی بندوبست کیا جائے چنانچہ حضرت اورنگ زیب علیہ الرحمتہ اس وقت دیوان حافظ منگوا کر فال نکلواتے ہیں اور یہ شعر برآمد ہوتا ہے :

(آب کوثر صفحہ (474 ۔ 475) میں لکھا ہے کہ دیوان حافظ ان کے سرہانے پڑا رہتا تھا)۔

برسر تربت ما چوں گزری ہمت خواہ
کہ زیارت گہہ رندان جہاں خواہد بود

یہ شعر پڑھ کر اورنگ زیب کو اسی جگہ اپنی موت کا یقین ہوگیا۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ نے حکم دیا کہ برہان پور (اورنگ آباد) کو ہی شاہی روزنامچے میں ختم سفر لکھا جائے اور اعلان کر دیا جائے کہ یہاں سے آگے نہ بڑھا جائے چنانچہ اسی مقام پر اس باہمت بادشاہ نے دوسرے یا تیسرے روز وفات پائی۔ (بحوالہ وقائع عالمگیری مرتبہ چودھری نبی احمد سندیلوی نیز رقعات عالمگیری)

فتوحات : اورنگ زیب نے 1661ء میں گورنر بنگال میر جملہ کو آسام کے راجہ پر حملہ کا حکم دیا کیونکہ اس نے شہزادوں کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر مغل سلطنت پر حملے کئے تھے۔ مارچ 1662ء میں آسام پر قابض ہوگیا اور مال غنیمت بھی ہاتھ آیا۔ 1667ء میں یوسف زئی قبائل میں سے داراشکوہ کے ایک حامی "بھاگو" نے دریائے اٹک عبور کرکے ضلع ہزارہ پر حملہ کیا لیکن شکست کھائی۔ 1673ء میں آفریدیوں نے مغلوں کے خلاف بغاوت کی اور محمد امین کابل کے گورنر کو پشاور جاتے ہوئے نقصان پہنچایا۔ پھر خوشحال خاں خٹک بھی آفریدیوں سے مل گیا۔ فروری 1674ء میں ان لوگوں نے سرکاری فوجدار شجاعت خاں کو قتل کر ڈالا چنانچہ اورنگ زیب حسن ابدال تک خود گیا۔ باغی بھاگ گئے اور اورنگ زیب نے مصالحانہ رویہ اختیار کرکے قبائیلوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور نوازشات سے بھی انہیں رام کیا۔ 1669ء میں متھرا کے جاٹوں نے بغاوت کر دی اور فوجدار عبدالنبی کو شکست دی اور ضلع سعید آباد میں بھی تباہی مچا دی۔ اورنگ زیب نے خود آکر اس بغاوت کو دبا دیا اور اس کے سرغنہ گوکل کو موت کی سزا دی۔ 1686ء میں بھی جاٹوں کے لیڈر "راجہ رام" نے مغل علاقے پر حملہ کیا۔ آخر اورنگ زیب نے انہیں شکست دی۔ راجہ رام قتل ہوا۔ حتیٰ کہ 1691ء میں جاٹوں کا بھرکس نکال دیا گیا۔ مئی 1672ء میں ست نامیوں کی بغاوت کو کچل دیا گیا۔

بندھیلے : بندھیلے راجپوت بھی مرکزی حکومت کے خلاف تھے۔ 1602ء میں اکبر اعظم کے خلاف بغاوت کی بیر سنگھ بندھیلہ ابوالفضل کا قاتل تھا۔ شاہجہانی دور نے اس کے بیٹے جھجھر سنگھ نے بغاوت کی اور شہزادہ اورنگ زیب نے اسے شکست دے دی۔ پھر اس کے اپنے دور میں چمپت رائے نے بغاوت کی اور گھیرے میں آگیا تو خودکشی کرلی۔

سکھ : گورو ارجن سنگھ کے جانشین گورو ہرگوبند سنگھ نے سکھوں کی تنظیم نو کی اور سکھ گورو تیغ بہادر کے قتل کا بدلہ لینے کے بہانے مغل علاقوں پر حملے کرنے لگے تاہم اورنگ زیب نے گورو گوبند سنگھ کو شکست دی۔ پھر وہ انند پور (ہوشیارپور) میں مقیم ہوگئے اور 1708ء میں بہادر شاہ کے عہد میں ایک افغان کے ہاتھوں دکن کے اطراف میں قتل کر دیئے گئے۔

راجپوت : اورنگ زیب کے دربار میں راجہ جے سنگھ اور راجہ جسونت سنگھ نے بڑے معتبر راجپوت امراء تھے۔ جے سنگھ والئی جے پور نے 1668ء میں وفات پائی اور جسونت سنگھ راٹھور والئی جودھپور 1678ء میں جبکہ وہ کابل کا گورنر تھا فوت ہوگیا۔ اس کی دو بیویاں امید سے تھیں ان سے دو لڑکے پیدا ہوئے اور بحکم شاہی ان کی تربیت دہلی میں ہونا تھی لیکن سرکش راجپوت ان لڑکوں کو خود ہی دہلی کی طرف لے کر چلے اور راستے میں میر بحر اور اس کے ساتھیوں کو قتل کرکے دہلی پہنچے کیونکہ اس نے ان سے اجازت نامہ عبور دریا طلب کیا تھا پھر وہ باغیانہ انداز میں ہی ان بچوں کو واپس لے کر اودھے پور پہنچے اور راجہ سے مل کر مغل حکومت پر یلغار کر دی۔ شہزادہ اکبر کو ان کی سرکوبی کیلئے بھیجا تو اسے بادشاہت کا لالچ دیکر باپ کے خلاف بغاوت پر آمادہ

کر لیا چنانچہ عالمگیر خود آگے بڑھا اور اکبر کو بھگا کر راجپوت ریاستوں کو تہس نہس کر ڈالا۔ آخر راجہ اودھے پور نے اپنے کچھ علاقے دیکر اطاعت قبول کر لی اور 1682ء میں عالمگیر نے اودھے پور کے راجہ کو پنج ہزاری منصب دیکر عزت افزائی کی۔

دکن کی مہمات : 1681ء سے پہلے تین مہمات بیجاپور اور گولکنڈہ کو فتح کرنے کیلئے گئیں تیسری مہم شہزادہ شاہ عالم کی قیادت میں 1679ء میں بھیجی۔ اس کا معاون دلیر خان تھا۔ ہندو فوجی سردار مرہٹوں سے مل گئے اور مغل فوج انتشار باہمی کا شکار ہوگئی۔ عالمگیر جولائی 1681ء میں خود دکن کی طرف چلا اور اس کے بعد شاہی فوجیں فتح یاب ہونے لگیں۔ بیجاپور کا حاکم عادل شاہ تھا۔ 1686ء میں بیجاپور کو فتح کرکے مغل سلطنت میں شامل کر لیا اور ستمبر 1687ء میں گولکنڈہ کے قلعہ پر بھی قبضہ ہوگیا۔

مئی 1666ء میں سیواجی پنج ہزاری منصب لیکر بھی خوش نہ ہوا اور پھر باغی بن کر مغل علاقے چھیننے نیز اس نے رائے گڑھ کے مقام 1674ء میں اپنی خودمختاری اور بادشاہت کا اعلان کر دیا جبکہ شاہی فوجیں اسے زیر نہ کر سکیں۔ 1680ء میں وہ مرگیا تو اس کا بیٹا شمبہ جی تخت پر بیٹھا۔ عالمگیر کے سالار مقرب خاں نے شمبہ جی کو شکست دی اور اسے زندہ پکڑ لیا گیا۔ پھر سالار اعتقاد خاں مرہٹوں کو رائے گڑھ کے مقام پر ایک شکست دی۔ شمبہ کا بیٹا ساہو جی گرفتار ہوا جسے 1689ء میں قتل کروا دیا گیا۔ اس کے بعد شمبہ جی کا بھائی راجہ رام مرہٹوں کا قائد بن کر آگے آیا۔ 1691ء میں اس کی راجدھانی جنجی کا محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ جنوری 1698ء میں فتح ہوگیا۔ راجہ رام بھاگنے میں کامیاب ہوگیا تاہم 1700ء میں وہ مرگیا اور مرہٹوں کو شکست فاش ہو گئی۔

اصلاحات : اورنگ زیب نے تخت نشین ہونے کے بعد بہت سی اصلاحات کیں۔

1۔ سکوں پر کلمہ طیبہ لکھنے کا رواج تھا آپ نے کلمہ طیبہ کی بے حرمتی اور بے ادبی کے خوف سے آئندہ کیلئے کلمہ طیبہ کا کندہ کرانا بند کروا دیا۔
2۔ پہلے شمسی کیلنڈر رائج تھا عالمگیر نے اس کی جگہ قمری کیلنڈر 1069ھ (1659ء) سے جاری کیا۔
3۔ جشن نو روز منانے کا رواج تھا جس پر لاکھوں روپے خرچ کئے جاتے اورنگ زیب نے یہ شاہی رسم فوراً بند کرنے کا حکم دیا۔
4۔ جشن نو روز کے موقع پر امراء اور اراکین سلطنت بادشاہ کو نذرانے پیش کیا کرتے تھے۔ جشن کے بعد نذرانے لینے بھی بند کر دیئے ورنہ خوشامدی حضرات تو چاہتے تھے کہ جشن بند ہوگیا تو کیا ہوا نذرانے بہرحال سادگی سے قبول کئے جانے چاہئیں چنانچہ 1088ھ میں یہ رسم بھی بالکل بند کر دی۔
5۔ مئی 1659ء (1069ھ) میں بھنگ کی کاشت قانونی طور پر ممنوع قرار دے دی گئی۔

6۔ مسلمانوں کے اخلاق عالیہ کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا اور اصلاحی نقطہ نظر سے احتساب کا محکمہ قائم کیا۔ ملک کے اندر شہروں اور بڑے قصبوں میں محتسب مقرر کئے جن کا فرض یہ تھا کہ وہ اہل اسلام کو شرع و سنت پر چلنے کی تلقین کریں اور بصورت کوتاہی ان کے خلاف تادیبی کارروائی بھی کریں چنانچہ محتسب اور اس کے عملہ کے لوگ معاشرتی برائیوں کا قلع قمع کرنے میں بہت حد تک کامیاب رہے۔ وہ شراب نوشی اور قمار بازی پر کڑا احتساب کرتے تھے۔

7۔ غلاموں کی خرید و فروخت کو قانونی طور پر ممنوع قرار دے دیا گیا۔

8۔ دربار میں ہاتھ اٹھا کر سلام کرنے کی رسم رائج تھی اسے ختم کر دیا گیا اور 1080ھ میں سلام مسنون کو نافذ کیا گیا۔

9۔ دربار میں گانے بجانے اور رقص و سرود کی محفلوں نے قدم جما رکھے تھے عالمگیر نے درباری رقاصاؤں اور موسیقاروں اور بھانڈوں وغیرہ کو نومبر 1677ء تک مناسب پنشن دے کر فارغ کر دیا۔

10۔ شاعروں کی سرکاری سرپرستی کا رواج عام تھا۔ دربار میں ملک الشعرا کا عہدہ بھی تھا۔ عالمگیر نے شعراء کی سرکاری سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا اور ملک الشعراء کی پوسٹ بھی ختم کر دی گئی۔

11۔ سرکاری طور پر تاریخ نویسی ختم کر دی گئی اس طرح تاریخ نویسی کو آزادی مل گئی۔

12۔ 1079ھ (نومبر 1679ء) میں بادشاہ کا ماتھے پہ تلک لگانا' زمین بوسی اور جھروکے کے درشن ایسی ساری رسمیں بیک جنبش قلم موقوف کر دی گئیں۔

13۔ جشن ولادت اور جشن تخت نشینی سادہ طور پر منانے کا حکم ہوا۔

14۔ بادشاہ کو سونے اور چاندی میں تولنے کی رسم ختم کر دی گئی۔

15۔ درباری لباس میں اصلاح کی گئی۔ امراء کیلئے ریشمی لباس اور زیورات پہننا ممنوع قرار دے دیا گیا اور اسی طرح کے دیگر سرکاری بے ہودہ تکلیفات ختم کر دیئے گئے۔

16۔ 1064ء میں ہندوؤں میں موجود رسم ستی کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔

17۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے موقع پر اسی (80) کے قریب ناجائز ٹیکس وصول کئے جا رہے تھے جن میں راہداری ٹیکس' پنڈاری ٹیکس اور گنگا جمنا میں نہانے کا ٹیکس خاصے مشہور تھے۔ صرف راہداری کی مد میں 25 لاکھ روپے سالانہ وصول ہوتے تھے عالمگیر نے یہ سارے ناجائز ٹیکس معاف کر دیئے اور اپنے نائبان اور کارپردازوں' جاگیرداروں اور زمینداروں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں ان اقدامات پر عملدرآمد ضرور کروائیں۔

18۔ مسلمانوں پر زکوٰۃ نافذ کی گئی جس کی وصولی پہلے کبھی نہ ہوئی تھی اب سرکاری طور پر زکوٰۃ وصول کرکے اس کا باقاعدہ حساب کتاب رکھا جانے لگا۔

19- ہندوؤں پر جزیہ نافذ کیا گیا۔ یہ وہ اقدام ہے جس کی تشہیر کر کے غیر مسلم مورخین اورنگ زیب کو بہت بدنام کرتے ہیں حالانکہ جزیہ ازیں پیشتر سلاطین دہلی ہمیشہ وصول کرتے تھے۔ صرف اکبر اعظم نے 1564ء میں جزیہ معاف کر دیا تھا۔ چنانچہ 2 اپریل 1679ء کو جزیہ دوبارہ لاگو کیا گیا جو اسلامی سلطنت کا بنیادی تقاضا تھا۔

20- کسی مرنے والے امیر کی' جائیداد اور اس کا مال و متاع ضبط کر لیا جاتا تھا عالمگیر نے اس مسئلہ کو شاہجہان کے سامنے بھی پیش کیا تھا لیکن اس نے کسی قسم کے ردوبدل سے انکار کر دیا تھا چنانچہ عالمگیر نے امراء کی فوتیدگی پر جائیداد کی ضبطی کا حکم منسوخ کر دیا اس طرح ہر کوئی اپنی جگہ چوکس ہو کر اپنے فرائض بطریق احسن نبھانے لگا۔

21- محکمہ مال میں اصلاحات کی گئیں۔ مالگذاری کے محکمے پر ہندوؤں کا قبضہ تھا اور وہ حساب کتاب کے ماہر ہونے کی آڑ میں کسی اور قوم کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور ان لوگوں نے رشوت کا بازار گرم کر رکھا تھا خاص کر پٹواری' قانون گو' منشی' معدی اور شق دار قسم کے عہدیدار بہت بدنام تھے۔ اورنگ زیب نے اپنی نگرانی میں اس محکمہ کی کڑی جانچ کی اور بددیانت اہلکاروں کو برطرف کر دیا اور بعض کو معافی مانگنے پر نیک چلنی کی ضمانت پر دوبارہ بحال کر دیا۔ تاہم وہ چاہتا تھا کہ مسلمان بھی اس محکمے میں در آئیں چنانچہ اس کا اہتمام کیا گیا اور حسابات کی جانچ پڑتال' مالیے کی تشخیص اور وصولی کیلئے ضوابط بنائے گئے جن کی وجہ سے رشوت ستانی کا راستہ بند ہو گیا۔

یہ قواعد و ضوابط "دستور العمل عالمگیر" کے نام سے اب تک محفوظ چلے آتے ہیں۔
(مسلمانان پاکستان و بھارت مطبوعہ کراچی جلد 1 صفحہ 547) (کیمبرج ہسٹری آف انڈیا جلد 4' صفحہ 221' ہسٹری آف اورنگ زیب' از جادو ناتھ سرکار' جلد 3 صفحہ 88 تا 140)

عالمگیر ایک عظیم حکمران : اورنگ زیب عالمگیر ایک عظیم حکمران تھا اور سلطانی امور سے آگاہ تھا۔ اس کی فوج بڑی مضبوط اور منظم تھی۔ پہلے پچیس سال میں ملک کا نظم و نسق مثالی تھا ہر جگہ امن و امان کا دور دورہ تھا۔ لوگ خوشحال تھے۔ زراعت تجارت اور صنعت کے شعبے بام عروج پر تھے۔ مور لینڈ اپنی تالیف (Agrarian System of Muslim India The) (مطبوعہ لنڈن 1923ء) میں لکھتا ہے کہ اکبری عہد میں کل مال گزاری بیس کروڑ تھی جو بڑھ کر شاہجہانی عہد میں چالیس کروڑ تک جا پہنچی جبکہ اورنگ زیب کے عہد میں یہ ساٹھ کروڑ روپے سالانہ سے بھی متجاوز تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اورنگ زیب کے بارے میں جادو ناتھ سرکار کے یہ الزامات بے بنیاد ثابت ہو جاتے ہیں کہ "عالمگیری عہد میں مالی حالات دگرگوں تھے۔" (بحوالہ ہسٹری آف اورنگ زیب' جلد 3 صفحہ 2-3' از جادو ناتھ سرکار)

اورنگ زیب عالمگیر شمس الدین التمش (1210ء تا 1236ء) غیاث الدین بلبن (1266ء تا 1287ء) اور شیر شاہ سوری (1540ء تا 1545ء) کی طرح بادشاہت کو قرآنی ارشاد کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ مقدس عطیہ اور فریضہ سمجھتا تھا۔ اور بلبن کی طرح اس کے

تقدس، رعب اور دبدبے کا قائل تھا لیکن ساتھ ہی وہ بلبن کی طرح عوام کے درمیان امتیازی دیواریں کھڑی کرنے کے بھی خلاف تھا۔

بے دھڑک بادشاہ : عالمگیر عوام میں گھل مل جاتا۔ جمعہ کی نماز کیلئے گلیوں میں سے گزر کر جامع مسجد میں جاتا اور لوگوں کے ساتھ عام لوگوں کی طرح نماز ادا کرتا تھا۔ اورنگ زیب سمجھتا تھا کہ بادشاہت اعلائے کلمۃ الحق کا ذریعہ ہے اور اس فریضہ کو مستعدی کے ساتھ نبھانا چاہئے جس طرح خلفائے راشدین نبھایا کرتے تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں عالمگیر کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور سربلندی کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ اس نے امور سلطانی انجام دینے کیلئے حتی الوسع اور ہمیشہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین کی مثالوں کو قائم رکھا اور خاص طور پر عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ وہ خزانہ عامرہ کو ایک قومی اور ملی امانت سمجھتا تھا اور ناجائز طور پر ایک پیسہ بھی خرچ نہ کرتا تھا۔ وہ تن آسانی کے یکسر خلاف تھا ہمہ وقت جہاد اس کا شیوہ تھا۔ وہ فتنے کے اختتام تک جنگ جاری رکھنے کا قائل تھا۔ وہ اپنے عمال کو بھی عوام کی تکالیف اور حاجات رفع کرنے کی تلقین کرتا رہتا اور دیکھتا تھا کہ کاشتکاروں کی فلاح و بہبود سے پہلو تہی نہ برتی جائے۔ کیونکہ یہ لوگ رزق خداوندی کا سرچشمہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ وہ رعایا کے ساتھ حکام کے مشفقانہ رویہ کا قائل تھا۔ عدل و انصاف کے بارے میں وہ کسی طبقاتی یا مذہبی امتیاز کا قطعاً قائل نہ تھا۔ شہزادگی کے زمانہ میں اس نے شاہجہان کو ایک خط میں لکھا:

> "چالیس سالہ تجربہ کی بنا پر آپ جانتے ہیں کہ تاجوری کا زیور کس قدر بوجھل ہے اور حقیقی بادشاہ صحیح معنوں میں وہی جس کی زندگانی کا یہ نصب العین ہو کہ وہ رعایا پر عدل و انصاف سے حکومت کرے۔"

ایک اور خط میں شاہجہان کو یوں لکھا:

> "عالی جاہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمرانی کی امانت اسی کے سپرد کرتا ہے جو رعیت پروری اور لوگوں کی حفاظت کے فرائض بخوبی انجام دے۔ بادشاہت یا حکمرانی دراصل عوام کے تحفظ اور اس کی خدمت کا نام ہے نہ کہ نفس پرستی اور عیش کوشی کا۔"

(بحوالہ رقعات عالمگیر)

وہ کہا کرتا تھا کہ ایک بادشاہ کا بیٹا اور تخت پر متمکن ہونے کی حیثیت سے خدا تعالیٰ مجھے اس لئے دنیا میں لایا کہ میں اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کیلئے زندہ رہوں اور ان کی خاطر ہر طرح کی مشقتیں برداشت کروں۔ پس میرا فرض یہ ہے کہ اپنی راحت کا خیال اس حد تک کروں جس حد تک اس کا میری رعایا کی خوشی کے ساتھ تعلق ہے۔ چنانچہ عالمگیر نے اس معاملہ میں ایک مثالی اسلامی حکمران کا کردار اپنایا۔

(بحوالہ رقعات عالمگیر صفحہ 224)

جادو ناتھ سرکار اپنی کتاب ہسٹری آف اورنگ زیب (صفحہ 1 جلد 1) میں لکھتا ہے کہ:
"غالباً برصغیر کی تاریخ میں پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ پورا برصغیر معہ اس کے اردگرد کے کئی علاقوں کے عالمگیری عہد میں ایک مرکز کے تحت آیا۔ مہاراجہ اشوک سمدرا گپت اور سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں بھی سلطنت ہند کو یہ وسعت حاصل نہ تھی۔"

مولانا شبلی (اورنگ زیب پر ایک نظر صفحہ 154) لکھتے ہیں کہ "عالمگیر اپنی روزی قرآن حکیم کی کتابت کرکے اور ٹوپیاں سی کر کماتا تھا اور قومی خزانے سے اپنی ذات کیلئے ایک کوڑی تک لینے کا روادار نہ تھا اور یہ بات عالمگیر کی عظمت کی گواہی کیلئے کافی ہے۔"

اورنگ زیب پر الزامات اور ان کا تجزیہ : تاریخ نویسی ایک فن ہے لیکن دیانت داری ایک وصف ہے جو اللہ کی عطا ہے۔ عالمگیر پر مشرق و مغرب کے غیر مسلم تاریخ نویسوں نے الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔ خاص کر انفسٹن۔ لین پول۔ منوچی اور جادو ناتھ سرکار وغیرہ نے تو ناحق اور ناجائز تنقید کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ یہ تاریخ نگار عالمگیر کے اچھے کاموں کی تعریف اور مثبت انداز نظر اختیار کرنے کی بجائے اپنے منفی انداز فکر کے تحت اپنے مفروضوں کے پیچھے نہ صرف بھاگتے رہے بلکہ انہیں ہوا دیکر اچھالتے رہے۔ منوچی نے جو الزامات گھڑے ہیں ان کی تعداد چار سو (400) تک پہنچتی ہے۔ یہ شخص اٹلی کا باشندہ تھا اور عیسائی مذہب رکھتا تھا۔ بڑے عرصے تک عالمگیر کے دربار سے منسلک رہا لیکن کسی وجہ سے عالمگیر ناراض ہوگیا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں عالمگیر پر بازاری اور گھٹیا قسم کے الزامات لگائے ہیں جن کا تصور میں بھی عالمگیر کی ذات سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ اس سے ہم یہی نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ منوچی بذات خود ایک گھٹیا ذہنیت کا گھٹیا آدمی تھا اسی طرح دوسرے تاریخ نگار بھی اپنی ذہنی اپج کے مطابق اختراعات نو کے انبار لگانے میں کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے حالانکہ جو شخص طوفان میں رہ کر طوفان سے لڑ رہا ہوتا ہے اسے پتہ ہوتا ہے کہ وقت کا تقاضا کیا ہے جبکہ کنارے پر کھڑے لوگ تو دل ہی دل میں داؤ پیچ کے ماہر بننے کے مدعی ہوتے ہیں۔

الزامات اور ان کا تجزیہ

(1) شاہجہان کی نظربندی : کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے بھائیوں کو تخت حاصل کرنے کیلئے یکے بعد دیگرے راستے سے ہٹایا اور پھر 1658ء میں اقتدار پاتے ہی اپنے باپ شاہجہان کو نظربند کر دیا جو کسی بھی لحاظ سے بری بات تھی۔

حالات بتاتے ہیں کہ ان بحران تک پہنچانے کی ذمہ داری خود داراشکوہ اور شاہجہان پر تھی۔ داراشکوہ باپ کا پیارا اور چہیتا بیٹا تھا۔ پنجاب اور الہ آباد کے زرخیز علاقے اس کی جاگیر تھے

لیکن وہ اپنے ان علاقوں سے دور دارالحکومت میں رہا کرتا تھا اور اپنے بھائیوں کے خلاف والد گرامی کو بھڑکاتا رہتا حتیٰ کہ اورنگ زیب عالمگیر کو تو خوب نشانہ بناتا تھا کیونکہ وہ آزاد خیال اور بزعم خویش وسیع المشرب تھا جبکہ اورنگ زیب ایک پابند شریعت شہزادہ تھا۔ وہ تخت و تاج کا تمنائی تھا اور موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ شاہجہان کی علالت نے اس کی یہ خواہش پوری کرنے کا سامان کر دیا اور والد گرامی کی بیماری کے دنوں میں دارالحکومت میں ہونے کے ناطے سارے اختیارات پر قابض ہوگیا اور والد کی بیماری کی خبر کو خفیہ رکھا۔ پھر یہ بھی کیا کہ گجرات' دکن اور بنگال کو جانے والے راستے بند کر دیئے جہاں اس کے حقیقی بھائی مراد بخش گجرات میں' اورنگ زیب دکن میں اور شجاع بنگال میں گورنر تھے۔

وہ اسی پر اکتفا نہ کر سکا بلکہ اس نے دارالحکومت میں بیٹھ کر اپنی فوجوں کو تینوں بھائیوں کے خلاف روانہ کر دیا۔ اس افراتفری میں جب مراد بخش پر صورت حال واضح ہوئی تو اس نے گجرات میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور مرکز سے تعلق توڑ لیا۔ پھر یہی کچھ شجاع نے کیا اور ان دونوں نے اپنے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ بھی جاری کر دیا لیکن صرف اورنگ زیب عالمگیر۔۔ نے بڑے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا اور پورے بحران میں نہ صرف خود۔ جذبات میں نہ آیا بلکہ اس نے اپنے ان بھائیوں کو بھی صبر و تحمل کی تلقین کی اور کہا کہ وہ بڑی احتیاط سے حالات کا جائزہ لیں اور جلد بازی سے باز رہیں۔

جب دارا کی بھیجی ہوئی فوجیں گجرات اور بنگال کی طرف بڑھیں تو مراد اور شجاع نے مقابلے کی ٹھانی اب اورنگ زیب کی خاموشی گویا تخت سے دست برداری کے مترادف تھی چنانچہ اس کو بھی مجبوراً اس جنگ میں کودنا پڑا۔ پہلے اس نے حکمت عملی سے کام لیکر دھرمت اور سامو گڑھ کے مقام پر فتح پائی پھر آگرہ اور دہلی کو بھی قبضے میں لے لیا اور اس موقع پر بقول الفنسٹن (بحوالہ ہسٹری آف انڈیا صفحہ 814) عالمگیر نے اپنے والد گرامی کے احترام کو بھی ملحوظ خاطر رکھا لیکن شاہجہان نے دارا کی محبت میں گم ہو کر عالمگیر کے چاروں طرف سازشوں کے جال پھیلا دیئے اور دارا شکوہ کو خط لکھا کہ تم جہاں بھی پہنچ چکے ہو وہیں رک جاؤ۔ اس مہم میں ابھی فیصلہ کئے دیتا ہوں۔ (واقعات عالمگیری صفحہ 73) دوسری طرف شاہجہان نے مراد بخش اور شجاع کو اورنگ زیب کے خلاف بھڑکایا اور ایسی چال چلی کہ اورنگ زیب کو مرصع تلوار اور مبارکباد کے پیغام بھیجنے کے ذریعے اپنے پاس بلا بھیجا لیکن حالات نے اپنا رخ ظاہر کر دیا تھا اب فاتح بیٹے کے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے والد گرامی کو اپنے خلاف سازشوں سے باز رکھنے کی کوشش کرے لہٰذا شاہجہان کو نظربند کرکے اپنے خلاف تنے جانے والے جال کو توڑ دیا تو یہ وقت اور حکمت کا تقاضا تھا اور یہ سب کچھ گویا حالات اور واقعات کا منطقی نتیجہ تھا کیونکہ شاہجہان کا جھکاؤ بہرحال داراشکوہ کی طرف حد سے زیادہ تھا ازیں پیشتر شاہجہان نے اورنگ زیب کو بلاوجہ دکن کی ولایت سے معزول کیا تھا۔ جب اسے قندھار اور وسطی ایشیا کی مہموں میں بھیجا گیا تو وہاں بھی عالمگیر کا حوصلہ بڑھانے کی بجائے اس کے حصے میں والد کی جانب سے طعن و تشنیع کے نشتر ہی

آئے۔ جن دنوں اورنگ زیب ملتان کا گورنر تھا اور اسے روپے کی ضرورت پیش آئی تو والد گرامی نے بالکل انکار کر دیا۔ اورنگ زیب نے دریائے سندھ کے دہانے پر ایک بندرگاہ بنانا چاہی تو اس ارادے پر ہی اس کی جواب طلبی کر لی گئی۔

(بحوالہ پرنس اورنگ زیب صفحہ 29 تا 34 از افتخار احمد غوری مطبوعہ کراچی 1962ء)

ان مسلسل زیادتیوں کے باوجود شہزادہ اورنگ زیب والد گرامی کا ہمیشہ ادب و احترام کرتا رہا اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لایا اس کے احترام والدین کا یہ حال تھا کہ وہ بادشاہ کی شکارگاہ میں داخل ہونا گستاخی خیال کرتا تھا اور اپنی سوتیلی ماؤں سے بھی بصد احترام پیش آتا اور جب مجبوراً اسے والد گرامی کو نظربند کرنا پڑا تو اس کو ساری سہولتیں مہیا کی گئیں اور جہاں آراء بیگم اس کی خدمت کیلئے موجود رہتی تھی۔ اگر کبھی پابندیاں سخت کی گئیں تو اس کی وجہ خود شاہجہان کا رویہ تھا جس کو دراصل داراشکوہ نے بے اختیار کر دیا تھا اور یہ اس کی صحبت میں "میرٹ" کو قتل کرنے پر تل گیا تھا۔ اگر اورنگ زیب والد گرامی کی سازش کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلا جاتا تو ہمارے معزز تاریخ نگار بڑے خوش ہو جاتے لیکن اگر اس نے اپنی جان بچانے کی تدبیر کر لی تو والد کی بے ادبی کا الزام لگانے پر مستعد ہو گئے۔ اس بات کا اعتراف تو منوچی بھی کرتا ہے کہ اورنگ زیب کو ملاقات کا شرف بخشنے کی دعوت کے موقع پر مسلح تاتاری خواتین کا پہرہ اس سازش کی اہم کڑی تھی تاکہ اسے گرفتار کر کے داراشکوہ کے حوالے کیا جا سکے۔

(منوچی' ج 1' صفحہ 291)

اب ذرا اس طرف بھی نظر ڈال لی جائے کہ شاہجہان نے بھی تو تخت کی خاطر اپنے بھائی شہریار اور دانیال کے بیٹوں کو قتل کروا دیا تھا اور یہی کچھ دوسرے مغل بادشاہوں نے اپنے اقتدار کی خاطر کیا تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ایک شخص کے برا ثابت ہو جانے سے دوسرا شخص اچھا ثابت ہو جاتا ہے تاہم صرف عالمگیر پر ہی کڑی تنقید اس لئے کی گئی کہ اس نے اسلام کی ترویج و ترقی کیلئے نہایت اہم قدم اٹھائے تھے اور نفاذ شریعت کیلئے فتاویٰ عالمگیر جیسی مستند اور معتبر کتاب تیار کروائی تھی جس کی اہمیت دنیا بھر میں آج بھی مسلمہ ہے۔

بھائیوں کا معاملہ : دارا تو الحاد میں ڈوب چکا تھا جس کی تفصیل گزر چکی ہے اس کی گرفتاری کے بعد علماء کے فتویٰ پر اسے قتل کر دیا گیا۔ مراد بخش کے ساتھ عالمگیر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کو حکومت میں سے حصہ دے گا اور کامیابی کی صورت میں کشمیر' پنجاب' ملتان اور گجرات کے علاقے اسے ملیں گے لیکن ساموگڑھ کی لڑائی کے فوراً بعد مراد بخش نے ایک دعوت دیکر بے صبری کے عالم میں اورنگ زیب کے آدمیوں کو اپنے ساتھ ملانے کی خفیہ سازش کی جس کا بروقت علم ہوتے ہی عالمگیر نے مراد بخش کو گرفتار کر لیا۔ مراد بخش ایک شراب خور شہزادہ تھا اس نے جہاں آراء کی سورت والی جاگیر کے منتظم علی نقی خاں کو بلاوجہ قتل کر دیا تھا اور اپنے خلاف کسی عدالت میں کارروائی بھی نہ ہونے دی تھی۔ اب وہ جو گرفتار ہوا تو علی نقی خاں کے

لڑکے نے عدالت میں نالش کر دی اور جرم ثابت ہونے پر عدالت نے اسے سزائے موت سنا دی۔ جس پر اسے موت کی سزا دے دی گئی۔ مراد بخش کو ایک سیاسی حریف کے طور پر قید کیا گیا تھا جبکہ موت کی سزا عدلیہ کے حکم پر دی گئی تھی۔

اسلامی پالیسی کیوں اختیار کی؟ : اورنگ زیب پر ایک الزام اسلامی پالیسی اختیار کر کے نفاذ شریعت کا اعلان کرنے سے متعلق بھی ہے۔ یہ الزام ہندو اور عیسائی مورخین کو واقعی بہت خوشی دیتا تھا کیونکہ ان کی خواہش تھی کہ ایک مغل حکمران اکبر اعظم کی پیروی کرلے تو ان کو قبول ہے اگر اسلامی قوانین پر چلے تو ان کیلئے سوہان روح ہے۔ جبکہ مغل حکمران خلافت اسلامیہ کے زیر رہ کر ان سے سند تقرری پانے کو ایک اعزاز سمجھتے تھے عالمگیر نے اسی (80) کے قریب ناجائز ٹیکس معاف کر دیئے تو ہندوؤں کو خوش ہونا چاہئے تھا کیونکہ ان کو بھی اس سے فائدہ پہنچا تھا لیکن انہوں نے تو ایک وطیرہ بنا لیا تھا کہ ہرحال میں اورنگ زیب اور اس کے اقدامات کی مخالفت کی جائے۔ رسم نو روز بند کرنے سے انہیں کیا نقصان تھا؟ اسلامی حکومت کے خلاف بطور اڈے استعمال ہونے والے مندروں کو گرانا گویا "مسجد ضرار" کو گرانے والی بات تھی جب اسلام فتنہ کو اتنا برا سمجھتا ہے کہ ایک اسلامی شعار (مسجد) کو بھی برداشت نہیں کرتا تو بھلا وہ کسی مندر کو کیسے برداشت کرنے کی اجازت دے سکتا ہے جبکہ قرآن کا کھلا حکم ہے کہ فتنہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے تک جہاد جاری رکھا جائے ورنہ ہندوؤں کی خبرگیری اور ان کی فلاح و بہبود کا اسے بہت خیال رہتا تھا۔

جزیہ کا نفاذ : برصغیر میں جزیہ صرف ان ہندوؤں سے لیا جاتا تھا جو اسلامی حکومت میں فوجی خدمات انجام دینے سے قاصر تھے اور جو فوجی خدمات انجام دیتے تھے ان سے جزیہ وصول نہ کیا جاتا۔ یہ حال سلاطین کے دور سے لیکر اکبر کے دور تک رہا۔ جس نے 1564ء میں اسے منسوخ کر دیا۔ اورنگ زیب چونکہ اپنے آپ کو اسلامی حکومت کا سربراہ سمجھتا تھا اس لئے اس نے جزیہ کی وصولی کا حکم دیا۔ یہ اسی طرح کیا جس طرح سرکاری طور پر مسلمانوں سے زکوٰۃ کی وصولی کا حکم نافذ کیا۔ یہ دونوں حکم اسلامی اصول کی بنیاد تھے لہٰذا ان کے نفاذ پر اورنگ زیب کو الزام دینا مناسب نہیں۔ جزیہ لگانے کی یہ وجہ نہ تھی کہ عالمگیر راجپوت سرداروں سے ڈرتا تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسے سترہ سال حکومت کرتے ہوچکے تھے جب جزیہ نافذ کیا کیونکہ اسے دکن کی مہمات کیلئے پیسے کی ضرورت تھی۔

دکن کی اسلامی ریاستیں اور اورنگ زیب : ایک الزام یہ ہے کہ اورنگ زیب نے دکن کی مسلمان ریاستوں کو اس لئے ختم کیا کہ وہ شیعہ ریاستیں تھیں۔ دکن میں پانچ ریاستیں تھی۔

(1) گولکنڈہ (2) بیجاپور (3) خاندیس (4) برار (5) احمد نگر

یہ ریاستیں آپس میں لڑتی بھڑتی رہتی تھیں حتیٰ کہ جب علی عادل شاہ نے حسین نظام

کی ستمگری سے تنگ آکر رام راج کو مدد کیلئے بلایا تو ہندوؤں نے احمد نگر میں آکر مسلمانوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا اس کو "فرشتہ" نے اس طرح رقم کیا ہے:

"ہندو فوجی مسجدوں میں بتوں کی پوجا کرتے تھے اور بھجن گاتے تھے اور چونکہ علی عادل شاہ روکنے کی ہمت نہ رکھتا تھا اس لئے جان بوجھ کر تغافل سے کام لیتا تھا۔ ان خانہ جنگیوں کی وجہ سے مغلوں کو ان ریاستوں کے انتظام میں مداخلت کا موقع ملا۔"

سب سے پہلے اکبر اعظم نے ان پر قبضہ کیا۔ جہانگیر کے عہد میں ان ریاستوں سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنے کی بنیاد پڑی۔ یہی صورتحال شاہجہان کے دور میں رہی لیکن ان ریاستوں میں ابن الوقت قسم کے حکمران تھے جو بغاوتیں کرتے رہتے اور مجبوری کے تحت اطاعت قبول کر لیتے اور پھر جب موقع ملتا دشمنی پر اتر آتے چنانچہ عالمگیر سے قبل ہی پانچ میں سے تین ریاستوں کو مغل سلطنت میں شامل کر لیا گیا تھا۔

عالمگیر کے زمانے میں بیجاپور اور حیدر باد کی ریاستیں خودمختار رہ گئی تھیں۔ اسی اثنا میں سیواجی مرہٹہ کے والد ساہو نے سر اٹھایا جسے بیجاپور کے والی علی عادل شاہ نے پونہ اور سوپہ نامی دو صوبے جاگیر کے طور پر عطا کئے تھے۔ سیواجی نے ان علاقوں میں بہت سے قلعے بنوائے۔ جب عادل شاہ بستر مرگ پر تھا تو سیواجی نے عادل شاہ کے علاقوں میں گھس کر قبضہ کر لیا اور اپنی جاگیر کو وسعت دیکر اس میں چالیس قلعے تعمیر کروائے۔ جب عادل شاہ فوت ہوا تو اس کا جائز وارث نہ ہونے کی وجہ سے سکندر نام ایک مجہول النسب نابالغ لڑکے کو اس کے تخت کا وارث بنا دیا گیا۔ جب سکندر بالغ ہوا تو اس نے افضل خاں کو سیواجی کی دست درازیوں کی سزا دینے کیلئے بھیجا جس کو سیواجی نے دھوکے سے قتل کر دیا۔ اس کے بعد سیواجی بھی طبعی موت مر گیا اور اس کا بیٹا سنبھا اس کا جانشین ہوا۔

اب سکندر سنبھا سے سمجھوتہ کرکے ایک سازش کے تحت مغلوں کے خلاف سنبھا کو مدد دیتا رہا۔ عالمگیر نے بار بار سکندر کو متنبہ کیا کہ اس کی پیٹھ ٹھوکنے سے باز آجائے لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ عالمگیری خطوط کو درخور اعتنانہ گردانتا رہا۔ چنانچہ مجبوراً عالمگیر نے بیجاپور کو فتح کرکے ممالک محروسہ میں شامل کر لیا تاہم سکندر کو سکندر خاں کے خطاب سے نوازا اور اس کی عزت و خاطر مدارات بھی خوب کی۔

حیدر آباد ان دنوں ابو الحسن عرف تانا شاہ کے زیر تسلط تھا جسے قسمت نے قطب شاہ کی حکومت کا والی بنا دیا تھا۔ جس کی اولاد نرینہ نہ تھی۔ ابو الحسن بچپن میں قلندروں کے ساتھ آوارہ پھرتا رہا تھا اور تخت نشینی کے بعد بھی اس کی یہی شان رہی اس کی عیش پرستی نے ریاست کو تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا اور ہر طرف فسق و فجور کا دور دورہ ہوگیا۔ ابوالحسن کو جس نے حکومت دلوائی تھی اس کا نام سید مظفر تھا لیکن ابوالحسن نے اس محسن کو معزول کرکے مادنا نامی ہندو کو وزیراعظم بنا لیا اور سب اختیار اسے سونپ کر خود رنگ رلیوں میں مشغول ہوا۔ عالمگیر کو

اقتدار میں آئے بیں سال گزر چکے تھے جب ابوالحسن نے سیواجی (جو عالمگیر کے دربار سے بھاگ کر باغی ہوگیا) سے مل کر شاہی فوجوں پر حملے کرنے میں مددمعاون ثابت ہونے لگا سیواجی نے مغل سلطنت کے اندر واقع پرگنا جالنا پر حملہ کرکے اسے تہس نہس کر دیا۔

(ماثرالامرا' جلد اول' صفحہ 345 تا 349)

سیواجی کی موت کے بعد سنبھاجی کو بھی ابوالحسن مدد دیتا رہا اور ایک لاکھ رائج الوقت طلائی سکہ "نہون" سے بھی اس کی مدد کی۔ آخر عالمگیر کو اس مرہٹوں کی آلہ کار ریاست پر بھی قبضہ کرکے شامل سلطنت کرنا پڑا۔ اورنگ زیب پر ایک الزام یہ ہے کہ اس نے ہندوؤں کے تہواروں پر پابندیاں لگائیں حالانکہ جب وہ شراب پی کر بازاروں میں غل غپاڑہ سے امن عامہ کو تباہ کرنے لگے تو اورنگ زیب نے حکم دیا کہ ہندو اپنے تہوار گلیوں محلوں کی بجائے کھلی جگہوں پر منعقد کیا کریں تاکہ شہری علاقوں میں امن و امان قائم رہ سکے۔

ہندوؤں کو ملازمت سے نکالنا : یہ الزام بھی سراسر غلط ہے۔ محکمہ مال پر ہندو چھائے ہوئے تھے جو کسانوں کو دو دو ہاتھوں سے لوٹتے تھے۔ خصوصی جانچ پڑتال کے بعد قصور واروں کا احتساب کوئی بری بات نہ تھی۔ ایسی تادیبی کارروائیاں ہر حکومت کیا کرتی ہے۔ جو نظم و نسق کا حصہ ہوتی ہیں۔ ہندوؤں کو ملازمتوں سے نکالنے کا الزام اس طرح بھی غلط ثابت ہوتا ہے کہ اکبر کے عہد میں ہندوؤں کی تعداد باون (52) تھی اور جبکہ اورنگ زیب کے عہد میں اکسٹھ (61) تھی۔ اسی طرح منصب داروں کی تعداد اکبری عہد میں چونسٹھ (64) تھی جو اورنگ زیب کے دور میں ایک سو اسی (180) تک جا پہنچی۔

غیر مسلموں کی بغاوتیں : یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ بقول تارا چند (271 A short Historiy of Indian People, Page) ست نامیوں' ہندو جاٹوں اور راجپوتوں کے بعض طبقوں کی جو بغاوتیں ہوئیں وہ انفرادی حیثیت سے تھیں اور ان کا سیاسی اور مذہبی اعتبار سے کوئی تعلق نہ تھا۔

علمی سرگرمیاں اور اورنگ زیب : اورنگ زیب خود بھی ایک عالم اور فاضل حکمران تھا بہترین اساتذہ سے تعلیم پائی تھی۔ نیز وہ علما اور مشائخ کا قدر دان تھا۔ ملا عبداللہ سیالکوٹی' سید عبداللطیف اور حضرت سیف الدین سرہندی کی صحبتوں سے اکثر فیض یاب ہوتا تھا (شبلی)

وہ عربی اور فارسی میں یکساں عبور رکھتا تھا۔ ترکی' ہندی اور ہندوستانی (اردو) پر بھی دسترس اسے حاصل تھی اور اقتدار میں آنے کے بعد بھی اس کی ذاتی علمی سرگرمیاں جاری رہیں۔ حتیٰ کہ تخت نشینی کے بعد قرآن حکیم کا جو حصہ ازبر یاد نہ تھا اسے بھی حفظ کیا۔ یہ 1062 ھ کی بات ہے جس کی تاریخ **ستقرئنک فلاتنسی** (1062 ھ) نکالی گئی اور جب حفظ کی تکمیل کی تو اس کی تاریخ "لوح محفوظ" (1072 ھ / 1662ء) کہی گئی۔ (ماثر عالمگیری' صفحہ 532)

اورنگ زیب کے دور میں سرکاری مدرسے بھی تھے اور نجی بھی جو علماء نے قائم کر رکھے تھے۔ عالمگیر سرکاری مدرسوں کے اخراجات برداشت کرنے کے علاوہ کبھی کبھی نجی مدرسوں کی امداد بھی کرتے تھے۔ مثلاً سیف خاں کے مدرسہ کو ایک ہزارہ پانچ سو اسی (1580) روپے کی مدد دی۔ مدرسہ و مسجد ہدایت بخش کی تعمیر و مرمت کیلئے ایک لاکھ چوبیں ہزار روپے دیئے گئے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی نے اپنی کتاب تاریخ ملت (ج 11' صفحہ 163) میں لکھا ہے کہ موضع سوندرہ (پرگنہ سانولی) اور سلیمہ (پرگنہ کڑا) کے مدرسوں کیلئے بھی عالمگیر نے یومیہ امداد مقرر کر رکھی تھی۔

طریق تعلیم : اورنگ زیب کے عہد میں مسجد مکتبوں کا زیادہ رواج تھا۔ جہاں ہندو اور مسلمان طلباء ابتدائی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ بعد ازاں وہ اپنے اپنے دینی مدرسوں میں چلے جاتے۔ مسلمانوں کو حدیث' فقہ' منطق' حساب وغیرہ کی تعلیم دی جاتی جبکہ ہندو طلباء شاستر کے علاوہ طب اور نجوم میں بھی مہارت حاصل کرتے تھے اور بنارس ہندو مدرسوں کا اہم مرکز تھا جبکہ اسلامی علوم کی تحصیل کا سب سے بڑا مرکز دہلی میں تھا۔ مدرسہ رحیمیہ دہلی اسی زمانے میں قائم ہوا۔ فرنگی محل لکھنؤ کا مدرسہ بھی اسی دور کی یادگار ہے۔ اس کی شاندار عمارت عالمگیر نے عطا کی تھی۔ درس نظامیہ کا اجرا ہوا۔ جس نے آگے چل کر اسلامی مدرسوں میں بہت رواج پایا حتیٰ کہ آج کل بھی درس نظامی کی کلاسیں ہندوستان پاکستان کی درسگاہوں میں جاری ہیں۔ درس نظامی سے متعلقہ کتابیں بھی عالمگیر کے عہد میں مدون ہوئیں۔

(شیخ محمد اکرام' آب کوثر' صفحہ 477)

اسی عہد میں ملا محسن (متوفی 1707ء) نے شیعہ حضرات کے اعتراضات کے جواب میں مدلل کتاب رد شیعہ تحریر کی۔ دوسری نجم القرآن مولانا محمد مصطفیٰ بن محمد سعید نے لکھی جس میں قرآن حکیم کے مضامین کی فہرست (انڈکس) مرتب کی گئی تھی۔ تیسری اہم کتاب فتاوی عالمگیری (فتاویٰ ہندی) بھی عالمگیر نے اپنی خاص کوشش سے مرتب کروائی۔ جو اس کی ذاتی نگرانی میں تحریر کی گئی۔ مولانا اسحاق بھٹی (برصغیر پاک وہند میں علم فقہ' صفحہ (345 تا 380) لکھتے ہیں کہ اس کام پر اس دور میں دو لاکھ روپے خرچ کیے۔

عالمگیر کے حکم پر مولانا عبداللہ رومی چلپی نے فتاوی عالمگیری کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا جو آج کل ناپید ہے۔ اس کے بعد قاضی القضاۃ مولانا نجم الدین ثاقب (متوفی 1229ھ) نے لارڈ سر جان شور (1792ء تا 1798ء) کے مشورے سے فارسی میں ترجمہ کیا اور کلکتہ سے اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے تھے۔ فتاویٰ عالمگیری کا اردو میں پہلا ترجمہ سید امیر علی ملیح آبادی نے کیا تھا۔ (ایضاً" صفحہ (342 تا 246) اس فقہی کام کو نہ صرف برصغیر میں بلکہ دنیا بھر میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

عالمگیری عہد میں شیخ غلام نقشبندی لکھنوی (م 1124)' ملا شیخ احمد جیون امیٹھوی (م 1138 ھ)' مولانا نور الدین (م 1155 ھ) اور اصغر قنوجی (م 1140 ھ) کے نام بطور مفسرین قرآن قابل ذکر ہیں۔

محدثین میں شیخ نور الحق (ابن شیخ عبدالحق محدث دہلوی) حاجی صبغتہ اللہ کے نام ملتے ہیں۔ اسی طرح فقہاء میں افضل العالی ملاوجیہہ الدین' مفتی شیخ عیسیٰ' محدث شہابی گویاموی وغیرہ جبکہ علماء میں بے شمار نام شہرت یافتہ ہیں۔

موسیقی اور عالمگیر : موسیقی کو دربار میں جو اہمیت حاصل تھی اورنگ زیب نے اس کی حوصلہ شکنی کی اور موسیقاروں کے احتجاجات کو بھی اہمیت نہ دی تاہم وہ خود فن موسیقی کا ماہر تھا۔ اس نے دربار سے موسیقی کو نکال دیا لیکن اس کے بعد درباری موسیقار ادھر ادھر بکھر گئے جن کی سرپرستی امرائے مملکت کرتے رہے دیگر فنون لطیفہ بھی عالمگیری دوری ترقی پر رہے اور ثقافتی سرگرمیاں بھی عروج پر رہیں۔

سیرت و کردار : اورنگ زیب عالمگیر برصغیر پاک و ہند کا عظیم حکمران تھا جس نے چالیس سال بطور شہزادہ اور پچاس سال بطور بادشاہ وقت گزارا۔ وہ ایک مسلمان بادشاہ تھا اور قرآن سنت کے نفاذ کیلئے کوشاں رہتا تھا یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم مورخین اورنگ زیب پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ دراصل ان مورخین کو شریعت اسلامی نافذ کرنے کا عزم رکھنے والے حکمران عالمگیر سے بیر ہے اور یہ بیر ایک مسلمان حکمران سے بیر ہے کیونکہ وہ اسلامی قانون کل نفاذ چاہتا ہے۔ یہ بیر اکبر اعظم جیسے نام نہاد مسلمان حکمران سے ان مورخین کو اس لئے نہ تھا کہ وہ ان کی ڈگر پر اسلامی قوانین کے خلاف خودبخود چل رہا تھا۔ اب جس دشمن کو گڑ کھلا کر مار ڈالنا آسان ہو اسے قتل کرنے کیلئے زہر خورانی کا سہارا لینے کی کیا ضرورت ہے یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم مورخین اکبر اعظم کی تحسین میں تو رطب اللسان ہیں لیکن اورنگ زیب کے اچھے کارنامے بھی انہیں سانپ بن کر ڈستے ہیں۔ علامہ اقبال نے اورنگ زیب کو ان لفظوں میں خراج تحسین ادا کیا ہے

درمیان　کار　زار　کفرو　دیں
ترکش　مار　اخدنگ　آخر　میں

یعنی کفرو اسلام کے معرکہ کارزار میں اورنگ زیب ہی ایک بہادر اور مسلمان حکمران تھا جو اہل اسلام کیلئے آخری تیر کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ وہ اسلام اور اسلامی کاز کے ساتھ تہ دل سے منسلک تھا۔

وہ بحیثیت مسلمان حکمران۔۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی روایات امامت اور جہانداری کا پاسبان تھا۔ وہ برصغیر کی اسلامی سلطنت میں اسلام کا بول بالا چاہتا تھا۔ شریعت کا مکمل نفاذ اس کی زندگی کا مقصود تھا۔ فیروز شاہ تغلق (1351ء تا 1388ء) کے بعد برصغیر میں یہ دوسرا مسلمان حکمران تھا جس نے اپنی اسلامی سلطنت میں اسلامی قوانین کو نافذ کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا اور اس کے ان اقدامات سے غیر مسلموں کو تکلیف پہنچنا قدرتی امر تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف ہندو راجپوت ان کے دشمن تھے دوسری طرف سکھوں نے معاندانہ رویہ اختیار کیا تیسری طرف مرہٹوں نے اپنے باغیانہ جوہر دکھائے اور چوتھی جانب

داراشکوہ جیسے ملحد نے اس کا راستہ روکنے کی بھرپور کوشش کی حتیٰ کہ عالمگیر کے بیٹے شہزادہ محمد سلطان نے بغاوت کی تو اسے عالمگیر نے عمر بھر کیلئے قید میں ڈال دیا اور دوسرے بیٹے معظم شاہ نے قطب شاہ سے مل کر سازش کی ٹھانی تو اسے سات برس تک قید میں رکھا اور اس کی بیٹی زیب النساء نے جب اپنے باغی بھائی شہزادہ اکبر کی حمایت کی تو اسے بھی سلیم گڑھ کے قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا۔

جو حکمران انتظامی معاملات میں اپنی حقیقی اولاد کو بھی نہ بخشتا ہو اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کسی اور کو بخش دے گا فضول ہے۔ حکومتوں کا استحکام عدل و انصاف میں پوشیدہ ہے۔ بددیانتی تباہی کا سبب بنتی ہے۔ ایک بالغ نظر اور باہمت حکمران کا فرض ہے کہ وہ طمع اور ہوس کے شکاریوں کو پنپنے کا موقع نہ دے۔ وہ آخری عمر تک اپنے سارے فرائض بڑے انہماک اور جانفشانی سے ادا کرتا رہا اور آخری وقت میں بھی اپنی جان جب جان آفرین کے حوالے کی تو وہ میدان کارزار میں تھا۔

عہد عالمگیر کے بعض دیانتدار اور دلیر عہدیدار : میاں عبدالرشید مرحوم اپنے کالم نور بصیرت (مطبوعہ نوائے وقت لاہور مورخہ 96-11-27) میں لکھتے ہیں:

"بندہ پادشاہی"

اورنگزیب عالمگیر کے عہد حکومت میں مرزا اعتقاد خان پنج ہزاری منصب رکھتا تھا مگر انتہا درجہ کا فقیر دوست شخص تھا۔ دہلی کا واقعہ ہے گلی میں سے کوئی مجذوب گزرا اعتقاد خاں کو خبر ہوئی تو جیسے بیٹھا تھا ویسے ہی ننگے سر اور ننگے پاؤں مجذوب کو دیکھنے کیلئے اٹھ دوڑا۔ بادشاہ کو لمحہ لمحہ کی خبر پہنچتی تھی۔ اس نے مرزا کے اس فعل کو ناپسند کیا۔ اس کا خیال تھا عمائدین حکومت کے اس طرح باہر نکلنے سے حکومت کے رعب داب میں فرق آتا ہے۔ اعتقاد خان بادشاہ کے پاس گیا تو بادشاہ نے کہا "کسے آنجا از بندہ ہائے پادشاہی ہم بودند؟"

(کیا حکومت کے ملازموں میں سے کوئی اور بھی وہاں تھا؟)

اعتقاد خان نے کہا "یکے ہمیں روسیاہ بود۔ دیگر ہمہ بندہ ہائے خدا بودند۔"

(صرف یہی ایک روسیاہ بادشاہ کا بندہ تھا۔ باقی سب اللہ تعالیٰ کے بندے تھے) بادشاہ خاموش ہوگیا۔

محمد یار خان : عہد عالمگیر کا ایک اور نامی امیر محمد یار خان تھا۔ عہدہ داروغگی پر فائز ہوا مگر دربار میں بہت کم جاتا تھا۔ حاسدوں نے اس کے خلاف بادشاہ کے کان بھرے۔ اسے پتہ چلا تو گھر سے استعفیٰ لکھ بھیجا اور کہا "اپنے فرائض انجام دوں یا درباداری کروں۔"

بادشاہ نے شہزادہ محمد اعظم کو بھیجا کہ اسے کہہ سن کر ساتھ لاؤ مگر وہ نہ مانا کئی برس بعد بادشاہ نے بڑے اصرار کے ساتھ اسے دہلی کی صوبیداری عطا کی جو اس نے قبول کر لی۔

امانت خاں میرک : عہد عالمگیر کا ایک اور لائق اور دیانتدار عہدیدار امانت خان میرک

تھا۔ ابتداء میں داروغہ محلات تھا۔ اس کے دستخط و مہر کے بغیر خواجہ سراؤں اور بیگمان کو کوئی چیز نہیں مل سکتی تھی چونکہ اسم بامسمی تھا نہ خود حرام کھاتا تھا نہ کسی اور کو کھانے دیتا اس لئے سب لوگ اس کے دشمن ہوگئے۔ اسے معلوم ہوا تو استعفیٰ لکھ بھیجا۔ بادشاہ نے نہ صرف اس کا استعفیٰ واپس کر دیا بلکہ اسے لاہور کی صوبیداری پر فائز کر دیا۔

ایک مرتبہ ماتحت حکام نے بقایا مال گری اور جدید مطالبہ مالیہ کی عدم وصولی پر اتنے لوگ قید خانہ میں بھیجے کہ جگہ تنگ ہوگئی۔ امانت خان کو خبر ملی تو خود قید خانہ میں گیا۔ قیدیوں سے بالمشافہ بات چیت کی۔ ان کے عذر سنے بہت سے قیدیوں کا مالیہ کم کرکے ان سے بالاقساط وصولی کرنے کے احکام جاری کئے اور انہیں رہا کر دیا۔

امانت خان کی گورنری کے زمانے کے دوران ایک شخص کے بارہ میں حکم پہنچا کہ اسے بادشاہ کے پاس حاضر کیا جائے۔ وہ بڑا ڈرا امانت خاں سے درخواست کی کہ وہ اس کی جان و مال کا ضامن بنے۔ اس نے کہا جو شخص اپنے باپ اور بھائیوں کا لحاظ نہیں کرتا میں اس کے بارہ میں کیسے ضمانت دے سکتا ہوں۔ پرچہ نویسوں نے یہ بابت بادشاہ کو لکھ بھیجی۔ اس نے امانت خان کو معزولی اور ضبطی جاگیر کا حکم جاری کر دیا۔ پھر خیال آیا ایسا بے لاگ شخص کہاں ملے گا جو میرا بھی لحاظ نہیں کرتا۔ قاصد کو راستہ ہی سے واپس بلا لیا اور امانت خاں کو نہ صرف عہدہ پر بحال رکھا بلکہ اس کے اعزاز میں اضافہ بھی کیا۔

عالمگیر کی مذہبی رواداری : شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر چونکہ پابند مذہب اور متشرع مسلمان تھا اس لئے مخالفین نے اس کو تعصب کے الزامات سے داغ دار بنانے کی بے حد کوشش کی ہے حالانکہ اس کی حکمت عملی بھی دوسرے شاہان مغل کی طرح روادارانہ و منصفانہ تھی بلکہ دین اسلام کے اصول اساسی پر مبنی ہونے کی وجہ سے زیادہ استوار اور قابل اعتماد تھی۔ اس پر مندروں کو گرانے کا الزام قطعی طور پر غلط ثابت ہوچکا ہے۔ اس کے متعدد فرامین اس کی اسلامی رواداری کے شاہد عادل ہیں۔ مثلاً 1511ء میں مشہور مستشرق لفٹیننٹ کرنل فلٹ کو بنارس جانے کا اتفاق ہوا جہاں علمی تحقیق و تفتیش کے سلسلے میں انہیں عالمگیر کے ایک فرمان کی عکسی نقل ہاتھ لگی۔ یہ فرمان ابو الحسن حاکم بنارس کے نام تھا۔ کرنل فلٹ نے تلاش جاری رکھی بالآخر انہیں خان بہادر شیخ محمد طیب کوتوال شہر کی امداد سے اصل فرمان دیکھنے کا موقع بھی مل گیا۔ جس کی پشت پر شہزادہ محمد سلطان کی مہر بھی ثبت تھی۔ فلٹ نے یہ فرمان انگلستان کے اخباروں میں چھپوا دیا۔ اس فرمان عالمگیری کا خلاصہ ترجمہ درج ذیل ہے:

> شرع شریف ملت حنیف کی رو سے نئے مندر نہیں بنائے جا سکتے لیکن پرانے مندروں کو توڑنا بھی جائز نہیں ہے ہم نے سنا ہے کہ بعض عمال سرکاری ازراہ خیر جبر و تعدی قصبہ بنارس اور نواحی مقامات کے ہندوؤں اور برہمنوں پر جو قدیم بت خانوں کے پروہت ہیں تشدد کرتے ہیں اور انہیں پروہتائی سے علیحدہ کر دینا چاہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے

کہ وہ بے چارے پریشان ہو کر مصیبت میں مبتلا ہو جائیں۔ اس لئے تم (ابو الحسن حاکم بنارس) کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس فرمان کے پہنچتے ہی ایسا انتظام کرو کہ کوئی شخص تمہارے علاقے کے برہمنوں اور دوسرے ہندوؤں پر جبر و تشدد نہ کر سکے اور ان کی تشویش کا باعث نہ ہو تاکہ یہ گروہ بدستور سابق اپنے اپنے مقامات و مناصب پر قائم رہ کر اطمینان قلب کے ساتھ ہماری دولت خداداد کے حق میں مصروف دعا رہے۔ سا بابت میں مزید تاکید جانو۔ (15 جمادی الاخر 1069 ھ)

(مغل ایمپائر بابر سے اورنگ زیب تک صفحہ (286 تا 298)

10 رجب 1070ء کے ایک عالمگیری فرمان میں پالیتانہ (جس کو شطرنج بھی کہتے ہیں) کے مندر، گاؤں اور پہاڑی پر احمد آباد کے شانتی داس جوہری کے قبضے کی تصدیق کی گئی ہے اور جوناگڑھ کے مندر گرنار اس کی پہاڑیوں اور سروہی کے آبوجی بھی اسی پروہت کو عطا کر دیئے گئے ہیں۔ گوہاٹی (آسام) میں اومانند کے مقام پر شیوجی کا مندر ہے جس کے دلائی (یعنی گدی نشین) کے نام عطائے اراضی کی ایک سند بھی اورنگ زیب ہی کی عطا کی ہوئی ہے۔ 1090 ھ اور 1098 ھ میں بھگونت اور رام جیون گسائیں کے مقبوضات وقف کی تصدیق کی گئی اور انہیں ہر قسم کی مداخلت سے محفوظ قرار دیا گیا ہے۔ یہ فرمان بھی عالمگیری کے ہیں۔

(آرکائیوز آف مغل ایمپائر باب چہارم)

غیر مسلم مورخین کی شہادت : اس قسم کے اور بھی متعدد فرامین و اسناد محفوظ ہیں جن سے حضرت عالمگیر کی مذہبی رواداری کے نہایت روشن ثبوت مہیا ہوتے ہیں۔ متعدد غیر مسلم مورخین اور سیاح مثلاً لین پول، کپتان ہملٹن، ڈاکٹر برنیئر، الفنسٹن، پروفیسر آرنلڈ، پروفیسر جدوناتھ سرکاری اس امر پر متفق ہیں کہ عالمگیر پر مذہبی تعصب اور عدم رواداری کا الزام قطعاً غلط ہے۔ مختصر اقتباسات ملاحظہ ہوں :

لین پول : "سیاحوں کی مخالفانہ نکتہ چینیاں اورنگ زیب کے خلاف صرف زمانہ شہزادگی تک محدود ہیں۔ وہی سیاح جب اس کے زمانہ شہنشاہی کا حال لکھتے ہیں تو بجائے کلمات تحسین کے اور کچھ نہیں لکھتے۔ اس کے پچاس برس کے طویل عہد حکومت میں ایک بھی ظالمانہ فعل ثابت نہیں ہے حتیٰ کہ ہندوؤں کے ستانے میں بھی جو اس کی دینداری کا ایک جزو تھا (مراد صرف جزیہ ہے) سب کو تسلیم ہے کہ کوئی قتل یا جسمانی ایذا رسانی ظہور میں نہیں آئی۔ (کتاب سوانح عالمگیر)

کپتان ہملٹن (سیاح) : حکومت کا مسلمہ مذہب اسلام ہے لیکن تعداد میں دس ہندوؤں کے پیچھے ایک مسلمان ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پوری طرح سے برتی جاتی ہے۔ وہ برت رکھتے ہیں اور تہواروں کو اسی طرح مناتے ہیں جس طرح ہندوؤں کی بادشاہی کے زمانے میں مناتے تھے۔ وہ اپنے مردوں کو جلاتے ہیں لیکن ان کی بیویوں کو یہ اجازت نہیں کہ اپنے مردہ

شوہروں کے ساتھ ستی ہوں۔

(سفر نامہ ہملٹن' جلد اول' صفحہ 127 - 128)

شہر سورت میں تخمیناً سو مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں لیکن ان کے درمیان اعتقادات و عبادات کے متعلق کبھی کوئی لڑائی نہیں ہوتی۔ ہر ایک کو پورا اختیار ہے کہ جس طرح چاہے اپنے طریقے سے اپنے معبود کی پرستش کرے۔ صرف اختلاف مذہب کی بنیاد پر کسی کو تکلیف دینا اور آزار پہنچانا ان (مسلمانوں) میں بالکل مفقود ہے۔"

(سفر نامہ' جلد اول' صفحہ 162)

ڈاکٹر برنیئر : (فرانسیسی سیاح جو اورنگ زیب کے زمانے میں یہاں موجود تھا۔) سلاطین مغلیہ اگرچہ مسلمان ہیں لیکن ان پرانی رسوم کی آزادانہ بجا آوری کو یا تو اس خیال سے منع نہیں کرتے کہ ہندوؤں کے مذہبی معاملات میں دست اندازی کرنا ہی نہیں چاہتے یا دست اندازی کی جرات نہیں رکھتے۔

(سفر نامہ' جلد دوم' صفحہ 56)

الفنسٹن : یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کسی ہندو کو اس کے مذہب کی بنا پر قتل' قید یا جرمانہ کی سزا دی گئی ہو۔ یا کسی شخص پر علانیہ اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کی وجہ سے اعتراض کیا گیا ہو۔

(تاریخ ہند)

ٹی ڈبلیو آرنلڈ : "جہاں تک مجھے پتہ چلا ہے اورنگ زیب کے عہد کی تاریخوں میں کسی کو بہ جبر مسلمان کرنے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔- عالمگیر کو کسی شخص نے عرضی دی کہ دو پارسی ملازموں کو جو تنخواہ تقسیم کرنے پر مقرر تھے آتش پرستی کی پاداش میں موقوف کر دیا جائے۔ عالمگیر نے عرضی پر لکھا "مذہب کو دنیا کے کاروبار میں دخل نہیں نہ ان معاملات میں تعصب کو جگہ مل سکتی ہے اگر عرضی دہندہ کی دلیل کو درست مانا جائے تو ہم کو چاہئے تھا کہ اس ملک کے تمام راجاؤں اور ان کی رعیت کو غارت کر دیتے مگر یہ کیونکر ہو سکتا تھا بادشاہی نوکریاں لوگوں کو ان کی لیاقت کے موافق ملیں گی کسی اور لحاظ سے نہیں مل سکتیں۔"

(ترجمہ پریچنگ آف اسلام' صفحہ 280)

نظم حکومت میں ہندو : یہ تو مذہبی رواداری کی داستان تھی باقی رہا ہندوؤں کے نظم و نسق حکومت میں شامل رکھنا تو اس اعتبار سے پوری تاریخ شاہد ہے کہ محمد بن قاسم سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کوئی مسلمان سلطان' کوئی مسلمان تاجدار' کوئی مسلمان امیر ایسا نہیں گزرا جس کی سرکار میں ہندو ملازم اور اہلکار زیادہ سے زیادہ دخیل نہ تھے۔ محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کرنے کے بعد نظم امور کے اہم ترین شعبے برہمنوں کے سپرد کئے۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے ہی میں ہندو افواج اسلام میں بھرتی کئے جاتے تھے۔ سلطان مسعود غزنوی کے عہد میں سند (سپہ

سالار کی وفات پر تلک کو ہندو فوجوں کا افسر بنا کر اسے نیالتگین والی ہند کی سرکوبی پر مامور کیا جا
ہے۔ خاندان غلاماں کے زمانے میں بھی اسلامی فوجوں کے ساتھ ساتھ ہندو فوجیں موجود تھیں
جلال الدین فیروز شاہ خلجی کے خلاف ملک چھجووالی اودھ نے اپنی تخت نشینی کا اعلان کیا تو اس کی
فوج بھی زیادہ تر ہندوؤں ہی سے بھرتی کی گئی تھی۔

سرکاری کارندوں اور ملازموں میں خوتوں اور مقدموں اور پٹواریوں سے لے کر اوپر
تک منشی، متصدی اور اہل کار زیادہ تر ہندو ہوتے تھے اور دفاتر کی ترتیب و تنظیم کا اکثر کام انہی
کے سپرد کیا جاتا تھا۔ مغلوں کے زمانے میں ہندو وزارت، نیابت اور سپہ سالاری تک کے عہدوں
پر فائز رہے۔ بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں سب کے معتمد علیہ کار پردازوں میں خاصی تعداد
ہندوؤں کی تھی۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب عالمگیر نے بھی جے سنگھ اور جسونت سنگھ کو بڑے
بڑے مناصب دے کر فوجوں کی جرنیلی تفویض کر رکھی تھی اور ہندو منصب داروں کا تو کچھ شمار
ہی نہ تھا۔

اس کے علاوہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان انفرادی تعلقات اور عدل و انصاف
کے روشن ترین واقعات کی تفاصیل سے کتب تاریخ بھری پڑی ہیں جن سے ظاہر ہے کہ مسلمان
سلاطین و امرا اس ملک کو اپنا وطن اور اس کے تمام باشندوں کو بلا امتیاز مذہب و ملت اپنے
برادران وطن سمجھتے تھے۔ اور ان کا سلوک ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ قطعاً مساوی تھا۔
آج بھی ہندوستان اور پاکستان میں ہزاروں ہندو خاندان ایسے ہیں جو اعتراف کرتے ہیں کہ ان
کے بزرگوں کو ہندوستان کے تاجداران اسلام نے مورد لطف و عنایات بنا کر انہیں خاک سے لاکھ
بنا دیا تھا۔

باب 2

تاریخی دستاویزات کا تذکرہ

(1) خافی خاں

خافی خاں یا خوافی خاں جس کا اصل نام محمد ہاشم نظام الملکی تھا جو ایک مورخ تھا یہ شخص خاف یا خواف کے ایک خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو کہ خراسان میں ہے۔ خاف یا خواف مشرقی ایران کا ایک ضلع ہے۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ' جلد 8' صفحہ 818)

خاف یا خواف کی تاریخی حیثیت : یہ ایران کے صوبہ خراسان کا ایک قصبہ یا شہر ہے۔ اس کا ذکر سب سے پہلے المقدسی نے خواف کے نام سے نیشاپور کے ایک ضلع کی حیثیت سے کیا۔ اس نے کہا کہ یہ چھوٹا سا شہر ہے۔ جہاں انار اور انگور بہت ہوتے ہیں اور انگوروں کو سکھا کر کشمش بنائی جاتی ہے۔ اس نے ضلع کا صدر مقام سلومک نامی شہر بتایا ہے۔ یاقوت حموی کا بیان ہے کہ اس کی ایک سرحد ضلع ہرات میں واقع بوشنج نامی شہر سے ملتی ہے۔ جبکہ دوسری سرحد "زوزن" سے ملتی ہے۔

القزوینی کا بیان ہے کہ خواف۔۔۔۔ نسا نامی قصبہ کے پاس تھا جو بڑا شہر تھا اور اس کے ساتھ بہت سے گاؤں' باغات اور چشمے تھے۔ یہ غالباً وہی مقام ہے جس کا ذکر سید المرتضٰی نے خاف کے نام سے کیا ہے۔ اس کے بقول یہ عجم کی سرزمین میں ایک گاؤں ہے۔

موجودہ خاف بحر جرجان سے ہرات کو جانے والی سڑک پر واقع ایک جگہ ہے اور اس کا محل وقوع ترشیز اور قلعہ ناضر کے درمیان ھری رود کی ایک معاون ندی کے کنارے ہے۔ پرل برگ (PRELL BERG) نے اس کی آبادی پندرہ ہزار لکھی ہے جبکہ کلارک اسے پانچ سو گھروں پر مشتمل قصبہ بتاتا ہے اور اس کے گرداگرد باغات کی خبر دیتا ہے۔ خافی خاں یا خوافی خاں انہی قصبات میں رہنے والے کسی خاندان کا فرد تھا کہتے ہیں کہ خافی خاں کا لقب ہاشم خاں نظام الملکی کو محمد شاہ نے دیا تھا۔ (ایضاً)

خافی خاں خواجہ میر کا بیٹا تھا۔ خواجہ میر شاجہان بادشاہ کے چھوٹے بیٹے مراد بخش کا مصاحب اور ہمراز ملازم تھا۔ اسے ساموگڑھ کی جنگ میں سخت زخم آئے تھے۔ (ایضاً" صفحہ 819)

خافی خاں کی تاریخ منتخب اللباب (جلد اول' صفحہ 739) میں درج کردہ ایک بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ خافی خاں کی پیدائش 1664ء کے لگ بھگ ہوئی۔ یہاں اس نے بیان کیا ہے کہ شاجہان کے وزیر سعد اللہ کی وفات کے 74 سال بعد خافی خاں کی عمر 52 سال تھی۔ (ایضاً"

صفحہ 819)

خیال کیا جاتا ہے کہ خافی خاں نے برنیئر کے دوست دانشمند کی طرح زندگی کا آغاز بطور ایک تاجر یا سرکاری ملازم (یعنی کلرک) کیا اور وہ 94-1693ء میں اسی ایک حیثیت میں بمبئی گیا جہاں اس نے ایک انگریز افسر سے ملاقات کی۔

(بحوالہ ایلیٹ ڈاؤسن' جلد 7' صفحہ 350)

خافی خاں نے اورنگ زیب عالمگیر۔۔ بہادر شاہ اور محمد شاہ کے عہد میں دکن اور گجرات میں ملازمتی خدمات انجام دیں اور وہ کافی عرصہ تک سورت میں بھی رہا۔ اور احمد آباد میں بھی قیام پذیر رہا۔ خافی خاں نے سیواجی کے شہر "دھوری" میں بھی اپنے قیام کا ذکر کیا ہے۔ بہادر شاہ کے آغاز حکومت میں وہ کمپانیر کا گورنر تھا اور زندگی کے آخری ایام اس نے نظام الملک آصف جاہ کی ملازمت میں گزارے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اسی وجہ سے وہ خافی خاں کے ساتھ ساتھ نظام الملکی بھی کہلایا۔

خافی خاں ماثر الامراء کے مصنف شاہ نواز کا گہرا دوست تھا جو ایک دکنی منصبدار تھا۔
(منتخب اللباب' جلد 2' صفحہ 678)

منتخب اللباب : خافی کا مشہور کارنامہ یہ ہے کہ اس نے منتخب اللباب کے نام سے ہندوستان کے مغلیہ خاندان کی تاریخ مرتب کی ہے۔ جو ایک معیاری کتاب ہے اور انگریز مورخین اور مستشرقین کے نزدیک یہ کتاب اپنے اسلوب، صحت بیان اور غیر جانبداری کی بنا پر بہت بلند مقام رکھتی ہے۔ اگرچہ انگریز مورخین اس کے ان حصوں کو مغلق بھی سمجھتے ہیں تاہم ان کی نظر میں یہ تاریخی کتاب دوسری تاریخی کتب کی بہ نسبت زیادہ اچھی اور دلچسپ ہے۔ یہ تاریخی کتاب 1526ء سے 1732ء تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ یہ عرصہ دو سو سال پر محیط ہے۔ 1732ء محمد شاہ کے جلوس کا چودھواں سال تھا۔ اس کتاب کے زیادہ اہم حصے شاہجہان اور اورنگزیب کے حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ خافی خاں نے ان دونوں بادشاہوں کی بے حد تعریف کی ہے۔

1917ء میں تاریخ کی یہ کتاب (Bib Liotheca India) میں دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی اور نامکمل تھی۔ برٹش میوزیم میں اس کتاب کا صرف ایک حصہ موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خافی خاں نے برصغیر کے چھوٹے چھوٹے مسلمان خاندانوں کی تاریخ بھی قلمبند کی تھی لیکن اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ البتہ اس کا کچھ حصہ مسودے کی صورت میں انڈیا آفس میں لائبریری میں محفوظ ہے۔

خافی خاں کی تاریخی کتاب منتخب اللباب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں قصہ درقصہ روایتیں پائی جاتی ہیں۔ مصنف نے جگہ جگہ ذاتی مشاہدات بھی بیان کئے ہیں حتیٰ کہ شیر شاہ سوری اور شہنشاہ جہانگیر کے بارے میں لکھے گئے تاریخی واقعات کی صحت کو زیادہ مستند گردانا جاتا ہے۔ خافی خاں نے ملکہ نورجہاں کے بارے میں بہت دلچسپ معلومات دی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ

اس نے یہ معلومات ایسے شخص سے حاصل کیں جو اسے سورت میں قیام کے دنوں میں ملا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا جو بچپن سے ہی نورجہاں کے والد کے ساتھ ایران سے افغانستان اور وہاں سے ہندوستان کے سفر پر آیا تھا اور جو اس خاندان کے بارے میں بڑی مستند معلوم رکھتا تھا۔

خافی خاں جہاں حکمرانوں کے تاریخی حالات و واقعات بیان کرتا ہے وہاں وہ ساتھ ہی ساتھ معاشی' معاشرتی' سماجی اور انتظامی معاملات پر بھی روشنی ڈالتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ طاعون' قحط وغیرہ کا ذکر کرنا بھی نہیں بھولتا۔ (یہ معلومات اسلامی انسائیکلوپیڈیا میں ایچ بیورج نے لکھی ہیں)۔

یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ خافی خاں نے واقعات اور حالات نہایت تحقیق و تدقیق سے لکھے ہیں۔ منتخب اللباب کا ترجمہ چار جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ پہلی تین جلدیں مغلوں کے عروج سے متعلق ہیں چوتھی جلد میں عالمگیر کے بعد مغلوں کے عہد زوال کی داستان ہے۔ زوال کے ساتھ ساتھ عبرت آموز واقعات کا مرقع بھی ہے۔ وہ سادات بارہہ کی سازشوں کا پوسٹ مارٹم بھی کرتا ہے اور مرہٹوں کے حکومت میں آنے کے خوابوں کی تفاصیل بھی دیتا ہے اور بادشاہ گروں کی بے بسی اور زوال کے عبرتناک حالات سے بھی آنے والی نسلوں کو آگاہ کرتا ہے اور بطور مورخ بڑی ذمہ داری سے قلم پر قابو رکھتا ہے۔ اس نے اپنے مشاہداتی واقعات کے علاوہ ثقہ لوگوں سے سنی ہوئی باتوں کو بھی اپنی تاریخی کتاب میں جگہ دی ہے۔ چوتھی جلد میں عالمگیر کے جانشینوں کی جنگی کاوشوں کا ذکر ہے اور اس کے بعد ہر بادشاہ کی جانشینی کا ذکر ہے۔ حتیٰ کہ وہ محمد شاہ رنگیلا کے عہد کے 1732ء تک کے حالات تفصیل سے قلمبند کرتا ہے۔

خافی خاں کا اسلوب اور معیار : منتخب اللباب فارسی میں لکھی گئی ہے۔ خافی خاں کی تحریر کے بارے میں اہل علم کہتے ہیں کہ ابو الفضل کے بعد وہ اپنی خوبصورت تحریر کیلئے بڑی شہرت رکھتا ہے۔ نیز اس کی ناقدانہ حس بھی بڑی تیز ہے اور خافی خاں کے تنقیدی معیار جو اس کے عہد کے مورخین کے ہاں ناپید تھا نے اسے مورخین میں بلند مقام سے نوازا ہے۔

خافی خاں کی زبان میں وہ سادگی بھی ہے جو اس کے دور میں مخصوص انداز تحریر کی حامل تھی۔ فارسی زبان میں عربی کے صحیح محاورات کی بندش ابوالفضل کے دور میں رواں ہوئی جو عبدالحمید لاہوری کے "شاہجہان نامہ" میں بھی موجود ہے لیکن یہ انداز تحریر خافی خاں کے ہاں نہیں ملتا بلکہ اس نے زبان کی سادگی کو فن تاریخ میں خاص مقام سے آشنا کیا۔ جب اورنگ زیب کے دسویں (10) سن جلوس کے بعد سرکاری تاریخ نویسی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا تھا تو اس غیر حاضری کے دور میں خافی خاں کی تاریخی۔۔ ایک اہم دستاویزات کے طور پر سامنے آتی ہے۔ خافی خاں لکھتا ہے کہ جب 1686ء میں گجرات کا صوبہ کام بخش کو عطا ہوا تو خافی خاں کو اورنگ آباد کا فوجدار بنا دیا گیا جہاں وہ اورنگ زیب کی وفات (1707ء) تک موجود رہا۔ شاہ عالم کے عہد میں جب شہاب الدین کا بیٹا قمر الدین آصف جاہ اول تخت نشینی کی جنگ سے لاتعلق ہو کر مالوہ میں موجود تھا اس وقت شہاب الدین کے انتقال کے بعد خافی خاں نے قمر الدین آصف جاہ کی

ملازمت اختیار کی اور وہ جو اسے محمد ہاشم نظام الملکی کا نام ملا وہ اسی وجہ سے ملا۔

وہ لکھتا ہے کہ جب آصف جاہ شاہ عالم کے دربار میں دوبارہ داخل ہوا اس وقت خافی خاں قمرالدین آصف جاہ کے ساتھ تھا۔ آصف جاہ نے شاہ عالم سے معافی نامے کی منظوری کے بعد یہ مقام حاصل کیا کہ قمرالدین آصف جاہ کو اودھ کے صوبیداری عطا کی گئی اور آصف جاہ کی طرف سے محمد ہاشم خافی خاں کو فوجدار مقرر کیا گیا اور جب جہاں دار شاہ کی بے راہروی کے بعد نظام الملک آصف جاہ نے مغل دربار سے علیحدگی اختیار کی تو محمد ہاشم (خافی خاں) بھی مغلیہ حکومت سے الگ ہوگیا۔ پھر فرخ سیر کا زمانہ آیا تو محمد ہاشم عرف خافی خاں پانچ برس تک مغلیہ حکومت میں ملازمت میں رہا۔ جب نظام الملک کو مالوہ کی صوبیداری ملی اور اس نے ہاشم خاں کو بلانا چاہا تو اس نے ضعیف العمری کے سبب دہلی چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

جادو ناتھ سرکار نے اپنی کتاب (جو اورنگ زیب کی تاریخ ہے) میں خافی خاں سے اکثر استناد کیا ہے اور اس کی کتاب کو عہد اورنگ زیب کی اہم ترین تاریخوں میں شمار کرتا ہے۔ جادو ناتھ سرکار نے نعمت خاں عالی کو بھی اگرچہ زیادہ مستند سمجھا ہے تاہم وہ خافی خاں کو نظرانداز نہ کر سکا۔ نیز جن دیگر ماخذوں سے استفادہ کیا ان میں محمد کاظم کا عالمگیر نامہ' ساقی مستعد خاں کی ماثر عالمگیری' عاقل خاں رازی کی فتوحاتِ عالمگیری' مطلب خاں کی آداب عالمگیری اور سجان رائے کی خلاصتہ التواریخ شامل ہیں تاہم جادو ناتھ سرکار نے تسلیم کیا ہے کہ خافی خاں کی تاریخ میں تمام واقعات اور حالات زیادہ تفصیل سے لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ جن کو پڑھ کر واقعہ کا پس منظر اور پیش منظر سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

شاہ عالم بہادر شاہ کے بارے میں خافی خاں کی رائے : خاندان تیموریہ میں بہادر شاہ جس قدر سخی' باہمت' خلیق' عیب پوش اور خطا بخش ایسے اوصاف سے متصف ہے اس کا ہم پلا اور کوئی مغل حکمران نظر نہیں آتا۔ البتہ وہ امور سلطنت میں ملک کی خبرگیری اور انتظام و انصرام کے سلسلے میں اس قدر لاپرواہ تھا کہ شوخ طبع اشخاص اسے اس کی تخت نشینی کی تاریخ کے حوالے سے "شاہ بے خبر" کہتے تھے اور اس کی تخت نشینی کی یہ تاریخ اس کے عہد پر ایک طرح سے پھبتی سے کم نہیں۔ شاہ عالم بہادر شاہ کے شب و روز کا حال ایسا تھا کہ وہ رات کو دیر تک جاگتا رہتا اور صبح دن چڑھے تک (حتیٰ کہ دوپہر تک بھی) سوتا رہتا۔ یہ تو حضر کی بات تھی۔ سفر کا موقع ہوتا تو اس کی آرام طلبی کا یہ حال تھا کہ وہ کوچ کے وقت بلاوجہ بہت زیادہ دیر کر دیتا اور لشکری اس کی اس عادت سے سخت دشواریوں کا شکار ہو جاتے۔ وہ بادشاہ کی ان عادتوں کے بڑے شاکی تھے لیکن کچھ کر نہ سکتے تھے۔ سفر میں تاخیر کا نتیجہ یہ نکلتا کہ منزل تک پہنچتے پہنچتے کافی رات گزر جاتی اور رات کے اندھیرے میں لشکری اپنا کام ڈھنگ سے انجام نہ دے سکتے۔

خافی خاں کی اس طرح کی تحریروں سے اس کی تنقیدی حس کا پتہ چلتا ہے حالانکہ بہادر شاہ بادشاہ اس کا بڑا محسن تھا اور یہ اس کا نمک خوار ہونے کے ناطے اس کا ممنون احسان تھا۔

کام بخش اور خافی خاں : کام بخش کے بارے میں بطور عینی شاہد خافی لکھتا ہے کہ جب جنگ تخت نشینی میں بہادر شاہ نے کام بخش کی فوجوں کو شکست دی اور اس معرکے میں کام بخش سخت زخمی ہوگیا تو بہادر شاہ اسے بھائی سمجھ کر ہمدردی کے طور پر دیکھنے گیا۔
آخر بہادر شاہ رات کے وقت خود اپنے بھائی (کام بخش) کو دیکھنے گیا اور اس کی عیادت کیلئے پہنچا تو اپنی چادر جو اس کے کاندھے پر تھی' اپنے زخمی بھائی کو محبت سے اوڑھا دی اور بڑی شفقت سے اس کی مزاج پرسی کرنے لگا اور اسے کہا کہ ہم تمہیں اس حال میں دیکھنا ہرگز نہ چاہتے تھے۔
کام بخش بولا: "میں نہیں چاہتا تھا کہ بے غیرتوں کی طرح گرفتار ہوکر تیمور کی اولاد کو ذلت اور رسوائی سے داغ دار کروں۔"
بہرحال بہادر شاہ عالم نے بڑی منت سماجت کرکے کام بخش کو شوربہ اور یخنی کے دو چار چمچ پلائے اور خود آنسو پونچھتا ہوا وہاں سے رخصت ہوا۔ کام بخش اور اس کے بیٹے کو شدید زخموں نے چور کر رکھا تھا۔ جوش غیرت سے زخموں کے ٹانکے کھل گئے اور بہادر شاہ کے جانے کے تین چار گھڑی بعد دونوں باپ بیٹا اللہ کو پیارے ہوگئے۔

خافی خاں اور ظلم انگیز معاشرے کا دردناک انجام : خافی خاں نے تاریخ مرتب کرتے وقت واقعات کو تجزیاتی نظر سے بھی کھنگالا ہے۔ وہ اصلاح معاشرہ کا داعی بن کر بھی سامنے آتا ہے اور پھر جب ظالمانہ اقدامات کا وقوع عمل میں آنے لگتا ہے تو خافی خاں اس کے انجام سے باخبر دانشمند کی طرح اس کی عبرتناکیوں سے بھی آگاہ کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ بہادر شاہ کے ایک معتمد "خاں خاناں" کا ایک واقعہ لکھتا ہے کہ خان خاناں کی خواہش تھی کہ وہ ہر اہم شہر میں اپنے نام پر ایک ایک مسجد اور ایک ایک سرائے تعمیر کروائے چنانچہ اس بارے میں خان خاناں کے احکامات پہنچتے ہی مقامی حاکموں نے خان خاناں کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے بہترین قسم کی زمینیں حاصل کرلیں اور وہ ایسے زمینی قطعات تھے جن کو ان کے قابضین چھوڑنے پر کسی طرح بھی رضا مند نہ تھے چنانچہ خوشامد کے رسیا حکام نے ان زمینوں کا قبضہ حاصل کرنے کیلئے ظلم و ستم اور تشدد سے بھی کام لیا جس سے بے شمار خاندان بے گھر ہوگئے اور انہیں بے یارومددگار چھوڑ دیا گیا کیونکہ وزیر موصوف تک شکایت پہنچانے والا کوئی نہ تھا۔
آخر یہ زمینیں جس مقصد کیلئے حاصل کی گئی تھیں ان پر وہ کام شروع کر دیا گیا لیکن اس دوران میں خان خاناں کی وفات ہوگئی تو چاپلوس قسم کے مقامی حکام نے سارا کام ادھورا چھوڑ دیا اور نیم تعمیر شدہ عمارتیں کوڑا کرکٹ کی آماجگاہ بن کے رہ گئیں۔ اس نیک کام میں ظلم و ستم روا رکھنے کا عبرتناک انجام بقول خافی خاں یہ ہوا کہ ظالمانہ اقدامات پر مبنی کوئی نیک کام بھی صحیح انجام کو نہیں پہنچ سکتا اور ایسے ظالم حاکموں کی اولاد بھی پھل پھول نہیں سکتی اور انجام کار وہ محروم ہی رہتی ہے۔ خافی خاں کہتا ہے کہ مردم آزار (لوگوں کو دکھ دینے والے) قسم کے لوگ دنیا میں خود بھی ذلیل و خوار ہوتے ہیں بلکہ اپنے ظالمانہ اقدامات کے انجام بد سے بھی انہیں کوئی نہیں بچا سکتا حتیٰ کہ ایسے لوگوں کی اولاد کاسہ گدائی لئے در در کی محتاج ہو جاتی ہے۔

خود اپنے کردار پر انگشت نمائی اور اعتراف گناہ : خافی خاں بادشاہی ملازمت میں رہا اور ظاہر ہے کہ ایک ماتحت اہلکار خوہ وہ کتنا بڑا منصب دار ہو ہر وقت اور ہر معاملے میں اپنی صوابدید پر قائم نہیں رہ سکتا بلکہ کبھی کبھی ایسے مواقع بھی آتے ہیں کہ حکم حاکم مرگ مفاجات کے مصداق وہ بے بس ہو جاتا ہے۔ چنانچہ خافی خاں جب عالمگیر بادشاہ کی دولت کا امین تھا تو نفس امارہ کے کہنے سے اس میں ہیرا پھیری کرتا رہا تھا پھر اس کے ضمیر نے ملامت کی تو توبہ کی توفیق ملی چنانچہ وہ اعتراف کرتا ہوا کہتا ہے کہ میں ابتدائے عمر میں بہت گنہگار رہا ہوں اور بدبختی کی حال شاہانہ خدمت گزاریوں میں عمر ضائع کرتا رہا ہوں حتیٰ کہ عالمگیر کے بتیسویں (32 ویں) سال جلوس تک میں بھی اپنے نفس امارہ کی اطاعت میں مصروف رہا اور حضرت خلد مکانی عالمگیر کا جو روپیہ دکن میں میری امانت میں تھا' میں نے وہ روپیہ خوب ہڑپ کیا تاہم اس معاملہ میں یہ احتیاط بھی ملحوظ رکھی کہ میرا کوئی اقدام ظلم و ستم اور جو و جفا کی حدود کو چھونے نہ پائے کہ مبادا لوگ باگ مجھے ظالم کہنے لگیں۔۔۔۔ بعد ازاں کچھ ایسے واقعات سامنے آئے کہ میں نے اللہ سے ڈر کر اپنے خدا تعالیٰ سے وعدہ کر لیا کہ میں آئندہ مسلمانوں کا مال "ظلماً" نہ کھاؤں گا اور نہ اسے نقصان پہنچاؤں گا اور اپنے نفس امارہ کی پیروی ہرگز نہ کروں گا۔

مولانا شبلی کی نظر میں خافی خاں : مولانا شبلی نعمانی نے منتخب اللباب کی زبان کے بارے میں یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ خافی خاں لکھتا لکھتا بعض جگہ ابہامی تحریروں کا لکھاری بن کر سامنے آتا ہے اور ہم خافی خاں کی مقصدیت کو سمجھنے سے عاری ہو جاتے ہیں۔ بہرحال یہ زبان و بیان کا ابہام "غالباً" اس دور سے تعلق رکھتا ہے جب عالمگیر کے پچاس سالہ دور کے آخری چالیس سال کے تاریخی واقعات کو ضبط تحریر میں لانے کی سرکاری طور پر ممانعت کر دی گئی تھی اور ان حالات کو لکھتے وقت مولف خود ابہام کا شکار ہوتا ہے کہ وہ حالات و واقعات میں عدم ربط کے خلا کو کس طرح پر کرے اور ان میں کس طرح منطقی روانی اور تسلسل کو قائم رکھے اور ان کو کس طرح ایک دوسرے سے تطبیق دے۔ ایسی صورت حال کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ گول مول بات کرے جس سے اس واقعے کے مختلف پہلو اپنے اندر مختلف امکانی تصورات سموئے ہوئے ہوں اور غالباً یہی اشکالات جو خافی خاں کو پیش آئے مولانا شبلی مرحوم کی بذبذب میں ڈال گئے۔

جہاں دار شاہ اور خافی خاں : خافی خاں اگرچہ کوئی تہجد گزار اور انتہائی دیانتدار اور پاکباز شخص نہ تھا جیسا کہ عالمگیر کے دور میں اس کے اعتراف سے ظاہر ہے تاہم وہ اخلاقی طور پر گراوٹ کو سلطنت کیلئے تباہی سے کم نہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ شاہ عالم بہادر شاہ کی وفات کے بعد جب تخت نشینی کی جنگ چھڑی تو جہاں دار شاہ کو کامیابی نصیب ہوئی لیکن وہ بدبخت اس عطیہ خداوندی کی کماحقہ قدر نہ کر سکا اس نے صرف گیارہ ماہ تک حکومت کی مگر اس کی بدبختی ملاحظہ ہو کہ اس نے مغلیہ سلطنت کو تین سو سالہ عزت و آبرو اور شوکت و دبدبہ کو ایک طوائف لعل کنور کے ہاتھ میں کھلونا بنا دیا اور مغلوں کی بہادری کے برخلاف یہ نظیر قائم کی کہ وہ میدان جنگ سے

فرار ہو کر اپنے دھرم اور بھرم کو رسوا کر گیا۔

سید برادران اور خافی خاں : سید برادران کو مورخین نے زمانہ ساز' چکر باز' طوطا چشم اور اقربا پروری تک لکھا ہے اور ان کی منتقمانہ کارروائیاں بھی تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں جس کے نتیجے میں ہندوستان میں اسلامی سلطنت کو زوال آیا۔ اگرچہ اس کی ساری ذمہ داری سید برادران پر نہیں ڈالی جا سکتی لیکن ان کی بادشاہ گری نے جس طرح انہیں تاریخ میں بدنام کیا ہے اس کا الزام کسی اور کو نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن خافی خاں جب ان دو سید بھائیوں کے بارے میں ہمیں تاریخ سے آگاہ کرتا ہے تو ان کے ذاتی اخلاق اور کردار کی جھلک دکھانا بھی نہیں بھولتا وہ کہتا ہے :

سید بھائیوں کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے ہمارا قلم مسلسل ان دونوں بھائیوں کا شاکی نظر آتا ہے لیکن بطور کفارہ یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ :

حسین علی خاں اپنے بڑے بھائی کی بہ نسبت فیض رسانی اور حاجت مندوں کی حاجت روائی میں بہت زیادہ کوشاں رہتا تھا اور مستحقین کے استحقاق کا بھی بہت خیال رکھتا تھا۔ اورنگ آباد میں جب گرانی نے لوگوں کی زندگی میں مشکلات کا زہر گھول دیا تو گرانی کے اس دور میں حسین علی خاں ہر روز غریبوں اور بیوہ عورتوں کو مدد دینے کیلئے اقدامات کرتا رہا اور اس مقصد کیلئے کافی رقم اور اچھا خاصا غلہ فراہم کرتا رہا اور دوسرا بھائی عبداللہ بھی تحمل' بردباری اور حسن اخلاق میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔

(2) بہادر شاہ نامہ

(از مقرب خاں)

مقرب خاں کا اصل نام مرزا نور الدین تھا اور اس کے آباء و اجداد مشہد کے رہنے والے تھے اور ان کا خاندان حکماء کا خاندان کہلاتا ہے۔ مقرب خاں فریضہ حج ادا کرنے کیلئے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پہنچے اور واپسی پر اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں مشہد سے ہوتے ہوئے برصغیر پاک و ہند میں وارد ہوئے اور اورنگ زیب کے ہاں ملازمت اختیار کی۔ سفینہ خوشگو میں ہے کہ مقرب خاں کی جائے پیدائش اور تاریخ پیدائش کا پتہ نہیں چلتا البتہ خزائن الامراء میں لکھا ہے کہ ان کے بزرگ شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان آئے۔ یہاں پر ہی مقرب خاں کی ولادت ہوئی پھر یہاں سے تعلیم کیلئے مشہد کا سفر کیا۔ اورنگ زیب کے عہد میں مقرب خاں داروغہ کی پوسٹ پر متعین تھے پھر اسے "خان سامان۔ کے عہدہ پر سرفراز کیا گیا اور بعد ازاں اسے "داروغہ جواہر خاص" مقرر کر دیا گیا اور اسے مقرب خاں کے خطاب سے نوازا گیا۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس نے نہایت دیانتداری سے تمام جواہرات بہادر شاہ' شاہ عالم کے سپرد کر دیئے اور بادشاہ نے اسے دانشمند خاں کا خطاب دیا۔ اس طرح اس شاہی اہلکار نے مقرب خاں اور دانشمند خاں کے لقب پائے اور نور الدین کی جگہ مقرب خاں کے نام سے ہی شہرت پائی۔ 1710ء میں دہلی میں قضائے الٰہی سے وفات پائی۔ آپ کی تصانیف کی تفصیل اس طرح ہے:

1۔ بہادر شاہ نامہ: جس میں بہادر شاہ کے عہد کے تاریخی حالات درج ہیں۔
2۔ وقائع حیدر آباد۔
3۔ جنگ نامہ: اس میں گولکنڈا کے محاصرہ کی تفصیلات ہیں۔ یہ منظوم تاریخ ہے جس میں مولف خود بھی قید و حصر کی مشکلوں سے دوچار رہا۔
4۔ راحت القلوب۔
5۔ حسن و دل۔
6۔ حسن و عشق۔

بہادر شاہ نامہ: اس عہد کے حالات و واقعات کا مرقع ہے۔ یہ کتاب بہادر شاہ کے حکم پر معرض تحریر میں آئی۔ اس میں اورنگ زیب عالمگیر کے آخری عہد کی تاریخ ملتی ہے کیونکہ اس کے مصنف اورنگ زیب عالمگیر مرحوم کے مشیر خاص تھے اور اسی نے مصنف کو مقرب خاں اور نعمت خاں کے القاب سے نوازا تھا چنانچہ عالمگیر کے شاہی ارشادات اور سرکاری احکامات مقرب خاں ہی تحریر کرتا تھا اور پھر یہ جاری ہوتے تھے۔ شاہ عالم کے ساتھ بھی مقرب خاں نے وفا

شعاری دکھائی اور وہ جواہرات کی کھیپ اس کے حوالے کر کے شاہ عالم کی رضا جوئی' پسندیدگی اور احسان شناسی کا مورد ٹھہرا اور بادشاہ نے اسے دانشمند خاں کا خطاب عطا کیا۔

تاریخی اعتبار سے بہادر شاہ نامہ کی جو اہمیت ہے وہ تو ہے ہی لیکن ادبی لحاظ سے بھی اس میں بعض خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ مقرب خاں شاعر بھی تھا اس لحاظ سے اس نے سادہ اور عام فہم زبان استعمال کی ہے جس میں شستگی بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اسی لئے اس کتاب کو فارسی تاریخ ادب میں شاہکار کی حیثیت دی جاتی ہے۔

خافی خاں اور مقرب خاں : خافی خاں نے جو واقعات اجمالی طور پر تلخیص کے انداز میں لکھے ہیں مقرب خاں نے وہی واقعات خاصی تفصیل کے ساتھ ادبی چاشنی کی مہم دیکر رقم کئے ہی۔ مقرب خاں اپنے انداز تحریر میں منفرد نظر آتا ہے۔ خافی شاہ عالم بہادر شاہ کے نیکی کے کاموں کو انسانی ہمدردی اور بلند اخلاقی سے تعبیر کرتا ہے لیکن مقرب خاں نے ان واقعات کو جواں مردی اور سیاسی بصیرت اور مستقبل کے بلند عزائم کے حوالہ سے دیکھا ہے۔

پہلے شاہانہ ادوار میں مورخین کا محور بادشاہان اور ان کے عظیم کارہائے نمایاں ہوتے تھے لیکن بعد میں مورخین نے تاریخ میں منطق اور تنقید کو بھی جگہ دی حتیٰ کہ آخری دور کے مورخین نے ایڈمنسٹریشن اور خارجہ پالیسی کے ساتھ ساتھ فتوحال کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔ ان میں خافی خاں اور مقرب خاں بھی شامل ہیں۔ خافی خاں نے مغل بادشاہوں کے پانچ سالہ دور میں پیش آنے والے اہم واقعات اجمالاً" بیان کئے ہیں لیکن مقرب خاں نے بہادر شاہ نامہ میں اس کے دور کے واقعات کو مفصل اور زیادہ بہتر انداز میں بیان کیا ہے تاکہ اصل واقعات کا پس منظر بھی معلوم ہو جائے۔ بہادر شاہ نے جس طرح اپنے مفتوح برادر زادگان سے ہمدردی کا سلوک کیا اور ان کی بیواؤں اور بچوں کی جس طرح پرورش کی ان باتوں کو بھی مقرب خاں نے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بہادر شاہ کی عمر 65 سال تھی جبکہ اس کا بھائی شہزادہ اعظم چالیس سال کا تھا۔ بڑا بھائی ہونے کے ناطے بہادر شاہ نے اعظم کو خط لکھا کہ مسلمانوں کا خون ضائع نہ کیا جائے اور جنگ کی بجائے صلح کا راستہ اختیار کیا جائے لیکن اعظم نے اس کی تجویز کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور آخر بھاری نقصان کے بہادر شاہ کو کامیابی اور اعظم کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ مقرب خاں اس قسم کے واقعات کو اس کی دور اندیشی اور صلح کوشی سے تعبیر کرتا ہے لیکن خافی خاں اس تجویز کو بہادر شاہ کی بزدلی قرار دیتا ہے۔

منعم خاں کی وفات کے بعد بہادر شاہ شاہ عالم نے وزارت عظمیٰ کا قلمدان امراء کے حوالے کرنے کی بجائے اسے عظیم الشان کے سپرد کر دیتا ہے۔ دانشمند خاں عرف مقرب خاں اسے بادشاہ کی مایوسی کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اسی طرح اس کی مایوسی اس وقت مزید اجاگر ہو جاتی ہے جب وہ ایک ہی شخصیت کیلئے مختص ایک لقب ایک کی بجائے بہت سے افراد کو عطا کرتا ہے حالانکہ ازیں پیشتر وہ لقب کسی خاص خاندان یا جاگیر کے والی کیلئے موروثی سمجھا جاتا تھا۔

خافی خاں شاہ عالم بہادر شاہ کی ایسی کارروائیوں کو اس کی بے خبری' لاپرواہی اور

بڑھاپے کی وجہ سے نسیان میں اضافہ قرار دیتا ہے لیکن مقرب خاں ان اقدامات کو امراء کے خلاف بادشاہ کی ناراضگی یا خوشی یا ان کے عمل کے خلاف بادشاہ کا ردعمل قرار دیتا ہے۔

جب منعم خاں نے 1708ء میں امراء کی اصلاح کا پروگرام مرتب کرکے بادشاہ کو پیش کیا اور اس اصلاحی پروگرام پر عملدرآمد کیلئے ساقی مستعد خاں کو ذمہ داری سونپی گئی۔ چنانچہ اس نے اصلاحی مقاصد کو سامنے رکھ کر متعلقہ افسروں کی فہرست مرتب کی جو بہت زیادہ طویل تھی چنانچہ منعم خاں نے اس فہرست کو دیکھ کر کہا کہ اتنے زیادہ امراء کے خلاف اصلاحی اقدام کرنے سے الٹا اثر ہوگا اور مغل سلطنت کی چولیں ہل جائیں گی پس اس نے اس پر عملدرآمد روک دیا اور فہرست لیکر اس پر نظرثانی کرتے ہوئے منعم خاں نے تمام بڑے بڑے منصبداروں کے نام خارج کر دیئے جو بہادر شاہ کی تخت نشینی کے بعد ان بڑے عہدوں پر متمکن ہوئے تھے۔ مقرب خاں لکھتا ہے کہ یہ سازش کامیاب رہی اور امراء کی اصلاح کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔

بطور تنقید نگار بھی مقرب خاں نے واقعات کو لکھتے وقت ایسا اسلوب اختیار کیا ہے کہ شاہانہ اقدامات کی خامیاں اظہر من الشمس ہو جاتی ہیں اور یہ سرکاری تاریخی کتاب خوشامدانہ سرحدوں کو عبور کرکے قاری کو کسی نہ کسی حد تک مطمئن کرنے کا اہتمام کرتی نظر آتی ہے۔

(3) عبرت نامہ

(از: محمد قاسم عبرت لاہوری)

عبرت نامہ خیر الدین میں واقعی عبرت انگیز واقعات بڑی دردمندی سے بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن عبرت نامہ محمد قاسم عبرت لاہوری میں تاریخی واقعات ہیں اور ان کا نام عبرت نامہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ عبرت لاہوری (محمد قاسم) نے مرتب کئے ہیں۔

محمد قاسم عبرت لاہوری مغل حکومت میں منصبدار تھا۔ جسے فرخ سیر کے عہد میں عبدالصمد خاں' سربلند خاں اور محمد امین خاں کے ساتھ رہ کر خدمات انجام دینے کا موقع ملا اور جب محمد شاہ کا دور تھا تو ان دنوں وہ نظام الملک کے ساتھ منسلک رہا تھا۔

اس عبرت نامہ میں زیادہ تر فرخ سیر کے عہد کا جائزہ لیا گیا ہے نیز سادات بارہہ اور فرخ سیر کے تنازعہ میں دونوں دھڑوں کی حکمت عملیوں اور ہر گروہ کے ان اقدامات کا ذکر کیا گیا ہے جو اس نے اپنے اپنے مفاد کے پیش نظر کئے تھے۔ عبرت لاہوری نے سب کا ذکر غیر جانبدارانہ انداز میں کیا ہے۔

چونکہ عبرت لاہوری عبدالصمد خاں کا منصبدار تھا لہٰذا جب فرخ سیر کو معزول کر دیا گیا تو اس معزولی کے دوران میں عبدالصمد خاں نے جو کارکردگی ظاہر کی اور خصوصاً مرہٹوں کے خلاف جو کامرانیاں حاصل کیں عبرت نامہ میں ان کی تفصیلات کو زیادہ جگہ دی گئی ہے۔ جب مرہٹہ فوج شکست کھا کر فرار ہوئی تو عبرت لاہوری نے اس کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ شکست خوردہ مرہٹہ فوج سر سے پاؤں تک مسلح ہونے کے باوجود جب فرار ہو رہی تھی تو بعض مغل عورتوں نے محض خیموں کی چوبوں سے ان پر حملہ کر دیا اور بعض مرہٹہ سپاہیوں کو قتل تک کر ڈالا لیکن شکست خوردگی کے احساس تلے دبی ہوئی مرہٹہ سپاہ کو اتنی ہوش نہ رہی کہ وہ اپنے اسلحہ کو استعمال میں لاتی اس میں عبرت کا پہلو یہ ہے کہ ایک شکست خوردہ مسلح فوج کس طرح ہمت ہار کر معمولی مقابلہ تک سے گھبراتی ہے۔

محمد شاہ رنگیلے کے عہد کے بارے میں بھی عبرت نامہ قاسم لاہوری میں واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ محمد شاہ پہلے تو سادات بارہہ کا دست نگر تھا اور ایک طرح ان کا قیدی بن کر بادشاہی نبھا رہا تھا لیکن آہستہ آہستہ منفی حالات کو اپنے حق میں کر لیا اور سادات بارہہ کو وہ مات دینے میں کامیاب ہوگیا اور پھر اس نے نظام الملک کو مالوہ اور دکن کی طرف بھیج دیا اس طرح وہ اس خطرہ سے بھی محفوظ ہوگیا لیکن اس بے فکری کے دور میں محمد شاہ عورتوں کا ایسا شوقین ہوا کہ عیاشی اور زن پرستی کی وجہ سے رنگیلا کے نام سے شہرت پائی۔ وہ 1719ء سے 1748ء تک برسر اقتدار رہا لیکن اگر وہ عیاشی میں وقت نہ ضائع کر دیتا اور جرات اور ہمت سے کام لیتا تو برصغیر میں مغل دور کو آئندہ کیلئے استحکام بخش سکتا تھا کیونکہ اس نے سید

برادران کو بھی انتہائی نامساعد حالات میں اپنی راہ سے ہٹا دیا تھا۔ وہ سیاسی حالات کو اپنے حق میں کرنے سے قاصر ہرگز نہ رہتا اگر وہ اپنے بزرگوں کی جوانمردی کا طریق کار اپناتا لیکن رنگیلا تو بس رنگیلا تھا جسے اس کی عیاشیاں اور عاقبت نا اندیشیاں لے ڈوبیں۔ عبرت نامہ میں مغل امراء کی طبقاتی کشمکش کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مرہٹوں اور جاٹوں کے خلاف مہمات کی تفصیلات بھی ہیں اور ایرانی اور تورانی امراء کی چپقلشوں اور ایک دوسرے کے خلاف ان کے حریفانہ کارناموں پر تفصیلی بات کی گئی ہے جس کے نتیجہ میں نادر شاہ درانی کو دہلی تک رسائی حاصل ہوئی اور وہ مغلوں کی عمر بھر کی کمائی اور شان و شوکت کا جنازہ نکال کر چلتا بنا اور جاتا ہوا وہ پندرہ کروڑ روپے نقد کے علاوہ تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرا بھی اپنے ساتھ لے گیا۔

عبرت نامہ کا مصنف چونکہ شاہی منصب دار تھا اس لئے اس نے مستند معلومات کا خزانہ جمع کر دیا ہے۔ عبرت نامہ لاہوری میں محمد شاہی عہد کے بارے میں مستند معلومات بھی ہیں اور ملک کے انتظامی، مالی، معاشی اور معاشرتی امور پر بھی قلم اٹھایا گیا ہے نیز دکن، گجرات، اودھ، پنجاب اور سندھ کے صوبہ جات کے محصولات کی تفصیل بھی سالانہ سطح پر مہیا کی گئی ہے۔ بعض دوسرے اہم علاقوں کے محصولات کا بھی حساب کتاب مہیا کیا گیا ہے اور غیر جانبدارانہ تنقید اور تقریظی رائے بھی ظاہر کی گئی ہے اور مرکز اور صوبوں کے درمیان حکومتی تعلقات کی نوعیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مصنف حالات و واقعات کی تفصیل دینے کے بعد صحافیانہ انداز اختیار کرتا ہے۔ نتائج اخذ کرنے کا کام خاموشی سے قاری کے سپرد کر دیتا ہے۔

(4) تاریخ مظفری

(از محمد علی پانی پتی)

عبدالمجید سالک اپنی کتاب "مسلم ثقافت ہندوستان میں" کے اندر لکھتے ہیں کہ "تاریخ مظفری" نواب محمد علی انصاری یا محمد علی پانی پتی کی لکھی ہوئی تاریخی کتاب ہے جس میں بابر کی فتح ہند سے لیکر محمد شاہ کی وفات تک سلاطین دہلی اور دوسرے معاصر حکمرانوں کا تذکرہ موجود ہے چونکہ مصنف کے حالات زندگی تفصیلاً نہیں ملتے تاریخ مظفری میں ہی اس کے حالات پر معمولی سی روشنی ڈالی گئی ہے۔

محمد علی انصاری۔۔ یا خواجہ محمد علی کا تعلق ابتدائی طور پر پانی پت سے تھا لیکن بسلسلہ ملازمت یہ صاحب بنگال کے نائب صوبیدار خواجہ رضا علی مظفر جنگ کے مصاحبوں میں شمار ہوتے تھے۔ سی اے سٹوری (Storey) نے بھی اس کے حالات زندگی کم ہی دیئے ہیں۔

محمد علی پانی پتی تاریخ مظفری میں لکھتا ہے کہ اسے نواب مظفر جنگ نے بنگال کی تاریخ لکھنے کا حکم دیا جس کا پیریڈ بہت کم تھا۔ یعنی یہ تاریخی واقعات صرف شاہ عالم کی فتح بنگال کے سلسلے میں کوششوں سے متعلق تھے۔ لیکن مصنف نے تاریخ مرتب کرتے وقت اس کے پیریڈ میں توسیع کر لی اور اس کے حالات کو اورنگ زیب کی وفات، تخت نشینی کی جنگ اور شاہ عالم کی تخت نشینی سے لیکر شاہ عالم ثانی کے دوسری بار برسر اقتدار آنے تک پھیلا دیا اور حالات کی واقعاتی شہادت کے طور پر اس کی اپنی حیثیت ایک عینی شاہد کی سی ہے لہٰذا اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے کیونکہ معاصر تواریخ یعنی غلام علی شاہ عالم نامہ اور خیر الدین کی عبرت نامہ کے مقابلے میں بعض تفصیلات زیادہ ہیں اور اس کا مصنف زیادہ زور شاہ عالم کے دور کے واقعات پر ہی دیتا ہے۔

شاہ عالم ثانی کے بارے میں تاریخ مظفری کا مصنف لکھتا ہے کہ اس کا 1758ء میں وزیر ہند کے خلاف دہلی سے روانہ ہونا صرف اس لئے تھا تاکہ اس طرح وہ مغل حکمرانوں کیلئے حکومت پر قبضہ کرنے کا موقع فراہم کریں اور ان کے پیچھے عماد الملک کی وہ ریشہ دوانیاں تھیں جن کا سلسلہ شاہ عالم ثانی کے والد عالمگیر تک پہنچتا تھا کیونکہ عماد الملک وزیر تھا اور نو عمر ہونے کے علاوہ مکار، حریص اور سفاک بھی تھا۔ عماد الملک یوں تو نظام الملک آصف جاہ کا پوتا تھا۔ لیکن اس کی تربیت میں کمی رہ گئی تھی اور اس میں اپنے دادا والی خصوصیات میں سے کوئی وصف بھی موجود نہ تھا۔ عماد الملک ذہین تو تھا لیکن مکاری اور چالبازی میں بہت گرا ہوا تھا اور لالچ نے اسے اندھا کر دیا تھا۔ وہ اپنی کامیابی کا کسی بھی قیمت پر خواہاں تھا۔ چنانچہ عالمگیر ثانی کا قتل دراصل اسی سازشی چالبازی کا شاہکار تھا۔ جس میں بادشاہ کو بچوں سمیت قتل کرنے کا منصوبہ تھا لیکن اس سازش کے کامیاب ہو جانے کی نوبت ابھی آئی نہ تھی کہ شاہ عالم عرف علی گوہر۔۔ اپنے چند دوستوں کے ساتھ سیر کرتا ہوا اودھ پہنچ گیا۔

بنگال کی بدانتظامی سر ابھار رہی تھی ادھر اودھ اور الہ آباد کے مراکز اس بارے میں تشویش کا شکار تھے چنانچہ شجاع الدولہ نے انتظامی عدم استحکام کے پیش نظر پہلے ان علاقوں پر قبضہ کیا جانا ضروری تھا جن پر انگریزوں نے جنگ پلاسی کے بعد قبضہ کر لیا تھا لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی کیونکہ بنگال کے ناظم میر قاسم کے انگریزوں کے ساتھ اختلافات کافی بڑھ چکے تھے اور ان کے ساتھ جنگ میں میر قاسم شکست کھا گیا اور میر قاسم بھاگ کر شجاع الدولہ کے پاس اودھ جا پہنچا جس نے شاہ عالم کے ساتھ ساتھ میر قاسم کو بھی اپنا حامی بنا لیا اور تینوں کی کل فوج ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی جس کے بل پر انگریزوں سے جنگ کی ٹھانی اور بکسر کے مقام پر انگریزوں سے مقابلہ ہوا جس میں انگریز فتح یاب ہوئے۔

محمد علی پانی پتی کے نزدیک اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ مغل حکمران سیاسی طور پر زوال کا شکار ہو چکے تھے۔ ان میں انتظامی امور کی کمی بری طرح کھٹکتی تھی۔ انگریزوں کی فوجی برتری زیادہ تر جنگی تربیت میں کمال' بہتر اسلحہ کی مرہون منت تھی۔ اس جنگ نے ہندوستان کی تقدیر کا فیصلہ کر دیا اور بالآخر آہستہ آہستہ انگریزوں کے تسلط میں آ گیا۔ محمد علی پانی پتی نے اٹھارہویں صدی کے ایسے حالات بھی بیان کئے ہیں جن کا ذکر دوسری ہم عصر تواریخ میں ناپید ہے۔ اس لحاظ سے تاریخ مظفری اٹھارہویں صدی کے حالات و واقعات کا اہم ماخذ تسلیم کی جاتی ہے۔

(5) عبرت نامہ

(از خیر الدین الہ آبادی)

فقیر خیر الدین محمد الہ آبادی مغلیہ خاندان کے آخری دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم تھے۔ وہ ایک مدبر اور معاملہ فہم کی حیثیت سے ہمارے سامنے نمودار ہوتے ہیں۔ جب ان کی خدمات مرہٹوں اور انگریزوں کے درمیان صلح کرانے کیلئے حاصل کی گئیں۔ جس میں اس نے اینڈرسن کی مدد کی تھی۔ چنانچہ صلح میں کامیابی کے بعد انگریزوں نے اسے پنشن سے نوازا۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ اس نے انگریزوں کی ملازمت بوجہ علالت ترک کر دی اور صحت یاب ہو کر مغل دربار سے منسلک ہوگیا پھر اسے ہم نواب سعادت علی خاں کے دربار سے وابستہ دیکھتے ہیں اور وہ لکھنؤ میں نظر آتا ہے۔ اس کا انتقال 1827ء میں ہوا۔ آخری ایام زندگی اس نے جونپور میں گزارے اور فرنگی حکومت سے پنشن بھی اسے ملتی رہی۔

فقیر خیر الدین محمد نے تاریخ جونپور بھی لکھی تھی اس کا ترجمہ میجر پاگسن نے کیا تھا۔ اسی طرح اس نے بلونت نامہ کی تالیف کی تھی۔

عبرت نامہ : اس کتاب میں فقیر خیر الدین محمد الہ آبادی نے 1790ء تک کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ اس میں تین جلدیں ہیں ایک جلد مقدمہ پر مشتمل ہے باقی دو جلدیں مختلف ابواب میں منقسم ہیں۔ عبرت نامہ میں شاہ عالمگیر ثانی (1754ء تا 1759ء) اور شاہ عالم ثانی (1759ء تا 1806ء) کے دور کو زیادہ وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ دراصل یہ کتاب تیمور سے شروع ہوتی ہے اور تیموری خاندان اور دوسرے بادشاہوں کا ذکر اس میں بہت ہی اختصار اور جامعیت سے کیا گیا ہے جس کیلئے مولف نے پچیس صفحات مختص کئے ہیں۔ اس کتاب میں صاف اور سادہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ مصنف خیر الدین کے دہلی اور آگرے پر حکمران مرہٹہ سرداروں سے ذاتی تعلقات تھے اور اسی وجہ سے انگریزوں نے اینڈرسن کی مدد کیلئے مرہٹوں سے صلح کے بہانے اس کی خدمات حاصل کی تھیں۔ جس میں کامیابی کے بعد مولف کو انگریزوں نے پنشن دے دی تھی۔ مولف نے واقعات بیان کرتے وقت تاریخی اعتبار سے درست سن لکھنے کا خاص اہتمام کیا ہے اور عالمگیر ثانی اور شاہ عالم ثانی کے عہد کے واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اس کتاب میں مغلیہ خاندان اور اس کی حکومت کے زوال کی داستان تفصیل سے بیان کی گئی ہے نیز مرہٹوں کا عروج بھی سامنے لایا گیا ہے پھر احمد شاہ ابدالی کے حملے اور پانی پت کے 1761 کے

حملہ میں مرہٹوں کا بھرکس نکالنے کا ذکر بھی ہے۔ پنجاب اور دہلی کے حالات پر بھی خاصی روشنی ڈالی گئی ہے۔

پنجاب کی گورنر مغلانی بیگم کی گرفتاری وغیرہ کا بھی ذکر اذکار شرح و بسط سے کیا ہے۔ وہ نواب سعادت علیخاں کی ملازمت میں رہا تھا تو اس کی تعریف و تحسین ان القابات سے کرتا ہے:

> "اعتماد الدولتہ والدین اعتضاد الاسلام و المسلمین وزیر الممالک عمدۃ الملک یمین الدولتہ ناظم الملک نواب سعادت علی خاں بہادر مبارز جنگ۔۔۔"

عبرت نامہ میں جہاں مغلوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے وہاں مختلف بادشاہوں اور ان کے ہم عصروں کے واقعات کو عبرت آموز طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ خیر الدین الہ آبادی غلام قادر روہیلہ کے بادشاہ پر مظالم کا ذکر رونگٹے کھڑے کر دینے کے انداز میں کرتا ہے لیکن وہ یہ نہیں بتاتا کہ غلام قادر روہیلہ کو اس قدر سفاک کیوں بننا پڑا اور وہ کیا حالات تھے جس کے نتیجہ میں وہ اس قدر ظالم' بے حیا اور سفاک ہوگیا تھا۔ اس بارے میں "فال آف مغل ایمپائر" میں لکھا ہے کہ غلام قادر روہیلہ کو شاہ عالم ثانی (1759ء تا 1807ء) نے اپنے حرم میں لونڈے کی حیثیت سے زینت بنا رکھا تھا نیز بادشاہ کے اہلکاروں نے غلام قادر روہیلہ کے والد کے حرم پر شرمناک یلغار کی تھی اور خلوت خانوں میں تباہی مچا دی تھی حتیٰ کہ روہیلہ حرم کی خواتین کے ساتھ زیادتی بھی کی تھی۔ اور پھر غلام قادر روہیلہ کو شاہ عالم کا اپنے حرم میں بطور لونڈا رکھنا بھی کم شرمناک نہیں اور ایک مسلمان بادشاہ کو' جو اہل اسلام کا محافظ اور مددگار ہوتا ہے اور نیکی میں ان کا معاون اور بدی میں اس کا قلع قمع کرنے والا ہوتا ہے۔۔۔ یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ غیر اخلاقی سلوک کرے۔

یہ دنیا (Action and Re-action) عمل اور ردعمل کے بل بوتے پر رواں دواں ہے۔ قدرت نے ہر چیز کا جوڑا پیدا کیا ہے جہاں آگ ہوگی وہاں دھواں بھی ہوگا۔ غلام قادر روہیلہ اور اس کے خاندان کے ساتھ بادشاہ کے اہلکاروں اور خود بادشاہ نے ذلت آمیز سلوک کیا تو جب شاہ عالم ثانی اور اس کا کنبہ اس کے ہاتھ لگا اور اسے اس پر دسترس حاصل ہوگئی تو وہ جذبہ انتقام سے اندھا ہوگیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ غلام قادر روہیلہ نے بادشاہ اور اس کے خاندان کے ساتھ جو کچھ کیا وہ درست یا جائز تھا ایسا بالکل نہیں لیکن وہ جو کہا جاتا ہے کہ قصاص میں زندگی ہے روہیلہ کا انتقام لینا نہایت ظالمانہ کردار تھا لیکن ایسا کیوں ہوا؟ اس لئے کہ وہ جذبہ انتقام میں اندھا ہوچکا تھا اور اس کی عقل جواب دے گئی تھی اور وہ اسی جذبہ میں پاگل ہوگیا تھا

چنانچہ اس نے اقتدار پاتے ہی بادشاہ اور اس کی خواتین کے ساتھ ایسے ایسے مظالم روا رکھے کہ رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ شاہی خواتین پر مظالم ڈھاتے وقت کہہ رہا تھا کہ ہماری خواتین کے ساتھ بھی ایسی ہی بے حرمتی روا رکھی گئی تھی اب میرے آدمی شاہ کی لڑکیوں اور خواتین کو گھروں میں ڈال لیں گے اور بغیر نکاح کئے وہ کچھ کریں گے جو نکاح کرنے کے بعد کیا جاتا ہے۔

خیر الدین الہ آبادی نے ان واقعات کا ذکر عبرت آموز طریقے سے کیا ہے۔ وزیراعظم عماد الملک نے شاہی تمکنت اور وقار کی بحالی کیلئے کوششیں کیں تو ان کو بعض فوجی جرنیلوں نے ناپسند کیا اور وزیراعظم کے خلاف ڈٹ گئے۔ وزیراعظم بادشاہ کو دہلی سے شاہجہاں آباد لے گیا اور فوجی جرنیوں کے قبضہ میں جو جاگیریں تھیں وہ شاہی حکم سے واپس لے لی گئیں۔ چنانچہ ان فوجی جرنیلوں نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دی اور بادشاہ کو اغوا کر لیا اور وزیراعظم کی ذاتی فوج میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ حالات کو اپنے حق میں کر سکتی۔ آخر بادشاہ نے وزیراعظم کی مدد کی تو اسے رہائی نصیب ہوئی۔ پھر احمد شاہ ابدالی کے حملے کی تفصیلات کا ذکر بھی عبرت آموز ہے اور خاص طور پر بادشاہ پر مظالم کی تفصیل بھی دل ہلا دیتی ہے۔ غلام قادر روہیلہ بادشاہ اور اس کے اہل خاندان پر غلبہ پاچکا ہے۔۔ شاہ عالم کو اس نے دھوپ میں بیٹھنے کا حکم دیا اور وہ دھوپ کی تیزی کی شکایت کرنے لگا تو غلام قادر روہیلہ نے اپنے تند خو افغانوں کو حکم دیا کہ بادشاہ کو گرا کر اندھا کر دو۔ ان لوگوں نے بادشاہ کو پکڑا اور ایک آنکھ میں بڑی سوئی گھسیڑ دی۔ بادشاہ درد سے تڑپنے لگا تو ان افغانوں نے اسے زمین پر پچھاڑ کر چھڑیوں سے مارنا شروع کر دیا۔ غلام قادر روہیلہ آگے بڑھا اور بادشاہ سے پوچھا کہ اب اسے کیا نظر آتا ہے۔ بادشاہ بولا مجھے تو سوائے قرآن مجید کے کچھ نظر نہیں آتا جو میرے اور تیرے درمیان حکم تھا۔ بادشاہ رات بھر تڑپتا رہا اس کے بچے بھی روہیلہ کے مظالم سے تڑپتے اور شور مچاتے رہے لیکن ان کی مدد کرنے والا کوئی نہ تھا۔ غلام قادر روہیلہ خود بادشاہ کے حرم یعنی موتی محل میں فخر و مباحات اور متکبرانہ انداز سے رات بھر جاگتا رہا۔ حرم سرا سے جب بچوں کے چیخنے کی دلدوز آوازیں سنائی دیتیں تو روہیلہ سانپ کی طرح جذبہ انتقام میں بل کھاتا اور یہ سلسلہ رات بھر جاری رہا۔ اس نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ جو کوئی چیخے چلائے اسے تہ تیغ کر دیا جائے لیکن ان لوگوں نے اللہ سے ڈرتے ہوئے اس حکم پر عمل نہ کیا۔

بادشاہ کو گرانے کے بعد روہیلہ اچھل کر اس کی چھاتی پر بیٹھ گیا۔ قندھاری خاں اور پرولی خاں نے بادشاہ کے ہاتھ پکڑ لئے اور ان کے دو ساتھیوں نے اس کی ٹانگیں جکڑ دیں۔ قندھاری خاں نے اس کی ایک آنکھ پھوڑ دی اور غلام قادر روہیلہ نے بادشاہ کی دوسری آنکھ اپنے ہاتھ سے پھوڑ دی۔ پھر روہیلہ نے حکم دیا کہ بادشاہ کے بیٹوں شہزادہ اکبر' سلیمان شکوہ اور احسن بخت کو لایا جائے اور ان کی آ[illegible] میں سلائیاں پھروا دی جائیں۔ اس [illegible] شاہی خواتین پردوں

سے باہر نکل آئیں اور گڑگڑا کر رحم کی بھیک مانگنے لگیں اور روہیلہ کے پیروں پر سر ڈال دیئے لیکن روہیلہ کو انتقامی پاگل پن نے اندھا کر رکھا تھا چنانچہ اس نے خواتین کے سینوں اور سروں پر ٹھوکریں ماریں اور دور دھکیل دیا۔ پھر مصور کو بلایا اور بادشاہ کے سینے پر سوار ہو کر اس منظر کی تصویر بنانے کا حکم دیا جس میں وہ خود چاقو سے بادشاہ کی آنکھیں نکالتا ہوا دکھائی دے۔ پھر اس نے ملازمین کو یہ بھی حکم دیا کہ شاہی افراد کو خوراک یا پانی وغیرہ ہرگز نہ دیا جائے۔ بے چارہ بادشاہ اور دیگر مظلومین اسی طرح تڑپتے اور چلاتے رہے لیکن بادشاہ کی آنکھوں سے خون جاری تھا اس لئے ان کا کوئی فائدہ نہ تھا۔۔۔۔ غلام قادر روہیلہ ایسے وقت میں بادشاہ کے پاس پہنچا اور اسے داڑھی سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا:

"میں نے یہ سب شدائد اور سختیاں تمہارے معاصی کے بدلے میں کی ہیں لیکن اب تمہیں صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر چھوڑ رہا ہوں ورنہ تمہارے ٹکڑے کرنے میں مجھے کوئی شے مانع نہ تھی۔"

تیرہ (13) ذیقعدہ کو غلام قادر روہیلہ کو بتایا گیا کہ سلیمان شکوہ کی دو کم سن بہنیں جن میں سے ایک کی عمر پانچ سال اور دوسری کی چار سال تھی پانی نہ ملنے کی وجہ سے دم توڑ گئی ہیں تو یہ خبر سن کر وہ مسکرایا اور حکم دیا کہ وہ جہاں مری پڑی ہیں انہیں وہیں رہنے دیا جائے۔

25 ذیقعدہ کو غلام قادر روہیلہ نے شہزادہ اکبر اور سلیمان شکوہ وغیرہ جملہ انیس (19) شہزادوں اور شہزادیوں کو طلب کیا اور انہیں سخت لہجے میں اپنے سامنے ناچنے اور گانا سنانے کا حکم دیا انہوں نے کہا کہ ہمیں ناچنا اور گانا بالکل نہیں آتا تو روہیلہ کہنے لگا کہ ہم نے تمہارے ناچنے اور گانے کی بڑی تعریف سنی ہے لہٰذا یہ تو تمہیں بہرحال کرنا ہی پڑے گا۔ جب انکار کیا گیا تو روہیلہ نے حکم دیا کہ جو شہزادے شہزادیاں ناچنے اور گانے سے انکاری ہیں ان کی ناکیں کاٹ دی جائیں یہ حکم سنا تو بیچاروں نے ناچنا اور گانا شروع کر دیا۔

غلام قادر روہیلہ کے ساتھ ذلت آمیز سلوک ہوا تھا اس لئے اس نے انتقام کی آگ میں جل کر بادشاہ اور شہزادوں اور شہزادیوں سے ذلت آمیز سلوک کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی چنانچہ خیر الدین الہ آبادی لکھتا ہے کہ اس گانے ناچنے کی محفل میں غلام قادر روہیلہ نے سونے کا بہانہ کرکے اپنی تلوار ایک طرف رکھ دی اور آنکھیں موند لیں جیسے کوئی سچ مچ سو رہا ہو وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تیموری خاندان میں غیرت نام کی شے زندہ ہے یا مرچکی ہے لیکن کسی کو موت کے خوف نے وقت سے فائدہ اٹھانے کی مہلت نہ دی اور وہ مسلسل مجبور و مقہور بن کر ناچتے رہے۔ علامہ اقبال نے قوموں کے زوال کی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس واقعہ کو "بانگ درا" میں یوں نظم کیا ہے:

غلام قادر روہیلہ

روہیلہ کس قدر ظالم، جفا جو، کینہ پرور تھا
نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوک خنجر سے
دیا اہل حرم کو رقص کا فرماں ستمگر نے
یہ انداز ستم کم تر نہ تھا آثار محشر سے
بھلا تعمیل اس فرمان غیرت کش کی ممکن تھی؟
شہنشاہی حرم کی نازنینان سمن بر سے
بنایا آہ سامان طرب بیدرد نے ان کو
نہاں تھا حسن جن کا چشم مہر و ماہ و اختر سے
لرزتے تھے دل نازک، قدم مجبور جنبش تھے
رواں دریائے خوں شہزادیوں کے دیدہ تر سے
یونہی کچھ دیر تک محو نظر آنکھیں رہیں اس کی
کیا گھبرا کے پھر آزاد سر کو بار مغفر سے
کمر سے اٹھ کے تیغ جاں ستاں، آتش فشاں کھولی
سبق آموز تابانی ہوں انجم جس کے جوہر سے
رکھا خنجر کو آگے اور پھر کچھ سوچ کر لیٹا
تقاضا کر رہی تھی نیند گویا چشم احمر سے
بجھائے خواب کے پانی نے اخگر اس کی آنکھوں کے
نظر شرما گئی ظالم کی درد انگیز منظر سے
پھر اٹھا اور تیموری حرم سے یوں لگا کہنے
شکایت چاہئے تم کو نہ کچھ اپنے مقدر سے
مرا مسند پہ سو جانا بناوٹ تھی، تکلف تھا
کہ غفلت دور ہے شان صف آرایان لشکر سے
یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی
مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام تھا جس کا گئی تیمور کے گھر سے

غلام قادر روہیلہ کون تھا؟ : غلام قادر روہیلہ روہیل کھنڈ کے سردار ضابطہ خاں کا بیٹا تھا اور نجیب الدولہ کا پوتا تھا۔ نجیب الدولہ ان مسلم سرداروں میں شامل تھا جنہوں نے مرہٹوں کی سرکوبی کیلئے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کی دعوت دی تھی اور جس کے نتیجہ میں (1761ء)

میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو بری طرح شکست ہوئی تھی جس کا بدلہ مرہٹوں نے نجیب الدولہ کی وفات کے فوراً بعد لیا۔ اس موقع پر شاہ عالم ثانی کی فوجیں بھی مرہٹوں کے ساتھ تھیں اور ان لوگوں نے شہر نجیب آباد میں نجیب الدولہ کے خاندان کی خواتین کی بھی بے حرمتی کی تھی۔ غلام قادر روہیلہ ان دنوں چھوٹا سا تھا وہ ابھی نو عمر ہی تھا جب اسے شاہی دربار میں اس کے والد کا نمائندہ یا یرغمال بنا کر رکھا گیا تھا۔ 1190ھ (1776ء) میں ضابطہ خاں نے شاہی افواج کو شکست دی تو غلام قادر روہیلہ شاہی حراست سے فرار ہو کر غوث گڑھ کے قلعہ میں اپنے والد ضابطہ خاں سے آملا۔ یہ جگہ مولانا اشرف علی تھانوی کی جائے پیدائش تھانہ بھون کے قریب ہی ہے جو ضابطہ خاں اور ان کے خاندان کا صدر مقام تھا۔ اگلے برس 1191ھ میں مرہٹوں نے ضابطہ خاں کو شکست دی اور غلام قادر روہیلہ کو قیدی بنا کر دہلی لے گئے جہاں اسے لال قلعہ میں رکھا گیا۔ اور اس کے والد ضابطہ خاں کو ذلیل کرنے کی غرض سے زنانہ لباس پہنا کر شاہ عالم ثانی کے دربار میں پیش کیا گیا۔ بعد میں غلام قادر کو بھی بدکرداری کے ضمن میں خصی کر دیا گیا۔ والد کی وفات کے بعد غلام قادر روہیلہ اپنی جاگیروں کا وارث تو بن گیا لیکن اس نے نذرانہ جانشینی کی رسم ادا نہ کی۔ 1202ھ (1787ء) میں مرہٹہ سردار سندھیا نے سکھوں کی بیخ کنی کیلئے غلام قادر روہیلہ سے معاہدہ کر لیا لیکن غلام قادر روہیلہ نے نے اس معاہدہ کی پابندی نہ کی بلکہ مرہٹوں کے محصول وصول کرنے والے اہلکاروں کو اس نے اپنی راجدھانی سے نکال دیا اور شاہی خزانہ جو اس طرح قبضہ میں آیا' اسے تصرف میں لے آیا اور اس عرصے میں اسے ایک خواجہ سرا کی سرپرستی حاصل رہی جس کا نام حافظ منظور علی خاں تھا اور وہ بادشاہ پر حاوی تھا۔ اور غلام قادر روہیلہ مرہٹوں سے چھٹکارا پانے کی آرزو رکھتا تھا۔ اسی سال ماہ اگست 1787ء میں دہلی کے قریب انتظامیہ کو تصرف میں لانے کا دعویدار ہوا۔ اس سے اگلے مہینے اس نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور شاہ عالم ثانی کو مجبور کیا کہ وہ اسے میر بخشی اور امیر الامرا کے عہدوں پر مقرر کر دے کیونکہ ان عہدوں پر کسی زمانے میں اس کے والد ضابطہ خاں اور دادا نجیب الدولہ وغیرہ فائز رہے تھے۔ پھر غلام قادر روہیلہ نے دوآب کے علاقے کو تاراج کر کے شاہی اراضی پر قبضہ کر لیا۔ یہ وہ اراضی تھی جو بادشاہ کے ذاتی مصارف کیلئے مخصوص تھی۔ شوال 1202ھ (جولائی 1788ء) میں غلام قادر روہیلہ اپنے دوست اور مدار المہام خواجہ سرا منظور علی خاں کی سازش اور غداری کی بنا پر بے بس اور مجبور بن کر بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہوا اور پھر غلام قادر نے سازش سے شاہ عالم ثانی کو قیدی بنا لیا اور 26 شوال 1202ھ (30 جولائی 1788ء) کو معزول کرنے کے دس روز بعد بادشاہ کو بصارت سے محروم کر دیا گیا اور حرم شاہی کی خواتین پر کھانا اور پانی بند کر دیا۔ شہزادوں کو کوڑوں سے پٹوایا اور شہزادیوں کی آبروریزی کی گئی اور خصی کئے جانے کا انتقام لینے کیلئے غلام قادر روہیلہ نے شاہی خاندان پر خوفناک مظالم جاری رکھے اور . .

اپنے انتقام کے جذبے کو ٹھنڈا کرنے میں مصروف رہا اور پھر مرہٹوں نے اس کو ٹھکانے لگایا۔
(بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ' جلد 14-2' صفحہ 559, 560)

خیر الدین الہ آبادی نے ان واقعات میں ربط کے فقدان کو راہ دی ہے اور یکطرفہ مظالم کی داستان ہی سنائی ہے حالانکہ کہا جاتا ہے کہ اس ظلم کی شکایت کسی نے کی تو روہیلہ نے کہا کہ جب بادشاہ کے خادموں نے میرے والد کے خلوت خانے لوٹے تھے اور انہوں نے روہیلہ خواتین سے اس سے بھی بدتر سلوک کیا گیا تھا۔ آخر غلام قادر روہیلے کے مظالم کے بارے میں بادشاہ کے دوست مرہٹہ سردار سندھیا کو پتہ چلا تو اس نے غلام قادر روہیلہ کو شکست دی اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔

اسے سندھیا کے دربار میں پیش کیا گیا جس نے حکم دیا کہ اس کا ایک ایک عضو کاٹا جائے اس طرح اس نے اپنے ظالمانہ طرز عمل کی سزا پائی اور سسک سسک کر جاں دی۔ اس کی لاش ایک کھلے میدان میں ایک درخت کے ساتھ لٹکا دی گئی اور اس کے بدن سے خون کے قطرے نیچے گر رہے تھے۔ ایک کتا ان ٹپکتے ہوئے قطروں کو چاٹتا جا رہا تھا۔ ان واقعات سے انسان کو جو عبرت حاصل ہوتی ہے شاید اسی کی بنا پر اس کتاب کا نام عبرت نامہ رکھا گیا ہے۔

(6) سیر المتاخرین

(از غلام حسین طباطبائی)

غلام حسین طباطبائی 1140 ھ (1727ء) میں شاہجہان آباد میں پیدا ہوا۔ جہاں سے بوجہ غربت اس کا والد نقل مکانی کر گیا تھا۔ غلام حسین کی یہ کتاب 1783ء میں مکمل ہوئی۔ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں ہندوستان کی قدیم تاریخ اور جغرافیہ ہند کی تفصیل دی گئی ہے اس میں صوبہ وار اور علاقہ جات کی مناسبت سے لوگوں کی عادات و خصائل وغیرہ کا ذکر ہے اور مشہور صنعتی اور زرعی پیداوار پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ مختلف ادوار کا احاطہ کرتی ہوئی اورنگ زیب عالمگیر کی وفات تک کے حالات و واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کے ماخذوں میں خلاصتہ التواریخ کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن مصنف نے اس بات کا کہیں ذکر نہیں کیا۔ مصنف کا والد بنگال میں علی وردی خاں کی سفارش سے شجاع الدولہ کے دربار میں جا پہنچا۔

تاریخ ادبیات فارسی میں ہے کہ "مصنف نے یہ کتاب 1780ء میں لکھنا شروع کی جو 1783ء کے آخر میں تکمیل کو پہنچی۔ اس کی دوسری جلد مغل متاخرین سے متعلق ہے جس میں 1700ء سے 1786ء تک کے حالات و واقعات قلمبند کئے گئے ہیں جس میں حکومتی نا اہلی کی نشاندہی نکتہ چینی کے انداز میں سامنے آتی ہے۔ ایک دور ایسا بھی تھا جب مغل بادشاہوں نے تاریخ نویسی پر پابندی لگا دی تھی لہٰذا غلام حسین طباطبائی نے اس عرصہ میں وقوع پذیر ہونے والے سات بادشاہوں کا ذکر کافی اختصار سے کیا ہے اور اس اجمالی تذکرہ کے بعد انگریزوں کی برصغیر میں قدم جمانے کی داستانیں بھی اس نے رقم کی ہیں۔

یہ کتاب پہلی بار کلکتہ سے 1836ء میں حکم عبدالمجید نے شائع کی پھر اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی شائع ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ مل اور لارڈ میکالے نے اس کتاب سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔

سیر المتاخرین کی اہمیت : مصنف نے اپنے مشاہدات اور ذاتی معلومات کی بنا پر کتاب کو بہت مالا مال کیا ہے۔ اس کی زبان فارسی ہے اور سادگی اور بے تکلفی کے زیور سے آراستہ ہے۔ اسلوب بڑا واضح اور صاف ہے۔ زبان میں سادگی کے ساتھ ساتھ شگفتگی کا عنصر بھی شامل ہے۔ نیز ابہام نام کو نہیں لفظوں کا انتخاب بھی معنوی طور پر کافی ذمہ دارانہ ہے۔

غلام حسین طباطبائی نواب علی وردی خاں کا رشتہ دار بتایا جاتا ہے۔ غلام حسین کا والد ہدایت علی خاں تھا جو بہار کی حکومت میں مہابت جنگ کی صوبیداری میں مہابت جنگ کے بھتیجے اور داماد ہیبت جنگ کا نائب تھا۔ جن دنوں میں شاہ عالم' غازی الدین کی زد سے بچنے کیلئے راہ فرار اختیار کر گیا تو ہدایت علی خاں اس کے ساتھ ساتھ بطور میر بخشی ہم سفر رہا اور اپنے بیٹے غلام

حسین طباطبائی کو میر منشی لگوا دیا۔ پھر ہدایت علی خاں ریٹائر ہو کر رہتاس میں اپنی جاگیر پر چلا گیا اور قاسم علی خاں کی معزولی کے واقعہ کے کچھ عرصہ بعد اس نے وفات پائی۔

غلام حسین طباطبائی کی تاریخی کتاب سیر المتاخرین کی تاریخی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ متاخرین مغل دور کے کسی مورخ نے اسے نظر انداز نہیں کیا۔ اس کی دونوں جلدوں کے بارے میں پچھلے اوراق میں بات ہو چکی ہے۔ اس کی پہلی جلد خلاصۃ التواریخ سے ماخوذ ہے لیکن اس کا اعتراف مولف نے ہرگز نہیں کیا۔ ایلیٹ کی کتاب مختصر التواریخ سے استفادہ شدہ ہے اور شاید غلام حسین نے حوالہ دیتے وقت صرف یہ لکھا ہے کہ اس نے پہلی جلد لکھتے وقت ایک "قدیم منشی کی تالیف" سے استفادہ کیا ہے۔ غالباً طباطبائی نے مختصر التواریخ سے براہ راست استفادہ کیا تھا اسی لئے اس نے خلاصۃ التواریخ کا حوالہ دینا ضروری نہ سمجھا بلکہ مختصر التواریخ کے گمنام مولف کو "ایک قدیم منشی" کہہ کر جان چھڑا لی۔ کرنل لیز (LESS) نے اس کے ماخذ سے احتراز پر مولف پر نکتہ چینی کی ہے۔

سیر المتاخرین کی دوسری جلد میں 1700ء سے 1786ء تک کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے جس میں اس دور کے سات مغل بادشاہوں کے حالات دیئے ہیں۔ نیز اس نے بنگال میں انگریزی عہد حکومت کا بھی تذکرہ کیا ہے اور ان کے حالات کا اس نے 1781ء تک احاطہ کیا ہے۔ اس نے انگریزی حکومت کے خصائص بھی گنوائے ہیں۔

مصنف کی انگریزوں سے محبت : غلام حسین طباطبائی نے دوسری جلد میں انگریزوں کے حالات لکھتے وقت انہیں بڑے استحسان کی نظروں سے دیکھا ہے۔ وہ انگریزوں کی تعریف میں رطب اللسان ہے اور کہتا ہے کہ انگریز لوگ بدعنوان اور بے انصاف نہیں ہیں وہ ان کو ہر طرح کی کرپشن سے بری الذمہ قرار دیتا ہے۔ وہ انگریزوں کے ہر اقدام کو مبنی بر انصاف کہتا ہے۔ اسے انگریزوں کی کوئی بھی ظالمانہ پالیسی ظالمانہ نہیں لگتی اور اس کے اس رویہ کی تعریف ڈاکٹر ٹیننٹ (TENNANT) نے بھی کی ہے اور وہ خوش ہے کہ ان کے پیشرو انگریزوں کے کردار کے حق میں مثبت انداز کی یہ تحریر موجود ہے جس میں ان کے کردار کی تعریف کی گئی ہے تاہم کہیں کہیں انگریزی حکومت کے بعض نقائص کا ذکر بھی کیا ہے۔ غلام حسین طباطبائی کو انگریزوں سے صرف یہ شکایت تھی کہ جس طرح فارسی کتابیں یورپ میں چھپ رہی تھیں برصغیر میں ایسا کیوں نہیں ہوا۔

زبان و بیان : سیر المتاخرین کی زبان فارسی ہے اور انداز تحریر بے تکلفی اور سادگی کا مرقع ہے۔ اس نے "آمد" کی حامل اپنی تحریر کو جھوٹ سے مبرا قرار دیا ہے اور "آورد" کی نفی کی ہے اور کہا ہے کہ میں نے جو جو کچھ قابل اعتماد لوگوں سے سنا اسے اسی طرح قلمبند کر دیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ اگر کوئی واقعہ یا بات غلط ہوگی تو اس کا ذمہ دار بیان کرنے والا شخص ہوگا کیونکہ میں نے تو قابل اعتماد راوی پر بھروسہ کرکے ہی قدم بڑھایا ہے۔

مسلمانوں کی خیر خواہی : غلام حسین طباطبائی اسلام اور مسلمانوں کا تہ دل سے خیر خواہ ہے۔ جب بھی مسلمانوں پر آفت آتی ہے تو اس کا قلم ہمدردی کے سیلاب میں ڈوب جاتا ہے اور موقع ملتے ہی مسلمانوں کی بہادری کے قصے سنانے شروع کر دیتا ہے اگر مرد کی بجائے کسی عورت ذات نے بہادری دکھائی تو طباطبائی کو اس کی بہادری کے نغمے گانے کا موقع ہاتھ آگیا چنانچہ جب بالا جی راؤ مرہٹہ۔ مانگیر اور بھاگل پور پہنچ کر دونوں مسلمان قصبوں کو تباہ و برباد کر دیتا ہے اور غوث محمد نامی مسلمان سردار جب لڑتا ہوا شہادت پا جاتا ہے تو اس کی بیوی۔ شیرنی بن کر آگے آتی ہے اور اس نے موثر تقریر کرکے اپنے لوگوں کو مرہٹوں کے خلاف آخری دم تک لڑنے کیلئے مستعد کر دیا ہے اور اپنے شکستہ سے مکان میں یہ لوگ بڑی بہادری سے لڑنے لگتے ہیں حتیٰ کہ بہت سے مرد حضرات جام شہادت نوش کر جاتے ہیں لیکن ان کی کمانڈر یعنی غوث محمد کی بیوی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑ رہی ہے۔ اتنے میں بالاجی راؤ کو پتہ چلا کہ اس کی سپاہ کا مقابلہ ایک مسلمان خاتون سے ہے تو اس کو بڑی حیرت ہوتی ہے اور آخر اس نے اس دلیر عورت کی تعریف کی اور لڑائی بند کرکے اسے چند بیش قیمت دکنی لباس بھی بھجوائے۔

طباطبائی مورخ کے ساتھ ساتھ نقاد بھی ہے جو اپنی رائے کا اظہار بھی ہر واقعے کے ضمن میں کرتا جاتا ہے۔ جب میر حسین نامی ایک عیار اور مکار شخص نے جھوٹی پیری مریدی کا جال پھیلا کر اس میں سادہ لوگوں کو پھانس لیا تو ان میں فرخ سیر بھی شامل ہو جاتا ہے جو اس مکار کا مرید بن جاتا ہے جس نے پانچ نمازوں کے علاوہ تین اور نمازیں فرض قرار دے دی تھیں اور خلفائے راشدین کے مقابلے میں اپنے چار نئے خلفاء مقرر کر دیئے تھے۔ چنانچہ اس کی چال میں فرخ سیر جیسا "احمق اور نادان اور سرے سے جاہل شخص" بھی آگیا۔ اور اس طرح ایک جھوٹے مذہب کو فروغ ملنے لگا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ طباطبائی ایک مغل بادشاہ کو ایسے القاب دیتے وقت ذرا بھی خوف زدہ نہ ہوا۔ شاید اس لئے کہ وہ ان کی دسترس سے باہر تھا اور انگریزوں کے ساتھ اس کی گاڑھی چھنتی تھی ورنہ دریا میں رہ کر مگرمچھ کی مخالفت خاصا مشکل کام تھا۔

تعصب کی جھلک : غلام حسین طباطبائی شیعہ مسلک کا پیروکار تھا۔ چنانچہ جب محمد امین خاں نامی ایک شخص نے درد قولنج سے وفات پائی جو محمد شاہ کا وزیر تھا اور سنی مسلک رکھتا تھا تو طباطبائی نے اس واقعہ میں تعصب کا وہ رنگ بھرا جس سے مسلمانوں میں فرقہ واریت کے ناسور کی نشاندہی ہوتی ہے حالانکہ ایک ذمہ دار مسلمان مورخ کا فرض ہے کہ وہ ایسی کسی بات کو ہوا ہرگز نہ دے جو مسلمانوں میں باہمی مخالفانہ جذبات کو ابھارتی ہو جبکہ محمد امین خاں کے علاقہ کے لوگ اس کی شرافت اور نیک چلنی کے مداح تھے۔ بہرحال ایسی باتیں ایک مدبر اور بلند پایہ مورخ کو زیب نہیں دیتیں اور اگر کوئی "طباطبائی" کسی سنی مسلک کے شخص کے بارے میں اہل بیت اطہار اور حضرت علیؓ سے بغض رکھنے کا الزام لگائے تو ظاہر ہے کہ یہ الزام غلط ہے کیونکہ علی المرتضیٰ تو سنی حضرات کے (بسلسلہ تصوف) سب سے بڑے پیرو مرشد ہیں اور رسول اکرمؐ کے

چہیتے صحابی اور داماد ہیں اور مدینہ العلم کا دروازہ ہیں۔ غالباً یہی چپقلش تھی جس کی موجودگی نے ایرانی اور تورانی گروہوں کو تقویت بہم پہنچائی تھی اور یہی چپقلش آہستہ آہستہ برصغیر میں اسلامی سلطنت کے زوال کا باعث بن گئی۔ جس کا فائدہ انگریزوں نے اٹھایا۔ کچھ بھی ہو سیر المتاخرین کی بڑی اہمیت ہے۔ غلام حسین بعض واقعات کا خود عینی شاہد ہے اور بعض اس نے معتبر ذرائع سے حاصل کر کے لکھے ہیں۔ اپنے روایت کردہ واقعات وہ زیادہ تفصیل سے بیان کرتا ہے اور اس لحاظ سے اس کی یہ تاریخی دستاویز دیگر ہمعصر مورخین کی دستاویزات سے زیادہ مفصل ہے۔

غلام حسین چونکہ انگریزوں کا پنشن خوار اور مراعات یافتہ تھا اور اسے انگریزوں کی طرف سے ایک جاگیر بھی ملی تھی اور انگریزوں کے قریب رہنے کا موقع بھی اسے ملا تھا لہٰذا اس کا جھکاؤ انگریزوں کی طرف زیادہ تھا اور "منہ کھائے آنکھ شرمائے" کے مصداق اس نے مورخانہ حقائق کے تقدس کو پس پشت ڈال کر انگریزوں کی ہاں میں ہاں ملانے کو بھی اپنا اصول بنا لیا تھا حتیٰ کہ وہ سراج الدولہ کے مقابلے میں انگریزوں کی کھل کر حمایت کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مروت آکر پیشہ وارانہ فرائض سے چشم پوشی کر جاتا تھا۔ بہرحال برگر (جنرل) اسے اس کی نجی ترک کا درجہ دیتا ہے۔ ایلیٹ اور ڈاؤسن بھی اس کی تعریف کرتے ہیں۔ سیر المتاخرین میں خوبیاں بھی ہیں اور بعض کمزوریاں بھی ہیں تاہم یہ ایک معلوماتی اور اہم دستاویز ہے۔

غلام حسین طباطبائی کو انگریزوں سے اخلاص مندی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں بلکہ ان کے ساتھ اپنی وابستگی اور اخلاص مندی کا اظہار اپنی کتاب سیر المتاخرین یوں کرتا ہے:

> "چونکہ مورخ کو صاحبان انگلشی سے حد درجہ اخلاص اور اتحاد تھا۔ میر قاسم نے (پہلے ہی) میری معاشی مدد کے طور پر کچھ مقرر کر رکھا تھا۔ میں نے (انگریزوں کے ہاں اپنا ایک مقام پیدا کر لئے جانے کے بعد) فوراً انگریز حکام سے اس کا اظہار کر دیا۔ انہیں یہ بات معلوم تھی کہ پرگنہ مونگیر میں قلعہ کے قریب فدوی کی چھ لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر قدیم زمانہ سے چلی آرہی تھی اور میر جعفر نے وہ جائیداد ضبط کر لی تھی اور وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ فدوی کا والد بادشاہ کی رفاقت میں رہا تھا۔
>
> انگریز حکام نے مجھے اپنا بہت زیادہ اخلاص مند ہونے کے سبب مذکورہ جاگیر نہ صرف میر قاسم کو کہلوا کر بحال اور واگزار کروا دی تھی بلکہ انہوں نے اس کے دستخطوں اور میرے دستاویز کو مکمل کر کے وہ مجھے دلوا دی تھی جس کے بعد میں نے موقع پر جا کر عمل دخل کیا۔ جب برسات کا موسم گزر گیا اور میجر کرنگ نے مغل بادشاہ' موشیر لاس اور کامگار خاں کے خلاف جنگ کے ارادہ سے عظیم آباد سے کوچ کیا تو فدوی بھی انگریزوں کے حقوق کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے ساتھ شامل ہوا چونکہ سال ہا سال کی عسرت نے معاشی طور پر مجھے کنگال کر ڈالا تھا اور میرے پاس سامان سفر

اور جنگ کیلئے اسلحہ اور سواری کا انتظام نہ تھا لہٰذا میجر کرنگ نے کمپنی کی طرف سے مجھے ایک خیمہ، اور ایک گھوڑا مع لوازمات عنایت فرمایا۔"

اسی طرح وہ انگریزوں کی طرف سے میر قاسم کے پاس مرشد آباد میں ایک خط لیکر گیا تو وہ طباطبائی کے ساتھ مہربانی اور روایتی اخلاق سے پیش آیا لیکن رام نرائن نے گماشتہ جگت سیٹھ کی وساطت سے یہ لکھوایا کہ غلام حسین طباطبائی چونکہ انگریز حکام کے ساتھ حد درجہ اخلاص رکھتا ہے اور اس کے بھائی اور والد صاحب بادشاہ کے ہمراہ ہیں لہٰذا غلام حسین کو حقیقی معنوں میں فریقین یعنی انگریزوں اور بادشاہ کا مشترکہ نمائندہ سمجھنا چاہئے۔ جب یہ مضمون میر قاسم تک پہنچا تو اس نے فوراً طباطبائی پر سفارتی نوازشیں موقوف کر دیں اور بے التفاتی اختیار کر لی ایسی صورت میں غلام حسین بہت گھبرا گیا۔ اگر وہ اجازت لیتا ہے تو انگریزوں سے اس کی وابستگی مزید پختہ ہو کر میر قاسم کی ناگواری کو بڑھاتی ہے اور وہاں مزید ٹھہرنا گویا اپنی بے وقعتی میں اضافہ کرنا تھا آخر اسے اسہال نے آلیا اور اس بہانے رخصت جو میر قاسم نے بصد کراہت منظور کی، لیکر وہ اس منظر سے غائب ہوگیا لہٰذا بنگال کے زمانہ کے احوال و واقعات میں ہم اسے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتے۔ البتہ عالمگیر کی وفات سے لیکر بارہویں صدی ہجری کے آخر تک کے واقعات اس نے دیانتداری سے لکھے ہیں۔

باب 3

اٹھارہویں صدی میں مسلم سوسائٹی کا ڈھانچہ

اور غیر مسلم دھڑے

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں کہ مغل سوسائٹی تین طبقات میں منقسم تھی۔
(1) مسلمان امراء (2) غیر مسلم امراء (3) علاقائی حیثیت کے ساتھ مغل سوسائٹی میں شامل طبقہ

یہ طبقاتی معاشرہ ایک دن میں قائم نہیں ہوگیا تھا بلکہ اس کا آغاز بابر کے دور میں ہوا۔ ہمایوں نے بھی اس کے تھپیڑے سہے اور اسے اپنوں اور بیگانوں کی سنگدلی نے ایران بھاگنے پر مجبور کر دیا پھر وہ واپس آیا تو اکبر کے دور میں مغل سوسائٹی کا ڈھانچہ ایک متعین راہ پر چل نکلا جس پر اکبر کی گرفت بڑی سخت تھی چنانچہ اس معاشرہ نے اسے "اکبر اعظم" بنا دیا۔ جہانگیر کے دور میں بھی اس معاشرے نے ترقی جاری رکھی اور شاہجہان نے بھی اپنی سوجھ بوجھ اور فضل باری سے ایک باوقار سوسائٹی کو عروج بخشا۔ وہ دارا کو اپنا جانشین بنانے کے حق میں تھا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا چنانچہ اورنگ زیب عالمگیر کو مغل سوسائٹی میں شکست و ریخت کے عمل کو روکنے کیلئے کافی جدوجہد کرنا پڑی۔

ہندوستانی مسلم معاشرے میں طبقات

ناقدین نے سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں مغل سوسائٹی میں مسلم طبقات کی تعداد چار بیان کی ہے جن کی تفصیل اس طرح ہے:

تورانی : یہ لوگ مغلوں کے ساتھ وسط ایشیا سے آئے تھے اور حکمرانوں کے ساتھ اپنے تعلقات کی بنا پر انہیں فخر تھا۔ یہ طبقہ تورانی کہلاتا تھا۔ ان میں حکمران خاندان کے لوگ میرزا کہلاتے تھے جبکہ دوسرے لوگ جو ان کے ساتھ آئے تھے تورانی کہلاتے تھے۔ یہ سنی العقیدہ لوگ تھے۔

خصوصیات : یہ لوگ بڑے جنگجو بہادر اور دلیر تھے لیکن اخلاقی اعتبار سے بھی بہت بلند مقام پر فائز تھے۔ مہمان نوازی ان کا شیوہ تھا اور زیر تسلط دشمنوں کے ساتھ درشتی نہ برتتے اور لڑنے سے گریز کرتے تھے۔ اپنے ہی طبقہ کے لوگوں سے معاشرتی میل ملاپ ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ بیاہ شادی بھی اپنے ہی طبقہ میں کرتے۔ چنانچہ شاہجہان کے عہد تک اکثر تورانی امرا اپنی ان

خصوصیات کو قائم رکھے رہے اور راج دربار میں ان کا وقار مستحکم رہا لیکن پھر جب ان کے باہمی میل ملاپ کا دائرہ دوسرے لوگوں تک پھیل گیا تو شاہجہان کے بعد ان کے وقار کو دربار میں چیلنج کیا جانے لگا جس کی وجہ سے یہ طبقہ خاصا نقصان اٹھانے پر مجبور ہوگیا۔ شاہجہانی عہد میں اس طبقہ کا سردار قلیچ خاں غازی الدین فیروز جنگ تھا۔ اورنگ زیب کے دور میں بھی تورانی طبقہ کی باگ ڈور اور تربیت اسی کے ہاتھ میں رہی۔ اس گروہ میں جس قدر امرا صاحب حیثیت گردانے جاتے تھے ان میں اس کا باپ بھتیجا محمد امین خاں' اس کا چچا زاد بھائی سربلند خاں وغیرہ بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ یہی قلیچ خاں ہے جس نے آگے چل کر نظام الملک آصف جاہ کے نام سے شہرت پائی۔ یہ لوگ عقیدہ کے اعتبار سے سنی تھے جبکہ ان کے مقابل ایک طبقہ ایرانی کہلاتا تھا جو شیعہ عقائد کا حامل تھا۔ شیعہ سنی ہونے کے ناطے یہ دونوں طبقے ہمیشہ کشمکش میں مبتلا رہتے اور اسی طبقاتی کشمکش نے مغل سلطنت کو آخر چلتا کر دیا جس کے ساتھ دیگر عوامل نے بھی کارکردگی دکھائی۔ ان کا آبائی وطن ماوراالنہر تھا۔ تورانی طبقہ کی دو شاخیں تھیں :

1۔ یہ طبقہ مرزا کہلاتا تھا۔ اس میں بابر کے خاندان کے لوگوں کے علاوہ ترک بھی شامل تھے۔ اس طبقہ کے لوگوں اور امراء پر بادشاہ اور حکومت کو بڑا اعتماد تھا۔

2۔ یہ وہ لوگ تھے جو حملہ آور بادشاہوں کے ساتھ عوامی حیثیت سے قسمت آزمائی کیلئے ان کی فوج میں شامل ہو کر آئے تھے۔ اگر یہ لوگ بادشاہ کی حمایت کا فیصلہ کر لیتے تو اس کا بھرپور ساتھ دیتے تھے۔ بصورت دیگر دشمنی پر اتر آتے اور بغاوتوں کی سرکردگی اور قیادت نبھاتے تھے۔

ایرانی : تورانیوں کے خلاف جو طبقہ ابھرا وہ ایرانی کہلاتا ہے۔ یہ لوگ ہمایوں کے بعد مغل بادشاہوں کے دست راست کے طور پر سامنے آئے۔ مغلوں نے فوجی مقاصد کیلئے بارود کا استعمال ایرانیوں سے ہی سیکھا جس کی وجہ سے مغل لودھیوں پر فتح یاب ہوئے اور اس سبقت کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمایوں جب شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر بھاگا تو سیدھا ایران میں پناہ گزین ہوا جس طرح بابر کی دوستی صفوی خاندان سے تھی اسی طرح ہمایوں کو ایرانی بادشاہ طہماسپ کی دوستی پر ناز تھا۔ جس نے اس کی فوجی مدد کی اور بالاخر اسے اقتدار واپس دلا دیا۔ جس میں ایرانی سردار اور کمان دار بیرم خاں کی تدبیر کا بھی بڑا دخل تھا۔

ایرانی گروہ کے لوگ تین افتخار رکھتے تھے :

1۔ وہ اگرچہ خود حکمران نہ تھے لیکن حکمرانوں کے مددگار اور معاون بن کر ابھرنے تھے۔ بابر نے اپنی بہن کی شادی مہدی خواجہ سے کی اور کہتے ہیں کہ اپنا ولی عہد ہمایوں کی بجائے مہدی خواجہ کو نامزد کیا تھا۔ ایرانیوں نے ہندوستان فتح کرنے میں بھی بابر کی امداد کی تھی اور انتظامی صلاحیتوں کے حامل یہ امرا آخر انتظامی عہدوں کیلئے نہایت موزوں قرار پائے خصوصاً مفتوحہ علاقوں کا انتظام و انصرام انہی کے سپرد ہوتا تھا۔ بابر نے مختلف گورنر مقرر کیے تو اپنے بیٹوں کے بعد اس کی نظر انتخاب ایرانیوں پر پڑی۔

2۔ ایرانی طبقہ میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ لوگ ہر طرح کے لوگوں میں بہت جلد گھل مل جاتے تھے اور ان کے مذہبی' معاشرتی اور تمدنی رواج کو سمجھنے کیلئے ان کے علم و ادب کا مطالعہ بھی کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مغل دور میں ایرانیوں نے ہندوستان کو ایرانی تمدن اور تہذیب سے روشناس کرانے کی بطریق احسن کوشش کی۔

چنانچہ مسلمانوں اور مقامی لوگوں کے میل جول سے ایک نیا طبقاتی عنصر مسلمانوں میں پیدا ہوا جو اپنی مذہبی اقدار کا تحفظ قائم رکھتے ہوئے مغل دور کی سوسائٹی کا جزواعظم بن کر ابھرا اور ایرانی تہذیب و تمدن کی چھاپ اس سوسائٹی پر بڑی گہری تھی۔ اکبر اعظم کے دور میں بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین اس میل ملاپ نے مسلمانوں کی تمدنی بے راہروی کی بنیاد رکھی۔ جس کا مقابلہ کرنے کیلئے تورانیوں کو اپنا کردار ادا کرنا پڑا۔ ایرانی طبقہ کے لوگ شادی بیاہ کے معاملہ میں آزاد خیال تھے اور جہاں مناسب سمجھتے رشتے قائم کر لیتے جبکہ تورانی اس معاملے میں بہت محتاط رویہ رکھتے تھے۔

افغانی : یہ طبقہ افغانیوں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ شمالی ہندوستان کی وادیوں میں آباد ہوگئے تھے اور پٹھان کہلاتے تھے۔

1۔ یہ لوگ مغلوں کے دشمن تھے۔
2۔ تورانیوں کی طرح اپنی نسل کی حفاظت کرنے والے تھے اور اپنے ہی حلقہ اور طبقہ تک محدود رہتے تھے۔
3۔ حصول دولت کیلئے ان لوگوں کی حریصانہ کوششیں ہمیشہ جاری رہیں جب بھی موقع ملا یہ لوگ خودمختار ہو بیٹھے۔

ان خصوصیات کی بنا پر افغانیوں یا پٹھانوں کو مغل دور میں بھی خاصی اہمیت حاصل رہی۔ یہ لوگ طبعاً جنگجو تھے لیکن ان کے قبائلی' جغرافیائی اور علاقائی معاشرتی اثرات نے ان کو بعض اوقات ظالم بھی بنا دیا۔ یہ برصغیر میں اپنی حکومت قائم کرنے کی زبردست خواہش رکھتے تھے جس کا جنون اٹھارہویں صدی تک بھی ماند نہ پڑا۔ یہ مغلوں سے حکومت چھین لینا چاہتے تھے کیونکہ مغلوں نے بھی تو ان سے حکومت چھینی تھی۔

اس طبقہ کے لوگ ایرانیوں کی طرح روحانی طور پر ہر طرح کے لوگوں اور قبائل سے گھل مل جاتے تھے اور ان کی مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ افغانوں نے ہندوستان میں کم از کم تین بار اپنی حکومتیں قائم کیں۔

روہیلے کون تھے؟

روہیلوں کی حکومت کا بانی داؤد خان نامی افغان یا پٹھان تھا۔ جو کوہستانی علاقہ روہ کا باشندہ تھا۔ یہ علاقہ پاکستان کی شمالی مغربی سرحد پر واقع ہے۔ یہ سردار اپنے وطن کی مناسبت سے روہیلہ کہلاتا تھا۔

روہ کے علاقے کے بہت سے پٹھان بھی اس کے ساتھ ہو لئے اور چلتے چلتے "روہیل کھنڈ" کے علاقے پر قابض ہو کر جاگیردار بن گئے۔ یہ لوگ بمقام "کٹیٹر" آباد ہوگئے۔ داؤد خاں کی وفات کے بعد اس کے ساتھ پٹھان بھی ادھر ادھر منتشر ہوگئے تاہم ان کے بعد اس کا متبنی علی محمد خاں کٹیٹر کے فوجدار کے ہاں ملازم ہوگیا جس نے منتشر شدہ روہیلوں کو اپنے پاس پھر سے جمع کر لیا اور عقلمندی اور حکمت عملی سے آہستہ آہستہ اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا اور اس نے روہیلوں کی مدد سے علاقے پر قبضہ کر لیا جہاں ہر طرف روہیلے چھا گئے اور بعد ازاں روہیلوں کے اس علاقے نے روہیل کھنڈ کے نام سے شہرت پائی جو بریلی کے نزدیک واقع ہے۔ یہ لوگ سنی العقیدہ تھے روہیلوں کی تین ریاستیں تھیں :

(1) کالیٹر : علی محمد خاں روہیلہ اس کے سردار تھے جس کے بعد حافظ محمد رحمت خاں جانشین ہوا۔ جس نے شیر شاہ سوری کے کردار اور اصلاحات کو اپنایا۔

(2) فرخ آباد یا بنگش سٹیٹ : اس ریاست کا ولی بنگش درہ ٹوچی سے تعلق رکھتا تھا۔ جو ایک اچھا جرنیل تھا۔ شاہ عالم (والد اورنگ زیب) اور احمد شاہ کے دور میں اسے ایک جاگیر ملی جسے بنگش نے ریاست کا درجہ دے دیا۔ اس کا بیٹا قائم جنگ بنگش بھی بہت لائق جانشین ثابت ہوا اور اس نے اپنی ریاست کی حدود کو فرخ آباد سے دریائے چنبل تک وسعت دی جس کا دوسرا نام فرخ آباد تھا۔

(3) غوث کدہ یا سہارن پور : سہارپور کے نزدیک ایک افغان ریاست نجیب خاں نے قائم کی۔ یہ اٹھارہویں صدی میں بنگش نواب جس کا نام محمد خاں تھا کے پاس ملازم تھا۔

1791ء میں دہلی کے وزیر صفدر نے بغاوت کی تو اسے برطرف کر دیا گیا۔ باغیوں نے دوبارہ دہلی پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت نجیب خاں کو نجیب الدولہ کا خطاب دیکر سہارن پور کے قریب ایک وسیع قطعہ اراضی عطا کیا گیا جس کا نام اس نے نجیب آباد رکھا۔ یہ علاقہ ازیں پیشتر غوث کدہ کہلاتا تھا اسی نجیب الدولہ کے خاندان میں سے غلام قادر روہیلہ پیدا ہوا جس کے مظالم نے تاریخ میں بڑی شہرت پائی۔

یہ تینوں افغان ریاستیں اگرچہ اورنگ زیب کے بعد قائم ہوئیں لیکن ان کے قیام کی تہہ میں روہیلوں کا جذبہ خودمختاری و آزادی صدیوں سے موجزن تھا۔

ہندوستانی امراء

مغل سوسائٹی میں امرا کا ایک چھوٹا سا طبقہ ایسے لوگوں پر مشتمل تھا جو مسلمان تھے اور ہندوستان کے باشندے تھے۔ ان میں دو طبقے تھے :

1۔ ایک وہ جو مقامی باشندے تھے لیکن اسلام قبول کرکے مغلوں کی ملازمت میں داخل ہوگئے اور اسلامی ناطے سے اعتبار قائم کرکے اعلیٰ مناصب پر فائز ہوگئے۔

2۔ دوسرے وہ لوگ تھے جو وسط ایشیائی عربی' ایرانی تھے اور وہ ہندوستان میں ان آباد کاروں کی اولاد تھے۔ یہ لوگ یہاں آنے کے بعد مقامی خواتین سے شادیاں کرکے یہیں کے ہو کر رہ گئے تھے اور ان کی خاصیت یہ بھی تھی کہ یہ لوگ پیدل لڑائی کے ماہر تھے جبکہ ایرانی اور تورانی وغیرہ سوار ہو کر لڑنے کو ترجیح دیتے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں مسلمان راجپوت اور مسلمان جاٹ خاص شہرت رکھتے تھے۔ یہ لوگ مقامی لوگوں کی طرح عدلیہ اور مالیاتی نظام میں بھی مہارت رکھتے تھے اور دوسرے طبقات کی بہ نسبت زیادہ وسیع المشرب اور وسیع القلب بھی تھے۔ نیز مقامی تہذیب و تمدن اور اس کے قوانین سے بھی واقفیت رکھتے تھے جبکہ یہ لوگ اسلامی قوانین کے بھی ماہر تھے چنانچہ فقہی مناصب پر تقرریاں عموماً ان لوگوں کے حصہ میں آئیں۔ اس طبقہ کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ اس زمرہ کے لوگ دراصل محمود غزنوی کے دور سے آباد چلے آرہے تھے جن کی تعداد میں روزبروز اضافہ ہو رہا تھا۔

غیر مسلم طبقات اور مغل

راجپوت : یہ طبقہ مغلوں کے نزدیک بہت اہمیت رکھتا تھا۔ راجپوتوں کے دو گھرانوں میں سے ایک کی ہمدردیاں مغلوں کے ساتھ تھیں جبکہ دوسرا ان کا دشمن تھا۔ خود مغلوں کو راجپوتوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی ضرورت بھی تھی جب کہ دوسری طرف راجپوت بھی ان تعلقات کے خواہاں تھے اور دونوں فریق اسے ایک سیاسی ضرورت خیال کرتے تھے۔

راجپوتوں کی مغل دشمن شاخ : رانا پرتاپ سنگھ مغلوں سے تعلق رکھتا تھا۔ راجپوتوں کی مغل دشمن شاخ رانا پرتاپ سنگھ کے بعد کسی مغل بادشاہ سے تعاون پر تیار نہ ہوسکی۔ دور شاہجہان میں ملیر سنگھ اور اورنگ زیب کے عہد میں جسونت سنگھ اگرچہ نظریہ ضرورت کے تحت مغلوں کو خراج ادا کرنے پر مجبور ہوگئے اور ان کو اس کے بدلے میں مغلوں نے منصب بھی عطاء کئے لیکن یہ راجپوت مغلوں کی مخالفت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔

شہزادہ اورنگ زیب کو جب قندھار کی مہم پر جانے کا حکم ہوا تو اس کی فوجیں دکن

سے چلیں اور جب دریائے چنبل عبور کیا تو راجپوت مہاراجہ ممیر سنگھ (بلیر سنگھ) کی فوجوں نے مغل فوج کا سازوسامان لوٹ لیا چنانچہ اورنگ زیب نے قندھار سے واپسی پر راجپوتوں کی اس زیادتی کی شکایت شاہجہان کے دربار میں بھجوائی لیکن وہاں داراشکوہ مدارالمہام تھا لہٰذا اس نے اس شکایت پر کوئی کارروائی نہ ہونے دی اور اس کے بعد جلد ہی تخت نشینی کی جنگ چھڑ گئی۔

چتوڑ کی ریاست پر جسونت سنگھ قابض تھا اور اس کے باپ کی گدی اور اس کا منصب اسے منتقل ہو چکا تھا۔ تخت نشینی کی جنگ میں وہ عالمگیر سے اختلاف رکھتا تھا لیکن اورنگ زیب کی مکمل فتح کے بعد جسونت سنگھ نے مرزا راجہ جے سنگھ کے مشورے سے ہتھیار ڈال دیئے اور اورنگ زیب سے معافی مانگ لی۔ اورنگ زیب نے مرزا راجہ جے سنگھ اور جسونت سنگھ دونوں کو معاف کر دیا۔ لیکن جسونت سنگھ اورنگ زیب اور شجاع کے درمیان لڑائی میں اورنگ زیب کے خلاف لڑا اور جب شجاع کو شکست ہوگئی تو جسونت سنگھ نے پھر معافی کی درخواست کرکے معافی نامہ حاصل کر لیا اور عالمگیر نے وسیع القلبی کا ثبوت دیتے ہوئے انسانی فروگزاشت سمجھ کر اس کا قصور معاف کر دیا۔

جسونت سنگھ کابل کا گورنر تھا۔ وہ 1674ء میں مرا تو لاولد ہونے کی وجہ سے اس کی ریاست میواڑ پر حکومت نے قبضہ کر لیا۔ پھر راجپوتوں نے بادشاہ کو اطلاع دی کہ جسونت سنگھ کی دو رانیوں سے بعد از انتقال دو بیٹے پیدا ہوئے ہیں مقصد یہ تھا کہ ریاست کا انتظام ان کے ورثاء کے پاس رہے لیکن عالمگیر نے حکم دیا کہ ان لڑکوں کی پرورش شاہی محل میں کی جائے گی جیسا کہ مغلوں کا دستور ہے اور بالغ ہونے پر ان میں سے اہل تر بیٹے کو شاہی منصب اور جاگیر سے نوازا جائے گا۔

اس مشفقانہ سلوک کے جواب میں مغل دشمن راجپوتوں نے اورنگ زیب پر الزام لگایا کہ وہ ان کے بچوں کو مسلمان بنانا چاہتا ہے اور ایک فتنہ کھڑا کر دیا کہ بادشاہ بچوں کو قتل کرکے ریاست پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ پھر دونوں رانیوں اور دونوں بیٹوں کے ساتھ کنیز کے لباس میں ایک ہزار راجپوتوں کو ڈولیوں میں بٹھا کر کابل سے دہلی کی طرف روانہ کیا۔ اس قافلے کا سربراہ درگا داس تھا جب یہ لوگ دریائے اٹک عبور کرنے لگے تو پل پر چیکنگ کے خطرے کی وجہ سے وہاں پر موجود سو کے قریب شاہی کارندوں پر ڈولیوں میں سے نکل کر فوجیوں نے حملہ کرکے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بعد ازاں درگا داس اس قافلے کو لیکر چتوڑ پہنچا۔ ایک لڑکا بیماری سے راستہ میں مرگیا اور دوسرے کا اتالیق خود درگا داس بنا اور اسے میواڑ کا والی بنا کر حکومت کرنے لگا۔ اس لڑکے کا نام اجیت سنگھ تھا۔ چنانچہ اس بغاوت کو فرو کرنے کیلئے عالمگیر 1678ء میں اپنے بھائی مراد بخش سے ملاقات کے بہانے ادھر دیا۔ درگاہ داس اور اجیت سنگھ پہاڑوں میں جا چھپے۔ مراد بخش راجپوتانے سے بھاگ کر مرہٹوں کے علاقوں میں پناہ گزین ہوگیا۔ اس موقع پر عالمگیر نے نوٹس میں ایسے مندر لائے گئے جو مغلوں کی اسلامی سلطنت کے خلاف گڑھ بنے ہوئے تھے چنانچہ عالمگیر نے ان مندروں کو گرانے کا حکم دیا نیز اس موقع پر 1679ء میں اورنگ زیب نے

ہندوؤں پر جزیہ کا اسلامی ٹیکس عائد کرنے کا حکم دیا۔ اس طرح میواڑ کی ریاست عالمگیر کے عہد میں ہی مغلوں کے خلاف رویہ رکھے ہوئے تھی۔

راجپوتوں کی خصوصیات : یہ قوم اپنی نسلی بہادری اور بات کی دھنی ہونے کی وجہ سے شمالی ہند میں مشہور تھی۔ بات رکھنے کے اعتبار سے ایک راجپوت کی زبان سے جو بات نکل جاتی تو وہ بات سب کیلئے نسلی انا کی حامل بن جاتی۔ اکبر کے زمانے میں رانا سانگا اور شاہجہان کے دور میں رانا پرتاپ سنگھ نے اور اورنگ زیب کے زمانہ میں جسونت سنگھ وغیرہ نے مسلسل بغاوتیں کرکے ثابت کر دیا کہ انہوں نے مغلوں کی اطاعت دل سے قبول نہیں کی۔ جسونت سنگھ کے بیٹے اجیت سنگھ نے جاٹوں سے مل کر 1681ء میں سکندریہ کو لوٹا اور اکبر کی قبر کھود کر اس کی ہڈیاں نکال کر جلا ڈالیں۔ یہ گویا مغل دشمنی کی ایک بھیانک صورت تھی۔

چتوڑ کے راجپوت بقول ولیم ٹوڈ (ہسٹری آف راجپوت) داخلی طور پر چھوٹے طبقوں میں منقسم تھے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے سے کم ملتے۔ ہر کوئی اپنی اکڑ فوں میں رہتا۔ باہمی شادیاں کم ہوتی تھیں ان میں اکھڑپن بہت زیادہ تھا۔ کم ظرفی کے باعث ضرورت کے وقت معاہدہ کر لیتے لیکن مطلب نکلتے ہی اسے توڑ ڈالتے اور ماتھے پر آنکھیں رکھ کر بات کرتے۔

راجپوتوں کا تاریخی جائزہ :

1۔ راجپوت دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ویدک زمانے کے سورج بنسی اور چندر بنسی خاندانوں کے چشم و چراغ ہیں۔ ہندو مورخ اس دعویٰ کو تسلیم کرتے ہیں لیکن انگریز مورخ کہتے ہیں کہ راجپوت دراصل بیرونی حملہ آور قوموں مثلاً گورجر' شک' ہن وغیرہ کی اولاد ہیں۔ جو ہندو مذہب قبول کرکے باوقار بن گئے۔ درمیانے درجہ کے ہندو آہیر اور جاٹ کہلانے لگے۔ کچھ گوجر بن کے رہ گئے۔ البتہ بندھیل کھنڈ کے چنڈیل راجپوتوں کو وہ ہندوستان کے اصلی باشندے تسلیم کرتے ہیں۔

2۔ اگنی راجپوتوں کا دعویٰ ہے کہ وہ مقدس آگ سے پیدا ہونے والے چار سورماؤں (1) پرمار (2) پربیار (3) چوہان (4) چالوکید کی اولاد ہیں۔

3۔ وی اے سمتھ کے خیال میں آریاؤں کے دور میں ہندوستانی قومیں گونڈ اور بھیل تھیں ان کی جنگجو نسل حکومت پر قابض ہوگئی تو راجپوت کہلا[illegible] کوتیر' راشٹر' سنڈیل اور راٹھور ان کی اولاد ہیں۔

4۔ پنڈت گوری شنکر کا خیال ہے کہ راجپوت کھشتریوں کی اولاد ہیں اور آریہ نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو راجپوت بہادر لوگ تھے۔ بات کے دھنی۔ قول کے سچے اور اپنی قائم کردہ اخلاقی اقدار پر جا[illegible] چھڑکنے والے تھے۔

راجپوتوں کے بارے میں 73[illegible]1ء میں روزنامہ نوائے وقت لاہور بحث چھڑی تھی جس میں محترم نصرتی چوہان صاحب نے راج[illegible]توں [illegible] آل ابراہیم علیہ السلام سے اور حضرت آدم

سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد بتایا تھا۔ چنانچہ نصرتی چوہان صاحب کا مضمون بسلسلہ "راجپوت" جس کی آخری قسط 27/5/73 کے نوائے وقت لاہور میں شائع ہوئی تھی یہاں درج کیا جاتا ہے بعض پیراگراف میں بوجوہ کچھ اقتباسات کو قلم انداز بھی کر دیا گیا ہے تاکہ تسلسل میں بغیر کسی الجھاؤ کے فرق نہ پڑے۔ اس مضمون کا مقصد یہ بات سامنے لانا ہے کہ ہمارے راجپوت بھائی نسلی لحاظ سے اپنے بارے میں کیا سوچ رکھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بات کو کھینچ تان کر اپنے ڈھب پر لے آنا تاریخ کے ساتھ زیادتی شمار ہو سکتا ہے البتہ سب دنیا کے لوگ آدم علیہ اسلام کی اولاد ہیں خواہ وہ کہیں کے باشندے ہوں اور طوفان نوح علیہ السلام کے بعد ساری دنیا آدم ثانی (نوح علیہ السلام) کے بیٹوں کی اولاد ہے۔

چنانچہ نصرتی چوہان لکھتے ہیں کہ: آپ کے موقر جریدہ "نوائے وقت" کی 15 اپریل 1973ء کی اشاعت میں محترم میاں کفایت علی صاحب کا ایک مضمون "وطنیت کا مسئلہ اور اس کی حقیقت" نظر سے گزرا۔ میاں صاحب کا یہ تاریخی تجزیہ کہ مغربی پاکستان میں زیادہ تر لوگ ہن نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ علم الانسان اور تاریخی واقعات و شواہد کے منافی ہے جبکہ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ "مغربی پاکستان کی اکثریت زمانہ قدیم کے آریاؤں کی اولاد ہیں" اور آریہ بذات خود حضرت سام بن نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ مغربی مورخین بالخصوص جیمس ٹاڈ نے اپنی کتاب "تاریخ راجستھان" (The Annuls and Antibuities of Rajasthan) میں راجپوتوں کی ابتدا کے متعلق ہرزہ سرائی اور قیاس آرائی سے کام لیکر حقائق کو مسخ کر دیا ہے جو کہ انگریزوں کی سامی دشمنی ڈپلومیسی (Anti Sematic Diplomacy) کا نتیجہ ہے۔ جس میں ٹاڈ اور اس کی "قوم تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر گامزن تھی اور وہ کسی صورت میں یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ہندوستان کے راجپوتوں اور جزیرۃ العرب میں ابتداء آفرینش سے حضرت آدم علیہ اسلام اور اماں حوا کے ابتدائی ناموں سے جو رشتے قائم ہیں وہ زندہ رہیں اور مذہبی یا سیاسی زاویہ ہائے نگاہ سے یہ دونوں سیامی گروپ ایک ہو جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نسلی، معاشرتی، لسانی، ذہنی اور وجدانی قدروں کی مماثلت و مشارکت کے اعتبار سے ماسوائے عربوں کے راجپوتوں کے ساتھ براعظم ایشیا کی کوئی قوم مطابقت نہیں رکھتی ہے؟ سریانی، سنسکرت، آرامی، عبرانی، شوری، سومیری، فونیقی اور عربی ادبیات کی لاتعداد کتابیں چیخ چیخ کر پکار رہی ہیں کہ یوریشیا کے سلسلہ کوہ آتش فشاں کے جنوب یعنی کہ ہندوستان، جزیرۃ العرب عراق، شام، فلسطین اور شمالی افریقہ میں ابتدائے آفرینش سے صرف ایک ہی قوم بستی چلی آتی ہے اور وہ آل سام بن نوح علیہ اسلام ہے۔ اب اگر اقوام عالم کے کان مصلحت کوشی نے بہرے کر دیئے ہیں یا حسد و عناد نے ان کو اندھا کر دیا ہے تو اس میں آل ابراہیم کا کیا قصور ہے؟

قارئین "نوائے وقت" کی دلچسپی کیلئے ذیل میں ہم زمانہ جاہلیت کے عربوں اور موجودہ راجپوتوں کے "علم الاصنام" سے مختصراً روشناس کراتے ہیں۔

(1) رددا (عربی ود) حضرت آدم صفی اللہ کا اصل نام ہے۔

(2) سواء : (عربی سواء) عبرانی سیت سریانی شیث علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کے فرزند رشید ہیں چونکہ آپ ملہم اور معلم اول ہیں اس لئے سنسکرت میں آپ سوا خدائے علم (Siva The God of Letters) کہتے ہیں اور چونکہ آپ انتہائی جلالی (تیجسوی) تھے اس لئے صفات متقابل کے حامل برہمن آپ کو خدائے فساد (Siva the Destroyer) کہتے ہیں۔ فرشتوں نے بھی آپ کے اوپر قالوا تجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدما کہا انہوں نے کہا کیا تو اس زمین میں ایک ایسے شخص کو خلیفہ بنانا چاہتا ہے جو خرابیاں کرے اور کشت و خون کرتا پھرے۔" (البقرہ: 30)

کا گمان کیا تھا۔ چونکہ آپ فرزندان آدم میں سب سے بڑے اور سردار تھے اس لئے آپ کو "مہادیوا" کہتے ہیں۔

(3) مہا (The Great) + دیوا (Cellecibody) : یہ وہی آدم ہیں جن کا جسم اطہر نورانی تھا۔ آپ ہی کے صلب سے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبران کرام پیدا ہوئے ہیں۔ ازروئے وراثت چوہانوں کو مہادیوجی کا بیٹا کہتے ہیں۔ ساری دنیا میں وہ سلسلہ فقر آپ ہی سے چلتا ہے جس کے متعلق حضور اکرمؐ نے فرمایا ہے:

الفقر فخری والفقر منی

"فقر میرے لئے باعث فخر ہے اور فقر مجھ سے ہے۔"

چونکہ آپ نے جزیرۃ العرب خانہ کعبہ کی تاسیس کی تھی اس لئے سنسکرت میں خانہ کعبہ کو مہادیوجی کا مندر" کہتے ہیں۔ عصائے آدم ہے جو کہ تین شاخہ تھا۔ عربوں کی روایت کے مطابق یہ زیتون کا ڈنڈ موسم بہار میں پتے اور پھول نکال لیتا تھا اور اس کی شاخوں سے "انوار اللہ" کا انعکاس ہوتا تھا۔ تاریخی طور پر عصائے آدم وراثتاً منتقل ہوتا ہوا آل ابراہیم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام تک چلا آیا ہے۔ حضرت موسیٰ نے عصائے آدم اور توریت کی تختیاں بنی اسرائیل سے بدظن ہو کر صحرائے سینا میں کسی جگہ دفن کر دی تھیں۔

(4) اجا : (عربی نمری' قبطی آنس) حضرت شیث علیہ السلام کی بیوی ہیں جو کہ اپنے بڑے بیٹے ہوبرا کی نسبت سے اموہوبر (ہوبر کی ماں) یعنی کہ اماں حوا کہلاتی ہیں۔ سنسکرت میں ان کے دوسرے نام اوما (عربی عماء) اوشا صبح صادق اور درگا مائی ہیں۔ چونکہ جزیرۃ العرب کی حرارت اور تمازت سے آپ کا رنگ سیاہ ہوگیا تھا اس لئے آپ کو "کالی مائی" بھی کہتے ہیں۔

(5) ہوبرا : (حوبر' حبار' حرب' عرب) حضرت شیث علیہ السلام کے فرزند رشید ہیں۔

(6) اسکندا : (سکندر ذوالقرنین) حضرت ہوبرا کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ویدوں کے مطابق آپ نے ساری دنیا کو فتح کر لیا تھا۔

(حوالہ کیلئے دیکھئے البیرونی کی کتاب الہند)

(7) مہارشی الگرس : (حضرت ادریس علیہ السلام قبطی' آزریئیں' یونانی ایکاڈمس) آپ پہلے شخص ہیں جس نے حروف تہجی ایجاد کئے۔ ہندوستان سے نقل سکونت کر کے جزیرۃ العرب تشریف لے گئے تھے اور وہاں سے زندہ جنت الفردوس میں چلے گئے۔ آپ کشتی نوح میں سوار ہیں ویدوں کے مطابق بابا منوجی نے مہارشی انگرس کو بیٹا کہا ہے۔

(ہندو روایات اس کے خلاف ہیں۔ منوہر منوسترکے سمرتی رچنا ضابطہ قانون بنانے والے کو کہتے ہیں۔) (ادارہ نوائے وقت)

(8) بابا منوجی : (حضرت نوح علیہ السلام) منورکا' نوحہ وہ جو کہ روتا تھا) طوفان کی تباہ کاریوں پر آپ اکثر روئے ہیں۔ سومیری ادبیات میں آپ کا اسم مبارک شمشناپشتم متکی بر جبرئیل علیہ السلام ہے۔

(9) سوما : سومناتھ (Lord Soma) حضرت سام بن نوح علیہ السلام طوفان کے بعد صرف آپ ہی کے صلب سے سلسلہ الہام چلتا ہے۔ عبرانی زبان میں سام کے معنی بلند رتبہ آدمی ہیں۔ یافث (ایا و اللہ + مددگار ہے اور حام کے معنی "کالا آدمی" ہیں۔)

ہندوستان کے "آریہ" آپ ہی کی اولاد تھے۔ ثبوت کیلئے رگ وید کا مندرجہ ذیل اشوک ملاحظہ کیجئے :

Prajapati (Manu) Created king soma and afterwards the triple vedas were produced (rig-Veda III, 10) By Griffth.

جب پرجاپتی (منوجی) (یہ دونوں مختلف شخصیتیں ہیں (ادارہ) نے حضرت سام علیہ السلام کو راجہ بنایا تو تینوں ویدوں کی تدوین ہوئی۔ رگ وید' منڈل سوئم' سوکت)۔

دریں حالات دنیا کا وہ شخص سب سے بڑا جھوٹا اور دروغ باف ہے جو کہ آریاؤں کو غیر سامی قوم قرار دے کر خود ان کا جانشین بننا چاہتا ہے۔ چنانچہ یورپین قوموں میں سب سے پہلے جرمنوں کے سر پر آریہ بننے کا خبط سوار ہوا اور انہوں نے مافوق الفطرت انسان (Super Human) ہونے کا دعویٰ کرنے کے علاوہ آریاؤں کے سواستکار کو اپنا قومی نشان بنا لیا لیکن اقوام عالم نے دیکھ لیا کہ نازی جرمنوں کا کیا حشر ہوا؟ دور حاضرہ میں مشرق وسطیٰ کی ایک پارتھین قوم نے حال ہی میں "آریہ" ہونے کا بڑا زور شور سے پروپیگنڈہ شروع کر دیا ہے۔ دیکھئے اس کا کیا انجام ہوتا ہے؟

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

روحانی اعتبار سے قبائل شمسیہ کی بعض ایسی علامات ہیں جن کو اگر صفات متضاد کی اقوام و قبائل مریخ) اپنا لیں تو وہ علامات ان کی تباہی کا موجب بن جاتی ہیں چنانچہ ان کے لئے سانپ کا نشان ہی بہتر ہے لیکن شمس سواستیکا چکر سدرشن یا گاڑی کے پہیئے کا نشان ان کو "گھن

چکر" بنا دیتا ہے۔

(10) سوریہ : (فرشتہ شمس و قمر حضرت جبرئیل علیہ السلام) نسبت روحانیہ کے اعتبار سے زمانہ قدیم کے آریا ان کو اپنا روحانی باپ (استاد) سمجھتے ہیں۔ اشوریوں کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دیوتا کا نام آشر (لفظ اسر سے بنا ہے۔ (دیوا سر سنگرام کی تقابل میں یہی ہے۔)
(سنسکرت ایشور) اور اپنے ملک کا نام "الشوریہ" ملک شام رکھ لیا تھا۔ چوہانوں کی ماں کنی (حضرت قنطورہ کنعان کی رہنے والی "اشوری" تھیں۔ چنانچہ جو شخص راجپوتوں اور ان کے آباؤ اجداد کے متعلق تحقیق کرنا چاہتا ہے اسے راجستھان کی تہذیب' تمدن' ثقافت' زبان' تاریخ اور ذہنی و فکری قدروں کا اشوری اور سومیری اقوام کی باقیات سے تقابلی مطالعہ کرنا چاہئے۔

(11) منو سمرتی : صحیفہ نوح علیہ اسلام حمورابی کا قانون۔

(12) نردا : سومیری' زعدار' عربی نمرود) کوش بن حام کی اولاد میں مخلوط النسل حبشی تھا اور پیشہ کے اعتبار سے لوہار۔ اس کا دوسرا نام فریدوں ہے (دیکھئے تاریخ الطوال مصنفہ دینوری) ام سامیہ کا بدترین دشمن تھا۔ برہمنوں نے کوہ طور پر حضرت موسیٰ کے واقعہ تجلی کو اس کے ساتھ منسوب کر دیا ہے۔ (دیکھئے کتاب الہند' البیرونی) اور منو سمرتی کے راویوں میں اس کا نام بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

(13) : اب ہم منو سمرتی کے ان دس عمائدین کے اسمائے گرامی سے روشناس کراتے ہیں جن کو ابنائے آدم علیہ السلام میں امتیاز حاصل ہے۔
ہے دوج سریشو (عمائدین) اس جاٹ پرش (شخص اکبر) نے تپ و ریاضت کرکے جس کو چتن (پیدا) کیا۔ وہ سب کا اپتن کرنے والا (خالق) مجھی کو جانو (33) میں نے پرجا (مخلوق)' چتن (پیدا) کرنے کی اچھا (خواہش) سے اگر (سخت) تپ (ریاضت) کرکے پوجا کے پت (مخلوق کیلئے) دش (10) مہان پرشوں (عمائدین) کو پرتھم اول پرت بن (تخلیق) کیا۔ (34)
ان دش مہان پرشوں کے نام مریچ' مرسکھا' ملیقا' اتری' ترح' تارح' آذر) اگوس' ادریس علیہ السلام آدریس) پیشہ (فلسطے جن کے نام پر فلسطین آباد ہوا۔ پلہہ' حضرت صالح فالغ) کرت؟ پرچیتو' وسشٹھ شری (رام چندر جی کے مشیر) بھرگور (حضرت ارغو) اور نارد (زعدار' نمرود) کو (35)

ان بڑے پرکاش والے (نوری) دش (10) پرجاتیوں (حکمرانوں) نے انیر (مختلف) بڑے کانت والے منو (انسان) تھا (اور) دیوتوں (ملائکہ) اور ان کے استھانوں (مقامات) اور برہمریشوں (ولیوں) کو اپتن (پیدا) کیا۔ (36) منو سمرتی (پرتھموا دھیائے)

نوٹ : شخص اکبر کیلئے امام شاہ ولی اللہ دہلوی کی کتاب "المعارف" ملاحظہ کیجئے۔ (ادارہ)

(14) : ارتمید (ارفخشد) حضرت سام بن نوح علیہ السلام کے فرزند ہیں۔

(15) : الیہ (ملات' لات) حضرت ارفخشد کی بہن ہے۔ زمانہ جاہلیت کے عرب ان کو خدا کی بیٹی کہتے تھے۔ الیہ راجپوتوں کے شجرہ نسب مرتبہ جمیس ٹاڈ میں موجود ہے۔

(16) : اب ہم علامہ ابن اثیر کی کتاب تاریخ الکامل میں مندرج حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا شجرہ نسب بتاتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام (برہما جی) بن تارح (آتری) بن ناخور (ناہر بن ساروغ بن ساروگ) بن ارغو (مہارشی بھرگو) بن فالغ (پلمہ) بن (؟) یقطن بن عابر (؟) بن ارفخشد (ار تمیدا) بن سام (سوما) بن نوح علیہ السلام (منوجی)

(17) : سرسوتی (حضرت سارہ علیہ اسلام) حضرت ابراہیم (برہما جی) کی بیوی ہیں۔

(18) : جمنا (زہرا المعروف ہاجرہ) حضرت ابراہیم علیہ اسلام کی دوسری بیوی ہیں۔

(19) : کنتی (قنطورہ) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تیسری بیوی ہیں۔

(20) : برہما ورتہ ہندوستان کے آریاؤں نے اپنی تینوں ماؤں کے نام پر سرسوتی انبالہ کے پاس دریائے (گھگر) جمنا (جمنا) اور کنتی عرف گنگا مائی کے دریاؤں کے نام رکھے تھے اور ان کے درمیانی علاقہ کو برہما ورت کہتے تھے؟

(21) : حضرت ابراہیم علیہ اسلام (برہما جی) کی تیسری بیوی حضرت قنطورہ کے چھ لڑکے تھے۔ زمران' یقسان' مدان' مدیان' اسباق اور سرخ۔ ان میں سے حضرت سرح (سریات) اور حضرت اسباق (اکشواکا) راجپوتوں کے شجرہ نسب مرتبہ جیمس ٹاڈ میں موجود ہیں۔ حضرت (اکشواکا) کی 58 ویں پشت میں شری رام چندر جی ہیں۔ رام چندر جی کے دو بیٹے تھے۔ لاہو جس نے لاہور آباد کیا اور دوسرا کوسا جس کے نام پر قصور ہے۔ کوسا کی اولاد جنوبی ہند میں چالوکیہ خاندان ہے اور راجہ لاہور کی اولاد میں چالیسویں پشت میں راجہ چوہان تھے۔

بنی قنطورہ میں یہ پہلا شخص ہے جو کہ مسلک ابراہیمی علیہ اسلام اسلام کو ترک کرکے ہندو بن گیا تھا اور کوہ آبو کے ہون کنڈ پر راجپوتوں کے جن چار قبیلوں کو برہمنوں نے شدھی غسل نار کیا تھا ان کے نام یہ ہیں :

(1) پنوارا (2) چالوکیہ (3) بھٹی (4) چوہان۔

اور ان کو "اگنی کلا" یعنی کہ غسل نار کے ذریعہ مرتد ہو جانے والے خاندان کہتے ہیں۔ ان خاندانوں میں پنوارا اور بھٹی چندر بنسی راجپوت ہیں جبکہ چوہان اور چالوکیہ سورج بنسی راجپوت ہیں۔

راجہ انہل چوہان نے انہلواڑا آباد کیا تھا اور اس کی چالیسویں پشت میں راجہ پرتھوی راج چوہان تھا۔ بالفاظ دیگر پرتھوی راج چوہان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی 149 ویں پشت میں تھا۔ موجودہ دور تک تقریباً 24 پشتیں اور گزر گئی ہیں گویا کہ موجودہ چوہان حضرت ابراہیم علیہ

اسلام کی تقریباً 163 ویں پشت میں ہیں۔

اب ذرا قرآن مجید کی طرف آیئے کہ کلام اللہ آل ابراہیم (راجپوتوں) کے شدھی (فاسق) ہو جانے کو کن الفاظ میں بیان کرتا ہے:

ولقد ارسلنا نوحا و ابراھیم وجعلنا فی ذریتھما النبوۃ والکتب فمنھم مھتد و کثیر منھم فسقون (26 : الحدید)

اور ہم نے نوح (منوجی) اور ابراہیم (برہماجی) کو پیغمبر بنا کر بھیجا اور ان کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب کے سلسلے کو وقتاً فوقتاً جاری رکھا تو بعض تو ان میں ہدایت یافتہ ہیں لیکن اکثر فاسق ہے۔ (حدید : 26)

بھی (بھی + ایل یہ ہبل) راجپوتوں کے شجرہ نسب مرتبہ جیمس ٹاڈ میں بھی آل ابراہیم ہے۔ ایک سادھو تھا جو کہ جنگلوں میں مجروانہ زندگی گزارتا تھا لیکن عربوں کی روایت کے مطابق ہبل ایک خدا رسیدہ شخص تھا جو کہ مسافروں کو ٹھنڈا پانی اور ستو پلایا کرتا تھا۔ ظہور اسلام کے وقت اس کا بت خانہ کعبہ کی چھت پر رکھا ہوا تھا۔

جادو بمرانی جیکب' عربی یعقوب علیہ السلام شری کرشن جی کا مورث اعلیٰ تھا۔ اسی کی نسبت سے آپ کو جادو بنسی کہتے ہیں۔

دیوا (عبرانی دیوہ' عربی داؤد علیہ السلام) حضرت شری کرشن جی ہیں۔ جنہوں نے تلنگانہ میں ایک قوی الجثہ دیو (راجہ) کو مارا تھا۔ (توریت کا GOLLIATH ان کی کتاب بھگوت گیتا اگر زبور نہیں ہے تو نہ سہی لیکن فلسفہ روحانیت کی اتنی ادق کتاب ضرور ہے کہ اس کی تفہیم سے مجوسی الاصل ملا پنڈت اور پادری قاصر ہیں۔ جہاں تک لحن داؤدی کا تعلق ہے؟ برہمن کہتا ہے کہ آپ بڑی اچھی بانسری بجاتے تھے لیکن گانے کا راز کوئی بھٹی یا پنوار راجپوت ہی بتا سکتا ہے؟

بدھا : (ذی الکفل) ذی والا + کفل (کپل) یعنی کہ کپل وستو والا۔

وانہ کان مع الصابرین

اور وہ صبر کرنے والوں میں سے تھا۔ (القرآن)

سالباھن : (حضرت سلیمان علیہ اسلام) دیوا (داؤد) کی 23 ویں پشت میں بھٹی اور پنوار راجپوتوں کا مورث اعلیٰ ہے۔ تخت ہزارہ کے علاوہ کوہ ہندوکش میں ایک تخت سلیمان علیہ السلام بھی ان کی یادگار ہے۔ سنا ہے راجہ سالباہن نے بہت سے یو اور پریوں کو قابو میں کر رکھا تھا لیکن جہاں تک کرہ ارض کی جہانبانی کا تعلق ہے۔ پنوار راجپوتوں میں زمانہ قدیم سے ایک کہاوت چلی آرہی ہے۔ "ساری دنیا پنواروں کی مٹھی میں ہے۔ (The world is in the fist of the pramaras) اللہ جانے سچے ہیں یا جھوٹے مجھے تو دال میں کچھ کالا کالا نظر آتا ہے؟

تاریخی طور پر راجپوتوں کو آل ابراہیم ثابت کرنے سے بات نہیں بنتی ہے بلکہ سب

سے بڑا مسئلہ اس ارشاد خداوندی کا ہے

فجلعنا فی ذریتهما النبوه والكتب

اور ان کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب کے سلسلے کو وقتاً فوقتاً جاری رکھا۔

جہاں تک نبوت کا تعلق ہے اقوام عالم کی مرضی ہے کہ مندرجہ بالا مشاہیر میں سے کسی کو نبی مانیں یا نہ مانیں لیکن آل ابراہیم علیہ السلام (راجپوتوں) میں کتاب (قرآن) کا وجود لازم و ملزم ہے؟ اگرچہ عربوں میں قریش بھی آل ابراہیم تھے اور ان کے پاس کوئی کتاب نہ تھی لیکن حضور پاک کی وساطت سے ان کو کتاب (قرآن) مل گئی۔ اپنا معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ بالفاظ دیگر ایک جاہل اور فاسق قوم سے اللہ تعالیٰ مطالبہ کر رہا ہے کہ تمہارے پاس میری کتاب تھی وہ کہاں ہے؟

مانا کہ سرسوتی (حضرت سارہ علیہ اسلام) میری نانی ہے لیکن ماں تو بھٹی اور نپوار راجپوتوں ہی کی ہے۔ ننھیال والے مجھے کیا لڈو کھلاتے ہیں جو میں ویدوں میں سے قرآن نکال کر اقوام عالم کو پیش کروں؟

لیکن راجپوتوں کو بذات خود اپنے آباؤ اجداد کی ویدوں کا مطالعہ نہیں کرنا چاہئے کیونکہ برہمنوں کی اجازت کے بغیر ہندو راجپوت وید پڑھ نہیں سکتا ہے۔ (راجپوت وید پڑھ سکتا ہے پڑھا نہیں سکتا' ادارہ) ملا مسلمان راجپوتوں سے یہ کہتا ہے کہ اگر تم نے کافروں کے ویدوں کو پڑھا تو خود بھی کافر ہو جاؤ گے؟ اور مجموعی طور پر ان ملاؤں اور پنڈتوں کی نسل کے باپ طمورت نے جو مذاہب عالم کی سیادت و قیادت سے آل ابراہیم کو محروم کر کے جنت' بیکمنٹ اور ہیون کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے (طمورت' نام پادشاہے است از ابنائے ہوشنگ کہ شیطان را مرکب خود ساختہ بود' در اول و آخر ایں لفظ تار فوقانی خواہد بود از برہان و سراج (غیاث اللغات) تمورت (ترمورتی) (THREE FACED) یعنی کہ ایک ہی فرد (قوم) جو کہ ملا' پنڈت اور پادری ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وید کے لفظی معنی "عقل و دانش" (Wisdom) کے ہیں اور اگر خدانخواستہ راجپوتوں میں عقل قسم کی کوئی چیز پیدا ہوگئی تو ملا پنڈت اور پادریوں کو مذہب کے نام پر بیوقوف بنانے کیلئے احمق کہاں سے ملیں گے؟ تیسری بات یہ ہے کہ وید سنسکرت میں ہیں اور سنسکرت اہل جنت کی زبان ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جب آدم علیہ السلام جنت سے اتر کر زمین پر آئے تو وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ سریانی زبان میں باتیں کیا کرتے تھے کیونکہ وہ ابھی ابھی جنت سے آئے تھے۔ لہٰذا انہیں معنی کی صاف معرفت حاصل تھی لہٰذا سریانی زبان اپنی اصل حالت پر بغیر تغیر و تبدل کے ان کی اولاد میں قائم رہی حتیٰ کہ حضرت ادریس علیہ اسلام گزر گئے تو ان میں تغیر و تبدل شروع ہوا اور لوگ اس کو اپنی اصل سے منتقل کرنے اور اس سے اپنی اپنی بولیاں نکالنے لگے چنانچہ سب سے پہلے زبان جو اس سے نکالا گئی وہ ہندوستان کی زبان (سنسکرت) ہے۔ اسی لئے یہ زبان سریانی سے قریب ترین ہے اور فرمایا کہ حضرت آدم علیہ اسلام جنت سے اترنے کے بعد سریانی زبان میں اس لئے باتیں کرتے تھے کہ یہ اہل جنت کی زبان ہے اور وہ جنت میں یہی زبان

بولا کرتے تھے اور جنت سے یہی زبان لے کر وہ دنیا میں آئے۔ (ص 256' ابریز (خزینہ معارف' مصنفہ علامہ احمد بن مبارک سلجاسی از منقولات سید عبدالعزیز تاریخ المغربی ترجمہ : ڈاکٹر پیر محمد حسن ایم اے پی ایچ ڈی' مطبوعہ علمی کتاب خانہ اردو بازار لاہور)

بایں ہمہ برصغیر ہندو پاک کی ملکی اور غیر ملکی ہر قوم کے دل میں یہی خواہش پائی جاتی ہے کہ "راجپوت اپنے ملک میں اگر زندہ رہیں تو ذلیل و خوار ہو کر اور اگر مریں تو آپس میں کتوں کی طرح لڑ کر مریں۔"

در کوئے نیک نامی مارا گزرندوا رند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضارا

لیکن میرے بچو! گوش ہوش سے سنو؟ یہ تو روح کائنات' کی آواز ہے؟
جب میں (جوہر ابراہیمی علیہ اسلام) نہ تھا تو کچھ بھی نہ تھا؟ اور جب میں نہ ہوں گا تو اس کائنات میں کچھ بھی نہ ہوگا؟ میرے ہی وجود روحانیہ سے اقوام عالم میں رشتہ اخوت قائم ہے اور جب غیر سامی قومیں اس میں انتشار پیدا کر دیں گی تو جو اقوام عالم آپس میں بھڑ جائیں گی حتیٰ کہ بھائی بھائی کو قتل کر دے گا؟

ولو نزلنه علی بعض الا عجمین فقراه علیهم ماکا نوابه مومنین (198، 199 : الشعراء)

(اور اگر ہم اس (قرآن) کو کسی عجمی پر اتارتے اور وہ اسے (اپنی قوم کو) پڑھ کر سناتا تو یہ اسے بھی نہ مانتے۔"

اس آیہ کریمہ کے اندر عجمیوں کی جہالت اور ان کے قلوب میں کفر بالفطرت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

(نوائے وقت لاہور' مورخہ 27 مئی 1973ء)

نصرتی چوہان کے خیالات کی تردید میں رشید احمد خاں باجوہ نے لکھا کہ آریہ اور یہودی الگ الگ قومیں ہیں۔ چنانچہ وہ "بسلسلہ راجپوت اور آل ابراہیم" بعنوان "افکار قارئین" (روزنامہ نوائے وقت لاہور مورخہ 5/7/1974) میں لکھتے ہیں کہ :

جناب نصرتی چوہان اور جناب اختر چشتی کے "تاریخی اور تحقیق" مضامین موقر جریدہ نوائے وقت کی وساطت سے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ دونوں محققین کی کاوش قابل داد ہے لیکن یہ کوئی تاریخی کاوش نہیں ہے۔ ان دونوں صاحبان کی راجپوتوں کو آل ابراہیم اور یہودی النسل اسرائیلی ثابت کرنے کی کوشش محض تضیع اوقات اور دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے۔ ایسا کرنا یقیناً سوشیالوجی کے اصولوں سے نابلد ہونے کا ثبوت ہے۔ صرف لفظی اور صوتی مشابہات کے سہارے کوئی قابل اعتماد نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ بھلا تاریخ کے بغیر کون اس تحقیق کو ٹھیک جانے گا۔ اس کام کے لیے زمان و مکان کے عنصر کی اشد ضرورت تھی جس کی ان مضمون نگاروں

نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور صرف لفظی مشابہات کے سہارے شب دیجور میں روشنی کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن روشنی کیسے میسر ہوتی۔ نامعلوم ان صاحبان نے کس حد کے تحت یہ نئی تحقیق کی ہے اور اس کے پیچھے کون سی تحریک کارفرما ہے۔

پیشتر اس کے ہم صحیح صورت حال پیش کریں درست معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحبان نے جہاں کہیں کوئی تاریخی بات کی ہے اس کو تاریخ اور سوشیالوجی کے اصولوں کی کسوٹی پر پرکھیں تاکہ کھرا اور کھوٹا الگ ہو جائے۔ نصرتی چوہان نے صرف لفظوں کے تطابق سے کام لیا ہے اور کسی مستند کتاب سے کوئی حوالہ پیش نہیں کیا۔ البتہ اختر چشتی نے ایک دو جگہ دو تاریخی بات کہی ہے۔ ہم پہلے اس کو لیتے ہیں۔

اختر چشتی صاحب نے "سرگزشت آل ابراہیم" نامی کتاب سے طویل خلاصہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے "اور پھر انہیں کنوڈ آبو پہاڑ پر ایک خاص اہتمام کیا گیا اور وشنو دھرم کے وضع کردہ طریقوں سے آگ کے ایک بڑے الاؤ کے سامنے یہودیوں کو جو امتداد زمانہ کی وجہ سے پہلے ہی دین ابراہیم سے بھٹکے ہوئے تھے وشنو دھرم میں شامل کر لیا گیا اور راجپوت کا لقب دیکر بھارت درش میں حکومت کرنے کا حق انہیں دے دیا گیا۔"

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہودیوں کو کب اور کس دور میں وشنو دھرم میں شامل کیا گیا؟ کیا اختر چشتی اس سلسلہ میں کسی عہد کا تعین کر سکیں گے؟ اگر انہوں نے زمانہ کی صراحت کی ہوتی تو زیادہ بحث کی ضرورت نہ ہوتی لیکن گتھی کو سلجھانے کے لیے کافی تگ و دو کی ضرورت ہو گی۔ فاضل مضمون نگار کے مضمون سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کوہ آبو پر پوتر اگنی جلائے جانے کا واقعہ مسیح علیہ اسلام کی پیدائش سے بہت پہلے کا ہے کیونکہ مضمون نگار نے رام چندر جی کو یہودی گردانا ہے اور رام چندر کا زمانہ 500 ق م کا قیاس کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ یہودیوں کو راجپوت کا لقب اس برصغیر میں صدیوں قبل مسیح دیا گیا۔ اگر ایسا ہے تو کیا چشتی صاحب قبل مسیح کسی راجپوت قبیلے کا انکشاف فرمائیں گے؟ کیونکہ مورخین کا خیال ہے کہ "راجپوت" کا لفظ پہلی بار ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں استعمال ہوا۔ اس سے پہلے راجپوتوں کے کسی قبیلے کا بھی ذکر نہیں ملتا۔

مضمون نگار نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ رام چندر جی یہودی تھے اور لادیوں نے برہمن بن کر زبور کو رگ وید بنا ڈالا اور داؤد علیہ السلام کو کرشن بنا دیا۔ بھلا بیسویں صدی کے اس بڑے انکشاف کو کون تسلیم کرے گا؟ تاریخ کا معمولی اور اوسط درجے کا طالب علم بھی جانتا ہے کہ رام چندر نسلاً" اعتبار سے آریہ تھے اور ایسے ہی کرشن اور رگ وید آریوں کی قدیم مقدس کتاب ہے۔

ہم مزید صراحت کے لیے آریہ قوم کی کتاب اور عہد کا اجمالاً ذکر کرتے ہیں کہ آریہ اور یہودیوں کے درمیان خط امتیاز کھینچا جا سکے۔ آریہ قوم کی چار مقدس کتب ہیں جن کو وہ وید کہتے ہیں۔ ان کتابوں کے نام ہیں رگ وید' یجر وید' اتھر وید اور سام وید۔ رگ وید کے بھجن یا

شلوک سنسکرت زبان میں ہیں اور ان میں اکثر دیوتاؤں اور مظاہر قدرت کا ذکر ہے۔ رگ وید اس دور میں لکھی گئی جب آریہ قوم پنجاب اور سندھ میں مقیم تھی۔ اسی لئے سپتا سندھ کے دریاؤں کی تعریف اکثر ملتی ہے۔ اس دور کو جس میں رگ وید لکھی گئی رگ ویدک تہذیب کہتے ہیں۔ Vedic زمانہ کے بارے میں تاریخوں کا صحیح تعین کرنا ممکن نہیں لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ زمانہ 4500 ق م اور 2500 ق م کے درمیان کا ہے۔ Vedic Age کے بعد زمانہ شجاعت Epic Age آتا ہے۔ زمانہ شجاعت مسیح کی پیدائش سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے ختم ہو چکا تھا اور اسی زمانہ میں رامائن اور مہا بھارت کی رزمیہ داستانیں لکھی گئی جس میں اول الذکر کا ہیرو رام چندر ہے اور کرشن مہابھارت کا ایک کردار ہے۔

اب معلوم نہیں کہ چشتی صاحب کس منطق کے تحت رام چندر کو لاوی سمجھتے ہیں اور کس طرح رگ وید کو زبور کی بگڑی ہوئی صورت بتاتے ہیں۔ جب کہ تقریباً تمام قابل مورخین کا خیال ہے کہ آریہ غیر ملکی تھے اور وسط ایشیا ان کا وطن تھا اور ویدک تہذیب اور زمانہ شجاعت اور رامائن' مہابھارت کی رزمیہ داستانوں کا تعلق آریاؤں سے ہے۔ اگر چشتی صاحب آریاؤں کو اسرائیلی سمجھتے ہیں تو یہ ان کی سب سے بڑی بھول ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ راجپوت نسلاً" کس قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ راجپوتوں کے نکاس کا کھوج لگانے سے پہلے یہ مناسب ہے کہ ان کے ظہور کا پس منظر معلوم کر لیا جائے تاکہ ان حالات کا پتہ چل سکے جن کے تحت انہیں راجپوت بنایا گیا۔

زمانہ شجاعت کے بعد آریہ قوم اپنے ذات پات کے نظام کی وجہ سے زوال کا شکار ہو گئی۔ ذات پات کے نظام نے آریہ قوم کا شیرازہ بکھیر دیا' اور غیر ملکی حملہ آوروں کے لیے فتوحات کے دروازے کھل گئے۔ سب سے پہلے ذات پات کے نظام کے ردعمل کے طور پر بدھ مت کا عروج ہوا۔ بدھ مت کو مہاراجہ اشوک' کنشک اور ہرش جیسے بادشاہوں کی سرپرستی حاصل رہی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برہمنوں کی قدر و منزلت جاتی رہی۔ اشوک کی وفات کے بعد موریا خاندان کا زوال شروع ہو گیا اور تقریباً دو سو سال تک طوائف الملوکی اور سیاسی انتشار کا دور دورہ رہا۔ اس عرصہ میں غیر ملکی قبائل اور حکمران برصغیر پر حملہ آور ہوتے رہے۔ ان میں سھین' ساکا' لوچی' ہن' کشان شامل ہیں اور یہی راجپوتوں کے آباؤ اجداد تھے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ مورخین کی اس سلسلہ میں کیا رائے ہے؟

ایم پاتیکار تاریخ ہند قدیم میں لکھتے ہیں : "راجپوت قوم مغول یعنی تاتاری فاتحین کی نسل سے ہے۔" لالہ لاجپت رائے تاریخ ہند حصہ اول میں لکھتے ہیں : "یہ امر بھی تاریخی طور پر ثابت شدہ سمجھ لینا چاہیے کہ ساکا اور لوچی قوم کے بہت سے آدمی جو کہ ترکمانی نسل سے تھے سن عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں اس ملک میں آئے اور ہندو سماج میں داخل ہو گئے چنانچہ یورپین محقق اقوام جاٹ' آہیر اور گوجروں کو بھی ان ہی قبیلہ جات میں گنتے ہیں۔" اکبر شاہ خان نجیب آبادی "آئینہ حقیقت نما" میں لکھتے ہیں :

"برہمنوں نے اب بدھوں کے مذہب اور حکومت کو مٹانے کے لیے ایک نئی جنگی قوم تیار کر کے اس سے وہ کام لیا جو چھتریوں سے لیا جاتا تھا۔ یہ نئی قوم مغلوں اور تاتاریوں کے جنگجو قبائل پر مشتمل تھی جو بعد میں راجپوت کہلائے۔"

ایم شمس الدین نے تاریخ پاک و ہند میں لکھا ہے "بعض مورخین کا خیال ہے کہ جاٹ اور راجپوت سیتھین قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔" یہ یوچی قبیلے کی ایک شاخ تھے۔ جو منگول نسل کے تھے اور چین ان کا آبائی وطن تھا۔ یوچی دراصل تاتاری خانہ بدوش تھے۔ جفاکشی اور خوبصورتی میں مشہور تھے۔

"راجپوتوں کے اکثر قبیلے ہن قوم کی نسل سے ہیں۔"

مندرجہ بالا تمام حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ جاٹوں اور راجپوتوں کے آباؤ اجداد سیتھین' ساکا' ہن اور کشان قبائل تھے اور ان قبائل کا تعلق یا تو ترکمانی نسل سے ہے یا منگول سے مثلاً SCYTHIAN قبیلے کا تعلق ترک قوم سے ہے۔ ملاحظہ ہو۔ (سید امیر علی کتاب اے شارٹ ہسٹری آف سیراسنز کے صفحہ 311)

اور اسی طرح کشان' یوچی اور ہن قبائل کا تعلق بھی ترکوں سے ہے۔ جیسا کہ اخلاق الزمان صاحب نے ماہنامہ مسلم نیوز نومبر 1972ء میں لکھا ہے۔ اب ایک بات اور باقی رہ جاتی ہے کہ منگول اور ترکوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے چونکہ ہم نے اوپر جو حوالے پیش کیے ہیں ان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ راجپوتوں کے بعض قبائل منگول نسل سے نہیں' لیکن منگول اور ترک قوم دونوں نسلاً" اعتبار سے ایک ہیں۔ جیسا کہ امیر علی نے اسے شارٹ ہسٹرف آف دی سیراسنز میں صفحہ 311 میں لکھا ہے۔

اس ساری بحث سے ثابت ہوا کہ راجپوت اور جاٹ غیر ملکی حملہ آور قبائل مثلاً ہن' شاکان' کشان اور سیتھین کی اولاد ہیں اور ان تمام قبائل کا تعلق عظیم قوم ترک سے ہے۔

(بحوالہ نوائے وقت لاہور' مورخہ 5 جولائی 1973ء)

بندھیلے کون تھے؟

بندھیلہ قوم ہندو مذہب رکھتی تھی جو دریائے گنگا کے ساتھ گھنے جنگلوں میں آباد تھی جو الہ آباد بنارس اور کالپی کے درمیان واقع تھے اور بنگال سے آگرہ جانے والی جرنیلی سڑک انہی جنگلات میں سے ہو کر گزرتی تھی اور بنگال بہار اور اڑیسہ سے شاہی خزانہ اسی شاہراہ کے ذریعے دہلی پہنچتا تھا۔ بندھیلوں کے سردار "چھترسال" نے اس شاہراہ کو لوٹ مار کا مرکز بنا لیا تھا اور 1657ء تا 1662ء کے عرصہ میں دو بار سرکاری خزانہ لوٹ لیا گیا اور شاہی محافظ بھی قتل کر دیئے تھے۔ کافی صبر آزمائی کے بعد 1667ء میں عالمگیر نے چھترسال بندھیلے کے خلاف کارروائی کا حکم دیا اور ایک سال کے اندر اندر اسے گرفتار کر کے عالمگیر کے سامنے پیش کیا گیا تو معافی مانگنے پر نہ صرف اسے معاف کر دیا گیا بلکہ سرکاری شاہراہوں کی محافظت کا منصب بھی اسے عطا کر دیا گیا۔ 77-1676ء میں چھترسال کو عالمگیر نے مرزا راجہ جے سنگھ کے ساتھ مرہٹوں کے خلاف ایک مہم پر بھیجا۔ دکن میں یہ سیوا جی کے ہتھے چڑھ گیا اور سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو کر اس کے کہنے پر پھر سے پرانی جگہ لوٹ مار کرنے لگا اور تین سال کے عرصے میں ایک جمعیت تیار کر لی اور پھر الہ آباد کالپی تا بنارس کے وسیع علاقے میں اپنی خودمختار ریاست بندھیل کھنڈ قائم کر لی اور جنگلوں میں مضبوط قلعے بھی تیار کر لئے چنانچہ اورنگ زیب کو بیجاپور اور گولکنڈہ میں مرہٹوں کی کرتوتوں کی وجہ سے شمال سے جنوب میں اپنا جنگی ہیڈکوارٹر تبدیل کرنا پڑا۔

جب اورنگ زیب دکن کی طرف متوجہ تھا ان دنوں بندھیلے اپنی لوٹ مار کو بنارس سے آگرہ تک وسعت دینے میں کامیاب ہوگئے اور کوئی شاہی مہم کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ جنگلات اتنے گھنے تھے کہ دشمن سے سامنا مشکل تھا۔ چھترسال بندھیلہ کی موت کے بعد بندھیلے ماند پڑ گئے اور مغلوں کیلئے کوئی بڑا خطرہ نہ رہے۔

جاٹ

ہندو جاٹ بھی مغلوں کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔ آگرہ اور دہلی کے قریب آباد تھے۔ یہاں یہ لوگ عہد شاہ جہان میں بھرت پور کے نام سے ایک ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کا علاقہ آگرہ اور گوالیار کے درمیان واقع تھا جس کے ایک طرف گنگا اور دوسری طرف جمنا واقع تھا۔ چھترسال بندھیلہ کی طرز پر جاٹوں کا سردار "چورامن" آگرہ تا سورت۔ شاہراہ پر لوٹ مار کرنے لگا۔ ان کا پیشہ کاشتکاری کے علاوہ چوری اور لوٹ مار بھی تھا۔ چورامن نے فوجی تربیت کا اہتمام کر کے جاٹوں کو ڈسپلن سکھایا اور متھرا کے قریب اپنے باپ بھرت کے نام پر ریاست بھرت پور قائم کی اور اسے بہت مضبوط کر لیا۔ 1664ء میں اورنگ زیب حسن ابدال میں آفریدیوں سے نبرد آزما تھا اس عرصہ میں جاٹوں نے فتح پوری سیکری اور

آگرہ کو خوب لوٹا بلکہ اکبر اعظم کے مقبرہ میں سے اس کی ہڈیاں نکال کر نذر آتش کر دیں حالانکہ اکبر اعظم ہندوؤں کے نزدیک سب سے پسندیدہ حکمران تھا لیکن جاٹوں نے جہالت میں اندھے ہو کر یہ حرکت کی اس کی وجہ سے خود ہندو حضرات بھی ان سے متنفر ہوگئے۔ اور "مہابلی" کی لاش کی بے حرمتی کرنے پر خود مرزا جے سنگھ نے ان کے خلاف کارروائی میں حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی۔

چورامن مرگیا تو اس کے بیٹے سورج مل نے اپنی ریاست کو وسعت دینا شروع کی اور اتنی مضبوط حکومت قائم کر لی کہ مرہٹوں پر حملہ آور ہونے لگا۔ عالمگیر کے بعد بھی 1717ء تا 1766ء کے دوران اس جاٹ ریاست کی مدد سے مغلوں نے بعض مہمات سر کیں۔ پانی پت کی تیسری لڑائی میں مرہٹوں نے جاٹ ریاست کا تعاون تو حاصل کیا لیکن مرہٹہ سردار سودیس راؤ بھاؤ نے توہین آمیز طریقہ سے سورج مل کا کوئی صائب مشورہ بھی نہ مانا چنانچہ سورج مل بھرت پور واپس چلا گیا اور مرہٹے پانی پت کے میدان میں کٹ کر رہ گئے۔

ست نامی اور مغل

مسلمان مورخین کا خیال ہے کہ جس طرح مسلمان اورنگ زیب کے حامی تھے اسی طرح ہندو اور غیر مسلم اقوام داراشکوہ کو بادشاہ دیکھنا چاہتی تھیں لیکن داراشکوہ کی ناکامی اور موت نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس لئے غیر مسلم اقوام اورنگ زیب کے خلاف ہوگئیں۔ ان میں ست نامی بھی تھے یہ لوگ بڑے جفاکش اور جنگجو تھے جن کی سربراہ ایک ہندو عورت تھی۔ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جادوگرنی ہے۔ اورنگ زیب جب حسن ابدال میں آفریدیوں کے خلاف نبرد آزما تھا ان دنوں اسے ست نامیوں کی بغاوت کی خبریں ملیں۔ عالمگیر نے دہلی اور آگرہ کے صوبیدار کو ان کے خلاف کارروائی کیلئے لکھا چنانچہ ان کے خلاف متواتر تین مہمیں بھیجی گئیں لیکن ست نامی زیر نہ ہوسکے بلکہ یہ ذات مشہور ہوگئی کہ ان کی سربراہ جادوگرنی کا کرشمہ ہے کہ شاہی فوجیں کامیاب نہ ہو سکیں۔

1668ء میں عالمگیر حسن ابدال سے فارغ ہوا تو اس نے ست نامیوں سے نمٹنے کا عزم کر لیا چنانچہ اپنے سپاہیوں کے حوصلے بڑھانے کیلئے عالمگیر نے مغل فوج کے جھنڈوں پر قرآنی آیات لکھوائیں اور کہا کہ انشاء اللہ ان آیات کے اثر سے جادوگرنی کا جادو ناکام ہو جائے گا چنانچہ مغل فوج عالمگیر کی سرکردگی میں ست نامیوں کے خلاف بڑی بہادری سے لڑی اور بہت سے ست نامی قتل کر دیئے گئے حتیٰ کہ ان کی جادوگرنی سربراہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس طرح ست نامیوں کا خاتمہ ہوگیا۔

سکھ اور مغل

سکھ ازم کی ابتداء : ننکانہ صاحب کا پرانا نام تلونڈی (موجودہ ضلع شیخوپورہ) تھا۔ جہاں 15 اپریل 1469ء کو کالو کھتری کے ہاں ایک بیٹا تولد ہوا۔ میں نے ضلع شیخوپورہ اور گوجرانوالہ کے دیہات میں بچپن گزارا ہے اور اس عرصے میں بڑے بوڑھوں سے سنا تھا کہ کالو کھتری کے ہاں اولاد نرینہ نہ ہوتی تھی چنانچہ دعا کیلئے شاہ کوٹ (ضلع شیخوپورہ) میں رہنے والے مسلمان بزرگ شاہ ابوالخیر المعروف بہ بابا نولکھ ہزاری کی بارگاہ میں حاضر ہو کر وہ اولاد نرینہ کیلئے عرض گزار ہوا۔ اور وہاں سے مژدہ سنایا گیا کہ جو بچہ پیدا ہوگا وہ تمہارا کم (ہندو کم) اور ہمارا زیادہ ہوگا (مسلمان زیادہ ہوگا) (قدر آفاقی) چنانچہ ان بزرگوں کے فیض اور دعا سے 1469-4-15 کو پیدا ہونے والے بچے کا نام نانک رکھا گیا جو بچپن میں ہی عارفانہ طبیعت کا مالک تھا اور ہر وقت معرفت کی وادی میں سیر کناں رہتا تھا۔ ذرا بڑا ہوا تو باپ نے اسے دکانداری سکھانے کا ارادہ کیا مگر نانک کا اس طرف جی نہیں لگتا تھا۔ پھر ایک دن اسے روپے دیکر خریداری کیلئے دوسرے کسی قصبہ میں بھیجا اور فقیر منش نانک نے درویشوں کے ایک ٹولے کو دیکھا جو مفلوک الحال تھا چنانچہ چوہڑ کانا (فاروق آباد ضلع شیخوپورہ) کے قریب موجودہ "سچا سودا" کے مقام پر باپ کی دی ہوئی ساری رقم ان فقراء میں تقسیم کر دی اور گھر چلے گئے۔ باپ نے جواب طلبی کی تو کہا میں نے "سچا سودا" کیا ہے اور تفصیل سے آگاہ کیا۔ باپ سر پیٹ کر رہ گیا۔

پھر والد نے اپنے داماد کی سفارش سے سلطان پور لودھی نزد کپور تھلہ کے نواب دولت خاں کے ہاں نانک کو ملازمت دلوا دی جہاں وہ کئی سال تک خدمات انجام دیتا رہا لیکن سرکاری ڈیوٹی کے بعد وہ جنگلوں میں نکل جاتا اور مراقبہ کرتا۔ کہتے ہیں کہ اسے اللہ کا دیدار نصیب ہوا اور حکم ملا کہ وہ اللہ احد کا پرچار کرے۔ جو ایک ہی ہے اور اس کا نام حق ہے۔ وہ خالق ہے۔ دشمنی اور خوف سے بے نیاز اور لافانی ہے۔ قائم بالذات ہے اور اکبر و اعلیٰ اور فیاض ہے۔ چنانچہ بابا نانک ملازمت چھوڑ کر سیاحت کیلئے نکل کھڑے ہوئے۔ وہ ہندوؤں کے مقدس مقامات اور مسلمان صوفیاء کے مزارات پر بھی حاضر ہوئے اور فیض پایا۔ ہندوؤں اور ان کے پنڈتوں سے مباحثات بھی کئے اور انہیں شرک اور دوسری برائیوں سے منع کیا۔ صوفی بزرگوں اور سابقین صوفیاء کے مزارات پر حاضر ہو کر روحانی فیض پایا۔ بابا نانک نے افغانستان' ایران' عراق (بغداد شریف) مکہ معظمہ کا سفر بھی اختیار کیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اندر سے مسلمان تھے اور اسی لئے وہ حج کی سعادت حاصل کرنے مکہ معظمہ گئے تھے لیکن ہندو مورخین اسے اپنے ہی رنگ میں لیتے ہیں۔ بابا نانک نے (سیر المتاخرین کے مطابق) سید حسن نامی مسلمان بزرگ سے اسلامی دینی اور فارسی کتب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ بابا نانک نے 1539ء میں وفات پائی۔

دفنانے کا جھگڑا : کنہیا لال ہندی نے تاریخ پنجاب میں لکھا ہے کہ گورونانک کی وفات پر

مسلمانوں اور ہندوؤں میں آخری رسوم ادا کرنے کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ مسلمان ان کو مسلمان بزرگ مان کر دفنانے کے حق میں تھے جبکہ ہندو ان کی نعش کو جلانا چاہتے تھے۔ ان کی میت رات بھر ایک جگہ پڑی رہی صبح کو دیکھا تو ان کی چارپائی پر نعش کی جگہ پھول رکھے تھے چنانچہ مسلمانوں اور ہندوؤں نے آدھے آدھے پھول لیکر اپنی دینی اور مذہبی رسوم کے مطابق انہیں دفنا اور جلا دیا۔ اس بارے میں تفصیلی بات سکھ عہد کے بارے میں جائزہ لیتے وقت کریں گے یہاں اتنا بتانا ضروری ہے کہ بابا نانک کی لاش احسان قریشی صابری کی روایت کے مطابق رات کے وقت مسلمانوں نے دفن کر دی تھی۔ بابا نانک بنیادی طور پر اسلامی تعلیمات سے بے حد متاثر تھے۔ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو مانتے تھے۔ بتوں کی پوجا کے مخالف تھے۔ ذات پات کے بندھنوں کو بھی نہیں مانتے تھے۔ بھائی چارہ اور مساوات انسانی کی تعلیم دیتے تھے۔ لالچ' بغض' حسد' حرص' طمع' غصہ' جھوٹ' فریب اور دیگر اخلاقی برائیوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق قابل مذمت سمجھتے تھے اور اسی پر عمل کرتے تھے۔ قناعت اور توکل کا درس دیتے تھے۔ رہبانیت اور گوشہ نشینی کے خلاف تھے اور معاشرے میں رہ کر نیکی اور بھلائی کے ساتھ زندگی گزارنے کو ترجیح دیتے تھے۔

لیکن ان کی اسلامی تعلیمات جو ان میں 90 فیصد سے زیادہ تھیں کو نظر انداز کر کے ہندوؤں نے ان کو ہندو ازم میں جذب کرنے کی کوشش کی اور ان کی تعلیمات کی انفرادیت سے فائدہ اٹھا کر ایک نئے دین کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب ہوگئے جس کا نام انہوں نے "سکھ ازم" رکھا۔

بابا نانک کے بعد ان کی جانشینی کا شرف ایک شخص "انگد" کو ملا۔ یہ دوسرا گورو تھا' تیسرا گورو امر داس 1552ء میں جانشین ہوا۔ اس نے بائیس سال تک خدمات انجام دیکر 1574ء میں وفات پائی۔ اکبر کے زمانے میں اسے ایک جاگیر (500 بیگھ پر مشتمل) عطا ہوئی جس میں پانی کا قدرتی چشمہ بھی تھا۔ اس جگہ آج کل امرتسر شہر (اور گولڈن ٹمپل) آباد ہے۔ پہلے پہل اس کا نام رام داس پور اور پھر گورو دا چک مشہور ہوا۔ چوتھا گروہ امر داس کا چیلا اور داماد رام داس تھا۔ امر داس نے سکھوں کو ایک روحانی مرکز دیا تھا۔ پانچویں گرو ارجن نے سکھوں میں سیاسی بیداری پیدا کی اور ان کو گھوڑوں کی تجارت کی طرف مائل کیا اور ان کو اس غرض سے ترکی' ایران' بلخ' بخارا وغیرہ تک بھیجا اور اپنے پیروکاروں پر دس فیصد ٹیکس نافذ کر کے شاہانہ ٹھاٹھ اختیار کیا۔ اچھی اچھی عمارتیں بنوائیں اور سچا بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بابا نانک نے دولت اور مال و زر سے کنارا کئے رکھا۔ گورو انگد اس کے قریب ہوا جبکہ مال اور دولت گورو امر داس کے دروازے تک پہنچ گئی اور رامداس کے تو قدموں سے جا لگی اور گورو ارجن نے اس سے خوب استفادہ کیا۔ چھٹے گورو ہرگووند نے سکھوں کو منظم کیا اور سپاہیانہ زندگی گزارنے کی تلقین کی انہوں نے یہ فریضہ 1606ء سے 1645ء تک ادا کیا۔

گورو ہرگووند نے دریائے بیاس کے کنارے ایک قلعہ ہرگووند پور تعمیر کرایا جہاں سکھ

قوم کے آوارہ اور جرائم پیشہ افراد کو جمع کر کے انہیں فوجی تنظیم کی شکل دے ڈالی۔ جس کا کام یہ تھا کہ نواحی علاقوں میں لوٹ مار مچائے۔ اس قلعہ میں آٹھ سو گھوڑے تھے تین سو گھڑسوار ہر وقت تیار کھڑے رہتے اور ساٹھ توڑے دار بندوقچی گورو صاحب کی حفاظت پر مامور تھے۔ اس فوجی تیاری کی خبر جہانگیر کو ملی تو اسے گوالیار کے قلعہ میں بند کر دیا گیا لیکن بعد ازاں رہا کر دیا گیا۔ جہانگیر کی وفات کے بعد گورو ہرگووند نے بعہد شاہجہان کھلم کھلا بغاوت کر دی اور چھ سال میں لاہور کے مغل گورنر کو تین بار شکست سے دوچار کیا۔ آخر 1645ء میں چھٹے گورو صاحب نے انتقال کیا۔

ساتواں گورو۔۔۔۔ ہررائے : چھٹے گورو کا پوتا تھا جو داراشکوہ کا دوست تھا اور خاموش طبع گورو تھا۔ جب 1654ء میں اورنگ زیب کی فوجوں سے بچنے کیلئے داراشکوہ کسی پناہ کی تلاش میں تھا تو گورو ہررائے نے اس کی مدد کی جس کی وجہ سے وہ اورنگ زیب کے زیر عتاب آگیا۔ چنانچہ اورنگ زیب نے اسے دہلی طلب کیا۔ وہ خود تو وہاں نہ گیا البتہ اپنے بڑے بیٹے رام رائے کو بھیج دیا جسے اورنگ زیب نے سکھوں کی ضمانت نیک چلنی کے طور اپنے پاس دہلی میں رکھ لیا۔ 1661ء ساتویں گورو نے وفات پائی۔

آٹھواں گورو : (ہررائے کا چھ سالہ چھوٹا بیٹا) ہرکشن کو مقرر کیا گیا۔ رام رائے نے بڑا بیٹا ہونے کے ناطے گدی نشینی کا دعویٰ عالمگیر کی عدالت میں کیا۔ ہرکشن کو دہلی طلب کیا گیا جہاں وہ چیچک سے 1664ء میں فوت ہوگیا اور گدی نشینی کا جھگڑا پھر کھڑا ہوگیا۔

نواں گورو : اس جھگڑے سے گدی نشینی کے امیدوار بہت تھے آخر ان میں سے ہرگووند کے بیٹے تیغ بہادر کو گدی نشین گورو مان لیا گیا جس کے بعد دوسرے امیدوار ناراض ہو کر خود ساختہ گورو بن بیٹھے چنانچہ گورو تیغ بہادر کوہ شوالک کی پہاڑیوں میں چلا گیا جہاں اس نے انند پور کی بنیاد رکھی۔ پھر اس نے بنگال اور دکن کا سفر اختیار کیا۔ راستے میں پٹنہ میں قیام بھی کیا جہاں پر سکھوں کا بہت بڑا مذہبی مقام ہے۔ اس جگہ تیغ بہادر کا بیٹا گووند رائے 1666ء میں پیدا ہوا۔ بعد ازاں تیغ بہادر نے پنجاب میں آکر اپنے لٹیرے چیلوں کی سرپرستی شروع کر دی۔ اورنگ زیب کے شاہی کارندوں نے اسے گرفتار کر کے دہلی پہنچا دیا اور 1675ء میں اورنگ زیب کے حکم سے بغاوت کی پاداش میں اسے قید کر دیا گیا جہاں گورو صاحب نے اپنے ایک سکھ پیروکار کو حکم دیا کہ اب وہ مرنا چاہتا ہے لہٰذا اس کا جھٹکا کر دیا جائے چنانچہ اس سکھ نے حکم کی تعمیل میں گورو صاحب کو تہ تیغ کر دیا۔

دسواں گورو : تیغ بہادر کا نو سالہ بیٹا گووند رائے مقرر ہوا جس نے سکھوں کو جنگی قوم بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ افرادی قوت میں اضافہ کرنے کیلئے اس نے نیچ ذات ہندوؤں اور اچھوتوں کو عام اجازت دے دی کہ وہ "پاہل" کی رسم ادا کر کے "پاکیزہ" ہو کر سکھ قوم کے باوقار افراد بن جائیں۔ قومی مساوات قائم کرنے کیلئے اس نے پانچ لوازم مقرر کئے جن کا اختیار کرنا ہر

سکھ کی مذہبی ضرورت قرار دیا گیا۔ یہ لوازم پانچ ککے کہلاتے ہیں یعنی پانچ ایسی چیزیں جن کا نام ک۔ (ککا) کے حرف تہجی سے شروع ہوتا تھا۔ یہ لوازم کنگھا' کیس (لمبے بال)' کچھا (نکر جیسی زیریں پوشاک)' کڑا (کلائی میں پہننے کا لوہے کا کڑا) اور کرپان (تلوار) تھے۔ جو آج بھی ہر سکھ کی مذہبی ضرورت شمار ہوتے ہیں۔ گورو تیغ بہادر نے سکھوں کو ہندوؤں سے منفرد اور ممتاز کرنے کیلئے اپنے نام کے آخر میں "سنگھ" (معنی شیر) کا اضافہ کرنے کا حکم دیا۔ اور اپنا نام گووند سنگھ یا گوبند سنگھ رکھا اور سکھ قوم کو قومی نام کے طور پر "خالصہ" سے موسوم کیا۔ گووند سنگھ نے مغلوں کے خلاف معاندانہ کارروائیاں جاری رکھیں لیکن جنگی طور پر اسے زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی البتہ لوٹ مار کا سلسلہ جاری رہا۔ پہاڑی ریاستوں کے والیان نے شاہی مدد طلب کی۔ اورنگ زیب نے سرہند کے گورنر کو ان کی سرکوبی کے لیے کہا۔ شکست کے بعد گورو جی انند پور کے قلعہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ محاصرہ میں اس کی بیوی اور بچے بھاگ کر سرہند پہنچے جہاں ہندو اہلکاروں نے اس کے دو بیٹوں کو قتل کر دیا۔ گوبند سنگھ بھیس بدل کر ضلع انبالہ میں واقع قلعہ چمکور پہنچ گیا اور بٹھنڈہ کے میدانوں میں پھرتا پھراتا آخر مکتسر (فیروز پور) کے مقام پر پہنچ کر تعاقب کرنے والوں سے محفوظ ہو گیا چنانچہ اس جگہ کا نام مکتی سر (نجات کا تالاب) رکھا۔

اسی جگہ پر گورو جی نے اپنی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب (آدی گرنتھ) کی تکمیل کی۔ اورنگ زیب ان دنوں میں دکن میں مصروف پیکار تھا جہاں 1707ء میں اس نے وفات پائی۔ جس کے بعد اس کا بیٹا بہادر شاہ تخت نشین ہوا۔ بہادر شاہ نے گورو گووند سنگھ کو دکن کی فوجی کمان عطا کر کے بلا بھیجا۔ وہ چارج لینے وہاں پہنچا لیکن "ناندیر" کے مقام پر اکتوبر 1708ء میں کسی افغان فوجی کی ذاتی رنجش کا نشانہ بن کر اگلے جہان کو سدھار گیا۔

بندہ بیراگی : سکھوں کا یہ دسواں گورو تھا جس نے آئندہ کیلئے جانشینی کا سلسلہ ختم کر دیا۔ بندہ بیراگی گوبند سنگھ کا چیلا تھا جس نے سکھوں کی فوجی قیادت کا بیڑہ اٹھایا۔ سکھ بننے کے بعد اس نے بندہ کا لقب اختیار کیا۔ گوبند سنگھ نے اسے پنجاب جا کر سکھوں کی تنظیم میں جان ڈالنے کا حکم دیا تھا۔ یہ پنجاب آیا تو سارے سکھ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس نے مسلسل لوٹ مار سے امن کو تباہ کر دیا اور مار دھاڑ کرتا ہوا دہلی تک جا پہنچا۔ اس نے سکھوں کے گورو کے بیٹوں کے قتل کا انتقام لینے کے بہانے سرہند شریف پر مئی 1710ء میں کامیاب حملہ کر کے اس کو سخت نقصان پہنچایا۔

شاہ عالم بہادر شاہ دکن میں تھا اس نے پنجاب کا رخ کیا تو بندہ بیراگی کی فوجوں نے مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی تاہم بندہ بیراگی بھاگ گیا۔ 1712ء میں بہادر شاہ وفات پا گیا اور اس کے بیٹے جانشینی کی جنگ میں الجھ گئے جہاں دار شاہ جانشین ہوا جسے 11 ماہ کے بعد فرخ سیر نے قتل کرا دیا۔ ادھر سکھوں کی سرکشی بڑھتی گئی جس کے مظالم سے سارا پنجاب چیخ اٹھا۔ فرخ سیر بادشاہ بن گیا تو اس نے سکھوں کا قلع قمع کرنے کیلئے پنجاب کا رخ کیا۔ پنجاب کے گورنر عبدالصمد خاں نے بندہ بیراگی اور اس کے ساتھیوں کو شکست دی۔ بندہ گورداسپور کے قلعہ میں محصور ہو کر

آخر پکڑا گیا جسے ساتھیوں سمیت دہلی لے جا کر 1716ء میں باغیانہ سرگرمیوں کی پاداش میں قتل کر دیا گیا۔ احمد شاہ ابدالی نے بھی سکھوں کو تباہ کرنے میں خاصا کردار ادا کیا لیکن مغلوں کے باہمی جھگڑوں نے سکھوں کو کھل کھیلنے کا موقع دیا اور وہ مستحکم پوزیشن اختیار کر گئے اور امرتسر کو اپنا مرکز بنا لیا۔ شہزادہ تیمور نے احمد شاہ ابدالی کی طرح سکھوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اس نے امرتسر پر 1756ء میں حملہ کیا اور ہر مندر کو گرا کر ان کے مذہبی تالاب کو مٹی سے بھر دیا۔ اب سکھوں نے جوش انتقام میں لاہور پر قبضہ کر لیا۔ سکھ سردار جسا سنگھ کلال نے اپنے نام کا سکہ بھی جاری کر دیا لیکن مرہٹوں نے راگھوبا کی سرکردگی میں سکھوں پر حملے کر کے انہیں لاہور بدر کر دیا۔

جب 1761ء میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو شکست فاش دی تو سکھ ادھر ادھر روپوش ہو گئے اور اس کے واپس جاتے ہی اپنی کمین گاہوں سے نکل آئے چنانچہ 1762ء میں سکھوں کو مزہ چکھانے دوبارہ احمد شاہ ابدالی آیا اور اس نے لدھیانے میں سکھوں کو شکست فاش دی لیکن اسے فوراً واپس جانا پڑ گیا اس کے بعد سکھوں نے سرہند پر حملہ کر کے افغان گورنر زین کو شکست دی اور پھر لاہور پر بھی قبضہ کر لیا اور 1764ء میں سکھوں نے اتفاق قائم کر کے امرتسر میں خالصہ حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا جو ایک مجلس "گورومتہ" کے مشورے سے چلائی جاتی تھی۔ سکھ حکومت قائم ہوتے ہی سکھ سرداروں نے اپنے اپنے علاقوں میں بارہ راجدھانیاں قائم کر لیں جن کو ختم کر کے رنجیت سنگھ نے سکھ حکومت کو استحکام اور وسعت و استقرار بخشا۔

سکھوں کی روحانی حیثیت اور سیاسی حالات پر تبصرہ :

سکھ مذہب کا بانی بابا گورونانک تھا جو درویش آدمی تھا۔ وہ ہندو ازم کے خلاف تھا۔ جب اسے روحانی روشنی ملی تو اس نے اسلامی تعلیمات کے مطابق اخلاقی اور روحانی اقدار کا پرچار کھل کر شروع کر دیا۔ بابا نانک کو چودھراہٹ سے غرض نہ تھی نہ وہ بادشاہی کا خواہش مند تھا لیکن اس کے جانشینوں نے آہستہ آہستہ "سکھ ازم" کو ہندو ازم کی ایک شاخ قرار دے ڈالا اور بعض اقدام کر کے اپنی انفرادیت بھی قائم رکھی۔ اس طرح سکھ روحانی اور عملی طور پر تو مسلمانوں کے قریب تھے جبکہ رسمی طور پر ہندوؤں کا حصہ بن کر رہ گئے۔ مغل بادشاہ بغاوت کو برا جانتے تھے اور اپنے حلیفوں کا خیال رکھتے تھے جبکہ حریفانہ روش کے سخت دشمن تھے۔ سکھ تو ایک طرف اگر کسی "دشمن" کو کوئی مسلمان مدد دیتا تو وہ بادشاہ کا معتوب ٹھہرتا۔ مغل تو اپنے بھائیوں بھتیجوں تک کو قتل کرا دیتے تھے تاکہ تخت پر براجمان رہ سکیں اگر ان کے راستے میں کوئی سکھ' ہندو یا کوئی اور غیر مسلم آجاتا تو اسے وہ کس طرح معاف کر سکتے تھے؟ یہی صورتحال سکھوں کو پیش آئی جب ان کے کسی گورو نے بادشاہ کے مخالف کی مدد کی تو وہ معتوب ٹھہرا۔ بہرحال بعض گورو صاحبان نے روحانی طور پر زندگی بسر کرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی زندگی اختیار کر لی۔ اور افرادی قوت کیلئے ہر طرح کے پنچ لوگ "پاہل" کی رسم کے ذریعے اپنی قوم میں شامل کر لئے چونکہ سکھ قوم میں ہر طرح کے پنچ اور باوقار لوگ شامل ہو گئے تھے اس لئے ہوس اقتدار ان کا مشترکہ مقصد تھا۔ سکھوں کو کسی اخلاقی بندھن کا خیال نہ تھا بلکہ ہر کوئی اقتدار کی خاطر ہر وہ اقدام کر

سکتا تھا جس کی توقع اخلاقی اعتبار سے معیوب تھی۔ بابا نانک جی معاذ اللہ لٹیروں اور ڈاکوؤں کے سردار نہیں تھے اور نہ ان کو ایسی کسی قوم کی سربراہی پسند تھی جس کا مطمع نظر ظالمانہ طور پر حصول اقتدار ہو۔ لیکن سکھوں میں شامل مختلف نسلوں اور ذاتوں کے لوگ اخلاقی اور روحانی طور پر بہت پیچھے تھے اس لئے ان کو تعصب کی آگ نے آگے بڑھنے میں مدد دی اور ہندوؤں کی چال میں آکر وہ مسلمانوں کے دشمن بن گئے۔ حالانکہ مسلمانوں نے انہیں روحانی اور اخلاقی اعتبار سے مالا مال کیا تھا۔ بابا فرید گنج شکر کے سجادہ نشینوں سے بابا نانک جی کی ملاقات ہوئی تو ان کے شبدوں کو روحانی توشہ جان کر اپنی مقدس کتاب میں جگہ دی۔ سکھ اخلاقی اور روحانی اعتبار سے مسلمانوں کے خوشہ چین اور انہی کے پروردہ اور فیض یافتہ تھے لیکن جب کبھی مغل بادشاہوں نے سیاسی ضرورت کے تحت اپنی مخالفت کی زد میں آنے والے کسی بھی گروہ کے ساتھ انتقامی کارروائی کی جس میں سکھ بھی شامل تھے تو ہندوؤں اور دوسری غیر مسلم اقوام نے پروپیگنڈا کرکے سکھوں کو باور کرا دیا کہ مسلمان تمہارے دشمن ہیں اور تمہیں مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کا حق ضرور ادا کرنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فریب خوردہ لوگ مغلوں کے دور میں بھی مسلمانوں کے دشمن بن کر ابھرے اور 1947ء میں آزادی کے موقع پر بھی ہندوؤں کے بہکاوے میں آکر مسلمان مہاجرین کا وہ قتل عام روا رکھا جس پر وہ آج بھی شرمندہ ہیں اور ہندو ان کو اپنی ڈگر کے مطابق استعمال کرکے ہمیشہ بغلیں بجاتا رہا ہے۔ کاش وہ اپنے گورو بابانانک جی کی حقیقی اور بنیادی تعلیمات کی طرف لوٹ آئیں جو اسلام کے خزینہ سے انہیں ملی ہیں جو انشاء اللہ ان کو ایک دن اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہمکنار کر دیں گی۔

آر پی ترپاٹھی کا تبصرہ : سکھ تحریک کے بانی باباگورو نانک جی اور سکھوں کے بارے میں ناقدانہ، محققانہ اور عمومی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے آر پی ترپاٹھی "مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال" میں لکھتے ہیں کہ :

سکندر لودھی کے زمانے میں گرونانک نے سکھ تحریک کی بنیاد ڈالی جس نے آگے چل کر ہندوستان کی تاریخ میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ نانک تلونڈی میں (جو کہ اب ننکانہ کہلاتا ہے) مہتہ کالو پٹواری کے یہاں 15 اپریل 1469ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد نانک نے فارسی اور مروجہ اسلامی علوم کی تعلیم سید حسن سے حاصل کی۔ ان کے بہنوئی نے ان کیلئے سرکاری غلے کے گودام دار کی ملازمت حاصل کر لی۔ ستائیس سال کی عمر میں جب کہ وہ دو لڑکوں اور دو لڑکیوں کے باپ بن چکے تھے ان کے دل میں روحانی اور مذہبی تلاش و جستجو کا اتنا غلبہ ہوا کہ وہ ملازمت کو چھوڑ بیٹھے اور دور دراز کے سفر پر نکل کھڑے ہوئے۔

انہوں نے آسام اور ڈھاکہ سے بغداد تک اور تبت و اڑیسہ سے سیلون تک کا سفر کیا اور بہت سے سنت فقیروں سے ذاتی تعلقات پیدا کر لئے۔ وہ ان کے عقائد، اخلاق، مذہب اور عادات کا بغور مطالعہ کرتے۔

کہا جاتا ہے کہ وہ مراد شیخ شرف نامی درویش، شیخ بہاء الدین اور کبیر بھگت کی

تعلیمات سے بہت متاثر ہوئے۔ اس بات کے متعلق کہ وہ کبی کے باقاعدہ مرید ہوئے شک ہے کیونکہ ان کے بقول خدا ان کا گرو تھا۔ 1521ء میں جب بابر کے حکم سے ایک خون آشام شیر کی طرح جوگائیوں کے گلے پر جھپٹ پڑا ہو' سید پور کو غارت اور وہاں کے شہریوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا تو نانک کے دل پر اس سانحے کا گہرا اثر ہوا۔ کہا جاتا ہے اس موقع پر وہ گرفتار ہوئے لیکن بعد میں رہا کر دیئے گئے۔ بڑھاپے میں وہ کرتار پور میں بس گئے۔ کاشتکاری شروع کر دی اور 22 ستمبر 1539ء کو فوت ہوگئے۔

نانک کبیر ہی کی طرح ایک مصلح تھے البتہ ان کے اظہارات میں نسبتاً زیادہ ٹھہراؤ اور وقار پایا جاتا ہے۔ وہ ملک کے سیاسی و سماجی حالات سے بہت غیر مطمئن تھے۔ ان کا کہنا تھا "کال (زمانہ) قینچی ہے۔ فرماں روا قصائی ہیں' انصاف پر لگا کر اڑ گیا ہے۔۔ میں دکھ سے روتا ہوں کہ نجات کس طرح حاصل ہوگی؟" وہ اندھی تقلید' منافقت' پستی اور بزدلی کی مذمت کرتے اور ہم وطنوں میں جو اخلاقی کمزوریاں پیدا ہوگئی تھیں ان سے نالاں تھے۔ ان کے مذہبی افکار کا سماجی پہلو ان کی تعلیمات سے واضح طور پر آشکار ہو جاتا ہے۔ ان کا مقولہ تھا "جو شخص سب آدمیوں کو (شاید عورتوں کو بھی) برابر سمجھتا ہے وہ ہی نیک ہے" اور "اس دنیا کی ناپاکیوں میں سے صرف پاکی کی اطاعت و فرماں برداری کرو۔" انہوں نے عورتوں کو مردوں کے ہم رتبہ قرار دیا۔ چھوت چھات اور ذات پات کی تمیز ختم کرنے کیلئے انہوں نے مل جل کر کھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ شراب اور سور کا گوشت ممنوع قرار دیا۔ انہوں نے بت پرستی' حلول خداوندی اور شرک کو ممنوع قرار دیا اور ذات پات' اساطیر' مذہبی رسومات کو ماننے سے انکار کیا۔

اس کے علاوہ انہوں نے اخلاقی قدروں پر زور دیا۔ ان کے نزدیک ہندو و مسلمانوں کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں اور یہ سب خدا کے بندے ہیں۔

نانک چاہتے تھے کہ ان کی تحریک ان کے بعد بھی باقی رہے انہوں نے مختلف مقامات پر سنگتیں قائم کیں اور سنگتوں کی دیکھ بھال کیلئے آدمیوں کو مامور کیا۔ اپنے جانشین کے انتخاب میں انہوں نے بہت احتیاط برتی اور لہنا نامی مرید کو اپنے بیٹوں پر ترجیح دی۔ اس انتخاب کے دو وجوہ تھے اول تو یہ کہ لہنا بلند کردار اور دین دار تھا دوسرے یہ کہ نانک کا سب سے بڑا بیٹا دنیوی امور سے بے نیاز اور تارک الدنیا ہوچکا تھا۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ نانک یہ نہ چاہتے تھے کہ ان کی تحریک ترک دنیا اور دنیوی امور و مسائل سے روگردانی کی تبلیغ کرے۔ ان کا مقصد اور نظریہ تو یہ تھا کہ عوام الناس کے دلوں میں مذہب کی روح پھونک دیں۔ وہ مذہب کو اسلام کی طرح "خانہ داروں کا مذہب" بنانا چاہتے تھے۔

گروانگد (لہنا) نے نانک کے اقوال کو مرتب کیا۔ جو "بھٹا کوہری" کی شدھ شکل میں لکھے گئے کیونکہ اس وقت یہی زبان پنجاب کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ یہ زبان لنڈا سے ملتی ہے اور ایک طرح سے مہاجنی سے بہت نزدیک ہے۔ سکھوں کی مقدس کتاب عوام کی زبان میں مرتب ہوئی اور پنجاب کے باشندوں کے رسم الخط میں تحریر کی گئی۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں

کیوں کہ بہت سے فقیروں اور درویشوں نے اس سے قبل بھی مقامی زبانوں اور مروجہ رسم الخطوں کو مذہبی ضروریات کیلئے استعمال کیا تھا۔ گرو انگد نے گرونانک کی تعلیمات کی پرامن اور باوقار طریقے سے ترویج و تبلیغ کی۔ انہوں نے لنگر خانوں کو سماجی' مذہبی ادارے کی شکل دی۔ گرو انگد مارچ 1552ء میں فوت ہوئے۔ گرو انگد نے اپنے بیٹوں کی مخالفت کے باوجود امر داس کو اپنا خلیفہ مقرر کیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سکھ دو طبقوں میں بٹ گئے۔ بڑے طبقے نے گرو انگد اور ان کے جانشین کو اپنا رہنما مانا اور چھوٹے طبقے نے گرونانک کے سب سے بڑے بیٹے بابا سری چند کو (اپنا گرو بنایا اور یہ لوگ اداسی (تارک الدنیا) کہلائے۔ اداسی جیسا کہ ان کے نام سے واضح ہے عقیدہ رہبانیت کی اور ساری دنیوی چیزوں سے علیحدگی کی تبلیغ و پیروی کرتے۔

گرو امر داس نے ترک دنیا کے خیال کو قبول نہ کیا۔ وہ خود تجارت اور کاشتکاری کرتے اور اپنے مریدوں کو "دنیا دار سنت" اور "ایک گرو ایک شبد اور ایک تفسیر" کی تعلیم دیتے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ شبد ہی قطعی سند ہے اور سارے صحیفوں سے برتر ہے۔

انہوں نے سکھ فرقے کو منظم کیا اور بائیس گدیاں مقرر کیں جن پر گرو کی طرف سے آدمی مقرر کیے جاتے۔ ان کا فرض تھا کہ مذہب کو پھیلائیں اور سکھوں کی بھلائی کا خیال رکھیں۔ گرو کا لنگر ہندو' مسلمان' امیر غریب سب کے لئے کھلا ہوا تھا حالانکہ خود گرو سادہ اور موٹا جھوٹا کھاتے لنگر کے مہمانوں کو عمدہ کھانا دیا جاتا جو گھی اور شکر سے تیار کیا جاتا۔ مہدویوں کی طرح یہاں بھی "ہر روز جو کچھ ملتا اسی دن صرف کر دیا جاتا اور کل کیلئے کچھ بھی نہ بچتا۔"

کہا جاتا ہے کہ گرو امر داس کے زمانے میں بہت سے مسلمانوں نے سکھ مت قبول کیا۔ گرو انگد کے ورثاء کی مخالفت کے سبب امر داس نے اپنا مرکز گوئند وال میں منتقل کر دیا۔ یہاں پر گرو نے اپنی نگرانی میں ایک باؤلی کھدوائی تاکہ زائرین اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

اکبر نے دورہ پنجاب کے دوران گرو سے ملاقات کی اور عطیہ دینے کی پیشکش کی لیکن گرو نے نرمی کے ساتھ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ شہنشاہ نے گرو کی شخصیت اور ترک نفس سے متاثر ہو کر گرو کی لڑکی بی بی بھانی کو کئی گاؤں کا عطیہ دیا اور گرو اور ان کے مریدوں کو یاتری ٹیکس کی ادائیگی سے معاف کر دیا۔ گرو نے شادی و موت کی رسومات کو سادہ بنایا اور ستی' پردہ' شراب کے استعمال کو ممنوع قرار دیا۔ گرو نے اپنی بیٹی بی بی بھانی کے شوہر رام داس کو اپنا خلیفہ مقرر کر کے غیر ارادی طور پر ایک ایسی روایت کا آغاز کیا جو آگے چل کر پریشانی کا باعث بنی۔ گرو نے سکھوں کے مجمع کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"رام داس ذات کامل ہے جس نے شریر دھار لیا ہے۔ دنیا میں جو اس کی پیروی کرے گا وہ نجات پائے گا۔"

اس طرح انہوں نے گرو کو اگر خدائی نہیں تو نیم خدائی کی حیثیت دے دی انہوں نے سکھوں کو یہ سبق دیا کہ "اگر وہ کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو اپنی جان اور مال و دولت سب کچھ گ

کی سیوا میں تج دیں اور اس کا حکم بجا لائیں۔" امر داس ستمبر 1574ء میں فوت ہوئے۔

اکبر نے گرو رام داس کا بھی احترام کیا۔ 1577ء میں اکبر نے 700 روپے کے عوض پانچ سو بیگھہ زمین جس میں ایک قدرتی چشمہ بھی تھا گرو کو عطا کیا۔ یہ چشمہ ایک تالاب کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا اور اس کے آس پاس امرت سر کا شہر آباد ہوا جو کہ سکھوں کیلئے تجارتی اور مذہبی دونوں لحاظ سے مکہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس موقع محل کا انتخاب بہت ہی عاقلانہ تھا کیونکہ اس کے پاس کے علاقے میں محنتی ہندو آباد تھے جو کہ اس نئے فرقے کیلئے تندرست اور زحمت کش پیرو مہیا کر سکتے تھے۔ یہ شہر جو تجارتی لحاظ سے اہم تھا عبادت خانے کی آمدنی میں بھی بتدریج اضافہ کر سکتا تھا اور نئے عقائد کی تبلیغ و اشاعت میں مفید ثابت ہوتا۔

گرو نے تجارت اور سوداگری کو جو اہمیت دی اس سے محنت و مزدوری کا وقار قائم ہوا' دست کاری' ہنر اور صنعت کو بڑھاوا ملا اور لوگوں کے سینوں میں الوالعزمی کی روح جوش مارنے لگی۔ یہ سب چیزیں نہ صرف سکھوں کیلئے نعمت ثابت ہوئیں بلکہ آگے چل کر پنجاب کے ہندوؤں نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا۔

رام داس نے اپنے تیسرے بیٹے ارجن کو جو کہ اٹھارہ سالہ جوان تھا اپنا جانشین مقرر کیا کیونکہ وہ ہی سب سے زیادہ لائق تھا اور اس کی پیشانی پر روشن مستقبل کی چمک پائی جاتی تھی۔ اس تقرر کے ساتھ موروثی جانشینی کا اصول پوری طرح قائم ہو گیا۔ ہندوستان کے مذہبی فرقوں اور سلسلوں میں یہ طریقہ عام تھا حالانکہ یہ ایک غیر جمہوری قاعدہ ہے۔ رام داس ستمبر 1581ء میں فوت ہوئے۔

رام داس نے اس کلیہ کو بڑی اچھی طرح پیش کیا کہ گرو کی آتما ایک ہی ہے اور وہی سلف سے خلف میں پہنچتی ہے اور اس کو روشنی دکھاتی ہے۔ انہوں نے ارجن کی نمایاں خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"جس طرح ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلایا جاتا ہے اسی طرح گرو کی آتما ارجن کے جسم میں داخل ہو چکی ہے۔"

بالفاظ دیگر گرو کی روح ایک گرو سے دوسرے گرو کی روح میں منتقل ہوتی رہتی ہے چنانچہ اس کلیہ سے یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ ہر گرو کا ایک جیسا احترام کرنا چاہئے اور ان سب میں وہی تغیر ناپذیر انا موجود ہے جو مسلسل اور ناقابل تقسیم ہے گرو کے منصب کا سرچشمہ خدا ہے۔

ارجن کی نامزدگی کے سبب ان کے بھائیوں کے دلوں میں بہت مایوسی اور شکایات پیدا ہوئیں لیکن گرو نے اپنے صبر و حوصلے' خوش تدبیری اور جذبہ مصلحت اندیشی سے وقتی طور پر اس مخالفت پر قابو پا لیا اور سکھوں کے اتحاد و تنظیم کا کام شروع کیا۔ وہ دورہ کرتے اور اجتماعی عبادات کی تبلیغ کرتے وہ خود بھی ایسی سنگتوں کو منعقد کرتے اور یہ بتاتے کہ اجتماعی عبادت انفرادی عبادت کی نسبت بہتر ہے انہوں نے منددوں شنی تعلیمی اداروں کی جنہیں ان کے اسلاف نے قائم کیا تھا ازسرنو تنظیم کی جن کا مقصد سکھ مذہب کی تبلیغ اور ہم عقیدہ لوگوں سے عطیات

جمع کرنا تھا۔

سکھوں سے کہا گیا کہ وہ "اپنی آمدنی کا دسواں حصہ خدا کی راہ میں نذر کریں" یہ نذر ایک طرح سے لازمی قرار دے دی گئی۔ مسندیا ان کے معاون میورا کہلاتے جو جگہ جگہ سے نذریں جمع کرتے۔ انہیں اس کی اجازت نہ تھی کہ نذر و نیاز کی آمدنی کو اپنے ذاتی مصرف میں لائیں۔ اس طرح امرتسر کے مرکزی خزانے کیلئے مستقل آمدنی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اب گرو کیلئے ممکن ہوگیا کہ دوسرے شہر مثلاً ترن تارن اور کرتار پور بسائے چنانچہ وسیع پیمانے پر تعمیرو کھدائی کا کام شروع ہوگیا۔

امرتسر کے تالاب کے بیچ انہوں نے دربار صاحب (گولڈن ٹیمپل) کی تعمیر شروع کی جو سکھوں کا مرکزی عبادت خانہ تھا۔ یہ گویا سکھوں کا کعبہ تھا۔ ان کے اہم ترین کاموں میں سے ایک یہ ہے کہ انہوں نے خود اپنے اور پچھلے گروؤں نیز کم از کم پانچ مسلمانوں اور دس ہندو درویشوں کے بھجن مرتب کئے جو "آدی گرنتھ" کہلاتے ہیں۔ یہ کتاب گویا سکھوں کی بائبل بن گئی اور سکھ مذہب کے معتقدین اس کو "ویدوں اور قرآن سے بھی بالاتر سمجھتے۔" یہ آدی گرنتھ 1604ء میں دربار صاحب میں رکھ دیا گیا۔

گرو کا دربار اتنا عالی شان ہوتا کہ مغل سلطنت کے بہت سے امراء کے دربار کی شان و شوکت اس کے سامنے ماند پڑ جاتی۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ گرو راجاجنک کی طرح معاشی زندگی بسر کرے جو دینی اور دنیوی کمالات کے اتحاد کا ایک مکمل نمونہ تھی۔ انہوں نے یہی مثال اپنے مریدوں کے سامنے پیش کی اور ان کو اس بات کی ترغیب دی کہ روحانی و اخلاقی فضائل کے ساتھ ساتھ سپاہیانہ خوبیاں اور تجارت میں ترقی کا جذبہ بھی ابھاریں۔

سکھوں نے گھوڑوں کی تجارت کی طرف توجہ دی جو کہ اس زمانے میں بہت ہی سودمند تھی۔ اس سے فن شہسواری سیکھنے میں مدد ملتی۔ "وہ جو سپاہیانہ مشقیں کرتے ہیں وہ میدان جنگ میں نڈر ہو کر لڑتے ہیں' وہ جو میدان جنگ میں فتح کرنے یا مرنے کا فیصلہ کرکے جاتے ہیں اور وہ جو مرتے دم ست نام کو اپنے سینے سے لگائے رکھتے ہیں وہ موت و زیست کی اذیت سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔" ان تمام باتوں نے مل کر سکھوں میں اپنی ذات اور اپنے فرقے کے متعلق گہرا احساس پیدا کر دیا۔ اس فرقے میں دولت' جوش اور قوت کا اضافہ ہوا اور اس طرح وہ دوسرے فرقوں اور مذہبی و سیاسی طبقوں کیلئے جاذب توجہ بن گئے۔

اکبر کی وسیع المشربانہ سیاست سے فائدہ اٹھا کر سکھ گروؤں کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ اپنے سماجی و مذہبی کاموں کو حسب دلخواہ انجام دیں۔ شہنشاہ کو اس تحریک یا اس کی تنظیم میں کوئی خاص قابل اعتراض بات معلوم نہ ہوئی لیکن یہ تحریک پنجاب کے جاگیرداروں اور مذہبی ٹھیکیداروں کی آنکھوں میں کھٹکتی ہوگی۔ اس وقت سرہند احیائے دین اسلام کی ایک زبردست تحریک کا مرکز بنا ہوا تھا جس کی رہنمائی شیخ احمد الفاروقی سرہندی (متولد 64-1563ء) کر رہے تھے جو ایک راسخ العقیدہ صوفی سلسلے کے خلیفہ بھی تھے۔

مسٹر آر پی ترپاٹھی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ سولہویں صدی کے اختتام پر دہلی میں وہ نقشبندیہ سلسلہ میں شامل ہوئے اور ان کا دعویٰ تھا کہ دین میں اسلام کے مختلف عقائد کی روحانی طاقت ان کے اندر مترکز ہے۔ جہانگیر نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس کی پیدائش کے وقت ہی سے خدا نے اس کو ہندوستان کا بادشاہ منتخب کر لیا تھا۔ اسی طرح شیخ احمد کا بھی یہی دعویٰ تھا کہ منشائے الٰہی یہی تھا کہ وہ دنیائے اسلام کی مذہبی اور روحانی رہنمائی کریں۔ وہ بڑے عالم باعمل تھے اور لوگ ان کا بہت احترام کرتے۔ ان کو اسلام کے دوسرے ہزار سالہ دور کا مجدد کہتے ہیں۔ اسی لئے ان کا خطاب مجدد الف ثانی ہے۔ ان کا مقصد اسلام کو ہر قسم کی بدعات اور حشو و زوائد سے پاک کرنا تھا۔

شیخ کے مداحوں میں خان خاناں' سید صدر جہاں' خان جہاں اور مہابت خاں کے نام لئے جاتے ہیں۔ اس وقت اکبر اپنی عمر کے آخری سال گزار رہا تھا اور اس کی پوری توجہ دکن کے امور اور سلیم کی بغاوت کی طرف مبذول تھی۔ اس کے علاوہ اکبر کو اتنا استحکام حاصل ہو چکا تھا کہ ہندوستان کے میدانی علاقوں میں کسی متعصب تحریک کا چلانا آسان نہ تھا۔

اکبر کے آخری ایام میں البتہ بعض امراء نے آگرے کی محافظ فوج کے سالار فرید بخاری کی سرکردگی اور بارہ کے سیدوں کی حمایت میں سلیم کی تخت نشینی کی پرزور حمایت کی۔ ان لوگوں نے سلیم کو ایک شرط پر اپنی پرجوش حمایت کا یقین دلایا تھا کہ وہ اسلام کی حفاظت کرے گا۔

غالباً اس وعدے کا مطلب یہ تھا کہ جہانگیر اکبر کی روش کے مقابلے میں روایتی اسلام کی حمایت کرے گا۔ جہانگیر کی تخت نشینی کے فوراً بعد شیخ فرید کو پنج ہزاری منصب عطا ہوا اور سلطنت کا میر بخشی بنا دیا گیا۔ فرید اور شیخ احمد کے تعلقات بہت گہرے تھے۔ چنانچہ پنجاب میں دو مستحکم مذہبی تحریکیں وجود میں آچکی تھیں جو مفید بھی ہو سکتی تھیں اور مضر بھی۔ ان میں سے ہر ایک اپنے ڈھنگ سے عوام اور خاص طور سے پنجاب کے رہنے والوں کی سیاسی و مذہبی زندگی پر اثر انداز ہوئیں ان دونوں تحریکوں کے پیرو اپنے عقائد و جذبات اور پرجوش رہبروں کے سبب سماجی و سیاسی پہلو اختیار کر رہے تھے لہٰذا جہانگیر کو دونوں ہی سے نبٹنا پڑا۔

جہانگیر نے سکھ مذہب اور اس کے گرو کے متعلق سن رکھا تھا "جس کو مذہبی اور دنیوی رہنما کہہ کر پکارتے تھے اور جو اپنے دین میں مسلمانوں کو بھی شامل کر لیتا۔ جہانگیر اس سلسلے میں مزید یہ لکھتا ہے کہ "مجھے کئی مرتبہ یہ خیال آیا کہ اس بے بنیاد موضوع (سکھ مذہب) کو ختم کروں یا پھر اس (گرو) حقیر انسان کو اسلام کا حلقہ بگوش بنا لوں۔"

باغی شہزادہ خسرو جب پنجاب سے فرار ہوتا ہوا گزرا تو اس نے گرو سے ملاقات کی۔ کہا جاتا ہے کہ گرو نے شہزادے کو مبارک باد دی۔ اس کی پیشانی پر زعفران کا قشقہ کھینچا اور اپنی دعاؤں کے علاوہ کچھ مالی مدد بھی دی۔

خسرو کی بغاوت نے جہانگیر کے مزاج میں تندی پیدا کر دی تھی اور وہ سخت گیر بھی ہو گیا تھا۔ گرو ارجن نے اپنے سلوک کی وضاحت میں بیان کیا کہ انہوں نے خسرو کے ساتھ جو

سلوک کیا اس کا اس کے سوا کوئی اور مقصد نہ تھا کہ شہنشاہ اکبر کے پوتے سے جو پریشان حالی میں مبتلا تھا مہربانی اور ہمدردی کا اظہار کرے۔ لیکن جہانگیر اس بیان سے مطمئن نہ ہوا اور اس نے گرو پر دو یا ڈھائی لاکھ کا جرمانہ عائد کر دیا۔ گرو نے یہ کہہ کر کہ ان کے پاس اپنی کوئی دولت نہیں اور جو کچھ ہے وہ غریبوں' لاچاروں اور مسافروں کیلئے ہے" جرمانہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔

اس بات پر شہنشاہ نے حکم صادر کیا کہ گرو کو گرفتار کر لیا جائے۔ ان کے بچے اور مکان فرید بخاری کو دے دیئے جائیں جس کو اب مرتضیٰ خاں کا خطاب مل چکا تھا۔ ان کی جائیداد ضبط کر لی جائے اور گرو کو قتل کر دیا جائے۔ البتہ جہانگیر نے سکھوں کے خلاف نہ تو کچھ کیا اور نہ کہا۔ سکھوں کے خلاف کوئی الزام عائد نہ کیا گیا اور محض مذہبی بنیادوں پر ایذا رسانی جہانگیر کا شیوہ نہ تھا۔

گرو نے نہ تو جرمانہ ادا کیا اور نہ ہی اپنے مریدوں کو جرمانے کی ادائیگی کیلئے چندہ جمع کرنے کی اجازت دی۔ سکھ روایات کے مطابق ہندو اہلکار چندو شاہ نے ذاتی رنجش کی بنا پر گرو کو اتنی اذیت پہنچائی کہ وہ مر گئے۔ اور 30 مئی 1606ء کو ان کی نعش دریائے راوی میں پھینک دی گئی۔

گرو ارجن دیو کی موت کی دردناک خبر ان کے گیارہ سالہ لڑکے اور جانشین ہرگوبند کو ایک الہام بخش پیغام کے ساتھ ملی جس میں کہا گیا اس (گرو ارجن کے جانشین) سے کہہ دو کہ ماتم نہ کرے اور نہ بزدلانہ طریقے سے سوگ منائے بلکہ خدا کے گن گائے۔ اس کو پوری طرح مسلح ہو کر تخت نشین ہونا چاہئے جہاں تک ہو سکے اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ فوج تیار کرے۔" گرو کی شہادت نے سکھوں کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ یہاں تک کہ جو باتیں سکھ تحریک میں ابھی تک پوشیدہ تھیں وہ واضح ہو گئیں۔ یہ پیغام اس بات کا منشور تھا کہ عادلانہ جذبات جنگجوئی کو ابھارا جائے" اور بتدریج منظم کیا جائے۔ سکھ مذہب کو سپاہیانہ مذہب بنایا جائے اور گرو ایک مقدس مجاہد کی حیثیت اختیار کرے۔ اسلام کی طرح جہاد کو مذہبی فرائض میں شامل کر کے معتقدین کو اس کی انجام دہی کی تعلیم دی گئی۔

گرو ہرگوبند نے اپنے والد کی وصیت کو گرہ میں باندھ لیا۔ دس دن تک گرنتھ صاحب کا پاٹھ ہوتا رہا۔ اس کے بعد گرو گدی نشین ہوئے اور پرانی رسم کے مطابق ان کو سیلی اور پگڑی پیش کی گئی۔ گرو نے حکم دیا کہ یہ دونوں چیزیں بھی فوراً ہی خزانے میں جمع کرا دی جائیں اور یہ کہا "تلوار کی پیٹی میری سیلی ہوگی اور پگڑی کے بجائے میں شاہی کلغی استعمال کروں گا۔" پھر انہوں نے دو تلواریں باندھیں "جو کہ مذہبی و دنیوی اقتدار کی علامت تھیں۔" گرو کی ماں نے تنہائی میں ان کو سمجھایا لیکن انہوں نے یہی جواب دیا "میرے متعلق آپ بالکل پریشان نہ ہوں ہر بات مرضی مولیٰ کے مطابق ہوگی۔"

ہرگوبند نے اب مسندوں کو حکم دیا کہ آئندہ معتقدین سے جو نذر و نیاز وصول کی جائے

وہ ہتھیار اور گھوڑوں کی شکل میں ہو نہ کہ روپے پیسے کی صورت میں۔ انہوں نے پیروکاروں کو گوشت کھانے کی اجازت دے دی اور "تخت اکال بنگا" کی بنیاد رکھی جو کہ پتھروں کا بنا ہوا ایک پختہ والان تھا۔ اسی کو انہوں نے اپنا تخت قرار دیا۔ شہر امرت سر کو ایک چھوٹی سی فصیل کے ذریعے محفوظ کر دیا گیا اور اس کا نام لوہ گڑھ رکھا۔ جب یہ مشہور ہوا کہ گرو ہرگوبند فوجی لیاقت کے لوگوں کی قدر کرتے ہیں تو بہترین قسم کے جنگجو اور پہلوان ان کے پاس آئے اور ان میں سے انہوں نے اپنے ذاتی محافظین کا دستہ منتخب کیا۔

ان کے سپاہی تنخواہ دار نہ تھے وہ یا تو قطعاً رضاکارانہ طور پر شامل ہوئے تھے یا پھر ان کو صرف دووقت کا کھانا' لباس' ایک گھوڑا اور ہتھیار دیئے جاتے۔ کشتی' جنگ اور شکار روز کا مشغلہ تھا۔

گرو ہانکا لگانے والوں کے گروہ کے ساتھ شکاری کتوں اور پالتو چیتوں اور مختلف النوع بازوں کو لے کر (ہر روز) لمبی مسافت طے کرتے لیکن مذہبی تعلیمات سے غفلت نہ برتتے۔ گرو ساون کے بادلوں کی طرح ہدایات کی بارش کرتے اور سکھ ان کے فیض سے دھان کے کھیتوں کی طرح سرسبز و شاداب ہو رہے تھے۔ سکھوں کو حکم دیا گیا کہ سارے تنازعات کو آپس ہی میں طے کر لیا کریں۔

لیکن گرو کا ارادہ یہ نہ تھا کہ آئندہ جلد ہی کسی سے جھگڑا مول لیں چہ جائیکہ مغل شہنشاہ سے انہوں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ شہنشاہ جہانگیر سے ملیں کیونکہ شہنشاہ نے ان کے دوہرے اقتدار اور اکال تخت سے گھبرا کر 1612ء میں بلا بھیجا تھا۔ جہانگیر نے حکم دیا کہ ان کے باپ پر جو جرمانہ عائد کیا گیا تھا وہ ادا کریں لیکن انہوں نے انکار کر دیا لہٰذا ان کو بارہ سال کیلئے گوالیار کے قید خانے میں بھیج دیا گیا۔

کچھ عرصے تک ان کو قید میں ضرور رکھا گیا لیکن ان کے ساتھ قلعدار کا سلوک بہت اچھا تھا۔ پھر جب گرو کی ماں نے بھائی جیٹھا کو ان کی رہائی حاصل کرنے کیلئے دہلی روانہ کیا تو ان کا مقصد وزیر خاں کی مدد سے پورا ہوگیا اور شہنشاہ کی ناراضگی ختم ہوگئی۔ گرو کو رہا کر دیا گیا اور چندوشاہ کو ان کے سپرد کر دیا گیا تاکہ اسے حسب دلخواہ سزا دے سکیں۔ بعد ازاں جہانگیر کا سکھوں سے جھگڑا ختم ہوگیا اور سکھوں کی باہمی چپقلش شروع ہوگئی۔ یہ اختلافات بھائی گورداس کے اعتراضات کی شکل میں ظاہر ہوئے لیکن گورو نے ان کو درخور اعتنا نہ جانتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا۔

(مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال از آر پی ترپاٹھی' صفحہ 408 تا 418)

باب 4

مغلیہ دور کے آخری فرمانروا

(اورنگ زیب عالمگیر کے بعد)

1۔ محمد معظم بہادر شاہ۔۔ شاہ عالم (اول) 1707ء تا 1712ء
2۔ جہاں دار شاہ 1712ء تا 1713ء
3۔ فرخ سیر 1713ء تا 1719ء
4۔ رفیع الدرجات 1719ء تا 1719ء (چند ماہ)
5۔ رفیع الدولہ 1719ء تا 1719ء (چند ماہ)
6۔ محمد شاہ (رنگیلا) 1719ء تا 1748ء
7۔ احمد شاہ 1748ء تا 1754ء
8۔ عالمگیر ثانی 1754ء تا 1759ء
9۔ شاہ عالم ثانی 1759ء تا 1806ء
10۔ اکبر ثانی 1806ء تا 1837ء
11۔ بہادر شاہ ثانی (ظفر) 1837ء تا 1857ء

اورنگ زیب کے جانشین

اورنگ زیب کے پانچ بیٹے تھے۔ (1) محمد سلطان (م 1676) (2) محمد معظم (3) محمد اعظم (4) اکبر (م 1704ء) (5) کام بخش۔ گویا اکبر 1704ء میں وفات پا چکا تھا۔

اورنگ زیب 20 فروری 1707ء کو فوت ہوا۔ وہ مغل کی شہزادوں کی جنگ تخت نشینی کے متوقع خون ریز مرحلوں سے آگاہ تھا لہٰذا اس نے اپنی زندگی میں ہی اپنے تین بیٹوں کے درمیان اپنی سلطنت کو بلحاظ اہلیت و قابلیت تقسیم کر دیا تھا۔

(1) محمد معظم : (سب سے بڑا بھائی جو) کابل و پنجاب کا حاکم تھا۔ (جو بعد میں بہادر شاہ اول اور شاہ عالم کے نام سے مشہور ہوا۔)

(2) محمد اعظم : یہ مالوہ اور گجرات کا حاکم تھا۔

(3) کام بخش : یہ دکن میں تھا اور بر سرِ پیکار تھا۔

اورنگ زیب کی وفات کی خبر پھیلتے ہی تخت نشینی کی جنگ چھڑ گئی اور ان شہزادوں نے باپ کی وصیت پر قطعاً غور نہ کیا کیونکہ ہر ایک ہوس اقتدار میں اندھا ہو رہا تھا۔ وفات کے وقت شہزادہ محمد معظم جمرود (افغانستان) میں تھا۔ وہ بادشاہت پر قبضہ کیلئے دہلی کی طرف بڑھا۔

محمد اعظم مالوہ کے دورہ پر گیا ہوا تھا اس کی بہن زیب النساء نے اپنے والد کی وفات کی خبر بذریعہ قاصد اسے پہنچائی وہ واپس آیا۔ والد گرامی کی تجہیز و تکفین کے بعد امرا اور خدام سے ملا اور خزانہ، توپخانہ وغیرہ کا چارج لیکر ان کا ملاحظہ کیا۔

کام بخش کو والد کی وفات کا علم قلعہ پرینده میں ہوا اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کرکے اپنے نام کا خطبہ جاری کر دیا اور دین پناہ کا لقب اختیار کیا اور سکوں پر یہ شعر لکھوایا:

{ در دکن زد سکہ بر خورشید و ماہ
بادشاہ کام بخش دین پناہ

محمد معظم شاہ عالم بہادر شاہ

(1707ء تا 1712ء)

محمد اعظم نے اپنے حامی امراء کو انعامات سے خوب نوازا اور ذوالحجہ کے وسط میں وہ امراء کو ساتھ لئے محمد معظم کے مقابلہ کیلئے چلا لیکن اس کے اکبر آباد (آگرہ) پہنچنے سے پہلے محمد معظم کے آدمیوں نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ ادھر عالمگیر کی علالت کے زمانہ میں منعم خان کو شہزادہ معظم نے لاہور کا وزیر مال بنا دیا تھا۔ وفات کی خبر کے بعد منعم خاں نے شہزادہ معظم کی خدمات میں کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس نے لاہور میں چالیس لاکھ روپے محمد معظم کی خدمت میں پیش کئے اور اس نے بہادر شاہ یا شاہ عالم کا لقب اختیار کرکے بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ اور اپنے بیٹے محمد معزالدین کو اکبر آباد کی طرف بھیجا جس نے قلعہ پر قابض ہو کر مختار خاں صوبیدار کو حراست میں لے لیا۔ شاہ عالم تیس لاکھ روپے کے ساتھ اکبر آباد پہنچا تو باقی خاں نے خزانے کی کنجیاں اس کے حوالے کر دیں کہا جاتا ہے کہ اس وقت خزانہ میں نو کروڑ (یا بقول بعض تیرہ کروڑ) روپیہ موجود تھا۔ شاہ عالم نے اس فتح و اقتدار حاصل ہونے کی خوشی میں بڑا جشن منایا اور لاکھوں روپے امراء اور شہزادوں میں تقسیم کئے۔ نیز بے شمار زر و جواہرات بھی تقسیم کئے۔ بہت سے مناصب پر بھی عہدیداروں کا تقرر ہوا۔ اس وقت شاہ عالم کے ہمراہ اسی ہزار سوار تھے۔ ادھر اعظم خاں نے بھی خزانہ سے امراء روسا کو خوب نوازا لیکن اس کے پاس خزانہ شاہ عالم کے مقابلے میں کم تھا۔ نیز اس کی طبیعت میں سخاوت کا عنصر بھی زیادہ تھا جبکہ شاہ عالم کے پاس خوئے دلنوازی کا توشہ وافر مقدار میں تھا۔ وہ تخت پر قبضہ کے خیال سے گوالیار تک آپہنچا۔ جہاں اسے شاہ عالم نے پیغام بھجوایا کہ والد گرامی کی وصیت کے مطابق دکن کے چھ میں سے چار صوبے آپ کے ہیں ان کے علاوہ دو صوبے اور بھی آپ کو مل جائیں گے لہٰذا جنگ سے باز آنا ہی ہمارے حق میں بہتر ہے لیکن محمد اعظم اس پیغام کو شاہ عالم کی کمزوری سمجھا۔ ادھر تیز آندھی آفت کی شکل میں آئی۔ ذوالفقار نے محمد اعظم کو مشورہ دیا کہ حالات سازگار نہیں ہیں لہٰذا کمک پہنچنے کے بعد ہی جنگ میں کودنا چاہئے لیکن اعظم نے اس کا مشورہ رد کر دیا اور اسے منہ نہ لگایا۔ آخر ذوالفقار اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ چنانچہ محمد اعظم نے دشمن پر حملہ کر دیا لیکن اس کے دو بیٹے اس جنگ میں کام آئے اور کئی امراء بھی مارے گئے۔ اب اسے زندگی اور بادشاہت سے کوئی رغبت نہ تھی اس نے اپنا ہاتھی آگے بڑھایا۔ رستم خاں نامی ایک امیر اس کے ہاتھی پر جا چڑھا اور محمد اعظم کو قتل کر دیا۔ اس طرح شاہ عالم کو فتح نصیب ہوئی۔ شاہ عالم نے فتح پانے کے بعد وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا اور مخالف امراء کو منصب دیکر ترقی بھی دی۔ اور ان کی خوب عزت افزائی کی اور محمد اعظم اور اس کے بیٹوں کو ہمایوں کے مقبرہ میں دفن کرایا پھر امراء میں انعامات اور خطابات تقسیم کئے۔ اپنے بیٹے معزالدین کو جہاندار شاہ کا خطاب دیا اور دوسرے بیٹے محمد اعظم

کو عظیم الشان کا خطاب عطا کیا جبکہ رفیع القدر کو رفیع الشان کے خطاب سے نوازا گیا اور جحستہ اختر کو جہان شاہ بہادر کا خطاب ملا۔

محمد اعظم کے قتل کی خبر گوالیار پہنچی تو امیر الامرا اسد اللہ نے شہزادی زیب النساء کے پاس حاضر ہو کر تعزیت کی اور اسے اپنے ساتھ لیکر شاہ عالم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت زیب النساء بھائی کے غم میں ماتمی لباس میں تھی۔ اس نے شاہ عالم کو فتح کی مبارک باد بھی دی تاہم شاہ عالم نے تحمل کا مظاہرہ کیا اور زیب النساء وغیرہ کا سالانہ وظیفہ مقرر کرکے اسے شاہجہان آباد بھجوا دیا جبکہ اسد خاں کو وکیل مطلق بنا دیا۔

کام بخش کا پیغام بھجوانا۔۔ اس کی سرکشی اور شکست : اقتدار کی دوسری سالگرہ کے موقع پر 18 ذوالحجہ 1119 ھ کو جشن منایا گیا اور اس موقع پر شاہ عالم نے حافظ محمد مفتی (جس کا خطاب معتبر خاں تھا) کے ہاتھ کام بخش کو محبت بھرا خط بھجوایا کہ والد بزرگوار نے بیجاپور کی حکومت تمہیں عطا کی تھی اس کے ساتھ ہم آپ کو حیدر آباد کا صوبہ بھی دیتے ہیں بس آپ اتنا کریں کہ متحدہ اسلامی ریاست کی طرح حسب سابق ہمارا سکہ اور خطبہ اپنے زیر قبضہ علاقوں میں جاری کر دیں نیز ہم صوبے کے حاکموں کو جزیہ جمع کروانے سے بھی مستثنیٰ قرار دیتے ہیں لیکن کام بخش نے ازخود گولکنڈہ اور حیدر آباد کی تسخیر کا منصوبہ بنایا لیکن اپنے ساتھیوں سے بگاڑ مول لیا۔ رستم خاں اور اس کے بیٹوں کو قید کرکے قتل کروا دیا اور احتجاج کرنے پر اس کی بیوی کو بھی مروا دیا۔ تیر اندازی کے ماہر اور اپنے استاد سیف خاں کے ہاتھ کٹوا دیئے۔ احمد خاں پر گھوڑے دوڑا دیئے اور ارشد خاں نامی امیر کی زبان کٹوا دی۔ احسن خاں کا گھر بار ضبط کرکے تین ماہ تک اسے اذیتیں دیکر قید میں ہی مار ڈالا اور اس طرح ظلم و تشدد کرکے اپنے اردگرد بے رحمانہ ماحول پیدا کر لیا کہ ہر کوئی کام بخش سے ناخوش تھا اور اس سے نجات حاصل ہونے کی دعائیں کر رہا تھا۔

جب اسے شاہ عالم کا پیغام ملا تو معتبر خاں (ایلچی) کے بارے میں خوشامدیوں نے کام بخش کے کان بھرے کہ وہ سازش سے آپ کو شکست دینا چاہتا ہے اور اس مقصد کیلئے اپنے ساتھ بھاری جمعیت لایا ہے۔ کام بخش نے بہانہ کرکے خوشامدیوں سے معتبر خاں کے ساتھ آنے والے لوگوں کی فہرست مانگی تاکہ انہیں ماہانہ وظیفہ دیا جائے۔ چنانچہ وظیفے کی خاطر خوشامدی حضرات نے مذکورہ لسٹ میں اپنے ہی حواریوں کے پچھتر (75) کے قریب نام لکھ کر بھجوا دیئے۔ کام بخش نے فہرست میں درج لوگوں کو بڑے کھانے کی دعوت دی اور سازش کے تحت دس دس کو مختلف بازاروں اور محلوں میں لے جا کر قتل کروا دیا۔ پھر شاہ عالم کے ایلچی کو ذلیل و خوار کیا۔ جب شاہ عالم نے اپنے نوازشانہ پیغام محبت کی یہ درگت بنی دیکھی تو اس نے اسی ہزار کی فوج سے کام بخش پر حملہ کیا اور اس کی چھ سات ہزار مظلوم فوج کو شکست دیکر دس ذیقعدہ 1120 ھ کو کام بخش کو زندہ گرفتار کر لیا۔ اس کے زخم سلے ہوئے تھے اور وہ بے ہوش تھا۔ جب اسے ہوش آیا اور شاہ عالم اسے ملنے گیا تو بھائی کو دیکھتے ہی جوش انتقام سے زخموں کے ٹانکے ٹوٹ گئے اور خون بہہ

نکلا چنانچہ کام بخش فوت ہوگیا نیز اس کا بیٹا فیروز مند بھی موت کی وادی میں جا پہنچا۔ شاہ عالم نے دکن میں داؤد خاں پنی (ایک امیر) کو صوبیداری سونپی اور واپس ہوا۔ ابھی برہان پور میں ہی تھا کہ راجپوتوں کی سرکشی کی خبر ملی جن کو ایک امیر سیف خاں نے کام بخش کی طرف سے مدد پر آمادہ کیا تھا۔ شاہ عالم اجین سے گزر کر اجمیر میں آٹھہرا۔

راجپوتوں کو سبق سکھانا : راجہ جسونت سنگھ کے بیٹے اجیت سنگھ نے عالمگیر کی وفات کے بعد سرکشی کا راستہ اپنایا۔ اس نے مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ مسجدوں کو شہید کر دیا اور ان کی جگہ مندر بنوائے۔ ذبیحہ گاؤ پر بھی پابندی لگا دی۔ اسے اپنے خسر جے سنگھ راجہ اور ریاست اودے پور کی حمایت پر بہت گھمنڈ تھا۔

چنانچہ شاہ عالم نے ان کو سبق سکھانے کا ارادہ کیا اور راجپوتانہ کو تاخت و تاراج کرنے کی غرض سے شہزادہ عظیم الشان کے ہمراہ خاں خاناں اور صمصام الدولہ کو مقرر کیا۔

راجپوتانہ کے یہ بہادر لوگ شاہی حملہ کی تاب نہ لاسکے اور دشوار گزار پہاڑوں میں روپوش ہوگئے۔ آخر اجیت سنگھ اور اس کے حامیوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ صلح کر لی جائے چنانچہ اس نے گرائی گئی مساجد کی جگہ قاضی القضاۃ قاضی خاں کی سرکردگی میں نئی مساجد تعمیر کروانے کی حامی بھری' ذبیحہ گاؤ پر پابندی ختم کر دی اور اذانیں دلوائیں اور معافی مانگی چنانچہ شاہ عالم نے اسے معاف کر دیا۔ نیز اسے خلعت اور شمشیر اور ہاتھی بھی عنایت کئے۔

بندہ بیراگی : 1708ء/1120ھ میں سکھوں کے گرو گوبند سنگھ کے انتقال پر "بندا" نامی ایک شخص نے گرو گوبند ہونے کا دعویٰ کیا۔اور ایک بڑی جمعیت اکٹھی کرکے سرہند پر قبضہ کر لیا اور پھر یہ لوگ ستلج پار تک دھاوے کرنے لگے گئے۔ آخر بادشاہ نے شہزادہ رفیع الشان کو ان کی روک تھام کیلئے بھیجا۔ شہزادہ نے ان کو پے در پے شکستیں دے کر ایک قلعہ میں محصور کر دیا مگر بندا بھیس بدل کر بھاگ نکلا اور جمعیت منتشر ہوگئی۔ شاہ عالم لاہور آگیا اور اسی جگہ 1712ء/1124ھ میں انتقال کر گیا۔ (سکھوں کے بارے میں تفصیلات الگ عنوان سے دی گئی ہیں-)

بہادر شاہ اور مرہٹے : انہوں نے شاہ عالم کا ساتھ اس وقت دیا تھا جب وہ کام بخش کے ساتھ نبرد آزما تھا چنانچہ اس صلے میں جاگیریں اور منصب ان کو ملے۔ سنبھاجی کے بیٹے ساہو کو باجگزار حاکم کی حیثیت سے پونا کا حاکم تسلیم کیا جا چکا تھا لیکن اس کے چچا راجہ رام کی بیوہ تارا بائی نے جھگڑا پیدا کیا جس کی وجہ سے ساہو کو دکن کی مالگزاری کی وصولی کا ٹھیکہ ملتے ملتے رہ گیا کیونکہ شاہ عالم اس وصولی میں سے صرف 25 فیصد لینے پر رضامند تھا لیکن تارا بائی اور ساہو کے اختلافات کی وجہ سے یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور شاہ عالم نے دونوں مرہٹہ فریقوں کو ایک جیسے مناصب اور اعزازات دینے پر اکتفا کیا۔ اس کے نتائج یہ نکلے کہ دکن میں مغلوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور مرہٹہ حاکمیت کی راہ ہموار ہوگئی۔

بہادر شاہ اول یا شاہ عالم (1707ء تا 1712ء کے عہد کا جائزہ :

انتظامی امور : کام بخش پر فتح مندی کے بعد بہادر شاہ دکن کا بھی حکمران ہوگیا تو اس نے اپنے محبوب امرا اسد خاں اور اس کے بیٹے ذوالفقار سے کہا کہ اس نے اپنے قدیم نمک خوار سے شہزادگی کی عمر میں ایک وعدہ کیا تھا کہ جب میں بادشاہ بنوں گا تو تجھے اپنا وزیراعظم بناؤں گا۔ لہذا کوئی اسے وزیراعظم بنانے کا ایسا راستہ تلاش کرو کہ تمہاری شان اور عظمت کو بھی دھچکا نہ لگے۔ اسد خاں نے کہا کہ بادشاہ سلامت کو وعدہ ضرور نبھانا چاہئے چنانچہ بہادر شاہ نے حکم جاری کیا کہ اسد خاں کو وکیل المطلق کے عہدہ پر فائز کیا جائے اور خلعت سے نوازا جائے جبکہ منعم خاں کو خان خاناں کا خطاب دیکر وزیراعظم (جو ان دنوں محض وزیر کہلاتا تھا) بنایا جائے اور آصف الدولہ نامی امیر مسند وکالت پر زیر شامیانہ وزارت بیٹھا کرے اور منعم خاں آداب نوکری کے کاغذات پر آصف الدولہ کے دستخط کروایا کرے۔

سپہ سالار ذوالفقار خاں (ولد اسد خاں) کو امیر الامراء کا خطاب ملا اور اسے دکن کی صوبیداری دی گئی۔ یہ انتخاب بھی بہت موزوں تھا کیونکہ ذوالفقار خاں ہی دکن میں کامیاب رہ سکتا تھا۔

بہادر شاہ اور لاہور : سکھوں کا قلع قمع کرنے کیلئے بہادر شاہ کو لاہور میں قیام کرنا پڑا اور اس نے حکم دیا کہ کوئی سکھ نہ تو لاہور میں داخل ہو سکتا ہے نہ یہاں رہائش رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ سکھوں نے لاہور سے نکل کر آس پاس کے دیہات میں ڈیرے ڈال لئے۔ چنانچہ شاہ عالم عرف بہادر شاہ نے ایک عرصہ تک لاہور کو پایہ تخت بنائے رکھا اور آخر اس نے یہاں پر ہی وفات پائی۔

بہادر شاہ شیعہ اور اس کے سنی بیٹے : بہادر شاہ خود شیعہ خیال کا تھا چنانچہ اس نے لاہور میں علماء کو حکم دیا کہ خطبے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام کے ساتھ "وصی" کا لفظ بھی ضرور استعمال کیا جائے نیز اذان میں بھی علی ولی اللہ وصی اللہ کے کلمات کو شامل کرنے کا حکم دیا جس کی وجہ سے لاہور میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ جہاں شاہ کا بیٹا خجستہ اختر اور عظیم الشان سنی اور عالمگیر مرحوم کے ہم مسلک تھے۔ انہوں نے بھی والد کے حکم کی مخالفت میں حاجی یار محمد کا ساتھ دیا جو بادشاہ کے خلاف تحریک عدم تعاون کا سرخیل تھا۔ آخر بہادر شاہ نے اپنا حکم واپس لے لیا۔

شاہ عالم نے 21 محرم الحرام (19 فروری 1712ء) کو لاہور میں وفات پائی۔ یہاں سے اسے لیجا کر دہلی میں قطب صاحب کے احاطہ کے باہر دفن کیا گیا اور جہاں دار شاہ کے بیٹے عظیم الشان کو عظیم الشان کے مصاحبوں نے اس کی تخت نشینی کا اعلان کرنے پر مجبور کر دیا۔

جہاں دار شاہ

(1712ء تا 1713ء)

شاہ عالم کے مندرجہ ذیل چار بیٹے تخت کے دعویدار تھے:

1۔ جہاں دار شاہ
2۔ عظیم الشان
3۔ رفیع الشان
4۔ جہان شاہ

شاہ عالم کے بیٹوں کی آل اولاد جو تخت یا تختہ تک پہنچی۔

1۔ جہاندار شاہ کی اولاد۔ عالمگیر ثانی (اس کا بیٹا) شاہ عالم ثانی (اس کا) اکبر ثانی (اس کا بیٹا) بہادر شاہ ظفر آخری مغل تاجدار تھا۔
2۔ عظیم الشان کا بیٹا۔۔ فرخ سیر تھا۔
3۔ رفیع الشان کے تین بیٹے تھے: (1) رفیع الدولہ (2) رفیع الدرجات (3) محمد ابراہیم
4۔ جہاں شاہ کے بیٹے۔۔۔ (1) محمد شاہ رنگیلا (2) احمد شاہ تھے

جہاں دار شاہ اور فرخ سیر: شاہ عالم کا لڑکا شہزادہ معز الدین جہاں دار شاہ کے لقب سے اپنے بھائی بھتیجوں کو ٹھکانے لگا کر ہندوستان کا بادشاہ ہوا لیکن پٹنہ (بہار) میں عظیم الشان کا لڑکا فرخ سیر موجود تھا اس نے بارہہ کے سادات کی مدد سے آگرہ کے پاس بڑی سخت لڑائی کے بعد جہاں دار شاہ پر (1712ء/1124ھ) میں فتح پائی۔ بارہہ کے سادات میں سے سید عبداللہ خان کو قطب الملک اور ان کے بھائی سید حسین علی خاں کو امیر الامرا کا خطاب دیا اور فیروز جنگ بہادر کے لڑکے چن قلیچ خاں کو نظام الملک فتح جنگ کا خطاب دے کر دکن کی صوبہ داری عنایت کی' حیدر آباد دکن کے نظام کی سلطنت کی بنیاد انہی سے پڑی پہلے کے دستور کے مطابق بادشاہ کے تخت پر بیٹھتے ہی جودھپور کا راجہ باغی ہوگیا۔ بادشاہ نے سید حسین علی خاں کو گوشمالی کیلئے روانہ کیا جس نے پے در پے شکست دے کر راجہ کو پہاڑوں میں بھاگ جانے پر مجبور کیا۔ ناچار معافی مانگی اور سالانہ خراج ادا کیا۔ سید حسین اس کے لڑکے کو ساتھ لے کر دہلی واپس آگیا۔

1714ء/1126ھ میں بندا نے سر اٹھایا اور سکھوں کی پہاڑی جماعت کو لیکر پنجاب کے گاؤں لوٹنے لگا اور اس بے رحمی اور سنگ دلی سے رعایا کو ستایا کہ سارا پنجاب چیخ اٹھا۔ بادشاہ نے لاہور کے حاکم عبدالصمد خاں کو ان کی سرکوبی کیلئے روانہ کیا۔ اس نے ان سب کو ایک قلعہ میں اس طرح گھیر لیا کہ فاقوں مرنے لگے مجبور بندا نے اپنے کو حوالہ کر دیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ دہلی بھیجا گیا جہاں اس کو قتل کر دیا گیا۔

اب بارہہ کے سادات کا زور بہت بڑھ گیا تھا۔ سلطنت کے سارے کاروبار پر وہ حاوی ہوگئے۔ دربار کے پرانے امیر تک دم بخود تھے۔ بادشاہ بھی ان کے ہاتھ سے تنگ آگیا تھا۔ سید عبداللہ بھی اس معاملہ کو سمجھ گئے۔ 1131ھ/ 1718ء میں فرخ سیر کو قید کر دیا اور اسی قید میں وہ مار ڈالا گیا اور شاہ عالم بہادر شاہ کے پوتے "رفیع الدرجات" کو تخت پر بٹھایا تین ماہ کے بعد دق کے مرض میں بادشاہ کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بھائی "رفیع الدولہ" کو بادشاہ بنایا لیکن بدقسمتی سے دو مہینے کے بعد یہ بھی مرگیا اور ملک میں ہر طرف بدنظمی پھیل گئی۔

فرخ سیر اور بارہہ کے سادات اور جہاں دار شاہ : شاہ عالم نے تین سید بھائیوں کی جاں نثاری اور مدد سے تخت حاصل کیا تھا۔ ان میں سب سے چھوٹا سید نورالدین تو تخت نشینی کے وقت جنگ میں مارا گیا اور دوسرے دو بھائیوں سید علی حسین عبداللہ اور حسین علی نے بڑی عزت پائی اور سید عبداللہ کو چار ہزاری منصب دے کر الہ آباد میں بطور گورنر تعینات کر دیا گیا جبکہ سید حسین علی کو (بہادر شاہ نے اپنی زندگی میں ہی (اپنے بیٹے) عظیم الشان کی جگہ (جو تعیناتی کے بعد دربار میں ہی مقیم رہا) بہار و بنگال کے قائم مقام گورنر کے طور پر تعینات کرکے پٹنہ بھیج دیا تھا۔ جہاں ان دنوں عظیم الشان کا بیٹا فرخ سیر اس کے نائب کے طور پر مقیم تھا۔ لیکن فرخ سیر بہت لاپرواہ اور غیر ذمہ دار شخص تھا اس لئے شاہ عالم نے اسے معزول کرکے دربار میں طلب کر لیا تھا۔ فرخ سیر بنگال سے چل تو پڑا لیکن دادا جی کے ڈر سے پٹنہ میں ہی ٹھہر گیا۔ یہاں اسے دادا جی کے مرنے کی خبر ملی چنانچہ فرخ سیر نے پٹنہ میں ہی اپنے والد عظیم الشان کی بادشاہت کا اعلان کر دیا لیکن ادھر عظیم الشان مارا گیا اور معز الدین نے غلبہ پا کر جہاں دار شاہ کے لقب سے حکومت سنبھال لی۔ یہ خبر ملتے ہی فرخ سیر نے مقتول باپ کی جگہ اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا اور پٹنہ میں مقیم سید حسین علی کو اپنے ساتھ ملا کر دہلی پر فوج کشی کی غرض سے فتح پور کے قریب بمقام کھجواہ پہنچ گیا جہاں اسے جہاں دار شاہ کی فوج سے مقابلہ پیش آیا لیکن جہاں دار شاہ کے جرنیل نا اتفاقی اور نااہلی کی وجہ سے شکست کھا گئے۔ پھر ایک معرکہ آگرہ کے قریب ہوا اس جگہ جہاں دار شاہ کی بھیجی ہوئی فوج اگرچہ زیادہ تھی لیکن فتح فرخ سیر کا مقدر بنی کیونکہ جہاں دار شاہ کو داد عیش عشرت سے ہی فرصت نہ تھی اور نہ وہ اس جنگ میں بذات خود مقابلہ کیلئے پہنچا تھا۔ سید حسین علی کا دستہ عیش پرست بادشاہ کی رقص گاہ تک جا پہنچا جہاں دار شاہ میدان جنگ میں بھی اپنی محبوبہ لعل کنور کے ساتھ محو عشرت تھا۔ سید حسین علی کے دستہ نے حملہ کیا تو لعل کنور رتھ میں بیٹھ کر فرار ہوگئی اور جہاں دار شاہ نے بھی فرار میں ہی عافیت دیکھی اور وہ بھاگ کر آگرہ کے قلعہ میں جا چھپا۔ بادشاہ کے فرار ہوتے ہی اس کی فوج نے ہتھیار ڈال دیئے اور فرخ سیر نے 1713ء میں تخت نشینی کی جنگ جیت لی اور جہاں دار شاہ دہلی پہنچ گیا۔ جہاں دار شاہ اپنے وزیر اور سپہ سالار ذوالفقار خاں کی مدد سے پنجاب کی طرف بھاگنا چاہتا تھا لیکن ذوالفقار خاں کے والد نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا چنانچہ اسے ذوالفقار خاں نے قلعے میں نظربند کرا دیا۔ فرخ سیر کے فوجیوں نے یہاں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور ذوالفقار خاں کا بھی یہی حشر

ہوا۔ تاہم اس کے باپ اسد خاں کو ذلیل و خوار کرنے کے بعد معافی دے دی گئی۔ بہرحال فرخ سیر کو تخت شاہی مل گیا اور تخت دلانے میں سید برادران کا سب سے زیادہ دخل تھا چنانچہ اس کے صلے میں سید علی حسین عبداللہ کو ہفت ہزاری کا منصب اور قطب الملک کا خطاب عطا ہوا اور اسے وزارت عظمیٰ پر سرفراز کیا گیا۔ حسین علی خاں کو ہفت ہزاری منصب اور امیر الامرا کا عہدہ عطا ہوا نیز میر بخشی اول کا عہدہ بھی دیا گیا۔ اسی طرح دیگر امراء کو بھی نوازا گیا۔

جہاں دار شاہ کا کردار : یہ بڑا ظالم اور سنگدل تھا اس نے رفیع الشان کے تین زخمی بیٹوں کو عوام کے منع کرنے کے باوجود قتل کروا دیا۔ عظیم الشان کے بڑے بیٹے شہزادہ محمد کریم نے چھپ کر جان بچائی لیکن جب ہاتھ لگا تو اسے بھی ٹھکانے لگا دیا گیا جہاں شاہ کے بیٹے نجستہ اختر کو گرفتار کرنے کے بعد مروا دیا گیا۔ اورنگ زیب کا پوتا (شہزادہ اعظم کا بیٹا) جسے بہادر شاہ نے اس کے باپ کے مرنے کے بعد بیٹوں کی طرح پالا تھا اسے بھی جہاں دار شاہ نے قتل کروا دیا نیز کام بخش (ولد اورنگ زیب) کے بچ جانے والے دو بیٹے جو بہادر شاہ کے پاس بیٹوں کی طرح پلے بڑھے تھے ان کو بھی جہاں دار شاہ نے مروا دیا۔ نیز بیس نامور امرا کو بھی تہ تیغ کروا دیا۔ جن میں رستم دل خاں، مخلص خاں، مہابت خاں، خان زمان خاں، عبدالقدیر خاں، لطیف اللہ خاں، حکیم الملک، ہدایت اللہ خاں اور جہاں شاہ کے بخشی (وزیر جنگ) محمد علی خاں بھی شامل تھے۔

لوگ باگ بھی جہاں دار شاہ کے ظلم و ستم سے تنگ آئے ہوئے تھے چنانچہ ایسی افراتفری کے عالم میں دربار میں ہر کوئی "ہر چہ باد اباد" کے تحت اپنی جان بچانے یا اقتدار میں حصہ دار بننے کیلئے مصروف ہوگیا۔

کردار : تاریخ نگار جہاں دار شاہ کے عہد کو فسق و فجور کا دور کہتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ قاضی القضاۃ اور مفتی کے ہاتھ میں صراحی اور جام تھا۔ عنان حکومت ایک بازاری عورت لعل کنور اور اس کے نااہل طبلچیوں اور موسیقاروں کے ہاتھ میں تھی۔ جہاں دار شاہ کو فسق و فجور سے فرصت نہ تھی۔ وہ لھو و لعب اور عیش و عشرت میں گم ہو کر رہ گیا۔ اس کے وفادار امراء بھی اس سے بدظن ہوگئے اور جب فرخ سیر کی افواج نے اس کی فوجوں کو للکارا تو کثیر تعداد میں ہونے کے باوجود وہ جم کر نہ لڑ سکیں اور مغل سلطنت کے رعب و داب کا وارث یہ بادشاہ دس ماہ کے عرصہ میں مسلمانوں کی عظیم سلطنت ہند کے بھی پرخچے اڑا گیا اور اپنی بھی جان نہ بچا سکا اور 1713ء میں خالق حقیقی سے ملاقات کرنے پر مجبور ہوگیا۔

فرخ سیر 1713ء تا 1719ء : 1713ء میں فرخ سیر کو مغل سلطنت کی حاکمیت ملی اس کے عہد میں سکھوں کے پیرو بندہ بیراگی کا قلع قمع کرنا پڑا۔ اس کے جرنیلوں نے مسلسل لڑائیاں لڑیں اور آخر بندہ بیراگی اور اس کے ساڑھے سات سو (750) ساتھیوں کو گرفتار کر کے دہلی پہنچایا گیا جہاں انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

فرخ سیر سید برادران کے بل بوتے پر حکومت میں آیا تھا لیکن درباری امراء میں غلط

فہمیاں پیدا ہو چکی تھیں اور وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور اپنی جان بچانے اور کسی نہ کسی طرح اقتدار حاصل کرنے کی کوشش میں رہنے لگے۔ چنانچہ اس گروہ بندی کے نتیجہ میں مسلح تصادم رونما ہوا جس میں سخت مقابلے کے بعد سید بھائیوں نے فرخ سیر کو گرفتار کر لیا۔ مخالفین اس کے محل میں داخل ہو گئے اور حرم میں شاہی خواتین کی بے حرمتی کی گئی اور فرخ سیر کو ترپولی کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ یہ واقعہ 28 فروری 1719ء کو پیش آیا جہاں اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر کر اسے اندھا کر دیا گیا اور زہر دیکر 16 مئی 1719ء کو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور ہمایوں کے مقبرہ میں دفن کیا گیا۔

فرخ سیر نے بھی مغل بادشاہوں کی طرح مخالفین سے انتقام لیا تھا۔ جہاں دار شاہ کے حامی ذوالفقار خاں کو قتل کروا دیا اور اس کے والد اسد خاں کو البتہ پرانی خدمات کے صلے میں زندہ رہنے دیا۔ ذوالفقار خاں کے خزانچی راجہ سوبھا چند کو دربار میں بلایا اور اس کی زبان کاٹ دی گئی کیونکہ اس نے فرخ سیر پر نکتہ چینی کی تھی۔ نیز دو شہزادوں کو اندھا کروا دیا گیا۔

فرخ سیر ایک کٹھ پتلی بادشاہ تھا عیاشی اور نا اہلی میں وہ بھی کم نہ تھا۔ اسے تیس سال کی عمر میں تخت پر بٹھایا گیا وہ بہت حسین تھا لیکن بے وفائی اس کی گھٹی میں رچی بسی تھی۔ بزدل اور ظالم تو تھا ہی اپنے وفاداروں کا بھی پاس لحاظ نہ کرتا تھا۔ سید بھائیوں کی قید نما نگرانی سے وہ تنگ آیا تو ان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ اس نے حسین علی کو راجپوتانہ میں شورش دفع کرنے بھیجا اور ایک خفیہ خط جودھپور کے والی اجیت سنگھ کو لکھا کہ کسی نہ کسی طرح حسین علی کو ختم کر دیا جائے تو تم انعام کے حقدار ہوگے۔ یہ خط اجیت سنگھ نے حسین علی کے حوالے کر دیا ادھر حسین علی کامیاب اور فرخ سیر شرمسار ہوا۔ دوسری کوشش یہ کی کہ نظام الملک کو دکن سے بلایا کہ اس کی جگہ حسین علی کو دکن کا صوبیدار بنا دیا اور ساتھ ہی نائب صوبیدار داؤد خاں کو کہلوا دیا کہ وہ حسین علی کو چارج نہ دے چنانچہ داؤد خاں اس کشمکش میں مارا گیا۔ اس عرصہ میں سید عبداللہ کو بھی زیر کرنے کی کوشش کی گئی لیکن ناکام رہا۔

1719ء میں حسین علی فرخ سیر کو سزا دینے کیلئے 11 ہزاری (11000) مرہٹہ فوج لیکر دہلی پہنچا اور اسے گرفتار کرکے قتل کر دیا گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کو مراعات : اس کے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈاکٹر ہملٹن نے شاہی گھرانے کا علاج معالجہ کیا اور عوض میں انگریزوں کو محصولات معاف کر دیئے گئے۔

رفیع الدرجات (1719ء)

سید بھائیوں کو تاریخ میں بادشاہ گر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان بھائیوں نے فرخ سیر کے بعد 28 فروری 1719ء کو رفیع الشان کے بیٹے رفیع الدرجات کو تخت پر بٹھا دیا اور اقتدار پر خود قابض ہوگئے۔ رفیع الدرجات کی عمر بیس برس تھی اور وہ ترپولی کے قلعہ میں چھ سال سے قید تھا اور تپ دق کا مریض بن چکا تھا۔ اس کو بادشاہت دیکر اصل مقصد عوامی بے چینی کو ختم کرنا تھا۔ ذرا فرص ملی تو سید بھائیوں نے اس کے علاج کیلئے حکیموں کی خدمات حاصل کیں لیکن اس کی حالت سنبھل نہ سکی۔ آخر اس نے سید بھائیوں سے کہا کہ میرے بڑے بھائی رفیع الدولہ کو قید سے نکالکر بادشاہ بنا کر اپنا کام چلا لو چنانچہ اس کی رائے پر عمل کیا گیا اور وہ 7 جون 1719ء کو وفات پا گیا۔

رفیع الدولہ (1719ء)

رفیع الدولہ کو قید خانہ سے نکال کر 4 جون 1719ء کو شاہجہان ثانی کے لقب سے بادشاہ بنایا گیا۔ اس کی تخت نشینی کے تین روز بعد رفیع الدرجات اگلے جہان کو سدھار گیا۔ بائیس سالہ رفیع الدولہ اگرچہ بادشاہ تھا اس کے نام کے سکے ڈھلوائے گئے اور خطبہ بھی اسی کے نام کا پڑھا جانے لگا لیکن اختیارات کا یہ حال تھا کہ سید بھائیوں کی اجازت کے بغیر سیر و شکار کیلئے بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اسے کسی کے ساتھ تنہائی میں کھل کر گفتگو کرنے کی بھی اجازت نہ تھی کیونکہ ایک نگران ہر وقت اس پر مسلط رہتا بہرحال رفیع الدولہ کی نام نہاد بادشاہت میں سید بھائیوں کے وارے نیارے تھے۔

اکبر آباد کی بغاوت : اس کے عہد کا اہم واقعہ اکبر آباد کی بغاوت ہے جس کا اس کے اعصاب پر برا اثر پڑا۔ اورنگ زیب کے بیٹے محمد اکبر (جو بغاوت کی وجہ سے ایران کی طرف بھاگ گیا تھا) کے تین بچے تھے۔ ایک لڑکا نیکو سیر تھا اور دو بیٹیاں تھیں۔ یہ تینوں بچے قلعہ آگرہ میں قید تھے۔ بہادر شاہ نے کرم کیا اور قید سے دونوں لڑکیوں کو نکال کر ان سے اپنے بیٹوں رفیع الشان اور جہاں شاہ کی شادیاں کر دیں۔ لیکن نیکو سیر کو قید میں رہنے دیا جس کی عمر اب چالیس سال ہو چکی تھی۔ ایک برہمن حکیم علاج کی غرض سے قلعہ میں اس کے پاس آنے جانے لگا تو اس نے نیکو سیر کا شجرہ معلوم کرکے اس کو تخت دلوانے کی ٹھانی۔ اس کی خبر سید بھائیوں کو ملی تو انہوں نے سمندر خاں نئے قلعہ دار کو قلعہ کا چارج لینے کیلئے بھیجا۔ اب ہندو حکیم اور اس کے معاونین نے خطرہ محسوس کرکے سمندر خاں کے آنے سے پہلے ہی کسی طرح نیکو سیر کو قید سے نکال کر اس کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا اور وہاں کے قلعدار غیرت خاں کو بھاگ دیا اور قلعہ پر

قبضہ کرکے بیٹھ گئے۔ مترسین نامی ہندو حکیم خود ہی نیکو سیر کا وکیل سلطنت بن بیٹھا اور اس کے نام کا سکہ بھی جاری کر دیا۔ سید بھائیوں نے حیدر قلی خاں کی قیادت میں فوج بھیجی جس نے آگرہ قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ طویل محاصرہ کی وجہ سے خوراک ختم ہوگئی اور اس کے ساتھی جرنیل دل چھوڑ گئے اور 1719ء میں ہی سید بھائیوں نے دوبارہ قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ ہندو حکیم نے خودکشی کر لی۔ نیکو سیر کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس قلعہ میں زر و جواہرات کا شاہی خزانہ تھا۔ جس پر سید حسین علی نے قبضہ کر لیا اور سید عبداللہ کو محروم رکھا چنانچہ ان میں بگاڑ پیدا ہوگیا۔ رفیع الدولہ نے 17 ستمبر 1719ء کو وفات پائی۔

روشن اختر محمد شاہ رنگیلا

(1719ء تا 1747ء)

محمد شاہ : سید بھائیوں نے مرزا روشن اختر کو جو بہادر شاہ کا پوتا تھا' محمد شاہ کا خطاب دے کر دہلی کا بادشاہ بنایا اور نظام الملک کو مالوہ کا حاکم بنا کر دہلی سے رخصت کر دیا جب ہر طرف سے سید بھائیوں کو اطمینان ہوگیا تو نظام الملک کے درپے ہوئے۔ سید دلاور علی اور عالم خاں دو امیروں کو فوج دے کر نظام الملک سے لڑنے کے لئے روانہ کیا مگر نظام الملک نے ان دونوں کو شکست دے کر دکن پر قبضہ کر لیا۔ دوسری لڑائی میں سید حسین اور عبداللہ دونوں مارے گئے۔ بادشاہ نے آزادی تو حاصل کر لی مگر عیش و عشرت میں ایسا پھنسا کہ سلطنت کے تمام کاروبار سے بے خبر ہوگیا۔ دکن سے نظام الملک کو بلا کو آصف جاہ کا خطاب دیا اور وزیر بنایا مگر آصف جاہ نے دیکھا کہ یہاں رہنا بادشاہ کی بے اعتدالی کے سبب مفید نہ ہوگا اس لئے واپس دکن چلا گیا جہاں ملک کی بدنظمی سے فائدہ اٹھا کر مرہٹے پھر مضبوط ہو رہے تھے اور ساہوجی کے وزیر بالاجی پیشوا کی ہوشیاری سے بڑی قوت پیدا کرکے چھاپے مارنے لگے تھے۔ نظام الملک کے دکن پہنچتے ہی بالاجی نے صلح کر لی اور اپنا رخ گجرات اور مالوہ کی طرف کر دیا اور لوٹ گھسوٹ کر ان ملکوں کو تباہ کر دیا اور آخر ان پر قبضہ کر لیا۔

نادر شاہ کا حملہ : ایران کا بادشاہ اس وقت نادر قلی درانی تھا' چند امیر اس سے باغی ہو کر پنجاب میں آگئے' نادر نے لکھا کہ ان کو اپنے ملک سے نکال دو یا گرفتار کر لو محمد شاہ نے اس کی کچھ پرواہ نہ کی تو 1738ء/1151ھ میں نادر شاہ نے مغلیہ سلطنت سے کابل اور پھر سندھ کو لے لیا اور پنجاب کو فتح کرکے دہلی کی طرف بڑھا۔ محمد شاہ بھی لڑنے کیلئے آمادہ ہوا لیکن آصف جاہ نظام الملک کی کوشش سے دو کروڑ روپیہ پر صلح ہوگئی مگر باہمی حسد کے مارے اودھ کے صوبہ دار برہان الملک سعادت خان کی ترغیب سے نادر شاہ دہلی آپہنچا اور بعض سپاہیوں کی بے اعتدالی سے شہر میں غدر مچ گیا۔ سات روز تک دہلی میں قتل عام ہوا اور لوٹ مچی رہی آخر نادر شاہ 15

کروڑ نقد، کوہ نور ہیرا اور شاہجہاں کے وقت کا بنا ہوا تخت طاؤس لے کر ایران واپس چلا گیا۔ چند سال کے بعد نادر شاہ کا انتقال ہوگیا اور کابل کی حکومت اس کے سپہ سالار احمد شاہ ابدالی کے ہاتھ آئی جس نے پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح ہندوستان میں مغلیہ سلطنت، سلطنت کے ان حصوں میں بے دخل ہوگئی جہاں سے اس کی فوج کیلئے کار آمد سپاہی ہاتھ آتے تھے۔

سید بھائیوں سے نجات : جہان شاہ (ولد بہادر شاہ) کے بیٹے نجستہ اختر کے ہاں شہزادہ روشن اختر بروز جمعہ 15 اگست 1702ء کو غزنی میں پیدا ہوا۔ اور 1720ء میں وہ اپنی والدہ نواب قدسیہ بانو کے ساتھ فتح پور سیکری میں مقید تھا اور سید بھائیوں نے اسے قید خانہ سے نکال کر 25 ستمبر 1719ء (16 ذیقعدہ 1131 ھ) کو تخت پر بٹھا دیا جس نے ابو الفتح ناصر الدین محمد شاہ کا لقب اختیار کیا۔ بعد ازاں اس کی والدہ بھی باہر آگئی جو بڑی دور اندیش خاتون تھی چنانچہ اس نے سید برادران کا اعتماد حاصل کر کے حکومت میں عمل دخل پیدا کر لیا اور محمد شاہ کی بھی سرپرستی کرنے لگی۔

لیکن سید برادران نے مادر ملکہ اور محمد شاہ کو فتح پور میں رکھا ہوا تھا جن کی خدمت پر مامور سارا عملہ ضلع مظفر نگر کے گاؤں "بارہہ" سے لاکر بھرتی کیا گیا تھا کیونکہ سید برادران کا وہ آبائی وطن تھا۔ محمد شاہ نے خود کو قیدی بادشاہ تصور کیا تو اس کی والدہ نے اعتماد الدولہ محمد امین خاں کی وساطت سے نظام الملک آصف جاہ کو دکن سے بلا کر مغل بادشاہ کی مدد کا منصوبہ بنایا چنانچہ وہ اپنی فوج لیکر برہان پور آپہنچا جس کے مقابلہ کیلئے سید بھائیوں نے بھی فوج بھیج رکھی تھی۔ اس جگہ معرکہ میں سید بھائیوں کو شکست ہوگئی اور نظام الملک دہلی کی طرف بڑھنے لگا۔

ادھر سید عبداللہ تو دہلی میں انتظامات کیلئے رک گیا اور حسین علی محمد شاہ کو ساتھ لے کر مقابلہ کیلئے نکلا۔ 10 اکتوبر 1720ء کو فتح پور سے 35 میل دور تورہ کے مقام پر میر حیدر قلی کاشغری نے حسین علی کی خدمت میں نظام الملک کی شکایت کے بہانے رسائی حاصل کر کے اچانک حسین علی کو قتل کر دیا۔ اس پر لشکر میں پھوٹ پڑ گئی اور دو دھڑے بن کر آپس میں لڑنے لگے۔ ایک گروہ محمد شاہ کا حامی تھا اور دوسرا سادات بارہہ کا طرف دار تھا۔ اس جنگ میں محمد شاہ کو کامیابی ملی اور آگرہ میں فوج نے سادات اور ان کے حامیوں کے گھر لوٹ لئے۔

ابراہیم کی تخت نشینی : حسین علی کے قتل کی خبر سید عبداللہ کو پہنچی تو اس نے دہلی میں فوج تیار کی اور اسی اثنا میں محمد شاہ کو معزول کر کے رفیع الشان کے بیٹے محمد ابراہیم کو ابوالفتح ظہیر الدین محمد ابراہیم کے لقب سے 15 اکتوبر 1720ء کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد سید عبداللہ کی فوج مقابلہ کیلئے نکلی کیونکہ محمد شاہ کی فوج محمد امین خاں کی سرکردگی میں دہلی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دونوں فوجیں شاہ پور اور حسن پورہ کے نواح میں ٹکرا گئیں۔ دو دن مقابلہ جاری رہا آخر شکست دے کر سید عبداللہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ جس نے قید خانے میں خودکشی کر لی اور اس طرح سید برادران کے اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔

سید برادران اور عبدالصمد خاں کے درمیان مخاصمت : عبدالصمد خاں پنجاب میں حکمران تھا۔ اس نے فرخ سیر کے عہد میں بندہ بیراگی اور اس کے ساتھی سکھوں کو تہس نہس کرنے میں بڑا کام کیا جس سے اس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ سید برادران اس کی کامیابیوں سے چڑتے تھے اور ان کی کوشش تھی کہ اسے چین نہ لینے دیا جائے چنانچہ محمد شاہ کے عہد میں بھی ان کی ریشہ دوانیاں جاری رہیں۔

حسین خاں قصوری کو بغاوت پر اکسانا : کہتے ہیں کہ سید برادران نے قصور کے قلعہ دار حسین خاں کو عبدالصمد کے خلاف بغاوت پر اکسایا اور حسین خاں نے محصولات کی ادائیگی سے انکار کر دیا نیز اس نے عبدالصمد کے اہلکاروں کو اپنے علاقہ میں سرکاری کام کی بجا آوری سے منع کرنا شروع کر دیا حتیٰ کہ قطب الدین کو قتل کر دیا جو عبدالصمد کی خاں کی فوج میں بڑا افسر تھا اور مالیہ وغیرہ وصول کرکے لاہور آرہا تھا۔ حسین خاں کے آدمیوں نے قطب الدین اور اس کے ساتھیوں کو قتل کرکے سرکاری خزانہ وغیرہ بھی چھین لیا۔ عبدالصمد خاں نے باز پرس کی تو معقول جواب نہ پاکر وہ حسین خاں کی سرکوبی کیلئے ایک ہزار کا لشکر لیکر قصور کی طرف چلا۔ چونیاں کے قریب حسین خاں اور عبدالصمد خاں کی فوجوں میں گھمسان کا رن پڑا اور حسین خاں کا پلڑا بھاری نظر آنے لگا۔ عبدالصمد کا صرف آغر خاں نامی سالار اپنے ساٹھ ساتھیوں سمیت میدان میں ڈٹ گیا جبکہ باقی لشکر بھاگنے لگا۔ آغر خاں کے ساتھیوں نے بیک وقت قصوری لشکر پر تیروں کی بارش کر دی اتنے میں لاہوری فوج کے ایک جرنیل بہادر خاں نے اپنا ہاتھی حسین خاں کی طرف بڑھایا اور حسین خاں کا لشکر آغا خاں اور بہادر خاں کے حملہ کی زد میں آگیا چنانچہ حسین خاں بھاگ نکلا اور اس کی فوج بھی فرار ہوگئی لیکن تھوڑی دیر بعد اپنی فوج کو مجتمع کرکے حسین خاں پھر حملہ آور ہوگیا۔ اس کا مرشد فقیر بیگ بھی اس جنگ میں اس کے ہمراہ تھا لیکن لاہوری فوج کی گولہ باری کے سامنے یہ فوج ٹھہر نہ سکی۔ حسین خاں کے فیل بان کو تیر لگا تو ہاتھی بے قابو ہو کر بھاگ نکلا اور اس پر بیٹھے ہوئے حسین خاں اور اس کا مرشد ہودے میں زوردار دھماکہ ہونے سے ہلاک ہوگئے اور اس کی فوج بھی شکست کھا گئی۔ محمد شاہ کو دہلی میں حسین خان کی موت اور شکست کی خبر ملی تو اس نے عبدالصمد کو ترقی دیکر پانچ سو سوار اسے اور دیئے جن کی تنخواہ سرکاری خزانہ سے ادا کرنے کا حکم دیا گیا۔ سید برادران کو اپنی اس سازش میں ناکامی پر دل ہی دل میں بہت افسوس ہوا لیکن ظاہر داری کی خاطر عبدالصمد خاں کو سیف الدولہ کا خطاب کیا گیا۔

کشمیر میں فسادات : پنجاب میں امن قائم ہوا ہی تھا کہ کشمیر میں ہندو مسلم فسادات شروع ہوگئے۔ جہاں امیر احمد خاں گورنر تھا۔ عبدالنبی خاں ایک مسلمان رہنما کی سرکردگی میں کشمیری مسلمانوں نے گورنر سے ملاقات کی اور امن کی یقین دہانی پر واپس آگئے۔ اسی اثنا میں ہندو سیٹھ مجلس رائے اپنے گھر کے باغ میں ہندوؤں کی خاطر تواضع کرنے میں مصروف تھا کہ

عبدالنبی کا دس ہزار مسلمانوں کے ساتھ ادھر سے گزر ہوا جس نے ہندوؤں کی جمعیت کے بارے میں پوچھ گچھ کی لیکن کوئی معقول جواب نہ ملا تو مسلمانوں نے ہندوؤں پر حملہ کے بہت سوں کو قتل کر دیا۔ مجلس رائے بھاگ کر گورنر میر احمد خاں کے گھر پناہ گزین ہوا۔ عبدالنبی اور اس کے ساتھیوں نے ہندوؤں پر حملہ کر دیا حتیٰ کہ میر احمد خاں کے محل کا بھی محاصرہ کر لیا اور مجلس رائے کو باہر نکالنے کا مطالبہ کیا لیکن انکار پر مسلمانوں نے سرکاری فوجیوں کو بھی قتل کر دیا جو میر ملا احمد خاں کے بھتیجے نائب کوتوال کی کمان میں تھے۔ نیز اس کا بھتیجا بھی مارا گیا۔ پھر لوگوں نے محل پر قبضہ کر لیا اور گورنر کو ذلیل کر کے نکال دیا نیز محل میں پناہ لینے والے ہندوؤں کو بھی سزا دی۔

اب عام مسلمانوں نے عبدالنبی خاں جس کا نام محبوب خاں تھا کو کشمیر کا گورنر مقرر کر دیا۔ جس نے اسلامی حکومت قائم کر کے پانچ ماہ تک کشمیر میں قرآن و سنت کا دستور العمل اپنایا اور مسجد میں بیٹھ کر سرکاری معاملات نمٹاتا تھا۔ اور دین پر عملدرآمد کی وجہ سے لوگ اسے دین دار خاں کے لقب سے یاد کرنے لگے۔ پھر دہلی سے مومن خاں کو کشمیر کا گورنر بنا کر بھیجا گیا جس کے سامنے عبدالنبی خاں اور اس کے ساتھی برضا و رغبت بہر استقبال حاضر ہوئے اور اپنی کارکردگی کے جوازات پیش کئے لیکن مومن خاں نے عبدالنبی اس کے دو بیٹوں اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا۔

قصور اور کشمیر کے واقعات کے بعد پنجاب میں اکیس برس تک امن و امان قائم رہا۔ گورنر پنجاب عبدالصمد خاں کی وفات 1737ء میں ہوئی اور اس کے بیٹے زکریا خاں کو اس کی جگہ گورنر لاہور بنایا گیا نیز اسے ملتان کی گورنری بھی سونپ دی گئی۔ عبدالصمد خاں نے سکھوں کی سرکوبی بھی کی تھی اور امن و امان کا مسئلہ پیدا نہ ہونے دیا تھا۔ اس کے عہد میں دہلی کے تاج کی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ ادھر نادر خاں کو بعض لوگوں نے ہندوستان کی دولت لوٹنے کیلئے اکسایا چنانچہ نادر شاہ درانی نے حملہ کر کے دہلی کی سلطنت کا بھرم خاک میں ملا کر رکھ دیا۔

نادر شاہ کا حملہ 1739ء : اٹھارہویں صدی عیسوی میں افغانستان کے قبائل میں ایرانی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کی تڑپ پیدا ہو چکی تھی۔ 1708ء میں ایک افغان سردار میر ولیس نے قندھار پر قبضہ کر کے اپنے غلزئی قبیلے کی خودمختار حکومت قائم کر لی۔ ایرانیوں نے قندھار کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے چنانچہ افغانیوں نے ہرات اور خراسان پر بھی قبضہ کر لیا اور میر ولیس کے بیٹے محمود نے 1722ء میں ایران کے پایہ تخت اصفہان پر قبضہ کر لیا اور اگلے چھ سال تک ایران پر غلزئی قبیلے کے چرواہے حکومت کرتے رہے۔

نادر قلی نامی ایک قزاقانہ زندگی بسر کرنے والا شخص اپنے لٹیرے ساتھیوں سمیت شہزادہ طہماسپ بن حسین صفوی کا مددگار بن گیا اور چند سال کی کوشش سے ہرات اور اصفہان وغیرہ علاقے واپس لے لئے اور ایرانی حکومت کو بحال کر دیا۔ چنانچہ ایرانی سرداروں اور فوجی حکام نے ایک جلسہ عام میں 1736ء میں نادر قلی کو اپنا بادشاہ بنا لیا اور نادر شاہ نے فوج جمع کر کے قندھار

پر حملہ کر دیا۔ آخر قندھار فتح ہوگیا۔ اور غلزئی قبیلہ کے لوگ مغل علاقوں میں آکر پناہ گزین ہوگئے۔

نادر شاہ کو قندھار کے محاصرے کے دوران ہندوستان میں قائم مغلیہ سلطنت کی کھوکھلی بنیادوں کے بارے میں پتہ چلتا رہتا تھا چنانچہ غلزیوں کی نقل مکانی کے بعد نادر شاہ نے محمد شاہ کو لکھا کہ غلزیوں وغیرہ کو واپس کیا جائے لیکن محمد شاہ رنگینیوں میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے جواب تک نہ دیا چنانچہ نادر شاہ نے فوج کشی کرکے مغل علاقے میں واقع غزنی اور کابل پر قبضہ کر لیا۔

ستمبر 1738ء میں نادر شاہ نے پنجاب پر حملہ کیا جہاں لاہور میں زکریا خاں گورنر تھا۔ اسے مرکزی حکومت سے کمک کی امید نہ تھی لہٰذا اس نے بیس لاکھ روپے دیکر نادر شاہ سے صلح کر لی جس نے اسے اس کے عہدے پر بحال کر دیا۔ اس طرح لاہور کے لوگ قتل و غارت گری سے بچ گئے۔ نیز زکریا خاں نے بہت سے ہاتھی اور پانچ ہزار گھوڑ سوار فوجی بھی نادر شاہ کے ہمرکاب کرنا منظور کر لیا۔ چنانچہ زکریا خاں کے بھائی حیات اللہ خاں کی کمان میں یہ فوج نادر شاہ کی ملازمت میں چلی گئی۔ اس اثنا میں نادر شاہ نے فخر الدولہ امین الدین خاں کو کشمیر کا گورنر مقرر کیا نیز لاہور کی ٹکسال میں اپنے نام کا سونے کا سکہ جاری کرنے کا بھی حکم دیا۔

نادر شاہ 14 فروری 1739ء کو کرنال کے قریب خیمہ زن ہوا جہاں محمد شاہ رنگیلا دو لاکھ فوج کے ساتھ موجود تھا۔ جس کے ساتھ صمصام الدین' برہان الملک سعادت خاں' نظام الملک آصف خاں اور قمرالدین جیسے نامور سردار بھی تھے۔ تاہم اس وقت مغل فوج غیر تربیت یافتہ اور غیر منظم تھی۔ مغل امرا بھی ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے درپے رہنے والے اور مفاد پرست تھے۔ میدان کارزار میں نادر خاں نے تین دن میں دشمن کے تیس ہزار سپاہی' ایک سو نامی گرامی امراء اور فوجی جرنیل جبکہ دس کے قریب شہزادے قتل کئے۔ برہان الملک سعادت خاں اور راجہ جھجرل گرفتار ہوئے۔ نادر شاہ نے برہان الملک کی عزت کی جس نے نادر شاہ کو دو کروڑ روپے جنگی تاوان کے عوض واپسی پر آمادہ کر لیا جبکہ بادشاہ نے تاوان کی بات چیت کیلئے اپنی طرف سے آصف خاں کو بھیجا۔ اس کامیاب سودے بازی کے بدلے برہان الملک سعادت خاں وزارت عظمٰی کی امید لگائے بیٹھا تھا لیکن محمد شاہ نے وزیراعظم آصف خاں کو بنا دیا۔ چنانچہ برہان الملک آتش انتقام سے جل اٹھا اس نے نادر شاہ کو بہکا کر تاوان کی رقم بڑھانے ورنہ دہلی پر حملہ کی ترغیب دی۔ نادر شاہ نے محمد شاہ سے ملاقات کرنے کا کہا اور ملاقات کے وقت آصف خاں اور محمد شاہ کو گرفتار کر لیا اور برہان الملک سعادت خاں کے کہنے سے دو کروڑ کی بجائے تیس کروڑ روپے تاوان کا مطالبہ کر دیا۔ حتیٰ کہ 20 مارچ کو وہ ان کو لیکر دہلی پہنچ گیا اور تیس مارچ کو عید کے موقع پر غلط افواہ کی بنا پر نادر شاہ کے کچھ فوجیوں کو مقامی لوگوں نے قتل کر دیا۔ اب نادر شاہ نے دہلی میں قتل عام کا حکم دے دیا۔ آخر نظام الملک گلے میں دستار ڈالے نادر شاہ سے قتل عام بند

کرنے کی اپیل کرنے حاضر ہوا جو اس نے منظور کر لی۔ اس موقع پر آٹھ نو سو ایرانی جبکہ ڈیڑھ لاکھ مقامی لوگ قتل ہوئے۔ چنانچہ نادر شاہ 15 کروڑ روپے نقد اور زر جواہرات اور تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرا وغیرہ اور بے حساب دولت لے کر کابل کی طرف چلا۔ وہ دو سو لوہاروں' دو سو بڑھیوں' ایک سو سنگتراشوں اور دوسرے پیشہ وروں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ نیز بے حساب سامان جنگ ہاتھی اور گھوڑے اور اونٹ بھی مال غنیمت کے طور پر ساتھ لے گیا اور 20 فروری 1739ء کو کابل پہنچ گیا۔

نادر شاہ کی ہلاکت : اب نادر شاہ جو بنیادی طور پر ایک گڈریا تھا اقتدار کے نشہ میں ظالمانہ روش اختیار کرنے اور لاکھوں بے گناہوں کا قتل عام کرنے کی وجہ سے اپنے آخری ایام میں دماغی توازن کھو بیٹھا۔ اس کی عمر پچاس سال تھی لیکن وہ بہت بوڑھا ہوگیا تھا۔ نادر شاہ کے بھتیجے علی قلی خاں نے سازش کے ذریعے نادر شاہ کو 8 جون 1747ء کی رات کو قتل کروا دیا۔

نادر شاہ کون تھا؟ : نادر شاہ بنیادی طور پر ایک چرواہا اور چرواہے کا بیٹا تھا جس کی اخلاقی اور اسلامی تربیت نہ ہونے کے برابر ہوئی تھی۔ وہ ایک جاہل اور اکھڑ شخص تھا۔ قسمت نے اس کی یاوری کی اور وہ کامیاب ڈاکو بن گیا جس کے ساتھی تین سو کے قریب تھے۔ وہ شاہی فوج کا مددگار بن کر سامنے آیا ازبکوں کے خلاف جنگ میں کامیابی حاصل کی تو خراسان کے حاکم نے اسے اپنی فوج کا سپہ سالار بنا دیا لیکن اس کی مفسدانہ سرگرمیوں نے حاکم خراسان کے اعتماد کو ہلا کر رکھ دیا چنانچہ اسے شہر بدری کی سزا دی گئی اور نادر شاہ نے ایرانی بادشاہ طہماسپ کی مدد میں افغانوں کے خلاف اپنے جوہر دکھائے اور فتح پائی پھر اس نے روسی حملہ آوروں کو بھی بحر کیسپئن کے کنارے شکست دی۔ عربوں کے حملے بھی روک دیئے۔ 1729ء میں بلوچیوں کو "کرمانو سے نکال دیا۔ 1729ء میں ہی تبریز کا علاقہ ترکوں سے چھین لیا اور پھر ابدالیوں سے خراسان کو بھی خالی کروا لیا۔ 1731ء میں ہرات کا محاصرہ دس ماہ کئے رکھا اور فتح پائی۔ اور جب 1732ء میں طہماسپ نے وفات پائی تو اس کی جگہ شاہ عباس سوم' ایران کے تخت پر بیٹھا جس نے 1736ء میں انتقال کیا۔ اس کے بعد ایرانی امراء نے نادر شاہ کو تخت پر بٹھا دیا لیکن اقتدار کے باوجود اس کی ظالمانہ سرشت میں فرق نہ آیا بلکہ وہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے اصول پر عمل پیرا رہا۔ برصغیر میں اس کی کامیابی کے بعد مغل سلطنت کا بھرکس نکل گیا۔

نادر شاہی حملے کے اثرات : مغل امراء آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ نادر شاہ نے جب حملہ کیا تو انہی کی آویزش نے کام دکھایا۔ نادر شاہ صرف دو کروڑ روپے لے کر واپس ہونے کیلئے مان گیا تھا لیکن سعادت خاں (برہان الملک) کی آتش انتقام نے نادر شاہ کو وعدہ خلافی کی ترغیب دی اور اسے 15 کروڑ روپے تاوان کا مطالبہ کرنے کیلئے اکسایا اور کہا کہ دو کروڑ روپے

لینا ہے تو مجھ سے ہی لے جاؤ ورنہ شہنشاہ ہند کے خزانے لوٹنے کیلئے دہلی کا رخ کرو اس کے نتیجے میں نادر شاہ کی حرص و آز کی رگ پھڑ اٹھی اور مغل سلطنت کا کچومر نکل کے رہ گیا۔ چنانچہ حملہ کے بعد:

1۔ مغلیہ سلطنت کا خزانہ خالی ہوگیا۔
2۔ مغل فوج منتشر ہوگئی۔
3۔ خراج اور محصولات کی آمدن بند ہوگئی کیونکہ سب تعلقہ دار خودمختار ہو گئے تھے۔
4۔ مغلیہ دربار ایرانی' تورانی اور مقامی امرا کا اکھاڑہ بن گیا۔
5۔ بنگال بہار اور اڑیسہ عملاً مرکز سے کٹ گئے۔
6۔ روہیل کھنڈ میں روہیلے خودمختار ہوگئے۔
7۔ گجرات اور مالوہ پر مرہٹوں کا قبضہ ہوگیا۔
8۔ اکبر آباد اور دہلی کے درمیانی علاقے پر جاٹوں نے اپنی حکومت قائم کر لی۔
9۔ دکن پہلے ہی نظام الملک آصف خاں کے زیر اقتدار خودمختاری حاصل کر چکا تھا۔
10۔ پنجاب ایرانیوں اور افغانیوں کے قبضہ میں چلا گیا۔
11۔ محمد شاہ رنگیلا صرف محل سرا کا شہنشاہ رہ گیا۔
12۔ اب مغل حکومت کا بھرم صرف نظام الملک آصف جاہ کے تدبر اور دانشمندی کے بل پر قائم تھا۔
13۔ جب وہ بادشاہ محمد شاہ کی کرتوتوں اور مقامی امراء کی ریشہ دوانیوں سے دل برداشت ہو کر دکن چلا گیا تو مغل سلطنت بھی عملی طور پر ختم ہو کر رہ گئی۔
14۔ پنجاب پہلے ہی سکھوں کے ستم کا نشانہ بنا ہوا تھا مغل حکومت سے اس کا تعلق ختم ہوتے ہی افغانوں نے بھی پنجاب کو لوٹنا شروع کر دیا۔ سکھ پہلے بھیس بدل کر امرتسر آتے تھے اب وہ کھلم کھلا آنے جانے لگے انہوں نے راوی کے کنارے ڈالو وال کا قلعہ تعمیر کرکے لوٹ مار شروع کر دی۔ جب پنجاب کا گورنر زکریا خاں فوت ہوا تو سکھوں نے اپنی سرگرمیاں مزید تیز کر دیں اور زکریا خاں کا بڑا بیٹا یحیٰی خاں لاہور کا حاکم بنا۔ یہ دہلی میں وزیراعظم میر قمرالدین خاں کا بھانجا تھا۔ یحیٰی خاں کے دور میں لکھپت رائے لاہور کا دیوان تھا جبکہ اس کا بھائی جسپت رائے ایمن آباد کا قلعہ دار اور فوجدار تھا۔ جسے سکھوں نے حملہ کرکے قتل کر دیا۔ جب یحیٰی خاں نے سکھوں پر فوج کشی کی تو وہ جموں کی طرف فرار ہوگئے۔ آخر ان کا تعاقب کرکے ایک ہزار سکھوں کو گرفتار کر لیا گیا اور لاہور لاکر دہلی دروازے کے باہر انہیں تہ تیغ کیا گیا اور جس گڑھے میں ان کو دفنایا گیا اسے سکھوں نے اپنے اقتدار کے دنوں میں "شہید گنج" کا نام دیکر مقدس مقام قرار دے لیا۔

شاہنواز خاں حاکم ملتان کا لاہور پر حملہ : نواب زکریا خاں کا چھوٹا لڑکا شاہ نواز خاں ملتان کا حاکم تھا جس نے لاہور کی باگ ڈور اپنے بھائی یحییٰ خاں سے چھیننے کی کوشش کی اور لاہور پر حملہ کر دیا اور فتح پائی اور اس طرح لاہور کی گورنری بھی شاہ نواز کو حاصل ہو گئی۔

شہ نواز خاں نے آدینہ بیگ کو جالندھر کا حاکم مقرر کیا۔ شاہ نواز نے یحییٰ خاں کو گرفتار کر لیا تھا لیکن وہ کسی طرح فرار ہو کر محمد شاہ رنگیلا کے پاس پہنچ گیا جس کی مدد کیلئے میر قمرالدین وزیراعظم کا مستعد ہونا ممکن تھا۔ چنانچہ دہلی کے اس متوقع حملہ کے پیش نظر شاہ نواز خاں نے احمد شاہ ابدالی کو خط لکھ کر اپنی مدد کیلئے بلا لیا جو نادر شاہ کی جگہ لے چکا تھا کیونکہ نادر شاہ کے قتل کے بعد 1748ء میں وہ برسراقتدار آگیا تھا۔

احمد شاہ ابدالی کا حملہ : احمد شاہ ابدالی ازیں پیشتر 1738ء میں نادر شاہ کی رکاب میں برصغیر آچکا تھا نیز وہ پنجاب کو ایرانیوں کی سلطنت کا حصہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ شاہ نواز کا پیغام ملتے ہی اس کے ایلچی کی خوب پذیرائی کی اور پھر چند ہفتوں کے بعد پنجاب پر حملہ کر دیا۔

ادھر شاہ نواز خاں کے ماموں میر قمرالدین نے اسے سلطنت دہلی کی طرف سے ایک شاہی فرمان کے ذریعے لاہور، ملتان، کشمیر، کابل اور سندھ کی صوبیداری عطا کر دی چنانچہ اب شاہنواز خاں خودبخود احمد شاہ کے مقابل آگیا۔ احمد شاہ نے اس وعدہ خلافی کا سخت نوٹس لیا اور لاہور پر قبضہ کر لیا اور اسے لاہور قلعہ اور مغل پورہ کے شاہانہ رہائشی علاقہ سے بے حساب دولت ہاتھ لگی۔ شاہ نواز دہلی کی طرف فرار ہوگیا۔ اب احمد شاہ نے دہلی پر چڑھائی کا قصد کیا جبکہ لاہور میں زکریا خاں کے بیٹے یحییٰ خاں دیوان لکھپت رائے کو قید سے رہا کرکے اسے پنجاب کا گورنر بنا دیا نیز اس نے شاہی فرمان جاری کرنے کی غرض سے شاہی مہر تیار کروائی نیز اپنے نام کا سکہ بھی جاری کرنے کا حکم دیا۔ بعد ازاں احمد شاہ نے 13 مارچ 1748ء کو سرہند پر قبضہ کر لیا۔

منارہ کی جنگ : سرہند سے تقریباً نو میل کے فاصلے پر احمد شاہ ابدالی اور محمد شاہ رنگیلے کی فوجوں میں جنگ ہوئی جس کی قیادت رنگیلے کا بیٹا احمد شاہ کر رہا تھا اور لشکر کے ساتھ محمد شاہ رنگیلا بھی ہمرکاب تھا۔ نیز جے پور کا راجہ بھی 12 ہزار راجپوتوں کے ساتھ شاہی فوجوں کا مددگار تھا۔ یہ جنگ ایک ماہ تک جاری رہی ایک دن مغل وزیراعظم پر نماز کے دوران گولہ گرا اور وہ جاں بحق ہوگیا۔ پھر راجہ جے پور دل چھوڑ گیا اور اس کے ساتھی راجپوت سپاہی بھی بھاگ نکلے۔ تاہم قمرالدین کے بیٹے میر معین الدین عرف میر منو اور صفدر جنگ نے ڈٹ کر مقابلہ جاری رکھا اور احمد شاہ ابدالی کی فوج بھاگ نکلی۔ مغل فوج نے دس میل تک اس کی فوج کا تعاقب کیا۔ تاہم احمد شاہ ابدالی مسلسل سفر کرتا ہوا 1748ء کے وسط میں کابل جا پہنچا۔ اس جنگ سے مغلوں کی ساکھ بحال ہوگئی اور 16 اپریل 1748ء کو محمد شاہ نے اس وقت وفات پائی جب شاہی لشکر

منارہ کی جنگ میں فتح کے شادیانے بجاتا ہوا دہلی کی طرف جا رہا تھا۔

محمد شاہ کا کردار : محمد شاہ رنگیلا ضرور تھا لیکن وہ بزدل نہیں تھا۔ اس نے سید برادران کو حکمت عملی سے شکست دی اور 1722ء تک ان سے گلو خلاصی کرانے میں کامیاب ہوگیا لیکن وہ اپنے حقیقی فرائض فراموش کرکے عیش و نشاط میں مگن رہا۔ حتیٰ کہ جب نادر شاہ دہلی کے قریب پہنچا تو محمد شاہ نے کوئی پرواہ نہ کی اور عیش و عشرت میں محو رہا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ نظام الملک جیسے وفادار اور عقلمند امیر نے اس کی بادشاہی کو سہارا دیئے رکھا۔ وہ خوبصورت اور نہایت حسین و جمیل تھا۔ دلیر، عقلمند اور شکار کا دلدادہ اور پولو کا شوقین بھی تھا لیکن یہ سب صفات نفرت انگیز برائیاں بن گئیں جب وہ ان صفات سے منہ پھیر کر محض عیش و عشرت اور لہو و لعب کا پجاری بن کے رہ گیا۔

کیا فائدہ کہ عیش میں گم اس طرح سے ہوں
یعنی کہ گردوپیش کو یکسر بھلا ہی دیں
مانا کہ ناگزیر ہے ہر گھر میں آگ بھی
لیکن یہ کیا مذاق کہ گھر کو جلا ہی دیں

(قدر آفاقی)

احمد شاہ بن محمد شاہ

(1748ء تا 1754ء)

اپنے باپ محمد شاہ کی وفات کے بعد 18 اپریل 1748ء کو احمد شاہ 21 سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ قمر الدین کے بیٹے میر معین عرف میر منو کو پنجاب کا گورنر بنایا گیا جبکہ دربار میں جاوید خاں کا طوطی بولتا تھا۔

احمد شاہ بھی رنگیلے باپ کا رنگیلا جانشین ثابت ہوا اور اس کا بھی زیادہ وقت حرم سرا میں گزرتا جس کا رقبہ چار مربع میل تھا۔ وہ کئی کئی ماہ زنان خانہ میں گزار دیتا تھا حتیٰ کہ مردانہ کھیلوں کا شوق بھی وہ زنان خانے کے میدانوں میں پورا کر لیتا اور اس کا ساتھ وہ حسین و جمیل عورتیں دیتیں جو حرم میں موجود ہوتیں۔ چنانچہ احمد شاہ کی سلطنت دہلی اور اس کے قرب و جوار تک محدود تھی اور معاملہ یہاں تک پہنچا کہ :

1۔ گجرات اور مالوہ میں مرہٹوں کا زور تھا وہ خود سر ہونے لگے۔
2۔ بنگال بہار اور اوڑیسہ میں نواب علی وردی خاں اپنی آزادی کے گیت گانے لگا۔
3۔ اودھ میں نواب صفدر جنگ اپنی خودمختاری کے مزے لوٹ رہا تھا۔
4۔ روہیلے مکمل علیحدگی کیلئے شورشیں کر رہے تھے۔
5۔ دکن میں آصف خاں خودمختاری کے جلو میں بڑے آرام سے تھا۔
6۔ پنجاب میں سکھوں کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔

میر منو حاکم پنجاب : میر منو کے عہد میں پنجاب میں کافی حد تک امن تھا لیکن سکھوں کی شورشیں تباہی کا نظارا پیش کرتی تھیں۔ امرتسر ان کا مذہبی مرکز تھا جہاں وہ مذہبی اجتماع کے بہانے اکٹھے ہوتے اور واپسی پر جن راہوں سے گزرتے وہاں لوٹ مار اور تباہی مچاتے چلے جاتے انہوں نے جگہ جگہ قلعے بھی تعمیر کر لئے۔ امرتسر کا قلعہ "دگلی رام رتنی" بھی ان میں سے ایک تھا۔ میر منو نے سب سے پہلے اسی قلعہ کو مسمار کیا اور ہزاروں سکھوں کو قتل کیا پھر اس نے سکھوں کے مروجہ لباس پر بھی پابندی لگا دی اور خلاف ورزی پر قتل کی سزا دی جاتی۔

کوڑا مل کا منصوبہ اور سکھ : ملتان کے ہندو نژاد گورنر کوڑا مل نے سکھوں کو بچانے کیلئے دو آبہ بست جالندھر کے حاکم آدینہ بیگ سے مل کر یہ ضمانت دی کہ اگر سکھ حضرات لوٹ مار چھوڑ کر وفادار شہری بن کر رہیں تو ان کو معاف کیا جا سکتا ہے لیکن سکھوں نے اسے اپنی بہادری خیال کیا اور اپنی سرگرمیاں مزید تیز کر دیں۔ امرتسر میں سکھوں کے تہوار کے موقع پر آدینہ بیگ نے سکھوں کو گرفتار کر لیا اور انہیں ہر طرح کے تحفظ کا یقین دلایا بشرطیکہ وہ امن پسند شہری بن جائیں لیکن وہ نہ مانے اور گورنر پنجاب کو "جلاد" قرار دے ڈالا حتیٰ کہ وہ گورو کے

نام پر حکومت کے خواب دیکھنے لگے چنانچہ سکھوں نے پنجاب سے مسلمانوں کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا اور افراتفری اور قتل و غارت گری کی انتہا کر دی۔

احمد شاہ ابدالی کا دوسرا حملہ : احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے پیش نظر میر منو کے صوبائی گورنر اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ لاہور پہنچ گئے لیکن ابدالی کی فوج بہت زیادہ تھی لہٰذا احمد شاہ ابدالی کا مقابلہ میر منو کیلئے ناممکن تھا آخری صلح کی کوشش کے نتیجہ میں یہ امور طے پائے :

1۔ پنجاب کی حکومت پچاس لاکھ روپے تاوان جنگ ادا کرے نیز پسرور' گجرانوالہ' سیالکوٹ اور گجرات کا لگان اور آبیانہ ہر سال بطور خراج ادا کیا کرے۔

2۔ احمد شاہ ابدالی کی کچھ فوج لاہور میں متعین کرنا منظور ہوئی کیونکہ دہلی کے تخت کی منظوری کے بغیر یہ معاہدہ کیا گیا تھا جبکہ میر منو کے مخالفین اس کی آڑ میں بادشاہ کے کان بھر سکتے تھے۔

اس طرح احمد شاہ ابدالی لاہور سے ہی واپس ہو کر قندھار جا پہنچا۔

میر منو اور دہلی کا دربار : میر منو کے مخالف وزیر صفدر جنگ نے لاہور میں اس کے احمد شاہ ابدالی کے ساتھ معاہدہ کے خلاف بادشاہ کے کان بھرے۔ چنانچہ احمد شاہ نے میر منو کے مقرر کردہ ناظم کوڑا مل کی جگہ لاہور کے سابق گورنر شاہ نواز خاں کو مقرر کرکے چارج لینے کیلئے بھیج دیا۔ شاہ نواز فوج لیکر آگے بڑھا لیکن کوڑا مل سے شکست کھا گیا۔ میر منو نے کوڑا مل کو راجہ کا خطاب دیا اور اسے ملتان کا گورنر مقرر کر دیا۔ اب میر منو طاقتور حاکم تھا جس نے دہلی کی فوجوں کو شکست دے دی تھی اسی زعم میں اس نے احمد شاہ ابدالی کو بھی سالانہ خراج کی ادائیگی بند کر دی اور کہلوا بھیجا کہ فصل برباد ہوگئی ہے اس لئے روپے کا انتظام ناممکن ہے۔ اس پر احمد شاہ ابدالی نے پنجاب پر حملہ کا فیصلہ کیا۔

احمد شاہ ابدالی کا تیسرا حملہ : 1751ء میں احمد شاہ ابدالی پنجاب پر حملہ کیلئے چلا اور سوہدرہ تک آ پہنچا پہلے اس نے اپنے وزیر سکھ جیون مل کے ذریعہ میر منو سے بات چیت کی جس نے بتایا کہ فصلیں تباہ ہوگئیں تھیں نیز کسانوں نے بغاوت کر دی لہٰذا روپیہ وصول نہ ہوسکا۔ اب بھی درانی فوجوں کی موجودگی میں کسان مالیہ وغیرہ دینے سے انکاری ہیں اور بہت سے نقل مکانی کرکے جا چکے ہیں۔ جب ابدالی فوج واپس جائے گی تو ہم کچھ کر سکیں گے۔ سکھ جیون مل نے یہ صورتحال احمد شاہ سے عرض کی لیکن وہ کالا شاہ کاکو تک آ پہنچا تاکہ پنجابیوں سے جنگ کر سکے پس چار ماہ تک لاہور کے نواح میں دونوں فوجوں میں یہ جنگ جاری رہی لیکن کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ آخر 12 اپریل 1752ء کو دونوں فوجوں میں بھرپور جنگ ہوئی جس میں ملتان کا گورنر کوڑا مل ہاتھی سے گر کر ایک افغان سپاہی کے ہاتھوں مارا گیا اور بالآخر پنجابیوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ قلعہ لاہور میں محصور ہو کر دو ماہ تک لڑتے رہے۔ اب میر منو نے صلح کا پیغام بھیجا اور دونوں کے درمیان ملاقات ہوئی جس میں میر منو نے دلیرانہ جوابات دیئے اور احمد شاہ نے خوش ہو کر

اسے "فرزند خاں بہادر رستم ہند" کا خطاب دیا اور میر منو نے پچاس لاکھ روپے بطور تاوان جنگ ادا کئے۔ احمد شاہ نے سرہند کا صوبہ بھی افغانستان میں شامل کر کے ملتان سمیت ان سب علاقوں پر میر منو کو حاکم اعلیٰ مقرر کیا اور خود کشمیر کی جانب چلا گیا۔

نتائج : اس جنگ کے دوران سکھوں کو لاہور سے باہر کے علاقوں میں اودھم مچانے اور لوٹ مار کا خوب موقع ملا۔ صلح کے بعد آدینہ بیگ خاں حاکم جالندھر کو سکھوں کے خلاف کارروائی کا حکم ملا۔ چنانچہ اس نے سکھوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی اور اپنے ایک سکھ جرنیل سردار جسا سنگھ کے ذریعے سکھوں کو پرامن زندگی اپنانے کی راہ دکھائی۔

مغل بادشاہ احمد شاہ کا انجام : دہلی دربار میں جاوید خاں وزیراعظم تھا اور سپہ سالار کا عہدہ غازی الدین کے پاس تھا۔ بادشاہ احمد شاہ عورتوں میں مدہوش رہتا تھا۔ ان دونوں امراء میں ٹھن گئی۔ اب احمد شاہ بھی امراء کی چپقلش سے تنگ آگیا تھا جب اس نے امراء کے خلاف کارروائی کی تو خانہ جنگی چھڑ گئی۔ غازی الدین نے مرہٹوں سے سازباز کر کے ان کی مدد سے شاہی فوجوں کو سکندر آباد کے مقام پر شکست دی اور بادشاہ سلامت اپنی بے شمار بیگمات کا لشکر میدان جنگ میں لاوارث چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ مرہٹوں نے ان بیگمات کی بے حرمتی کی اور زیورات سمیت سب سامان لوٹ لیا۔ غازی الدین خاں تعاقب میں دہلی پہنچا اور بادشاہ کو گرفتار کر لیا۔ ساتھ اس کی والدہ بھی قیدی بنا لی گئی۔ 5 جون 1754ء کو غازی الدین نے احمد شاہ (بادشاہ) کی آنکھیں نکلوا دیں اور بعد میں سلیم گڑھ کے قلعہ میں اسے قید کر دیا جہاں اس کی وفات 1775ء میں ہوئی۔ ادھر میر منو بھی احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد جلد ہی پولو کھیلتا ہوا گر کر وفات پا گیا اس کے بعد اس کے تین سالہ بیٹے امین الدین خاں کی والدہ (میر منو کی بیوہ) نے اس کی سرپرست بن کر پنجاب کی باگ ڈور سنبھالی۔ جس کے منظوری احمد شاہ ابدالی سے حاصل کی گئی۔

مغلانی بیگم : احمد شاہ ابدالی نے میر منو کی وفات پر کہا "ایران' توران اور ہندوستان کا بہترین جرنیل چل بسا۔" اس کے ساتھ ساتھ دربار لاہور میں مغلانی بیگم کی گورنری کے زمانہ میں دربار دہلی کے حامی بھی موجود تھے جبکہ احمد شاہ ابدالی کے حامی بھی تھے اس لئے لاہور کا دربار امرا کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ جب حالات مغلانی بیگم کے قابو سے باہر ہونے لگے تو اس نے احمد شاہ ابدالی سے مداخلت کی درخواست کی جس نے جہاں خاں درانی کو لاہور روانہ کر دیا تاکہ وہ دہلی دربار کے حامیوں کا قلع قمع کرے۔ ادھر عالمگیر ثانی کے خود سر وزیر اعتماد الملک غازی الدین نے اپنے سپہ سالار غازی الدین حیدر کو دہلی دربار کے مفادات کے تحفظ کیلئے لاہور بھیجا۔ اس چپقلش کی وجہ سے سکھوں کو کھل کھیلنے کا موقع ملنے لگا۔ مغلانی بیگم ہر ایک کو شک کی نظر سے دیکھنے لگی حتیٰ کہ اس نے میر بخاری کو زنان خانے میں داخل ہونے پر نوکرانیوں سے پٹوا پٹوا کر مروا دیا چنانچہ اس کے بعد مغلانی بیگم زوال کا شکار ہوگئی۔

عز الدین (ابو العدل) عالمگیر ثانی اور بعد کے مختصر حالات

(1754ء تا 1759ء سے لیکر 1857ء تک)

1748ء/1161ھ میں محمد شاہ کا انتقال ہوگیا تو اس کا لڑکا احمد شاہ چند سال کیلئے بادشاہ بنا رہا۔ غازی الدین خاں وزیر نے اس کی آنکھیں نکلوا دیں اور جہاندار شاہ کے لڑکے کو عالمگیر ثانی کا خطاب دے کر تخت پر بٹھایا۔ وزیر نے پنجاب پر پھر قبضہ کر لینا چاہا لیکن احمد شاہ ابدالی فوراً پنجاب آگیا اور وہاں سے دہلی آپہنچا اور ایک روہیلہ سردار نجیب الدولہ خاں کو اپنا قائم مقام بنا کر واپس ہوا۔ غازی الدین نے مرہٹوں کو ترغیب دے کر دہلی اور پنجاب پر ان کا قبضہ کرا دیا۔ پھر نجیب الدولہ روہیل کھنڈ چلا گیا اور پنجاب کے پٹھان حاکم کابل پہنچے۔ احمد شاہ ابدالی یہ دیکھ کر مرہٹوں کی سرکوبی کیلئے ہندوستان روانہ ہوا۔ غازی الدین کو جب یہ معلوم ہوا تو اس نے عالمگیر ثانی کو قتل کر ڈالا اور خود بھاگ کر سورج مل نامی ایک جاٹ کے پاس چلا گیا۔

مرہٹوں کا نیا دور اور پانی پت کی لڑائی : سیواجی کا پوتا راجہ ساہو جس کو بہادر شاہ نے اس کا وطن واپس کر دیا تھا عیش پسند اور کاہل نکلا اس لئے سلطنت کی اصلی باگ اس کے وزیر بالاجی کے ہاتھ میں آگئی۔ جس کا لقب پیشوا تھا اس نے اندرونی انتظام درست کرکے ان جاگیرداروں کی سرکوبی کی جو شاہی مقامات پر ڈاکہ زنی کرتے تھے۔ امیر الامرا سید حسین علی نے دس لاکھ روپے سالانہ اور ضرورت کے وقت 15 ہزار سپاہی مہیا کرنے کے بدلہ میں دکن کے پرانے رواج کے مطابق سرکاری محاصل کا چوتھ (یعنی کل محاصل کا چوتھا حصہ کمیشن کے طور پر) مرہٹوں کو دینا قبول کیا اور دکن کی حکمرانی حاصل کر لی۔

1719ء/1132ھ میں بالاجی کے بعد اس کا لڑکا باجی راؤ پیشوا ہوا۔ اس نے نظام الملک کے سبب سے، دکن میں فتوحات کا راستہ بند دیکھ کر گجرات، مالوہ، مارْوار اور ناگپور کی طرف پیش قدمی کی اور ہر جگہ کامیاب رہا۔ 1740ء/1153ھ میں اس کے لڑکے بالاجی باجی راؤ نے جب اپنے باپ کے بعد سلطنت کی باگ ڈور سنبھالی تو سلطنت اس قدر مضبوط ہوگئی تھی کہ نظام دکن سے احمد نگر کا ضلع لے لیا اور شمالی ہندوستان میں غازی الدین کی ترغیب سے دہلی اور پنجاب پر قبضہ کر لیا۔

اب پیشوا دہلی کی شہنشاہی کا خواب دیکھنے لگا اس وقت احمد شاہ ابدالی پنجاب پہنچ گیا تھا۔ مرہٹے ہٹ کر جمنا پار آگئے۔ ابدالی بھی یلغار کرتا ہوا سر پر آپہنچا اور اس زور کا حملہ کیا کہ مرہٹوں کے ایک دستہ کے سوا قریب قریب سارے مرہٹے مارے گئے۔ پیشوا کو جب یہ معلوم ہوا تو بہت پیچ و تاب کھایا اور بدلہ لینے کیلئے "سدا شیو بھاؤ" ایک بہادر افسر کی ماتحت میں تین لاکھ فوج جس میں سے ایک لاکھ باقاعدہ تھے روانہ کئے اس فوج کے پاس دو سو توپیں تھیں جو ابراہیم

خاں افسر توپ خانہ کے ماتحت تھیں۔ پانی پت کے میدان میں 1761ء/1174ھ میں ان دونوں کا مقابلہ ہوا۔ ابراہیم خاں جس نے فرانسیسی طرز کی گولہ اندازی میں بڑی مہارت پیدا کی تھی اپنے توپ خانہ سے ایک قیامت برپا کر دی لیکن ابدالی نے اپنے خاص رسالہ سے مرہٹہ لشکر کے پچھلے حصہ پر اس زور کے ساتھ حملہ کیا کہ مرہٹوں کا میدان میں ٹھہرنا دشوار ہوگیا وہ آخر بھاگ نکلے۔ تقریباً دو لاکھ مرہٹے مارے گئے اور کوئی نامی سردار زندہ نہ بچا۔ پیشوا اسی غم میں مرگیا اور اس کا لڑکا مادھو راؤ پیشوا ہوا۔

ابدالی دہلی پہنچا اور شاہ عالم ثانی کو بادشاہ بناکر واپس چلا گیا۔ شاہ عالم ان دنوں بہار پر قبضہ کرنا چاہتا تھا جب اس کو کسی طرف سے کوئی امداد نہ ملی تو الہ آباد میں دس برس انگریزوں کا پنشن خوار بن کر مقیم رہا۔ پھر مرہٹوں کی امداد کے بھروسے دہلی آیا لیکن غلام قادر روہیلہ نے جو دہلی پر قابض ہوگیا تھا شاہ عالم کی آنکھیں نکلوا دیں۔ آخر مرہٹوں نے غلام قادر کے پنجہ سے نجات دلا کر بادشاہ کو اپنے قبضہ میں رکھا۔ اس طرح عرصہ تک شاہ عالم مرہٹوں کا دست نگر رہا۔ 1219ھ / 1804ء میں انگریزوں نے مرہٹوں سے نجات دلا کر پنشن مقرر کر دی اب ہندوستان کی بادشاہی تو انگریزوں کے ہاتھ میں آئی اور شاہ عالم صرف دہلی کا بادشاہ ہو کر رہ گیا۔

احمد شاہ ابدالی کا چوتھا حملہ

1756ء بعہد عالمگیر ثانی

(1754ء تا 1759ء)

مغلانی بیگم نے حالات سے تنگ آکر جہاں خاں درانی کے ذریعے احمد شاہ ابدالی کو مسلح مداخلت کیلئے پیغام دیا۔ ادھر غازی الدین وزیر اعظم ایک بڑی فوج لیکر دہلی سے سرہند آ پہنچا اور یہاں کے گورنر آدینہ بیگ کو ساتھ ملا لیا۔ نیز لاہور کے دہلوی امیر غازی الدین حیدر کو لکھا کہ وہ مغلانی بیگم کو اس کی معزولی کا حکم پہنچا دے اگر وہ حکم نہ مانے تو اسے گرفتار کرکے سرہند بھیج دے۔

مرنے سے پہلے میر منو نے اپنی بیٹی کی سگائی غازی الدین سے کر دی تھی لیکن موت نے اس نکاح کی مہلت نہ دی تھی چنانچہ غازی الدین نے یہ پیغام بھی بھیجا کہ اگر اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے کر دو تو تمہیں عہدے پر بحال رکھا جائے گا لیکن مغلانی بیگم اور بیٹی نے صاف انکار کر دیا چنانچہ دونوں کو گرفتار کرکے سرہند لے جایا گیا اور غازی الدین نے مغلانی بیگم کی لڑکی سے زبردستی شادی رچالی اور مغلانی بیگم کو دہلی میں نظربند کر دیا۔

ان حالات میں احمد شاہ ابدالی نے تیزی سے آکر لاہور پر قبضہ کر لیا اور آدینہ بیگ

فرار ہوکر کانگڑہ کے پہاڑوں میں روپوش ہوگیا۔ احمد شاہ ابدالی نے لاہور میں اپنے بیٹے تیمور شاہ کو گورنر بنایا اور خود جاکر سرہند پر قابض ہوگیا۔ اسے لاہور اور سرہند سے اسلحہ اور توپ خانہ کافی ملا چنانچہ وہ زیادہ تیاری کے ساتھ کرنال پہنچ گیا۔

دہلی میں جب عالمگیر ثانی کو احمد شاہ ابدالی کی اطلاع پہنچی تو وہ امراء اور شہزادوں کے ساتھ اس کے استقبال کیلئے روانہ ہوا۔ زیادہ خطرہ غازی الدین کو تھا کیونکہ اس نے مغلانی بیگم سے برا سلوک کیا تھا چنانچہ اس نے معافی مانگ کر مغلانی بیگم سے صلح کر لی۔ ادھر احمد شاہ نے نوے لاکھ روپے تاوان کا مطالبہ کیا لیکن امراء اس پر راضی نہ ہوئے۔

تلاشی اور لوٹ مار : چنانچہ خواجہ سرا "محرم خاں" کے ایما پر امراء کی خانہ تلاشی لی گئی تو بے حساب دولت اور ہیرے جواہرات اور سونا چاندی حاصل ہوا۔ اس کے بعد احمد شاہ نے عام لوٹ مار کا حکم دیا اور لشکریوں نے خوب ہاتھ رنگے۔ احمد شاہ کی فوجیں دہلی میں ایک یا دو ماہ تک رہیں۔ احمد شاہ نے یہاں اپنا نکاح احمد شاہ بن محمد شاہ رنگیلا کی بیٹی سے کیا جبکہ اپنے بیٹے تیمور کی شادی جہاندار شاہ کے بیٹے عالمگیر ثانی کی بیٹی سے کی۔

دوسرے حملے : پھر احمد شاہ نے دہلی کے قریب واقع بالم گڑھ (موجودہ پالم پور) کے قلعہ پر قبضہ کر لیا بعد ازاں متھرا پر قبضہ کیا جہاں کے مندروں سے اسے کروڑوں روپے ہاتھ لگے۔ پھر وہ آگرہ کے قلعہ پر حملہ آور ہوا اور کافی زک اٹھائی تاہم آگرہ پر بھی ابدالی کا قبضہ ہوگیا۔ وہاں سے واپسی پر راہ میں ہزاروں جاٹوں سے پالا پڑا تو انہیں بھی تہس نہس کرکے ان کی طاقت کو ختم کر دیا۔ آخر احمد شاہ ابدالی نے دہلی میں عالمگیر ثانی کو دوبارہ تخت پر بٹھایا اور خود لاہور کی راہ لی اور 1757ء میں قیام لاہور کے بعد قندھار چلا گیا کیونکہ ترکوں کے حملے کا خطرہ تھا۔

تیمور شاہ اور سکھ : احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد سکھوں نے دوآبہ جالندھر میں اودھم مچا دیا چنانچہ ان پر سختی کی گئی اور امن و امان قائم ہوگیا۔ پھر آدینہ بیگ کانگڑہ کے پہاڑوں سے نکل کر دوآبہ بست جالندھر میں مقیم ہوگیا اور سکھوں سے مل کر اور ان کو اپنی فوج میں بھرتی کرکے لاہور کے خلاف لڑنے کی تیاریاں کرنے لگا اور اس نے امرتسر اور جالندھر میں لوٹ مار مچا دی اور پھر گورداسپور اور بٹالہ تک حدود کو پھیلا لیا اور فیصلہ ہوا کہ افغانوں کو بھگا کر آدینہ بیگ کو لاہور کی گورنری ملے گی جبکہ جسا سنگھ کلال کی سرکردگی میں سکھوں کو ہر طرح کی مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔

آدینہ بیگ اور افغانوں میں جنگ : آدینہ بیگ اور سکھوں کی سرگرمیوں کا توڑ کرنے کیلئے تیمور شاہ نے مراد خاں کی سرکردگی میں آدینہ بیگ کے خلاف ایک لشکر بھیجا اور اس کی مدد کیلئے کشمیر سے فوج بھجوائی۔ نیز سرہند کے گورنر عبدالصمد خاں اور جالندھر کے حاکم سرفراز خاں نے بھی ان کی مدد کی۔ چنانچہ چار صوبوں کی فوجیں آدینہ بیگ اور سکھوں سے دریائے بیاس کے کنارے ٹکرائیں لیکن سکھوں کی بہادری رنگ لائی اور آدینہ بیگ کو فتح حاصل ہوئی۔

اس شکست کا بدلہ لینے کیلئے تیمور شاہ کا وزیراعظم جہان خان اپنی فوج لیکر آگے بڑھا چنانچہ آدینہ بیگ پہاڑوں کی طرف فرار ہوگیا۔ اب اس نے سکھوں کے گڑھ امرتسر پر قبضہ کرکے وہاں کے قلعہ "رام راونی" کو مسمار کر دیا۔ اور وہاں پر موجود سکھوں کو قتل کر دیا گیا۔ نیز بٹالہ اور کلانور کے قلعے بھی تباہ و برباد کر دیئے چنانچہ سکھ دو سال تک سر نہ اٹھا سکے تاہم انتقامی جذبہ پروان چڑھتا رہا اور سکھوں نے اس عرصہ میں خصی تیاری کر لی۔

لاہور پر سکھوں کا قبضہ : موقع پاتے ہی سکھوں نے پھر تباہی مچانا شروع کر دی ادھر آدینہ بیگ بھی پہاڑوں سے نکل کر ان سے آملا اور جالندھر کے صوبیدار سرفراز خاں کو شکست دی۔ ادھر سے جہان خاں کی فوجیں چڑھ آئیں اور سکھوں سے مقابلہ ہوگیا اور سکھ کسی نہ کسی طرح فتح یاب ہوگئے۔ شہزادہ تیمور اور جہاں خان فرار ہوگئے چنانچہ اپریل 1758ء میں آدینہ بیگ کی سرکردگی میں سکھوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا لیکن اب سکھوں کے تیور بدلے ہوئے تھے کیونکہ وہ "خالصہ راج" قائم کرنے کیلئے تلے بیٹھے تھے۔ سابقہ معاہدہ کے مطابق آدینہ بیگ نے لاہور میں اپنی گورنری کا حق جتلایا تو جسا سنگھ کلال نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے اسے ذلیل کرکے بھگا دیا اور جسا سنگھ کلال کی قیادت میں سکھوں کی حکومت لاہور میں قائم ہوگئی۔

مرہٹے پنجاب میں : آدینہ بیگ بے عزتی کروا کر مرہٹوں سے جا ملا اور اس نے رگھوناتھ راہو کو ایک لاکھ روپیہ روزانہ دینا کے اور قیام کے دوران پچاس ہزار روپے دینے کے عوض پنجاب کو سکھوں سے خالی کروانے کا معاہدہ کیا چنانچہ پہلے مرہٹوں نے سرہند پر قبضہ کیا اور تباہی مچائی پھر مرہٹہ فوجیں لاہور پہنچیں اور سکھوں کو شکست دیکر لاہور پر قبضہ کر لیا۔ شہزادہ تیمور ابھی سکھوں سے خوف زدہ پھر رہا تھا کہ مرہٹوں کے قبضے نے اسے اور بھی پریشان کر دیا چنانچہ مرہٹے اس کی فوجوں کو اٹک سے آگے پہنچا کر مڑے اور اٹک کے قلعہ پر بھی قابض ہوگئے۔ نیز انہوں نے ملتان اور ڈیرہ جات اور جنوبی علاقہ پر بھی قبضہ کر لیا۔

آدینہ بیگ دوبارہ گورنر پنجاب : مئی 1758ء میں 75 لاکھ سالانہ کے عوض مرہٹوں نے آدینہ بیگ کو گورنر لاہور مقرر کر دیا اور مرہٹہ سردار شمبھو جی راؤ کو ملتان کا گورنر بنایا گیا اور مرہٹے لٹیرے بن کر ہر طرف اودھم مچانے لگے۔ ادھر سکھوں نے بھی سر اٹھایا اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ ادھر مالیر کوٹلہ کے نواب نے آدینہ بیگ کے خلاف جنگ چھیڑ دی جس میں آدینہ بیگ کامیاب رہا اور اس نے لاہور کی بجائے (گورداسپور) کو دارالخلافہ بنا لیا۔ پھر اس نے ملتان کے مرہٹہ حاکم کو بھی بھگا دیا اور سندھ کے مرہٹہ حکمران کو بھی شکست سے دوچار کیا۔ چنانچہ عالمگیر ثانی نے خوش ہو کر آدینہ بیگ کو ملتان اور سندھ کا حاکم بھی بنا دیا۔ نیز اسے جنگ بہادر کا خطاب دیا۔ اس طرح آدینہ بیگ کو سرخروئی حاصل ہوئی۔

سکھوں پر حملے اور آدینہ بیگ کا قتل : اب آدینہ بیگ نے دیکھا کہ سکھوں نے "ماجھا" کے علاقوں میں پھر تباہی مچا دی ہے چنانچہ اس نے بارہ ہزار سکھوں کو قیدی بنایا اور

ہزاروں کو قتل کیا۔ سکھوں کا یہ قتل عام بٹالہ میں ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ اسی رات آدینہ بیگ کو نقاب پوش سکھوں نے اس کی حویلی میں داخل ہو کر قتل کر دیا اور آدینہ بیگ کے دور کا خاتمہ ہو گیا۔

شمہ جی مرہٹہ بطور گورنر پنجاب : اب مرہٹوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ ادھر سکھوں نے بھی لوٹ مار مچا رکھی تھی اور ان لوگوں نے خاص کر مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا وہ جن مسلمانوں کو گرفتار کرتے ان کو امرتسر لے جاتے اور جبر و تشدد کے علاوہ تعمیراتی کاموں میں ان سے بیگار لیتے۔

دہلی دربار ان دنوں نکبت و فلاکت کا مرقع تھا۔ وہاں غازی الدین وزیراعظم تھا۔ جس نے درباری امراء سے پرخاش کی بنا پر مرہٹوں سے سازباز کر رکھی تھی اور وہ احمد شاہ بن محمد شاہ کو مرہٹوں سے شکست دلوا کر اپنی پوزیشن مضبوط کر چکا تھا۔ اور اس کی گرفتاری کے بعد جہاں دار شاہ کے دوسرے بیٹے عز الدین کو عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت پر بٹھا دیا تھا چنانچہ اب بھی اس نے مرہٹوں کو دہلی بلایا تاکہ اپنے حریف نجیب الدولہ کو نیچا دکھا سکے۔ آخر دونوں فوجوں میں ڈیڑھ ماہ تک جنگ رہی اور نجیب الدولہ (میر بخشی) کی فوج شکست کھا گئی اور غازی الدین وزیراعظم کو پرانے عہدے پر بحال کر دیا گیا اور اسی نے عالمگیر ثانی کو کسی طرح موت کی آغوش میں پہنچا دیا یعنی وہ 30 نومبر 1759ء کو خالق حقیقی سے جا ملا۔ بعد ازاں غازی الدین نے کام بخش (ولد اورنگ زیب عالمگیر) کے پوتے محی الملت کو شاہجہان سوم کے لقب سے تخت کی زینت بنا دیا۔ عالمگیر ثانی کا بیٹا شہزادہ علی گوہر اس وقت بہار میں تھا۔ والد کے قتل کی اطلاع پا کر اس نے اسی علاقہ میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور انگریزوں کے زیر سایہ 1760ء تا 1771ء بنگال میں بادشاہی کرتا رہا۔

مغل حکمران اور مغربی اقوام : پانی پت کے میدان میں ایسی بڑی شکست سے مرہٹوں کی مرکزی طاقت ٹوٹ گئی۔ دہلی کی شہنشاہی کا خواب پریشان نظر آیا خود آپس میں بھی نفاق ہو جانے سے چاروں مرہٹہ سردار الگ ہو گئے۔ بھونسلا ناگپور میں، گائیکواڑ گجرات میں، ہلکر اندور میں اور سندھیا گوالیار میں خود مختار ہو کر سلطنت کرنے لگے اس لئے ایک تیسری قوم کو بڑھنے کا موقعہ مل گیا۔

یہ لوگ یورپ کے رہنے والے تھے۔ ایشیا اور یورپ میں تجارتی تعلقات بہت زمانہ سے قائم تھے اور خاکنائے سویز کے راستہ سے آپس میں تجارت کرتے تھے۔ آٹھویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی تک تجارت کا ڈھنگ یہ رہا کہ بحیرہ روم کے کنارے رہنے والی قومیں ملک مصر و شام کی بندرگاہوں میں آکر ہندوستان کی اجناس جو فارس یا بحیرہ قلزم کی راہ سے وہاں جاتی تھیں خرید کر لے جاتی تھیں۔ ان قوموں میں سے وینس اور جینوا والے اس کام میں بڑے ہوشیار تھے۔ ہندوستان سے مصر یا شام کے بندرگاہوں تک مال زیادہ تر عرب تاجر لے جاتے

تھے۔ پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں پرتگیزوں کو (جو پرتگال کے باشندے تھے) تجارت شوق ہوا اور جہازرانی میں خوب مہارت پیدا کی۔ ان کو خیال پیدا ہوا کہ ہم لوگ خود ہندوستان جا کر کیوں نہ مال لائیں اور پورا نفع اٹھائیں چنانچہ 1498ء/904ھ میں "واسکو ڈی گاما" نا جہازراں پہلی دفعہ افریقہ کا چکر لگا کر راس امید پہنچا اور پھر وہاں سے اسد البحر نامی ایک مسلما جہازراں کی رہنمائی سے کالی کٹ آگیا۔

اس راستہ کے معلوم ہو جانے سے ہندوستان کی تجارت آہستہ آہستہ پرتگیزوں کے قبضہ میں آگئی۔ عربوں (موپلہ) کا چونکہ اس سے بڑا نقصان تھا اس سبب سے ان کے ساتھ ان کی اکثر لڑائی رہتی۔ عربوں (مالا باری موپلے) کو شکست ہوئی اور مالابار کے کمزور راجاؤں پر بھی جہازوں کے سبب پرتگیز غالب آگئے۔ انہوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی بستیاں سمندر کے کنارے بسائیں یہ آبادیاں جب بڑھ گئیں تو پرتگال کے بادشاہ نے ان کے انتظام اور حفاظت کیلئے ایک حاکم ہندوستان بھیجا۔

914ھ / 1509ء میں دوسرا نائب "ال بوکرک" نامی بھیجا گیا۔ یہ بڑا ہوشیار اور عقلمند تھا۔ اس نے تجارت کو ترقی دینے میں بڑی کوشش کی۔ اس شخص کے بعد ستر برس کے عرصہ میں پرتگیزوں نے بڑا عروج پایا۔ ہندوستان کے اکثر بندرگاہ اور جزیرے ان کے قبضہ میں آگئے چنانچہ سولہویں صدی عیسوی کے آخر میں جب ان کا زوال ہو رہا تھا تو "گوا" سندیپ ہگلی، چاٹگام، دیو، دمن سب ان کے ہاتھ میں تھے۔

1009 / 1600ء میں ملک ہالینڈ کے ولندیزوں کو جہاز رانی کا خیال آیا اور وہ بھی ہندوستان آکر تجارت کرنے لگے اور آہستہ آہستہ انہوں نے پرتگیزوں کی جگہ خود لے لی۔ پچاس برس کے عرصہ میں ہر جگہ ولندیز ہی ولندیز نظر آنے لگے۔ اور بحری قوت کے سبب سارے بحر ہند پر ان کا قبضہ ہوگیا۔ بنگالہ کا مقام "چنسرا" ان کا صدر مقام تھا۔

ولندیزوں کی کامیاب تجارت نے یورپ کے ہر ملک کو ہندوستان سے تجارت کرنے شوق پیدا کرا دیا چنانچہ ڈنمارک، جرمنی، فرانس اور انگلستان کے لوگ بھی اپنے اپنے جہاز لیکر ہندوستان آئے لیکن آپس کی نا اتفاقی کی وجہ سے ڈنمارک، جرمنی وغیرہ کے لوگ یہاں جم نہ سکے لیکن فرانسیسی اور انگریز برابر ترقی کرتے رہے۔ 1009ھ / 1600ء میں انگلستان کی ملکہ الزبتھ کے زمانہ میں ایک انگریزی کمپنی قائم ہوئی اور اس کی طرف سے تجارتی جہازوں کا ایک بیڑا ہندوستان بھیجا گیا۔ جو 1010ھ / 1601ء میں بڑی کامیابی سے واپس ہوا۔ 1110ھ 1696ء میں ایک اور انگریزی کمپنی قائم ہوئی۔ اسی طرح 1220ھ / 1700ء میں ایک تیسری انگریزی کمپنی کھڑی ہوئی۔

ان مختلف انگریزی کمپنیوں میں آپس میں ناچاقی رہتی تھی اس کے لئے آخر میں مشورہ قرار پایا کہ سب انگریزی کمپنیوں کو ملا کر ایک "ایسٹ انڈیا کمپنی" کر دی جائے چنانچہ اس طرح تمام کمپنی مل کر ایک ہو جانے سے انگریزوں کے آپس کے رشک و حسد کا خاتمہ ہوگیا اور

کمپنی روز بروز ترقی کرنے لگی۔ جہانگیر بادشاہ کے زمانہ میں اس کمپنی کو تجارت کیلئے چار کوٹھیاں بنانے کی اجازت ملی پھر انگریزوں نے محصول معاف کرا کر تجارت کو بڑی ترقی دی۔

1048ھ / 1638ء میں شاہجہان نے باٹن نامی ایک انگریز ڈاکٹر کے علاج سے شہزادی کے صحت پانے کے انعام میں کمپنی کو تجارتی حقوق عطاء کئے۔ صوبہ بنگالہ کے صوبہ دار سے بھی اس نے اسی طرح رعایتیں حاصل کیں۔ 1050ھ / 1640ء میں بیجانگر دکن کے حاکم رام راجا کے بھائی نے انگریزوں کو وہ زمین دی جو آج مدارس کے نام سے مشہور ہے اور انگلستان کے بادشاہ چارلس کے حکم سے وہاں ایک قلعہ بنایا گیا جس کا نام "سینٹ جارج" رکھا گیا۔ بمبئی کا جزیرہ پرتگال کے بادشاہ کی طرف سے انگلستان کے بادشاہ چارلس دوم کی ملکہ کو جہیز کے طور پر ملا اور چارلس نے اس جزیرہ کو کمپنی کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

1098ھ / 1686ء میں عالمگیر نے انگریزوں کی نیت دیکھ کر بمبئی کے سوا تمام ہندوستان سے ان کو نکال دیا۔ 1108ھ / 1696ء میں شہزادہ عظیم الشان نے پھر ان کو اجازت دے دی اور کلکتہ انہوں نے خرید لیا اور وہاں ایک قلعہ "فورٹ ولیم" کے نام سے بنایا۔ اس طرح سے انگریز 1700ء / 1112ھ صدی کے ختم پر مضبوطی سے کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں جم گئے۔

فرانسیسی بھی انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں آئے اور کلکتہ کے پاس چندر نگر اور مدراس کے پاس پانڈی چری میں اپنے صدر مقام بنائے اور انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہر کام میں دخل دیتے رہے۔ ڈوپلے ان کا مشہور فرانسیسی سردار تھا جو انگریزوں کو نکال کر ہندوستان میں فرانسیسی سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا۔ یہ دونوں قومیں دیسی نوابوں اور راجاؤں کی مدد کے بہانہ ایک دوسرے پر غلبہ پانے کی کوشش کرتی رہیں چنانچہ 1164ھ / 1750ء میں فرانسیسی غالب اور انگریز پریشان حال ہوگئے لیکن یہ حالت بہت دنوں تک قائم نہیں رہی۔ 1166ھ / 1752ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک انگریز کلرک کلایو نامی نے قلم چھوڑ کر تلوار سنبھالی اور آہستہ آہستہ فرانسیسی لوگوں کو شکست دے کر انگریزوں کو مضبوط بنایا۔ 1173ھ / 1759ء میں فرانسیسی ہر جگہ پست ہو کر ہمیشہ کیلئے ہندوستان کی سلطنت سے مایوس ہوگئے اور 1183ھ / 1769ء میں فرانسیسیوں کی تمام تجارتی کمپنیاں بھی ٹوٹ گئیں اور انگریز ہندوستان میں پوری قوت کے ساتھ عروج پر آگئے۔

مغل بادشاہوں کے کام : یوں تو کہنے کو تو مغلیہ خاندان نے 962ھ / 1554ء سے 1274ھ / 1857ء تک تین سو برس سے زیادہ حکومت کی لیکن در حقیقت ہمایوں سے لے کر محمد معظم بہادر شاہ تک ایک سو ساٹھ برس حکومت رہی اس کے بعد سے مغلیہ سلطنت کا شہنشاہ برائے نام ہی رہا۔

دنیا میں بہت کم ایسا خاندان گزرا ہے جس کے چھ باپ بیٹے ایک کے بعد دوسرے لائق نکلے ہوں۔ یہ فخر ہندوستان میں صرف مغلیہ خاندان کو حاصل ہے کہ بابر سے لیکر عالمگیر تک

لائق حکمران ہوئے۔ مغلیہ سلطنت کے قائم ہونے سے ہندوستان کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بادشاہ گری کا خاتمہ ہوگیا اور صحیح معنی میں عالمگیر اورنگ زیب ہندوستان کا شہنشاہ تھا۔ مغلیہ سلطنت کی سیاسی پالیسی تقریباً ہر زمانہ میں یکساں رہی' زبردست فوجی طاقت کے سبب سے ہر ناموافق حالت کو موافق بنا لیتے تھے اور بعض دفعہ اپنی عقل سے ایسی چال چلتے کہ دشمن فرمانبرداری کرنے پر مجبور ہو جاتا۔

ان کے زمانہ میں علمی ترقی بے انتہا ہوئی تقریباً کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا کہ جس میں اہل کمال دربار میں حاضر نہ ہوں۔ اس زمانہ میں ملا مبارک' حکیم فتح اللہ شیرازی' ملا محمود جون پوری' محب اللہ بہاری' ملا جیون' عرفی' فیضی' ملا نظام الدین سہالوی' ملا امان اللہ بنارسی' قاضی مبارک' حکیم گیلانی' ملا بحر العلوم اور شاہ ولی اللہ وغیرہ علم و فضل کے روشن ستارے تھے۔ ابوالفضل آصف خاں' علامہ سعد اللہ جیسے وزیر اسی زمانہ میں تھے' خان خاناں' خان زماں' مہابت خاں' اعظم خاں' فیروز جنگ' میر جملہ جیسے بہادر سپہ سالار رہے اور بیربل' ٹوڈرمل' مان سنگھ' جے سنگھ' اجیت سنگھ' جسونت سنگھ جیسے مشیر سلطنت تھے۔

فوج میں ہر مذہب اور ہر نسل کے آدمی داخل ہوتے تھے' ہندوؤں میں زیادہ تر راجپوت تھے اور آخر میں مرہٹے بھی طاقتور ہوگئے تھے۔ فوجی انتظام سب سے الگ الگ ہوتے' توپ خانہ کا افسر میر آتش کہلاتا' تنخواہیں سب کو نقد دی جاتی تھیں۔ زراعت کو اس زمانہ میں ایسی ترقی ہوئی کہ شاید ہندوستان میں اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی ہو۔ مختلف قسم کے پھول اور میوے کے درخت کابل اور ترکستان سے منگوا کر یہاں لگائے گئے۔ مختلف قسم کے شاہی باغوں کو دیکھ کر دوسرے امیر بھی بکثرت باغوں کی طرف متوجہ ہوگئے اور ملک میں عمدہ عمدہ باغ تیار ہوئے۔

گو کہ عمارتوں کا سلسلہ فتح پور میں اکبر کے زمانہ ہی میں شروع ہوگیا تھا لیکن شاہجہاں نے تو کمال تک پہنچا دیا۔ تاج محل جو اس کی پیاری بیگم کا مقبرہ ہے اس خوبصورتی سے تیار ہوا کہ وہ دنیا بھر میں سب سے خوبصورت عمارت سمجھی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ ہر قسم کے شاہی محل' قلعے' خانقاہیں' سرائیں' شفا خانے' پاگل خانے اس کثرت سے اس زمانہ میں تیار ہوئے کہ شمار سے باہر ہے۔ دہلی اور آگرہ کا لال قلعہ' دیوان عام اور دیوان خاص آج بھی دیکھنے کے لائق ہیں۔ مدرسے تو اس وقت میں بہت قائم کئے گئے لیکن دہلی' لکھنؤ' جونپور' آگرہ' لاہور اور احمد آباد کے مدرسے زیادہ مشہور ہیں۔ مسجدوں کی بھی کوئی انتہا نہیں' دہلی اور آگرہ کی جامع مسجد آج بھی بطور یادگار موجود ہے نہ صرف مدرسوں اور مسجدوں کیلئے بلکہ ہندو اور مسلمانوں کے دوسرے رفاہ عام کیلئے بھی بڑی بڑی جائیدادیں وقف کی گئیں۔

تجارت کو تو اس زمانہ میں بھی بہت ترقی ہوئی' سورت کی بندرگاہ خاص طور پر بارونق ہو گئی تھی اور تجارت کے روزبروز ترقی کے سبب دنیا کے ہر ملک کے آدمی وہاں موجود رہتے

تھے۔ صرف ایک تاجر عبدالصمد نامی کے پاس کئی سو تجارتی جہاز موجود تھے۔ کاریگری کے لحاظ سے ہندوستان بہت بلند مرتبہ پر پہنچ گیا تھا۔ ڈھاکہ کا ململ ساری دنیا میں شہرت رکھتا تھا۔ علم موسیقی کے اہل کمال ہمیشہ دربار میں حاضر رہتے' موسیقی کا مشہور استاد میاں تان سین اسی زمانہ میں تھے۔

مغلیہ سلطنت میں عورتوں کو تعلیم دی جاتی تھی' خاص کر شاہی بیگمات ہر علم سے آگاہ ہوتی تھیں' نورجہاں بیگم' عام علم و فن کے ساتھ تیر اندازی سے خوب واقف تھی' بندوق کا نشانہ بھی اس کا بڑا اچھا تھا' نور جہاں کے علاوہ گلبدن بیگم اور زیب النساء کو آج بھی ایک ادیب کی حیثیت سے علمی دنیا جانتی ہے' اس زمانہ کے ترجمے اور تصنیفیں بے شمار ہیں' توزک بابری' طبقات اکبری' تاریخ الفی' آئین اکبری' تزک جہانگیری' فتاوی عالمگیری' مہابھارت کا ترجمہ' وید کا ترجمہ سب اسی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

دہلی اور بنارس میں رصدگاہیں بھی اسی زمانہ میں راجہ جے سنگھ کے اہتمام سے تیار ہوئیں۔ ڈاک کا بھی اچھا انتظام تھا۔ کابل کے تازہ میوے روزانہ اسی ڈاک سے جہانگیر کیلئے آتے تھے۔ عالمگیر کے زمانہ میں گجرات سے دہلی اور دولت آباد کی خبریں آسانی سے معلوم ہوجاتی تھیں چنانچہ عید کے چاند کی خبر گجرات سے دہلی اسی ڈاک کے ذریعہ بھیجی جاتی تھی۔

مغلوں کے عہد کی خاص یادگار بات یہ ہے کہ ہندو مسلمان مل کر ایک ہوگئے۔ ان کی زبان ایک ہوگئی' تہذیب و تمدن قریب قریب ایک ہوگیا' رہنے سہنے' پہننے اوڑھنے کے طریق ایک ہوگئے۔ رسم و رواج یکساں ہوگئے۔

بہار اور بنگال انگریزوں کے ماتحت : انگریزوں نے شروع میں مدراس کے نواب کرناٹک کی مدد کے پردہ میں مدراس کے صوبہ پر قبضہ کیا بنگالہ میں بنگال کے نوابوں کے معاملات میں دخل دے کر وہاں بھی اپنے قدم جمائے۔ یہ دیکھ کر بنگال کے نوجوان نواب سراج الدولہ نے ان کے خلاف چڑھائی کی اور ان کو بے دخل کر دیا لیکن انگریز بھی موقع کے منتظر رہے اور ایک بھاری فوج سراج الدولہ کی سرکوبی کیلئے بھیجی' سراج الدولہ کے سپہ سالار میر جعفر کو انگریزوں نے نوابی کا لالچ دلا کر ملا لیا' سراج الدولہ مارا گیا اور میر جعفر بنگال کا نواب بنا پھر میر جعفر کے داماد میر قاسم کو اپنے خسر سے لڑا کر بنگالہ میں بھی انگریزوں نے مضبوطی سے پاؤں جما دیئے۔

1765ء/1179ھ میں شاہ عالم نے جو الہ آباد میں انگریزوں کا پنشن خوار تھا باضابطہ بنگال' بہار اور اڑیسہ کی دیوانی چند مذہبی شرائط کے ساتھ انگریزوں کے حوالہ کی۔ اس وقت سے انگریز ان ملکوں کے حقیقی مالک بن گئے۔ بنگال' بہار اور اڑیسہ کا نواب ان کے ماتحت پنشن پانے لگا اور اسی وقت سے ہندوستان میں انگریز گورنر جنرل کا عہدہ مستقل طور پر مقرر ہوا۔ 1772ء/ 1186ھ میں سب سے پہلا گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز بنایا گیا یہ بڑا ہوشیار آدمی تھا' اس نے دہلی تک اپنا اثر قائم کیا' 1773ء/ 1187ھ میں گورنر جنرل کے مشورہ کیلئے چار ممبران کی ایک کونسل کلکتہ میں بنائی گئی جس کا مشہور ممبر فلپ فرانس تھا۔ اس نے ہیسٹنگز پر رشوت کا الزام لگایا اور اسی

چند ساہوکار کے ایجنٹ نندکمار نے ثبوت اور گواہی بھی بہم پہنچائی لیکن اس پر ایک شخص کی طرف سے جعل سازی کا مقدمہ کھڑا کر کے اس کو پھانسی دیدی اور خود بھی صفائی کیلئے عدالت میں حاضر نہیں ہوا۔ پھر فلپ فرانسس سے ڈوئل لڑ کر اس کو زخمی کر ڈالا جس کے علاج کیلئے فلپ وطن واپس گیا ادھر کونسل کا ایک ممبر بھی مر گیا اس طرح ہیسٹنگز کیلئے راستہ صاف ہو گیا اور وہ خودمختارانہ حکومت کرنے لگا۔

1785ء/1200ھ میں کارنوالس گورنر جنرل ہوا اس کے زمانہ میں لڑائی کم اور اصلاحی کام زیادہ ہوئے۔ عدالت اور مال گزاری وصول کرنے کے طریقہ میں اصلاحی کی گئی۔ 1793ء/1208ھ میں سرجان شور لندن سے گورنر جنرل مقرر ہو کر آیا۔ اس نے ہندوستان میں رعب و داب بٹھانے کے سوا ملکی انتظامات کیلئے کوئی کام نہیں کیا۔

ریاست میسور کی فتح : ہندوستان کے بالکل دکن میں ایک چھوٹی سی ریاست پر ایک ہندو راجہ حاکم تھا، شروع میں کمزور اور معمولی ریاست تھی۔ راجہ برائے نام حاکم تھا اصلی طاقت اس کے وزیر دلوائی کے ہاتھ میں تھی۔ حیدر علی نامی اس کی فوج میں ایک رسالدار تھا جس نے آہستہ آہستہ طاقت حاصل کر لی۔ وزیر نے ڈر کر اس کانٹے کو نکال دینا چاہا۔ حیدر علی بڑا ہوشیار آدمی تھا۔ معاملہ کی تہ کو سمجھ گیا۔ اب ان دونوں میں ان بن ہو گئی اور نوبت لڑائی کی پہنچی۔ حیدر علی نے لڑائی جیت لی۔ راجہ اور اس کے وزیر دونوں کو نظربند کر کے پنشن مقرر کر دی اور خود سلطنت کا مالک بن کر حکومت کرنے لگا۔ اس نے اپنے کو اس قدر مضبوط بنا لیا کہ ہمسایہ سلطنتیں ڈرنے لگیں۔

1765ء/1179ھ میں انگریزوں نے حیدر آباد کے نظام الملک اور مرہٹوں کے ساتھ مل کر حیدر علی کو تباہ کرنا چاہا لیکن حیدر علی نے خود مدراس پہنچ کر انگریزوں کو صلح پر مجبور کر دیا۔ 1781ء/1196ھ میں انگریزوں نے شرائط صلح کے خلاف ماہی بندر پر قبضہ کر لیا جس کے سبب حیدر علی سے پھر لڑائی شروع ہوئی جس میں حیدر علی کو شکست ہوئی اور وہ میسور واپس چلا آیا۔ اور اسی سال اسی برس (80) کی عمر میں اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ اس کی جگہ اس کا لڑکا فتح علی (جو ٹیپو سلطان کے نام سے مشہور ہے) میسور کا بادشاہ ہوا۔

ٹیپو بڑا بہادر، ہشیار اور سپاہی آدمی تھا۔ اس نے بہت سے مقامات فتح کر لئے اور جب آخر میں بنگلور فتح کر چکا تو انگریزوں سے صلح ہو گئی لیکن 1790ء/1205ھ میں ٹیپو سلطان نے جب ٹراونکور کے راجہ کی نافرمانی کے سبب سے اس کی سرکوبی کرنی چاہی تو انگریز اس کے خیرخواہ بن کر میدان میں آگئے اور نظام الملک کی مدد سے ٹیپو کو گھیر لیا اور پھر آدھی سلطنت لے کر اس سے صلح کی۔

1213ھ / 1798ء میں لارڈ ولزلی گورنر جنرل ہوا۔ اس نے آتے ہی دل میں ٹھان لی کہ ہندوستان کی تمام ریاستوں کا خاتمہ کر دے چنانچہ اس نے سب سے پہلے میسور کے ٹیپو سلطان سے لڑائی چھیڑی۔ نظام الملک کو اپنے ساتھ ملا لیا اور دونوں نے دو طرف سے میسور کے

پایہ تخت سرنگاپٹم کو گھیر لیا۔ سلطان کے معتمد خاص میر صادق علی نامی کی غداری سے انگریز قلعہ میں گھس آئے۔ سلطان شیروں کی طرح لڑ کر شہید ہوا۔ میسور فتح ہوگیا۔ انگریزوں نے سلطان کے لڑکوں کو پنشن دے کر کلکتہ روانہ کر دیا اور راجہ کے لڑکے کرشنا نامی کو راجہ بنا دیا۔

1801ء/1216ھ میں انگریزوں نے کرناٹک کے نواب کو پنشن دے کر کل علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اسی طرح تنجور کی ریاست بھی انگریزوں نے ضبط کر لی اور ان کے وارثوں کو پنشن پر گزارہ کرنا پڑا۔ اودھ کے نواب کو مجبور کیا گیا کہ دوآبہ اور روہیل کھنڈ کے تمام ضلع انگریزوں کو اس فوج کے خرچ کے بدلے دیئے جائیں جو اودھ کے نواب کی حفاظت کیلئے لکھنؤ میں موجود رہتی ہے۔ 1805ء/1220ھ میں لارڈ کارنوالس گورنر ہو کر آیا مگر کلکتہ پہنچتے ہی دو مہینہ میں مرگیا۔ اس کے بعد سرجارج بارلو گورنر جنرل ہوا۔

معین الدین اکبر ثانی 1806ء / 1837ء : 1806ء/1221ھ میں شاہ عالم دوم کا انتقال ہوگیا اور اس کی جگہ معین الدین اکبر دوم برائے نام دہلی کا بادشاہ ہوا جس کو انگریزوں کی طرف سے پنشن ملتی تھی اور صرف قلعہ کے اندر کی حکومت اس کو حاصل تھی۔

1807ء / 1222ھ میں لارڈ منٹو گورنر جنرل کے عہدہ پر آیا جس کے زمانہ میں سکھوں اور سندھ کے امیروں سے صلح نامے ہوئے اور دوستی و اتحاد کو ترقی دیکر اس نے انگریزی سلطنت کو محفوظ اور مضبوط بنایا۔ اس کے بعد مارکوئس آف ہیسٹنگز 1813ء / 1228ھ میں گورنر جنرل ہوا اس نے نیپال کی فوجوں کو "بام ساہ" نیپالی سردار کے ذریعہ (جو انگریزوں سے مل گیا تھا) سخت شکست دے کر ہمالیہ کی ترائی کا کل علاقہ انگریزی سلطنت میں داخل کر لیا۔ پھر 1818ء / 1234ھ میں پونہ کا تمام علاقہ پیشوا سے چھین لیا اور باجی راؤ پیشوا کو آٹھ لاکھ کا وظیفہ دے کر کانپور میں نظر بند کر دیا۔

1823ء / 1239ھ میں لارڈ ایم ہرسٹ جب گورنر جنرل ہو کر آیا تو آسام، اراکان اور ضلع تناسرم (برما) فتح کرکے سلطنت کے رقبہ کو بڑھایا۔ 1828ء / 1244ھ میں ولیم بن ٹنگ گورنر جنرل ہوا۔ اس نے اپنے زمانہ میں سڑکوں کا معقول انتظام کیا، ٹھگوں کی جڑ اکھاڑ دی۔ انہیں کے زمانہ میں ستی کی رسم بند کر دی گئی اور ہندوستان کی سرکاری زبان انگریزی قرار پائی اور اس کی تعلیم کیلئے انگریزی مدرسے قائم کئے گئے۔ 1251ھ /1835ء میں سرچالس منکاف گورنر جنرل ہوا جو پرانے اور بڑے تجربہ کار ملازموں میں سے تھا۔ اس نے تمام اخباروں کو آزادی دے دی اس سے انگریز ناراض ہوگئے۔ اس لئے مجبور ہو کر استعفیٰ دے دیا۔ 1839ء / 1255ھ میں لارڈ آک لینڈ گورنر جنرل ہو کر آیا اور کابل کی لڑائی میں مصروف رہا۔ جس میں انگریزوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔

سراج الدین اور ابو ظفر بہادر شاہ دوم : 1837ء /1253ھ میں دہلی کے وظیفہ خوار بادشاہ اکبر دوم کا انتقال ہوگیا تو اس کا لڑکا سراج الدین بہادر شاہ دوم کے لقب سے تخت پر

بیٹھا۔ اپنے باپ کی طرح اس کو بھی انگریزوں کی طرف سے 12 لاکھ سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ 1857ء / 1272ھ تک دہلی کے لال قلعہ میں رہا۔ 1258ھ / 1842ء میں الن برا یہاں کا سب سے بڑا حاکم ہوا۔ اس نے سکھوں کی روک تھام کیلئے سندھ پر قبضہ کرنا چاہا اس لئے سندھ کے امیروں پر یہ الزام لگایا کہ کابل کی لڑائی میں سندھ کے امیروں نے سامان رسد نہیں دیا۔ انگریزوں نے آخر لڑ کر سارے سندھ پر کسی نہ کسی بہانے قبضہ کر لیا۔

1844ء / 1260ھ میں لارڈ ہارڈنگ اول آیا اس کے زمانہ میں سکھوں کی پہلی لڑائی ہو کر صلح ہوگئی اور اسی وقت سے انگریز سرکاری ملازمتوں میں ان لوگوں کو ترجیح دینے لگے جو انگریزی جانتے تھے۔ نہریں اور ریلیں بنانے کی تجویز بھی اسی زمانے میں ہوئی۔ 1265ھ /1846ء میں لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ہو کر آیا۔ یہ کمسنی کے باوجود بڑا ذہین تھا۔ یہ لارڈ ولزلی کا ہم خیال اور سارے ہندوستان پر قبضہ کرنے پر تل گیا۔

سکھوں کی جنگ اور پنجاب پر قبضہ : ہندوستان میں سوائے پنجاب کے اب ایک بالشت بھر زمین ایسی نہ تھی جو خودمختار ہو اور جس پر انگریز اپنی ماتحتی کا دعویٰ نہ کرتے ہوں۔ پنجاب میں اس وقت سکھ حاکم تھے' عالمگیر کے زمانہ میں سکھوں کے دسویں "گرو" گوبند سنگھ ہوئے تھے جنہوں نے ان کو درویشی سے جنگی قالب میں ڈھال کر ملک میں بڑی بدامنی پھیلائی تھی۔ بہادر شاہ اور فرخ سیر کے زمانہ میں بھی سکھوں نے بغاوت کی جس کو دور کرکے پنجاب میں امن قائم کر دیا گیا۔ نادر شاہ درانی نے ہندوستان واپس جاتے وقت پنجاب کو کابل کے ماتحت کر دیا۔ اس کے بعد مرہٹوں نے جب پنجاب پر قبضہ کیا تو احمد شاہ ابدالی نے پھر ان کے قبضہ سے نکال کر کابل کی سلطنت میں شامل کر لیا اس بار بار کی خانہ جنگی سے سکھوں نے بڑا فائدہ اٹھایا۔ چھوٹے بڑے جتھے بنا کر ملک کو خوب لوٹا ہر جتھے نے بڑی بڑی زمینداری قائم کر لی۔

اب سکھوں کے مختلف گروہ ہوگئے تھے اور چھوٹے بڑے زمینداروں کی حیثیت سے ملک میں پھیل گئے تھے انہیں میں سے رنجیت سنگھ کا باپ تھا۔ رنجیت سنگھ 1194ھ /1780ء میں بمقام گوجرانوالہ پیدا ہوا۔ 18 برس کی عمر تھی کہ اپنے جتھے کا سردار ہوگیا اور دوسروں کی طرح لوٹ مار سے ترقی پانے لگا۔ اس نے سب سے پہلے اپنے ہم قوم جتھوں کو زیر کرکے اپنی زمینداری کو بڑھایا جب سکھوں کی بڑی بڑی طاقتوں کو توڑ کر اپنا مطیع بنا لیا تو چھوٹے چھوٹے مسلمان نوابوں سے علاقے چھین لئے۔ لاہور کو مرکز بنا کر اس نے سکھ سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

کابل میں درانی خاندان کی خانہ جنگی سے رنجیت سنگھ نے فائدہ اٹھا کر تمام پنجاب' کشمیر اور سرحدی علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ وہ سخت گیر مگر ہوشیار حکمران تھا۔ جب تک زندہ رہا انگریزوں سے صلح رکھی۔ جب 1255ھ / 1839ء میں انتقال ہوا تو نابالغ لڑکا وارث ہوا اور چند منہ زور سردار اس کے اتالیق مقرر ہوئے۔ ان لوگوں نے انگریزی علاقہ پر حملہ کرکے مفت کی لڑائی مول لی۔ آخر شکست کھا کر صلح کر لی۔ پھر 1222ھ / 1849ء میں ڈلہوزی نے پنجاب پر قبضہ کرنا ضروری سمجھا اور ایک لڑائی کے بعد رنجیت سنگھ کے لڑکے راجہ دلیپ سنگھ کو پنشن دے کر

پنجاب کو سلطنت انگلشیہ میں داخل کر لیا اس کے بعد برہما کی نوبت آئی۔ چنانچہ ایک بہانہ سے برہما (رنگوان' پیگو' ٹانگو) پر قبضہ کر لیا پھر جب ناگپور کا مرہٹہ راجہ لاولد مر گیا تو اس بہانہ سے اس ریاست کو اپنے قبضہ میں لے آئے۔

صوبہ اودھ پر قبضہ : بارھویں صدی ہجری کے وسط میں دلی کی سلطنت کی طرف سے برہان الملک سعادت خاں اودھ کا صوبہ دار بنایا گیا کچھ دنوں کے بعد یہ خودمختار ہوگیا' برہان الملک کے بعد اس کے لڑکے شجاع الدولہ نے حکومت کی باگ سنبھالی اور شاہ عالم کے ساتھ مل کر بکسر کے مقام پر انگریزوں سے لڑا۔ لڑائی میں شکست کھا کر انگریزوں سے صلح کر لی۔ اس کے مرنے پر اس کا لڑکا آصف الدولہ تخت پر بیٹھا۔ یہ بڑا سخی تھا۔ لکھنؤ میں آصف الدولہ کا امام باڑہ اسی کی بنائی ہوئی قابل دید اور مشہور عمارت ہے۔

اس کی وفات پر اس کا بھائی نواب سعادت علی خاں ان کی جگہ نواب ہوا۔ اس نے روپے سے انگریزوں کی بڑی مدد کی۔ اس کے مرجانے پر غازی الدین حیدر نواب ہوا اور پھر اس کا لڑکا نصیرالدین حیدر اودھ کا نواب ہوا۔ اس نے انگریزوں کے اشارہ سے اپنی بادشاہی کا اعلان کیا اس کے بعد اس کا لڑکا امجد علی شاہ سلطنت کا مالک ہوا چند ہی برس کے بعد اس نے بھی وفات پائی۔ اب اس کے لڑکے محمد علی اور پھر اس کے لڑکے واجد علی شاہ اودھ کے بادشاہ ہوئے۔ لارڈ ڈلہوزی جو اودھ کا ملک لے لینا چاہتا تھا نے واجد علی شاہ پر یہ الزام لگایا کہ ملک میں سخت بد انتظامی پھیلی ہوئی ہے اس لئے 1273ھ /1856ء میں اودھ کے بادشاہ کو ایک لاکھ ماہوار پنشن دیکر کلکتہ کے مٹیا برج میں نظر بند کر دیا اور صوبہ اودھ کو انگریزی سلطنت میں شامل کر لیا۔

جنگ آزادی اور سلطنت مغلیہ کا خاتمہ : 1856ء / 1273ھ میں کیننگ صاحب گورنر جنرل ہو کر آئے۔ لارڈ ڈلہوزی نے بڑی تیزی سے ہندوستانی ریاستوں کا خاتمہ کیا تھا چنانچہ مقامی لوگ انگریزوں سے نفرت کرنے لگے اسی دور میں نیا کارتوس ایجاد ہوا جس کے چلانے سے پہلے دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا جس کے بارے میں مشہور ہوگیا کہ اس کارتوس میں گائے یا خنزیر کی چربی استعمال کی گئی ہے چنانچہ ہندو اور مسلمان فوجیوں میں بغاوت کی لہر دوڑ گئی لیکن سکھوں' ہندو راجوں اور جاگیرداروں کی مدد سے انگریزوں نے جنگ آزادی کے مجاہدین پر قابو پا لیا اور آزادی کے متوالوں اور ان کے رہبروں اور سرداروں سمیت بے شمار لوگ مارے گئے اور قید ہوئے جبکہ سرخیل آزادی بہادر شاہ ظفر کو قید کرکے رنگون میں نظر بند کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے نکل کر انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ کے ہاتھ آگئی اور وہ قیصر ہند بن کر حکومت کرنے لگیں جبکہ گورنر ہند کی جگہ وائسرائے ہند کو بادشاہ کا قائم مقام بنا دیا گیا۔

(مختصر تاریخ ہند از مولانا ابو ظفر ندوی' طبع اول 1936ء علی گڑھ)

بہادر شاہ ظفر

(آخری مغل تاجدار)

ہندوستان کے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کو انتقال کئے ایک سو پینتیس (35) برس ہوگئے ہیں انہوں نے 7 نومبر 1862ء کو رنگون میں قید حیات اور قید فرنگ سے رہائی پائی۔

بہادر شاہ ظفر کا پورا نام ابو المظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی' ظفر تخلص تھا۔ بہادر شاہ' اکبر شاہ ثانی کے فرزند تھے۔ اکبر شاہ ثانی اکبر شاہ ثانی شاہ عالم ثانی بادشاہ دہلی کے تیسرے بیٹے تھے۔ شاہ عالم ثانی نے 1761ء سے 1806ء تک حکومت کی۔ بہادر شاہ کے والد اکبر شاہ ثانی 1806ء سے 1837ء تک سریر رائے سلطنت رہے۔ بہادر شاہ ظفر 1775ء میں پیدا ہوئے اور 1837ء میں تخت پر بیٹھے۔ 1857ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی۔ انگریز فوجیں یلغار کرتی دہلی تک پہنچ آئیں۔ جب دہلی کی مدافعت کی کوئی صورت باقی نہ رہی تو بہادر شاہ لال قلعے سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں پناہ گزین ہوگئے۔ 22 ستمبر 1857ء کو ہڈسن' سید رجب علی' میرزا الٰہی بخش کو لے کر مقبرے میں پہنچا۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد بہادر شاہ نے اپنے لئے اور جواں بخت اور زینت محل کیلئے جاں بخشی کا وعدہ لے کر اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ ہڈسن شاہ کی سواری کو قلعے میں لے گیا۔ بہادر شاہ کے دل میں امید تھی کہ قلعے میں جائے گا تو اس کی سابقہ حیثیت میں کوئی فرق نہ آئے گا لیکن یہ امید موہوم تھی۔ انگریزی افواج کے سپہ سالار جنرل ولسن نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا اور ان سے نہایت برا برتاؤ کیا گیا۔ انہیں قلعہ میں قید کر دیا گیا ادھر انگریز سول اور فوجی افسروں میں یہ بحث چھڑی کہ شاہ کی جاں بخشی کا وعدہ کس بنا پر اور کس نے کیا۔ ہڈسن نے یہ وعدہ جنرل ولسن کے ایما پر کیا تھا۔ سول حکام کا کہنا تھا کہ اس نوع کے وعدے کرنے کا مجاز صرف سانڈرس (کمشنر) تھا۔ خاصے بحث مباحثے کے بعد شاہ پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ ہوا۔ اسی دوران میں شاہ بیمار پڑ گئے۔ بچنے کی امید کم تھی لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس وقت شاہ کی عمر 85 برس تھی۔ 17 جنوری کو دیوان خاص میں جو ایک صدی تک تخت طاؤس کی بہار دیکھ چکا تھا مظلوم بہادر شاہ کا مقدمہ شروع ہوا۔ مقدمہ بیالیس دن جاری رہا۔ اس میں اکیس پیشیاں ہوئیں۔ 9 مارچ 1858ء کو بہادر شاہ کے تحریری بیان کا انگریزی ترجمہ فوجی کمشنر کے سامنے پڑھا گیا اسی روز ایڈووکیٹ جنرل نے مختلف شہادتوں اور وثیقوں کے متعلق طویل تقریر کی۔ بعد ازاں کمیشن نے فیصلہ صادر کر دیا کہ بہادر شاہ پر چار

الزام تھے چاروں ثابت ہوگئے ہیں اور ازروئے قانون وہ سزائے موت کے مستحق ہیں یہ فیصلہ پنجاب کے چیف کمشنر جان لارنس کے سامنے پیش ہوا جس نے ایک مفصل نوٹ لکھا اور جلاوطنی کی سزا تجویز کی اور رپورٹ منظوری کیلئے مرکزی حکومت کے پاس بھیج دی۔ وہاں سے حکم ہوا کہ بادشاہ کو معہ متعلقین کلکتہ روانہ کر دیا جائے۔ 5 نومبر 1858ء کو شاہ دہلی سے روانہ ہوئے۔ غالباً سولہ مرد و زن تھے' چھ سو گورے حفاظت کیلئے ہمراہ تھے۔ سال کے اختتام سے پہلے بہادر شاہ رنگون پہنچ گئے تھے۔ جہاز سے اترتے ہی گورے شاہ کو صدر بازار رنگون کے ایک دو منزلہ بنگلہ میں لے گئے۔ بنگلے کے گرد گوروں کا پہرہ رہتا۔ چھ سو روپے ماہوار خرچ کیلئے مقرر تھے۔ بادشاہ زیادہ وقت تسبیح اور استغفار میں گزارتے۔ 7 نومبر 1862ء کو پیغام اجل آ پہنچا اور ان کو رنگون میں ہی دفنا دیا گیا۔

(بحوالہ روزنامہ امروز لاہور' زیر عنوان "پس منظر" مورخہ 7/11/1973)

باب 5

مغلیہ دور 1707ء تا 1857ء تک کا تفصیلی جائزہ

آخری مغل دور میں حکومتی اداروں کی شکست و ریخت اس کی وجوہات' جانشینی کی جنگوں کے اثرات' منصب داری اور جاگیرداری نظاموں کا بحران۔- سیاسی دھڑے بندیاں' مختلف امرائے سلطنت کا ذکر اور دیگر موضوعات پر سیر حاصل بحث اور تبصرہ جات۔۔۔

مغل امرا کی تنظیم : مغل امراء کی تنظیم ایک ایسے طویل تاریخی ارتقا کا نتیجہ تھا جو اسلام کے زیر سایہ مغربی ایشیا میں سیاسی اور اقتصادی ترقی کی شکل میں رونما ہوا۔ ہندوستان کے مخصوص سماجی اور اقتصادی حالات کیلئے ایک طاقت ور سیاسی حکومت کی ضرورت تھی:

ڈاکٹر ستیش چندر کہتا ہے کہ: سولہویں صدی کے اواخر اور سترہویں صدی کے آغاز میں امراء کی تنظیم نے مغل سلطنت کے قیام' توسیع اور استحکام کیلئے اہم کردار ادا کیا لیکن اس کے ساتھ اس تنظیم کی کامیاب کارکردگی کی راہ میں بہت سی اقتصادی اور انتظامی رکاوٹیں رونما ہوئیں۔ بظاہر ان مسائل کا کوئی حل برآمد نہ ہوسکا اور سترہویں صدی کے آخر تک جاگیروں کے فقدان نے ایک سخت بحران پیدا کر دیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ زرعی اور صنعتی پیداوار کم تھی جو حکمران طبقہ کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی تھی۔ اکبر' جہانگیر اور شاہ جہاں کو خصوصیت کے ساتھ اس صورتحال سے دوچار ہونا پڑا۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے وقت صورتحال کافی بگڑ چکی تھی اور دکن کی لڑائیوں اور جاٹوں' مرہٹوں' راجپوتوں اور سکھوں سے معرکہ آرائیوں نے یہ صورتحال مزید خراب کر دی اگرچہ اورنگ زیب نے سیاسی اور فوجی مسائل کو حل کرنے کیلئے بہت سی تدابیر اختیار کیں لیکن اسے مستقل کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد حکومت کے سامنے جو مسائل تھے ان کو سمجھنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ مختصر طور پر حکمران طبقہ کے کردار' شاہ وقت سے ان کے تعلقات' ملک کے سماجی اور سیاسی افراد کے ساتھ ان کا رویہ خود ان کا سماجی اور مدنی نظریہ اور ان کے اندرونی اختلافات اور مسائل کا تجزیہ کیا جائے۔

قرون وسطیٰ میں ہندوستانی سماج کے دو بااثر طبقات

(الف) زمیندار (ب) جاگیردار

(1) زمیندار : ان کو راجہ' سردار اور موروثی زمیندار جن کو قدیم مورخوں نے رئیس اور ٹھاکر کہا ہے اور بعد کی فارسی تصنیفات میں ان کیلئے زمیندار کا لفظ استعمال کیا ہے۔

(2) جاگیردار : دوسرا وہ طبقہ جس کو مال گزاری کی آمدنی دی گئی ان کو جاگیردار کہا جاتا تھا۔ ان میں قدر مشترک یہ تھی کہ ان کا ذریعہ آمدنی کاشتکار کی پیداوار کی بچت تھی لیکن زمیندار ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ نئے حکمرانوں کی اندرونی اور بیرونی مشکلات یا مقامی اور مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مال گزاری کی ادائیگی بند کر دیں اور دوسروں کی زمینوں پر ناجائز قبضہ کر لیں۔ ان میں سے بیشتر اپنی زمینداری کے کاشتکاروں پر ظلم کرکے زیادہ سے زیادہ لگان وصول کرتے تھے۔ زمینداروں کے علاقہ سے جو سوداگر گزرتے تھے ان کو بھی ٹیکس دینا پڑتا تھا۔

عملی طور پر زمینداروں کی حیثیت موروثی تھی اور ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو اپنی زمینداریوں پر ہندوستان میں ترکوں کے آنے سے قبل ہی سے متصرف تھے۔ ترک حکمرانوں نے اپنے اقتدار کے فوری استحکام کیلئے ان میں اکثر کو ان کی زمینداری پر بحال رکھا بشرطیکہ یہ زمیندار ترک حکمرانوں کے سیاسی اقتدار کو تسلیم کر لیں اور اپنی زمینداریوں کا لگان کسی نہ کسی صورت میں ادا کرتے رہیں۔ نیز وہ فوج کیلئے سپاہی وغیرہ مہیا کریں۔ اور مقامی حکام کی ضرورت کے وقت مدد کریں۔

چنانچہ ترک اور مغل حکمرانوں نے اپنے مفاد کے پیش نظر ایسے اقدام کئے کہ ان کی سلطنت میں جان و مال محفوظ رہے۔ رائج الوقت سکہ کی قیمت مقرر کی جائے اور قیمتوں کو نہ بڑھنے دیا جائے نیز ناپ تول کے پیمانے مقرر کئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے فوجی اقدامات کے ذریعہ زمینداروں کی خودسری کی بھی روک تھام کی۔ ان عوامل کا فائدہ کسانوں اور سوداگروں کو پہنچا۔ سیاسی اور انتظامی امور کے استحکام کے سلسلہ میں جو اقدامات کئے گئے اس سے زمینداروں کی قوت اور اختیارات میں بہت کچھ کمی بھی واقع ہوئی اگرچہ بعض صورتوں میں انہیں بلاواسطہ فائدہ بھی پہنچا۔ لیکن بااثر اور طاقتور زمیندار اس پر بھی ناراض رہتے تھے کہ ان کو اس بات کی ممانعت کی جاتی تھی کہ وہ پڑوسیوں کی املاک پر قبضہ کریں۔ زمینداروں اور مرکزی حکومت کی یہ کشمکش' کبھی اعلانیہ ہوتی اور کبھی خفیہ۔ راجپوتانہ اور بندیلکھنڈ کے علاقوں میں قبائلیوں کو کافی اقتدار حاصل تھا۔ اس علاقہ کے زمیندار یا راجہ اپنے قبیلہ کے سردار ہوتے تھے اور ان کے اقتدار اور اختیارات پر ہلکی سی ضرب بھی قبائلیوں کی مخالفت کے لئے کافی ہوتی تھی۔ دوسرے علاقوں میں بھی اکثر زمیندار قبیلہ کا سردار ہوتا تھا اور اس کے روایتی اختیارات پر کسی قسم کا حملہ

پورے قبیلہ پر حملہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس طرح راجپوتوں کے علاوہ جاٹ' گوجر' افغان وغیرہ بھی اپنی قبائلی روایات کو سینہ سے لگائے ہوئے تھے۔

ترک اور مغل حکمرانوں نے زمینداروں کے اختیارات کو مختلف طریقوں سے کم کرنے کی کوشش کی۔ بڑی بڑی زمینداریوں کو جہاں ایک فرقہ کے لوگ آباد اور قابض تھے مختلف فرقوں کے لوگوں میں تقسیم کر دیا گیا اور سرکش زمینداروں سے زمینیں لے کر وفادار زمینداروں کو دی گئیں۔ زمینوں کے انتظام کیلئے ہر صوبہ' سرکار اور پرگنہ میں ایک محکمہ قائم کیا گیا۔ لیکن زمینداروں کا طبقہ انتظامیہ کیلئے درد سر بنا رہا۔ وسطی ہندوستان' راجپوتانہ' پہاڑی علاقہ اور پورے دکنی علاقے میں زمینداروں کو بڑی قوت حاصل تھی اور ان کے بہت سے طاقتور گروہ تھے۔ جب حکومت وسیع ہو کر ان علاقوں پر قابض ہوئی تو ان زمینداروں کے پیدا کردہ مسائل و حل کرنے کی کوشش کی گئی اورنگ زیب کے دور حکومت میں مغلوں کی نہ صرف جاٹوں سکھوں اور پٹھانوں کے ساتھ دشمنی ہوئی بلکہ راجپوتوں اور مراٹھوں کے ساتھ بھی لمبے عرصے تک کشمکش رہی یہ سب مغل شہنشاہیت کیلئے بڑھتے ہوئے خطرات کی نشانیاں ہیں۔

جاٹ اور مغل : اورنگ زیب کا جاٹوں کے ساتھ گہرا ٹکراؤ 1669ء میں متھرا کے پاس کے علاقے میں شروع ہوا۔ بغاوت تیزی سے پھیلی اور اس کی انتہا تک پہنچنے کے وقت 20 ہزار جاٹ باغیوں نے مغل فوج کا سامنا کیا۔ ان کی قیادت تلپٹ کے زمیندار گوکلا جاٹ نے کی۔ چنانچہ جاٹوں نے کئی بار مغل فوج کے دستوں کے خلاف فتح بھی حاصل کی آخر میں ایک بڑی فوج لے کر اونگ زیب نے بذات خود جاٹوں کو شکست دی۔ لیکن تقریباً آٹھ ہزار مغل سپاہی بھی مارے گئے۔ شاہ جہاں کے زمانے میں بھی آگرہ اور متھرا کے آس پاس جاٹوں کا مغلوں کے ساتھ ٹکراؤ ہوا۔ جاٹ ہمیشہ لوٹ مار کر موقعہ کی تلاش میں رہتے تھے کہ مغلوں کے مطابق جاٹوں کا علاقہ زور طلب تھا یعنی وہاں کے لوگ زور زبردستی اور لڑائی بھڑائی کے بغیر آسانی سے مالگزاری نہیں دیتے تھے۔ اس پس منظر میں مقامی حاکموں کو خوفزدہ کرنے کی پالیسی اپنانے کا آسان بہانہ مل گیا تھا جہاں تک فرقہ واریت کا سوال ہے۔ 62-1661ء میں اورنگ زیب کے حکم کے مطابق آگرے میں ایک مندر توڑا گیا لیکن بندیلہ راجہ بیر سنگھ دیو کے ذریعہ بنوایا ہوا متھرا کا مشہور وشنوناتھ کا مندر جاٹوں کی بغاوت سے قبل نہیں منہدم کیا گیا۔ اس لئے جاٹوں کی بغاوت کا سیدھا تعلق اورنگ زیب کی فرقہ ورایت سے نہیں جوڑا جا سکتا۔

جاٹ کشمکش کی قیادت ابتدا سے ہی زمیندار کے ہاتھوں میں رہی۔ 1686ء جمنا کے علاقے کے جاٹوں نے دوبارہ بغاوت کی۔ اس بغاوت کا سردار زمیندار راجہ رام تھا اور اس نے جگہ جگہ خوفناک جنگل میں چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لئے تھے' جن کا محاصرہ کرنا آسان نہیں تھا۔ جاٹوں کی بغاوت کو دبانے کیلئے کچھواہ بشن سنگھ کو متھرا کا فوجدار مقرر کیا گیا اور جاٹوں کے علاقے کی زمینداری اسے دی گئی اس طرح جاٹوں کی کشمکش صرف شہنشاہ کے خلاف نہیں رہی کچھواہ راجے جاٹ علاقے پر اپنا زمیندارانہ قبضہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ جاٹ کسان زمیندار راجپوتوں کو

اپنا آقا ماننے کیلئے تیار نہیں تھے اس لئے اس کشمکش کی شکل بدل گئی۔ اٹھارہویں صدی میں آزاد جاٹ ریاست کے قیام کا یہی پس منظر تھا۔ اب مغلوں اور سکھوں کے بارے میں بھی ستیش چندر کے خیالات ملاحظہ ہوں:

مغل اور سکھ : مغل اور سکھوں کی کشمکش بھی اورنگ زیب سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے دور حکومت میں گروؤں کے ساتھ جھڑپیں ہوتی تھیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سکھوں کی جانب سے مغل بادشاہ پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔ اس کی وجوہات گرو حضرات کو دین و دنیا دونوں کا محافظ سمجھا جانا (گرو کو حقیقی بادشاہ کہا جاتا تھا) گروؤں کی مادہ پرستی کا بڑھنا اور گرو اور ان کے چیلوں کا ہتھیار بند ہونا' بھائی چارے اور اخوت کے جذبے پر زور دینا جن کی وجہ سے سکھ مذہب پنجاب میں نچلے طبقے' جاٹ' کسانوں' کاریگروں وغیرہ میں مقبول ہوتا جارہا تھا۔ اورنگ زیب اور سکھوں کی کشمکش کا یہی سماجی پس منظر تھا تو بھی اس میں شک نہیں کہ 1675ء میں اورنگ زیب کے ذریعہ گرو تیغ بہادر کا قتل صرف نا انصافی ہی نہیں بلکہ اس کی تنگ نظری اور متعصبانہ پالیسی کا نمونہ تھا۔ کچھ ہمعصر مصنفین کا کہنا ہے کہ گرو تیغ بہادر نے ایک افغان حافظ آدم کے ساتھ مل کر پنجاب میں فسادات کئے تھے جن کی وجہ سے اس کا قتل کیا گیا۔ گرو کے خاندان کے کچھ لوگوں کی گرو کے خلاف سازش کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کشمیر کے صوبے دار شیر افگن کی ظالمانہ پالیسی کے خلاف گرو نے آواز بلند کی تھی اس نے کچھ مسلمانوں کو سکھ ہونے کی ترغیب دی لیکن اہم فرقے کے سربراہ کا اس طرح ظالمانہ قتل کرانا نہ تو منصفانہ ہی تھا اور نہ ہی دانشمندانہ۔

(گرو تیغ بہادر کے قتل کے بارے میں الحاق پنجاب کا باب دیکھیں)

1675ء میں گرو تیغ بہادر کا قتل : گرو گوبند سنگھ نے 1699ء میں خالصہ کی بنیاد رکھی اور آنند پور کو سکھوں کا مرکز بنایا تھا۔ 1702ء تک سکھوں اور مغلوں کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں ہوا نہ ہی مغلوں نے سکھوں کی کارروائی میں مداخلت کی اس سے پہلے ہندو پہاڑی راجاؤں کی مغلوں کے خلاف بغاوت میں گرو نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ گرو گوبند سنگھ کی مغلوں کے ساتھ کشمکش سیاسی وجوہات سے ہوئی سکھوں کی بڑھتی ہوئی قوت اور سیاسی خواہش مندی کی وجہ سے بلاس پور کے راجہ اور دوسرے مقامی ہندو راجاؤں کے ساتھ سکھوں کی کشمکش کی ابتدا ہوئی۔ ان راجاؤں کی درخواست پر مقامی مغل حاکم گوبند سنگھ کو کچلنے کیلئے تیار ہوگئے۔ سکھ بڑی بہادری سے لڑے لیکن 1705ء کے آخر تک ان کی بغاوت کچل دی گئی۔ سکھ ریاست کے قیام کیلئے اٹھارہویں صدی سے جدوجہد جاری رہی۔ اس کا قیام حقیقی شکل میں اٹھارہویں صدی کے نصف کے بعد ہوا جب مغل حکومت کافی کمزور ہو چکی تھی۔ حاکمانہ طاقت مسل کے سردار یعنی زمیندار کے ہاتھ میں رہی اس طرح اس جدوجہد کی شکل بدلتی رہی اور اس میں اقتصادی' سماجی' سیاسی اور مذہبی عناصر کی شمولیت رہی۔ گرو کے دو بیٹوں کے قتل کا الزام اورنگ زیب پر نہیں

بلکہ مقامی حاکموں کے سر پر ہے۔ 1705ء میں اورنگ زیب نے گرو کو معاف کر دیا اور اسے اپنے پاس دکن میں بلایا ایسا خیال ہے کہ گرو یہ چاہتا تھا کہ اورنگ زیب اسے آنند پور واپس دلا دے لیکن گرو کے وہاں پہنچنے سے قبل ہی اورنگ زیب کی وفات ہو چکی تھی۔

مغل اور پٹھان : جاٹوں اور سکھوں کی کشمکش کے تقریباً ساتھ ہی ساتھ اورنگ زیب کو پٹھانوں کی آزاد حکومت کے قیام کے جذبے سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کابل اور دریائے سندھ کے درمیانی کوہسانی علاقے میں رہنے والے آزادی پسند بہادروں سے اکبر اور جہانگیر کو بھی لوہا لینا پڑا تھا۔ 1667ء میں یوسف زئی قبیلوں کے سردار بھاگو نے محمد شاہ نامی آدمی کو جو پرانے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا بادشاہ بنایا اور اس کے وزیر کی حیثیت سے اپنے نام کا اعلان کیا۔ رفتہ رفتہ بہت سے قبائلی بھاگو کے پرچم تلے جمع ہو گئے اور انہوں نے ہزارا' پشاور اور اٹک وغیرہ علاقوں پر لوٹ مار شروع کر دی۔ دس ہزار سپاہیوں کے ساتھ محمد امین خان نے راجہ مان سنگھ کے ہمراہ بھاگو پر حملہ کیا کئی جنگوں کے بعد مغل فتح یاب ہوئے لیکن 1672ء میں پٹھانوں کی بغاوت پھر شروع ہو گئی۔ آفریدی سردار اکمل خان نے بادشاہ کی حیثیت سے سکہ و خطبہ اپنے نام سے جاری کیا چنانچہ محمد امین خان کو ان کے خلاف بھیجا گیا لیکن پٹھانوں نے درہ خیبر میں مغل افواج کو گھیر لیا۔ محمد امین خان کسی طرح جان بچا کر پشاور لوٹ گیا لیکن اس کے سارے سپاہی مارے گئے۔ اور تمام سامان لوٹ لیا گیا اسی پسپائی کی وجہ سے تمام قبائلی علاقے میں بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ 1674ء میں ایک دوسرے مغل بادشاہ منصب دار شجاعت خاں کو درہ خیبر میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ پٹھانوں کی قیادت اس وقت خوشحال خان خٹک کے ہاتھوں میں تھی وہ اورنگ زیب کا پرانا دشمن تھا اور کچھ مدت تک قید میں بھی رہ چکا تھا۔

پٹھانوں کو دبانے اور کابل کا راستہ صاف کرنے کیلئے اورنگ زیب کو بذات خود پشاور جانا پڑا۔ پٹھان قبائیلیوں میں پھوٹ ڈال کر مہاراجہ جسونت سنگھ کی قیادت میں راجپوتوں کو خیبر کے علاقے میں تعینات کرکے اور کابل کے صوبے دار امیر خاں کی خوش انتظامی کی وجہ سے 1678ء تک رفتہ رفتہ اورنگ زیب پٹھان بغاوت پر قابو حاصل کر سکا۔

جاٹوں اور سکھوں کی طرح پٹھانوں کی جدوجہد کے پیچھے بھی آزاد ریاست کے قیام کا جذبہ کارفرما تھا۔ پٹھانوں کی جدوجہد سے مغلوں کو ہمیشہ کابل کی حفاظت کا فکر رہنے لگا کیونکہ کابل کو مغلیہ ہندوستان کا بیرونی دروازہ سمجھا جاتا تھا۔ اکبر کے زمانے میں ازبک اور اورنگ زیب کے زمانے میں ایرانی بادشاہ کے ذریعے کابل پر حملہ ہونے کے سلسلے میں مغل کافی پریشان رہے۔ جنگی و اقتصادی دونوں نظریوں سے مغلوں کیلئے پٹھان قبائل کے علاقے میں آمدورفت کا نہ رکنا انتہائی اہم تھا۔ سکھ و جاٹ بغاوت کے علاقے بھی جنگی اور آمدورفت کے نقطہ نظر سے اہم تھے اس لئے ان سب تحریکوں کی جانب اورنگ زیب کا نظریہ سخت ہی نہیں بے رحمانہ بھی تھا۔ یہ تمام تحریکیں تبھی کامیاب ہو سکیں جب مرکز میں کمزوری آ گئی لیکن انہوں نے مراٹھا تحریک کو پنپنے اور مرکزی قوت دینے کے مسائل کو اور زیادہ الجھانے کا کام ضرور کیا۔

مغل، راجپوت اور مراٹھے : راجپوتوں اور مراٹھوں کی جدوجہد کا پس منظر جاٹوں سکھوں اور پٹھانوں کی جدوجہد سے بہت مختلف تھا۔ راجپوتوں کے ساتھ مغلوں کے تعلقات بڑے دیرینہ تھے اور مغل حکومت کی ترقی اور استحکام میں راجپوتوں کا کافی ہاتھ تھا۔ سرہندر ناتھ سرکار کی رائے میں کشمکش کی بنیادی وجہ اورنگ زیب کی یہ پالیسی تھی کہ وہ پرانی ہندو ریاستوں پر اپنا قبضہ جما کر ہندوستان میں ایک ایسی اسلامی ریاست قائم کرنا چاہتا تھا جس کے نتیجے میں ہندوؤں کو تبدیلی مذہب کیلئے مجبور کیا جا سکے لیکن قدیم تحقیق اس رائے کی تائید نہیں کرتی۔ تخت نشینی کے وقت اورنگ زیب کے راجپوت راجاؤں سے تعلقات دوستانہ تھے۔ آمیر کا راجہ مرزا راجہ جے سنگھ اورنگ زیب کا معتمد خاص تھا۔ اس نے ہر معیبت میں اورنگ زیب کا ساتھ دیا تھا اسی وجہ سے مارواڑ کے راجہ مہاراجہ جسونت سنگھ نے کھوا جنگ سے قبل داراشکوہ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اورنگ زیب نے رانا راج سنگھ کو بھی شاہ جہاں کے دور میں ضبط کئے گئے پرگنے واپس دے کر اپنی طرف ملا لیا تھا لیکن رفتہ رفتہ اورنگ زیب کی نظر میں راجپوتوں کی اہمیت کم ہوتی گئی۔ مرزا راجہ جے سنگھ کی 1667ء میں موت کے بعد اس جیسا کوئی لائق اور قابل اعتماد راجپوت راجہ اورنگ زیب کو نہیں ملا۔

1679ء میں مہاراجہ جسونت سنگھ کی جمرود میں وفات ہوگئی۔ آنجہانی راجہ کا کوئی بیٹا زندہ نہیں تھا ایسی حالت میں مارواڑ کی گدی کے دو خاص دعوے دار تھے۔ ایک جسونت سنگھ کے بڑے بھائی امر سنگھ کا پوتا اندر سنگھ جو ناگور کا جاگیردار تھا اور دوسرا امر سنگھ کا نواسہ انوپ سنگھ وراثت کے اس مسئلے کے حل ہونے تک پرانی مغلیہ روایات کے مطابق مارواڑ کو اورنگ زیب نے خالصہ کر لیا جسونت سنگھ کی رانیوں اور خدمت گاروں کے اخراجات کیلئے سوجت اور جے تاران ان کے پرگنے انہیں دیے دیئے گئے۔ جودھ پور پر شاہی تسلط جمانے کے بعد جسونت سنگھ کا سامان ضبط کر لیا گیا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مہاراجہ کے اوپر تقریباً پچاس لاکھ روپے جو انہیں خرچہ کیلئے دیئے گئے تھے بقایا تھے۔ کچھ روز بعد مہاراجہ کی دو رانیوں کے بطن سے دو بیٹے اجیت اور دلتھمبن پیدا ہوئے گدی کا سوال طے کرنے کیلئے ان کو بھی اورنگ زیب کے دربار میں بلایا گیا۔

اٹھارہویں صدی میں مغل دربار میں

سیاسی دھڑے بندیاں

اورنگ زیب کے دور حکومت کے آخر اور اٹھارویں صدی کے آغاز میں مغل دربار میں امراء کی دو جماعتوں نے آئندہ چالیس برس تک مغل دربار میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر ستیش چندر لکھتا ہے:

(1) پہلا گروہ : پہلی جماعت کے رہنما وزیر الممالک اسد خاں اور اس کا بیٹا ذوالفقار خاں تھے۔ ذوالفقار خاں 1702ء میں بخشی الممالک بھی ہوگیا تھا۔ اسد خاں ایران کے ایک مشہور خاندان سے متعلق تھا اور اس کا دادا ذوالفقار خاں' شاہ عباس اول کے عہد میں شراوان کا بیگلر بیگی تھا۔ 1601-1600 میں کسی شبہ کی بنا پر ذوالفقار خاں کو شاہ عباس کے حکم سے مار ڈالا گیا۔ چنانچہ اسد خاں کا باپ خاں لار۔ کو (المخاطب بہ ذوالفقار خاں قرامان لو) جہانگیر کے آخری دور میں ہندوستان آیا پھر شاہ جہاں نے اس کے ساتھ بہت مہر و محبت کا سلوک کیا یامین الدولہ آصف خاں کے برادر نسبتی صادق خاں کی لڑکی سے اس کی شادی کرائی اور تین ہزاری منصب پر فائز کرایا۔ شاہ جہاں کے دور حکومت کے آخر میں فالج کی بنا پر وہ عملی زندگی سے دست کش ہو کر پٹنہ میں جاگزیں ہوگیا۔

محمد ابراہیم المخاطب بہ اسد خاں صادق خان کی بیٹی کے بطن سے ذوالفقار خاں قرامان لوکا سب سے بڑا بیٹا تھا اور جو 1055 ہجری مطابق 26-1625ء میں اسے اسد خاں کے لقب سے سرفراز کیا گیا اور آختہ بیگی گھوڑوں کا سردار اور فوراً بعد بخشی دوم کے عہدے پر مامور کیا گیا۔ وہ اورنگ زیب کا بھی خاص آدمی تھا اور بطور بخشی دوم اس کے تحت کام کرتا رہا۔ 1661ء میں اس کا عہدہ بڑھا کر چار ہزاری دوہزاری منصب پر فائز کیا گیا۔ 1669ء میں جب جعفر خاں وزیر مملکت کا انتقال ہو گیا تو اس کی جگہ پر بھی اسد خاں ہی کو بطور نائب وزیر کے منتخب کیا گیا۔ اگلے برس وہ میر بخشی کے عہدہ پر شکر خاں متوفی کی جگہ پر منتخب ہوا۔ اور 1673ء تک نائب وزیر رہتے ہوئے اس عہدہ پر بھی کام کرتا رہا۔ 1676ء میں اسے ترقی دے کر عہدہ وزارت پر سرفراز کیا گیا۔ اس کے بعد اسے ایک زبردست لشکر کا سپہ سالار بنا کر دکن بھیجا گیا اور راجپوتوں کے فتنہ کو فرو کرنے میں بھی اس نے بڑی مستعدی سے حصہ لیا۔ بیجاپور کے محاصرہ میں اس نے ایک اہم کردار ادا کیا جس کیلئے اسے مسند وزارت سے سرفراز کیا گیا اس طرح 1676ء تک اسد خاں ایک اہم مقام حاصل کر چکا تھا۔ جس پر وہ اورنگ زیب کے دور حکومت کے باقی 31 برسوں میں بھی قائم رہا۔ اس کی وزارت کی مدت دوسرے وزراء

کے مقابلے میں دراز ترین مدت تھی۔ اس کے عہدہ اس کے بلند مقام اس کے اعلیٰ نسب و حسب اور شاہی خاندان سے اس کے تعلق کی بنا پر اسے ہر طرف سے بے انتہا عزت و احترام حاصل تھا۔ اورنگ زیب اس کی قابلیت اور صلاحیت کا بہت قدر دان تھا۔

اورنگ زیب کی حکومت کے آخری دور میں اسد خاں کو کچھ عرصہ کیلئے اسلام پوری میں خیمہ زن لشکر کا افسر اعلیٰ مقرر کیا گیا کیونکہ اب اسے کسی عملی کردار کیلئے ضعیف و نحیف مانا جانے لگا تھا اس کے بعد بھی کوندانہ' راج گڑھ اور دکن کھیڑہ کے محاصرہ میں اورنگ زیب کا ہمرکاب تھا۔

ذوالفقار خاں : ذوالفقار خاں پسر اسد خاں 1649ء میں پیدا ہوا اور 1660ء میں جب وہ گیارہ سال کا تھا اسے پہلا منصب عطا ہوا۔ 1677ء میں اورنگ زیب کے ماموں شائستہ خاں کی بیٹی سے اس کی شادی ہوگئی اور اعتقاد خاں کا خطاب ملا۔ اس نے اعتقاد خاں کی حیثیت سے 1689ء میں راہیڑی راج گڑھ پر قبضہ کرکے پہلا کارنامہ انجام دیا۔ راج گڑھ کا قلعہ بے حد مضبوط تھا اور وہاں خزانہ کے ساتھ ساتھ شمبھاجی اور راجہ رام کے خاندان بسے ہوئے تھے۔ لہٰذا انعام کے طور پر (2000) دو ہزاری (3000) تین ہزاری سوار منصب کر دیا گیا اور موروثی لقب ذوالفقار خاں دیا گیا اس کے بعد میں اسے پن ہالہ کے قلعہ کو فتح کرنے کیلئے بھیج دیا گیا۔

ذوالفقار خاں کا اصلی رتبہ اس وقت سے مانا جاتا ہے جب اسے فوج کی کمان سپرد کی گئی اور جنجی پر قبضہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ جہاں شمبھاجی کے جانشین نے پناہ حاصل کر رکھی تھی اور یہ مرہٹوں کے اجتماع کا مرکز بن چکا تھا۔ جنجی کی فتح اور راجہ رام کی گرفتاری کے بعد اورنگ زیب کو امید تھی کہ مراہٹوں کی مہم ختم ہو جائے گی لیکن ذوالفقار خاں کو زبردست مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے مقابلہ کیلئے فوج ناکافی تھی۔ مرہٹوں کی کارروائیوں کے پیش نظر مقامی آبادی کا عدم تعاون اور خود ذوالفقار خاں کے اپنے امراء کا غیر اطمینان بخش رویہ بھی تھا کیونکہ وہ دل سے اس مہم کے ساتھ نہ تھے۔ 1692ء میں کرناٹک میں سنت جی گھورپانڈے اور دھانا جی جادو کی آمد نے صورتحال کو دشوار بنا دیا۔ ذوالفقار خاں نے اپنے آپ کو مشکل میں گرفتار پایا۔ اسد خاں اور شہزادے کام بخش کو اس کی مدد کیلئے حکم دیا گیا لیکن کام بخش کی سازشوں کے نتیجہ میں مزید انتشار پھیلا اور اس کو گرفتار کرکے قید کر دیا گیا اور محاصرہ کو عارضی طور پر ترک کر دینا پڑا۔

تاہم 1698ء میں ذوالفقار خاں نے جنجی کو فتح کیا لیکن اصل مجرم راجا رام فرار ہوگیا۔ اورنگ زیب نے ذوالفقار خاں کو ایک ہزار (1000) سوار کا انعام دیا اب اس کا منصب پانچ ہزار ذات/پانچ ہزاری سوار کر دیا گیا۔

ذوالفقار خاں کی زندگی میں جنجی کے محاصرہ کا زمانہ بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہی وہ زمانہ تھا جس میں اس نے اپنے گرد جانثار ساتھی اور پیرو اکٹھا کئے اور دکنی امراء سے تعلقات قائم کئے۔ بعض ہمعصر مشاہدین کا خیال ہے کہ اس کے یہاں دکن میں آزاد سلطنت کے قیام کی ہوس

پرورش پانے لگی تھی۔ ذوالفقار خاں کے سیاسی خیالات کی بھی اس دور میں نشوونما ہوئی۔ 1697ء میں اس نے اورنگ زیب کو راجہ رام کی طرف سے معاہدہ کی ایک تجویز بھیجی لیکن اورنگ زیب اس کو سننے کیلئے تیار نہ ہوا۔

جنجی کی فتح کے بعد ذوالفقار خاں کو سب سے پہلے مراٹھا جنرل دھاناجی جادو سے کون کان میں نمٹنے کے لئے مقرر کیا گیا اور اس کے بعد گشتی کمیشن کی حیثیت سے مرہٹوں سے جہاں بھی وہ مل سکیں، نمٹنے کا کام سپرد ہوا۔ ذوالفقار خاں اسے نقصان پہنچانے میں ناکام رہا کیونکہ وہ تیزی سے اپنے پڑاؤ کی جگہیں بدلتا رہا لیکن دوسرے مرہٹہ سرداروں کے خلاف اس نے بہت سی کامیابیاں حاصل کیں اور ایک کامیاب جنرل کی حیثیت سے نمایاں ہوا۔ 1702ء میں وہ میر بخشی کے عہدہ پر فائز ہوا۔ 1705ء میں جبکہ اورنگ زیب نے واکن کھیرا کے مقام پر ذوالفقار خاں کو اپنے تمام امراء اور جنرل کے ساتھ طلب کیا اس کی آمد سے لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا اور جلد ہی قلعہ فتح کر لیا گیا لیکن اورنگ زیب کو چونکہ پڑیاناٹک کے فرار میں ذوالفقار خاں اور اس کے ساتھی دلپت راؤ کے سازباز کا شبہ تھا اس لئے اسے حقیر رقم سے نوازا گیا۔ پھر بھی جلد ہی اس کا منصب (6000) ہزاری ذات/6000 چھ ہزاری سوار کر دیا گیا۔

ڈاکٹر ستیش چندر کا کہنا ہے کہ اورنگ زیب کی وفات تک اسد خاں اور ذوالفقار خاں دربار میں وزیر اور میر بخشی کے دو اہم عہدے حاصل کر چکے تھے اور ان کے ذاتی مناصب (7000) ہزار ذات اور (6000) چھ ہزار سوار تک بڑھ گئے تھے۔ علاوہ ازیں ان کو غیر معمولی شہرت اور عزت مل چکی تھی۔ ذوالفقار خاں اپنے وقت کا کامیاب ترین جنرل تھا۔ اس کے خاص مددگاروں میں داؤد خاں پانی پتی راؤدلپت بندیلہ اور راؤ رام سنگھ ہاڈا تینوں ہی مشہور جنگجو تھے اور کرناٹک میں ایک عرصہ تک ذوالفقار خاں کے ماتحت کام کر چکے تھے۔ 93-1692ء میں ذوالفقار خاں کے اشارہ پر راؤ رام سنگھ ہاڈا کا سردار کوٹہ کی گدی پر بیٹھا اور ذوالفقار خاں کی ماتحتی میں کام کرتا رہا۔ 1706ء میں ذوالفقار خاں بوندی کی زمینداری کو بدھ سنگھ کی بجائے جسے برطرف کر دیا گیا تھا اپنے لئے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ راؤ دلپت بندیلہ جس نے 1668ء میں نوکری کی تھی 1690ء میں جنجی میں متعین کیا گیا اور اس کے بعد ذوالفقار خاں کے ساتھ کام کرتا رہا۔

داؤد خاں پنی خضر خاں کا بیٹا تھا۔ یہ ایک سوداگر تھا۔ جو بیجاپور کے مشہور سرداروں کی پوزیشن تک پہنچ گیا تھا۔ 1677ء میں دکنی پارٹی کے ہاتھوں خضر خاں کے قتل کے بعد داؤد خاں اپنے بھائی سلیمان خاں کے ساتھ شاہی فوج میں شامل ہوگیا اور اس کو اس کے چچا رن مست خاں سے وابستہ کر دیا۔ اس نے بعد میں کافی شہرت حاصل کی اور اس کو بہادر خاں کے خطاب سے نوازا گیا۔ اس کے بعد اسے ذوالفقار خاں سے منسلک کر دیا گیا۔ اس نے جنجی کے محاصرہ کے دوران کافی نام پیدا کیا۔ جنجی کی فتح کے بعد جب ذوالفقار خاں کو دربار میں واپس بلا لیا گیا داؤد خاں کو حیدر آبادی کرناٹک کی فوجداری میں نائب بنا دیا گیا اور دو سال کے بعد 1701ء میں بیجاپور

کرناٹک کی فوجداری بھی اس کے حوالے کر دی گئی۔ 1704ء میں اسے شہزادہ کام بخش کا جو اس وقت حیدر آباد کا صوبہ دار تھا نائب مقرر کر دیا گیا اور اس کا منصب (6000 چھ ہزاری ذات / (6000) چھ ہزاری سوار کر دیا گیا۔

داؤد خاں کے دکن کے امراء سے بہت تعلقات تھے اور وہ ایک امیر آدمی کے طور پر مشہور تھا۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ وہ کٹر خیالات کا حامی نہ تھا۔ اس کا جھکاؤ ہندوؤں کی طرف جانبدارانہ نہ تھا۔ اوپر کے بیانات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اسد خاں اور ذوالفقار خاں اور اس کے ساتھیوں کا گروہ بہت طاقتور تھا اس کے خاص ممبروں کے منصب چوبیس ہزار (24000) ذات اور چوبیس ہزار (24000) سوار تک جا پہنچے تھے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ گروہ کسی ذات یا فرقہ پر مبنی نہ تھا۔ اسد خاں اور ذوالفقار خاں کو اس بات پر فخر تھا کہ وہ ایرانی ہیں لیکن ہندوستان میں پیدا ہوئے اور اورنگ زیب کی وفات کے وقت تک تقریباً تین چوتھائی صدی سے یہیں رہتے آئے تھے۔ یہ گروہ ایک ہی خاندان سے وابستہ ایک ذاتی گروہ تھا اور ذوالفقار خاں سے رشتہ داری اور اس سے ذاتی وفاداری رکھتا تھا۔ اس گروہ کی مخصوص سیاست نہ تھی لیکن ذوالفقار خاں کی ذاتی دلچسپی اور وقار شاہو میں تھا اور مرہٹوں سے اس کے تعلقات بنانے کیلئے کوشاں تھا۔ بندیلہ سے اور راجپوت سرداروں سے اس کے تعلقات بھی غیر اہم نہیں ہیں۔

(2) دوسرا گروہ : دربار کے دوسرے گروہ میں غازی الدین فیروز جنگ اس کے بیٹے چن قلیچ خاں (بعد کو جو نظام الملک بنا) حامد خان بہادر اور اس کا عمزاد محمد امین خاں فیروز جنگ کا باپ شامل تھے۔ خواجہ عابد شاہ جہاں کے آخری دور میں ہندوستان آیا تھا اور دکن میں اورنگ زیب کے ساتھ اس وقت شامل ہوا جب وہ تخت کے حصول کیلئے شمالی ہندوستان کی طرف کوچ کر رہا تھا۔ خواجہ عابد کے والد عادل شیخ بخارا کے مشہور عالم اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے سلسلہ سے تھے۔ حکومت کے سولہویں سال 75-1674ء میں ان پر عتاب نازل ہوا اور انہیں مکہ کی زیارت کیلئے بھیج دیا گیا۔ 81-1680ء میں انہیں پھر صدر کل کے عہدہ پر فائز کیا گیا اور آخرکار برار کا گورنر بنا دیا گیا۔ 1667ء میں گولکنڈہ کے محاصرہ کے دوران بندوق کی گولی سے زخمی ہو کر ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کا عہدہ پانچ ہزاری تھا۔

غازی الدین میر شہاب الدین 1069ھ میں ہندوستان آیا 80 ہجری 79-1668ء اور راجپوت کی جنگ میں بڑا کارنامہ انجام دیا۔ اس نے مرہٹوں کے ساتھ بھی جنگ میں نام کمایا اور اسے غازی الدین خاں و فیروز جنگ کے خطابات سے نوازا گیا۔ 1685ء میں بیجاپور کے محاصرہ کے دوران اعظم کے پاس رسد پہنچانے کے عوض انعام ملا۔ اس پر قبضہ کا سہرا بھی اسی کے سر ہے اور اس کا عہدہ سات ہزار ذات / سات ہزار سوار مقرر کر دیا گیا۔ اگلے سال ادونی پر قبضہ کرکے اس نے اپنی شہرت میں مزید اضافہ کیا لیکن اس سے اگلے سال حیدر آباد میں پلیگ کی بیماری میں وہ اندھا ہوگیا۔ 1698ء میں اسے برار کا گورنر مقرر کیا گیا جس عہدہ پر وہ اورنگ زیب کی حکومت کے دوران آخر تک فائز رہا۔ 1700ء سے 1702ء تک اسلام پوری کے

کیمپ کا انچارج رہا اور برار اور مالوہ میں نیاجی کا پیچھا کرنے کا کام سپرد کیا گیا۔ 1701ء میں بہادر پور سے واپسی پر اورنگ زیب غازی الدین کے کیمپ سے گزرا اور اس نے اپنی عادت کے مطابق خان کی فوجوں کا معائنہ کیا۔ خان کی فوجیں چار کوس تک پھیلی ہوئی تھیں اور بکتر بند گاڑیوں سے مسلح تھیں ان کے معائنہ کے بعد اورنگ زیب نے ان میں سے بکتر بند کی ایک بڑی تعداد پر اپنا قبضہ جما لیا اور شہزادہ بدر بخت کو خط لکھا تم دوگنے خراج پر بھی ایسے ہتھیار نہیں رکھ سکتے جیسے فیروز جنگ کے پاس ہیں اس کے پاس وہ تمام سامان موجود ہے جو ہونا چاہئے بلکہ وہ سامان بھی موجود ہے جو نہیں ہونا چاہئے۔

نظام الملک : چن قلیچ خاں 1081ء یعنی ہجری 1671ء میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے باپ کی شروع کی مہمات میں حصہ لیا اس کے بعد مرہٹوں کا پیچھا کرنے پر مقرر کیا گیا اور اسی سال وہ بیجاپور کا گورنر اور تل کونکان۔ اعظم نگر اور بلگام کا فوجدار بنایا گیا۔ 1705ء میں کھنکھیرا کے محاصرہ میں اس نے نمایاں حصہ لیا۔ کھنکھیرا کے قبضہ کے بعد چن قلیچ خان کا شہنشاہ پر اثر بڑھ گیا اور وہ تمام معاملات میں اس سے مشورہ کرنے لگا۔ چن قلیچ خان کے بھائی حامد خاں بہادر اور رحیم الدین خاں نے بھی فیروز جنگ کے ماتحت کام کیا۔ 1707ء میں وہ 2500/1500 کے اور 1600-1500 کے منصب پر رہا۔ چن قلیچ خاں کے دوسرے عمزاد محمد امین خاں 1687ء میں بخارا کے خاں کے ذریعہ باپ کی موت کے بعد آیا۔ وہ 2000/1000 کے منصب پر فائز ہوا اور تھوڑے وقفہ ہی میں ایک بہادر اور 2000/1000 جنگجو کی حیثیت سے پہچانا جانے لگا۔ شروع میں وہ فیروز جنگ کے ماتحت کام کرتا رہا۔ 1698ء میں وہ دربار میں بلایا گیا اور صدر منصب پر مقرر کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب نے یہ قدم جان کر اٹھایا تھا تاکہ ایرانیوں کا خاص طور سے اسد خاں اور ذوالفقار خاں کا اثر کم کیا جا سکے۔

خواجہ عبداللہ کی وفات کے بعد اورنگ زیب نے محمد امین خان کو صدر مقرر کیا۔ شیخ شہاب الدین سہروردی کی نسبت سے وہ اس عہدہ کیلئے مناسب ترین آدمی تھا اور اس کا چچا خواجہ عابد اورنگ زیب کی حکومت کے اولین دور میں اسی عہدہ پر فائز تھا۔ حقیقت میں اس بات کا بہت کم ثبوت ملتا ہے کہ اورنگ زیب ایرانی امراء میں شیعہ عقیدہ کی وجہ سے تفریق کرتا تھا حالانکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نے شیعہ عقائد کی ناپسندیدگی کو کبھی نہیں چھپایا اس طرح اس کے بہت سے افسر ایران سے نکالے ہوئے شیعہ عقیدہ کے ماننے والے ہی تھے۔ صدر کے عہدہ کے فوراً بعد محمد امین خاں نے بخشی کے عہدہ کے لئے ایک درخواست گزاری۔ اورنگ زیب نے اس کو نامنظور کر دیا۔ ذوالفقار خاں کے 1702ء میں میر بخشی کے عہدہ پر فائز ہونے سے یہ صاف ہو جاتا ہے کہ اس کے خاندان کے بارے میں شہنشاہ کو کوئی شبہ تھا۔

فیروز جنگ اور محمد امین خاں دونوں ہی توران سے ہند آئے تھے وہ ہمیشہ اپنے بھائی بندوں کی سرپرستی کرتے اور بہت سے تورانی ان کے ساتھ تھے۔ چن قلیچ خاں اور حامد خاں بھی تورانیوں کی سرپرستی کرتے تھے۔ انہوں نے اسد خاں اور ذوالفقار خاں کے گروہ پر سبقت حاصل

کر لیا اور فیروز جنگ چن قلیچ خاں کے تعلقات کی کشیدگی اور فیروز جنگ کے نابینا ہونے کی وجہ سے یہ گروہ کمزور تھا۔

خانہ جنگی بسلسلۂ تخت نشینی اور امراء کا کردار : ستیش چندر کا خیال ہے: شہزادوں کے درمیان خانہ جنگی سے جاگیرداروں اور صوبہ داروں کو ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا تھا اور وہ اس جنگ میں ملوث شہزادوں سے مختلف مراعات حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

اورنگ زیب کے بیٹے یعنی معظم اعظم اور کام بخش عرصہ سے وفادار جاگیرداروں کو اپنے گرد جمع کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور یہ سعی اس خانہ جنگی کے پیش نظر تھی جس کا اورنگ زیب کی وفات کے بعد وقوع میں آنا ناگزیر معلوم ہوتا تھا۔ ان میں سے بڑا بھائی یعنی معظم کو اورنگ زیب نے 1687ء میں قید کر دیا تھا اور جب 1695ء میں وہ رہا کیا گیا تو اسے گورنر بنا کر کابل روانہ کر دیا گیا۔ کام بخش عالم فاضل اور نہایت سمجھ دار شخص تھا لیکن اس کی طبیعت میں گہرائی نہ تھی۔ اعظم دربار کے ممتاز عہدہ داروں کی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ خصوصاً اس نے اسد خان اور ذوالفقار خاں کو اپنی طرف راغب کر لیا تھا۔ دربار میں اعظم شاہ اور کام بخش آپس میں کشیدہ رہتے تھے۔

کام بخش کی زندگی کی حفاظت کے پیش نظر دونوں بھائیوں میں جنگ کے امکان کو اپنی زندگی میں روکنے کیلئے اورنگ زیب نے 1707ء میں کام بخش کو بیجاپور کا صوبہ دار مقرر کرکے رخصت کر دیا۔ کام بخش کو تمام شاہانہ لوازمات نذر کئے گئے اور اسے شاہی علاقوں ہی سے اپنے نقارے بجانے کی اجازت بخشی گئی۔

اس سے قبل احسان خان کو اس کا بخشی خاص مقرر کیا گیا تھا اور اس کو کام بخش کی نگہداری کا منصب سپرد کیا گیا۔ محمد امین خاں کو بھی اسی کے ساتھ شامل ہونے کی ہدایت کی گئی۔ محمد اعظم کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے صوبے مالوہ کی طرف کوچ کرے اس پر وہ نہایت چراغ پا ہو کر رخصت ہوا۔

بعد از وفات ملنے والے وصیت نامہ کے مطابق اورنگ زیب نے بیجاپور اور حیدر آباد کام بخش کو دیئے تھے ممکن ہے کہ کام بخش کو بیجاپور کا انتظام سنبھالنے کیلئے بھیجتے وقت اورنگ زیب اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی خواہش سے متاثر رہا ہو اور اس امید میں کہ ممتاز جاگیرداروں اور عہدہ داروں کی مدد سے کام بخش جو اورنگ زیب کی ضعیفی میں باپ کا بہت چہیتا تھا اپنے دشمنوں سے دفاع کر سکے لیکن شاید اورنگ زیب کو اس کی زیادہ فکر تھی کہ وہ اپنے بیٹوں کے درمیان ایک توازن برقرار رکھ سکے تاکہ ان میں سے کوئی بھی باپ کو کسی یکطرفہ میلان اور تعصب کا مجرم نہ قرار دے سکے اور اس پر بھی وہی الزام عائد نہ کیا جا سکے جو خود اورنگ زیب نے اپنے باپ پر کیا تھا کہ وہ داراشکوہ کی طرف رجحان رکھتا ہے لیکن اورنگ زیب کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی کہ محمد امین خاں کو کام بخش کے ساتھ منسلک کیا جا سکے کیونکہ کام بخش نے احمد نگر سے چند منزلیں ہی طے کی ہوں گی کہ اس کو اورنگ زیب کی وفات کی اطلاع ملی اور

وہ اس خبر کو سنتے ہی اعظم شاہ کے ساتھ شامل ہونے کے لیے روانہ ہوگیا۔
اعظم اپنے شاہی پڑاؤ کے شاید دو منزل تک بھی نہ پہنچا تھا کہ 3 مارچ 1707ء کو احمد نگر میں اورنگ زیب کی وفات ہوگئی۔ وہ الٹے پاؤں واپس لوٹ گیا اور اس نے شاہی املاک و اثرات پر قبضہ کر لیا۔ تمام درباری امراء نے وزیر اعظم اسد خاں کے ساتھ اعظم کی تخت نشینی کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ ذوالفقار خاں جو میر بخشی تھا اور جو مرہٹوں کو پسپا کرنے کی غرض سے ایک مہم پر گیا ہوا تھا وہ تنگ بھدرا دوآب سے تیزی کے ساتھ واپس آیا اور اورنگ آباد کے قریب اعظم شاہ کے ساتھ مع رام سنگھ ہاڑا دلپت بندیلہ اور تربیت خاں میر آتش شامل ہوگیا۔
حکومت کے با اثر امراء کی مدد سے نیز شاہی رسد' توپ خانے اور دکن کی مہم پر آئے ہوئے تجربہ کار اور نہایت ہوشیار سرداروں کی وفاداری کے پیش نظر اعظم کے بارے میں عام طور پر یہ پیشین گوئی کی جانے لگی تھی کہ دوسرے امیدواروں کی بہ نسبت خانہ جنگی پر قابو اور فتح پانے میں صرف وہی کامیاب ہو سکے گا لیکن امراء میں سے بیشتر خانہ جنگی کے خطرات مول لینے کو تیار نہ تھے اور وہ جی جان سے معظم کے ساتھ نہ تھے اور علانیہ اس کا ساتھ دیتے کترا رہے تھے چنانچہ چن گروہ جو ایک طاقتور عسکری گروہ تھا اس نے اس امکانی خانہ جنگی میں حصہ نہ لینے کا اظہار کیا۔ اپنی بادشاہت کا اعلان کرنے کے بعد اعظم نے بھی اس طاقتور گروہ کو خوش کرنے کیلئے محمد امین خاں کو چھ ہزاری اور سات ہزاری اور سات ہزار کا عہدہ عطا کیا اور چن قلیچ خاں کو خان دوراں کا خطاب عطا کیا۔ اور اس کو نجابت خاں کی جگہ برہان پور (خاندیش) کا گورنر بھی مقرر کیا اور اس کو حکم دیا کہ وہ خود تو دربار سے منسلک رہے اور وہاں اپنی جگہ کسی نائب کو مقرر کر دے لیکن چن قلیچ خان نے اورنگ آباد سے ایک یا دو منزل کا سفر کرنے کے بعد ہی شاہی کیمپ سے اپنی علیحدگی کا اعلان کر دیا اور سبب یہ ظاہر کیا کہ اس کے صوبے میں خود اس کی موجودگی بہت ضروری تھی۔

فیروز جنگ دولت آباد ہی میں ٹھہرا رہا اور اعظم کے ساتھ شامل ہونے کیلئے کوئی اقدام نہ کیا ذوالفقار خاں نے اعظم کو صلاح دی کہ وہ دولت آباد کے راستہ آگرہ کا سفر کرے اور فیروز جنگ کو اپنے ساتھ شامل ہونے کیلئے مجبور کرے لیکن اعظم آگرہ کا سیدھا راستہ ترک کرنے پر تیار نہ تھا۔

دراصل اعظم فیروز جنگ اور چن قلیچ خاں کے شامل ہونے سے انکار کرنے پر سخت ناراض تھا لیکن اس نے اس وقت اپنی ناراضی کو پوشیدہ رکھنا ہی مصلحت جانا۔ نیز یہ سوچ کر کہ فیروز جنگ کو دشمن کی بجائے دوست بنا کر چھوڑ جانا زیادہ مصلحت آمیز اقدام ہے۔ اس کو سپہ سالار کے خطاب سے نوازا اور اورنگ آباد کا گورنر اور دکن کا نائب حکمران یعنی وائسرائے مقرر کر دیا۔ ایک نفر ہاتھی اور دوسرے بہت سے تحائف چن قلیچ خاں کے ذریعہ اس تک پہنچانے کیلئے سپرد کیے گئے۔ منصور خاں سے جو داروغہ توپ خانہ دکن تھا فیروز جنگ کی آمد تک اورنگ آباد کی نگہداشت کیلئے کہا گیا۔

(خافی خاں منتخب اللباب صفحہ 572' نیز قاسم کا ظفر نامہ بہادر شاہ' صفحہ 10)
محمد امین خاں بھی برہان پور سے ایک دو منزل سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ اس نے فوج کے پچھلے دستوں کو لوٹ لیا جبکہ فوج داؤد نگر کے پہاڑی مقامات سے گزر رہی تھی اور اس کے بعد وہ برہان پور لوٹ گیا۔ بہت سے سپاہی بھی باغی ہوگئے جن کو دکن میں بھرتی کیا گیا تھا۔ بعد ازاں محمد امین اورنگ آباد کے مقام پر چن قلیچ خاں سے مل گیا جہاں ان دونوں نے مل کر بہت سے اضلاع پر قبضہ کر لیا۔ (خافی خاں' صفحہ 522)

فیروز جنگ اور چن قلیچ خاں کے علاوہ اسد خاں اور ذوالفقار خاں بھی دکن چھوڑ کر اعظم شاہ کے ساتھ چلنے کو تیار نہ تھے اور انہوں نے اعظم شاہ سے پرزور درخواست کی کہ انہیں دکن ہی میں چھوڑ دیا جائے اور اس کا سبب یہ بتایا کہ وہ مرہٹوں کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھ سکیں۔

دراصل اعظم کے پاس فیاضی کا اظہار کرنے کیلئے دولت نہ تھی۔ دکن کی لڑائیوں میں کثیر دولت خرچ ہو چکی تھی۔ دکن روایتی طور پر ایک خسارہ کا علاقہ تھا اور چونکہ اورنگ زیب شاہجہاں کے جمع کردہ خزانے کو خرچ کرنے میں پس و پیش کرتا تھا۔ فوج کی تنخواہ تقریباً تین سال سے واجب الادا چلی آتی تھی اور اب شہنشاہ کی دولت کا خاص ذریعہ بنگال کی مالگزاری کے سوا کچھ نہ تھا جو تھوڑا بہت روپیہ شاہی خزانے سے اعظم کو حاصل ہوا وہ سپاہیوں کی واجب الادا تنخواہیں دینے میں خرچ ہوگیا۔

بہرحال دربار میں دونوں مخصوص گروہوں کے سرداروں کا خانہ جنگی میں حصہ لینے سے پس و پیش دکن سے مراجعت نہ کرنے کی ان کی شدید خواہش اور ان کے ساتھ ساتھ دکنی افواج کی علیحدگی ان سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں گروہوں کی دلچسپیوں کا مرکز صرف دکن ہی بن کر رہ گیا تھا اور یہ آیندہ کیلئے ایک خطرہ کا نشان تھا کہ اہل دکن شمالی ہند کو ایک دوسرا ملک تصور کرتے تھے اور مغلوں کی حکومت کو غیر ملکیوں کی حکومت سمجھتے تھے۔ اس لئے مرکزی حکومت میں کمزوری کے موقع پر دکن میں آزاد اور خودمختار حکومتوں یا سلطنتوں کی تحریک کا زور پکڑ جانا یقینی اور فطری تھا۔

اعظم کی بہت سی مشکلات حل ہو جاتیں اگر وہ سب سے پہلے آگرہ پر قابض ہو جاتا کیونکہ یہاں (آگرہ میں) شاہجہاں کے خزانوں کا بہت سا حصہ موجود تھا لیکن کوئی ایک فرد واحد بھی ایسا نہ تھا جس کو اس میں شک تھا کہ اعظم شاہ کی لاکھ رکاوٹوں اور پشاور کے فاصلہ کے باوجود شاہ عالم اس سے قبل ہی آگرہ آپہنچے گا۔ اعظم آگرہ پر اپنا قبضہ جما لیتا اگر اس نے اپنے فرزند بیدار بخت کو جو احمد آباد کا گورنر تھا آگرہ کی طرف کوچ کرنے کا حکم دے دیا ہوتا لیکن اعظم کو بیدار بخت کے بارے میں شاہی تخت پانے کی تمنا کا یقین دلایا جا چکا تھا اس لئے اسے مالوہ میں منتظر رہنے کا حکم دیا۔ جس نے اعظم کا مالوہ میں ایک مہینہ اٹھائیس دن انتظار کیا۔ دریں اثنا شاہ عالم کا تیسرا بیٹا عظیم الشان جس کو کہ اورنگ زیب نے اپنی وفات سے کچھ ہی پہلے بہار سے واپس

بلا لیا تھا آگرہ پہنچ گیا۔ قلعہ کے حاکم باقی خان نے جو بیدار بخت کا خسر تھا قلعہ کو سپرد کرنے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ تخت کے دعویداروں میں سے ایک خود وہاں پہنچ گیا چونکہ شاہ عالم کی قبل از وقت آمد متوقع تھی اس لئے آگرہ با آسانی اس کے قبضہ میں آگیا۔

محمد معظم ملقب بہ شاہ عالم' اورنگ زیب کی وفات کے وقت کابل اور لاہور کا گورنر تھا۔ علاوہ ازیں ملتان کی گورنری بھی اسی کے سب سے بڑے بیٹے جہاندار شاہ کے سپرد تھی۔ دوسرا بیٹا عظیم الشان' بنگال اور بہار کا گورنر تھا۔ ان صوبوں کے ذرائع آمد اور پنجاب اور افغانستان کے فوجی اڈوں پر صاحب اختیار ہونے کے سبب سے شاہ عالم تخت کے دوسرے دعوے دار اعظم سے طاقت آزمائی کے لئے زیادہ تیار تھا۔ دور دراز کابل میں شاہی دربار سے اس کی جلاوطنی پردۂ زحمت میں رحمت ثابت ہوئی کیونکہ اس نے اپنے گرد قابل اعتماد معاونین کو جمع کر لیا تھا اور بار بار کی آمدورفت سے اپنی افواج کو فوجی نقل و حرکت کی مشق کراتا رہا یہاں تک کہ کسی بھی چھت والے مکان میں سونے سے اس کو وحشت سی ہونے لگتی تھی اس کی یہ عادت زندگی بھر جاری رہی۔ 1703ء میں خوش قسمتی سے اسے ایک گمنام سردار اور امیر منعم خاں کی خدمات میسر آگئیں۔ شاہ عالم کی سفارش پر منعم خاں کو کابل کا دیوان مقرر کر دیا گیا اور پنجاب کا نائب صوبے دار بھی تھا۔ خانہ جنگی کے احتمال کے پیش نظر منعم خاں نے شاہ عالم کیلئے کچھ خزانہ جنگ جمع کر لیا اور خاموشی سے اونٹ اور بیل وغیرہ توپ خانہ کھینچنے کے لئے مہیا کر لئے اور ساتھ ہی ساتھ کچھ کشتیاں بھی فراہم کر لیں تاکہ پشاور اور لاہور کے درمیان دریاؤں کو عبور کیا جا سکے۔

(خافی خاں منتخب اللباب' صفحہ 573)

شاہ عالم کو اورنگ زیب کی رحلت کی خبر 20 مارچ 1707ء کو پشاور کے قریب جمرود کے مقام پر ملی۔ منعم خاں کی تیاریوں کی رو سے وہ کافی سرعت کے ساتھ لاہور اور لاہور سے دہلی تک پہنچتا چلا گیا۔ لاہور کے خزانے سے اسے 28 لاکھ اور دہلی کے خزانے سے 30 لاکھ روپے دستیاب ہوئے جس سے اس کو اپنے سپاہیوں کی ادائیگی کرنے میں بہت مدد ملی۔ 12 جون 1707ء کو وہ آگرہ پہنچ گیا۔ قلعہ کے حاکم باقی خاں نے شاہ عالم کے سامنے سر تسلیم خم کیا اور قلعہ کی کنجیاں اس کو پیش کر دیں۔ شاہ عالم نے شاہ جہاں کے خزانے سے دو کروڑ حاصل کر کے اپنے اعوان و انصار میں تقسیم کر دیئے۔

اعظم گوالیار سے آگرہ کی طرف بڑھا دونوں حریف 18 جون 1707ء کو جاجو کے میدان میں ساموگڑھ کے قریب مدمقابل ہوئے۔ اعظم کی افواج بلاشک شاہ عالم کی افواج کی بہ نسبت ہر طرح کم تھیں کہا جاتا ہے کہ اعظم 35 ہزار موجودی سوار لے کر گوالیار پہنچا تھا اور اس کے سواروں کی تعداد وہاں پہنچتے پہنچتے پچاس ہزار تک پہنچ گئی تھی اور اس کے علاوہ توپ خانہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ شاہ عالم کے ساتھ مورخین نے ایک لاکھ پچاس ہزار سواروں کی تعداد بتائی ہے۔

شاہ عالم اپنی طاقت میں ان بھاری توپوں سے بھی اضافہ کر چکا تھا جو اسے آگرہ کے قلعہ سے حاصل ہوئیں جبکہ اعظم کو اپنا بھاری توپ خانہ دکن اور گوالیار ہی میں چھوڑ دینا پڑا تھا تاکہ وہ جلد از جلد پیش قدمی کر سکے۔

نسخہ دل کشا صفحہ 162 الف میں ہے کہ اعظم نے ایک خاص انداز سے فاخرانہ طور پر اعلان کیا کہ توپ خانے کی مدد سے جنگ کرنا بہادری کے خلاف ہے اس لئے وہ اب صرف تلواروں کے ذریعہ ہی جنگ کرے گا۔

اعظم کو ابتدائی مڈبھیڑ میں کچھ برتری حاصل ہوئی لیکن جیسے ہی شاہ عالم کی مخصوص افواج نے جنگ میں شمولیت کی اعظم کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ شاہ عالم کے توپ خانے نے اس کی افواج میں تباہی مچا دی۔ معتقد و سرکردہ امراء شہزادہ بیدار بخت اور اس کا بھائی والا جان لقمہ اجل بن گئے۔ ذوالفقار کو بھی کچھ ضرب پہنچی۔ اس یقین کے بعد کہ میدان اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے اور فتح کی کوئی امید باقی نہیں وہ اعظم شاہ کے پاس حاضر ہوا اور اس کو بھاگ نکلنے کی صلاح دی تاکہ اگر زندہ رہے تو کسی اور موقع پر قسمت آزمائی کی جا سکے لیکن اعظم نے انکار کر دیا کیونکہ شاید دارا کا انجام اس کے ذہن میں تھا اور اس نے اپنی زندگی کا مہنگا سودا کرنا منظور کیا۔ وہ تین سو سے چار سو سواروں کے ساتھ ہی جنگ کرتا رہا۔ حمید الدین خاں کے ہمراہ ذوالفقار گوالیار کو چلا گیا اور دیگر لوگوں نے بھی اس کی پیروی کی۔ انجام یہ ہوا کہ اعظم ایک تیر سے گھائل ہوگیا۔ رستم دل نے اس کا سر قلم کر لیا اور اسے لیکر شاہ عالم کی خدمت میں پیش کرنے کیلئے روانہ ہوگیا۔ ذوالفقار خاں نے جو اپنے حاکم اور بادشاہ کے ساتھ آخر تک وفادار رہنے اور لڑنے سے انکار کیا اس پر متعدد معاصرین نے سختی سے رائے زنی کی ہے کچھ تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ اس کا فرار ہونا ہی اعظم کی شکست کا خاص سبب تھا۔

ستیش چندر کا کہنا ہے کہ اگرچہ یہ رائے مبالغہ سے خالی نہیں تاہم اس میں بھی شک نہیں ہے کہ ذوالفقار خاں کا عمل وفاداری کے ہر معیار کے برعکس تھا اور اس سے ذوالفقار خاں پر "خود غرض اور ناقابل اعتماد" ہونے کا الزام عائد ہوتا ہے۔

ولی عہدی کی جنگ نے سلطنت کو مزید کمزور کر دیا۔ تقریباً دس ہزار نفوس اور متعدد ایسے جری تجربہ کار معتمد امراء جاں بحق ہوئے جو مرہٹوں کے خلاف مہم میں عظیم شہرت حاصل کر چکے تھے۔ دلپت بندیلہ اور رام سنگھ ہاڑا جو ذوالفقار خاں کے دست راست تھے وہ بھی میدان جنگ میں کام آگئے۔ دونوں حریفوں خاص طور پر شاہ عالم نے افواج اور امراء کو بیش قیمت تحائف اور فرمان بخشے تاکہ ان کی اعانت حاصل رہے۔ اس طرح ان دونوں نے حکومت کی حالت کو مزید صدمہ پہنچایا جو کہ پہلے ہی خراب ہوگئی تھی۔

خافی خاں اپنی تاریخ "منتخب اللباب" میں (صفحہ 576 پر) لکھتا ہے کہ شاہ جہاں کے پس انداز کردہ 24 کروڑ میں سے علاوہ چاندی سونے کے ظروف کے 9 کروڑ تو قلعہ آگرہ ہی میں سے دستیاب ہوئے تھے یا ایک دوسرے بیان کے مطابق تفصیل اس طرح ہے۔ 13 کروڑ نقد

جس میں 100 تولہ سے لے کر تین سو تولہ تک کی اشرفیاں شامل تھیں اور جو خصوصاً تحفہ تحائف کے استعمال کیلئے بنائی گئی تھیں اور اکبر کے دور حکومت کی 12 ماشہ اور 13 ماشہ مزید اشرفیاں بھی موجود تھیں۔

شاہ عالم (بہادر شاہ) اور اس کے دور پر تبصرہ : ڈاکٹر ستیش چندر کا کہنا ہے کہ تخت نشینی کے بعد بہادر شاہ (شاہ عالم) کو مجبوراً ان مسائل سے دوچار ہونا پڑا جو اورنگ زیب سے اس کے جانشینوں کو بطور وراثت ملے تھے۔ مثلاً بگڑی ہوئی مالی حالت' جاگیرداری نظام کے عمل درآمد میں زبردست نقائص کے نتیجے میں امراء کی اخلاقی پستی' ہندو اور مسلمانوں میں ایسے خیالات کی تحریک جو باہمی اختلافات اور شکوک و شبہات کو ہوا دے رہے تھے۔ نظم و نسق کے نفاذ عام مسائل خصوصاً دکن میں جہاں مرہٹے مغلوں کیلئے ایک دردسر بن گئے تھے' سکھوں کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہوا تصادم مرہٹوں کے ساتھ روزافزوں اختلافات اور ان سب کے مجموعی نتائج جو شہنشاہیت کی عظمت و حرمت پر اثر انداز ہو رہے تھے خصوصاً امراء پر جو حکومت کی بڑھتی ہوئی مشکلات سے فائدہ اٹھا کر اپنے اثرات میں اضافہ کرنے کے مواقع تلاش کر رہے تھے۔

درپیش حالات اور اپنی افتاد طبع کے پیش نظر ان مشکلات کا مقابلہ کرنے کیلئے بہادر شاہ نے سمجھوتے اور مصالحت کی پالیسی اختیار کی۔

بہادر شاہ ایک مذہبی رجحان رکھتا تھا اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کبھی کسی درویش کے پاس حاضر ہونے اور اس سے ملنے کے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح وہ بھی تصوف کا قائل معلوم ہوتا تھا اور اس کے بارے میں شیعی رجحانات کا بھی شک بھی نہ تھا۔ وہ ایک ہندو ماں کے بطن سے پیدا ہوا تھا اور مغلوں کی روایات کے مطابق اس کی شادی بھی ہندو گھرانے ہی میں ہوئی تھی۔ شہزادگی کے زمانے میں بہادر شاہ کے سیاسی نظریات کا معاصر مورخین کو کوئی علم نہیں تھا اس نے متعدد بار دکن کی نیابت کی ذمہ داری سنبھالی لیکن اس کے نظم و نسق سے شہنشاہ غیر مطمئن تھا اور اس کی پالیسیوں کو کمزور اور غیر مستحکم سمجھتا تھا اسی وجہ سے اس نے بہادر شاہ کو کبھی بھی کسی طویل عرصہ کیلئے دکن کی خودمختارانہ ذمہ داری نہیں سونپی۔ بیجاپور اور گولکنڈہ پر آخری اقدامات کے زمانے میں اس پر گولکنڈہ کے حکمران ابوالحسن کے ساتھ سازش کے الزامات عائد کئے گئے اور شہنشاہ نے اس کے نتیجے میں اس کو حراست میں بھی رکھا۔ بقول خافی خان شہزادہ گولکنڈہ پر حملہ کرنے کو ایک قسم کی بدعہدی سمجھتا تھا اور اس کا خواہشمند تھا کہ صلح اور جنگ اس کی مرضی کے مطابق ہو کیونکہ وہ ولی عہد تھا اور امکانی حد تک وہ ابوالحسن کو اپنے مقاصد کے لئے آلہ کار بنانا چاہتا تھا۔

بہادر شاہ کو 1695ء تک حراست میں رکھا گیا تھا پھر اس کو شمالی ہند میں آگرہ کا گورنر بنا کر بھیج دیا گیا۔ بعد ازاں ملتان کی گورنری پر اس کا تقرر ہوگیا۔ 1698ء میں اس کو کابل کا گورنر مقرر کیا گیا اور خصوصاً ہندوستان اور فارس کی سرحد کی نگہداشت کی ذمہ داری اس کے سپرد کی گئی۔ 1700ء میں پنجاب کی گورنری کیلئے بھی اس کو نامزد کیا گیا۔ اس طرح اورنگ

زیب کی حکومت کے ایک نہایت اہم دور میں بہادر شاہ مرکزی حکومت کے نظم و نسق کے سیاق و سباق سے غیر متعلق سا رہا۔

راجپوتوں کے سلسلے میں 1681ء میں بہادر شاہ نے میواڑ کے رانا کے ساتھ ایک خفیہ صلح نامہ کر رکھا تھا کہ بادشاہ بنتے ہی وہ جزیہ ختم کر دے گا اور راجپوتوں کو دوسری اور بہت سی مراعات بھی دے گا بشرطیکہ وہ اس کو فوجی امداد بہم پہنچائیں۔ پتہ یہ چلتا ہے کہ اس قسم کے صلح نامے اعظم اور شہزادہ اکبر اور بہت سے راجپوت سرداروں کے مابین بھی طے پا چکے تھے۔ (خافی خاں صفحہ 626)

لیکن راجپوتوں کی آپس کی نا اتفاقی اور پھوٹ نے ان کی دوستی کی قیمت گھٹا دی تھی لہٰذا ان صلح ناموں اور وعدوں کی قیمت بھی کم ہوتی گئی اور جانشینی کی جنگ کے دوران بہادر شاہ کو راجپوتانہ کے حکمران سرداروں سے کوئی مدد حاصل نہ ہوئی۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ راجپوتوں اور مرہٹوں کے مسائل کے سلسلے میں بہادر شاہ کے نظریات میں استحکام نہ تھا چنانچہ اس کی پالیسی مصلحت اور احتیاط کے ساتھ اہم مسائل اور تنازعات کو مصالحت کی روشنی میں حل کرنے تک محدود رہی۔

بہادر شاہ کے سامنے سب سے پہلا مسئلہ ممتاز عہدہ داروں کے انتخاب اور مصالحت کا تھا۔ اعظم کو شکست دینے کے بعد بہادر شاہ نے اعلان کر دیا کہ وہ کسی شخص کو صرف اس لئے مجرم نہ قرار دے گا کہ اس نے اعظم کا ساتھ دیا کیونکہ اس نے یہ تسلیم کیا کہ اگر خود اس کے اپنے بیٹے بھی دکن میں ہوتے تو وہ بھی حالات کے تحت اعظم کا ساتھ دینے پر مجبور ہوتے چنانچہ جنہوں نے فوری طور پر خود کو اس کے سامنے پیش کر دیا ان کو ملازمت دینے کے وعدے کئے گئے اور ان کو اورنگ زیب کے عطا کردہ منصبوں کی بحالی کا بھی یقین دلایا گیا۔ گوارلیار میں اسد خاں' ذوالفقار خاں اور دوسرے بہت سوں کو یقین دہانی کے خطوط روانہ کئے گئے اور ان کو دربار میں آنے کی دعوت دی گئی اور دکن سے غازی الدین خاں' فیروز جنگ' چن قلیچ خاں اور محمد امین خاں کو طلب کیا گیا۔ شکست خوردہ حریفوں کے معاونین کو سزا نہ دینے کی پالیسی ہندوستان میں مغلیہ خاندان کی روایات کے عین مطابق تھی نیز یہ پالیسی حکومت کے مفاد میں اور بہادر شاہ کے مفاد میں بھی تھی۔ اس سے بہادر شاہ کیلئے پرانے عالمگیری امراء کی وفاداری حاصل ہوگئی اور اس طرح کام بخش بھی تنہا رہ گیا جو ابھی تک بیجاپور اور حیدر آباد کو اپنی کمزور گرفت میں لئے ہوئے تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ اب جانشینی کی جنگ کو ختم ہی سمجھا جانے لگا تھا اور یہ یقین کیا جانے لگا تھا کہ کام بخش کی شکست کسی لمحہ بھی رونما ہو سکتی ہے قدیم عالم گیری امراء کی خواہشات اور توقعات کو خود اپنے معاونین کے مطالبات کے ساتھ منضبط کرنا بہادر شاہ کی حکمت عملی کیلئے ایک سخت امتحان تھا۔

یہ اہم وصیت کی گئی تھی کہ خواہ کوئی شہزادہ تخت نشینی میں کامیاب ہو اسد خاں کو بہرحال وزارت پر قائم رکھے اس سفارش کی بنا پر نیز اس کے ساتھ خاندانی تعلقات اور اپنی

خدمات اور تجربات کی بنا پر اسد خاں وزارت کا دعویدار ہوا اور میر بخشی کا عہدہ اپنے فرزند ذوالفقار علی خاں کے لئے طلب کیا۔ اس کے مطالبات کی جہان شاہ نے بھی تائید کی۔ جہان شاہ اس وقت باپ کا بہت چہیتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ بیگمات نے بھی اسی کے حق کی حمایت کی۔

بادشاہ کو ذوالفقار خاں کے حق کو تسلیم کرنے میں تو کوئی قباحت نہ تھی کیونکہ اس نے اس کو سات ہزار منصب پر فائز کیا تھا اور میر بخشی کا عہدہ دینا بھی اسی کے لئے قبول کر لیا تھا لیکن وزارت کا تو اس نے پہلے ہی اپنے معتمد اور وفادار اور آزمودہ امیر منعم خاں سے وعدہ کر رکھا تھا جس کی خدمات تخت و تاج کے حصول کو ممکن بنانے میں مسلمہ تھیں لیکن بہادر شاہ اسد خاں اور ذوالفقار خاں جیسے دو لائق اور بااثر امراء کو بھی اپنے سے علیحدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس دشواری کا ایک حل اس طرح نکالا گیا کہ منعم خاں کو تو وزارت سونپی گئی اور اسد خاں کو وکیل مطلق کا وہ قدیم عہدہ سپرد کیا گیا جو شاہ جہاں کے عہد میں آصف خاں کے بعد کسی کے بھی حصہ میں نہ آیا تھا۔ اس عہدہ کو اعظم خاں نے بظاہر تو قبول کر لیا لیکن خفیہ طور پر اس نے ایک عرضداشت پیش کی جس میں وہ تمام حقوق اور مناصب اسد خاں نے اپنے لئے طلب کئے تھے جو آصف خاں کو مخصوص طور پر حاصل تھے۔ ان خصوصی حقوق کا مطلب یہ تھا کہ اس کے دربار میں سب کے سب امراء مع وزیراعظم پیش ہوا کریں اور اس کے دستخطوں کیلئے وہ تمام خطوط پیش ہوں جو صوبہ داروں' فوجداروں اور دیوانوں وغیرہ کی تقرری علیحدگی اور منتقلی سے متعلق ہوں۔ ایک نقل ان تمام خبرناموں اور رپورٹوں کی اس کو پیش کی جائے جو صوبے داروں اور دیوان صاحبان کی بھیجی ہوئی ہوں اور وہ شاہی مہر بھی اس کے قبضہ میں ہو جو تمام فرمانوں پر لگائی جاتی ہے اس کے علاوہ اس نے کچھ اور انفرادی امتیازات بھی طلب کئے مثلاً نو ہزار' نو ہزار کا منصب' توغ توبان' لاہور کی گورنری' دیوان عام میں بیٹھنے کا حق اور یہ کہ شاہزادگان کے بعد اپنے نقارے بجانے کا بھی اس کو حق عطا کیا جائے۔

(ریاض السلاطین صفحہ 246 از غلام حسین نیز خافی خاں جلد 2 صفحہ 686)

بہادر شاہ کو اسد خاں کے ان مطالبات سے فکر بھی لاحق ہوئی لیکن اس کو خوش کرنے کیلئے اس کے تقریباً سبھی مطالبات تسلیم کر لئے گئے سوائے نو ہزار منصب کے اور دیوان عام میں بیٹھنے کے۔ نیز اسے آصف الدولہ کے خطاب سے بھی ملقب کیا گیا۔ منعم خاں کو وزارت کا قلمدان سونپا گیا اور اسے سات ہزاری منصب اور ایک کروڑ دام انعام عطا ہوئے اور خان خاناں کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔ نیز اپنی غیر حاضری میں آگرہ کی گورنری بھی اسی کو دی گئی۔ اس کے دو بیٹوں یعنی مہابت خاں اور خان فرمان کو پانچ ہزاری اور چار ہزاری منصب عطا ہوئے اور مہابت خاں کو بخشی سوم کا عہدہ بھی بخشا گیا اور زیادہ تر امراء اور عہدیداران کو ان کے پچھلے منصبوں ہی پر برقرار رکھا گیا۔ (خافی خاں صفحہ 685) لیکن اس سب کے باوجود مسئلہ حل نہ ہوسکا۔ پرانے امراء اس لئے خوش نہ تھے کہ ایک گمنام امیر یعنی منعم خاں کو وزارت جیسے منصب اعلیٰ پر فائز کیا گیا تھا خصوصاً اسد خاں اور ذوالفقار خاں کو وزارت نہ ملنے کا بڑا ہی صدمہ تھا۔

دوسری طرف منعم خاں ان شرائط اور قوانین کو ناپسند کرتا تھا جو بظاہر اس کو اسد خاں کا ماتحت قرار دیتے تھے چنانچہ جس روز آصف الدولہ نے بطور دیوان کے اپنا منصب سنبھالا تو خان خانان کیلئے یہ ضروری ہوا کہ وہ اس کی خدمت میں حاضر رہے جس طرح کہ دوسرے وزراء کیلئے بھی لازم تھا اور اس کے دستخط لینا بھی وزیراعظم کیلئے ناگزیر تھا کیونکہ کوئی فرمان آصف الدولہ کے دستخط کے بغیر مکمل نہ ہو سکتا تھا چونکہ منعم خاں اپنے اختیارات میں اسد خاں کی مداخلت کو ناپسند کرتا تھا اس لئے جب بھی کوئی اہم وزارتی معاملہ درپیش ہوتا وہ آصف الدولہ کو اس معاملہ کی اطلاع ہی نہ کرتا تھا۔ بالاخر وکیل مطلق کو راستے سے ہٹانے کا ایک بہانہ ہاتھ آہی گیا چونکہ اسد خاں کو عیش و نشاط کی زندگی بہت عزیز تھی اور وہ معمر بھی ہوچلا تھا اس لئے طے پایا کہ وہ دہلی جا کر سکون کے لمحات گزارے۔ اس کو حکم دیا گیا کہ زینت النساء بیگم کو دہلی لے جائے اور اس کو دہلی لاہور اور اجمیر کے صوبوں کا ذمہ دار بنا دیا گیا۔ ذوالفقار خاں کو اپنے والد ماجد کا نائب مقرر کیا گیا لیکن اس استثنا کے ساتھ کہ آصف الدولہ کی مہر' تحصیلی کاغذات شہری پروانوں اور سندوں پر وزیر کی مہر کے بعد لگے گی۔ اس کے علاوہ حکومت کے نظم و نسق میں اس کا کوئی دخل نہ رہے گا۔ (تذکرہ ارادت خاں صفحہ 76) اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد دکن سے چن قلیچ خاں اور محمد امین خاں پہنچ گئے۔ محمد امین خاں کو پانچ ہزاری اور ساڑھے تین ہزاری منصب عطا ہوا۔ پھر اس کو مراد آباد اور سنبھل کا فوجدار مقرر کیا گیا۔ یہ ایک اہم منصب تھا کیونکہ مراد آباد کی فوجداری رقبہ کے لحاظ سے ایک پورے صوبے کے برابر تھی۔ چن قلیچ خاں کو چھ ہزاری' چھ ہزاری منصب پر ترقی دے کر فائز کیا گیا نیز اس کو خاں دوراں کا خطاب عطا کیا گیا اور اودھ کا گورنر اور گورکھپور کا فوجدار بھی مقرر کیا گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس نے اس منصب کو پس و پیش کے ساتھ قبول کیا کیونکہ اس کا دل ابھی تک دکن ہی میں اٹکا ہوا تھا۔ چنانچہ چھ ہفتوں کے بعد ہی اس نے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا لیکن پھر منعم خاں کے اشارے پر اپنا استعفیٰ واپس لے لیا اور اب اس کو سات ہزاری کے منصب پر ترقی کے ساتھ فائز کیا گیا۔ 1685ء میں جو گولکنڈہ کا محاصرہ ہوا تھا اس میں بہادر شاہ کے قید ہونے اور اس کی اہانت کا ذمہ دار فیروز جنگ تھا اس لئے اسے دربار میں حاضر ہونے کے سلسلہ میں سخت تردد تھا۔ اس کی انتہائی رعایت کرتے ہوئے نیز منعم خاں کے اشارے پر اس کو گجرات کا گورنر مقرر کیا گیا اور اجازت دی گئی کہ وہ شہنشاہ کے سامنے حاضر ہوئے بغیر اپنا عہدہ سنبھالنے کیلئے روانہ ہو جائے۔

(بحوالہ عبرت نامہ' صفحہ 44 از قاسم لاہوری)

دکن میں کام بخش کی موجودگی اس بات کا ثبوت تھی کہ ابھی سلطنت کا ایک اور دعوے دار موجود ہے۔ یہی سبب تھا کہ وہاں کے امراء کے ساتھ ایک نرم پالیسی اختیار کی گئی اور اسی لئے فیروز جنگ کے دربار میں حاضر ہونے سے گستاخانہ انکار کو محض اس خوف و ہراس پر محمول کرکے ٹال دیا گیا۔

اس کے بعد کے عرصہ میں فیروز جنگ' چن قلیچ خان اور محمد امین خاں حکومت کی

پالیسی پر کچھ زیادہ اثر انداز نہ رہے۔ کیونکہ بقول بعض منعم خاں اور بہادر شاہ کے دل میں ان لوگوں کی طرف سے کچھ خلش تھی لیکن اس گروہ کی دل شکستگی کا اصل سبب یہ تھا کہ انہیں اپنے حقوق کی پامالی کا بڑا احساس تھا نیز یہ لوگ راجپوتوں اور مرہٹوں وغیرہ کے ساتھ بہادر شاہ کی نرم پالیسی اور مراعات پر بھی افسردہ تھے جو بہادر شاہ نے منعم خاں اور ذوالفقار خاں کے اشارے پر اختیار کر رکھی تھی۔ انہیں اسباب کی بنا پر یہ لوگ حکومت کے نظم و نسق کے رجحان اور اس کی پالیسی سے خود کو غیر متعلق سمجھتے تھے۔

(ارادت خاں' صفحہ 72 نیز عبرت نامہ از قاسم صفحہ 16' 17)

1710ء میں فیروز جنگ کی وفات اس گروہ کی مزید کمزوری کا باعث ہوئی۔ تقریباً اسی زمانے میں چن قلیچ خاں نے اپنے منصب اور اپنی ذمہ داری سے استعفیٰ دے دیا اور وہ دہلی میں عزلت کی زندگی گزارنے لگا۔

اس طرح اب بساط سلطنت پر صرف دو ہی اہم شخصیتیں باقی رہ گئیں یعنی وزیراعظم منعم خاں اور میر بخشی ذوالفقار خاں اور بہادر شاہ کے دربار میں جو سیاسی کشمکش تھی وہ اب ان دونوں کی طاقت آزمائی میں مرکوز ہو کر رہ گئی تھی جو محض انفرادی یا شخصی نہ تھی بلکہ یہ سیاسی حاشیہ آرائیاں بھی رکھتی تھی۔ ذوالفقار خاں کھلے طور پر راجپوتوں اور مرہٹوں کے ساتھ دوررس رعایتی پالیسی کا خواہاں تھا۔ یہ اس کے اس عمل سے بھی مترشح ہوتا تھا جس کے تحت اس نے اعظم شاہ کو بطور مشیر خاص کے دکن سے تخت و تاج کیلئے طاقت آزمائی کرنے کیلئے روانہ ہونے کا مشورہ دیا تھا۔ منعم خاں اپنے کردار اور اپنے نظریات میں بہادر شاہ سے بہت قریب تھا اور وہ صوفیانہ خیالات سے بھی متاثر تھا۔ مشہور تھا کہ اس نے تصوف کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی تھی جس پر سخت گیر علماء بہت چراغ پا تھے۔ نیز بہادر شاہ کی طرح وہ بھی سمجھوتے اور امن و صلح کی پالیسی کی طرف رجحان رکھتا تھا۔ وہ کسی حد تک اس فیاضانہ پالیسی پر بھی اثر انداز تھا جس کے تحت ان پرانے عالمگیری امراء کے ساتھ رعایتی سلوک برتا گیا جنہوں نے کہ اعظم کا ساتھ دیا تھا تاہم ایک ایسا امیر ہونے کے باعث جو حال ہی میں عروج پر پہنچا تھا اس میں ابھی سیاسی اور انتظامی سوجھ بوجھ کی کمی تھی اور اس کی میانہ روی کی پالیسی سے کوئی مطمئن نہ تھا۔ چنانچہ ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ حکومت کے مسائل اور بھی الجھ گئے اور دربار میں جو گروہوں اور افراد کے درمیان کشمکش تھی وہ اور سخت ہوگئی۔

راجپوتوں سے سلوک : خانہ جنگی کے دوران اعظم اور بہادر شاہ دونوں نے ہی راجپوتوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اعظم نے اجیت سنگھ اور جے سنگھ کو مہاراجہ اور مرزا راجہ کے خطابات عطا کئے اور سات ہزاری منصب سے بھی سرفراز کیا۔ نیز دونوں کو علی الترتیب گجرات اور مالوہ کی گورنری بخشی۔ جے سنگھ اعظم سے مالوہ میں آملا تھا لیکن اس نے جاجو کی جنگ میں اعظم کا ساتھ چھوڑ دیا تاہم اس کو بہادر شاہ سے کچھ خاص مراعات حاصل نہ ہوئیں کیونکہ بہادر شاہ سے جے سنگھ کا چھوٹا بھائی وجے سنگھ مل گیا تھا۔ اجیت سنگھ طرفین میں سے کسی

ایک کے ساتھ بھی شامل نہ ہوا بلکہ اس نے اس خانہ جنگی سے یہ فائدہ اٹھایا کہ جودھ پور سے مغل سپہ سالار کو برطرف کر دیا۔ اس نے نہ تو دربار میں حاضری دی اور نہ بہادر شاہ کی تخت نشینی پر اسے رسمی مبارکباد بھیجی۔ وہ جودھ پور میں مسلمانوں پر سختیاں کرتا رہا۔ اس نے گاؤکشی کو ممنوع قرار دیا' اذان دینے پر بھی پابندی لگا دی اور وہ بعض مساجد کو منہدم کر رہا تھا۔ اور پرانے مندروں کی مرمت کرا رہا تھا اور نئے مندروں کی بنیادیں رکھ رہا تھا جبکہ اودے پور کا رانا اور مہاراجہ جے سنگھ اس کی زبردست معاونت کر رہے تھے چنانچہ 9 اکتوبر 1707ء کو ایک جنگ کا فیصلہ کیا گیا جس کا مقصد اجیت سنگھ کو سزا دینا اور اس کے گروہ کو پارہ پارہ کر دینا تھا تھا۔ محراب خاں کو جودھ پور کا فوجدار مقرر کیا گیا۔ 10 نومبر کو شہنشاہ بذات خود امیر اور اجمیر کے راستہ سے راجپوتانہ کیلئے روانہ ہوا۔ خراماں خراماں شاہی لشکر جنوری 1708ء کے اواخر میں جے سنگھ کے دارالسلطنت امیر پہنچا۔ بہادر شاہ نے حکم دیا کہ چونکہ جے سنگھ اور وجے سنگھ دونوں بھائیوں کے درمیان کچھواہا کی راج گدی کے سلسلے میں تنازعہ تھا ان کی ریاست کو شاہی عملداری میں لے کر ضبط کر لیا جائے اور شہر کا نام بدل کر اسلام آباد رکھ دیا جائے اور وہاں سید احمد سعید خاں بارہ کا تقرر بطور نئے فوجدار کے کر دیا جائے۔ شہنشاہ نے تین روز تک امیر میں پڑاؤ کیا اور اس دوران میں شہر کے باشندے شہر سے کوچ کر گئے۔ متصدی صاحبان جے سنگھ کی املاک کو ضبط کرنے کیلئے روانہ ہوئے لیکن جلد ہی ان املاک کو واپس کر دیا گیا اور حکومت وجے سنگھ کو سونپ دی گئی۔

(بحوالہ اخبارات 6 اپریل 1712' نیز سیر المتاخرین از غلام حسین صفحہ 392)

بہادر شاہ امیر سے آگے بڑھا تو اودے پور کے رانا امر سنگھ نے اپنے ملک پر حملے کے خطرہ کو اس طرح ٹالا کہ اپنے بھائی بخت سنگھ کو مبارکباد کا خط دے کر نئے شہنشاہ کی خدمت میں روانہ کیا اور نذر کے طور پر ایک سو اشرفیاں ایک ہزار روپے سونے کے ساز سے مرصع دو گھوڑے' ایک ہاتھی اور نو تلواریں وغیرہ بھجوائیں اور خود اپنے پایہ تخت سے فرار ہوگیا اور اپنے خاندان و املاک وغیرہ کو پہاڑیوں میں چھپا دیا کیونکہ شاہی فوج اس کی سرحد کے قریب تک آپہنچی تھی لیکن شہنشاہ نے ازراہ عنایت اس کا نذرانہ قبول کر لیا۔

بہادر شاہ اجمیر کے قریب پہنچا تو اسے اجیت سنگھ کی طرف سے صلح کے پیغامات وصول ہوئے لیکن یہ پیغامات قبول نہ کئے جا سکے۔ دریں اثنا جودھ پور کا نامزد فوجدار محراب خاں مراتھا کے قریب پہنچ گیا اور اجیت سنگھ کی زیر کمان ایک فوج کو شکست دے کر وہ شہر پر قابض ہوگیا۔

اب درگا داس اور اجیت سنگھ کو دربار میں حاضر ہونے کے فرمان بھیجے گئے۔ اجیت سنگھ نے جواب میں معافی کی درخواست کی لیکن شہنشاہ کے ارادوں کے بارے میں اپنے شکوک کا اظہار بھی کیا۔ چنانچہ منعم خاں کے صاحبزادے خان زمان کو واجہ بدھ سنگھ ہاڑا اور نجابت خان کی معیت میں اجیت سنگھ سے ملنے اور اس کی تسلی کیلئے روانہ کیا گیا۔ 24 فروری کو اجیت سنگھ نے قانونی طور پر مراتھا کے مقام پر خود کو شہنشاہ کے حوالے کر دیا۔ اس کا عزت کے ساتھ استقبال کیا گیا اور اس کو قدیم تین ہزاری اور ساڑھے تین ہزاری منصب پر بحال کر دیا گیا۔ جس پر وہ پہلے

... تھا اور مہاراجہ کے خطاب سے بھی سرفراز کیا گیا اور اس کے علاوہ اور بہت سے تحائف سے بھی نوازا گیا اس کے دو بیٹوں کو اعلیٰ عہدے پر مقرر کیا گیا۔ اسی کے ساتھ قاضی خاں اور محمد ...ث مفتی کو جودھ پور میں دوبارہ اسلام کو مضبوط کرنے کیلئے روانہ کیا گیا۔

(بحوالہ عبرت نامہ از مرزا محمد۔ خافی خاں صفحہ 716, 676)

کچھ جدید مورخین نے کہا ہے کہ محراب خاں کو چوری سے جودھ پور پر قابض ہونے کیلئے بھیجا گیا تھا اور جب اجیت کو اس کا علم ہوا تو وہ غصہ کی آگ سے جل اٹھا لیکن خافی خاں واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ اجیت سنگھ عاجزی کے ساتھ خود اس پر راضی ہو گیا تھا کہ خان زماں اور قاضی القضات قاضی خاں اس غرض سے جودھ پور آئیں کہ دوبارہ مساجد تعمیر کریں۔ مندروں کا انہدام کریں۔ اذان کیلئے احکام شرعی نافذ کریں اور گاؤ کشی کو بحال کریں اور منصفوں اور جزیہ جمع کرنے والے حاکموں کا تقرر کریں چنانچہ اجیت سنگھ کی یہ درخواست قبول ہوئی اور اس کی خطاؤں کو درگزر کیا گیا اور قاضی' مفتی' موذن اور امام وغیرہ سب اہلکاروں کو جودھ پور اور قرب و جوار کی آبادیوں میں مقرر کیا گیا۔

(سیر المتاخرین' صفحہ 386' خافی خاں' صفحہ 689)

سلطنت کی مستند ترین تاریخ کے مطابق اجیت سنگھ نے متعدد بار جودھ پور کی بحالی کیلئے درخواست پیش کی لیکن چونکہ وہ اپنے دل میں بغاوت اور نقص امن کے ارادے چھپائے ہوئے تھا اس لئے شہنشاہ نے جس پر سب کچھ روشن تھا اس کی درخواست نامنظور کر دی۔

(خافی خاں' صفحہ 689)

راجپوتوں پر عدم اعتماد کی بنا پر اور شاہی رعب اور دبدبے کو ان پر قائم رکھنے کیلئے بہادر شاہ نے جودھ پور پر اپنا تسلط رکھنا مناسب سمجھا۔ وہاں پر جزیہ بھی عائد کر دیا گیا۔

(ارادت خاں' صفحہ 95)

نیز اجیت سنگھ اور جے سنگھ کو شاہی کیمپ میں نیم نظر بندی کی حالت میں رکھا گیا اور شہنشاہ خود کام بخش کی سرکوبی کیلئے دکن کی طرف روانہ ہو گیا۔ ادھر 30 اپریل 1708ء کو دونوں راجاؤں نے شاہی کیمپ سے راہ فرار اختیار کی لیکن اس وقت شہنشاہ کام بخش والی مہم کو نسبتاً زیادہ اہم سمجھتا تھا اور اس لئے اس نے فرار شدہ راجاؤں کا تعاقب کرنے کا حکم جاری نہیں کیا۔ نظر بندی سے فرار ہو کر جے سنگھ اور اجیت سنگھ اودے پور پہنچے جہاں پر انہوں نے مہارانا کے ساتھ مغلوں کے خلاف متحد ہو کر لڑنے کیلئے ایک محاذ بنانے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ مغلوں کے اثرات کو راجپوتانہ سے بالکل ختم کر دیا جائے بلکہ وہ پورے ہندوستان کو اپنے زیر اثر لے آنے کا خواب دیکھنے لگے۔

محاذ بندی کے مشورہ کے بعد اجے سنگھ نے جودھ پور پر حملہ کیا اور اس پر اپنا قبضہ جما لیا اور جے سنگھ نے امیر کو دوبارہ حاصل کر لیا۔ بعد ازاں انہوں نے ہنڈوان اور بیانہ کی مغل چوکیوں پر بھی لشکر کشی کی۔ جب شہنشاہ کو اس بغاوت کا علم ہوا اس نے اسد خاں وکیل مطلق کو

دہلی سے آگرہ روانہ ہونے کا حکم دیا اور متعدد سپہ سالاروں اور فوجی سرداروں کو اس کی معاونت کا حکم دیا گیا ان سالاروں اور سرداروں میں چین قلیچ خاں' خاں دوراں صوبہ دار اودھ' خان جہان صوبہ دار الہ آباد اور محمد امین خاں فوجدار مراد آباد شامل تھے لیکن ان امراء نے کوئی جنبش نہ کی ان کی بجائے اسد خاں اور ذوالفقار خاں نے جو بظاہر منعم خاں کی راجپوت پالیسی سے متفق نہ تھے جے سنگھ اور اجیت سنگھ سے گفت و شنید شروع کی۔

(خافی خاں صفحہ 386 کے مطابق یہ دور گانے بجانے والوں' بھانڈوں اور رقاصاؤں کیلئے عیش عشرت سے پر تھا۔ ان فنکاروں نے آخر سلطنت کو ڈبو دیا۔)

ادھر 1708ء کا برسات کا موسم ختم ہوا۔ راجپوت فوجوں نے اجمیر کے نواح پر لشکر کشی شروع کی اور گیارہ روز تک شہر کا محاصرہ کئے رہے۔ یہاں تک کہ صوبہ دار سید شجاعت خاں بارہ نے ان کو پسپا کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے سامبر پر حملہ کیا۔ ایک لڑائی کے حادثہ میں مشہور سردار سید حسین خاں کام آیا اور اس طرح راجپوتوں کو ایک شاندار فتح نصیب ہوئی لیکن اس کے علاوہ انہیں کہیں اور کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور محض لوٹ مار پر ہی قانع رہے۔

4 اکتوبر 1708ء کو راجپوت راجاؤں کو ان کے منصب پر بحال کر دیا گیا اور یہ اسد خاں اور شہزادہ عظیم الشان کے مشورے سے ہوا۔ جو اس وقت باپ کا بڑا چہیتا تھا۔ اسد خاں نے جو کہ لاہور' دہلی اور اجمیر کے صوبوں کا مختار کل تھا راجاؤں کو ان کے وطن مالوف کی سندیں دینا طے کیں۔ بشرطیکہ وہ اپنے تھانے سامتھرا اور دیدوانہ سے ہاتھ اٹھائیں اور کابل اور گجرات میں تقرر کئے جانے پر راضی ہوں لیکن راجے اب ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کو تیار نہ تھے نہ اپنے گھروں سے دور جا کر کوئی عہدہ لینے کو تیار تھے اور وہ مالوہ اور گجرات کی صوبے داری کا مطالبہ کرنے لگے۔

فروری 1709ء میں کام بخش کو شکست دینے کے بعد بہادر شاہ نے دوبارہ اپنی توجہ راجپوتانہ پر مرکوز کی۔ وہاں راجاؤں کو ان کے منصبوں پر بحال کئے جانے کے بعد اکتوبر 1708ء سے ایک ناقابل اعتبار جنگ بندی چل رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دربار میں ایک طاقتور گروہ راجپوتوں کے خلاف ایک سخت اور درشت پالیسی اپنانے کے حق میں تھا چنانچہ اجمیر میں غازی الدین فیروز جنگ کا تقرر ہوا اور اس کو حکم ہوا کہ فوری طور پر احمد آباد سے اپنے نئے منصب کو سنبھالنے کیلئے روانہ ہو جائے۔ ایک خبر یہ تھی کہ شہنشاہ راجپوتوں کو سزا دینے کی غرض سے اور انہیں سبق دینے کا تہیہ کئے ہوئے تھا۔ خائف ہو کر راجپوتوں نے اپنے پرانے ہمدردوں یعنی آصف خاں اور شہزادہ عظیم الشان سے بیچ میں پڑنے کی درخواست کی۔

(بحوالہ اخبارات 7 ستمبر 1712ء و عبرت نامہ از مرزا محمد)

اس لئے راجپوت راجاؤں سے بہت تیزی کے ساتھ ایک معاہدہ کیا گیا۔ ان کے آبائی علاقے انہیں واپس کر دیئے گئے اور ان کا مطالبہ بھی قبول کر لیا گیا کہ وہ شہنشاہ سے اس کی نقل

و حرکت کے درمیان (سر سواری یعنی دربار میں نہیں) ہی گفتگو کر سکیں گے اور وہاں تک شاہزادہ عظیم الشان ان کی رہنمائی کرے گا۔ یہ بھی طے پایا کہ شہنشاہ کے سامنے حاضری کے بعد انہیں چھ ماہ کی رخصت ملے گی اور اس کے بعد ان کا جہاں بھی تقرر کیا جائے گا وہ وہاں جا کر اپنے فرائض منصبی انجام دیں گے۔ 21 جون 1710ء کو جبکہ شہنشاہ سفر میں تھا اس کے حضور منعم خاں کے فرزند مہابت خاں نے دو راجاؤں کو پیش کیا۔ دستور کے مطابق آداب و تحائف پیش کرنے کے بعد انہیں چھ مہینے کی مہلت گھر واپس جانے کیلئے دی گئی۔

(بحوالہ اخبارات مورخہ 28 جون 1711ء)

بہادر شاہ بہت خواہشمند تھا کہ راجپوت سکھوں کے خلاف اس کی اعانت کر سکیں اور یہ بھی چاہتا تھا کہ مرہٹوں کے خلاف بھی کام آسکیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ پہلے کی طرح راجپوتوں کو اب بھی مغل سلطنت کا داہنا بازو بنائے رکھنے اور محافظ و معاون کی طرح قائم رکھنا چاہتا تھا لیکن ایسی پالیسی کی کامیابی کیلئے ایک فیاضانہ سلوک کی ضرورت تھی۔

بہادر شاہ کی حکومت کی باقی مدت میں بھی راجپوتوں کے معاملات ایک ہی حالت پر قائم رہے۔ منعم خاں راجپوت راجاؤں کی اس منگ کو قبول کرنے کو تیار نہ تھا کہ انہیں مالوہ اور گجرات کے صوبوں کا صوبے دار مقرر کیا جائے۔ اس نے ان کے بجائے انہیں کابل اور گجرات کی تقرری قبول کرنے کیلئے آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ عظیم الشان نے جو خود کو راجپوتوں کا دوست بنا کر پیش کرتا تھا ان سے مشرقی علاقوں کی تقرری کا وعدہ کیا اور عدم تقرری کی حالت میں وطن کو واپس جانے کی رخصت کا یقین بھی دلایا۔ بشرطیکہ وہ دربار میں حاضر ہوں لیکن راجپوت راجا ان تجویزوں میں سے کسی ایک کو بھی ماننے کیلئے تیار نہ تھے۔

دونوں راجہ دربار میں اپنے فرائض ادا کرنے کیلئے حاضر ہوئے۔ اس وقت تک منعم خاں فوت ہو چکا تھا اور تمام معاملات کا مرکز شاہزادہ عظیم الشان بنا ہوا تھا۔ راجاؤں کا تقرر سادھورا کیلئے کیا گیا جہاں انہوں نے ایک بڑی فوج کے ساتھ اپنے فرائض منصبی ادا کئے اور پہاڑ کے دامن کو بندہ بیراگی والے گروہ کے حملوں سے محفوظ رکھا۔

ڈھائی مہینے کے بعد جے سنگھ کو احمد آباد رکھورا عرف چترکوٹ کا فوجدار مقرر کیا گیا اور اجیت سنگھ کو گجرات کے سواراٹھ کا۔ یہ تقرریاں راجپوتوں کی توقعات سے کہیں کم تھیں اس لئے انہیں وطن لوٹ جانے کی درخواست پیش کی۔ اپنے وعدہ کے مطابق شہنشاہ نے اس سے اتفاق کیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنے پیچھے ایک چوکی چھوڑتے جائیں اور جنوری 1712ء میں یہ دونوں راجے وطن کیلئے روانہ ہوئے اور اس طرح بہادر شاہ کی راجپوت پالیسی میں ایک ارتقائی تبدیلی رونما ہوئی۔

(خافی خاں' صفحہ 716,700)

بہادر شاہ اور دکن کا مسئلہ : دکن کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ تھا جس کا مغلوں کو سترہویں صدی کے آغاز سے سامنا کرنا پڑا۔

(1) پہلے تو مغربی ساحل پر وہ علاقہ جہاں مرہٹی زبان بولی جاتی تھی اور جہاں شیوا جی نے آزادی حاصل کرنے کی تحریک چلائی تھی۔

(2) دوسرے میسور تک دکھنی پہاڑ کا مسئلہ ایک زرخیز اور نہایت ہی فائدہ رساں علاقہ۔

مغل حکمران ایک عرصہ سے اس علاقہ کی دولت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے جس کیلئے کوشش تقریباً 1776ء میں شروع ہوئی۔ شیوا جی کے وقت سے مرہٹہ لوگ اس علاقے سے چوتھ وغیرہ وصول کر رہے تھے جو ان کی تمام مالگزاری کا 35 فیصد ہوتی تھی۔

بہادر شاہ کی تخت نشینی کے وقت یہ مسئلہ اور بھی الجھ گیا تھا کیونکہ وہاں سلطنت کا ایک دعوے دار کام بخش موجود تھا۔ جس نے اپنا سکہ بھی رائج کر رکھا تھا اور جو اپنے نام کا خطبہ بھی پڑھواتا تھا اور اس نے اپنی آزادی اور خودمختاری کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ اورنگ زیب نے پٹھار پر چڑھائی کرکے وہاں کی خودمختار سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ ان علاقوں میں یکساں نظم و نسق قائم کرنے اور مرہٹوں کی بغاوت کو دبانے کیلئے اورنگ زیب نے اپنی عمر کے آخری چھبیس سال دکن ہی میں گزارے تھے۔ لیکن صرف محدود کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کی وفات کے بعد امراء جو پہلے ہی سے دکن میں اس طویل قیام سے دل شکستہ ہو چکے تھے کیونکہ وہ شمالی ہند سے سینکڑوں میل دور تھے جس کو کہ وہ اپنا اصلی وطن سمجھتے تھے کسی نئے حکمران کیلئے اتنا اثر قائم کر لینا آسان نہ تھا جو ان کو دکن میں مزید قیام کرنے پر مجبور کر سکتا۔ علاوہ ازیں دکن ہی میں مستقل توجہ مرکوز کئے رہنا شمالی ہند کیلئے نقصان رساں ہو سکتا تھا جبکہ مغل سلطنت شمالی ہندوستان کے وسائل کے بل بوتے پر قائم تھی۔

جاجو کی جنگ سے قبل بہادر شاہ نے ایک خط میں کام بخش کو حافظ احمد مفتی عرف معتبر خاں کے ذریعہ بھیجا ہمارے والد ماجد نے بیجاپور کا صوبہ تمہارے سپرد کیا تھا اب ہم تمہارے لئے بیجاپور اور حیدر آباد کے دو صوبے مع کل رعایا املاک و سازو سامان چھوڑتے ہیں اس شرط پر کہ سکے ہمارے نام سے ڈھلیں گے اور خطبہ بھی ہمارے نام ہی کا پڑھایا جائے گا۔ وہ خراج جو اب تک ان دونوں صوبوں کے صوبے دار پیش کرتے تھے اسے بھی ہم چھوڑتے ہیں۔ تمہارے لئے لازم ہے کہ عوام کے ساتھ انصاف کرو حکم عدولی کرنے والوں کو سزا بھی دو اور اس علاقے کے ظالموں اور لٹیروں کا قلع قمع کر دو لیکن کام بخش نے یہ تجویز مسترد کر دی۔

اگر کام بخش نے بیجاپور اور گولکنڈہ کے سبھی اہم قلعوں پر کوئی موثر قبضہ کر لیا ہوتا۔ اپنے امراء کا اعتماد اور تعاون حاصل کر لیا ہوتا اور مرہٹوں سے بھی اس کی کوئی مفاہمت ہو گئی ہوتی تو کام بخش یقیناً بہادر شاہ کیلئے ایک زبردست خطرہ بن سکتا تھا۔ کام بخش نے مرہٹوں سے گفت و شنید تو کی لیکن وہ کچھ زیادہ بار آور نہ ہو سکی۔

وہ ذوالفقار خاں کے نائب' داؤد خاں کی مخالفت کے سبب کرناٹک کو اپنے قابو میں نہ لاسکا۔ شمال میں نظر بیگ خاں نے جو گولکنڈہ کا فوجدار تھا اور جس کا بہادر شاہ سے گٹھ جوڑ تھا اس کی فرمانبرداری کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسرے بہت سے امراء نے بھی بہادر شاہ کے ساتھ خفیہ خط و کتابت کے ذریعہ اپنی خودمختاری دکھانے کی کوشش کی حالات اس بات سے اور بھی بگڑ گئے کہ کام بخش نے اپنی شک و شبہ کی عادت کی بنا پر اپنے میر بخشی اور نہایت معتمد سردار' تقرب خاں کی وفاداری کو بھی شک و شبہ کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس نے تقرب خاں کو قید کر دیا اور اس کو اور اس کے ہمنواؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ بقول نور الدین اس کے نتیجہ میں دو تین ہزار افراد بے روزگار ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جیسے ہی بہادر شاہ کے قدم نزدیک پہنچے ویسے ہی کام بخش کے امراء اور سرداروں نے اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا یہاں تک کہ کام بخش شکستہ دلوں کی ایک قلیل تعداد کے ساتھ رہ گیا۔ فرار ہونے کو اپنی شان کے خلاف جان کر اس نے جان کی بازی لگا کر مقابلہ کیا لیکن ناکام رہا اور 13 جنوری 1709ء کو میدان جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا۔

اس طرح وہ خانہ جنگی جس نے کہ ملک کے مختلف حصوں کو پچھلے دو سال سے ایک بحران میں ڈال رکھا تھا بہادر شاہ کی فتح کے ساتھ ختم ہوگئی اور بہادر شاہ ہندوستان کی وسیع تر سلطنت کا حکمران بن گیا۔ بہادر شاہ کی فتح نے ایک ہندوستان گیر سلطنت کے خیال کو تقویت پہنچائی اور ملک کی سیاسی سالمیت کا تصور ملک کا ایک بنیادی خیال بن گیا اور اسی نے ان تمام سیاسی تحریکوں کو ممکن بنایا جو ملک میں اٹھارہویں صدی میں رونما ہوئیں۔ مثلاً اس کا اظہار اس طرح بھی ہوا کہ مغل بادشاہ کو ہندوستان کا شہنشاہ تسلیم کیا جانے لگا۔ اس حالت میں بھی جبکہ اس کی ساری قوت اور شان و شوکت رخصت ہوچکی تھی۔

اس کے بعد بہادر شاہ کو دکن کے نظم و نسق کیلئے مناسب اقدام کرنے تھے۔ پہلے دکن کے چھ صوبوں کی نائب حکمرانی شہزادہ عظیم الشان کو پیش کی گئی لیکن عظیم الشان نے مشرقی صوبوں یعنی بنگال' بہار' اڑیسہ اور الہ آباد کی حکمرانی کو ترجیح دی کیونکہ ان میں سے چند پر وہ اورنگ زیب کے عہد میں نیابت کر چکا تھا اس لئے دکن کی نیابت ذوالفقار خاں کے سپرد ہوئی۔ اس کو دکن سے متعلق کل مالگزاری اور نظم و نسق کے سلسلے میں پوری آزادی دے دی گئی۔ اس کو دربار میں رہنے کی اجازت کے ساتھ ساتھ اپنی پچھلی میر بخشی کی ذمہ داری نبھانے کا شرف بخشا گیا۔ اس کے قدیم مصاحب اور پروردہ داؤد خاں پنی کو دکن میں اس کا نائب بنایا گیا اور اس کا سات ہزاری/ پانچ ہزاری منصب (پانچ ہزار دواسپہ) دیا گیا اور بیجاپور' برار اور اورنگ آباد کی گورنری بھی اس کو ملی اورنگ آباد کو اس کا صدر مقام مقرر کیا گیا۔

(بہادر شاہ نامہ از نعمت خاں عالی صفحہ 416)

میر بخشی اور دکن کا (غیر حاضر) نائب حکمراں بننے سے ذوالفقار خاں سلطنت کے اہم ترین امراء میں شمار ہونے لگا۔ اس سے قبل مغل بادشاہوں نے کبھی کسی ایک کو بیک وقت ایسے دو عظیم ترین منصب نہیں دیئے تھے۔ یہ نیا اقدام اور نئی جدت آئندہ کیلئے ایک خطرناک علامت بن گئی مزید برآں ذوالفقار دکن سے متعلق مال گزاری یا کسی دوسرے معاملے میں کوئی مداخلت برداشت کرنے کو تیار نہ تھا کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منعم خاں ذوالفقار خاں کو اس قدر وسیع اختیارات دیئے جانے کا مخالف تھا۔ اس نے یہ دلیل پیش کی کہ برہان پور (خاندیش) اور نصف برار جس کو بالعموم پائیں گھاٹ کہا جاتا تھا۔ دکن کا کوئی جزو نہ تھے کیونکہ خاندیش تو خودمختار فاروقی سلطنت کا ایک حصہ تھا اور پائیں گھاٹ کو اکبر نے تحویل میں لیا تھا۔ وہ ان صوبوں کو دہلی کے ماتحت صوبوں میں شامل کرنا چاہتا تھا اور ان صوبوں کے سیاسی و مالی معاملات اور تقرر علیحدگی اور منتقلی اہلکاران کا اختیار وہ اپنے سب سے بڑے فرزند مہابت خاں کو دلانا چاہتا تھا جو تیسرے میر بخشی کے عہدے پر فائز تھا۔ اس سے منعم خاں اور ذوالفقار خاں میں مزید تلخی بڑھ گئی چونکہ بہادر شاہ امراء کے درمیان تنازعوں میں فیصلہ دینا ناپسند کرتا تھا اس لئے جو حالات جیسے ہوتے ویسے ہی چلتے رہا کرتے تھے۔

(خافی خاں' جلد 2' صفحہ 684)

چنانچہ دکن پر ذوالفقار خاں ہی نائب حکمراں رہا اور وہاں کے معاملات کیلئے وہی تنہا صاحب اختیار بھی رہا۔ ذوالفقار خاں کے اختیارات اور اس کے اثرات دکھانے کیلئے ایک مثال ہی کافی ہے۔ اس کی وکالت اور پشت پناہی کی بنا پر نیماجی سندھیا کو جو ان علاقوں کا با اثر ترین سردار تھا سات ہزاری/پانچ ہزاری منصب دیا گیا اور اس کے بیٹے اور پوتوں کو جو منصب دیئے گئے ان کا حساب سب ملا کر چالیس ہزار ذات اور پچیس ہزار سوار تک پہنچتا ہے۔ اورنگ آباد کے آباد علاقوں کے بہت سے پرگنے اس کو منتقل کر دیئے گئے اور وہاں سے ایک ہزار سے زائد چھوٹے بڑے منصب داروں کو علیحدہ کیا گیا۔ سخت مخالفت اور شور و شر کے باوجود ذوالفقار خاں کے ان اقدامات کو بدلا نہ جا سکا۔

اگرچہ دکن کے نائب حکمران کو وسیع اختیارات دینا ایک انتظامی ضرورت تھی لیکن مرکزی حکومت کی کمزوری کے پس منظر میں اور دکن میں خودمختارانہ رجحانات کی موجودگی کے پیش نظر اس سے بڑے امراء کے دلوں میں لالچ کی آگ بھڑک اٹھی جو دکن پر دانت لگائے بیٹھے تھے۔ وزارت اور میر بخشی کے منصبوں کے ساتھ دکن کی نائب حکمرانی کا منصب بھی دربار کے سیاسی گروہوں کی کشمکش کا مرکز بن گیا۔ نئے نائب حکمران کے اختیارات اور اثرات کی آزمائش اس میں تھی کہ وہ مرہٹوں کے مسئلہ کو اپنے پسندیدہ طریقہ سے طے کر سکے لیکن اس مقام پر آکر اس کی خودمختاری ایک دشواری کے نرغے میں آتی دکھائی دی۔ کام بخش کی شکست کے بعد

ذوالفقار خاں نے شاہو کے وکیل سے شہنشاہ کو روشناس کرایا۔ اس نے ایک عرضی پیش کی جس کا مقصد دکن کے چوتھ اور سردیش مکھی کی مالگزاری کو جو دکن کے چھ صوبوں سے حاصل ہوتی تھی طلب کرنا تھا اور اس نے تباہ شدہ علاقوں کی خوشحالی کو بحال کرنے کی شرط بھی لگائی تھی۔ اس مسئلہ پر دونوں وزیروں میں سخت تنازعہ شروع ہوا بالآخر بہادر شاہ نے جو ان میں سے کسی ایک کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا حکم دیا کہ منعم خاں اور ذوالفقار خاں کی درخواستوں کے پیش نظر سردیش مکھی کی سندیں دے دی جائیں۔ گویا اس نے شاہو کو مرہٹہ حکمران تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جیسا کہ اورنگ زیب نے بھی کیا تھا۔ اس نے چوتھ کے مطالبے کو بھی مسترد کر دیا صرف دیش مکھی کی اجازت دی گئی اور اس کیلئے بھی مقابل دعویداروں کو جھگڑنے کیلئے چھوڑ دیا گیا۔ پس جیسے ہی بہادر شاہ نے دکن سے قدم نکالا شاہو رائے گڑھ سے باہر آگیا اور اس نے اپنے سرداروں کو یہ حکم جاری کر دیا کہ شہنشاہ نے مجھ کو ان علاقوں کے سردیش مکھی کی اجازت دے دی ہے لیکن چوتھ کی اجازت ابھی نہیں ملی ہے۔ اس لئے تم شاہی سرحدوں پر حملے کرو اور بدامنی پھیلاؤ تاوقتیکہ وہ ایسا کرنے پر راضی ہو جائے۔

مرہٹہ پالیسی : ظاہر ہے کہ بہادر شاہ کی مرہٹہ پالیسی کم نظری اور خام خیال پر مبنی تھی۔ ذوالفقار خاں کے مشورے کو ٹھکرا کر اس نے مرہٹوں کے ساتھ مفاہمت کا سنہری موقع ہاتھ سے کھو دیا۔ اس وقت مرہٹوں کی طاقت بہت ہی گھٹ چکی تھی۔ وطن میں شاہو کی حالت متزلزل تھی اور اگر بہادر شاہ اس کو تسلیم کر لیتا تو اسے ضرور شاہو کی دوستی حاصل ہو جاتی اور شاہو اس کا احسان مند بھی ہوتا۔ علاوہ ازیں شاہو کی جانشینی کو اورنگ زیب نے بھی ہمیشہ تسلیم کیا تھا اور تخت پر بیٹھنے کے بعد خود بہادر شاہ نے ایک طرح شاہو کے حق کو تسلیم کر لیا تھا کیونکہ اس نے اس کو پچھلے منصب پر بحال کر دیا تھا اور تخت نشینی کی مبارکباد کے بدلے میں اس کو شاہی فرمان اور تحفے تحائف بھی بھیجے تھے اور اس سے کام بخش کے خلاف فوجی تعاون کیلئے بھی حکم دیا تھا۔

ذوالفقار خاں جو وسیع تجربہ کا مالک تھا اور مرہٹوں کے کردار اور ان کی سیاست سے بھی واقف تھا۔ اب واضح طور پر محسوس کرتا تھا کہ دکن کی پالیسی میں دوررس اور زبردست تبدیلیاں لانے کا مناسب وقت آچکا تھا اور اس پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ مرہٹوں کو بجائے مخالفین کے سلطنت کا حصہ دار بنایا جائے اور عسکری اور انتظامی خصوصیات سے فائدہ اٹھایا جائے تاکہ ان کو دکن کی خوشحالی اور خوش انتظامی کی ذمہ داری دے کر وہاں مستحکم امن و امان کی صورت پیدا کی جائے۔

دکن سے بہادر شاہ کی روانگی کے فوراً بعد صوبہ برہان پور' بیجاپور اور اورنگ آباد میں مرہٹوں کی ریشہ دوانیوں کی خبر پہنچی۔ 1710ء میں صوبہ بیجاپور میں مرہٹوں کا ایک زبردست گروہ

داخل ہوگیا اور احمد نگر کی طرف رخ کیا۔ رستم خاں بیجاپوری جو آٹھ ہزاری/ آٹھ ہزاری کا منصب دار تھا اور صوبہ دار بھی تھا ان کی برف بڑھا لیکن انہوں نے جنگ سے احتراز کیا۔ جب یہ خبر بہادر شاہ کو ملی اس نے اپنی ناراضی کی علامت میں رستم خاں کا منصب ایک ہزاری کے حساب سے کم کر دیا لیکن جلد ہی وہ موم ہوگیا اور اب خان کو پچھلے منصب کے علاوہ ہزار کا منصب بھی دے دیا اسی اثنا میں مرہٹوں کا ایک دوسرا جتھا برہان پور پر حملہ آور ہوا اور پایہ تخت کے قرب و جوار تک کو لوٹ لیا۔ صوبہ دار میر امین خان جنگ کرنے کیلئے نکل آیا لیکن وہ چاروں طرف سے مرہٹوں سے گھر گیا۔ خان نے زبردست جنگ لڑی لیکن وہ اسی لڑائی میں کام آگیا اور اس کے دو بیٹے زخمی ہوگئے۔ مرہٹوں کا ایک دوسرا گروہ اورنگ آباد کے قریب ظاہر ہوا اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں لوٹ مار کی۔ نائب حکمران کے نائب داؤد خاں پنی نے ان کے خلاف لشکر کشی کی لیکن مرہٹوں نے جنگ کرنے سے پرہیز کیا اور فرار ہوگئے۔ اب بارش کا موسم قریب آنے لگا تھا۔

برسات کے بعد مرہٹے پھر پوری طاقت کے ساتھ آگئے۔ چندر سین جادھو نے وجیا واگ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور پھر گلبرگہ کی طرف چلا۔ ہیبت راؤ نے سوما جگن ناتھ وغیرہ کی اعانت سے بیجاپور پر حملہ کیا لیکن داؤد خاں کے نائب میر امان نے اسے صوبے سے باہر نکال دیا۔ گنگا نے جو فیروز جنگ کا ایک برخاست کیا ہوا سردار تھا مالوہ اور برہان پور میں بدامنی پھیلائی شاہو کی ہدایت کے ماتحت مرہٹوں کے چالیس ہزار کے ایک جتھے نے جنید کے علاقے پر حملہ بولا اور ذوالفقار خاں کی جاگیر میں لوٹ مار مچائی۔ مغل ان حملوں کو روکنے سے بے بس تھے اگرچہ داؤد خاں پنی ایک بڑی فوج کی ہمراہی میں مرہٹوں کا تعاقب کر رہا تھا اس نے رستم خاں کے ہاتھ لے کر خود باگ ڈور سنبھالی کیونکہ رستم خاں کئی بار ناکامیاب ہوچکا تھا۔ اس نے خاندیش سے سانتا گھورا پاڑے کو پسپائی پر مجبور کیا اور اس کے دفاع کا اچھا انتظام کیا اور اپنے بھتیجے علاوں خاں کو برار کی حفاظت کیلئے بھیجا۔ اس نے اپنی حکمت علی سے مرہٹوں میں بدامنی پھیلانے کی کوشش بھی کی غالباً انہی دنوں داؤد خاں نے شاہو سے سازباز کی اور دکن کی چوتھ اور سردیش مکھی شاہو کو دینے کی حامی بھری لیکن اسے مرہٹہ اہلکار نہیں وصول کر سکتے تھے بلکہ داؤد خان کا نائب اس کو جمع کرکے ایک بندھی رقم کی شکل میں مرہٹوں کو دیتا تھا۔ شہزادوں اور امراء کی جاگیریں ہر مالگزاری سے مستثنیٰ تھیں۔ مرہٹوں کو اس معاہدہ کی کوئی تحریری توثیق نہیں دی گئی تھی۔

(دارد صفحہ 247-248)

یہ معاہدہ شاہور کے لئے ایک آسمانی تحفہ تھا کیونکہ اس سے مرہٹوں کی نظر میں اس کا وقار ایک ایسے وقت میں بڑھ گیا جبکہ وہ زوال پذیر تھا لیکن بدقسمت دکن کو اس پر بھی چین نصیب نہ ہوا۔ اس معاہدہ سے لاتعداد تنازعے اور اختلافات پیدا ہوئے اور مرہٹوں کے ہاتھ ہر

طرف بڑھنے لگے۔ ان کے اہلکار قدیم دستور کے مطابق ہر جگہ چوتھ وصول کرنے آموجود ہوتے۔ دسمبر 1711ء میں برہان پور کا صوبہ دار میر احمد خاں ایک ایسے دستہ سے لڑتا ہوا مارا گیا جس کی سربراہی تلسی بائی رام کی ایک خاتون کر رہی تھی۔ مرہٹوں نے کرناٹک کے متعدد مقامات مثلاً کونول' شولاپور' بیری نگر اور بہت سے دوسرے علاقوں کا محاصرہ کیا۔ مرہٹوں کی ریشہ دوانیوں سے زمیندار کو موقع مل گیا اور وہ ہر جگہ سر اٹھانے لگے اور کرناٹک میں مغلوں کے اختیارات محض برائے نام رہ گئے۔

داؤد خاں کا معاہدہ اورنگ زیب کی پالیسی سے ایک زبردست گریز تھا۔ اس سے مغل سلطنت کو وہ فوائد حاصل نہیں ہوئے جن کی توقع کی جا سکتی تھی لیکن دکن میں امن و امان اور مرہٹوں سے دوستانہ تعلقات کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ مرہٹہ حکمران کا مرہٹہ سرداروں پر اقتدار ختم ہوچکا تھا اور ان میں سے زیادہ تر برائے نام اس کے ماتحت تھے اور اپنی خواہش سے خود ہی لوٹ مار کرتے پھرتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں اورنگ زیب کے ہاتھوں جو مرہٹہ حکومت تباہ ہو چکی تھی اس سے جو لاقانونیت پھیل گئی تھی وہ با آسانی یا تھوڑے عرصہ میں قابو میں نہیں لائی جا سکتی تھی۔ البتہ مغل حکمران اور مرہٹہ حکمران کی باہمی مفاہمت سے ہی دوبارہ لٹیرے مرہٹوں پر قابو حاصل کیا جا سکتا تھا لیکن ایسے معاہدہ کی واضح تحریر سے مغل بوجوہ گریزاں تھے۔

سکھوں کی بغاوت اور بہادر شاہ کا زمانہ

4 مئی 1710ء جبکہ شہنشاہ نربدا کے قریب فروکش تھا لاہور کے دیوان نے خبر بھیجی کہ ایک شخص گرو گووند کی رہبری میں لاہور کے قرب و جوار میں اور سرہند میں سکھوں نے شورش برپا کر دی تھی۔ شہنشاہ نے متعدد فوجداروں کو مناسب اقدامات کرنے کا حکم دیا لیکن یہ شورش تیزی سے پھیلتی گئی اور 22 مئی 1710ء کو سرہند کا فوجدار وزیر خان شکست کھا کر مارا گیا اور شہر تاراج کرکے زیر و زبر کر دیا گیا۔

جب بہادر شاہ لاہور سے چلا کہ اعظم کے خلاف تخت نشینی کے لئے طاقت آزمائی کرے۔ گرو گووند نے چند ہمنواؤں کی معیت میں بہادر شاہ کا ساتھ دیا تھا جس کیلئے انہیں منصب بھی بخشا گیا تھا۔ گرو جاجو کی جنگ میں بھی شامل تھا اور بعد ازا وہ بہادر شاہ کے ساتھ راجپوتانے اور دکن بھی پہنچا۔ دسمبر 1708ء میں خبر ملی کہ گرو کی وفات ہوگئی اور وہ کافی جاگیر چھوڑ گئے جس پر بہادر شاہ نے قبضہ نہ کیا۔ پنجاب میں بظاہر امن و سکون قائم رہا یہاں تک کہ ڈیڑھ سال بعد سکھوں کی شورش دوبارہ رونما ہوئی۔ بندہ بیراگی نے سات آٹھ ہزار آدمیوں کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کر لیا اور شروع میں تو اس کے پاس چار پانچ ہزار سوار تھے لیکن جلد ہی اس نے اپنی طاقت بڑھا کر سترہ ہزار اور پھر چالیس ہزار مسلح سپاہیوں تک کا اضافہ کر لیا۔ سونی پت اور سرہند کے فوجدار اور دوسرے بہت سے سردار کھلی جنگ میں شکست کا منہ دیکھ چکے تھے۔ سکھوں نے سلطان پور اور سارن پور کی بستیوں کو محاصرہ میں لے لیا تھا اور لاہور کے قرب و جوار سے لے کر دہلی کے قریب تک کے اتنے بڑے علاقے پر تسلط جما لیا تھا کہ وہاں سے دہلی پہنچنا چند ہی دنوں کا کام تھا۔ اس علاقے میں سکھوں نے اپنا نظام حکومت قائم کر لیا تھا۔ انہوں نے مالگزاری کی وصولیابی کیلئے تھانیداروں اور تحصیل داروں کو مقرر کیا تھا وہ جن جن بستیوں کو پامال کرتے گئے وہاں اپنے فوجداروں کو چھوڑتے گئے۔ یہ سردار عموماً پست اقوام میں سے منتخب کیے جاتے تھے۔ اگر کوئی بھنگی یا چمار گھربار چھوڑ کر گرو سے جا ملتا تو تھوڑے ہی عرصہ میں وہ پروانہ تقرری لے کر ہی گھر واپس آتا۔

ڈاکٹر ستیش چندر کا خیال ہے کہ سکھوں کی بغاوت دراصل پست اقوام کی بغاوت تھی۔ سکھ بھی مسلمانوں کی طرح اونچی ذات کے ہندوؤں کے ساتھ زیادتیاں کرتے تھے اور اس لئے اکثر مقامات پر مقامی ہندو زمیندار اور صاحب ثروت لوگ مغل حکومت ہی کا ساتھ دیتے تھے۔ سکھوں کے سامنے کوئی واضح سماجی اور سیاسی مقاصد نہ تھے۔ ان کے پاس ایک مضبوط بنیادی اقتصادی ڈھانچہ کی کمی تھی جس پر ایک نئے اور بلند سماج کی تعمیر کی جا سکتی تھی۔ سکھ زیادہ سے زیادہ جس معیار پر پہنچ سکتے تھے وہ ایک ایسے سماجی ڈھانچہ کی تعمیر تھی جس کی بنیاد کسانی یا دہقانی قبیلہ بندی پر قائم تھی۔ اس قسم کی کوشش کا بلند اقوام کی طرف سے سدباب ہونا لازمی

تھا۔ اگر تیزی سے کسانوں کی کثیر سے کثیر تعداد کو آمادہ پیکار کیا جا سکتا تو یہ کوشش بھی کامیاب ہو سکتی تھی لیکن سکھوں کی تحریک کی مذہبی بنیاد اس کے قابل قبول ہونے میں ایک رکاوٹ ثابت ہوئی جس سے تحریک کا تیزی کے ساتھ ترقی کرنا دشوار ہوگیا۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شہنشاہی حکومت اپنی ابتدائی غفلت سے جاگ اٹھی۔ اسد خاں کو گرو کے خلاف مہم پر جانے کا حکم ہوا۔ چن قلیچ خان' محمد امین خان' خان جہاں صوبہ دار الہ آباد' سید عبداللہ خاں اور متعدد دیگر سرداروں کو اس سے تعاون کرنے کا حکم ملا اور ان لوگوں کو اپنی تیاری مکمل کرنے کے لئے مناسب پیشگی رقوم دی گئیں۔ اواخر جون میں شہنشاہ اجمیر سے روانہ ہوا اور بہ نفس نفیس سکھوں کے خلاف مہم پر روانہ ہوا۔ لاہور اور دہلی کی اس سڑک کو صاف کرکے جو عرصہ سے بند چلی آرہی تھی بہادر شاہ نے ہمالیہ کی ترائی میں ساڈھورا کے مقام کو اپنا صدر مقام بنایا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سکھوں نے اپنی پناہ کیلئے متعدد قلعے تعمیر کر رکھے تھے۔ لوہ گڑھ پر جسے گرو گوبند سنگھ نے تعمیر کیا تھا اور جہاں خود وہ اور ان کے بعد بندہ شاہی شان شوکت سے رہتے تھے۔ دسمبر 1710ء میں چڑھائی کی گئی لیکن خاص شکار یعنی بندہ بیراگی بھاگ نکلا۔ بہادر شاہ نے وزیراعظم منعم خاں کی اس کی اس لاپرواہی پر جس کے سبب بندہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا سخت باز پرس کی کچھ مورخین کا تو یہ بیان ہے کہ شہنشاہ کی شدید سخت کلامی ہی وزیر کی وفات کا باعث ہوئی۔

بندہ کے لوہ گڑھ سے فرار ہو جانے کے بعد بہادر شاہ لاہور لوٹ آیا اور شاہی افواج نے بندہ کے خلاف مہم کو جاری رکھا۔ اس کے بعد کبھی کبھی جنگ ہو جاتی تھی۔ شاہی سپہ سالار رستم دل اور محمد امین خاں کو گرو کے تعاقب میں اس لئے کامیابی نہ ہوتی تھی کہ اس نے گوریلا جنگ کے طریقے اپنا رکھے تھے اور اب وہ شاہی فوجوں کے مقابلے میں جنگ کرنے کے حق میں نہ تھا چنانچہ اس نے جالندھر پر حملہ کیا تو مغل سپہ سالار خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے اور مقامی سکھوں اور ان کے ہمنواؤں کو باقی ماندہ مغل سپاہ کو موت کے گھاٹ اتارنے اور بٹالہ اور کلانور اور اردگرد کے دیہات میں اپنی فوجی چوکیاں قائم کرنے کا موقع مل گیا۔ شہنشاہ کی موجودگی کے باوجود گرو کے خلاف لشکر کشی کچھ زیادہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کا ایک سبب دونوں مغل سپہ سالاروں کے درمیان باہمی حسد اور تنازعہ تھے۔ جن کے نتیجہ میں ستمبر 1711ء میں رستم دل کی اہانت اور نظربندی ہوئی۔ جنوری 1712ء میں جب شہنشاہ کی وفات ہوگئی محمد امین نے لاہور کی خانہ جنگی میں حصہ لینے کیلئے اپنا عہدہ چھوڑ دیا اور گرو نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر لوہ گڑھ اور ساڈھورا پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

سکھ تحریک نے ایک آزاد سکھ حکومت کے قیام کی تحریک کی شکل اختیار کر لی اگر یہ تحریک کامیاب ہو جاتی تو اس قسم کی دوسری تحریکیں دوسری جگہوں میں بھی معرض وجود میں آتیں اٹھارہویں صدی کی سیاسی تصویر کا رخ بھی بدل سکتی تھیں۔

منعم خاں کی وفات اور وزارت کیلئے کشمکش کا آغاز

ذوالفقار خاں منعم خاں کو غاصب سمجھتا تھا چنانچہ وہ منصب وزارت کو اپنے خاندان کیلئے حاصل کرنے کیلئے کوشاں تھا۔ 28 فروری 1711ء کو منعم خاں ایک مختصر سی بیماری کے بعد وفات پا گیا اور وزارت کا مسئلہ پھر زور پکڑ گیا۔ اب ذوالفقار خاں کا یہ خیال پختہ تر ہوگیا کہ صرف وہ خود ہی اس منصب کا حق دار تھا۔ شروع شروع میں تو شہزادہ عظیم الشان بھی جو اپنے باپ کے دربار میں بلند ترین اہمیت کا مالک تھا ذوالفقار خاں کا حامی تھا۔ وہ اور سعد اللہ خاں دیوان و تن خالصہ نے یہ تجویز پیش کی کہ ذوالفقار خاں کو وزارت پر فائز کیا جائے اور منعم خاں کے صاحبزادگان یعنی مہابت خاں اور خان زمان کو علی الترتیب میر بخشی اور دکن کا نائب حکمران مقرر کر دیا جائے۔ اس طرح عظیم الشان' ذوالفقار خاں کو اپنا دست راست بنانا چاہتا تھا نیز منعم خاں کے بیٹوں کو بھی خوش رکھنا چاہتا تھا کیونکہ وہ کچھ دنوں سے اس کے قریب ترین دوست ہوگئے تھے لیکن اس تجویز کی ذوالفقار خاں اور خود شہنشاہ نے مخالفت کی۔ ذوالفقار خاں میر بخشی اور دکن کی نائب حکمرانی کے منصب سے دستبردار نہ ہونا چاہتا تھا چنانچہ اس نے وزارت تو اپنے والد محترم کیلئے طلب کی اور خود کو میر بخشی اور دکن کی نائب حکمرانی کے منصب پر برقرار رکھنے کا مطالبہ کیا۔ بہادر شاہ کو یہ اعتراض تھا کہ منعم خاں کے بیٹے ان منصبوں کیلئے غیر موزوں تھے۔ جہاں تک ذوالفقار خاں کے مطالبہ کا سوال تھا تو اس بات کی کوئی نظیر موجود نہ تھی کہ ایک ہی خاندان کے افراد کو بیک وقت تین ایسے عظیم منصب دیئے گئے ہوں یعنی وزارت' میر بخشی اور دکن کی نائب حکمرانی اور بہادر شاہ کا یہ خیال بھی صحیح تھا کہ ایسا کرنا خود شاہی خاندان کیلئے مضر ثابت ہوگا۔ عظیم الشان اس نظریئے سے متفق تھا چنانچہ ذوالفقار خاں کے مطالبوں کو رد کر دیا گیا اس کے بعد یہ تجویز کیا گیا کہ صفوی شہزادہ محمد ہاشم کو رسمی طور پر وزارت پر فائز کر دیا جائے اور بخشیوں میں سے کوئی ایک اس کے فرائض کو انجام دے لیکن شہزادہ کی رعونت اس راہ میں حائل ہوئی اور یہ تجویز بھی رد ہوگئی۔ انجام یہ ہوا کہ وزارت پر کسی کا تقرر نہ ہوسکا اور عارضی طور پر سعد اللہ خاں کو میر دیوان مقرر کیا گیا اور اس کو شہزادہ عظیم الشان کی نگرانی اور ماتحتی میں فرائض انجام دینے کا حکم دیا گیا۔

ذوالفقار خاں کا نظریہ حکومت : ذوالفقار خاں اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ اب طاقت مرکوز ہو کر کسی ایک شخص کے ہاتھ میں رہنی چاہیے۔ ذوالفقار خاں کو شاید اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ مغل حکومت کو تباہی سے صرف وہ شخص بچا سکتا ہے جس کو شاہی معاملات کا صحیح ادراک ہو جو مرہٹوں' راجپوتوں اور ہندوؤں کا اعتماد حاصل کر سکے اور اسی کے ساتھ جس کو پرانے امراء اور سرکردہ عہدہ داروں کا تعاون حاصل ہو۔ ذوالفقار خاں کی نظر میں ایسا انسان صرف وہ خود تھا۔ اس نظریہ سے اور بہت سے نتائج برآمد ہوئے۔ ان میں خاص یہ تھا

کہ وزیر کو تمام معاملات کا محور بنا دیا جائے اور وہ نہ صرف انتظامی معاملات اور اقتصادی معاملات کا مختار کل ہو جو کہ اس کے خاص میدان عمل تھے' بلکہ فوجی معاملات بھی جو کہ میر بخشی کے زیر انتظام رہے تھے اسی کے زیر اختیار ہوں۔ وزیر کو دولت مند صوبوں پر بھی اختیارات دیئے جائیں کیونکہ اس کے بغیر وہ امراء کے کسی ایک طبقے کی طرف سے پیش آنے والے اختلافات کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ اس طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ذوالفقار خاں کی خواہشات لازمی طور پر مجرمانہ یا باغیانہ نہ تھیں بلکہ ذوالفقار خاں کا نظریہ وزارت ہندوستان میں مغلوں کی قائم کردہ روایات سے مختلف تھا۔ گویا یہ ایک بنیادی اختلاف تھا اس اختلاف سے وزیر اور حکومت کے درمیان نیز وزیر اور امراء کے درمیان ایک کشمکش اور طاقت آزمائی کا امکان ظہور پذیر ہونے لگا۔ اس طرح منعم خاں کی وفات سے دربار کی سیاسی طاقت آزمائی نئے دائروں میں داخل ہوگئی جس سے نئی تبدیلیاں وجود میں آئیں۔

طرز حکومت اور انتظام سلطنت بعہد بہادر شاہ : ستیش چندر لکھتا ہے کہ بہادر شاہ کے عہد میں اورنگ زیب کی پالیسیوں سے انحراف کا آغاز ہوا۔ اس انحراف کا اظہار مرہٹوں کے ساتھ تعلقات میں زیادہ اور راجپوتوں کے ساتھ تعلقات میں کچھ کم ہوا لیکن سکھوں کے سلسلے میں کچھ خاص وجوہات کے تحت جبر و تشدد کی قدیم پالیسی کچھ مزید شدت کے ساتھ جاری رکھی گئی۔ ہندو رعایا کے ساتھ شہنشاہ کے تعلقات میں اور مذہبی معاملات میں بھی اورنگ زیب کی پالیسیوں سے ایک محتاط گریز دیکھنے میں آتا ہے چنانچہ شاہی دربار میں شراب نوشی اور رقص و سرود پر پابندی جاری رہی۔ اگرچہ بہادر شاہ اپنے باپ کی پالیسی اور نظریات کو اپنانے سے کوسوں دور تھا۔ تاہم اس کے حکم سے جمعہ کے خطبہ میں حضرت علی ؓ کیلئے لفظ وصی کے اضافہ پر زبردست فتنہ و فساد برپا ہوا اور اپنی اس کوشش سے اسے دستبردار ہونا پڑا لیکن اس کے نتیجہ میں شہنشاہ اور عوام کے درمیان ایک بعد پیدا ہوگیا۔

جہاں تک ہندوؤں کے ساتھ بہادر شاہ کے برتاؤ کا سوال ہے نہ تو مندروں کے انہدام کے واقعات سننے میں آتے ہیں نہ جبراً تبدیل مذہب کے واقعات لیکن ہندوؤں کے لئے پالکیوں کے اور عربی عراقی گھوڑوں کے رتھوں اور ہاتھیوں کے استعمال پر پابندی بحال رکھی ان کو حکم تھا کہ کانوں میں موتی وغیرہ نہ پہنیں اور داڑھیاں کتروائیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے حکم دیا کہ صوبوں میں ہندوؤں کا تقرر خبر رسانوں کے طور پر نہ کیا جائے۔ اس طرح سیاسی تنازعات اور دوسرے محرکات کے پیدا کردہ ہندوؤں کے عدم اعتماد کا خاتمہ نہ ہوپایا۔ تاہم ایک فیاضانہ اور امن پسندانہ پالیسی سے جو فوائد حاصل ہونے چاہئے تھے وہ انتظامیہ اور اقتصادی کمزوری کے سبب حاصل نہ ہوسکے۔ بہادر شاہ کو انتظامی معاملات سے دلچسپی بھی نہ تھی اور نہ اس کا رجحان ہی اس طرف تھا۔ خافی خاں کے بقول "حکومت کی حفاظت اور ملک کے انتظام کی طرف سے اس درجہ کوتاہی تھی کہ تیز فہم اور زیرک طبع لوگوں نے بہادر شاہ کی تخت نشینی کی تاریخ "شاہ بے خبر" کے الفاظ سے نکالی تھی۔ بہرحال بہادر شاہ کی انتظامی کوتاہی کو اس کے وزیر منعم خاں نے کسی حد

تک پورا کیا۔ ہدایت اللہ خاں (سعد اللہ خاں) دیوان تن اور خالصہ نے بھی بہت حد تک ان کمزوریوں کو دور کیا کیونکہ وہ لیاقت اور جفاکشی میں اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتا تھا۔

بے ضابطگیوں کا چلن

اقتصادی معاملات میں کمزوری آ جانا بہت خطرناک تھا۔ مغل حکومت کے روز اول سے ہی مغل حکمران منصب داروں کو بطور جاگیر زمینیں دینے کیلئے زمینوں کو حاصل کرنے کے مسائل سے دوچار تھے۔ یہ مسئلہ بڑھتے بڑھتے بہت نازک ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب کے عہد میں یہ معاملہ نہایت ہی خطرناک صورت اختیار کر گیا تھا۔ اورنگ زیب کے عہد میں حکومت کی توسیع سے بھی یہ مسئلہ حل نہ ہوا۔ اپنی تخت نشینی پر بہادر شاہ نے اندھا دھند جاگیریں اور ترقیاں دے کر اس مسئلہ کو اور نازک تر بنا لیا تھا۔ یہاں تک کہ بھیم سین کے بقول منشیوں نے بھی اعلٰی منصب حاصل کر لئے تھے۔ ان معاملات نے اخلاص خاں عرض مکرر کو سخت تشویش میں ڈال دیا کیونکہ وہ ایک ایسا عرض مکرر تھا جو اپنی لیاقت اور دیانتداری کیلئے اور مالگزاری اور حساب کتاب کے معاملات میں اپنی سخت گیری کیلئے مشہور تھا اور اس نے وزیر کو عرض داشت پیش کی کہ بادشاہ کا یہ اسراف بے جا دور اندیشی کے اور حکومت کے خلاف تھا اور یہ کہ ہندوستان کا تو ذکر ہی کیا پوری دنیا بھی ان لوگوں کو جن پر بادشاہ بخشش کی بارش کرنا چاہتا تھا جاگیریں دینے کیلئے کافی نہیں ہو سکتی۔ اس نے تجویز کیا کہ وزیر کو اس معاملہ کی جانچ کرنی چاہئے کہ منصبوں پر مقرر افراد اپنے منصبوں کے اہل تھے یا نہیں اور عہدہ داروں کو ملنے والا عہدہ یا منصب یا ترقی ان کی اہلیت سے زیادہ تو نہیں لیکن اس قسم کی جانچ پڑتال سے جو غم و غصہ پیدا ہوتا اس کا مقابلہ کرنے کیلئے نہ تو منعم خاں اور نہ اخلاص خاں تیار تھے۔ بالآخر محمد ساقی مستعد خاں مورخ کے سپرد یہ کام کیا گیا۔ اب یہ ضروری ہوگیا کہ عرض مکرر یا وزیر کے ذریعہ بادشاہ کو پیش کئے جانے سے پہلے ہر عرضی مستعد خاں دیکھیں اور اسے واجب قرار دیں لیکن اس سے زبردست تاخیر کا ہونا لازمی ہوگیا۔ دو ممتاز ملکہ نے یعنی مہرپرور اور آمنہ الحبیب نے اور شہنشاہ کے دیگر ڈائریکٹ مقربین نے بغیر مستعد خاں کی جانچ پڑتال اور دستخطوں کے اپنی عرض داشتوں پر شہنشاہ کے دستخط حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا لیکن ایسی بے ضابطہ عرضیوں پر محکمہ مالیات کی طرف سے بے توجہی برتی جانے لگی۔ بادشاہ متصدیوں سے یہ کہہ چکا تھا کہ اس کے دستخطوں کی پرواہ کئے بغیر جو مناسب کارروائی ہو وہی کریں۔ اس سے شاہی دستخطوں کا وقار ختم ہوگیا۔

منعم خاں' اخلاص خاں اور مستعد خاں بادشاہ کی بے پناہ فیاضی پر روک ٹوک نہ لگا سکے لیکن جاگیری نظام کے بڑھتے ہوئے مسائل کو اس بے دلی سے کئے ہوئے ان اقدامات سے حل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نازک مسئلہ کی حقیقت کا اندازہ مندرجہ ذیل سطور سے ہو سکتا ہے۔

پچھلے شہنشاہوں کا یہ دستور تھا کہ منصب داروں کو شاہی جانوروں کی پرورش کے لئے

خرچ دیا کرتے تھے۔ باوجود اس حقیقت کے کہ اورنگ زیب کے دور میں جاگیروں کی آمدنی نہایت غیر یقینی ہوگئی تھی اور ان میں سے متعدد ویران اور غیر مزروع ہوگئی تھیں۔ آختہ بیگی اور دوسرے متصدی منصب داروں کے وکیلوں سے یہ خرچ وصول کرتے رہے۔

جاگیریں بمشکل تمام بہم پہنچتی تھیں اور خافی خاں کے الفاظ میں ایک انار اور سو بیمار کا سا حال تھا اور سخت تاخیر اور دشواری کے بعد منصب داروں کو کوئی چھوٹی سی جاگیر مل پاتی تھی۔ اس کے باوجود متصدی جانوروں کی پرورش کے پورے اخراجات طلب کرتے رہتے تھے۔ اگرچہ جاگیروں کی کل آمدنی بھی ان رقوم (ان کی آدھی یا تہائی بھی نہ تھی) سے کم ہی ہوتی تھی۔ ان حالات میں منصب داروں کے خاندانوں کے زبوں حالات کا اچھی طرح تصور کیا جا سکتا ہے۔ منصب داروں کے وکیلوں کی عرض داشتوں کا اس سلسلہ میں کوئی اثر نہ ہوا بلکہ انہیں پوری رقوم ادا کرنے کے سلسلے میں پریشان کیا جاتا تھا۔ سزائیں دی جاتی تھیں اور انہیں قید و بند کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ حالات یہاں تک بگڑے کہ منصب داروں کے وکیلوں نے بطور احتجاج اپنے عہدوں سے مستعفی ہونا شروع کر دیا۔

بالآخر منعم خاں نے اصلاحات کیں۔ اس نے حکم نافذ کیا کہ جب کسی منصب دار کو جاگیر دی جائے تو جانوروں کی پرورش کا خرچہ اس کی کل آمدنی سے نکالا جائے اور جو باقی بچے وہ اس کو بطور تنخواہ دے دیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں جانوروں کی پرورش امراء کی تنخواہ پر منحصر نہ رہی بلکہ ایک مرکزی ذمہ داری بن گئی اور اسی کے مطابق امراء کی تنخواہیں بھی کم کر دی گئیں۔ اس طرح منصب داروں اور وکیلوں کے کاندھوں سے جانوروں کے خرچہ کا بوجھ ہٹ گیا۔ دراصل اس حکم کی اہمیت یہ تھی کہ جانوروں کے خرچہ کی مکمل طور پر واگزاری کر دی جائے۔

اس اصلاح سے بے شبہ منصب داروں کو کافی سہولت مل گئی لیکن اس سے مرکزی حکومت کی ذمہ داری بڑھ گئی۔ جاگیریں تقسیم کرنے کے سلسلے میں بہادر شاہ کی فیاضی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بات کا شبہ تھا کہ وہ ان زمینوں کو جو امراء کی چھوڑی ہوئی تھیں خالصہ میں رکھ بھی سکتا تھا اور ان سے شاہی جانوروں کی پرورش کے لئے خرچ بھی وصول کر سکتا تھا اس سے غالباً شاہی خزانہ کا خرچ بڑھتا ہی چلا گیا۔

مالی بحران اور بہادر شاہ کا دور

بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہادر شاہ کے عہد میں مالی بحران کا سامنا تھا۔ سننے میں آتا ہے کہ جب بہادر شاہ تخت نشین ہوا اس کو آگرہ کے قلعہ میں 13 کروڑ کی لاگت کا سکہ بند اور غیر سکہ بند سونا چاندی ہاتھ آیا۔ دور حکومت کے آخر تک یہ سب خرچ ہوچکا تھا۔ خافی خاں کہتا ہے کہ اس کے (بہادر شاہ) دور حکومت میں بے جا اخراجات کو دیکھتے ہوئے حکومت کی

آمدنی ناکافی تھی۔ اس لئے سرکاری معاملوں میں سخت کفایت سے کام لیا گیا۔ خصوصاً شاہی خاندان کے اخراجات کیلئے روزانہ شہزادہ عظیم الشان کے خزانے سے روپیہ منگوایا جاتا تھا تب جا کر کام چلتا تھا۔ شاہی افواج کے اسلحہ دار سپاہی اس بات کے شاکی تھے کہ ان کی تنخواہ پچھلے چھ سال سے واجب الادا چلی آتی تھی۔

اس طرح بہادر شاہ کے دور حکومت کو سخت مالی بحران سے دوچار ہونا پڑا اور جاگیرداری نظام کے نازک حالات سے سابقہ پڑا اگرچہ منعم خاں اور کچھ دوسرے امراء نے بہت سے غلط اور بے جا اخراجات کو روکنے کی کوشش کی اور منصب داروں اور دوسرے عہدے داروں کی بے تحاشہ بڑھتی ہوئی تعداد کو کم کرنے کی طرف بھی توجہ کی۔ حکومت اور مذہبی عصبیت کی پالیسی میں کافی کمزوری آگئی۔ ہندوؤں کے ساتھ زیادہ رواداری کا سلوک اختیار کیا گیا اورنگ زیب کی راجپوتوں اور مرہٹوں کے ساتھ جو سخت گیری کی پالیسی تھی اس میں بھی ایک تبدیلی رونما ہوئی لیکن یہ اقدامات محض تجرباتی اور پس و پیش کے حالات میں کئے گئے تھے۔ اس لئے ان سے قابل لحاظ نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تجربات کی روشنی میں بہادر شاہ ایک فیاضانہ اور قابل قبول طرز عمل کا راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ لیکن حالات و واقعات کے زیر اثر وہ اپنے طرز عمل سے کوئی خاص اور قابل لحاظ فائدہ حاصل نہ کر سکا اور وہ زوالی دور کی آمد آمد کو روکنے میں کسی طرح بھی کامیاب نہ ہوسکا کیونکہ مسلمان امراء باہمی چپقلشوں میں مبتلا تھے اور غیر مسلم دھڑے آزادی کی دھن میں آگے بڑھ رہے تھے۔

عہدہ وزارت کے لئے ذوالفقار خاں کی جدوجہد

ڈاکٹر ستیش چندر کے خیال میں منعم خاں کی موت سے وہ مسئلہ سامنے آگیا جو عملی طور پر دربار کی سیاست پر آنے والے بیس سال تک حاوی رہا اور وہ گویا مغلیہ حکومت کے باقی تمام دوسرے مسائل کیلئے ایک مرکزی نقطہ نظر بن کر رہ گیا۔ یہ مسئلہ ایک موزوں اور مناسب وزیر کے انتخاب کا مسئلہ تھا۔ وزیر کا مقام قرون وسطیٰ کے مشرق قریب نیز ہندوستانی کے انتظامیہ میں تخت نشین حکمران کے ساتھ لازم و ملزوم کی طرح منسلک ہوتا ہے۔ بادشاہ وقت کے ساتھ وزیر کے تعلقات کی نوعیت ہمیشہ بڑی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ ایک بااثر وزیر سے ہمیشہ خطرہ رہتا ہے کہ وہ نہ صرف بادشاہ کے اقتدار کو بے اثر کر دے بلکہ خود ہی حکمران نہ بن بیٹھے۔ اس کے برعکس بے اثر اور بے رسوخ وزیر اکثر نقصان رساں ثابت ہوا ہے۔ اکبر نے مرکزی حکومت کے فرائض و مناصب کو کم و بیش ہم مرتبہ عہدہ داروں میں تقسیم کرکے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے مالی معاملات کی ذمہ داری دیوان صاحبان کے سپرد کی تھی جن کا تقرر بنیادی طور پر ان کے انتظامی اور مالی معاملات کے تجربہ کی بنا پر ہوتا تھا اور جن کا سرکاری منصب داری کیلئے دعوے دار یا حقدار ہونا کچھ لازمی نہ تھا۔ اس طرح اکبر کے وزراء شہنشاہ کے معتمد و

معتبر ہونے کے سبب مہتم بالشان ہوتے تھے نیز اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ مالی محکمات کے سربراہ بھی ہوتے تھے لیکن رفتہ رفتہ وزیر کا دربار کے منصب داروں میں سے سب سے زیادہ ممتاز منصب دار ہونا پھر سے رواج پا گیا۔ جہانگیر کے دور حکومت کے اواخر اور خاص کر شاہ جہاں کے عہد حکومت میں، منصب داروں میں سے جو سب سے زیادہ ممتاز ہوتے تھے انہیں میں سے کچھ وزارت کا قلمدان سپرد ہونے لگا تھا۔ اورنگ زیب کے عہد میں میر جملہ کو اورنگزیب کی تخت نشینی کیلئے کامیاب کوششیں کرنے کے صلہ میں وزارت کے عہدہ پر فائز کیا گیا۔ اس کا جانشین جملۃ الملک اسد خاں ہوا۔ یہ دونوں منصب دار یعنی 7000 ذات 7000 سوار کے بلند ترین منصب پر فائز تھے۔ علاوہ خود اپنے عہدہ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے ان کو وقتاً فوقتاً اہم فوجی سربراہی بھی سپرد کی گئی۔ چنانچہ اورنگ زیب کے زمانہ وفات تک دربار میں وزیر کا بلند ترین منصب دار اور بادشاہ وقت کا خاص مشیر ہونے کے ساتھ ساتھ مالی معاملات کے سربراہ ہونے کی قدیم ترین رسم کی جڑیں بھی نہایت گہری اور مضبوط ہو چکی تھیں۔ علاوہ ازیں وزارت کے عہدہ کے ساتھ بااثر سرپرستی اور انفرادی مفادات کے زبردست مواقع بھی منسلک تھے۔ اس لئے کچھ تعجب کی بات نہیں کہ عہدہ وزارت کیلئے شدید جدوجہد ہر دور میں نظر آتی ہے اور اس کا حصول منصب داروں اور عہدہ داروں کی درپردہ کوششوں کا مرکز قرار پا چکا تھا۔

وزارت کی نہج میں اس باریک تبدیلی کے باوجود شاہ جہاں اورنگ زیب کے دور میں وزراء بادشاہت کے مستحکم اقتدار کو نقصان پہنچانے کی کوئی طاقت نہ رکھتے تھے اور اس لئے ان سے کوئی امکانی خطرہ نہ تھا۔ ان شہنشاہوں کی انفرادی اہلیت اور مغلیہ حکومت کا زبردست وقار وزراء کو ان کے دائرے میں محدود رکھنے کیلئے کافی تھا لیکن اس وقت اس مسئلہ کا کوئی تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ کسی کمزور اور نا اہل اور ناقابل حکمران کے عہد میں بھی وزارت کا ادارہ اسی طرح بخوبی تمام اپنے فرائض انجام دیتا رہے گا یا نہیں۔ ایسا قیاس ہے کہ اس مسئلہ نے کبھی نہ کبھی اورنگ زیب کے دماغ کو بھی پریشان رکھا تھا لیکن ان کو اطمینان تھا کہ اسد خاں جس کو اس نے اس کام میں ماہر کر دیا تھا اس عہدہ کے فرائض سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہوتا رہے گا۔ اسی کے ساتھ وہ حکومت کو تقسیم کرنے کے تصور سے بھی پرامید تھا جس کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔

تخت نشینی کی جنگ میں بہادر شاہ کی کامیابی نے منعم خاں کو عہدہ وزارت پر فائز ہونے کا موقع فراہم کیا۔ وہ ابھی تک صرف ایک معمولی منصب دار تھا اور اس کا تقرر بہادر شاہ کی تخت نشینی کی جنگ میں معاون و مددگار ثابت ہونے کے صلہ میں کیا گیا تھا۔ وزیر مقرر ہونے کے علاوہ منعم خاں کو سات ہزار سات ہزار سوار (دو اسپہ وسہ اسپہ) منصب اور لاہور کی (غیر حاضرا صوبہ داری اور دیگر متعدد نقد و غیر نقد انعامات و اکرامات سے نوازا گیا تھا۔ ایک طرح سے تو منعم خاں کیلئے سات ہزاری (7000)/ سات ہزاری (7000) کا منصب اس کے عہدہ وزارت سے بھی زیادہ اہم تھا کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وزیر کا دربار میں امراالامرا ہونا بشمولیت امارات خزانہ اس درجہ قابل قبول ہو چکا تھا کہ اس کا اچانک پندرہ سو کے منصب سے سات ہزاری کے

منصب پر فائز کیا جانا کسی کیلئے باعث حیرت نہ ہوا اگرچہ منصب میں اس قدر اچانک ترقی کی مثال اس سے قبل نظر نہیں آتی۔ منعم خاں کو عطا کئے گئے دوسرے مراعات بھی اسی حقیقت پر مزید روشنی ڈالتے ہیں۔

موجودہ بادشاہ بہادر شاہ اور امرائیں سب سے زیادہ بااثر وزیر کے درمیان تصادم کا امکان متعدد عوامل کے سبب ٹلتا رہا۔ اول تو یہ کہ منعم خاں نے کبھی بھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ اس کا جو کچھ وقار تھا وہ محض بہادر شاہ کا مرہون منت تھا۔ اس لئے اس نے کبھی اپنی پچھلی خدمات یا اپنے وقار کی عظمت پر نگاہ غلط انداز نہ ڈالی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ حکومت خدا کا عطا کردہ خاص عطیہ ہے۔ اس لئے حکمرانوں پر احسان کرنے کا کوئی دعویدار نہیں بن سکتا اس لئے کسی کا ان کی کامیابی میں خود کو محرک سمجھنا محض غرور تمکنت ہے اور کچھ نہیں۔ دوسرے یہ کہ منعم خاں امراء کے کسی بااثر گروہ کا سربراہ نہ تھا اس لئے بہادر شاہ کیلئے اس کے اثرات سے خوفزدہ ہونے یا اس کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس کرنے کا موقع نہ تھا۔ اس نے بخوشی تمام منعم خاں کو انتظام حکومت کا بار سنبھالنے دیا اور اپنی فراست کی بنا پر اس نے نہ خود اس کے روزانہ کے معاملات میں دخل اندازی کی اور نہ دوسروں کو اس کی اجازت دی۔ تیسرے یہ کہ منعم خاں ایک نہایت اعلیٰ منتظم نہ سہی تاہم وہ ایک اوسط درجہ کا قابل و ماہر منتظم ضرور تھا۔

اس نے اپنے اخلاق، علم و فضل اور قدیم عالمگیری امراء کے لحاظ و پاس کے سبب ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی لیکن اتنے متعدد حسن اتفاقات کا دوبارہ یکجا ہونا ناممکنات میں سے معلوم ہوتا تھا۔ اس لئے بہادر شاہ کو منعم خاں کا جانشین تلاش کرنے میں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس سے وزارت کا مسئلہ سنجیدہ شکل اختیار کر گیا۔ بہادر شاہ نے بالآخر اس مسئلہ کو اس طرح حل کرنا چاہا کہ اکبر اعظم کی روایت پر عمل کرتے ہوئے وزارت کے فرائض کو متعدد اشخاص میں تقسیم کر دیا جائے لیکن اکبر کی روایت کو پوری طرح زندہ کرنے سے قبل ہی بہادر شاہ نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اس کے نتیجہ میں وزارت کا سوال پھر طاقت آزمائی کی آتش فروزاں کی نذر ہوگیا۔

ذوالفقار خاں اور تینوں شہزادوں کا وفاق

اپنے اور اپنی نسل کے لئے وزارت کا عہدہ حاصل کرنے کی کوشش میں ناکام ہو جانے کے بعد ذوالفقار خاں نے اپنی خواہش کو پورا کرنے کیلئے نئے حربے استعمال کرنا شروع کر دیئے۔ اس کی مہم کا اصل مقصد شہزادہ عظیم الشان کو زبردست شکست دینا تھا کیونکہ وہ شہزادہ عظیم الشان کو وزارت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتا تھا۔ عظیم الشان بہادر شاہ کے بیٹوں میں سے سب سے زیادہ بااثر اور لائق و فائق تھا۔ وہ اوائل عمری ہی میں اورنگ زیب کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا اور اس کو بہت عزیز ہوگیا تھا۔ بنگال کی صوبہ داری یعنی 1697ء تا 1706ء کے

عرصہ میں صوبہ کی اندرونی تجارت کو اپنی اجارہ داری میں لے کر اس نے بہت وافر دولت پس انداز کر لی تھی۔ بہادر شاہ کی تخت نشینی کیلئے اس کی کوششوں کا اور اول الذکر کے دربار میں اس کے اثرات کا تذکرہ پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ دولت طاقت اور اثر میں اس نے اپنے تینوں بھائیوں یعنی جہاں دار شاہ کو' رفیع الشان شاہ اور جہان شاہ کو اس قدر پیچھے چھوڑ دیا تھا کہ عام طور پر یہ یقین کر لیا گیا تھا کہ جانشینی کی طاقت آزمائی میں ان کی کامیابی کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ اب ذوالفقار خاں نے حکومت کی تقسیم کے معاہدہ کو بنیاد بنا کر مقصد برآری کیلئے تینوں بھائیوں کو ایک وفاق کی شکل میں عظیم الشان خاں کے خلاف متحد کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

اس طرح بااثر ترین شاہزادہ اور دربار میں بااثر ترین امیر الامراء کھلے طور پر ایک دوسرے کے دست و گریباں ہوگئے۔ ان حالات کی روشنی میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور سے سے آغاز ہونے والی خانہ جنگی ان تمام خانہ جنگیوں سے مختلف تھی جو اس سے قبل مغل شہزادگان کے درمیان وقوع پذیر ہوچکی تھیں۔

آخری لمحہ تک ذوالفقار خاں کو اپنی کامیابی کا یقین نہ تھا اور وہ شہزادہ عظیم الشان سے کسی معاہدہ پر پہنچنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ ذوالفقار خان کی اصل شرائط کا تو ہمیں علم نہیں ہوسکا بہرحال وہ کوشش جو اس نے مشہور مورخ ارادت خاں کے توسط سے بہادر شاہ کی وفات کے فوراً بعد کی اس کو عظیم الشان کے جانب سے اس کے ترجمان شیخ قدرت اللہ نے مسترد کر دیا اور ذوالفقار خاں کو فوری طور پر سر تسلیم خم کرنے کو کہا گیا ورنہ کسی دوسری جگہ کا کوئی امکان نہ تھا۔ اسی طرح ان کوششوں کا بھی وہی حشر ہوا جو منعم خاں کے صاحبزادگان کے توسط سے کی گئی تھیں۔

ذوالفقار خاں کیا چاہتا تھا اور کس قسم کی خواہشات رکھتا تھا اس کا اندازہ حکومت کو منقسم کرنے کی اس تجویز سے کیا جا سکتا ہے جو اس نے اسی زمانے میں یا اس سے کچھ قبل ہی مرتب کی تھی۔ اس تجویز کے مطابق نربدا کے جنوب کا کل خطہ جہان شاہ کے حصہ میں آیا تھا۔ ملتان ٹھٹھا اور کشمیر رفیع الشان کے زیر نگین ہونا تھا اور باقی جہاں دار شاہ کیلئے تجویز کیا گیا تھا۔ اس تجویز کا ایک خاص اور نہایت ہی عجیب پہلو یہ تھا کہ ان تینوں بھائیوں کا مشترک وزیر ذوالفقار خاں ہی کو ہونا تھا وہ جہاں دار شاہ کے دربار میں رہنا چاہتا تھا جس کے نام کے سکے چلنے تھے اور تمام ملک میں اسی کے نام کا خطبہ بھی پڑھا جاتا تھا اور وزیراعظم اپنے نائبین کے ذریعے دوسرے حکمران بھائیوں کے دربار میں اپنے فرائض ادا کرنا چاہتا تھا۔

اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آیا ذوالفقار خاں کو حکومت کو تقسیم کرانے کی تجویز حکمت عملی کا ایک حصہ تھی یا اس بات کا اقرار تھا کہ تخت نشینی کا مسئلہ کا حل ممکن نہیں پرانے حل کو نئے طریقے سے استعمال کرنے کا تجربہ کرنا تھا۔ حکومت کی تقسیم کی تجویز تو ہمایوں کے وقت ہی میں ناکامیاب ہوچکی تھی۔ اس کا لاحاصل ہونا شاہ جہاں کے دور حکومت اور اورنگ زیب کی وفات کے بعد بھی ثابت ہوچکا تھا۔ شاید اورنگ زیب کی طرح ذوالفقار خاں کو بھی

خیال ہونے لگا تھا کہ اب حکومت اس قدر وسیع تھی کہ اس کا کسی ایک مرکز کے ماتحت رہنا دشوار ہوگیا تھا اور اسی لئے غیر مرکزیت کی تجویز قابل غور تھی۔ ذوالفقار خاں کی تجویز کے مطابق اس بات کی کوشش کی گئی تھی کہ حکومت کی سالمیت کو برقرار رکھتے ہوئے غیر مرکزیت و حکومت کی تقسیم کی تجویز پر عمل درآمد کیا جائے چنانچہ سب سے بڑے بھائی کو اتحاد اور سالمیت کا نشان بنایا جانا تھا اور اس میں شہنشاہ اقتدار اعلیٰ اور وزیراعظم کو حکومت کا اصل محرک اور وزیر حکومت کا ناظم بنانا تھا۔ اگر اس تجویز پر عملدرآمد کر لیا جاتا تو حکمرانی کا پورا زور اور اس کی پوری قوت وزیر کے ہاتھ میں مرکوز ہو جاتی۔ کچھ مورخوں کے خیال کے مطابق تقسیم کی تجویز میں اولا عظیم الشان شریک تھا اور اسی کی مرضی سے یہ تجویز مرتب کی گئی تھی لیکن یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ اپنی دولت و ثروت اور جاہ و سپاہ کے گھمنڈ میں وہ بہادر شاہ کی وفات کے بعد اپنے وعدے سے منحرف ہوگیا تھا۔ چنانچہ دوسرے شہزادوں کے سامنے بجز جنگ کے کوئی دوسرا راستہ باقی نہ رہ گیا تھا۔ اور اسی لئے انہوں نے عظیم الشان کے حصے کو جہاں دار کی طرف منسوب کر دیا۔ بہرحال یہ بات ہرگز قرین قیاس نہیں ہے کہ عظیم الشان نے کسی ایسی تجویز سے اتفاق کیا ہو جس کے مطابق حکمرانی کی اصل قوت وزیر کے ہاتھوں میں آجائے۔ اس لئے یہی سمجھنا چاہئے کہ حکومت کی تقسیم کی تجویز محض ذوالفقار خاں ہی کی تجویز تھی اور اس کے ذریعہ وہ پوری حکمرانی کی طاقت کو اپنے ہاتھ میں مرکوز کر لینے کے خواب کو شرمندہ تعبیر کر لینا چاہتا تھا۔

شہزادوں کے درمیان جو حکمرانی کی جنگ ہوئی تھی اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ سبھی مبصرین اس پر متفق ہیں کہ محض ذوالفقار خاں کی قوت اور جسارت کی بنا پر باقی تین شہزادوں نے عظیم الشان پر فتح پائی۔ عظیم الشان اپنی جگہ اس فاش غلطی کا مرتکب ہوا کہ وہ محض پیش بندیوں تک ہی محدود رہا اور وہ اس خیال خام کی بنا پر کہ چونکہ اس کا خزانہ باقی شہزادوں کے خزانوں سے کہیں زیادہ تھا اس لئے خود اس کو کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت نہ پڑے گی اور دوسرے شہزادوں کی فوج خزانے خالی ہونے پر منتشر ہو کر رہ جائے گی۔ اس سے ذوالفقار خاں کو ایک چال چلنے کا موقع مل گیا۔ اس نے عظیم الشان کا تعلق لاہور سے منقطع کر دیا اور لاہور کے قلعہ میں جمع شدہ خزانوں اور توپ خانوں پر قبضہ کر لیا۔ اور عظیم الشان کو خود اس کے کیمپ ہی میں نظر بند کر دیا۔

(بحوالہ عبرت نامہ از مرزا محمد' عبرت نامہ از قاسم لاہوری' صفحہ 44)

شاید عظیم الشان کے اس طرز عمل کا سبب اس کی فوج کی تعداد کا اپنے بھائیوں کی افواج کی تعداد سے کم ہونا تھا۔ عظیم الشان کو اپنے بھائیوں میں پھوٹ پڑنے کی توقع ہونے کا بھی پتہ چلتا ہے کیونکہ وہ ان کی صلاحیتوں کو بہ نظر حقارت دیکھتا تھا اور اسے چن قلیچ خاں اور دیگر امراء سے کمک ملنے کی بھی امید تھی لیکن اس کے بھائیوں کی مجموعی افواج کی تعداد نے اسے مغلوب کر دیا اس سے قبل کہ کسی بھی طرف سے کوئی کمک اس تک پہنچ سکتی اس کی افواج فاقہ کشی اور بغاوت کے سبب بہت کمزور بھی ہوگئی تھیں۔

عظیم الشان کی شکست اور اس کی موت کے بعد باقی تین بھائیوں کے درمیان مال غنیمت کی تقسیم پر تنازعہ کھڑا ہوگیا۔ ذوالفقار خاں نے ابتدا ہی سے جہان دار شاہ کا ساتھ دیا تھا اس کا سبب جیسا کہ ارادت نے اشارہ کیا ہے شاید یہ ہو سکتا ہے کہ جہاندار شاہ ایک کمزور شہزادہ تھا عیش و عشرت کا شوقین تھا اور کام سے بددل تھا چنانچہ ذوالفقار خاں جیسے وزیر کو وہ تمام بھائیوں میں سب سے زیادہ موزوں معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایسے اقتدار کا متمنی تھا جس میں اسے کسی کا ماتحت نہ رہنا پڑے۔ ایک دوسرے مبصر کے قول کے مطابق بہادر شاہ نے خود بستر مرگ پر جہان دار شاہ کے حق میں اعلان کر دیا تھا۔ (قاسم لاہوری' صفحہ 16-17)

ذوالفقار خاں کی اعانت جہان دار شاہ کی متواتر فتح کا باعث ہوئی جو اسے اپنے دونوں بھائیوں کے خلاف نصیب ہوئی۔ 29 مارچ 1712ء کو بہادر شاہ کی وفات کے ایک ماہ بعد جہاندار شاہ باقاعدہ طور پر تخت نشین ہوا اور اسی کو شہنشاہ بننے کا فخر نصیب ہوا۔

جہاندار شاہ کے عہد میں

ذوالفقار خاں بطور وزیر اعظم

جہاندار شاہ کی تخت نشینی کے بعد ذوالفقار خاں اپنے حق کی بنا پر وزیر بن گیا۔ وہ دکن کی نائب حکمرانی پر بھی قائم رہا جسے وہ اپنے نمائندہ داؤد خاں کے ذریعہ چلاتا رہا۔ مزید براں اس کو نئے شہنشاہ کے ہاتھوں ایک عدیم المثال منصب یعنی دس دس ہزار دو اسپ کا منصب عطا ہوا اور اس کو ایک شہزادہ کا منصب اور اختیارات حاصل ہوگئے۔ اس کا باپ پہلے کی طرح وکیل مطلق کے منصب پر قائم رہا اور اس کو (غیر موجودگی میں) گجرات کی صوبہ داری اور بارہ بارہ ہزاری کے منصب بھی عطا کئے گئے۔ جہاں دار اس کی بڑی عزت کیا کرتا تھا اور اس کو چچا کے نام سے پکارتا تھا۔

(اخبارات مورخہ یکم اپریل 1712' نیز 3 اور 7 اپریل 1712ء)

باب 6

فرخ سیر کا عہد اور سید برادران

سید برادران کا عہد (1713ء تا 1721ء) : مغلوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے سادات کرام میں سے ابو العزم نام کا آدمی ہندوستان آیا اور میرٹھ و سہارنپور کے علاقے میں اپنے خاندان کے ساتھ بس گیا۔ کہا جاتا ہے کہ بارہ گاؤں بسانے کی بنیاد پر انہیں "بارہا سید" کہا جانے لگا۔ اکبر کے دور حکومت سے ہی "بارہا" کے سید بہادر اور جنگجو سمجھے جاتے تھے اور مغلیہ فوج کے ہر اول دستہ کی کمان انہیں وراثتاً حاصل تھی۔ ان کے زیادہ تر ازدواجی تعلقات ہندوستانی امیروں کے ساتھ تھے اور ان کا رہن سہن اور طور طریقہ ہندوستانی تھا۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں عبداللہ خاں بارہا جو سید میاں کے نام سے مشہور تھا بیجاپور اور اس کے بعد اجمیر کے صوبہ دار کے عہدہ پر فائز رہا تھا مگر اورنگ زیب کا خیال تھا کہ بارہا سیدوں کو ڈھیل دینا اپنی بربادی کرنا ہے کیونکہ یہ لوگ ذرا سی ڈھیل پر مغرور ہو کر راستہ سے بھٹک جاتے ہیں اور سازشیں کرنے لگتے ہیں۔

تاہم سید میاں کے دونوں بڑے بیٹے حسین علی اور عبداللہ خاں اپنی بہادری کی وجہ سے اورنگ زیب کے دور حکومت میں ہی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ 1700ء میں سید عبداللہ خاں نے مرہٹہ سردار ہنومنت کے خلاف جنگ میں ہمت اور جنگی قابلیت کا ثبوت دیا تھا۔ اس جرات کے نتیجہ میں اورنگزیب نے انہیں دو خلعتے اور کٹاریں بھیجیں۔ اس کے بعد عبداللہ خاں شاہ عالم کے بڑے بیٹے جہاندار شاہ کی خدمت میں ملتان میں رہا لیکن 1703ء میں جھگڑا کرکے وہ لاہور چلا آیا اور وہاں کئی سال تک بیکار بیٹھا رہا۔ اس کا چھوٹا بھائی حسین علی خاں ابتدا میں فتح پور اور بعد میں ہنڈون و بیانہ کا فوجدار رہا۔

جاجوں کی جنگ میں دونوں بھائیوں نے بہادر شاہ کی طرف داری میں جنگ کی۔ جاجوں میں سید برادران بڑی جرات اور دلیری سے لڑے اور ان کے ایک بھائی نور الدین علی خاں نے جنگ میں شہادت پائی اور حسین علی خاں زخمی ہوا لیکن بہادر شاہ کے دربار میں انہیں خاص ترقی نہیں ملی۔ 1708ء میں عظیم الشان نے حسین علی کو بہار میں اپنا نائب صوبہ دار مقرر کیا۔ عبداللہ خاں مزید کئی سال بیکار رہا۔ 1710ء میں سکھوں کے خلاف آمنت پور کی جنگ میں عبداللہ خاں نے پھر بہادری اور جرات کا ثبوت دیا۔ آخر میں 1711ء میں عظیم الشان نے عبداللہ خاں کو الہ آباد کا نائب صوبیدار مقرر کیا۔ اس طرح سید عبداللہ خاں اور سید حسن علی خاں دونوں ہی کو عظیم الشان کی مہربانی سے اپنے عہدے حاصل ہوئے۔ لاہور کی خانہ جنگی میں عظیم الشان کی وفات کے بعد اس کے دوسرے بیٹے فرخ سیر نے جب بغاوت کا علم بلند کیا تو وہاں کے نائب صوبہ دار حسین علی کو اس سے کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔

جنوری فروری 1712ء میں فرخ سیر کے رہتاس کے قلعہ پر دغا بازی سے قبضہ جمانے سے حسین علی ناراض تھا۔ 15 مارچ 1712ء کو بہادر شاہ کی موت کی خبر پاتے ہی اور شاہی خانہ جنگی کے نتائج سے پہلے ہی فرخ سیر نے اپنے باپ عظیم الشان کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ اس وقت حسین علی کچھ باغیوں کے خلاف راج گیر کی طرف گیا ہوا تھا اس کے ساتھ صلاح و مشورہ کئے بغیر فرخ سیر کے اس اعلان کی وجہ سے حسین علی اور فرخ سیر میں اختلاف بڑھ گیا۔ ایک ہمعصر مورخ کے مطابق حسین علی کا ارادہ تھا کہ فرخ سیر کو جس کے پاس سپاہیوں کی تعداد کم تھی قیدی بنائے لیکن فرخ سیر کے بخشی احمد بیگ نے جلد ہی ایک بڑی فوج تیار کر لی دوسری طرف فرخ سیر نے بھی حسین علی کو بڑے عاجزانہ اور انکسارانہ خطوط لکھے آخر میں حسین علی نے اس کا ساتھ دینا منظور کر لیا۔

لاہور کی جنگ میں عظیم الشان کی موت کی خبر سننے کے بعد حسین نے اپنی جانب داری بدلنا چاہی۔ فرخ سیر بھی مایوس ہو کر خودکشی کرنے کو تیار ہوگیا لیکن اس کی ماں خود حسین علی کے پاس گئی اور اسے عظیم الشان کے پرانے احسانوں کی یاد دلائی اور اس کے بیٹوں کو حکومت میں سب سے اعلیٰ عہدہ دلانے کی یقین دہانی۔ مورخ نور الدین کے مطابق اس نے کہا۔

> "اگر وہ ہار جاتے ہیں تو قیامت کے دن تک ان کا نام بہادروں کی صف میں گنا جائے گا اور اگر کامیاب ہوتے ہیں تو سارا ہندوستان ان کے قدموں کے نیچے ہوگا اور ان کے اوپر صرف بادشاہ ہوگا۔"

حسین علی کے ذریعہ فرخ سیر کی طرفداری نہ چھوڑنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے اس بات کا بڑا ملال تھا کہ ذوالفقار خاں نے جہاندار شاہ کے دربار میں ساری قوت اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔

حسین علی کے فرخ سیر کا ساتھ دینے کے بعد بھی دونوں کا اختلاف ختم نہیں ہوا۔ پٹنہ میں موجود انگریزی کمپنی کے ایجنٹ کے مطابق فرخ سیر اور حسین علی کے درمیان اختلاف اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس وقت دو گروہ ہوگئے۔ اس وقت کی مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ فرخ سیر پٹنہ کے سبھی ملکی اور غیر ملکی تجاروں سے دولت وصول کرنا چاہتا تھا لیکن حسین علی اس کا مخالف تھا اسی وقت خواجہ عاصم "خان دوراں" لاہور کی جنگ سے بچ کر پٹنہ جا پہنچا۔ اس کی کوششوں اور اثر کی وجہ سے حسین علی اور فرخ سیر کا اختلاف کچھ کم ہوگیا۔

فرخ سیر اور حسین علی کے اختلافات بنیادی طور پر اس وقت ذاتی تھے اور ان کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ حسین علی اس بات سے ناراض تھا کہ فرخ سیر نے بھوج پور کے زمیندار سدھسٹ نارائن کو اپنا دوست کیوں بنا لیا جب کہ حسین علی کے ساتھ اس کے تعلقات پہلے سے ہی دشمنانہ تھے۔ اس وقت پالیسی کا سب سے اہم قدم جزیہ کا ختم کرنا تھا۔ حسین علی کی صلاح سے یہ کام فرخ سیر نے پٹنہ ہی میں کیا۔

فرخ سیر کی مستقل کی پالیسی کے لئے اس ابتدائی اعلان کی ایک خاص اہمیت ہے۔ 18

ستمبر 1712ء کو فرخ سیر نے پٹنہ سے کوچ کیا اور نومبر میں وہ الہ آباد پہنچا وہاں پر سید عبداللہ نے بھی ذاتی وجوہات کی بنا پر فرخ سیر کا ساتھ دینا منظور کیا۔ عبداللہ خاں ایک کامیاب منتظم نہیں تھا وہ اپنے سپاہیوں کی پچھلی تنخواہیں نہیں ادا کر سکا تھا۔ بہادر شاہ کی وفات کے وقت بنگال کے دیوان مرشد علی خاں کے ذریعہ بھیجا گیا 28 لاکھ کا خزانہ الہ آباد کی سرحد پر تھا۔ عبداللہ خاں نے اسے ہتھیا لیا اور اس سے اپنے سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کر دیں۔

جہاندار شاہ عبداللہ خاں سے پہلے ہی سے ناراض تھا کیونکہ اس نے اس کی خدمت چھوڑ کر عظیم الشان کی خدمت منظور کی تھی۔ اس لئے جہاندار شاہ نے عبداللہ خاں کو الہ آباد کی نائب صوبہ داری کے عہدہ سے ہٹا دیا۔ ان حالات میں عبداللہ خاں کے لئے فرخ سیر کی تائید کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ تو یہ عبداللہ خاں نے جہاندار شاہ کو بھی ایک عرضداشت بھیج رکھی تھی۔ مندرجہ بالا تفصیلات کے ظاہر ہے کہ سید برادران اور فرخ سیر کے درمیان اختلاف کی وجہ خان دوراں اور میر جملہ نہیں تھے جن پر بادشاہ مہربان تھے حقیقت تو یہ ہے کہ خان دوراں کا اثر ابتدائی دور میں دونوں گروہوں کے درمیان دوستی پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوا لیکن بعد میں بادشاہ کے ان معتمدوں کی آپسی پھوٹ اور پرفریب برتاؤ نے حالات کو اور زیادہ خراب کر دیا سید برادران نے بھی فرخ سیر کی جانبداری اس کے باپ کے احسانوں کے بدلے میں نہیں بلکہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر کی۔

سید برادران کے اختیارات اور ان کی عام پالیسی : بادشاہ بننے کے بعد فرخ سیر نے عبداللہ خاں کو وزیر اور حسین علی خاں کو میر بخشی کا عہدہ دیا اور دونوں کو ہفت ہزاری منصب عطا کیا۔ عبداللہ خاں کو ملتان اور حسین علی کو بہار کی صوبہ داری پر فائز کیا اور انہیں یہ صلاح دی گئی کہ وہ اپنے صوبوں کا انتظام اپنے نائبوں کے ذریعہ کرائیں۔ ان کے چھوٹے بھائی سید نجم الدین علی خاں اور ان کے دوسرے چھوٹے بھائی رشتہ داروں کو بھی اعلیٰ منصب دیئے گئے۔ عبداللہ خاں کے ماموں مظفر خاں کو بارہا اجمیر کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ ان عہدوں کے علاوہ سید برادران نے اپنے دوسرے عزیزوں کیلئے اعلیٰ عہدے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چاہتے تھے کہ حکومت کو عزت و پائندگی دینے کیلئے پرانے عالمگیری و بہادر شاہی امیروں کا تعاون حاصل کیا جائے اس لئے زیادہ تر پرانے امیروں کو اپنے اپنے عہدوں پر رہنے دیا گیا اگر سید برادران کا بس چلتا تو اسد خاں و ذوالفقار علی خاں کو جنہیں عظیم الشان اور اس کے بیٹے کی موت کیلئے مجرم ٹھہرایا گیا تھا معاف کر دیا تھا اور انہیں پھر سے اعلیٰ عہدے دیئے جاتے۔ لیکن فرخ سیر اس سے متفق نہیں تھا۔ اس نے ان دونوں خاص امیروں اسد خاں اور ذوالفقار خاں کو قیدی بنا لیا۔ ذوالفقار خاں کو پھانسی دیدی گئی اور اسد خاں کو ذلیل کیا گیا۔ اس کا منصب چھین لیا گیا۔ حقیقت میں فرخ سیر کا یہ فعل ناعاقبت اندیشانہ تھا اور حکومت و شاہی خاندان دونوں کے حق میں غلط تھا۔ یہ دونوں تجربہ کار اور باثر امیر سید برادران کی جاہ طلبی کی خواہش پر روک لگانے میں معاون ہو سکتے تھے۔ بعد میں فرخ سیر نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ سید برادران فرخ سیر کے اس

فعل سے خوش نہیں تھے۔ حسین علی نے اس کا نتیجہ نکالتے ہوئے فرخ سیر کے بارے میں کہا وہ احسان مندی نہیں جانتا اعتماد کو نہیں جانتا اور اپنے قول و فعل میں صرف غیر مستقل ہی نہیں بلکہ اس کے توڑنے میں اسے کوئی شرم نہیں۔

دربار میں اب صرف ایک طاقتور گروہ رہ گیا تھا جس میں چن قلیچ خاں' محمد امین خاں اور عبدالصمد خاں شامل تھے۔ عبداللہ خاں اس گروہ کی اہمیت کو اچھی طرح سے سمجھتا تھا اس لئے اس نے چن قلیچ خاں کے توسل سے اس گروہ کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی۔ عبداللہ خاں کے مشورے سے چن قلیچ کو سات ہزار ذات سات ہزار سوار کے منصب کے ساتھ نظام الملک کا خطاب دیا گیا اور اسے دکن کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ دکن کے نائب صوبہ دار داؤد خاں ہی کو گجرات کا نائب صوبہ دار بنا دیا گیا۔ نظام الملک کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے اور اپنے معاونین کیلئے جاگیریں چن لے اور وہاں کے خصوصی زمینداروں کے منصب طے کرنے کیلئے صلاح دے۔ عبداللہ خاں اکثر یہ کہتا کہ وہ نظام الملک کو اپنے بڑے بھائی کی طرح سمجھتا ہے۔ نظام الملک کے دکن کو کوچ کرنے سے پہلے عبداللہ خاں خود اس کی رہائش گاہ پر گیا اور دوستی کی نشانی کے طور پر دونوں نے بیش قیمت تحائف کا تبادلہ کیا۔ محمد امین خاں کو دوم بخشی کا عہدہ اور اعتماد الدولہ کا خطاب دیا گیا۔ حالانکہ عبدالصمد خاں ذوالفقار خاں کا خصوصی معاون تھا لیکن نظام الملک کا رشتہ دار ہونے کے ناطے اسے سات ہزار ذات سات ہزار سوار کا منصب دیکر لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ عبدالصمد خاں حکومت کے انتظام میں کامیاب ثابت ہوا۔ اس نے سکھ و افغان باغی عناصر کو کچل کر وہاں پر امن قائم کیا۔ عام طور سے دوسرے صوبوں میں امیر اپنے سابق عہدوں پر قائم رہے۔

بادشاہ کے قابلِ اعتماد لوگوں کا تقرر جن عہدوں پر ہوا اور دربار کی نظر میں اس لئے اہم تھے کہ ان سے بادشاہ کی قربت قائم کی جا سکتی تھی ان تقرریوں کی وجہ سے سید برادران اور فرخ سیر کے اختلافات بڑھے۔

خاص عہدوں پر تقرری کے بعد فرخ سیر اور سید برادران کے سامنے راجپوتوں' مرہٹوں' سکھوں اور ان سے متعلق دوسرے مسائل کیلئے ایک اعلیٰ پالیسی طے کرنے کا مسئلہ آیا۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ بہار میں پڑاؤ کے وقت ہی فرخ سیر نے حسین علی کے مشورے سے جزیہ کو ہٹانے کیلئے فرمان جاری کر دیا تھا۔ حصول تخت کی جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد آگرہ میں فرخ سیر نے دوبارہ اس حکم نامہ کی تائید کی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پر صحیح طور پر عمل 2 اپریل 1713ء کو کیا گیا جب حسین علی نے بادشاہ کو ایک عرضداشت میں لکھا کہ اس کے متعلق دفتر دیوانی کو پروانہ بھیج دیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اودے پور کے مہاراناکے وکیل بہاری داس نے عبداللہ خاں کو مشورہ دیا کہ ہندوؤں کی مخالفت کی وجہ جزیہ ہے اور اگر وہ جزیہ کو ہٹا دے گا تو ان کی جڑیں اور مضبوط ہوں گی۔ عبداللہ خاں نے اس صلاح کو منظور کر لیا اور بادشاہ کو جزیہ ہٹانے کیلئے راضی کر لیا۔ اسی طرح بہت سے مقامات پر سے سفر محصول بھی ہٹا دیا گیا۔

(بحوالہ اخبارات 3 اپریل 1713ء)
ہندوؤں کے پالکی پر بیٹھنے اور ایرانی و عربی گھوڑوں کے استعمال پر سابقہ پابندی کچھ دنوں تک برقرار رہی۔

فرخ سیر اور راجپوت : جہاں تک راجپوتوں کا تعلق ہے فرخ سیر کے بادشاہ بننے کے بعد جے سنگھ' اجیت سنگھ اور دوسروں نے مبارکباد کے خطوط بھیجے جو بادشاہ کو پیش کئے گئے۔ فرخ سیر نے حسین علی کے مشورہ سے راجہ جے سنگھ' اجیت سنگھ اور دیگر راجاؤں کے پاس خطوط بھیجے کہ وہ بادشاہ کے روبرو حاضر ہوں۔ ساتھ ہی مہارانہ سنگرام سنگھ کو دوستانہ خطوط بھیجے گئے۔ مہارانہ کا بیٹا پرتاپ سنگھ 13 مارچ 1713ء کو شاہی دربار میں حاضر ہوا اور اسے بہت سے تحائف دیئے گئے۔ سنگرام سنگھ کو سات ہزار ذات سات ہزار سوار کا منصب عطا کیا گیا اور اسے آٹھ کروڑ دام انعام کی شکل میں دیئے گئے۔ اتنا اونچا منصب راجہ راج سنگھ کے علاوہ میواڑ کے کسی دوسرے رانا کو نہیں دیا گیا تھا۔ مہاراجہ جے سنگھ و اجیت سنگھ نے خوف و شک کی وجہ سے دربار میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا لیکن انہوں نے بادشاہ کو مطلع کیا کہ شاہی حکم کے مطابق انہیں جہاں بھی مقرر کیا جائے گا وہاں وہ خدمت کرنے کو تیار رہیں گے۔ انہوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اعتماد بحال ہونے پر جلد ہی دربار میں حاضری دیں گے۔ دونوں راجاوؤں نے مالوہ و گجرات اور مالوہ و برہانپور کی صوبہ داری کیلئے ذاتی تجویز رکھی۔ اس طرح کی مانگ یہ دونوں راجہ بہادر شاہ کے وقت سے کر رہے تھے۔ راجپوت راجاؤں کے اس برتاؤ سے فرخ سیر ناراض ہوا۔ فرخ سیر نے حسین علی' میر جملہ و خان دوراں کی موجودگی میں کہا ہمیں اس کے سلسلہ میں ہوش مندی اور تدبر سے کام لینا چاہئے۔ یہ ممکن نہیں کہ دونوں کو ایک ہی علاقہ کی سمت بھیجا جائے کیونکہ وہ حکومت کے مفادات کے خلاف ہوگا۔ اس طرح بہادر شاہ کی طرح فرخ سیر نے بھی راجپوت راجاؤں کی باہمی دوستی کو مغل شہنشاہیت کیلئے نقصان دہ سمجھا۔ جے سنگھ کو سات ہزار ذات سات ہزار سوار کا منصب اور مالوہ کی صوبہ داری عطا کی گئی۔ اجیت سنگھ کو ساتھ ہزار ذات سات ہزار سوار کا منصب عطا کیا گیا۔ لیکن اسے ٹھٹھہ کا صوبہ دار مقرر کیا۔ اس کا واضح مقصد دونوں راجاؤں کے درمیان مخالفت پیدا کرنا اور انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا تھا۔ جس میں کافی حد تک کامیابی ملی۔ جے سنگھ نے مالوہ کی صوبہ داری کی تجویز کو قبول کر لیا لیکن اجیت سنگھ نے جس کی نگاہیں گجرات پر لگی تھیں ٹھٹھ جانے سے انکار کر دیا۔ اسی وقت ناگور پر قبضہ کرنے کی خواہش سے اور پرانی دشمنی کے تحت اجیت سنگھ نے اندر سنگھ کے لڑکے محکم سنگھ و موہن سنگھ کو دلی میں قتل کرایا جو کہ شاہی منصب دار تھے۔ اجیت سنگھ کی ان حرکتوں سے فرخ سیر بہت ناراض ہوگیا اس لئے اجیت سنگھ کے خلاف خود فرخ سیر کی کمان میں ایک شاہی فوج بھیجنا طے کیا گیا لیکن بعد میں اس کی کمان میر بخشی حسین علی کو سونپ دی گئی۔ 6 جنوری 1714ء کو حسین علی نے ایک بڑی فوج کے ساتھ یہ مہم شروع کی۔ سیاسی نقطہ نظر سے مارواڑ کے خلاف اس شاہی مہم کا ایک اہم مقام ہے۔ سب سے پہلے یہ بات جان لینا ضروری ہے کہ راجپوت راجاؤں کے سلسلہ میں پالیسی

سے متعلق فرخ سیر اور سید برادران کی رائے مختلف تھیں۔ سید حسین علی راجپوت راجاؤں کا تعاون حاصل کرنے کیلئے ابتدا ہی سے پھرامیر کے وکیل جگ جیون رام سے پوشیدہ طور پر صلاح مشورہ کر رہا تھا۔ میواڑ کا وکیل بہاری داس بھی سیدوں کا گہرا دوست تھا۔ دوسری طرف فرخ سیر کا منصوبہ تھا کہ سید برادران میں اختلاف پیدا کرکے انہیں ایک دوسرے سے الگ کر دیں اور اس طرح انہیں برباد کر دیں۔ اس لئے حسین علی کو کوچ کے فوراً بعد بادشاہ نے اجیت سنگھ کو اس قسم کا ایک خط لکھا کہ اگر وہ حسین علی کو جنگ میں ہرا کر مار ڈالنے میں کامیاب ہو جائے تو اسے بادشاہ کا پورا اعتماد مل جائے گا لیکن اس پوشیدہ پرفریب منصوبہ کا نتیجہ فرخ سیر کی امید کے خلاف ہوا۔ حسین علی کو بادشاہ کے اس منصوبہ کا راز معلوم ہوگیا۔ ممکن ہے بادشاہ کا یہ خط اس کے ہاتھ لگ گیا ہو یا حسین علی سے صلح کرنے کے مقصد سے اجیت سنگھ نے اس راز کو افشا کر دیا۔ عبداللہ خاں نے بھی حسین علی کو خطوط لکھے جن میں اسے جلد ہی دربار میں واپس آنے کے لئے اصرار کیا کیونکہ بادشاہ کے مقربین کی وجہ سے وہ خود پریشان تھا۔ حسین علی اب تک اپنے خلاف فرخ سیر کے کاموں سے پوری طرح واقف ہوگیا تھا ان حالات کے تحت مارچ 1714ء میں حسین علی اور اجیت سنگھ کے مابین ایک سمجھوتہ ہوا۔ سمجھوتہ کے مطابق اجیت سنگھ نے اپنی لڑکی کی شادی فرخ سیر کے ساتھ کرنے اور اپنے بیٹے ابھے سنگھ کو میر بخشی کے ساتھ دربار میں بھیجنے و ضرورت پڑنے پر خود دربار میں حاضر ہونے کا وعدہ کیا۔ اجیت سنگھ نے پیش کش دینا اور ٹھٹھہ کی صوبہ داری بھی منظور کر لی لیکن اس سمجھوتہ کا سب سے اہم حصہ وہ تھا جو پوشیدہ طریقہ سے اجیت سنگھ و حسین علی کے مابین ہوا اس میں یہ طے کیا گیا کہ ,جیت سنگھ بادشاہ کا حکم مان کر ٹھٹھہ کی جانب روانہ ہو جائے گا لیکن جیسے ہی وہ کچھ منزلیں طے کرے گا اسے گجرات کی صوبہ داری کی تقرری کا پروانہ دیدیا جائے گا۔

حسین علی کی کارروائی واضح طور پر اس پالیسی کے خلاف تھی جس پر عمل درآمد کرنے کے مقصد سے مارواڑ بھیجا گیا تھا۔ اس نے دونوں راجاؤں کو الگ الگ صوبوں میں مقرر کرنے کی بانسبت انہیں مالوہ اور گجرات میں مقرر کرنے کا وعدہ کیا اور اس طرح راجاؤں کی وہ مانگ پوری ہوگئی جو وہ بہادر شاہ کے دور حکومت سے کرتے آرہے تھے۔ اس طرح یہ سمجھوتہ سید برادران اور راجپوتوں کے درمیان دوستی اور تعاون کی شروعات تھی۔

مندرجہ بالا واقعات نے 1714ء کے آخر میں فرخ سیر اور سید برادران کے اختلافات کو پھر سے پیدا کر دیا۔ دونوں گروہوں میں ٹکراؤ کی خاص وجہ یہ تھی کہ سید برادران حقیقی شاہی طاقت اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے۔ خافی خاں لکھتا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ جاگیر دینا منصب اور عہدہ دینا یا اس میں ترقی دینا وغیرہ کوئی بھی کام ان کی ماقبل صلاح کے بغیر نہ ہو اس کے خلاف فرخ سیر حالانکہ شاہی عہدہ کیلئے نا اہل تھا مگر وہ اپنے ذاتی اختیارات کو خود استعمال کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ سید برادران کی خواہشات کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وزیر اور بخشی کے روایتی اختیارات بہت بڑھ جائیں گے اور ایسی حالت میں بادشاہ محض نام کا

بادشاہ رہ جائے گا۔ فرخ سیر چاہتا تھا کہ وزیر بادشاہ کے صلاح کار کی حیثیت سے ہی کام کرے اور محکمہ مالگزاری کا حاکم بنا رہے لیکن آزادانہ طور پر اپنے اختیارات کا استعمال نہ کرے۔ ذوالفقار خاں کی طرح سید برادران وزیر کے عہدہ کو سب سے زیادہ طاقتور بنانا چاہتے تھے جس سے انہیں نئی پالیسیاں وضع کرنے کا موقع ملے۔ اختیارات کے بارے میں یہ دونوں مختلف نظریہ شروع ہی سے دکھائی دیتے ہیں۔ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ حکومت کے خاص عہدوں پر تقرری کے سوال پر وزیر اور بادشاہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف بنے رہے۔ بادشاہ نے اپنے آپ کو با اثر بنانے کیلئے جملہ کو داروغہ خواہان' داروغہ غسل خانہ کے عہدہ پر فائز کیا گیا اور خان دوراں کو داروغہ دیوان خاص و والاشاہیوں کے بخشی کے عہدے عطا کئے دونوں کو سات ہزار ذات اور سات ہزار سوار کے منصب دیئے گئے۔ ان دونوں امیروں کے تعاون سے ید برادران کے خلاف ایک گروہ ترتیب دیا گای۔ فرخ سیر کے ان دونوں معتمدین و مقربین نے انتظامیہ کے کاموں میں بھی مداخلت کرنا شروع کر دی۔ میر جملہ کو بادشاہ نے اپنی جانب سے حکم ناموں پر شاہی مہر لگانے کا اختیار دیدیا تھا۔ فرخ سیر نے باربار یہ بات دہرائی کہ میر جملہ کا دستخط اور قول میرا دستخط اور قول ہے۔ میر جملہ نے اس اختیار کا فائدہ اٹھا کر تقرریوں اور منصب میں ترقی وغیرہ کے کاغذوں کو بغیر دیوان وزارت کے پاس بھیجے شاہی مہر لگانا شروع کر دیا۔ یہ کام روایتی اصول کے خلاف تھا اور وزیر کی عزت پر سیدھی چوٹ تھی۔ ایسی تقرریوں میں وزیر کو تحائف یا پیش کش کی شکل میں کافی دولت ملتی تھی۔ اس لئے میر جملہ کے طریقہ عمل سے وزیر کو اقتصادی نقصان بھی ہوا ان سب وجوہات سے سیدوں کو اپنی حالت کی طرف زیادہ چوکس ہونا پڑا۔

مشکل یہ تھی کہ خود عبداللہ خاں حکومت کے کاموں کی طرف سے عدم دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ صرف ایک سپاہی تھا اسے حکومت کے انتظام اور مالیات کے کاموں میں دلچسپی کم تھی اس لئے یہ سب کام اس نے اپنے دیوان رتن چند کو سونپ دیئے تھے۔ حالانکہ چند مالیاتی کاموں میں ہوشیار تھا۔ وہ بہت زیادہ لالچی اور مغرور تھا اپنے وزیر کے لئے مناسب پیشکش حاصل کئے بغیر وہ کوئی بھی کام پورا نہیں کرتا تھا۔ میر جملہ نے ان غیر قانونی کارروائیوں کو روکنے کی کوشش کی۔ وہ خود منصب اور عہدہ کی تقرری کے لئے پیشکش نہیں لیتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ رتن چند کی شکایت پر عبداللہ خاں نے اسے یہ حکم دیا کہ وہ ایسے کسی بھی تقرر کو منظور نہ کرے جس میں میر جملہ کا ہاتھ ہونے کا شک ہو۔ ان کارروائیوں سے انتظامیہ کا کام رک گیا اور بادشاہ اور اس کے معتمدین اور سید برادران کے درمیان کشیدگی بڑھ گئی۔

ایک دوسرے نقطہ نظر سے بھی فرخ سیر کی سیدوں کے خلاف شکایت صحیح تھی۔ رتن چند کی وجہ سے اجارہ کا رواج عام ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ خالصہ زمین کو بھی اجارہ پر دیا جانے لگا تھا۔ جب کبھی بھی کسی عامل کا تقرر ہوتا تھا رتن چند اس سے ایک قول لکھوا لیتا تھا اور اس بنیاد پر پیشگی روپیہ مہاجنوں سے لیتا تھا۔ فرخ سیر اجارہ کو کسانوں اور حکومت دونوں کیلئے تباہ کن سمجھتا تھا اور اسے روکنے کیلئے اس نے فرمان جاری کیا تھا۔

اس حالت میں سید برادران کی طاقت کم کرکے اور اس امید پر کہ وہ اپنی مرضی سے اپنا عہدہ چھوڑ دیں فرخ سیر نے اپنے متعمدین کی فوجی طاقت بڑھانی شروع کر دی۔ میر جملہ کو پانچ ہزار سوار رکھنے کی اجازت دی گئی جن کی تنخواہ شاہی خزانہ سے دی جاتی تھی۔ اس کو لاہور صوبہ میں جو بڑا دولت مند اور زرخیز تھا جاگیریں دی گئیں۔ اس سے پہلے میر جملہ کو سات ہزار ذات سات ہزار سوار کا منصب اور بنگال کی صوبہ داری دی گئی تھی اور ان کیلئے دہلی و آگرہ صوبوں میں جاگیریں دی گئیں۔ اسے بھی سات ہزار کا منصب دیا گیا۔ ان دونوں کے دوسرے متعلقین کے عہدوں میں بھی غیر معمولی ترقی کی گئی۔ انہیں وجوہات سے عبداللہ خاں نے حسین علی کو مارواڑ سے جلد لوٹنے کیلئے خط بھیجے تھے۔

مارواڑ سے لوٹنے کے بعد اس دور کے حالات کو دیکھ کر سید برادران نے یہ نتیجہ نکالا کہ دربار میں اپنی حیثیت کو بنائے رکھنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ کسی دوسرے دولت مند صوبہ پر ان کا قبضہ ہو جائے تاکہ اس کے ذرائع کا استعمال کیا جا سکے۔ اس کے مطابق نظام الملک کو دکن کی صوبہ داری سے ہٹا کر حسین علی نے وہاں کی صوبہ داری اپنے نام لکھوا لی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ذوالفقار خاں کی طرح وہ دربار میں رہے اور اپنے نائب کے ذریعہ دکن کا انتظام چلائے اس لئے اس نے داؤد خاں کو دکن میں اپنا نائب مقرر کیا اور اس سے مقامی انتظام چلانے اور حسین علی کو سالانہ پیش کش دینے کے بارے میں معاہدہ کر لیا۔ یہ ایک نامناسب انتظام تھا لیکن فرخ سیر اسے آسانی سے نامنظور نہیں کر سکتا تھا کیونکہ کچھ دن پہلے اس نے اپنے معتمد میر جملہ کو بنگال کا صوبہ دار بنا کر وہاں کے نائب صوبہ دار مرشد قلی خاں کے ساتھ اسی طرح کے معاہدے کرنے کی منظوری دے دی تھی۔ میر جملہ کے مشورے سے فرخ سیر نے حسین علی کی تجویز نامنظور کر دی اور اسے حکم دیا کہ وہ بذات خود دکن جائے۔

اس حکم سے دربار میں ایک تشویشناک حالت پیدا ہوگئی۔ بہادر شاہ کی طرح فرخ سیر بھی وزیر میر بخشی اور دکن کی صوبہ داری تینوں کے تینوں عہدے ایک ہی خاندان کے لوگوں کو سونپنا شاہی خاندان کیلئے خطرناک سمجھتا تھا۔ برخلاف اس کے سید برادران ان تینوں میں سے کسی بھی عہدہ کو چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ اس لئے دکن میں حسین علی کے ذاتی طور پر جانے کے حکم کو فرخ سیر کی سیاسی چال سمجھتے تھے جس سے وہ دونوں بھائیوں کو ایک دوسرے سے الگ کرکے الگ الگ ان سے نمٹ سکے اس لئے فرخ سیر اور میر جملہ کی سیاسی چالوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے حسین علی نے اپنے بھائی کو دربار میں اکیلا چھوڑ کر دکن جانے سے انکار کر دیا۔

فرخ سیر نے اجیت سنگھ کے ساتھ حسین علی کے ذاتی معاہدہ کی بھی مخالفت کی اور اجیت سنگھ کے نام گجرات کی صوبہ داری کا فرمان جاری کرنے میں لیت و لعل سے کام لیا۔ اسی اثناء میں جس وقت کہ یہ سب جھگڑے ہو رہے تھے اس وقت حسین علی نے خود اپنے قتل کی ایک سازش کا پتہ لگایا۔ سید برادران کو یہ ڈر تھا کہ بادشاہ کے مددگاروں کے ذریعہ قتل کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس لئے انہوں نے دربار میں جانا چھوڑ دیا اور اپنی رہائش گاہ کے چاروں طرف

سخت پہرہ لگا دیا۔ اس طرح سید برادران نے یہ واضح کر دیا کہ وہ دھمکیوں سے نہیں ڈریں گے۔ حقیقت میں بادشاہ کے معتمد فوجی نقطہ نظر سے اپنے کو کمزور سمجھتے تھے انہوں نے بادشاہ کو محمد امین خاں کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کا مشورہ دیا جو ایک تجربہ کار جنگجو تھا لیکن اس کے انعام میں امین خاں خود وزیر بننا چاہتا تھا۔ بادشاہ کے صلاح کار اسے اور بھی خطرناک سمجھتے تھے کیونکہ بعد میں محمد امین کو وزیر کے عہدہ سے ہٹانا اور بھی مشکل ہوتا۔ اس سے فرخ سیر کے ہاتھوں میں طاقت نہیں آتی لیکن بادشاہ اور اس کے معتمدین صرف سیاسی چالوں سے سیدوں کو ان کے عہدہ سے ہٹانے میں نااہل تھے۔

حالات کو سمجھتے ہوئے فرخ سیر نے پھر سیدوں کے ساتھ صلح کرنے کی کوشش کی۔ فرخ سیر کی ماں سیدوں کے پاس گئی اور اپنے بیٹوں کی جانب سے انہیں یقین دلایا۔ آخر میں یہ طے ہوا کہ میر جملہ اور سید حسین علی دونوں اپنے اپنے صوبوں کو چلے جائیں۔ سیدوں نے یہ واضح کر دیا کہ میر جملہ کے چلے جانے کے بعد ہی حسین علی بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوگا۔ اس کے دربار میں حاضری کے وقت قلعہ کا کل انتظام سیدوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس سمجھوتہ کے مطابق 16 دسمبر 1712ء کو میر جملہ نے بنگال کے لئے کوچ کیا۔ 20 کو حسین علی بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا اس وقت قلعہ کا سارا نظم و نسق سید برادران کے ہاتھ میں تھا۔ یہ ایک ایسی عجیب بات تھی جس نے سیدوں کے خصوصی اختیارات واضح کر دیئے اور یہی بات بعد میں فرخ سیر کے لئے خطرناک ثابت ہوئی۔

20 مئی 1725ء کو حسین علی نے دکن کیلئے کوچ کیا۔ جاتے وقت حسین علی نے بادشاہ سے اجازت لی کہ دکن میں زمینداروں کا تقرر اور معزولی قلعہ کے محافظوں کا تقرر و تبادلے وغیرہ پورے اختیارات اس کے ہاتھ میں ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ فرخ سیر کو اس بات کیلئے بھی مجبور کیا گیا کہ حسین علی کو شاہی مہر دے دی جائے جس سے جاگیرداروں کے تبادلہ وغیرہ میں بادشاہ کی رسمی اجازت کی ضرورت نہ پڑے۔ جاتے وقت حسین علی نے فرخ سیر کو یہ تنبیہ کی کہ اگر اس نے میر جملہ کو دربار میں واپس بلایا تو وہ تین ہفتوں ہی میں دکن سے واپس آ دھمکے گا۔

اس طرح طاقت کیلئے یہ پہلا ٹکراؤ ختم ہوا۔ ظاہراً" اس کا نتیجہ سیدوں کی فتح تھی کیونکہ بادشاہ سید برادران کو ان کے عہدہ سے ہٹا نہیں سکے بلکہ اس نے سیدوں کی اس ہتک آمیز شرط کو بھی منظور کیا کہ بادشاہ کے دربار میں سیدوں کے حاضر ہونے سے پہلے قلعہ کا سارا انتظام انہیں سونپ دیا جائے گا۔ اس طرح بادشاہ ان کے خصوصی اختیارات قبول کرے۔ اتنا ہونے پر بھی اس چپقلش نے سیدوں کو اپنی کمزوریوں سے آگاہ کرا دیا اور انہیں سمجھوتہ کیلئے مجبور کیا۔ انہیں یہ احساس ہوا کہ بادشاہ کے مددگاروں۔۔ کے ساتھ ہی دربار کا ایک طاقتور گروہ ان کی مخالفت کر رہا ہے۔ ان کا قائد امین خاں تھا۔ بارہا کے سید تعداد میں کم تھے اور صرف اپنی طاقت پر سید برادران کا اثر بنائے رکھنے میں نااہل تھے۔ جس وقت سید برادران کو ہٹائے جانے کی افواہ پھیلی بہت سے سادات بارہا نے بھی ان کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا اس لئے انہوں نے ایک

بڑے علاقہ پر اپنا اثر جمانا ضروری سمجھا لیکن یہ جب ہی ممکن تھا جب دونوں بھائیوں میں سے ایک ذاتی طور پر اس علاقہ کا انتظام سنبھالے۔ ممکن ہے اس وجہ سے حسین علی دکن کو جانے کے لئے تیار ہوگیا۔ اس طرح جس مسئلہ کو لے کر جھگڑا شروع ہوا تھا اس پر سیدوں کو جھکنا پڑا۔ وہ بادہ کے متعمد خاں دوراں کو نائب میر بخشی کا عہدہ دینے کو رضامند ہوگئے۔ میر جملہ کو دربار چھوڑ کر اپنے صوبہ کی طرف جانا پڑا مگر فرخ سیر نے اس کے ساتھ سات ہزار مغل سپاہی بھیجے جو کسی بھی صوبہ دار کو نہیں دیئے جاتے تھے۔ اس لئے میر جملہ کی جانب سے سیدوں کو پھر بھی خطرہ بنا رہا۔ ساتھ ہی سمجھوتہ کے بعد بھی سیدوں کے لئے بادشاہ کی تلخی کسی بھی طرح کم نہ ہو سکی۔ حقیقت یہ تھی کہ جیسے ہی حسین علی نے پیٹھ پھیری بادشاہ نے داؤد خاں پنی کو خفیہ حکم بھیجا کہ اس کا گجرات سے برہان پور تبادلہ کر دیا گیا۔ اور کہ یہ وہ حسین علی کو روکے۔ داؤد خان تیزی کے ساتھ کوچ کرتا ہوا 13 اگست کو برہان پور پہنچا۔ 6 ستمبر کو حسین علی اور داؤد خاں کی جنگ ہوئی جس میں داؤد خاں کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ فرخ سیر کے خفیہ خطوط حسین علی کے ہاتھ آگئے جس سے اس کے سلسلہ میں بادشاہ کی دوہری پالیسی واضح ہوگئی۔

دکن کی صوبہ داری سے ہٹانے کی وجہ سے نظام الملک سیدوں سے ناراض ہوگیا۔ دکن سے دلی لوٹتے وقت وہ راستہ میں حسین علی کے پڑاؤ سے دو تین میل کے فاصلہ پر نکلا لیکن پرانے اصولوں کے تحت اس نے جاکر حسین علی سے ملاقات نہیں کی۔ محمد امین خاں وزارت کے عہدہ کے لالچ سے سیدوں کی مخالفت کر ہی رہا تھا اس لئے عبداللہ خاں کو اس بااثر گروہ کا سامنا بھی کرنا تھا۔

اس طرح طاقت کے تجربہ کے اس دور میں کوئی بھی بنیادی مسئلہ حل نہ ہوسکا۔ عبداللہ خاں سازشی بادشاہ کا سامنا کرنے کیلئے دربار میں کچھ وقت کیلئے اکیلا رہ گیا۔ مسئلہ کا حل تب ہی ہو سکتا تھا جبکہ دونوں میں سے ایک گروہ اتنی طاقت حاصل کر لیتا کہ دوسرا اس کے سامنے نہ لڑ سکے۔

حامیان فرخ سیر اور سید برادران کے درمیان

نئی وزارت کیلئے کشمکش

حسین علی کے دکن کو کوچ کرنے کے بعد کچھ برسوں تک فرخ سیر اور سید برادران اپنے اپنے حمایتی کی تعداد بڑھانے میں مشغول رہے۔ فرخ سیر نے پرانے امیروں خاص کر محمد امین خان' نظام الملک اور اس کے حمایتوں کا تعاون حاصل کرنے کی جانب غور کیا۔ اس نے جے سنگھ اور اجیت سنگھ کو بھی اپنی طرف ملانے کی کوشش کی۔ دوسری طرف سید عبداللہ خاں و حسین علی خاں نے پرانے امیروں و راجپوتوں کی حمایت حاصل کرنے اور مراٹھا' جاٹ وغیرہ دوسرے عناصر سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔

اس کشمکش کے نتیجہ میں انتظامیہ میں ڈھیل آگئی اور حکومت کی حالت روزبروز بگڑنے لگی۔ عبداللہ خاں نے اپنے دیوان و خاص صلاح کار رتن چند پر انتظام کا سارا بوجھ ڈال دیا۔ اس کے نتیجہ میں انتظامیہ کے سب ہی شعبوں پر اس کا اثر قائم ہوگیا۔ یہاں تک کہ قاضیوں کے تقرر میں بھی اس کا ہاتھ رہتا تھا۔ خاص طور سے مالگزاری کے محکمہ میں اس کا اثر اتنا بڑھ گیا تھا کہ کسی بھی فرد کو اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کی مخالفت کر سکے۔ محکمہ مالگزاری کے دونوں خاص افسر دیوان تن و دیوان خالصہ کا ٹھیکہ دینا شروع کر دیا یہاں تک کہ خالصہ زمین بھی ٹھیکہ پر دی جانے لگی۔ ان کارروائیوں کے نتیجہ میں خالصہ و جاگیر کی زمین کی مالگزاری گھٹنے لگی لیکن اس طرح رتن چند اپنے آقا کیلئے کافی مقدار میں دولت اکٹھی کرنے میں کامیاب ہوا۔ جب عبداللہ خاں کبھی بھی کسی عامل کا تقرر کرتا تھا رتن چند اس سے پیشگی روپیہ دینے کا پٹہ لکھا لیتا تھا اور اتنی رقم ساہوکاروں سے وصول کر لیا تھا۔ فرخ سیر نے ان غیرقانونی کاموں کو روکنے کی کوشش کی لیکن عبداللہ خاں نے اس کے ان اعتراضات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔

ان حالات میں جاگیرداروں کی حالت اور بھی بگڑنے لگی۔ جاگیروں کی کاغذی آمدی (جمع) اور حقیقی آمدنی (حاصل) کے درمیان بڑھتے ہوئے فرق سے ان کیلئے اپنی روزی کمانا مشکل ہوگیا۔ چھوٹے منصب دار کے لئے یہ اور بھی مشکل تھا۔ اس حالت میں دیوان رتن لطف اللہ خاں نے پچاس سے سو ذات تک کے منصب داروں کو جاگیروں کے بدلے نقد روپیہ دینا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ رقم جاگیروں کی نسبت بہت کم تھی اور باقاعدہ بھی نہیں دی جاتی تھی اس کے نتیجہ میں بہت سے امیروں جن میں بڑے امیر بھی شامل تھے سوار رکھنا بند کر دیا

متصدیوں سے مل کر سواروں کی چھوٹی فہرست بھیجنے لگے اس طرح نظام کا پوری طرح زوال ہونے لگا۔

ان کارروائیوں کے پس پردہ نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرہ میں مہاجنوں میں ٹھیکیداروں تعلقداروں وغیرہ کا اثر بڑھنے لگا۔ یہ بات بہت سے پرانے خاندان کے لوگوں اور امیروں کو اکھرنے لگی۔ ان کے جذبات کی جھلک ہمیں خافی خاں کے اس بیان سے ملتی ہے کہ رتن چند کے زمانہ میں بارہا اور بنیوں کے علاوہ کسی پر بھی نظر کرم نہیں کی جاتی تھی اور ہر ایک صوبہ کے امیر بے عزتی اور غیر یقینی کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔ ایک اور ہمعصر مصنف خوشحال خاں کے مطابق رتن چند نے مالگزاری کے اصول کی جگہ پر دکانداری کے اصول رائج کر دیئے یا دوسرے الفاظ میں اس نے ہر ایک چیز کو بکری کیلئے رکھ دیا۔

اس طرح انتظام کمزور ہوتا جا رہا تھا اور شاہی دربار سیاسی کشمکش کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ حالت یہ تھی کہ جب کبھی بھی بادشاہ شکار کیلئے یا کسی دوسری جگہ پر سواری کرنے کی تیاری کرتا تھا تو عام طور سے یہ افواہ پھیل جاتی تھی کہ اس کا مقصد سید عبداللہ پر حملہ کرنا ہے۔ عبداللہ خاں نے اپنی حفاظت کیلئے ایک مستقل فوج بھرتی کر لی تھی جس کی تعداد 15 سے 20 ہزار تھی۔ دربار میں بہت سے دشمن ہونے کی وجہ سے عبداللہ خاں کی حفاظت کیلئے یہ سپاہی بھی کافی نہیں تھے۔ اس لئے جب کبھی بادشاہ شکار کیلئے سواری پر نکلتا عبداللہ خاں اور سپاہی بھرتی کر لیتا تھا۔

سید برادران اپنی حالت اور اپنی مشکلات سے ٹھیک طرح سے اس واقف تھے۔ اس لئے اختیارات حاصل کرنے کے سوال کو آخری طور پر حل کرنے کے مقصد سے وہ ضروری ذرائع مہیا کرنے میں لگ گئے۔ واقعات بھی ان کے حق میں ہوتے چلے گئے جس سے انہیں اپنی خواہش کی تکمیل کا مناسب موقع مل گیا۔

جنوری 1716ء میں میر جملہ بڑی پریشان حالت میں اچانک دلی پہنچا اس سے پہلے بہار کو کوچ کرتے وقت اس کے ساتھ سات ہزار زائد مغل سپاہی مقرر کئے گئے تھے۔ سپاہیوں کی زائد تعداد کے خرچ کیلئے اسے نو لاکھ روپے دیئے گئے جس میں سے کچھ نقد دیئے گئے تھے اور باقی بنگال صوبے کی آمدنی سے دیئے گئے تھے لیکن میر جملہ پٹنہ سے آگے نہیں بڑھا۔ پٹنہ میں رہ کر میر جملہ بہار کے زمینداروں پر جو ہمیشہ سے سرکش اور باغی سمجھے جاتے تھے' قابو پانے میں ناکام رہا۔ ساتھ ہی اس نے غلط طریقے سے خرچہ کیا جس کی وجہ سے مغل سپاہیوں کی تنخواہ نہیں دے سکا۔ نتیجتاً غیر مطمئن سپاہیوں نے عوام سے دولت اکٹھی کرنے کیلئے ظالمانہ اور غیر قانونی طریقے اپنائے۔ دوسری طرف میر جملہ نے شاہی اختیارات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے سامنے شیر کی لڑائی کروانا وغیرہ کا شروع کر دیئے۔ ان سب کاموں کی اطلاع بادشاہ کے پاس پہنچی۔ اسی وقت میر جملہ نے تیس لاکھ روپے کا خزانہ جو ہر سال دہلی بھیجا جاتا تھا ہتھیا لیا اور غلط طریقہ سے خرچ کر دیا۔

اس کے نتیجے میں نومبر 1715ء میں میر جملہ کو بہار کے صوبے دار کے عہدے سے

ہٹا لیا گیا۔ اس کی جگہ سربلند خاں کو وہاں کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ بنگال کی غیر حاضر صوبے داری سے بھی اسے ہٹا دیا گیا۔ اس طرح میر جملہ ایک کے بعد ایک مشکلات کا شکار ہوگیا۔ اب اس کے پاس ایک ہی امید بچی تھی کہ وہ اپنے پرانے کرم فرما بادشاہ سے خود گزارش کرے اس لئے وہ بغیر پیشگی اجازت و اطلاع کے دہلی پہنچا۔ اس کے ساتھ ہی سات آٹھ ہزار مغل سپاہی بھی دارالحکومت پہنچے جنہیں گزشتہ بارہ تیرہ مہینوں سے تنخواہ نہیں ملی تھی۔ ان سپاہیوں نے وہاں پہنچ کر میر جملہ کی رہائش گاہ پر گھیرا ڈال دیا اور دارالحکومت میں ہنگامہ کرنا شروع کر دیا۔ عبداللہ خاں کو شک تھا کہ یہ سب اس کے اوپر حملہ کرنے کا بہانہ ہے اس لئے اس نے اپنے سپاہیوں کی تعداد اور بڑھانی شروع کر دی اور فوجی ٹکراؤ کی تیاری کر لی۔ سید جو عبداللہ خاں کو اپنا رشتے دار سمجھتے تھے اس کی حفاظت کے لئے بڑی تعداد میں دلی پہنچ گئے۔

فرخ سیر اس ٹکراؤ کیلئے تیار نہیں تھا۔ غصے میں اس نے میر جملہ کا منصب اور جاگیر چھین لی۔ ایسی حالت میں میر جملہ اپنے پرانے دشمن عبداللہ خاں کی پناہ میں آیا اور اس سے مدد کی درخواست کی۔ عبداللہ خاں کے درمیان میں پڑنے سے اسے لاہور کا قاضی مقرر کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ وہ دربار میں حاضر ہوئے بغیر ہی چلا جائے۔ عبداللہ کی سفارش سے سات آٹھ ماہ بعد اسے اس کا پرانا منصب و خطاب بھی دوبارہ عطا کر دیئے گئے۔ ان واقعات کا نتیجہ یہ کہ عبداللہ خاں کے راستے سے ایک کانٹا ہٹ گیا اور اب وہ اپنے کو نسبتاً زیادہ محفوظ سمجھنے لگا۔ فرخ سیر کی حالت اور بگڑ گئی۔

عبداللہ خاں کی طاقت اور اہلیت کا پتہ سرزمین سفارتی وفد کی کارروائیوں سے چلتا ہے۔ یہ سفارتی وفد برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے بادشاہ کے دربار میں بھیجا گیا تھا اس کا مقصد کمپنی کیلئے بنگال بہار اور اڑیسہ میں آزادانہ تجارت کی سہولتیں حاصل کرنا تھا۔ کمپنی کے ذریعے پیش کی گئیں دو درخواستیں اس لئے منظور نہ ہو سکیں کہ وہ خان دوراں کے ذریعہ بھیجی گئی تھی۔ انگریز سفارتی وفد کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ ساری طاقت خان دوراں کے ہاتھ میں ہے اور وزیر صرف ایک کٹھ پتلی ہے۔ آخر میں عبداللہ خاں کے کہے پر فرخ سیر نے کمپنی کو ایک مقررہ رقم دینے کے وعدے پر اسے ساری مغل حکومت میں اپنا مال لانے اور بیچنے کا اختیار دیدیا۔ اس فرمان کا انگریز نے جان بوجھ کر یہ مطلب نکالا کہ وہ ملک کی اندرونی تجارت میں بھی بغیر محصول دیئے حصہ بنا سکتے ہیں۔ حقیقت میں فرخ سیر نے اس فرمان سے انہیں اسی طرح کے اختیارات دیئے جیسے 1656ء میں بنگال کے صوبے دار شاہ شجاع کے ذریعے انہیں دیئے گئے تھے۔ کمپنی کیلئے حیرت کی بات یہ تھی کہ ان سب کاموں کیلئے وزیر نے ایک پیسہ بھی نہیں لیا جبکہ انگریزوں کا یہ مستحکم خیال تھا کہ "دلی میں ہر چیز بکاؤ ہے۔"

مندرجہ بالا واقعات نے وزیر کے اثر اور اختیارات کی افضلیت اور اہمیت کو واضح کر دیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مالگزاری و مالیات دونوں معاملوں میں وزیر کی فضیلت کو تسلیم کر لیا گیا۔

فرخ سیر کی تخت سے برطرفی : میر جملہ کی جانب سے مایوس ہونے کے بعد فرخ سیر نے پھر سے امیروں کے طاقتور گروہ کی تشکیل کرنے اور ان کے ذریعہ طاقت حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ سب سے پہلے اس نے جے سنگھ کو اپنی طرف ملانے کی کوشش کی۔ مالوہ کے صوبہ دار کی شکل میں 1715 میں جے سنگھ نے مراٹھوں کو نربدا کے پار بھگا کر ان کے خلاف اہم کامیابی حاصل کی تھی۔ اس زمانہ میں کے اخبارات میں اس کو اورنگ زیب کے بعد سب سے بڑی فتح بتایا گیا۔

حالانکہ راجہ جے سنگھ کو مالوہ کی صوبے داری دلانے میں سید حسین علی کا خاص ہاتھ تھا۔ لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر جے سنگھ سید برادران سے ناراض تھے۔ کوٹہ بوندی ریاست کی خانہ جنگی میں حسین علی کی مداخلت سے ہی جے سنگھ کے بہنوئی بدھ سنگھ کو حکومت کے حق سے محروم ہونا پڑا تھا۔ جاجوں کی جنگ میں بدھ سنگھ نے بہادر شاہ کی طرف سے جنگ کی تھی جس کی وجہ سے اسے کوٹہ کے قلعے کے ساتھ چون قلعے دیئے گئے۔ رام سنگھ ہاڑا کے بیٹے بھیم سنگھ کو کوٹہ سے ہٹا دیا گیا کیونکہ اس نے اعظم شاہ کی طرف داری کی تھی لیکن بھیم سنگھ نے کوٹہ پر اپنا قبضہ چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا۔ فرخ سیر کے تخت نشین ہونے پر وہ دلی پہنچا۔ اس نے حسین علی کی عنایات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف بدھ سنگھ نے دربار میں حاضر ہوتے کے شاہی حکم کو ٹھکرایا ہی نہیں بلکہ جس وقت حسین علی نے اجیت سنگھ کے خلاف حملہ کیا اس نے دشمنوں کی طرح کے کام کئے اور کوٹہ پر قبضہ کر لیا لیکن بھیم سنگھ نے جلد ہی کوٹہ پر پھر اپنا قبضہ قائم کر لیا۔ اس نے حسین علی کے اشرے پر بوندی پر بھی قبضہ کر لیا اور بادشاہ نے رسمی طور سے اس کی اجازت اسے عطا کر دی۔ غصے میں آکر بدھ سنگھ اجین میں جے سنگھ سے ملا اور اس سے بادشاہ سے سفارش کرنے کا وعدہ لیا۔ اسی وقت سے سید برادران اور جے سنگھ کے تعلقات بگڑنے لگے۔ دکن جاتے وقت جب حسین علی مالوہ سے گزر رہا تھا تب جے سنگھ نے اس کا خیر مقدم کرنے سے انکار کر دیا اور ایک باغی زمیندار کو سزا دینے کا بہانہ بنا کر اجین سے بھلسا کی جانب چلا گیا۔ اس زمانے کی روایت کے مطابق جے سنگھ کا یہ کام تہذیب کے خلاف تھا۔ حسین علی نے بادشاہ سے اس کی شکایت کی۔ جے سنگھ کی ناراضی کی دوسری وجہ تھی سیدوں کا جاٹوں کو پس پردہ تعاون دینا۔ جے سنگھ اپنی ریاست کی سرحد کے پاس چوڑامن جاٹ کی قیادت میں جاٹ قوت کے بڑھنے سے فکرمند تھا۔ چوڑامن جاٹ کے لوٹ مار کے کاموں سے بے چین ہونے کے علاوہ اورنگ زیب کے وقت سے ہی امیر گھرانے اور جاٹوں میں دشمنی تھی۔ راجہ رام سنگھ نے راجہ رام کے خلاف بہت سی لڑائیاں لڑی تھیں۔ راجہ رام کے مرنے کے بعد بھجہ کا بیٹا چوڑامن جاٹوں کا قائد بنا کچھ زمانے تک چوڑامن معمولی طور پر لوٹ مار کے کاموں میں لگا رہا لیکن جاجوں کی جنگ کے بعد منام خاں کے توسل سے وہ بہادر شاہ کے روبرو حاضر ہوا اور اسے پندرہ سو ذات پندرہ سو سوار کا منصب دیکر آگرہ و دہلی کے بیچ کے ماڈی کا محافظ مقرر کیا گیا۔ سکھوں کے خلاف مہم میں اس نے بہادر شاہ کا ساتھ دیا اور سادھو اور لوہ گڑھ کے محاصرہ کے وقت موجود

رہا۔ لاہور کی جنگ میں وہ عظیم الشان کی طرف تھا لیکن اس نے لوٹ مار کے علاوہ کچھ کام نہیں کیا۔ جہاندار شاہ نے اسے معاف کر دیا اور اسے خلعت دی اسے فرخ سیر کے خلاف مہم میں ساتھ دینے کا حکم دیا۔ چوڑامن جہاندار کی جانب سے لڑا لیکن جب جنگ کا رخ جہاندار شاہ کے حق میں نہ رہا تو چوڑامن نے لوٹ مار شروع کر دی اور اس کے جاٹ سپاہیوں نے حرم سرا کے ڈیروں کو لوٹ لیا۔

فرخ سیر کے دور حکومت کے ابتدائی زمانے میں چھبیلا رام کو آگرے کا صوبے دار مقرر کیا گیا اور اسے حکم دیا گیا کہ باغی جاٹ سرداروں کو کچل دے۔ چھبیلا رام نے جاٹ قوت کو کچلنے کیلئے زائد فوجی گروہوں کا تقرر کیا لیکن وہ اس کام میں ناکام رہا کیونکہ اسے مقامی زمینداروں کی تائید حاصل نہیں ہوئی۔ لوگوں کو یہ شک تھا کہ چوڑامن کو سیدوں کی حمایت حاصل ہے۔ چھبیلا رام کے ناکام ہونے پر اس کی جگہ پر خان دوراں کی تقرری کی گئی۔ خان دوراں کی کوششوں سے چوڑامن دربار میں حاضر ہوا اور وہاں اس نے آقا سے وفاداری جتائی۔ اس لئے اسے دہلی سے چمبل کے ماڈی کا محافظ مقرر کیا گیا۔ کچھ وقت کے بعد ہی چوڑامن باغی ہوگیا اس نے شاہی علاقے میں موجود بہت سے پرگنوں پر قبضہ کر لیا اور جاگیرداروں کی جاگیروں میں مداخلت کی۔ بادشاہ کے پاس یہ شکایتیں آنے لگی تھیں کہ وہ غیر قانونی طریقے سے راہداری وصول کر رہا ہے اور ہتھیار جمع کر رہا ہے۔ چوڑامن نے تھوٹ میں اپنا گڑھ بنایا جہاں سے وہ اپنی کارروائیاں کرتا تھا۔

ان حالات میں ستمبر 1715ء میں فرخ سیر نے جے سنگھ کو اس مطلب کا خط بھیجا کہ وہ راؤ راجہ بدھ سنگھ' چھتر سال بندیلہ اور راٹھور درگا داس کے ساتھ دربار میں حاضر ہو۔ بادشاہ نے جاٹوں کے خلاف شاہی فوج کی کمان جے سنگھ کو دینے اور بدھ سنگھ کو بوندی دینے کا وعدہ کیا اسے خصوصی شاہی مراعات کے بارے میں بھی امید دلائی گئی۔

سیاسی چالوں کی نظر سے فرخ سیر کی یہ پالیسی انتہائی اہم تھی۔ اس سے ایک ساتھ دو مقصد پورے ہوتے تھے۔ اول جاٹوں کی طاقت کا کچلنا دوئم جے سنگھ کی حمایت حاصل کرنا۔ جے سنگھ جاٹوں کی طاقت کو کچلنے کا خواہشمند ہوتے ہوئے بھی دربار کی سیاست سے دور رہنا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ دربار حاضر نہ ہو کر سیدھا امیر چلا گیا۔ جون 1716ء میں فرخ سیر کے دوبارہ بلانے پر ہی وہ دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے حکم جاری کیا کہ بھیم سنگھ کو بوندی سے ہٹا کر اسے خالصہ میں لے لیا جائے اور بعد میں یہ جگہ بدھ سنگھ کو دے دی جائے۔ اس کے بعد جے سنگھ کو جاٹوں کے خلاف مہم کی کمان سونپی گئی یہاں یہ قابل ذکر ہے کہ ان معاملات کے فیصلے عبداللہ خاں سے کوئی صلاح و مشورہ نہیں کیا گیا۔

جے سنگھ نے پچاس ہزار شاہی سپاہیوں کے ساتھ نومبر 1716ء میں جاٹوں کے مرکز تھون پر حملہ کیا لیکن گھنے جنگل' ٹوٹے ہوئے راستوں' رسد کی کمی اور مقامی زمینداروں کے دشمنانہ رویے کی وجہ سے جے سنگھ کو جلدی کامیابی حاصل نہ ہو سکی ایک سال اور چھ ماہ کے

مسلسل ٹکراؤ کے بعد آخر میں فرخ سیر کو صلح کیلئے کوششیں کرنی پڑیں۔ اس کام کیلئے عبداللہ خاں کے چچا خان جہاں کو ظاہری طور پر جے سنگھ کی مدد لیکن حقیقت میں اس کے کاموں میں رکاوٹ ڈالنے کیلئے بھیجا گیا۔ عبداللہ خاں کا مقصد جے سنگھ کو نیچا دکھانا تھا۔ خان جہاں کی کوششوں سے جاٹوں کے ساتھ صلح ہو گئی۔ اس صلح کے مطابق چوڑامن نے بادشاہ کو پچاس لاکھ روپیہ نقد اور دوسرے قیمتی تحائف دینا اور وزیر کو ذاتی ملاقات کے وقت 20 لاکھ روپیہ دینا منظور کر لیا۔ اس نے تھون' ڈیل وغیرہ مقامات پر سے اپنا قبضہ چھوڑ دیا اور وعدہ کیا کہ جہاں کہیں بھی اسے مقرر کیا جائے گا وہ خدمت کرنے کو تیار رہے گا۔

یہ صلح جے سنگھ کی ذاتی طور پر بے عزتی اور سیدوں کی سیاسی جیت سمجھنا چاہئے۔ جاٹوں کی جنگ نے سیدوں اور فرخ سیر کے تعلقات میں اور بھی زیادہ الجھن پیدا کر دی۔ اسی وقت سید برادران نے حکومت کے ایک باغی دشمن کے ساتھ سمجھوتہ کرکے دربار کی گروہ بندی کو ایک نیا موڑ دیا۔

جاٹوں کی جنگ کا خاتمہ ہوتے ہوتے سید برادران و فرخ سیر کی کشمکش میں کچھ اہم خصوصیات دکھائی دیتی ہیں۔ فرخ سیر نے اب یہ مان لیا۔ پرانے تجربہ کار امیروں کی بربادی اس کیلئے فائدہ مند نہیں تھی بلکہ ان امیروں کا سیدوں کے خلاف استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے اس نے اورنگ زیب کے زمانے کے امراء کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ فرخ سیر کے دور حکومت کے شروع میں عنایت اللہ خاں جو اپنے بیٹے کو پھانسی دیئے جانے کے بعد مکہ چلا گیا تھا 1717ء کے شروع میں لوٹ آیا۔ عنایت اللہ اورنگ زیب کے ماتحت کام کر چکا تھا اور اس پر اورنگ زیب کی خصوصی مہربانیاں تھیں۔ اسے انتظامیہ کا تجربہ تھا اور وہ کفایت شعاری کے لئے مشہور تھا۔ فرخ سیر نے اپنے حمایتوں کے مشورے سے اسے دیوان تن و خالصہ کے عہدے پر مقرر کیا اور اپریل 1717ء میں اسے چار ہزار کا منصب دیکر کشمیر کے غائبانہ صوبے دار کا عہدہ دیا۔

اس زمانے کے انتظامیہ کے ڈھانچہ میں مالگزاری کے معاملات میں عبداللہ خاں کے اختیار و اثر کو دھیان میں رکھتے ہوئے عنایت اللہ نے وزیر کے مشورے کے بغیر دیوان تن کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کچھ دنوں بعد اخلاص خاں کی کوششوں سے یہ سمجھوتہ ہوا کہ عنایت اللہ خاں مالگزاری کے معاملات میں وزیر عبداللہ خاں کے صلاح و مشورے کے بغیر کسی بھی تجویز کو منظور نہیں کرے گا۔ وزیر بھی اس بات کیلئے متفق ہوگیا کہ وہ ہفتہ میں ایک یا دو بار دیوان خاص میں بیٹھے گا اور وزارت کا سارا کام رتن چند پر نہیں چھوڑے گا۔ اس سے پہلے عبداللہ خاں قلعے کے دیوان خاص میں چار پانچ ماہ سے نہیں گیا تھا۔

حقیقت میں سمجھوتہ صرف دکھاوا تھا جو حالات کو سدھارنے میں کامیاب نہ ہوا کچھ وقت کے بعد پالیسی سے متعلق متضاد خیالات کی وجہ سے کشمکش پھر شروع ہوگئی۔ اورنگزیب کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے عنایت اللہ خاں نے مکہ کے شریف کا ایک خط پیش کیا جس میں جزیہ کو

شرع کے مطابق واجب بتایا گیا تھا۔

اس کے بعد جاگیروں اور منصبوں کی آمدنی کی جانچ پڑتال کر کے عنایت اللہ خاں نے کچھ لوگوں کے منصب اور جاگیریں چھیننے یا کم کرنے کی تجویز رکھی اس نے یہ الزام لگایا کہ ہندو' ہیجڑے اور کشمیری زور زبردستی و چالاکی سے اپنی اوقات سے زیادہ منصب حاصل کئے ہوئے ہیں اور سیر حاصل جاگیروں پر قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ کمینے لوگ' چاہے وہ دیوانی اور بخشی کے دفتر سے متعلق ہوں یا خان ساماں کے دفتر سے' منصب دار بن گئے ہیں اور انہوں نے جاگیریں حاصل کر لی ہیں اور پرانے خاندان کے لوگوں کے سر پر خاک پڑ گئی ہے۔

ممکن ہے ان تجاویز کے پیچھے عنایت اللہ خاں کا مقصد انتظام میں بے اصولی اور بدانتظامی کو ختم کرنا تھا لیکن اس کا نتیجہ دوسرا ہی ہوا جزیہ دوبارہ لگانے کی تجویز سے ہندو ناراض ہوگئے۔ دوسری تجویز بھی درمیانی طبقے کے عہدیداروں کے خلاف تھی جن میں ہندوؤں اور ہندوستانی مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی اس لئے ان لوگوں نے ان دونوں تجاویز کی مخالفت کی۔ رتن چند کی مخالفت کی وجہ سے عبداللہ خاں نے بھی ان اصلاحات کی منظوری نہیں دی اس طرح عنایت اللہ خاں کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا وہ ٹوٹ گیا۔ خافی خاں لکھتا ہے کہ اس کے بعد ہندو عنایت اللہ خاں کے دشمن ہوگئے اور ہر طرح سے اس کی مخالفت کرنے لگے۔

عنایت اللہ خاں کی تجاویز کی مخالفت کرنے سے عبداللہ خاں کو دفتروں کے حاکموں اور ہندوؤں کی حمایت حاصل ہوئی اس وقت سے ہی سید برادران ہندوؤں اور ہندوستانیوں کے حمایتی گنے جانے لگے پھر بھی یہ کہنا مشکل نہیں کہ یہ کشمکش ہندوستانیوں اور مغلوں کے مابین تھی یہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ سیدوں نے اعلیٰ عہدوں پر اپنی یا کسی خاص طبقے یا گروہ کی اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش نہیں کی اس کے برخلاف انہوں نے پرانے امیروں کا تعاون حاصل کرنے اور انہیں خوش رکھنے کیلئے اعلیٰ عہدے دیئے۔ ذاتی مفادات کی حفاظت کیلئے کی گئی دربار کی گروہ بندی نے اب آگے بڑھ کر ایک سیاسی کشمکش کی شکل اختیار کر لی۔ یہ گروہ ذات یا مذہب کی بنیاد پر نہیں تھے۔ سیاسی نقطہ نظر سے اہم سوال یہ تھا کہ راجپوتوں کے برابر جاٹوں اور مراٹھوں کو اعلیٰ منصب وغیرہ دیکر حکومت کا وفادار بنانے کی کوشش بہتر ہے یا نہیں۔ یہ سوال کوئی نیا نہیں تھا اورنگ زیب کے سامنے بھی یہ سوال تھا اورنگ زیب کے دور حکومت میں اور اس کی وزارت کے بعد شاہی فوجوں کے عزت و احترام کو کافی ٹھیس پہنچی تھی کیونکہ مراٹھوں اور کچھ حد تک جاٹ اور سکھوں نے بھی گوریلا طریقہ جنگ کو اپنا لیا تھا جس سے فیصلہ کن جنگ ناممکن ہوگئی تھی۔ مغل شہنشاہیت کی اتحاد و استحکام میں بھی گراوٹ آگئی تھی ان حالات میں اور دربار میں مخالف گروہوں کی کارروائیوں کی وجہ سے سید برادران نے مراٹھا اور جاٹوں کے ساتھ صلح کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ سیدوں نے یہ محسوس کیا کہ ہندوؤں کی تائید حاصل کرنے کیلئے مذہبی خیر سگالی ضروری ہے انتہا پسندی اور دقیانوسی پالیسیوں کے حمایتی گروہ نے سیدوں کی ان پالیسیوں کی مخالفت کی۔ ان پر شرع کے مطابق کام نہ کرنے اور ہندوؤں کے حق میں ہونے کا الزام لگایا

اور اس طرح "مذہب خطرے میں ہے" کے نعرے کو پھر سے بلند کیا۔ اس گروہ نے اورنگ زیب کی پالیسی کو صحیح و مناسب مانا۔ بقول ستیش چندر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سیدوں کی پالیسی حقیقت میں اکبر کی آزاد خیالی اور خیرسگالی کی پالیسی پر قائم تھی۔ وہ ایک ایسی حکومت کا تصور کرتے تھے جس میں تمام عناصر کا تعاون ہو برخلاف اس کے ان کے مخالفین اورنگ زیب کی پالیسی کو واپس لانا چاہتے تھے اور مغلوں اور مسلمانوں کے خصوصی اختیارات کو بنائے رکھنا چاہتے تھے اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسئلے کے بنیادی پہلو اور اس کی گہرائی کو ان دونوں نے اچھی طرح سے پرکھ لیا تھا دونوں کے لئے اختیارات حاصل کرنے کا سوال اہم اور اس دور کا اصل معاملہ تھا۔ حصول اختیار کے لئے دونوں اپنے اپنے اصولوں کو اپنے مقصد کے مطابق تبدیل کرنے کو تیار تھے۔ جو آگے آنے والے صفحات میں اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔

سید برادران اور مرہٹوں میں معاہدہ : دربار کی گروہ بندی اور حصول اختیارات کی کشمکش نے مرہٹوں یا مراٹھوں سے متعلق سیدوں کی پالیسی کو واضح طور پر متاثر کیا۔ 1715ء میں حسین علی جب دکن میں صوبے دار ہوکر پہنچا اس وقت حکومت کی مخالفانہ کارروائیوں سے دکن میں بدنظمی اور افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ ابتدا" حسین علی خاں نے نظام الملک کو پالیسی کو جاری رکھتے ہوئے مراٹھوں کی چوتھ اور سردیش مکھی کے مطالبے کو نامنظور کر دیا۔ مغل سلطنت میں مراٹھوں کے حملوں اور لوٹ مار کو روکنے کے لئے حسین علی نے فوجی مہمات شروع کیں۔ لیکن وہ مراٹھوں کی کارروائیوں کو روکنے میں ناکام رہا اس کی وجہ یہ تھی کہ مراٹھا سپاہی ہمیشہ چھاپہ مار جنگ کرتے تھے شاہی حملے کے وقت وہ اپنے علاقوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے اور شاہی افواج کو لوٹتے ہی دوبارہ ان پر اپنا تسلط قائم کرلیتے تھے فرخ سیر کی پالیسی کی وجہ سے حالت اور بھی نازک ہوگئی۔ بادشاہ نے مراٹھ سرداروں اور جاگیرداروں کو اس مطلب کے خطوط لکھے کہ وہ دکن کے صوبے دار حسین علی کی مخالفت کریں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیجاپور' حیدر آباد اور کرناٹک میں حسین علی کا تسلط عام طور سے نہیں کے برابر رہ گیا۔

اس حالت میں حسین علی خاں نے شنکراجی ملہار کی مدد سے مراٹھوں کے ساتھ صلح کی بات چیت شروع کی فروری 1718ء میں حسین علی خاں اور ساہو کے مابین معاہدہ ہوا مغلوں اور مراٹھوں کے تعلقات کے بڑھنے میں مراٹھوں کے عروج میں یہ معاہدہ اہم ہے۔ اس معاہدہ میں حسین علی کا خاص مقصد مراٹھوں کا فوج تعاون حاصل کرنا تھا۔ اس لئے مراٹھوں کو دکن کی چوتھ و سردیش مکھی دینے کے ساتھ ہی ساتھ یہ طے کیا گیا کہ 1500ء مراٹھے گھوڑ سوار دکن کے صوبے دار کی خدمت کریں گے۔ کچھ بیواؤں کے ساتھ ساہو کو شیواجی کی آزاد حکومت دیدی گئی۔ دکن کے چھ صوبوں سے چوتھ و سردیش مکھی وصول کرنے کے مطالبے کو بھی مان لیا گیا۔ برار' گونڈوانہ و کرناٹک میں مراٹھوں کے ذریعے مفتوحہ علاقے بھی ساہو کو دیدیے گئے۔ ان کے بدلے میں ساہو نے دس لاکھ روپے پیش کش کی شکل میں دینا منظور کیا۔ لیکن سمجھوتہ کی سب سے اہم شرط یہ تھی کہ ساہو نے پندرہ ہزار 1500 گھوڑ سوار مغل صوبہ دار کے کنٹرول میں

رکھنا منظور کرلیا۔ اس نے صوبے کو پھر سے بسانے اور مجرموں کو سزا دینے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی منظور شدہ محصولات کے علاوہ دوسرے کسی بھی قسم کے نئے محصول کو وصول کرنے پر روک لگا دی گئی خاص کر راہداری وصول کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔

معاہدے کی کچھ شرطیں واضح طور پر حکومت کے مفاد کے خلاف تھیں حسین علی نے مراٹھوں کی چوتھ و سردیش مکھی کے مطالبے ہی کو منظور نہیں کیا' جسے منظور کرنا لازمی ہوگیا تھا' بلکہ انہیں اپنے عاملوں کے ذریعے خود محصول اکٹھا کرنے کا اختیار دے کر سلطنت میں دو عملی قائم کردی۔

معاہدے کی شرطیں : حسین علی نے رسمی منظوری کے لئے بادشاہ کو بھیجیں لیکن فرخ سیر اپنے ہی خلاف کئے گئے اس معاہدے کو منظوری دینے کے لئے تیار نہیں تھا اور نہ ہی اس سے یہ امید کی جاسکتی تھی۔ حکومت کے بہت سے خیر خواہوں نے بھی بادشاہ کو یہ مشورہ دیا کہ مالگزاری و انتظام میں اپنے بدترین دشمن کو حصے دار مان لینا ٹھیک نہیں۔ اس لئے فرخ سیر نے اس معاہدے کو نامنظور کردیا لیکن ساہو نے بادشاہ کی منظوری کا انتظار کئے بغیر ہی اپنے عاملوں کے ذریعہ چوتھ و سردیش مکھی وصول کرنا شروع کردیا۔ معاہدے کے مطابق اس نے سنتوجی' پرساجی بھونسلے اور بالاجی پیشوا کی قیادت میں دس ہزار مراٹھا سوار حسین علی خاں کے پاس بھیج دیئے۔

مراٹھا اور حسین علی کے مابین ہوئے معاہدے نے فرخ سیر کی حالت کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا۔ سید مراٹھا سمجھوتے سے پیدا ہونے والی حالت پر قابو پانے کے مقصد سے 1717ء میں فرخ سیر نے محمد امین خان کو مالوہ کا صوبہ دار مقرر کیا اس کارروائی کا خاص مقصد حسین علی کو شمالی ہندوستان کی جانب آنے سے روکنا تھا اسی طرح دکنی ہندوستان میں حسین علی کے اثر کو کمزور بنانے کے لئے فرخ سیر نے اس کے شمالی صوبے (برہانپور وغیرہ) میں بہت سے نئے تقرر کیے جاں نثار خاں کو برہان پور کا صوبہ دار اور ضیاء الدین خاں ایرانی کو دیوان مقرر کیا۔ جلال الدین کو برہان پور کا دیوان اور فضل اللہ خاں کو برہان پور کا بخشی تعینات کیا گیا۔ فرخ سیر کی ان کارروائیوں کی وجہ سے دکن میں یہ افواہ کافی پھیل گئی کہ بادشاہ نے حسین علی کے خلاف جنگ چھیڑ دی ہے جاں نثار خاں نے حسین علی کے باپ کے ساتھ پگڑی بدلی تھی اس لئے اس نے حسین علی سے سمجھوتہ کرلیا۔ ضیاء الدین ایک قابل آدمی تھا۔ حسین علی نے اسے دکن کے دیوان کا عہدہ تو دیدیا لیکن حقیقت میں اسے کوئی اختیار نہیں دیا۔ دوسرے لوگوں کو ان کے عہدوں پر تعینات کرنے سے اس نے صاف انکار کر دیا اس لئے فرخ سیر کا یہ منصوبہ بھی ناکام رہا۔

اس کے بعد فرخ سیر نے کچھ پرانے امیروں کو متحد کرنے کی ٹھانی جن کے تعاون سے سیدوں پر نگرانی رکھی جاسکے۔ اس نے 1718ء کے اگست و ستمبر میں جودھ پور سے اپنے خسر اجیت سنگھ کو مراد آباد کی فوجداری سے نظام الملک کو اور بہار کی صوبہ داری سے سربلند خاں کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم بھیجا۔ ان میں سے ہر ایک کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ اپنے ساتھ بڑی

تعداد میں اپنی فوجیں لائیں۔ اس کے پیچھے اس کا مقصد ایک عظیم لشکر اکٹھا کرنا تھا۔ لیکن فرخ سیر اس منصوبہ میں بھی کامیاب نہ ہوسکا۔ اسے اور اس کے مصاحبوں کو اس بات کا ڈر تھا کہ اگر ان طاقتور امیروں کے تعاون سے سیدوں کو ہٹا دیا جائے تو ان امیروں کے اثر سے آزاد ہونا اور بھی مشکل ہو جائے گا اس لئے فرخ سیر نے اپنے نئے معتمد محمد مراد کشمیری کو وزیر کے عہدہ کے لئے منتخب کیا۔ اس ترقی سے دوسرے امیر بادشاہ سے بہت زیادہ ناراض ہوئے بغیر سوچ سمجھے بادشاہ نے نظام الملک و سربلند خاں کو اور بھی ناخوش کردیا۔ اس نے سربلند خاں کو بہار کی صوبے داری سے ہٹا دیا اور اس کے بدلے کوئی مناسب عہدہ بھی نہیں دیا۔ مراد آباد کی فوجداری بھی نظام الملک سے چھین لی گئی اور اسے ایک صوبے میں تبدیل کر کے محمد مراد کشمیری کو دیدیا گیا۔ عبداللہ خاں نے اس حالت کا پورا فائدہ اٹھایا اس نے سربلند خاں کو کابل اور نظام الملک کو بہار کی صوبہ داری دینے کا وعدہ کیا اور اس طرح انہیں اپنا طرفدار بنالیا۔ اسی درمیان مالوہ میں حسین علی خاں کو روکنے میں اپنے کو نااہل سمجھ کر محمد امین خاں مالوہ سے دلی لوٹ آیا بادشاہ نے غصے میں آکر اس کا منصب چھین لیا اور اسے برطرف کردیا لیکن عبداللہ خاں کی مداخلت سے اس کا منصب لوٹا دیا گیا اس طرح ایسے لوگوں کو جو اعلی عہدوں کے خواہش مند تھے' عبداللہ خان نے لالچ دے کر اپنی طرف ملا لیا اجیت سنگھ پہلے ہی سے سیدوں کا طرفدار تھا۔ گجرات میں غاصبانہ و ظالمانہ کاموں کا الزام لگا کر فرخ سیر نے اسے گجرات کی صوبہ داری سے ہٹا دیا تھا جس سے وہ بادشاہ سے اور بھی ناراض ہوگیا تھا۔

اس لئے 1718ء کے اواخر تک فرخ سیر تقریبا" اکیلا رہ گیا اب صرف جے سنگھ اس کا حامی تھا پرانے امیروں میں سے زیادہ تر بااثر لوگ جیسے امین خاں نظام الملک اور سربلند خاں وغیرہ کا یقین بادشاہ کی جانب سے ختم ہوگیا تھا اور انہوں نے یا تو سیدوں کا ساتھ دینا شروع کر دیا تھا یا غیر جانبدار رہنے کا ارادہ کرلیا تھا۔

موجودہ حالات میں سیدوں کے سامنے تین ہی راستے تھے اول فرخ سیر کو ہٹا کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دینا جیسا کہ سلطنت کے دور میں ہوتا تھا دوسرے فرخ سیر کو ہٹا کر خاندان تیمور کے کسی دوسرے شاہزادے کو تخت نشین کرنا جو ان کی خواہشات کے مطابق کام کرکے سوم فرخ سیر کو گدی پر بنائے رکھنا لیکن اس کے سارے اختیارات چھین کر اپنے ہاتھ میں لے لینا۔ پہلے راستے کے بارے میں سیدوں نے شاید کبھی سوچا نہیں تھا اور اگر کبھی سوچا بھی ہو تو اسے عملی طور پر نہیں سوچا۔ ایک ہوشیار سیاست داں ہونے کے ناطے عبداللہ خاں نے تیسرے راستے کے حق میں ہی کام کیا۔ ایک ہم عصر مورخ کے مطابق وہ فرخ سیر کے ساتھ ویسا ہی تعلق رکھنا چاہتا تھا جیسا مہابت خاں نے جہاں گیر کے ساتھ قائم کیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اسے اپنے پورے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا اس طرح قانونی حکمرانوں کو ہٹائے بغیر ہی وہ مکمل حکمرانہ اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہتا تھا۔

عبداللہ خاں نے 1718ء کے شروع میں حسین علی کو عجلت کے ساتھ فورا" شمالی

ہندوستان آنے کو لکھا۔ ستمبر 1718ء کے شروع میں فرخ سیر نے میر جملہ کو لاہور سے بلا لیا۔ فرخ سیر کی کارروائی حسین علی کے ساتھ کئے گئے معاہدے کے خلاف تھی اس طرح حسین علی کو دلی آنے کا بہانہ مل گیا۔ اکتوبر 1718ء میں حسین علی دلی کی جانب سے روانہ ہوگیا۔ برہان پور پہنچنے پر پیشوا بالا جی وشوناتھ دس ہزار 10000 گھوڑ سواروں کے ساتھ حسین کے ساتھ مل گیا اس طرح دونوں کی مشترکہ افواج کی تعداد پچیس ہزار 25000 گھوڑ سواروں اور دس ہزار 10000 پیادہ ہوگئی۔ بادشاہ کی اجازت کے بغیر اسے جانے کے لئے حسین علی نے یہ بہانہ نکالا کہ اسے شاہزادہ اکبر کے اس لڑکے کو جسے سمبھا جی کے دربار میں چھوڑ دیا گیا تھا اور جسے ساہو نے لوٹا دیا ہے از خود دلی پہنچانا ضروری ہے۔

اپنی عجلت پسند اور جذباتی عادت کی وجہ سے حسین علی نے شروع سے ہی فرخ سیر کو گدی سے ہٹانے کی ٹھان لی تھی۔ دلی پہنچنے تک اس نے یہ فیصلہ اپنے قریبی لوگوں تک ہی محدود رکھا حسین علی ایک آزاد حکمران کی طرح نقارہ بجاتے ہوئے دلی میں داخل ہوا اس کا یہ برتاؤ شاہی شان کے خلاف تھا حسین علی نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب وہ بادشاہ کے خدمت گاروں میں نہیں ہے۔ اس کا کہنا تھا "مجھے شاہی ناراضی اور اپنے منصب کے خاتمے کی پرواہ نہیں میں اپنے خاندان و قوم کی عزت قائم رکھوں گا۔"

فرخ سیر کے لئے کیا پالیسی اپنانی چاہئے اس معاملے کو لے کر حسین علی اور عبداللہ خاں میں اختلاف رائے شروع ہوگیا۔ 19 فروری کو حسین علی' اجیت سنگھ اور بھیم سنگھ بارا کے درمیان صلاح و مشورہ ہوا یہ طے کیا گیا کہ حسین علی کے دربار میں پہنچنے اور قیدی شہزادے کو اسے سپرد کرنے سے پہلے سید داروغہ' دیوان خاص و میر آتش ان دونوں عہدوں کا مطالبہ کریں اس کے علاوہ سیدوں نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ جے سنگھ کو امیر چلے جانے کی اجازت دی جائے۔ قلعہ کے اعلیٰ عہدوں پر جیسے داروغہ خواصان وغیرہ ان کے ذریعہ تجویز کیے گئے لوگوں کو مقرر کیا جائے اور بادشاہ کے روبرو حاضر ہونے کے وقت قلعہ پر سیدوں کے سپاہیوں کا کنٹرول ہو۔ فرخ سیر نے سیدوں کے ان سب مطالبوں کو منظور کر لیا جے سنگھ کو امیر جانے کی اجازت دیدی گئی داروغہ دیوان خاص ' میر آتش' داروغہ خواصان ' داروغہ جلو اور ناظر حرم وغیرہ سب عہدوں پر سیدوں کے ذریعہ نامزد کئے گئے لوگوں کو مقرر کر دیا گیا۔ لیکن فرخ میر نے یہ شرط رکھی کہ پرانے عہدیدار جشن نو روز تک جو ایک ماہ بعد تھا اپنے عہدوں پر قائم رہیں گے۔

22 فروری کو حسین علی نے بادشاہ کے روبرو حاضری دی اس وقت قلعہ کی سبھی خاص جگہوں پر سیدوں کے سپاہی تعینات تھے لیکن اس حاضری سے حالات میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا اور کشیدگی کا خلا پہلے جیسا بنا رہا ساتھ ہی خصوصی عہدوں پر سیدوں کے ذریعے نامزد کئے گئے لوگوں کے تقرر میں ایک ماہ کی تاخیر کرنے کی تجویز سے بادشاہ کی جانب شک و شبہ اور بھی بڑھ گیا۔ اس لئے سیدوں نے معاہدے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ 26 فروری 1719ء کو عبداللہ خاں اور فرخ سیر کے درمیان کشیدہ ماحول میں بات چیت ہوئی۔ مذاکرات کے دوران فرخ سیر نے

عبداللہ خاں کو گالیاں دیں اس کے بعد وہ اپنے حرم چلا گیا۔ اس کے بعد عبداللہ نے بادشاہ کے طرفدار شاہی محافظوں کی ٹکڑی کے سپاہیوں کو قلعہ سے نکال دیا اور قلعہ پر اپنا قبضہ اور مضبوط کرلیا۔

ان حالات کے بعد بھی عبداللہ خاں اس بات کے حق میں تھا کہ فرخ سیر کو تخت سے نہیں ہٹایا جانا چاہئے اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک سبھی اہم عہدوں پر سیدوں کے ذریعہ نامزد کئے گئے لوگوں کا قبضہ عام طور سے قائم ہوچکا تھا۔ اس لئے عبداللہ خاں نے فرخ سیر کو بار بار یہ پیغام بھیجا کہ وہ ان کے مخالفین کو قلعہ سے نکال دے لیکن فرخ سیر نے ایسا کرنے سے صاف انکار کردیا اسی وقت شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ اجیت سنگھ اور محمد امین خاں وغیرہ امیروں نے مل کر سید برادران کو قتل کردیا ہے نتیجے میں بہت سے امیر بادشاہ کی طرفداری کرنے کے لئے جمع ہونے لگے حسین خاں کے مراٹھا سپاہی امین خاں کے سپاہیوں سے بھڑ گئے۔ جس سے شہر میں حالت کافی کشیدہ ہوگئی۔ دلی میں مراٹھوں کے لئے شہری عوام نے بغاوت کر دی حالانکہ اس کے بارے میں فارسی مصنفین نے مراٹھا سپاہیوں کی بڑی ہنسی اڑائی ہے حقیقت یہ ہے کہ دلی کی گلیوں میں کسی فوج کا عوام کی بغاوت کو دبانا آسان نہیں تھا آخر میں پندرہ سو 1500 یا دو ہزار 2000 مراٹھا سپاہیوں کے مارے جانے اور سنتاجی وغیرہ ان کے کئی سرداروں کے قتل کے بعد مراٹھا سپاہیوں کو شہر چھوڑنے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ فوجی نقطہ نظر سے یہ مظاہرہ اہم نہیں تھا تو بھی اس سے شاہی خاندان کے لئے عوام کا اعتماد واضح ہوگیا۔ اس لئے سید آخری فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں کرسکتے تھے۔ انہیں خاص طور سے یہ خوف تھا کہ جے سنگھ جو دہلی سے صرف 40 کوس کے فاصلے پر 2000 دو ہزار گھڑ سواروں کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا واپس نہ لوٹ آئے۔

ہاشم علی خاں' اخلاص خاں اور محمد امین خاں نے حسین علی کے ساتھ صلاح مشورے میں فرخ سیر کو تخت سے ہٹا دینے کی رائے دی۔ محمد امین یہ رائے کئی دن پہلے ظاہر کرچکا تھا دوسرے امیر خاص طور سے خان دوراں اور فرخ سیر کے خسر اجیت سنگھ نے بھی یہی مشورہ دیا۔ اس لئے حسین علی نے عبداللہ کو خط لکھ کر مطلع کیا کہ وہ خود قلعہ سے باہر آجائے اور قلعہ کا انتظام اسے (حسین علی) کے حوالے کردے۔ اس وقت تک فرخ سیر نے حرم سے باہر نکلنے اور اپنے حمائیوں کو عہدوں سے برخاست کرنے کی تجویز کو منظور نہیں کیا تھا اس لئے عبداللہ خاں کے سامنے حسین علی کے مشورے کو قبول کرنے کے بجائے کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا اس لئے افغان سپاہیوں کا ایک دستہ حرم میں بھیجا گیا فرخ سیر کو گھسیٹ کر حرم سے باہر لایا گیا اور اسے اندھا کرکے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ رفیع الدرجات جس کی عمر 20 سال کی تھی اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا کچھ دن بعد 29 اپریل 1719ء کو فرخ سیر کا بیہمانہ قتل کر دیا گیا اور اسے ہمایوں کے مقبرے کے تہہ خانے میں دفن کر دیا گیا۔

عبداللہ خان نے حسین علی کے ان اقدامات کو نامناسب بتایا اور جلدی بازی کے لئے اپنے بھائی کو الزام دیا فرخ سیر خوشامدی اور کمینے لوگوں کو پسند کرتا تھا جس کی وجہ سے پرانے

امیروں نے سیدوں کو ان کے عہدوں سے ہٹانے میں فرخ سیر کا ساتھ نہیں دیا۔ فرخ سیر کو عہدے سے برطرف کرکے سیدوں نے پرانے امیروں کے خلاف اپنی حفاظتی تدابیر کو ختم کردیا۔ سیاسی' اقتصادی و انتظامی مسائل جو گزشتہ کچھ زمانے سے چلے آ رہے تھے گروہ بندی و انتظامی گڑ بڑ کی وجہ سے اور بھی خطرناک ہوگئے تھے۔ سیدوں کو ان سبھی مسائل کا حل تلاش کرنا تھا۔ سیدوں کا اپنے اثر کو قائم رکھنا اس بات پر منحصر تھا کہ وہ پرانے امیروں کا تعاون حاصل کریں اور مراٹھا' راجپوت ' جاٹ وغیرہ کے مختلف مسائل کا جو پہلے سے چلے آ رہے تھے۔ مناسب حل تلاش کرسکیں۔

اس طرح سید برادران کو فرخ سیر کو تخت سے برطرف کرنے کے بعد اور بھی مشکل مسائل کا سامنا کرنا تھا۔

سید برادران اور نئی وزارت

فرخ سیر کو معزول کرنے اور دوسرے شہنشاہ کو تخت نشین کرنے کے بعد سید برادران نے ان تمام عہدوں پر اپنے نامزد کردہ افراد کو متعین کیا جن کے وسیلہ سے شاہ کا قرب حاصل ہوسکتا تھا۔ داروغہ۔ دیوان خاص' داروغہ غسل خانہ ناظر حرم اور حتی کہ خواجہ سرا اور شہنشاہ کے ملازم خاص بھی سید برادران کے منتخب شدہ تھے۔ سید ہمت خان بارہہ کو شہنشاہ کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس کے حکم کے بغیر شہنشاہ کو کھانا تک بھی پیش نہیں کیا جاسکتا تھا شہنشاہ کسی امیر سے اس وقت تک نہیں مل سکتا تھا جب تک اس کا اتالیق یا سید برادران میں سے کوئی موجود نہ ہو۔ جب کبھی شہنشاہ نماز عوامی دعاء یا شکار کے لئے جاتا تو سادات بارہ کی ایک نمائندہ جماعت اسے زرغہ میں لیے رہتی۔ اس طرح شہنشاہ کی شخصی آزادی ختم ہوچکی تھی اور شہنشاہ تک پہنچنا بغیر سید برادران کے توسط کے ممکن نہ تھا۔ اس کی ضرورت خاص طور پر اس لئے تھی کہ سید برادران کی طاقت کا انحصار صرف اس پر تھا کہ شہنشاہ کی ذات پر ان کا تصرف قائم رہے۔

یہ صورت حال 11 جون 1719ء تک قائم رہی جب تک کہ رفیع الدولہ برفیع الدرجات کے دق کی بیماری سے فوت ہو جانے کے بعد منصب پر فائز ہوا۔ لیکن رفیع الدولہ بھی اس بیماری کا شکار ہوا اور 28 ستمبر 1719ء کو سید برادران نے بہادر شاہ کے سب سے چھوٹے بیٹے جہاں شاہ کے بیٹے محمد شاہ کو تخت نشین کیا۔ محمد شاہ کی تخت نشینی کے بعد ان کے اقتدار میں معمولی سی کمی آئی اور خاندانی دربان اور ملازمین خاص کو ان کے سابقہ عہدوں پر بحال کر دیا گیا۔ لیکن اب بھی مصالح ملکی میں شہنشاہ کو کوئی اختیار حاصل نہ تھا۔

ان عہدوں میں تبدیلی کے علاوہ جن کے ذریعہ شاہ کا قرب حاصل ہوسکتا تھا۔ سید برادران عمال حکومت کے رد و بدل کی پالیسی سے تقریباً دست کش ہوگئے۔ صوبوں میں گورنر اور دوسرے عمال حکومت کو ان کے سابقہ عہدوں پر بحال کردیا۔ پالیسی کی یہ تبدیلی نظم و نسق بحال کرنے کے لئے ضروری تھی تاکہ قدیم امراء سید برادران کے اقتدار کو تسلیم کرلیں اور پھر سہولت کے ساتھ مرکزی طاقت ان کے ہاتھوں میں آجائے۔

دربار میں فرخ سیر کے مقربین مثلاً محمد مراد کشمیری' امین الدین سنبھلی' غازی الدین احمد بیگ اور شہنشاہ کے اقرباء جیسے سعادت خاں اور شائستہ خاں وغیرہ کی جائیداد اور منصب ضبط کر لئے گئے لیکن بہت سے دوسرے امراء کی جائیدادوں کو ضبط نہیں کیا گیا۔ کسی کو قتل نہیں کیا گیا۔ بلکہ شہنشاہ کے مقرب مصاحبین مثلاً خان دوران اور میر جملہ کی جاگیر اور منصب برقرار رہے اور انہیں عہدے بھی دیئے گئے۔ عام طور سے سید برادران نے ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ امین خاں بخشی دوم کے عہدہ پر برقرار رہے۔ ایک

دوسرے تورانی روشن الدولہ ظفر خان کو بخشی سوم کے عہدہ پر برقرار رہنے دیا۔ صدر کا عہدہ ایک قدیم عالمگیری امیر امیر خاں کو اور پھر میر جملہ کو دیا گیا۔ حکومت کے دو سب سے بڑے عہدے اور دکن کے وائسرائے کے عہدہ کے علاوہ جو سید برادران کے پاس 1715ء سے تھے یا ان جگہوں کے علاوہ جن سے شہنشاہ کا قرب حاصل ہو سکتا تھا اہل بارہہ یا سید برادران کے ذاتی ملازمین جو متوسلین کو صرف آگرہ یا الہ آباد کی صوبہ داری یا مراد آباد کی فوج داری دی گئی۔

سید برادران کو ابھی اپنی قوت کو مستحکم کرنا تھا۔ اس کے لئے سب سے پہلے تو یہ ضروری تھا کہ سلطنت کے ہر حلقہ پر اپنا اقتدار قائم کرلیا جائے۔ تاکہ مخالفین ایک مرکز پر جمع نہ ہوسکیں۔ دوسرے یہ کہ اپنی قوت کو برقرار رکھنے اور امراء کی متوقع مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لئے ایسا مضبوط حلقہ قائم کیا جائے۔ جو ان کا معاون و مددگار ہو۔

سید برادران کے خلاف بغاوتوں کا آغاز : سیدوں کی مصالحانہ پالیسی کے باوجود ان کی قوت کا مقابلہ کرنے کے لئے بہت جلد دو مرکز قائم ہوگئے۔ ایک آگرہ میں اور دوسرا الہ آباد میں۔ آگرہ میں مترسین نامی ایک زمانہ ساز شخص نے علم بغاوت بلند کیا۔ جس کا بنیادی مقصد سلطنت کی بگڑی ہوئی حالت سے فائدہ اٹھا کر دولت کمانا اور اپنے اقتدار کو مستحکم کرنا تھا۔ اس کے حصول کے لئے انہوں نے تیمور خاندان کے ایک شریف نوجوان نیکو سیر کو جو آگرہ کے قلعہ میں مقید تھا۔ شہنشاہ بنا دیا۔ خود ان باغیوں کے پاس نہ طاقت تھی اور نہ ان کی کوئی اہمیت تھی۔ لیکن سیدوں کو اس کا خوف تھا کہ مخالف قوتیں نیکو سیر کے گرد جمع نہ ہو جائیں۔ یہ افواہ بھی تھی کہ نظام الملک جے سنگھ اور الہ آباد کا گورنر چھبیلا رام ناگر نیکو سیر کی امداد کو آرہے ہیں' نیکو سیر کے اعوان و انصار نے امراء افغانوں اور مقامی زمینداروں سے مدد کی درخواست کی۔ جے سنگھ حقیقت میں امیر سے کئی منزل آگے آگیا تھا اور آگرہ سے 80 کوس پر ٹوڈا نگ کے مقام پر خیمہ زن تھا۔ فرخ سیر کی معزولی کے بعد بہت سے امراء مثلاً تقریب خاں شائستہ خاں وغیرہ نے جے سنگھ کے دربار میں پناہ لی تھی۔ اور انقلاب زمانہ کے منتظر تھے۔ اس طرح سیدوں کے خلاف حزب اختلاف کا مرکز امیر بن گیا تھا۔ اس کا بھی خوف تھا کہ بہت سے دوسرے امراء جنہوں نے بالکل آخر وقت میں سیدوں کا ساتھ دیا تھا۔ جے سنگھ کے معاون و مددگار نہ ہو جائیں۔

لیکن بغاوت آگرہ سے آگے نہ بڑھ سکی اور اونچے طبقہ سے کسی قسم کا تعاون نہ مل سکا۔ یہاں تک کہ نظام الملک نے جو مالوہ جاتے ہوئے آگرہ سے گزرا اس نے بھی کسی قسم کی امداد نہ کی۔ مترسین نے سید برادران اور دوسرے مشہور امراء سے درخواست کی کہ وہ نیکوسیر کو شہنشاہ تسلیم کرلیں۔ کہا جاتا ہے کہ عبداللہ خاں اس تجویز کو قبول کرنے کے حق میں تھا لیکن حسین علی نے اسے اپنی ہتک سمجھتے ہوئے انکار کر دیا اور سخت اقدامات کا تہیہ کرلیا۔

الہ آباد کی بغاوت فرخ سیر کے قدیم خادم الہ آباد کے گورنر چھبیلا رام کی ذاتی فراست کا نتیجہ تھی۔ وہ سید برادران کے منصوبوں کی طرف سے مشکوک تھا۔ اس شک کو اس وقت اور تقویت پہنچی جب سید برادران نے اسے الہ آباد سے منتقل کرنا چاہا۔ اور شاہ علی خاں

کی سربراہی میں ایک فوج روانہ کی جس کو یہ ہدایت تھی کہ قلعہ پر قبضہ کرے۔ حقیقت میں سید برادران کا چھبیلا رام کا اقتدار ختم کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ الہ آباد کا مستحکم قلعہ اس کے قبضہ میں رہنا بھی ان کے خیال میں نہ تھا خاص طور سے اس لئے کہ یہ قلعہ بنگال سے دہلی آنے والے خزانہ کے راستہ کے خلاف پڑتا تھا۔ وہ چھبیلا رام کو آلہ آباد کی صوبہ داری کے عوض میں اودھ دینے کو تیار تھے لیکن چھبیلا رام نے ان کے کسی قول پر اعتبار نہ کیا۔ اور (اگست 1719) کو اعلانیہ علم بغاوت بلند کردیا۔ اس کے فوراً بعد ہی چھبیلا رام کا انتقال ہوگیا لیکن اس بغاوت کو اس کے بھتیجے گردھر بہادر نے جاری رکھا۔ ان کے اقتدار کے شروع کے چودہ ماہ میں سید برادران کی تمام قوت اور صلاحیتیں ان دو بغاوتوں کی نذر ہوگئیں۔ بھوک اور غداری کے نتیجہ میں تین مہینہ کے محاصرے، محاصرین کی فاقہ کشی اور بعض کی غداری کے نتیجہ میں 12 اگست 1719ء کو آگرہ فتح ہوا۔ مزید 9 ماہ بعد گردھر بہادر کے ساتھ جنگ میں اور مصالحت کی گفتگو میں صرف ہوئے۔ تب 11 مئی 1720ء کو آلہ آباد کے اخلاء پر رضامند ہوا۔ قلعہ فتح ہونے کے بعد گردھر بہادر کو جو مراعات دی گئیں وہ نہ صرف معقول تھیں بلکہ تقریباً وہی تھیں جو اس کی مخاصمانہ سرگرمیوں سے پہلے پیش کی گئی تھیں۔ اسے اودھ کی گورنری مع متعلقہ جاگیروں کے پیش کی گئی۔ اس کے علاوہ دو یا تین اہم فوجداریاں جن کی اس نے خواہش کی اس کو عطا کی گئیں۔ اس کے علاوہ تیس لاکھ روپیہ بطور انعام مزید دیئے گئے۔ اس سلسلہ میں اہم بات یہ ہے کہ ان مطالبات کی پیش کش کے باوجود گردھر بہادر نے سید برادران کے قول پر اعتماد کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے معاہدے میں صاف صراحت کی کہ رتن چند کو ضامن بنایا جائے اور وہی اس معاہدے پر عمل درآمد کی ذمہ داری لے۔

سید برادران کے سیاسی مسائل کا جائزہ : یہ صورت حال سیدوں کی فوجی طاقت پر منفی طور پر اثر انداز ہوئی۔ سید برادران میں اتنی قدرت نہ تھی کہ وہ طویل فوجی اقدامات برقرار رکھتے انہیں اس بات کی ضرورت تھی کہ وہ ہر قدم احتیاط سے اٹھائیں تاکہ فرخ سیر کی معزولی کے لئے جو مشترک قوت رونما ہوئی تھی وہ برقرار رہے اور مستحکم ہو۔ اس کے لئے دو امور کی ضرورت تھی اول مرہٹوں اور راجپوتوں کے ساتھ اتحاد کی توسیع اور استحکام اور دوسرے عالمگیری امراء کے پیدا کردہ مسائل کا حل۔

سید برادران نے راجپوت اور مرہٹوں کے ساتھ اتحاد کو مضبوط کرنے اور ہندو رائے عامہ کو عام طور پر ہموار و ہم نوا کرنے کی سرگرم کوشش کی۔ فرخ سیر کی معزولی کے فوراً بعد راجہ اجیت سنگھ کی خواہش پر جزیہ کو ایک مرتبہ پھر ختم کر دیا گیا۔ مزید خیر خواہی کے اظہار کے لئے اجیت سنگھ کی لڑکی کو جس نے باقاعدہ اسلام قبول کرنے کے بعد فرخ سیر کے ساتھ شادی کرلی تھی۔ اس بات کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنے نئے مذہب کو ترک کر دے اور اپنی تمام دولت املاک لے کر اپنے باپ کے ساتھ گھر واپس چلی جائے۔ یہ حادثہ جس کو خافی خان نے "نادر الوجود" کہا ہے۔ دارالحکومت کے مسلمانوں اور خصوصاً ان قاضیوں کو سخت ناگوار گزرا جنہوں نے

اسلام کو ترک کرنا غیر قانونی قرار دیا لیکن سید برادران نے اس کی کوئی بھی پرواہ نہیں کی۔

جے سنگھ سوائی سید برادران سے ہمیشہ سے مخاصمت رکھتا تھا۔ وہ آگرہ کی بغاوت میں شرکت کے لئے امیر سے باہر آگیا تھا۔ اس نے ان چند امراء کو جب بغاوت کے ارادہ سے دہلی سے فرار ہوکر آئے تھے پناہ بھی دی۔ اس کے باوجود اجیت سنگھ کی معرفت سید برادران نے اس سے مصالحت کی گفتگو شروع کی۔ آخر کار آگرہ کی فتح کے بعد اور حسین علی کے حملہ کے خوف سے جے سنگھ ٹوڈانگ سے واپس ہوگیا۔ سید برادران نے جے سنگھ کے ساتھ مراعات برتیں اور علاقہ احمد آباد میں سور ناتھ کی فوجداری سے سرفراز کیا۔ اور ایک خطیر رقم عطا کی۔ اجمیر جسے سب سے اہم صوبہ سمجھا جاتا تھا اور جسے ایک مذہبی حیثیت حاصل تھی اس لئے اس کی صوبہ داری صرف اعلیٰ طبقہ کے امراء کو تفویض کی جاتی تھی لیکن اس کے باوجود یہ عہدہ بھی اجیت سنگھ کو عطا کیا گیا۔ اسی کے ساتھ گجرات کا صوبہ بھی اس کے تصرف میں دے دیا گیا۔ راجہ کو دوسرے اعزازات سے بھی نوازا گیا اور اس طرح وہ پوری سلطنت میں اہم اور طاقتور امراء میں شمار کیا جانے لگا۔ دونوں راجپوت راجہ متحد ہوکر سلطنت کا سب سے زیادہ بااثر عنصر بن گئے۔ اس سے ہندوؤں میں جو خود اعتمادی کی فضا پیدا ہوئی اس کا اندازہ خافی خاں کی اس شکایت سے ہوتا ہے جس میں اس نے کہا "دارالحکومت کے نواح سے نربدا کے کنارے تک کافر مندروں کی مرمت کرا رہے ہیں اور اس کوشش میں ہیں کہ ذبیحہ گاؤ بند ہو جائے۔"

سید برادران نے اجیت سنگھ کی معرفت اپنی یہ کوشش جاری رکھی کہ جے سنگھ عملی طور پر ان کے ساتھ شامل ہو جائے اس کی ایما پر اجیت سنگھ تنویر پور کے مقام پر جے سنگھ سے ملا اور اس کو اپنے ساتھ جودھ پور لے گیا۔ جہاں اس کی آمد پر جشن منایا گیا اور دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد اجیت سنگھ نے اپنی ایک بیٹی کی شادی اس سے کردی۔ ان اقدامات کے اثرات واضح اور بہتر ہوتے اگر سید برادران کچھ دنوں اور برسر اقتدار رہتے۔ اسی زمانے میں جے سنگھ نے سید برادران کے خلاف نظام الملک کی متحدہ اقوام کی درخواست کو مسترد کردیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ سید برادران کے ساتھ بھی تعاون کے لئے تیار نہ ہوا۔ اس طرح راجپوتوں کے ساتھ سید برادران کا معاہدہ صرف اجیت سنگھ تک محدود رہا۔

سید برادران نے سردیش مکھی اور چوتھ وصول کرنے کی اسناد شاہی دستخطوں سے مرہٹوں کو عطا کیں۔ جس کی وجہ سے مرہٹوں کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا۔ وہ اور مستحکم ہوگیا۔ دکن سے حسین علی کی سرکردگی میں جو مرہٹہ فوجیں دہلی آئیں تھیں۔ وہ اسناد لے کر ساہو خاندان کے ساتھ واپس ہوگئیں۔ اس لشکر کے سپاہیوں کی تنخواہیں اگرچہ نسبتاً کم تھیں لیکن شمالی ہندوستان کے لوگ اور خصوصاً اہلیان دہلی ان کو پسند نہیں کرتے تھے اس لئے سید برادران اس لشکر کو ضرورت سے زیادہ نہیں روکنا چاہتے تھے۔ اگرچہ شمالی ہندوستان میں کوئی مرہٹہ فوجی باقی نہ تھا۔ لیکن دکن میں سید برادران کی ساری طاقت کا انحصار ان ہی پر تھا۔ عالم علی اور حسین علی جو دکن میں علی کے نائب تھے شنکر جی بلہار کی سرپرستی میں تھے۔ شنکر جی بلہار ایک زمانہ میں

راجہ رام کا وزیر تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ حسین علی نے عالم علی کو مشورہ دیا تھا کہ وہ کل معاملات میں شنکر جی سے مشورہ کرتا رہے اور چونکہ آخر الذکر کا ستارا کے دربار سے خاص تعلق تھا اس وجہ سے یہ شاہو سے اور بھی اچھے تعلقات کی ضمانت تھی۔

سید برادران نے صرف راجپوتوں اور مرہٹوں ہی سے اچھے تعلقات استوار نہیں کیے بلکہ مزید مراعات دے کر چورامن جاٹ کو بھی مقرب اور پابند بنالیا۔ دہلی سے گوالیار تک کی شاہراہ اس کے سپرد کی گئی۔ اور آگرہ کے محاصرہ میں حصہ لیا اور اس خدمت کے سلسلے میں مزید مراعات دی گئیں۔

مکمل سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے سید برادران نے کسی قسم کی مذہبی یا قومی تفریق روا نہیں رکھی۔ نہ صرف مندرجہ بالا مثالوں سے ثابت ہے بلکہ عالمگیر اور بہادر شاہ کے دور کے امراء کے ساتھ ان کا برتاؤ بھی اس کا مظہر ہے۔ اپنے ساتھ ملانے کے لئے اور نظم و نسق میں ان کا تعلق حاصل کرنے کے لئے ان کے مراتب میں اضافہ کیا۔ انہیں بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا۔ اس طرح تقریباً تمام قدیم عہدہ داران کو ان کے قدیم عہدوں پر برقرار رکھا گیا۔ نظام الملک کے نام اپنے ایک خط میں عبداللہ خان نے اپنی عام پالیسی کی ان الفاظ میں وضاحت کی ہے۔ "ہندوستان جیسے عظیم ملک کا نظم و نسق بغیر امراء اور ریاست کے عہدہ داران کے تعاون کے ممکن نہیں یہ ایک فرد واحد کا کام نہیں۔ کیا موجودہ حالات میں میرے لئے یہ بہتر ہوگا کہ میں نئے افراد کو (غیر آزمودہ مختلف منصب پر مامور کروں اور ان پر بھروسہ کروں یا آپ جیسی ہستی کا تعاون حاصل کروں جو ہمیشہ میرے دوست رہے ہیں؟"

اس پالیسی پر عمل پیرا ہونے میں سید برادران کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مثلاً فرخ سیر کی معزولی سے پیدا شدہ خوف و شک کی فضاء کچھ قدیم امراء کا حسد جنہیں یہ ناگوار تھا کہ سید برادران نے جو نئے امراء میں سے تھے۔ اتنی طاقت کیوں حاصل کی۔ محمد امین خاں اور نظام الملک جیسے افراد کی جاہ کی ہوس جو اپنا اقتدار اور اثر قائم کرنے کی خواہش مند تھے' مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی جاہ کی ہوس اور دونوں بھائیوں کے درمیان ذاتی اور سیاسی معاملات میں بڑھتے ہوئے اختلافات۔

دونوں بھائیوں کے درمیان اختلاف کی بنیاد سیاسی قوت اور فتوحات کی تقسیم تھی۔ ان میں اس پر بھی اختلاف تھا کہ قدیم امراء اور خصوصاً نظام الملک کے ساتھ کس قسم کا طرز عمل اختیار کیا جائے۔ حسین علی نے یہ الزام لگایا کہ عبداللہ خان نے اپنے محل سے تعلق کا ناجائز فائدہ اٹھا کر فرخ سیر کے دفن شدہ خزانہ اور خاندانی جواہر پر قبضہ کرلیا۔ اس نے اس پر بھی اعتراض کیا کہ عبداللہ خاں نے 200 سے زائد فرخ شاہی اور دوسرے امراء کی جاگیروں کو حاصل کرکے اپنے اعوان و انصار میں تقسیم کر دیا۔ کچھ عرصہ تک تو دونوں کے درمیان اس حد تک کشیدگی رہی کہ کبھی کبھی جنگ کی بات بھی زبان پر آجاتی لیکن رتن چند نے دونوں کو تورانی خطرہ سے متنبہ کرکے صلح کرا دی۔

آگرہ کی تسخیر کے بعد مال غنیمت کا زیادہ حصہ حسین علی کو ملا۔ عبداللہ خاں نے دہلی چھوڑنے کے لئے یہ عذر کیا کہ وہ جے سنگھ کی امیر کی طرف پیش قدمی کو روکے گا لیکن اس کا اصل مقصد اس مال غنیمت میں حصہ لینا تھا۔ ایک مرتبہ پھر رتن چند نے مصالحت کرا دی۔ لیکن عبداللہ خاں مال غنیمت میں اپنے حصہ سے مطمئن نہ تھا۔ اسی بناء پر دونوں بھائیوں میں سے ہر ایک ذاتی طور پر آلہ آباد کی مہم کی سربراہی کرنا چاہتا تھا۔ آخر کار مصالحت اس طرح ہوئی کہ مہم کی کمان رتن چند ہی کے سپرد کی جائے۔ ان تمام اختلافات کے پس پردہ دونوں بھائیوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش تھی۔ حسین علی عبداللہ خاں سے زیادہ مستعد تھا اور اس نے بہت جلد حقیقی طور پر اقتدار کے معاملہ میں برتری حاصل کرلی۔ لیکن وہ گرم مزاج اور تیز تر طبیعت کا مالک تھا۔ وہ کوئی فیصلہ کرنے سے قبل صورت حال کو پوری طرح پرکھنے میں ناکام رہتا۔ اور کسی بھی مسئلہ کی گہرائی تک نہیں پہنچ پاتا تھا۔ جیسا کہ خافی خاں کہتا ہے "حسین علی خود کو حکومت کے انتظامی اور دفاعی معاملات میں اپنے بھائی سے برتر سمجھتا تھا حالانکہ نہ وہ معاملہ کی حقیقت کو سمجھ سکتا تھا اور نہ مصلحت اندیش تھا۔"

اس کا قیاس یہ تھا کہ اس کے اور اس کے بھائی کے مقربین اور متوسلین میں بہت عمدہ منتظمین ہیں۔ اس کا بیٹا عالم علی جو دکن کا صوبہ دار ہے ایک مستحکم لشکر رکھتا ہے اس لئے نظام الملک کو مالوہ کا صوبہ دار بنانا قرین مصلحت ہے کیونکہ مالوہ دہلی اور دکن کے درمیان واقع ہے۔

اس طرح حسین علی نے اپنی قوت اور استحکام کا غلط اندازہ لگایا اور عبداللہ خاں کی اعتدال پسندانہ پالیسی اور دانش مندی کی قدر کرنے میں بھی کام رہا۔ سید برادران کو آئندہ جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا اس کی ذمہ داری بڑی حد تک حسین علی کی اپنے طاقتور مخالفین کو مغلوب کرنے میں جلدی بازی تھی جو ان کے تحکمانہ رویے اور غیر دانشمندانہ حکمت عملی کا نتیجہ تھی۔ عبداللہ خاں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ نظام الملک کو بہار کا گورنر بنایا جائے۔ جو شرارت پسند اور سرکش زمینداروں کا صوبہ تھا۔ اس صوبے کے محاصل بہت کم تھے۔ اس طرح عبداللہ خاں نظام الملک کو دربار سے دور رکھنا چاہتا تھا اور ایسی جگہ تقرر کرنا چاہتا تھا جہاں وہ روپیہ اور وسائل کی کمی سے پریشان رہے۔ اس کے بعد اس سے صورت حال کے مطابق اچھی طرح نمٹا جا سکتا تھا لیکن حسین علی کے ایماء پر یہ تقرر منسوخ کیا گیا اور اس کی بجائے نظام الملک کا تقرر مالوہ میں ہوا۔ نظام الملک نے اس کو سید برادران کے اس وعدہ پر قبول کیا کہ اس صوبہ کو کم از کم طویل عرصہ کے لئے اس سے کسی حالت میں کبھی بھی واپس نہیں لیا جائے گا۔ مارچ 1719ء کو وہ دہلی سے روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ اس کا بیٹا مغل خاں اور ایک ہزار سے زائد منصب دار تھے جنہوں نے اس کے ایماء پر اپنے خاندان کے افراد کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ اس نے سید برادران کے بار بار اصرار کرنے کے باوجود اپنے بیٹے کو اپنے وکیل کی حیثیت سے دربار میں چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

نظام الملک سید برادران پر اتنا ہی کم اعتماد کرتا تھا جتنا سید برادران اس پر بھروسہ کرتے تھے۔ اور جلد یا بہ دیر دونوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش ناگزیر تھی کیونکہ سید برادران کے لئے نظام الملک کے معاملہ کی حیثیت انفرادی مسئلہ نہ تھی بلکہ کسی حد تک یہ عالمگیری اور بہادر شاہی دور کے قدیم امراء کا مسئلہ تھا۔ ان امراء میں سے بہت سے اپنے ایرانی اور تورانی نسب پر فخر کرتے تھے حالانکہ ان میں سے زیادہ تر ہندوستان میں کئی نسلوں سے سکونت پذیر تھے اور ہندوستانیوں اور ہندوستانی نژاد مسلمانوں کے مقابلہ میں احساس برتری رکھتے تھے۔ یہ امراء اور خاص طور سے تورانی اپنے آپ کو مغل شہنشاہ سے منسلک کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور سیاسی تدبر کے ساتھ اقتدار حاصل کرنے کو اپنا حق جانتے تھے۔ لیکن یہ طرز عمل جو مغل روایت کے خلاف تھا یہ ان مفرور امراء اس میں اپنی تضحیک محسوس کرتے تھے کہ حقیر ہندوستانیوں کا ایک طبقہ ان پر غلبہ حاصل کرے۔ ان میں سے اکثر نے راجپوتوں اور مرہٹوں سے سید برادران کے بڑھتے ہوئے اشتراک کی مخالفت کی انہوں نے ان کوششوں کی بھی مخالفت کی جو ہندو رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے جزیہ ختم کرکے کی گئیں۔ اس کے علاوہ ایسے امراء بھی تھے جنہوں نے سید برادران کے اقتدار کو ذاتی جاہ طلبی میں رکاوٹ محسوس کیا۔ ان مختلف فرقوں نے سید برادران کے اقتدار کے سامنے ابھی تک سر تسلیم ختم نہیں کیا تھا بلکہ حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ وہ ان کے خلاف بھرپور قدم اٹھانے کے لئے موقع کے منتظر تھے۔ ان حالات میں سید برادران کے نظام الملک کے خلاف سخت اقدام کرنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ یہ اندیشہ تھا کہ قدیم امراء ایسے اقدام کو اپنے بیخ کنی کی پالیسی کا ایک جزو نہ سمجھیں۔ سید برادران خود یہ خطرہ مول لینے کے لئے تیار نہ تھے۔ دوسرا راستہ صرف یہ تھا کہ نئے اور غیر تربیت یافتہ افراد کو اقتدار سونپا جائے جس سے نہ صرف نظم و نسق کی ابتری کا اندیشہ تھا بلکہ راجپوتوں مرہٹوں اور جاٹوں وغیرہ کو اپنی قوت کو استوار کرنے کا موقع فراہم کرنا تھا۔

بدقسمتی سے حالات نے کچھ ایسی صورت حال اختیار کی کہ سید برادران کو نظام الملک کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا حالانکہ انہوں نے اس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

باب 7

نظام الملک کی بغاوت اور سید برادران کا زوال

جس وقت سے نظام الملک نے مالوہ کا انتظام سنبھالا تھا برابر یہ خبریں آ رہی تھیں کہ وہ ایک گورنر کی ضرورت سے بہت زیادہ لشکر اور سامان جنگ جمع کر رہا ہے اور یہ کہ دکن پر برابر اس کی نظریں لگی ہوئی ہیں/ سید برادران کے استفسار پر نظام الملک نے یہ جواب دیا کہ مرہٹے پچاس ہزار سواروں کے ساتھ پورے صوبہ میں جو تباہی مچائے ہوئے ہیں اس کو روکنے کے لئے یہ اقدام ضروری ہے/ اس کے باوجود سید برادران نظام الملک کے عزائم کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے/ ان کے یہ شبہات بے بنیاد بھی نہ تھے کیونکہ مالوہ سے نظام الملک نے اپنے بیٹے مغل خاں کو جے سنگھ سورتی کے پاس بھیجا تھا تاکہ سید برادران کے خلاف اقدام کے لئے مشورہ کرے/ سید برادرن کو نظام الملک کے خلاف دوسری شکایات بھی تھیں مثلاً نظام الملک نے مرحمت خاں کو ملازمت دی تھی جسے حسین علی نے باندؤ کی قلعہ داری سے اس لئے برطرف کر دیا تھا کہ 1719ء میں جب وہ دہلی جاتے ہوئے ادھر سے گزرا تھا تو اس کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکا تھا۔ نظام الملک کا مرحمت خاں کو ملازمت دینا سید برادران نے اپنی نافرمانی پر محمول کیا۔ ان کے علاوہ سید برادران کو نظام الملک سے کچھ دیہات کو تباہ کرنے اور کچھ پرگنہ نیلم کے زمینداروں کو ان کی مرضی کے خلاف منتقل کر دینے کی بھی شکایات تھیں۔ انہیں یہ بھی شبہ تھا کہ نیکو سیر کی بغاوت میں بھی نظام الملک کا ہاتھ تھا۔

اس کے باوجود یہ شکایات نظام الملک سے اعلانیہ تصادم کا سبب نہ بنیں اگر دوسری اہم مصلحتیں درمیان میں پیدا نہ ہو جاتیں۔ دراصل حسین علی دکن کے ساتھ ساتھ مالوہ گجرات' اجمیر اور آگرہ پر بھی حکومت کرنا چاہتا تھا اس کے حصول کے لئے وہ مالوہ کو اپنا صدر مقام بنانا چاہتا تھا۔ اس کے دو اسباب تھے اول سید برادران کو مرہٹوں سے خطرہ تھا اور اس لئے دکن کے معاملات پوری طرح قبضہ میں رکھنا چاہتا تھا اور یہ دہلی میں بیٹھ کر ممکن نہ تھا۔ یہ کہا جاتا ہے کہ 1719ء میں اس کے دہلی کے دورہ کے موقع پر بالا جی وشوناتھ کو ساہو نے ہدایت کر دی تھی کہ وہ دولت آباد اور چاندہ کے قلعوں کا ٹیکس وصول کرے' براز میں پارسوجی بھونسلے کی فتوحات کی توثیق اور چوتھ وصول کرنے کا اختیار حاصل کرے۔ کچھ عرصہ سے مرہٹوں نے گجرات اور مالوہ سے چوتھ وصول کرنا شروع کر دیا تھا۔ ساہو کا استدلال یہ تھا کہ اگر اسے یہ اختیار دیا گیا تو وہ ان سرداروں پر قابو حاصل کرسکتا ہے جنھوں نے خود ٹیکس عائد کرنا شروع کردیا تھا تارا بھائی نے نظام الملک کے پاس خفیہ طور پر قاصد بھیجے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے دکن کو خفیہ طور پر فتح کرنے کا اور اس زمین کو جو خزانہ اور لشکر سے معمور تھی۔ آزادی کرانے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔"

سید برادران کو ستارا خاندان کی بڑھتی ہوئی جاہ کی ہوس اور نظام الملک کی فتنہ پردازی سے یہ خطرہ تھا کہ کہیں دکن کا مسئلہ از سر نو تازہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ غالباً وہ سلطنت کو اقتدار کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ شمالی اور جنوبی حصوں پر یکساں توجہ دی جاسکے۔ سلطنت کی اس طرح تقسیم کا مشورہ بھی دونوں بھائیوں میں روز افزوں اختلافات کے پیش نظر تھا۔ سید برادران کا پہلا قدم نظام الملک کو مالوہ سے ہٹانا تھا۔ حسین علی نے نظام الملک کو آگرہ الہ آباد برہان پور یا ملتان میں سے کسی اقطاع کی بھی صوبہ داری قبول کرنے کی پیش کش کی اور اسے یہ یقین دلایا کہ وہ جس صوبہ کو پسند کرے گا اس کی سند اسے بھیج دی جائے گی لیکن مالوہ کی صوبہ داری سے اس قدر جلدی علیحدہ ہو جانے پر اسے اعتراض تھا' خصوصاً ان حالات میں کہ فصلیں تیار تھیں اور وہ نہ لگان کا روپیہ وصول کرسکا تھا اور نہ وہ رقم جو اس نے زراعت میں لگائی تھی۔ اس پیش کش کے جواب میں اس نے یہ احتجاج کیا کہ اس نے مالوہ کی صوبہ داری اس محکم وعدہ پر قبول کی تھی کہ اسے اس عہدے سے جلد نہیں ہٹایا جائے گا۔ اسی لئے وہ تبادلہ کے اس حکم کو وعدہ خلافی کے مترادف سمجھتا تھا۔ نومبر 1719ء کے قریب حسین علی نے اپنے بخشی دلاور علی خاں کی کمان میں ایک طاقتور فوج کو بوندی کے ایک تنازعہ کو ختم کرنے کے لئے روانہ کی تھی لیکن اس کو یہ ہدایت بھی کر دی گئی تھی کہ اس کام کو ختم کرنے کے بعد مالوہ کی سرحد پر نظر رکھے دلاور علی ... بوندی میں اپنا کام ختم کرکے مالوہ کی سرحد کی نگرانی کرنے لگا۔ اسے ہوشیار رہنے کی ہدایت دی گئی تھی عالم علی کو خطوط بھیجے گئے کہ دکن کی حفاظت سے بے خبر نہ رہے۔ ان تمام پیش بندیوں کے بعد سید برادران نے نظام الملک کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دے کر شاہی نامہ بردار بھیجا۔ نظام الملک کے لئے یہ اقدام خلاف توقع نہ تھا کیونکہ محمد امین اور دیانت خاں بار بار اسے متنبہ کرچکے تھے کہ گردھر بہادر (الہ آباد میں) کے معاملات سے عہدہ براء ہونے کے بعد سید برادران اس کے خلاف کارروائی کا ارادہ رکھتے تھے۔ اسے شہنشاہ اور اس کی والدہ کے خاص بیانات بھی ملے تھے جس میں انہیں سید برادران کی گرفت سے آزاد کرانے کی خواہش کی گئی تھی۔ اس لئے اس نے دربار میں واپسی کے احکامات کی خلاف ورزی کا فیصلہ کیا اور علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس نے دربار میں حاضری کے لئے اجین کو خیرباد کہا لیکن جنوب کی جانب مڑگیا اور نربدا عبور کرکے دکن میں داخل ہوگیا۔

دکن میں فوراً برار اور خاندیش کے گورنر نظام الملک کے معاون ہوگئے۔ اسیر گڈھ کا مضبوط قلعہ بغیر ایک قطرہ خون گرائے تسخیر ہوگیا۔ جو امراء اب اس کی ساتھ مل گئے تھے۔ مثلاً اسیر گڑھ کا صوبہ دار طاہر خاں اور برہان پور کے انور اللہ خاں اور نور اللہ خاں وہ سب سید برادران کے پروردہ اور معتمد تھے ان لوگوں کی سید برادران سے روگردانی نہ صرف ان کی سیاسی کمزوری کا مظہر تھی بلکہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سید برادران کو عام مقبولیت حاصل نہ تھی۔ سید برادران نے پرانے امرا کو ان کے قدیم عہدوں پر بحال کر دیا تھا لیکن ان میں سے بیشتر نئی حکومت کو نامعقول اور سید برادران کو نمک حرام سمجھتے تھے۔ نظام الملک نے امراء کے

ان جذبات سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے پوری کوشش کی اور یہ بات ذہن نشین کرا دی کہ :

1۔ وہ جو کچھ بھی کررہا ہے وہ شاہی خاندان کے عزت و وقار کے لئے کر رہا ہے۔ جب کہ سید برادران تیموری خاندان کو تباہ کرنے پر آمادہ ہیں۔

2۔ سید برادران تمام ایرانی اور تورانی خاندان کو تباہ کرنے پر آمادہ ہیں۔

3۔ سید برادران نے ہندوؤں سے ساز باز کرلی ہے اور غیر اسلامی پالیسی پر عمل پیرا ہیں' جو سلطنت کے مفاد کے خلاف ہے۔ نظام الملک کی سید برادران کے خلاف تحریک کے لئے مندرجہ بالا الزامات اور خصوصیت کے ساتھ یہ اعلان کہ شہنشاہیت خطرہ میں ہے بہت موثر ثابت ہوئے اور بہت لوگ اس کے ہم نوا ہوگئے۔

حالات کے اس رخ نے سید برادران کو خوف زدہ کر دیا اور ان کے مشیروں میں افتراق پیدا ہوگیا۔ نظام الملک نے نسل اور مذہب کے معاملہ میں جو عصبیت اختیار کی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم امراء کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کیا جائے اس میں دونوں بھائیوں میں سخت اختلاف پیدا ہوگیا۔ ایک مرتبہ نظام الملک نے اپنے آپ کو کردار کے اعتبار سے ایک سپاہی بتایا تھا جو مساعد حالات میں غصہ سے مغلوب ہوکر اپنے مخالف کا دشمن بن جاتا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ مغل امراء اور خصوصاً" تورانیوں پر مزید اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے پہلا اقدام یہ تجویز کیا کہ محمد امین خان کو جو نظام الملک کا چچیرا بھائی تھا اور بخشی دوم کے عہدہ پر فائز تھا۔ قتل کر دیا جائے۔ عبداللہ خاں اس قسم کے اقدام کو نہ صرف خطرناک سمجھتا تھا بلکہ بے محل اور بددیانتی پر محمول کرتا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ نظام الملک کی بغاوت کو انفرادی اقدام سمجھ کر اس کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھتا تھا کہ یہ بغاوت مغل امراء کے پورے طبقہ کی ناراضی کی نشان دہی کرتی ہے۔ وہ اس پر آمادہ تھا کہ نظام الملک کو دکن تفویض کرکے اس سے مصالحت کرے۔ اس نے بڑے طنز سے کہا کہ نظام الملک کی بغاوت فرخ سیر کی معزولی کا پہلا ثمر ہے اس نے حسین علی پر یہ الزام لگایا کہ حسین علی نے قبل از وقت نظام الملک کو اپنا مخالف بنالیا۔ خان دوران (نظام الملک) اور رتن چند نے عبداللہ خاں کی تجویز کی حمایت کی اور یہ رائے دی کہ اب جنگ سید برادران کی موت کے بعد ہی ختم ہوگی۔"

عبداللہ خاں کے اصرار پر حسین علی نے محمد امین خاں کو معزول کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور مغلوں کی دل جوئی کے طور پر ایک تورانی امیر حیدر علی خاں کو میر آتش کے اہم نصب پر فائز کیا گیا۔ لیکن حسین علی نے مصالحت کی اس تجویز کو یہ کہہ کر منظور کرنے سے انکار کیا کہ یہ شکست کے مترادف ہے نیز خود نظام الملک بھی اسے منظور نہیں کرے گا۔ اس نے اپنے بھائی پر جرات کی کمی اور پیش قدمی نہ کرنے کا الزام لگایا۔ بالآخر اس کے ایماء پر دلاور علی کو نظام الملک کے خلاف شمال کی طرف سے پیش قدمی کرنے اور عالم علی کو جو دکن میں حسین علی کا نائب تھا جنوب کی جانب سے لشکر کشی کا حکم دیا گیا۔ تاکہ اس طرح نظام الملک کو دونوں فوجوں کے درمیان پسپا کر دیا جائے۔ بالاجی وشوناتھ اور ساہو کو خطوط بھیجے گئے اور درخواست کی گئی کہ وہ

عالم علی کی مدد کریں۔

نظام الملک نے سید برادران کے سپہ سالاروں سے زیادہ چستی کا مظاہرہ کیا اس سے پہلے کہ عالم علی کی فوجیں دلاور علی کی کمک سے قوت حاصل کرسکیں' نظام الملک نے دلاور علی کی افواج پر حملہ کرکے 29 جون 1720ء کو مکمل طور پر تباہ کردیا۔ اس کے بعد اس نے عالم علی کی طرف رخ کیا جس کے ساتھ پیشوا باجی راؤ کی سرکردگی میں مرہٹہ سواروں کی فوج شامل ہوچکی تھی۔

اس غیر متوقع ضرب نے سید برادران کو سراسیمہ کردیا۔ عبداللہ خان نے ایک مرتبہ پھر نظام الملک سے صلح کی کوشش کی تاکہ سانس لینے کا موقعہ مل سکے۔ سید برادران کے بہی خواہوں میں بعض نے (جیسے دیانت خاں خفی یا دیوان تن و خالصہ) اس طرف توجہ دلائی کہ حسین علی کے خاندان کے افراد ابھی تک دکن میں مقیم ہیں اور ان کو نظام الملک کی دست برد سے بچانے کے لئے محتاط پالیسی کی ضرورت ہے۔ نظام الملک کا چچا زاد بھائی محمد امین خاں حالات کے اس بدلتے ہوئے رخ سے دل ہی دل میں خوش تھا اس نے نظام الملک سے مصالحت کے لئے مدد کی پیش کش کی۔

آخر کار دوزخی پالیسی اختیار کرنا طے ہوا۔ نظام الملک کو فرمان اور خطوط بھیجے گئے جن کا لب و لہجہ ریاکارانہ تھا۔ اسے دکن کی صوبہ داری عنایت کی گئی۔ ساتھ ہی دلاور خاں کے اقدام کی مذمت کی گئی۔ نظام الملک سے کہا گیا کہ عالم علی اور میر بخشی کے خاندان کو دکن چھوڑنے کی اجازت دے دے۔ اسی کے ساتھ ساتھ دکن کے لئے بڑے پیمانہ پر فوج تیار کی گئی اور عالم علی کو اس فوج کی آمد کے انتظار کی ہدایت کی گئی۔

لیکن نظام الملک اتنا زیرک اور ہوشیار تھا کہ وہ اس طرح کی بدیہی سازش کا شکار نہیں ہوا۔ اس نے اپنے مخالفین کے دام فریب میں خود ان کو پھنسا دیا۔ ان کے خطوط و زبان کو اس طرح استعمال کیا جس کا کوئی تصور بھی نہ تھا۔ اس نے اس کی زیادہ سے زیادہ تشہیر کی اور اس طرح اپنے آپ کو ہر ایک کی نگاہ میں دکن کا قانونی صوبہ دار ظاہر کیا اور عالم علی کو باغی ٹھہرایا جو شاہی حکم کی خلاف ورزی کرکے دکن کی حکومت اس کے سپرد کرنے میں مانع تھا۔ اس طرح عالم علی نہ صرف اخلاقی حق سے محروم ہوگیا بلکہ بہت سے غیر مستقل مزاج افراد نے اپنی قسمت نظام الملک سے وابستہ کرلی۔

چنانچہ 10 اگست 1720ء کو شکر کھیرا کی جنگ میں نظام الملک کے ہاتھوں عالم علی اور اس کے معاونین مرہٹے بالکل تباہ و برباد ہوگئے۔ اس کے فوراً" بعد حسین علی کو جبکہ وہ شہنشاہ کے ساتھ دکن کی طرف آرہا تھا قتل کر دیا گیا۔ یہ سب کچھ ایک سازش کے ماتحت ہوا جو محمد امین خاں بخشی دوم' حیدر قلی خاں' میر آتش اور چند دوسرے امراء مثلاً" سعادت خاں (جو بعد کو برہان الملک ہوئے) اور میر جملہ نے تیار کی تھی۔ اس وقت عبداللہ خاں دہلی کے راستے میں تھا اس نے جب یہ خبر سنی تو دارالسلطنت کو واپس لوٹ گیا اور ابراہیم خاں نام کے ایک شخص کو شہنشاہ بنا

کر تخت پر بیٹھا دیا اور اپنے معاونین کو جمع کرنا شروع کیا۔ سادات بارہ اور چورامن جاٹ نے آخر تک اس کے ساتھ دیا۔ بہت سے افغان بھی مطلب براری کے لئے ساتھ ہوگئے۔ اگرچہ اس وقت کے امراء میں سب سے مشہور افغان میر محمد خان بنگش محمد امین خان اور شہنشاہ محمد شاہ کے ساتھ ہوگیا۔ فرخ سیر دور کے کچھ قدیم امراء جیسے غازی الدین احمد بیگ محمد مراد کشمیری وغیرہ جو ملازمت سے سبکدوش ہوکر دہلی میں سکونت پذیر تھے۔ عبداللہ خاں کا ساتھ دینے پر رضا مند ہوگئے۔

خافی خاں لکھتا ہے "کوئی قصائی باورچی یا دھنیا جس نے ایک خستہ حال ٹٹو پر چڑھ کر اپنے اپ کو پیش کر دیا لشکر میں شامل کرلیا گیا اور اسی روپیہ ماہوار مشاہرہ مقرر کر دیا گیا۔ عجلت کے ساتھ مرتب کی ہوئی عبداللہ خاں کی یہ فوج محمد امین خاں اور شہنشاہ محمد شاہ کی فوجوں کا مقابلہ نہ کرسکی۔ 13 نومبر 1720ء کو آگرہ کے قریب حسن پور کے مقام پر عبداللہ خاں کو شکست ہوئی اور وہ قید کرلیا گیا۔

اس طرح سید برادران کی نئی وزارت کا خاتمہ ہوا اپنی طاقت کو مستحکم کرنے میں سید برادران کی ناکامی کا خاص سبب اورنگ زیب اور بہادر شاہ کے زمانہ کے مقتدر امراء کی مخالفت تھی۔ یہ قدیم امراء سید برادران کو کم ظرف سمجھتے تھے اور اسی لئے سلطنت کے انتظام میں ان کی بالادستی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور سید برادران کی عام پالیسی اور مملکت کے سیاسی مسائل کو حل کرنے کا طریقہ بھی انہیں پسند نہ تھا۔

سید برادران کی مخالفت میں سب سے بڑھ کر اس چھوٹے مگر مضبوط گروہ نے حصہ لیا۔ جو نظام الملک اور محمد امین خاں کے ساتھ تھا۔ یہ لائق اور حوصلہ مند امراء سلطنت میں اعلیٰ اقتدار حاصل کرنے کے خواہش مند تھے۔ یہ طبقہ سید برادران کی راجپوت اور مرہٹوں کو مراعات دینے اور ہندو رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی پالیسی کے بھی خلاف تھا۔ اور وہ اس اقدام کو اورنگ زیب کی پالیسی سے انحراف سمجھتے تھے۔ یہ ان کے نزدیک نہ صرف ریاست کے اسلامی کردار کے منافی تھا بلکہ سلطنت اور شہنشاہیت کے مفاد کے بھی خلاف تھا۔

اپنے آپ کو اسلام اور شہنشاہیت کے نجات دہندہ کے علاوہ سید برادران کے مخالفین نے ان کو مغلوں سے برگشتہ کرکے امراء کے ایک چھوٹے طبقہ کے محدود مفاد کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان کے جذبات کو برانگیختہ کیا اور سید برادران پر الزام لگایا کہ وہ خود اپنے متوسلین کے لئے اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کوشش کی کہ بلند مرتبہ امراء میں ہر فرقہ اور ہر نسل کے افراد کو حتیٰ کہ اورنگ زیب اور بہادر شاہ کے عہد کے امراء اور راجپوت و مرہٹوں وغیرہ کو مجلس مشاورت میں شامل کرلیں۔ لیکن سید برادران کی پالیسی کو غلط طریقہ سے پیش کرنا اور مغل اور سید برادران کی مخالفت کو ہندوستانیوں کی کشمکش ظاہر کرنا ہی ان کے مخالفین کے مفاد میں تھا۔

سیاسی اعتبار سے سید برادران کی سب سے بڑی غلطی فرخ سیر کی معزولی تھی۔ اس سوال پر اخلاقی نقطہ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ کیا سید برادران شہنشاہ کے وفادار نہ تھے۔ یا وہ

حالات کے تقاضوں کے پیش نظر اس سے برتاؤ کرتے تھے۔ اروِن کا خیال تھا کہ فرخ سیر کی معزولی شاید ناگزیر تھی لیکن اس ناگزیر اقدام کے لئے جو طریقہ کار اختیار کیا گیا وہ غیر ضروری طور پر درشت تھا اور اس قیدی کی جان لے لینا ایسا اقدام تھا جس کا کوئی جواز نہ تھا۔

ڈاکٹر ستیش چندر کا خیال ہے کہ زیر بحث موضوع کی سچائی کو جاننا بہت ضروری ہے فرخ سیر کا قتل حالانکہ غیر ضروری ظالمانہ طریقہ سے کیا گیا لیکن یہ فعل بھی اس کی معزولی کا ناگزیر اور منطقی ردعمل تھا۔ جب تک وہ زندہ رہتا سید برادران اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھ سکتے تھے۔ سید برادران کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ اپنے مقصد میں فرخ سیر کی معزولی کے بغیر کامیاب ہوسکتے ہیں یا نہیں؟ عبداللہ خاں کا خیال یہ تھا کہ بغیر اس کے بھی کامیابی حاصل ہوسکتی تھی۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ خطبہ اور سکے پر فرخ سیر کا نام باقی رہنے میں اس وقت کوئی نقصان نہیں ہے جب تک کہ تمام اہم عہدوں پر ان کا قبضہ رہے اور ان کے نامزد افراد ان پر فائز کیے جاتے رہیں۔ معزولین نے جس کی تمام تر ذمہ داری حسین علی پر عائد ہوتی ہے امراء کے دلوں میں شبہات پیدا کر دیئے تھے وہ سید برادران کے ارادوں کو بھانپ گئے تھے اور اسی خیال نے ان کے تمام معاون افراد کو جو اس غیر معمولی اقدام کے حق میں نہ تھے متحد کردیا۔

وہ لکھتا ہے کہ اگر انہیں بہادر افراد کی نظر سے دیکھا جائے جو اپنے ناشکر گزار حاکم کے خلاف اپنی جان اور عزت کے لئے لڑ رہے تھے تو معزولی کے بعد سید برادران کو ظالم نمک حرام سمجھا جائے گا جو اپنے خاندان کی ناموس پر ایک بدنما داغ تھے۔ تمام ہم عصر مصنفین یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو سید برادران کے ہم نوا ہیں اس سلسلے میں ان کو ملامت کرنے پر متحد ہیں اور معزولی کے فعل کو قابل مذمت و نفرت سمجھتے ہیں۔ ان کی سیاسی قوت کی کمزوری پر نظر کرتے ہوئے ملک کی مصلحت کے پیش نظر بھی یہ ایک فاش غلطی تھی کیونکہ اس نے ان کے مخالفین کو خاص طور سے چن فرقہ کو تیموری شہنشاہیت کی بقاء کا علمبردار بنا دیا اور انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے مفاد کے لئے عوام کو برگشتہ کیا۔

سید برادران نے اپنے وسائل اور طاقت کا مبالغہ آمیز اندازہ لگایا۔ وہ طاقتور فرقہ کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کیا جائے۔ اس مسئلہ پر آپس میں دست و گریباں رہے۔ آخر کار انہوں نے قبل از وقت طاقت آزمائی کا مظاہرہ کر ہی دیا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ خاں نے اپنی قوت کی کمزوری کا اندازہ حسین علی سے بہتر لگایا تھا۔ تحمل اور حکمت عملی کے ساتھ وہ محمد امین خاں، نظام الملک، سربلند خاں کو فرخ سیر سے الگ کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ان امراء سے نہ صرف تعلقات برقرار رکھے جائیں بلکہ اگر ممکن ہو تو زیادہ مستحکم کیے جائیں اس لئے وہ ان کے ساتھ احتیاط اور مصلحت کا حامی تھا۔ اس کے برخلاف حسین علی مغلوب الغضب اور خود پسند تھا۔ اور بظاہر یہ سمجھتا تھا کہ یہ حکمت عملی ناقابل عمل ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ نظام الملک، محمد امین خاں وغیرہ کو جلد از جلد ختم کر دیا جائے یا کم از کم ایسا معذور کر دیا جائے کہ وہ نیش زنی نہ کرسکیں۔ نظریاتی اختلاف اور طریقہ عمل کے اس تضاد نے جو

اقتدار کی ہوس اور مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلہ میں سامنے آچکے تھے دونوں بھائیوں کے درمیان اختلافات کو اور نمایاں کردیا تھا۔

سید برادران کا اقتدار اتنی مدت تک قائم نہ رہا کہ ان کی انتظامی صلاحیتوں کا صحیح جائزہ لیا جاسکے۔ فرخ سیر کی معزولی کے فوراً بعد پارٹی میں بڑھتے ہوئے اختلافات نے انتظامیہ کو مفلوج کردیا تھا اور ہر جگہ زمیندار اور شورش پسند سر اٹھا رہے تھے۔ جہانداری کے مسلمہ قوانین کو نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ رتن چند جیسے نائبین کی قلاشی اور دست نگری نے سید برادران کو نہ صرف غیر مقبول بنا دیا تھا بلکہ ان کی انتظامی صلاحیتوں کو شبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا تھا۔ مالگزاری وصولیابی کے سلسلہ میں سخت گیری اور رشوت کی گرم بازاری بھی انہیں افسروں کے سبب سے تھی۔ اس کے برخلاف وہ مصنفین بھی جو سید برادران کے بدترین مخالف ہیں اس سے انکار نہیں کرتے کہ سید برادران نے نظم و نسق کو بہتر بنانے کی پوری کوشش کی لیکن ان میں جنگی لیاقت اور انتظامی صلاحیتوں کی کمی انتظامیہ پر آخری ضرب لگانے میں سب سے آگے رہی۔

اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے کر سید برادران نے مغل سلطنت کی سالمیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جب کہ ایک ناکارہ اور کمزور بادشاہ کی معزولی کا لازمی نتیجہ سلطنت کا پارہ پارہ ہونا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایسی پالیسی اختیار کی کہ اگر کچھ عرصہ اور اس پر عمل کیا جاتا تو وہ ایسے حکمراں طبقہ کے قیام میں مددگار ثابت ہوتی جس میں ہر طبقہ کے مغل امراء راجپوت اور مرہٹے شامل ہوتے۔ آخری تجزیہ کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغلوں نے جو سیاسی حکمت عملی اختیار کی تھی وہ صرف اسی طرح استوار اور مستحکم ہوسکتی تھی کہ ملک میں ایسا حکمراں طبقہ پیدا کر دیا جائے۔

اس پر عمل پیرا ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ سید برادران کے علاوہ کوئی طاقتور طبقہ دربار میں یا دربار کے علاوہ ایسا نہ تھا جو اس حکمت عملی کو بروئے کار لانے میں دلچسپی لیتا۔ عالمگیری امراء یا وہ طبقہ جو مغل کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا' اقتدار میں دوسروں کی شرکت گوارا نہیں کرتا تھا اور صرف اپنے آپ کو حکمرانی کا اہل سمجھتا تھا۔ مرہٹہ سردار صرف دکن پر اپنا اقتدار قائم رکھنے میں دلچسپی رکھتے تھے اور انہیں مغل سلطنت کی استواری سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ حالانکہ عارضی طور پر شاہو کا مفاد سید برادران کے مفاد سے وابستہ تھا لیکن وہ مغل سلطنت کے احیاء اور استحکام کے خلاف تھے اور انہیں سید برادران کی اس خواہش سے کوئی ہمدردی نہ تھی کہ ایک مخلوط اور متحد حکمران طبقہ کا قیام عمل میں آئے۔ سید برادران مرہٹوں کا تعاون کسی حد تک بھی حاصل نہ کرسکے۔ دکن میں حسین علی کے نائب عالم علی نے باجی راؤ کے اس مشورہ کو بھی منظور نہیں کیا کہ مرہٹوں کو نظام الملک کو خوف زدہ کرنے سے نہ روکا جائے اور شمالی ہندوستان سے کمک آنے تک فیصلہ کن جنگ سے پہلو تہی کی جائے۔ مغل سلطنت کے استحکام اور استقرار میں مرہٹوں سے زیادہ راجپوتوں کا مفاد تھا کیونکہ انہیں اپنی قوت میں اضافہ کرنے اور سلطنت میں بڑے عہدہ حاصل کرنے کے زیادہ مواقع حاصل تھے۔ ان سے یہ توقع کی

جاسکتی تھی کہ وہ سید برادران کی پوری طرح مدد کرتے کیونکہ ان کی پالیسی ان کی اپنی خواہشات کی تکمیل میں معاون ثابت ہوتی۔ اجیت سنگھ اور جے سنگھ سید برادران کے مرہون منت تھے کیونکہ انہوں نے ان کو بہت مراعات دی تھیں لیکن ان راجاؤں میں سے کسی نے بھی سید برادران کو بروقت فوجی مدد بہم نہیں پہنچائی۔ بلکہ وہ اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتے رہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سید برادران ایسے مسئلہ میں جس کا کوئی حل نہ تھا الجھے رہے۔ سیاسی اتحاد کے امکانات نہایت کمزور تھے اور صرف ایک مضبوط اور طاقتور مرکزی حکومت ہی سلطنت کو انتشار سے محفوظ رکھ سکتی تھی کہ ایک تجربہ کار اور باصلاحیت حکمران کی غیر موجودگی میں طاقتور مرکزی حکومت کے قیام کا انحصار صرف ایک ایسے وزیر پر تھا جس کو یا تو امراء کے طبقہ کی حمایت حاصل ہوتی یا پھر خود سلطنت کو استحکام حاصل ہوتا۔

ان وجوہ کی بناء پر سید برادران مضبوط مرکزی حکومت برقرار نہیں رکھ سکتے تھے۔ سید برادران تیموری شہنشاہیت کے اتحاد کو ایک علامت کے طور پر برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن بادشاہ اور طاقتور وزیر کے درمیان جو بدگمانیاں تھیں ان کی وجہ سے یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا اور وزیر اور بادشاہ کبھی بھی متحد الخیال نہ ہوسکے بلکہ اختلافات کی خلیج کو ذاتی مفادات نے اور وسیع کردیا۔

اگرچہ ان وجوہ کی بناء پر جو اوپر بیان کی جاچکی ہیں سید برادران کا تجربہ کامیاب نہ ہوسکا لیکن انہوں نے جو "نئی وزارت" قائم کی اس کو نظرانداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سید برادران نے نسلی عصبیت اور تنگ نظری کو ختم کرکے ایک سیکولر اور قومی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ جو ان کے اپنے مفاد میں تھی۔ لیکن اس میں بھی وہ ناکام رہے۔

نظام الملک اور وزارت کی کشمکش کا خاتمہ

1۔ **محمد امین خاں کی وزارت** : سیدوں کے زوال ان کی شکست اور نظام الملک کے عہدہ وزارت سنبھالنے کے درمیان ایک سال تین مہینہ کا عرصہ ہے۔ اس مدت کے پہلے تین مہینوں میں نظام الملک کا برادر عم زاد محمد امین خاں کی اسی وزارت پر مسند نشین تھا۔ محمد امین خاں کو آٹھ ہزاری منصب دو اسپہ سہ اسپہ دیا گیا۔ اور اسی کے ساتھ ملتان کی غائبانہ صوبہ داری بھی بخشی گئی۔ اس کے بیٹے قمرالدین خاں کو بخشی دوئم مقرر کیا گیا اور اسے سات ہزاری منصب مراد آباد کی فوجداری اور داروغہ احدی اور داروغہ نسل خانہ کے عہدے بھی دیئے گئے۔ یہ عہدے اس لحاظ سے نہایت اہم تھے کہ شہنشاہ تک کی رسائی انہیں عہدے داروں کے ذریعہ ممکن تھی۔ دوسرے ان لوگوں کو بھی نوازا گیا جنہوں نے سید برادران کے خلاف سازش میں حصہ لیا تھا۔ سعادت خاں کو اودھ کا صوبہ دار اور حیدر قلی کو گجرات کا گورنر جمع عہدہ میر آتش بنایا گیا۔ میر جملہ کے اس عہدہ صدر اور خان درواں کے پاس بخشی کا قلمدان باقی رہا۔ نظام الملک کے پاس دکن اور مالوہ کی صوبہ داری برقرار رہی۔ عبدالصمد خاں کے پاس لاہور رہا اور کشمیر کا اضافہ اس کے بیٹے زکریا خاں کے نام سے کر دیا گیا۔ دوسرے صوبوں میں زیادہ تبدیلیاں نہیں لائی گئیں۔

(خافی خاں صفحہ 911 ' 938)

پہلے دن سے ہی نیا وزیر سیدوں کے خلاف تحریک کے مقصد کو پورا کرنے میں بہت کم دلچسپی لے رہا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ "شہنشاہ کو اس کے پورے اختیارات پر دوبارہ فائز کر دیا جائے۔" وہ اگر کچھ تھا تو وہ اتنا ضرور تھا کہ سیدوں سے زیادہ بااختیار تھا اور کہا جاتا ہے کہ محمد شاہ کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ تخت پر تاج پہن کر جلوہ گر رہے۔ شہنشاہ وزیر سے خائف تھا اور اس نے تمام اختیارات اسی کو سونپ دیئے تھے۔ وہ عوام کی شکایات پر کوئی دھیان نہ دے رہا تھا۔ "دوسرے امراء محسوس کرتے تھے کہ شہنشاہ بالکل بے بس تھا اسی لئے وہ بھی وزیر سے خائف رہتے تھے۔ سیدوں کے زوال سے شہنشاہ کو جو کچھ ملا وہ اتنا تھا کہ اب اسے کچھ شخصی آزادی حاصل ہوگئی تھی۔ لیکن حکومت کے معاملات میں اس کے کچھ اختیارات نہ تھے۔

(خافی خاں صفحہ 940)

محمد امین سیدوں کی عام پالیسی سے انحراف کرکے نئی راہ اختیار نہ کرسکا اس نے جزیہ کو دوبارہ نافذ کر دینے کا منصوبہ بنایا لیکن جے سنگھ اور گردھر بہادر کی مخالفت کے سبب اس کو اس ارادہ سے باز رہنا پڑا۔ تاہم وزیر کے حکم کی عزت رکھنے اور متعصب عناصر کو خوش کرنے کی غرض سے یہ اعلان کر دیا گیا کہ اس ٹیکس کو صرف اس وقت کے لئے ملتوی کر دیا گیا جب تک کہ رعیت کی خوش حالی اور ملک میں امن و امان کی بحالی نہ ہوجائے۔

(خافی خاں صفحہ 936)

مرہٹوں کے معاملہ میں نئی سندوں کے ذریعہ چوتھ اور سردیش مکھی کی ادائیگی کا معاہدہ جو سیدوں نے کیا تھا تسلیم کرلیا گیا اپنی طرف سے نظام الملک شاہو کو چوتھ اور دیش مکھی دینے کے لئے پہلے ہی راضی ہوچکا تھا اور اس معاہدہ کی 4 جنوری کی خفیہ ملاقات میں توثیق کر دی۔ یہ ملاقات ان دو اہم شخصیتوں کے درمیان طویل ملاقاتوں کے سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔

(بحوالہ ڈفرن جلد 1 صفحہ 473ء انڈین ہسٹری ریکارڈ کمیشن روداد نمبر 27 صفحہ 10-209)

اس طرح محمد امین خاں اور نظام الملک وغیرہ کی فتح سے سیدوں کی پالیسی میں کوئی فوری تبدیلی نہ آسکی اگرچہ سیدوں کو ان کی ہندو نواز پالیسی کے لئے سخت بدنام کیا گیا تھا۔ اجے سنگھ ہمیشہ سے سیدوں کا زبردست مددگار رہا تھا۔ اس کو "بدانتظامی" کے سبب ہٹا دیا گیا لیکن ان معاملے میں بھی محمد امین اس کا صوبہ بحال کرنے کے لئے نصف حد تک ضرور تیار تھا۔

نظام الملک کی آمد اور اس کی ابتدائی دشواریاں : محمد امین خاں ایک مختصر سی علالت کے بعد 27 جنوری 1721ء کو وفات پاگیا۔ کچھ مشوروں کے بعد شہنشاہ نے دکن سے نظام الملک کو طلب کیا کہ وہ آئے اور قلمدان وزارت سنبھالے۔ نظام الملک سیدوں کے زوال کے بعد سے اس عہدہ کا متمنی تھا اور جب اس کو محمد امین خاں کے عہدہ وزارت پر مقرر ہونے کی اطلاع ملی تو وہ شمالی ہندوستان کے لئے درحقیقت روانہ بھی ہوگیا تھا۔ لیکن اپنے برادر عمزاد سے تنازعہ نہ کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا اور کرناٹک کا رخ کیا جہاں پر مرہٹوں کے حملے ہو رہے تھے۔

جب نظام الملک کو شاہی احکام پہنچے تو اس کو کرناٹک کے معاملات درست کرنے میں کچھ وقت لگا اور اس لئے وہ دربار میں 20 فروری 1722ء سے قبل حاضر نہ ہوسکا۔ اس وقفہ میں محمد امین کو اپنی حکمرانی کے جوہر دکھانے کا پورا موقع ملا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو ایک کمزور اور عیش پسند انسان ثابت کیا۔ انتظامی معاملات کی طرف سے بے پرواہ اور پوری طرح اپنے مقربین کے زیر اثر وہ کبھی بھی استقامت کے ساتھ کسی ایک ارادہ پر قائم نہ رہ سکتا تھا۔ بقول ایک مرہٹہ وکیل کے وہ فطرتاً متلون مزاج انسان تھا۔

اس عرصہ میں مقربین میں سے جو سب سے پیش پیش تھے وہ حیدر علی خاں اور کوکی جیو تھے۔ حیدر قلی خاں (محمد رضا) اصفرین کا باشندہ تھا اور وہ عظیم الشان کا ہمنوا رہ چکا تھا۔ جب فرخ سیر تخت نشین ہوا تو اس کو میر جملہ کے ذریعہ حیدر نکی کا خطاب حاصل ہوا۔ دکن کا دیوان بنایا گیا اور وہ تمام شاہی زمینوں اور متعدد دوسری شاہی املاک کا محافظ تھا اور اسے تمام ماتحتوں کی تقرری اور برطرفی کا اختیار تھا۔ نظام الملک کی اس کے ساتھ نبھ نہ سکی اور اس نے اس کو خود اپنے حکم سے دلی بھیج دیا۔ تب اس کو گجرات کا دیوان اور سورت کا متصدی بنایا گیا۔ جس عہدہ سے اس نے دولت کے انبار جمع کر ڈالے۔ عبداللہ خاں اسے ناپسند کرتا تھا اور اس نے اس کو 1718ء میں عبدالحئی پسر عبدالغفور بوہرہ کی شکایت پر برطرف کر دیا جس کی 85 لاکھ کی املاک کو حیدر قلی نے اس بہانے سے ضبط کر لیا تھا کہ وہ لاولد مرا۔ دربار پہنچ کر حیدر قلی نے کسی نہ کسی

طرح رتن چند کا تقرب حاصل کرلیا اور اسے آگرہ اور آلہ آباد کے خلاف بھیجی گئی فوج پر مقرر کر دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد ہی میر آتش بنا دیا گیا۔ اس سے حیدر قلی کو سیدوں کے خلاف سازش کرنے کا موقعہ ملا اور حسین علی کو قتل کرنے کے سلسلے میں اس کو چھ ہزاری منصب پر ترقی دے دی گئی۔ وہ ہر روز شہنشاہ کے تقرب کی وجہ سے ترقی کرتا گیا اور نظام الملک کے قلمدان و زارت سنبھالنے تک وہ آٹھ ہزاری اور سات ہزاری منصب تک ترقی کرچکا تھا۔ کوکی جیو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بڑی حسین و جمیل اور بہت عاقل و ذہین عورت تھی اور شہنشاہ کی والدہ کی سہیلی تھی۔ خواجہ خدمت گار کے ساتھ جو شہنشاہ کا مقرب ہمنشین تھا' مل کر وہ ملازمتوں کے خواہشمندوں سے پیش کش کے طور پر بڑی بڑی رقوم حاصل کرتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ خود شہنشاہ بھی اس غیر قانونی آمدنی میں حصہ دار تھا۔ کوکی اس قدر بااثر ہوگئی تھی کہ یہ افواہ مشہور ہوگئی تھی کہ شاہی مہر اس کے قبضہ میں رہتی تھی۔ شاہی مقربین کی انتظامی امور میں دخل اندازی' اور بخشی خاص خان دوراں صمصام الدولہ کے بے پناہ حسد نے نئے وزیر کی راہ میں بہت دشواریاں پیدا کیں۔ اس نے یہ دیکھا کہ آئین حکمرانی بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔ قدیم امراء کی طرف سے بے توجہی برتی جاتی تھی آمدنی زوال پذیر تھی اور حکومت تیزی سے قبر میں دھنستی چلی جارہی تھی۔

(خافی خان صفحہ 940 ماثر الامرا' جلد 3 صفحہ 746)

جب نظام الملک نے حیدر قلی کی انتظامی امور میں دخل اندازی کی شکایت کی تو شہنشاہ نے حیدر قلی کو گجرات واپس چلے جانے کی ہدایت کی۔ گجرات پہنچ کر حیدر قلی نے ایک متکبرانہ اور مغرورانہ انداز اختیار کرنا شروع کردیا اور خود مختار حکمران جیسا طور طریق اپنانے لگا۔ اس نے شاہی امراء کو دی گئی جاگیریں ضبط کرنا شروع کردیں اور عربی حبشیوں اور فرانسیسیوں (یورپیوں) کو اپنے توپ خانے کی تقویت کے لئے مقرر کرلیا۔ سامان کو بغیر اجازت اپنی تحویل میں لینے لگا۔ وہ اونچے چبوترے پر بیٹھ کر فریادیں سنتا تھا اور اس طرح شاہی امتیازات کو گویا پامال کرتا تھا۔ جانوروں کی کشتیاں ملاحظہ کرتا اور اپنے ہمنواؤں کو جھالہ لگی پالکیاں بخشش میں دیتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ کہا جاتا تھا کہ وہ ایسا کرنے کی جسارات اس لئے کرتا تھا کہ اس کو پوشیدہ طور پر شاہی پشت پناہی حاصل تھی۔

(خافی خاں صفحہ 946 وغیرہ)

بالآخر نظام الملک نے جسے کچھ ہی عرصہ قبل مالوہ کی گورنری سے برطرف کیا گیا تھا۔ شہنشاہ کی خوشامد کی کہ گجرات کا صوبہ اس کے بیٹے یعنی غازی الدین خاں کے نام پر اس کو دیدیا جائے۔ دسمبر 1722ء میں وہ حیدر قلی کے حوصلوں کو پست کرنے کے بہانے گجرات روانہ ہوگیا۔ لیکن اس کے اصل مقاصد کچھ اور ہی تھے اس کے دہلی آنے کا مقصد ایک تو یہ تھا کہ اسے غلط فہمی تھی کہ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ نئے شہنشاہ سے کیا امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں اور کہاں تک اس سے خطرہ ہے۔ ان میں سے پہلی تمنا تو محض ایک فریب نظر بنی دکھائی دے رہی

تھی یعنی کم از کم جتنا آسان وہ اس کام کو سمجھتا تھا اس سے کہیں زیادہ دشوار نکلا۔ اسی اثناء میں دکن میں اس کی بنی بنائی بات خراب ہوتی نظر آرہی تھی۔ مبارزالملک نے جس کو اس نے اپنی غیر حاضری میں اپنا نائب مقرر کردیا تھا۔ شاہو کے ساتھ چوتھ اور سردیش مکھی کے سلسلے میں ہونے والے معاہدہ کو کالعدم کر دیا تھا اور اس کے سبب مرہٹوں کی ریشہ دوانیوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔ 1723ء میں پیشوا باجی راؤ ایک زبردست فوج کے ہمراہ مالوی میں داخل ہوا۔ اہم صوبہ میں جو سیاسی اعتبار سے نہایت اہم تھا مرہٹہ ریشہ دوانیوں کے سلسلہ کی پہلی کڑی تھی۔

نظام الملک مالوہ میں جھبوا کے قریب بداکشا (یابولا شا) کے مقام پر باجی راؤ سے 21 فروری 1723ء کو ملا اور اس کے ساتھ ایک ہفتہ تک مقیم رہا۔ ہم صرف اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس ملاقات کے بعد نواب بھوپال دوست محمد خاں کے خلاف ایک مشترکہ مہم چلائی گئی کچھ ہی عرصے کے بعد نظام الملک نے مالوہ کے صوبہ کا انتظام سنبھال لیا اور باجی راؤ دکن کو لوٹ گیا۔

یوں لگتا ہے کہ ان دونوں کی گفتگو کا رجحان دوستانہ تھا اور اس کے نتیجہ میں آپس میں کوئی مفاہمت ہوگئی تھی۔ نظام الملک کی جانب سے پیشوا کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے اسباب واضح طور پر موجود تھے۔ ابھی تک اس نے دہلی کا رخ کرنے یا دکن ہی میں رہ جانے کے سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ ان حالات میں اپنے دشمن پیدا کرلینا عقلمندی نہ تھی۔ باجی راؤ کی جانب سے بھی نظام الملک کے ساتھ دوستی قائم کرلینے کے لئے کافی مضبوط وجوہات موجود تھیں۔ نظام الملک آخری شاہی وزیر تھا وہ پوری حکومت میں سب سے زیادہ باثر امیر تھا اور دکن کا تو گویا مالک تھا۔ اس وقت تک اس نے مرہٹوں کو ایسا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔ جو وہ مخالفت کرسکیں اس نے شاہو کے چوتھ اور سردیش مکھی جمع کرنے کے اختیار کو تسلیم کر ہی لیا تھا۔ اس لئے نوجوان پیشوا ایک ایسے باثر شخص کی دوستی کا ضرور متمنی تھا۔

لیکن یہ نظام الملک کی سیاسی فہم و فراست کا ایک اعلیٰ نمونہ تھا کہ پیشوا کی دوستی سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ وہ مواخرالذکر کی مملکت کی توسیع کی روک تھام کے لئے اقدامات سے بھی عاقل نہ تھا۔ مالوہ کی صوبہ داری کا جس کے لئے شہنشاہ کی اجازت بعد میں حاصل کی گئی۔ اصل مقصد یہ تھا کہ مرہٹوں کی قوت کو جنوب ہی میں محدود رکھا جائے اور شمال میں ان کی توسیع پسندی کو روک دیا جائے۔

اس طرح ہم شروع ہی سے نظام الملک کو اس حکمت عملی پر کاربند پاتے ہیں جس کے مطابق وہ زندگی بھر عمل کرتا رہا۔ یعنی دکن میں اپنا اقتدار قائم رکھنا دلی کے لئے ایک راستہ کھلا رکھنا اور بغیر ناقابل تلافی تصادم مول لئے ہوئے مرہٹوں کی طاقت کو محدود رکھنا۔ اس ملاقات کے بعد نظام الملک نے دوبارہ گجرات کا رخ کیا۔ حیدر قلی جسے کسی طرف سے بھی اعانت نہ مل سکی۔ خوف و ہراس سے نڈھال ہوگیا۔ جنون کا بہانہ کرکے وہ بہت قلیل جماعت کے ساتھ دہلی کے لئے روانہ ہوگیا۔ یہ سن کر نظام الملک نے اپنے چچا زاد بھائی حامد خاں کو گجرات میں نائب مقرر کیا اور جھالور سے دہلی کی طرف لوٹ گیا۔ اس طرح گجرات پر بھی نظام الملک کا تصرف ہوگیا۔ (خافی

صفحہ 946 وغیرہ)

نظام الملک کی اصلاحات کا منصوبہ اور دکن کے لئے اس کی روانگی : 3

جولائی 1723ء کو نظام الملک دربار میں واپس آیا۔ اس نے دیکھا کہ کوکی جیو کے زیر اثر رشوت ستانی اور بداعمالی بہت بڑھ گئی تھی درباریوں اور شاہی مقربین نے سیر حاصل جاگیروں پر اپنا قبضہ جمالیا تھا۔ حد یہ ہے کہ خالصہ بھی منصب داری میں تقسیم کیا جاچکا تھا۔ اجارہ داری جاری ہوچکی تھی اس سے ایک طرف تو قیمتوں میں اضافہ ہو رہا تھا اور دوسری طرف اجارہ داری کے نرخ زیادہ ہونے کی وجہ سے کسانوں میں غربت پھیل رہی تھی اور مالگزاری کے وصولیابی میں کمی واقع ہوگئی تھی۔ اوپر سے لے کر نیچے تک تحفوں اور پیش کش کی صورت میں رشوت ستانی کا بازار گرم تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ قدیم امراء بے روزگاری اور افلاس میں وقت گزارتے تھے۔ اور شاہی خزانے میں افواج کو اور منصب داروں کو ادا کرنے کے لئے نقد روپیہ موجود نہ تھا۔ چھوٹے منصب داروں کا تو بہت ہی برا حال تھا۔ ان کے پاس اپنا معیار زندگی برقرار رکھنے اور اپنے ماتحتوں کو قائم رکھنے کے ذرائع موجود نہ تھے اس وجہ سے ان میں سے اکثر نے تجارت شروع کردی تھی۔

نظام حکومت کو بہتر کرنے اور حکومت کے خزانوں کو سیراب کرنے کی غرض سے نظام الملک نے ایک مفصل منصوبہ تیار کرکے شہنشاہ کے سامنے پیش کیا۔ اس کی خاص خاص تجاویز جنہیں وہ دربار میں پہنچنے کے پہلے ہی روز سے شہنشاہ کے سامنے پیش کر رہا تھا۔ حسب ذیل تھیں۔ صرف باصلاحیت اور کارگزار امراء اور سپاہی مقرر کئے جائیں جیسا کہ اورنگ زیب کے عہد میں ہوتا تھا خالصہ زمینوں کی کاشت بند کی جائے۔ جاگیروں کی دوبارہ تقسیم ہو اور خالصہ زمین (جو جاگیروں میں دے دی گئی تھیں) واپس لے لی جائیں۔ رشوت ستانی ختم کی جائے۔ اور اورنگ زیب کے عہد کی طرح جزیہ بھی نافذ کر دیا جائے۔

(خافی خاں صفحہ 947)

یہ تجاویز شہنشاہ کو مطلقاً پسند نہ تھیں اور مقربین کو یہ خدشہ تھا کہ اگر نظام الملک کو ایک بار دربار پر تسلط حاصل ہوگیا تو وہ سب اپنے اقتدار سے محروم ہو جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے شہنشاہ سے عرض کی کہ اب حکومت کے حالات اورنگ زیب کے عہد کے حالات سے بالکل مختلف ہیں اس لئے قدیم قوانین کے نافذ کرنے سے مال گزاری اور انتظامی امور کا طریقہ کار درہم برہم ہو جائے گا۔ انہوں نے شہنشاہ کے دماغ میں نظام الملک کے ارادوں سے متعلق شکوک و شبہات پیدا کرنے شروع کردیئے اور اس کی بلند خواہشات اور اختیارات و اثرات کے لئے اس کی کوششوں کا بار بار تذکرہ کیا اور یہ بھی اس کے دماغ میں بٹھایا کہ اس جیسا کامیاب سپہ سالار شاہی خاندان کے مستقبل کے لئے ایک زبردست خطرہ ہے۔ انہوں نے جزیہ کو دوبارہ شروع کرنے کی تجویز کے خطرات سے آگاہ کیا اور انفرادی اور اجتماعی طور پر شہنشاہ سے یہ کہا کہ جزیہ کا لگانا [illegible] ہے۔ اور نظام الملک کی تجویز کا مقصد محض حکومت میں خلفشار پیدا کرنا اور

حکومت اور اس کے ملازمین کے درمیان ایک عداوت اور مخاصمت پیدا کرتا ہے ہم عصر مصنف وارد افسوس کے ساتھ لکھتا ہے کہ امراء ایمان اور دین کے معاملات میں بہت ست پڑ چکے تھے اور وہ جزیہ کی مخالفت کو ہندوؤں کی تحریک کا نتیجہ بتلاتا ہے مقربین تو اپنے ہی مقاصد کی بناء پر نظام الملک کی تجاویز کی مخالفت کر رہے تھے۔ جزیہ کو دوبارہ نافذ کرنے کی بناء پر اس کے مخالفین کو ہندو امراء اور اہل کاروں کی پشت پناہی بھی حاصل ہوگی اور اس طرح انہوں نے نظام الملک کو سب سے جدا کردیا۔ حد یہ ہے کہ عبدالصمد خاں جو شادی کے رشتہ سے نظام الملک کا قرابت دار تھا وہ بھی جزیہ کے دوبارہ نافذ کرنے کے خلاف تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ نے رسمی طور پر تو نظام الملک کی اصلاحات کے لئے اپنی مرضی ظاہر کردی لیکن درحقیقت اس نے ان کو بالکل مسترد کردیا۔ اصلاحات کی تجویز کو رد ہو جانے سے نظام الملک ایک عجیب دشواری میں پھنس گیا۔ یا تو وہ سید برادران کے نقش قدم پر چل کر ایک فوجی بغاوت کرے، اپنے دشمنوں کا قلع قمع کر دے اور محمد شاہ کو محض ایک کٹھ پتلی بنادے یا کسی دوسرے کو اس کی جگہ شہنشاہ مقرر کرے۔ نظام الملک میں غالباً یہ سب کچھ کرنے کی طاقت تو تھی اور بغاوت کے بعد اس کے لئے سید برادران سے زیادہ اپنی طاقت کو مضبوط کرنے کے مواقع بھی موجود تھے لیکن نظام الملک اس طریقہ کو شاید بے سود اور غیر شریفانہ کہتا تھا۔

امراء نہایت مختلف الطبع لوگ تھے اور ان میں آپس میں زبردست حسد اور جلن موجود تھی اس لئے ان کی اعانت کے بھروسہ پر کوئی بھی خواہ کتنا ہی لائق و فائق کیوں نہ ہو۔ مکمل طور پر بااختیار نہیں ہوسکتا تھا اب ایک ہی راستہ تھا کہ وہ کوئی ایسا خاندان برسراقتدار لائے۔ لیکن موجودہ حالات میں ایسا کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اس کے برعکس دربار میں بے بس بن کر رہنا اس کے مزاج کے خلاف تھا اور اس سے دکن میں نظام الملک کی بنی بنائی بات بگڑ سکتی تھی شاہی مقربین نے شہنشاہ کو باور کرانے میں تساہل نہ برتا کہ نظام الملک کا ایک ہی وقت میں دکن پر اقتدار، گجرات اور مالوہ کی (غیابتی) صوبہ داری کے ساتھ ساتھ وزیر بھی ہونا حکومت کے لئے سخت خطرہ کا سبب ہوسکتا ہے۔ مغل تاریخ میں ایک شخص کے ہاتھ میں اس قدر اختیارات کے مرکوز ہو جانے کی کوئی ایک نظیر بھی تو نہ تھی۔ چنانچہ نظام الملک کو دکن کی گورنری سے برطرف کرنے کے اقدامات شروع ہوگئے۔

نظام الملک دکن کو ہمیشہ اپنے خوابوں کی تعبیر سمجھا تھا اس کی جوانی کا بیشتر حصہ وہیں گزرا تھا اور سیدوں کے قبضہ سے نکالنے کے بعد سے وہ دکن پر اپنی تلوار کے زور پر اپنا حق سمجھتا تھا۔ وہ ایک متزلزل وزارت کے بدلے دکن کے اقتدار کا سودا کرنا نہ چاہتا تھا۔ دکن میں مرہٹوں کی ریشہ دوانیوں کی خبر کی وجہ سے اور اپنے نائب مبارز الملک پر عدم اعتماد کے سبب وہ دکن کی طرف لوٹنا نہایت ضرور سمجھتا تھا دکن سے ہٹانے کے لئے اس نے مبارز الملک کا نام کابل کی صوبہ داری کی خالی آسامی کے لئے تجویز کیا تھا۔ دہلی کا سفر تو گویا محض ایک آزمائشی سفر تھا۔ خود اپنی آنکھوں سے دربار کی روبہ زوال حالت دیکھ کر اور شہنشاہ میں قوت ارادہ کے فقدان

کو محسوس کرکے اس نے اپنا الگ راستہ بنانے کی ٹھان لی کیونکہ دربار کی طرف سے کسی قسم کے نقصان پہنچنے کا خدشہ نہ تھا دربار کی اصلاح اور حکومت کے امور کو سدھارنے کی کوشش کے بار آور نہ ہونے کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ ہی چکا تھا۔

اپنی پیش کردہ تجاویز کے مسترد کئے جانے کے کچھ عرصہ بعد نظام الملک کے گفت و شنید جاری رکھنے کا بہانہ کیا۔ لیکن یہ بالکل واضح تھا کہ اس نے دکن کو لوٹ جانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ دسمبر 1723ء میں راجہ گوجرمل' دیوان خالصہ کے فوت ہو جانے پر جو کہ نظام الملک کی طرف سے شہنشاہ سے گفت و شنید کر رہا تھا۔ مصالحت کی آخری توقع بھی ختم ہوگئی۔ دسمبر 1723ء میں نظام الملک اپنی جاگیر مراد آباد اپنی "تبدیل آب و ہوا" کے لئے پہنچا۔ آگرہ سے اس نے خبر ارسال کی مرہٹوں نے مالوہ اور گجرات پر حملہ کر دیا ہے۔ مالوہ اور گجرات اس کے بیٹے کی صوبہ داری میں تھے۔ چنانچہ اس نے لکھا کہ وہ ان کو پسپا کرنے کی غرض سے ان پر جوابی حملہ کرنے جا رہا تھا۔ جب نظام الملک مالوہ پہنچا تو مرہٹوں نے نربدا کو دوبارہ پار کرلیا تھا۔ اسی وقت اس کے پاس یہ خبر پہنچی کہ دکن میں بارزالملک یعنی اس کے نائب کو گورنر مقرر کرکے نظام الملک کو معزول کردیا گیا تھا۔ اور اب اس کے خلاف کانھوجی اور دوسرے مرہٹہ سرداروں سے کمک مانگی جا رہی تھی۔ شہنشاہ نے بھی شاہو سے مشورے شروع کردیئے تھے۔ اب نظام الملک نے ہر پردہ کو چاک کرکے دکن کا رخ کیا۔

حیدر آباد دکن کی آزاد مملکت : 11 اکتوبر 1724ء کو باجی راؤ کی مدد سے نظام الملک نے اورنگ آباد کے قریب شکر کھیڑا کے مقام پر مبارز الملک کو شکست دی۔ اسی تاریخ سے حیدر آباد کا ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے آغاز ہوتا ہے۔ اور مغل حکومت کی شکست و ریخت کا عمل شروع ہوتا ہے۔

نظام الملک آصف جاہ اول کی شخصیت

اور کردار اور کارنامے

آپ 1671ء میں پیدا ہوئے۔ نام قمرالدین خاں رکھا گیا۔ آپ کے والد اورنگ زیب عالمگیر کے مشیرو مصاحب تھے جبکہ آپ کی والدہ شاہجہان کے وزیراعظم کی بیٹی تھی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد علوم متداولہ کی طرف توجہ کی۔ 19 سال کی عمر میں تمام مروجہ ضروری علوم و فنون میں دسترس حاصل کرلی۔ فارسی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ اور استادانہ مہارت حاصل تھی۔ تخلص شاکر تھا پھر آصف اختیار کیا۔ 1690ء میں اورنگ زیب نے قمرالدین کو چار ہزاری منصب سے نوازا واکن کھیڑا کی تسخیر میں قمرالدین نے بہادری کا مظاہرہ کیا تو عالمگیر نے اس کو پنج ہزاری منصب کے ساتھ ساتھ کرناٹک کی فوجداری بھی عطا کر دی۔ اور زمرد کی انگوٹھی عنایت کی جس پر آپ کا خطاب چین قلیچ خاں کندہ تھا۔ جنگ تخت نشینی کے موقع پر قمرالدین آصف جاہ غیر جانبدار رہا۔ چنانچہ شاہ عالم نے تخت پر بیٹھتے ہی آصف جاہ کو خان دوراں کا خطاب دیا اور اودھ کی صوبیداری اور لکھنؤ کی فوجداری سپرد کی۔ 1719ء میں آصف جاہ کے حاسدوں نے سازباز کرکے اسے دربار سے دور ہٹانے کی کوشش کی۔ اور اس کے نتیجہ میں اسے مالوہ کا گورنر بنا دیا گیا لیکن سید حسین علی (سید برادران میں سے) نے تین ماہ کے اندر اندر اسے آگرہ کا صوبیدار بنوا دیا۔ اور اسی اثناء میں سید برادران نے محمد شاہ پر اپنی گرفت مضبوط کرلی۔ بادشاہ کی آنکھیں کھلیں تو اس نے آصف جاہ کو مدد کے لئے پکارا اور آصف جاہ اپنی فوج لے کر مدد کے لئے بڑھا۔ رتن پور کے نزدیک سید دلاور خاں بخشی اور نظام الملک آصف جاہ کی فوجوں میں جنگ ہوئی جس میں دلاور خاں مارا گیا۔ ایک اور جنگ برار کے مقام پر ہوئی جس میں سید عالم علی خاں بھی مارا گیا جس نے مرہٹوں اور راجپوتوں کی مدد حاصل کر رکھی تھی۔ اس طرح آصف جاہ فاتح رہا۔

دور وزارت : محمد شاہ کی مدد آصف جاہ نے نہایت مشکل حالات میں کی تھی۔ اس لئے محمد شاہ آپ کا قدر دان تھا جب محمد شاہ کا وزیراعظم محمد امین خاں فوت ہوا۔ تو 1721ء میں محمد شاہ نے آصف جاہ کو وزارت کی پیشکش کی۔ اس وقت وہ اورنگ آباد میں تھا۔ چنانچہ وزارت کا چارج لینے جب وہ اپنی فوج کے ساتھ دہلی کو چلا تو راستے میں باغی ریاستوں اور علاقوں کو مغل سلطنت کا باجگزار اور اطاعت گزار بناتا ہوا فروری 1722ء میں دہلی پہنچا اور وزارت کا قلمدان سنبھال لیا۔

آصف جاہ نے مغل حکومت کی وہ شان دیکھی ہوئی تھی جب عالمگیر کا دور تھا چنانچہ اس نے مغلوں کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کے عزم کے ساتھ چند اصلاحات نافذ کیں۔

1۔ خالصہ زمینوں کی منتقلی امراء کو روک دی گئی۔
2۔ پیشکش کی صورت میں بادشاہ کو نذرانے اور رشوت دے کر عہدے حاصل کرنے پر پابندی لگا دی۔
3۔ بعض سابقہ حکمرانوں کا منسوخ کردہ جزیہ دوبارہ نافذ کردیا۔
4۔ یہ حکم دیا گیا کہ افغان حملہ کے خلاف ایرانیوں کی مدد کی جائے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ گویا ہمایوں کے احسان کا بدلہ بذریعہ احسان چکا دیا جائے۔

رد عمل : ان اصلاحات کے خلاف امراء اور غیر مسلم اقوام نے آصف جاہ کے خلاف محاذ بنالیا۔ اور نظام الملک آصف جاہ کو بندر تک پکارا گیا۔ اور آخر یہ سازشی گروہ بیس سالہ بادشاہ کو نظام الملک کے خلاف بدظن کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اور بادشاہ کو یقین دلا دیا کہ اس طرح کے اقدامات کرکے آصف جاہ شہزادہ ابراہیم کو بادشاہ بنانا چاہتا ہے۔ جب نظام الملک نے حالات کو قابو سے باہر ہوتے دیکھا تو بہانہ کرکے دہلی سے کوچ کرکے دکن کی طرف روانہ ہوگیا۔ اور 1764ء میں دکن پہنچ کر وہاں کے گورنر بہادر خاں کو شکست دے دی اور دکن کا حکمران بن بیٹھا۔ اور محمد شاہ اور اس کے حواریوں کی سازشوں کے خلاف ڈٹ گیا۔ اور دکن کی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ لیکن احتیاط یہ کی کہ اپنی بادشاہت کا اعلان نہ کیا اور نہ ہی اپنے نام کے سکے جاری کئے اور نہ خطبہ میں اپنا نام شامل کروایا۔ بلکہ بظاہر بادشاہ کی سرپرستی قبول کرتے ہوئے محدود سی آزاد حکومت کا ڈول ڈالا۔ جب محمد شاہ کو پتہ چلا تو اس نے بھی مجبوراً اس کی اس آزادانہ خود مختاری کو قبول کرلیا۔

ازیں پیشتر 1738ء میں نادر شاہ کے دہلی میں قیام کے وقت دہلی دربار کو آصف جاہ کی ضرورت محسوس ہوئی اور اسے بلایا گیا۔ جب نادر شاہ نے پانی پت کا میدان مار لیا تو نظام الملک نے نادر شاہ کو وہاں سے واپس جانے کے لئے دو کروڑ روپے کے عوض راضی کرلیا لیکن برہان الملک سعادت خاں نے نظام الملک کو نیچا دکھانے کے لئے نادر شاہ کو دہلی پر قبضہ کے لئے اکسایا۔ اس طرح نادر شاہ دہلی پر قابض ہوگیا تو 3 مارچ 1739ء کو نادر شاہ نے دہلی میں قتل عام کا حکم دے دیا۔ اب سعادت خاں اینڈ کمپنی نادر شاہ کے سامنے دم نہ مار سکے اور لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہوتے رہے۔ اب سعادت خاں کو نظام الملک کی دشمنی کا الٹا اثر یاد آیا اور وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہوا لیکن جو تیر کمان سے نکل چکا تھا اس کے اثرات فی الفور ظاہر ہو رہے تھے۔

آخر نظام الملک کی منت سماجت کی گئی اور نظام الملک اپنی دستار گلے میں ڈال کر ننگے سر نادر شاہ کے پاس حاضر ہوا اور قتل عام بند کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ نادر شاہ شاہی خزانہ وغیرہ بری طرح لوٹ کر لے گیا اور نظام الملک نے دکن کو اپنا دارالقرار بنا لیا جہاں 1748ء میں اس نے بطور خود مختار حکمران وفات پائی۔ نظام الملک نے ہر دور میں مغلوں کی ساکھ بحال کرنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن مغل دربار میں گروہ بندیاں جڑ پکڑ چکی تھیں جن کی اصلاح کا

کوئی امکان نہ تھا۔ آخر آصف جاہ نظام الملک نے اپنی دکن کی حکومت قائم کرلی جو قیام پاکستان کے بعد بھارت سرکار کی مکارانہ پالیسی کے تحت بھارت کے قبضہ میں آگئی۔

جاٹوں اور راجپوتوں کے معاملات

(سید برادران کے بعد)

راجپوتانہ اور صوبہ آگرہ کی سرحدوں پر جاٹوں کے اقتدار راجپوت حکمرانوں کی طاقت اور اہمیت میں روز افزوں اضافہ یہ دو امور پچھلے کچھ عرصہ سے نہایت نمایاں صورت اختیار کرگئے تھے۔ ان طاقتوں کے ساتھ سید برادران کے قریبی تعلقات نے اس عمل کو مزید تقویت بخش دی تھی' جس سے جاٹوں اور راجپوتوں میں زبردست اعتماد پیدا ہوگیا تھا۔

سیدوں کے زوال کے بعد ان عناصر کے ساتھ مغل حکومت کے تعلقات کی نوعیت دوبارہ درباری حلقوں میں ایک خاص موضوع بن گئی تھی چو رامن جاٹ نے سید برادران کا اس وقت ساتھ چھوڑ دیا تھا جب ان کی قسمت ان سے برگشتہ ہوگئی تھی اور وہ شاہی افواج سے آکر مل گیا تھا۔ لیکن عبداللہ خان کے خلاف حسن پور کی جنگ کے موقع پر اس نے پھر ساتھ چھوڑ دیا اور شاہی افواج کے عقبی دستہ کے ساز و سامان کو لوٹ لیا۔ اس نے اپنی بے وفائی کے ان طریقوں کو اس کے بعد بھی جاری رکھا اور بندیلوں کی مدد کی جب وہ آلہ آباد کے صوبہ دار محمد خاں بنگش کے نائب دلبر خاں سے دست و گریباں تھے۔ 1721ء میں چورامن نے سعادت خاں کی افواج کو تاراج کیا جبکہ وہ جودھپور کے اجیت سنگھ کی سرزنش کے لئے جا رہے تھے۔ معاملات اس وقت اور سنگین ہوگئے جب 1722ء میں چورامن کے بیٹے محکم سنگھ نے آگرہ کے گورنر سعادت خاں کے نائب نیل کنٹھ ناگر کو شکست دی اور اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا (سعادت خاں اس وقت آگرہ کا صوبہ دار تھا) سعادت خاں کا جاٹوں پر کوئی خوف و ہراس قائم نہ ہوسکا۔ چنانچہ خاں دوروں کے مشورے پر 1722ء میں اجیت سنگھ کو ان کے خلاف مہم سر کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔

اگرچہ جے سنگھ جاٹوں کے فتنہ کو دبانے کے لئے تیار تھا۔ لیکن اپنی پچھلی شکستوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس نے اس وقت تک اقدام کرنے سے انکار کردیا جب تک اسے آگرہ کا صوبہ دار مقرر نہ کر دیا جائے۔ یکم ستمبر 1722 کو اس کی خواہش پوری کر دی گئی اور اس کے فوراً بعد ہی جے سنگھ چودہ پندرہ ہزار سوار لے کر دہلی سے روانہ ہوگیا۔ اس وقت تک چورامن مرچکا تھا اور اس کے بیٹے محکم سنگھ نے جاٹوں کی رہبری کا کام سنبھال لیا تھا۔

جے سنگھ نے جاٹوں کے گڑھ تھن کا محاصرہ کرلیا۔ اور باقاعدہ جنگلات کو کاٹتا ہوا اور محاصرہ کو سخت سے سخت تر کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس میں چند ہفتے گزر گئے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ یہ محاصرہ کب تک چلتا۔ لیکن جاٹوں کے درمیان اختلافات شروع ہوگئے۔ محکم سنگھ کا چچا زاد

بھائی بدن سنگھ اجیت سنگھ کی طرف آملا اور اس نے جاٹوں کے دفاع کے کمزور مقامات اس کو بتا دیئے۔ اب محکم سنگھ کی صورتحال خطرناک ہوگئی۔ ایک رات اس نے مکانات کو آگ لگا دی۔ بارود کو نذر آتش کردیا۔ جس قدر بھی نقد اور جواہرات جمع کرسکتا تھا وہ لے کر اجیت سنگھ کے پاس بھاگ کر پہنچ گیا۔ اجیت سنگھ نے اس کو پناہ دی۔ اب جے سنگھ کامیابی کے ساتھ قلعہ میں داخل ہوا اور اس کو مسمار کر دیا اور اہانت کے طور پر زمین پر گدھوں کے ہل چلوا دے۔

اس فتح کے لئے جے سنگھ کو راجائے راجیشور کا خطاب دیا گیا۔ جاٹوں کے ساتھ صلح کی کیا شرائط قرار پائیں۔ اس کا تذکرہ کسی معاصر کے یہاں نہیں ملتا۔ بدن سنگھ جاٹوں کا سربراہ مقرر ہوا اور چورامن کی زمینداری اس کے قبضہ میں آگئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ اہم قلعوں کو تو مسمار کر دیا گیا تھا لیکن چورامن خاندان کو اس پورے علاقے سے محروم نہیں کیا گیا تھا جو رفتہ رفتہ انہوں نے حاصل کئے تھے۔ اس کے بعد سے بدن سنگھ اپنے آپ کو عاجزی سے جے سنگھ کا باج گزار لکھتا تھا۔ لیکن وہ ایک اچھا منتظم تھا۔ اس کی محتاط سرپرستی میں بھرت پور کا خاندان اگلے بیس سال میں خاموشی اور استقلال کے ساتھ قوت حاصل کرتا گیا۔ اس طرح جاٹوں کی قوت کو جو صدمہ پہنچا تھا وہ صرف ظاہری تھا اور اس کی حقیقت کچھ نہ تھی۔

سیدوں کے زوال سے بھی راجپوتانہ کے سیاسی حالات میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوگئیں۔ سیدوں کے اقتدار کے دوران اجیت سنگھ راٹھور راجپوت راجاؤں میں سب سے اہم راجہ ہوگیا۔ کیونکہ وہ گجرات اور اجمیر دونوں کا صوبہ دار تھا۔ اجیت سنگھ ہمیشہ ایک اوسط درجہ کا منتظم تھا اور اس کی پچھلی صوبہ داری پر راجہ اور راجہ کے اہل کاروں کے خلاف ظلم و تشدد کی بہت سی شکایات موصول ہوئیں۔ ان شکایات کے پیش نظر 1717ء میں فرخ سیر نے بدانتظامی کے الزام پر راجہ کو اس کے منصب سے معزول کر دیا تھا لیکن جب اقتدار سیدوں کے ہاتھ آیا تو انہوں نے راجہ کو اس کے پرانے منصب پر بحال کر دیا اور اس کو اجمیر کا صوبہ دار مقرر کردیا اجیت سنگھ نے دوبارہ گجرات کے معاملات کو اہل کاروں پر چھوڑ دیا اور عبداللہ خاں کو متعدد اور پر زور سفارشوں کے باوجود جودھ پور کو چھوڑ کر' خود صوبہ کی ذمہ داری سنبھالنے سے انکار کردیا۔

سیدوں کے زوال کے بعد شہنشاہ نے حیدر قلی خاں کو گجرات کا صوبہ دار مقرر کردیا۔ اور خان دوران کے چھوٹے بھائی مظفر علی خاں کو اجمیر کا صوبہ دار مقرر کیا۔

(خافی خاں صفحہ 938' سیر المتاخرین صفحہ 453)

جب اجیت سنگھ نے یہ سنا' وہ تیس ہزار افواج لے کر جودھ پور سے روانہ ہوکر اجمیر پر قابض ہوگیا۔ اس نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ ان کے مذہبی معاملات میں کوئی دخل اندازی نہ کی جائے گی۔ اس نے شہر کے تمام بااثر لوگوں کو جمع کیا اور جہان شاہی یعنی شہنشاہ کے والد کا ایک نشان دکھلایا جس کی رو سے اس کو اجمیر اور گجرات کی صوبہ داری تاحین حیات بخش دی گئی تھی۔ اس نے شہنشاہ سے بھی درخواست کی کہ اجمیر یا گجرات کا صوبہ اسی کے پاس چھوڑ دیا

جائے۔

(تاریخ مظفری صفحہ 317)

دربار میں صورت حال نہایت ہی زیر و زبر تھی۔ نامزد صوبہ دار مظفر علی خاں دہلی سے چند منزلیں بھی طے نہ کرنے پایا تھا۔ وہ ایک نیا امیر تھا اور اس کے پاس فوج کو جمع کرلینے کے ذرائع موجود نہ تھے شاہی خزانہ خالی تھا۔ پچھلی خانہ جنگی ہر چند اختتام کو پہنچ گئی تھی۔ فوج کے مطالبات واجب الادا تھے۔ اور سپاہ دل برداشتہ تھی۔ دربار میں گروہوں اور جماعتوں کی کثرت تھی۔ ان تمام حالات کے پیش نظر خان دوران' اجیت سنگھ سے مصالحت کرلینے کے حق میں تھا۔ اور اس کی یہ دلیل تھی کہ اگر وہ میدان جنگ میں ہار بھی گیا تو وہ اپنے وطن مالوف کی پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں جا چھپے گا جہاں کوئی بھی اس کا تعاقب نہ کرسکے گا۔ بالفاظ دیگر وہ اس صورت حال سے خائف تھا جس میں 1679ء میں اورنگ زیب پھنس گیا تھا۔ ایک دوسرا گروہ جس کا سربراہ حیدر قلی اور کچھ امراء تھے۔ اجیت سنگھ کو اجمیر کی صوبہ داری دینے کے خلاف تھا ان کی دلیل یہ تھی کہ اجمیر دہلی سے قریب کا صوبہ تھا۔ اور اس میں مسلمانوں کے متعدد متبرک مقامات تھے۔ اس لئے اس پر ہندو اقتدار مناسب نہ تھا۔

ابھی دربار میں اس معاملہ پر بحث ہو رہی تھی کہ مظفر علی خاں کے فوجی تنخواہیں نہ ملنے کے سبب باغی ہوگئے اور ان کے ہاتھ جو آیا تھا اس پر قابض ہونے لگے مجبور ہوکر مظفر علی نے اجمیر میں پناہ لے لی تھی۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر ابھے سنگھ کی سربراہی میں راٹھوروں نے شاہی سرحدوں پر بہت لوٹ مار مچائی۔ نرنول میں زمیندار اور مقامی گروہ اس قدر زور آور ہوگئے تھے کہ انہوں نے بغاوت کر دی تھی اور شہر میں لوٹ مار مچا رکھی تھی۔ اس طرح دربار کی کمزوری سے ہر طرف صورت حال ابتر ہوچلی تھی۔

(خافی خاں صفحہ 938)

اب اجمیر کی صوبہ داری ایک کشکول بن گئی تھی۔ یکے بعد دیگرے خاں دوراں حیدر قلی' اور مرحوم وزیر کے فرزند قمرالدین خاں نے اس آسامی کو قبول کیا لیکن صوبہ کے انتظام کی قیمت اور دشواریوں سے سب ہی ہراساں ہوگئے۔ بالآخر نصرت خاں بارہ کو اس خالی صوبہ داری پر مقرر کیا گیا اور اس نے معافی تلافی کے خطوط لکھے۔ اس کے اس عمل سے اس کی عزت میں کچھ فرق نہیں آیا کیونکہ اس کے دوست خان دوراں کی سفارش سے اس کو معاف کر دیا گیا اور اسے اجمیر کی صوبہ داری پر قائم رہنے کی اجازت مل گئی۔ (مارچ 1722ء) خان دوراں کی نیت کے بارے میں صرف اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے۔ اس نے شاید نظام الملک کو اجیت سنگھ کی بغاوت کے فرو کرنے کی نیک نامی سے محروم رکھنا چاہا جیسا کہ چند مورخین کا خیال ہے کہ یا اس نے ایسے گروہ کو وجود میں لانے کا سوچا ہے۔ جس کے ہندی نژاد مسلمان اور راجپوت بعض امراء کے تنگ نظرانہ اور علیحدہ روی کے رویہ کا مقابلہ کرسکیں۔

چونکہ دربار کی ایک طاقتور جماعت اجیت سنگھ کو شبہ کی نظر سے دیکھتی تھی یہ طے کیا

گیا کہ نصر خاں جو سانبھر کا فوجدار اور گجرات کا دیوان تھا' اسی کو اجمیر کا دیوان بھی مقرر کر دیا جائے اس کو زبردست اختیار دیئے گئے تاکہ وہ راجہ کی دست درازیوں کو روک سکے۔ اجیت سنگھ کو نصر خاں سے ازلی نفرت تھی اس لئے وہ اس اقدام سے نہایت برا کیکھتہ ہوا اور اس وقت جبکہ وہ راجپوتوں کے درمیان ان کو دوست جان کو خیمہ انگیز ہوا 6 جنوری 1723ء کو فریب دے کر قتل کردیا۔ جب محمد شاہ کو یہ اطلاع ملی تو وہ بہت غضبناک ہوا اور شرف الدولہ کی کمان میں اس نے ایک فوج مقرر کی کہ وہ پرفریب اجیت سنگھ کو اس کے چوہے کے بل سے بھی نکال کر لائے۔

جے سنگھ گردھر بہادر اور بہت سے دوسرے سرداروں کو جنہوں نے جاٹ مہم کو مکمل کیا تھا ان کی مدد کرنے کو کہا گیا۔ اسی اثناء میں حیدر قلی خاں جو نظام الملک کی آمد پر گجرات سے بھاگ آیا تھا۔ دہلی کے نزدیک پہنچا۔ قمرالدین کے مشورہ پر اس کو معاف کر دیا گیا اور اسے اجمیر کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ حیدر قلی بڑی پامردی سے روانہ ہوا وہ سانبھر کے راستہ سے جودھ پور کی طرف بڑھا۔ 8 جون 1723ء کو وہ اجمیر پہنچا نئے صوبہ دار نے گڑھ پاٹلی کا محاصرہ کرلیا۔ ڈیڑھ ماہ کے محاصرے کے بعد قلعہ والوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

اب اجیت سنگھ نے صلح کر لینے ہی کو مصلحت جانا۔ اس نے شاہی سپہ سالار کے پاس ابھے سنگھ کو متعدد ہاتھی اور تحفے تحائف لے کر بھیجا۔ دربار میں خان دوراں راجپوتوں سے دوستی کا ہاتھ بڑھائے رکھنے کو تیار رہتا ہی تھا۔ چنانچہ اجیت سنگھ کو معاف کر دیا گیا اور اس کو اس کے منصب پر بحال کردیا گیا۔ انفرادی طور پر بذات خود دربار میں حاضر ہونے سے اس کی معذرت کو بھی قبول کرلیا گیا۔ اجیت سنگھ کا لڑکا ابھے سنگھ اپنے باپ کی جگہ دربار میں حاضر ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد 7 جنوری 1724ء کو جودھ پور میں اپنے کسی بیٹے کے ہاتھوں یا زہر دیئے جانے سے اجیت سنگھ کے انتقال کی خبر پہنچی۔ اب خان دوراں نے ابھے سنگھ کو راجائے راجیشور کا خطاب اور 7 ہزاری منصب دلوا دیا اور اس کو اپنے باپ کی گدی پر قابض ہونے کے لئے جودھ پور جانے کی اجازت مل گئی۔

(تاریخ مظفری صفحہ 337)

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سیدوں کے زوال سے جودھ پور کے خاندان کو وہ اہمیت حاصل نہیں رہی تھی جو ان کے زمانے میں تھی۔ لیکن اس سے راجپوتوں کی طاقت اور ان کی اہمیت میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ جے سنگھ کو پہلے آگرہ کا صوبہ دار مقرر کیا گیا اور اس کے بعد مالوہ کا۔ وہ بخشی خاص خان دوراں کا بہت قریبی دوست تھا۔ اور مغل دربار میں دس سال سے زیادہ عرصہ تک اس کا بہت زبردست اثر رہا۔ خان دوراں نے ابھے سنگھ کو بھی اپنی طرف مائل کرنا چاہا کیونکہ ابھے سنگھ راجپوتانہ کا بڑا مقتدر آدمی تھا۔ اس طرح مغل دربار میں راجپوت ایک اہم فرض ادا کرتے رہے۔

دربار سے نظام الملک کی روانگی کا وقت مغل دور حکومت میں ایک دور کے ختم ہونے کی حیثیت رکھتا ہے اس عرصہ میں متعدد حوصلہ مند امراء نے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لے کر

حکومت کو پارہ پارہ ہونے سے بچایا اور انتظامیہ کے محکموں میں انہوں نے بہت سی اصلاحات بھی کیں۔ نظام الملک کی علیحدگی نے ثابت کردیا۔ کہ آئندہ سے حوصلہ مند اور باا ثر امراء اپنے اثرات کو اپنے لئے علیحدہ علاقے حاصل کرنے پر صرف کریں گے۔

بظاہر اس سے قبل کا زمانہ وزیروں کے اپنے اثرات کو مضبوط و منضبط کرنے اس عمل کے راستہ میں حائل ہونے والے باا ثر افراد اور امراء کی جماعتوں اور حاکم اعلیٰ یعنی بادشاہ سے تصادم مول لینے سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اس کشمکش کی تہہ میں ایک اور کشمکش تھی۔ ایک کشمکش ان لوگوں کے درمیان جو اکبر کی وسیع النظر اور لادین قومی اتحاد کی حکمت عملی کا احیاء اور اس کی ترقی چاہتے تھے اور دوسرے وہ لوگ جو اورنگ زیب کے نام سے وابستہ علیحدگی اور مذہبی تفریق کی پالیسی کو اپنانا چاہتے تھے۔

ذوالفقار خاں اور سید برادران نے ہندو جذبات کو مطمئن کرکے اپنا استحکام و اقتدار چاہا اور اس کے لئے انہوں نے راجپوتوں اور مرہٹوں کو خصوصی طور پر اپنی طرف ملانا چاہا۔ یہ فرض کرلینا صحیح نہیں ہوگا کہ یہ امراء ہمیشہ خود غرضی ہی سے کام لیتے تھے یا یہ کہ لوگ جان بوجھ کر حکومت کے مفاد کے خلاف اپنی خود غرضی کی بناء پر ایک خاص قسم کی پالیسی کو اپناتے تھے۔ ان کو اس ایک سمت میں لے جانے والی طاقت خود غرضی کے ساتھ ساتھ اپنے اصولوں پر یقین بھی تھا کہ وہ صحیح راستہ پر عمل پیرا تھے۔ ڈاکٹر ستیش چندر کا کہنا ہے کہ سید برادران سے اپنا تصادم میں نظام الملک اور محمد امین خاں نے عالمگیری امراء کو مذہب و ملت کے جذبات کا واسطہ دے کر اپنی طرف کھینچنا چاہا۔ حکومت کی باگ دوڑ ہاتھ میں آجانے پر انہیں اسی سبب سے سید برادران کی بہت سی وسیع النظری اور حیلے جوئی کی پالیسیوں کے خلاف عمل کرنا پڑا چنانچہ جزیہ کو دوبارہ نافذ کرنے کی کوشش کی گئی اور اجیت سنگھ کی سرکوبی کے لئے مہم بھیجی گئی اس کا مقصد کچھ یہ بھی تھا کہ راجپوتوں کو ان کے مناسب مقام پر ہی ٹھہرے رہنے کا اشارہ دیا جائے۔ لیکن یہ محدود مقاصد بھی حاصل نہ ہوسکے۔ کیونکہ وہ جماعتیں جو راجپوتوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنے کو اور شرع کے احکامات نافذ کرنے کو کہتی تھیں اب کمزور پڑ چکی تھیں حتی کہ عبدالصمد خاں تورانی جماعت کے سربراہ نے بھی نظام الملک کی طرف سے جزیہ لگانے کی تجویز کی مخالفت کی۔

باب 8

مرہٹوں کی شمالی ہند کی طرف پیش قدمی

اٹھارہویں صدی کی ابتدائی تین دہائیوں میں راجپوتوں اور مرہٹوں کے اندرونی و بیرونی حالات میں اہم تبدیلیاں ہوئیں اس زمانے میں راجپوت و مرہٹہ دونوں ہی طاقتوں کی ترقی ہوئی اور مغلوں کے ساتھ ان کے تعلقات میں کافی تبدیلی آئی۔ ساتھ ہی دونوں میں اندرونی کشمکش رہی جس کا اثر اس دور کی سیاست پر پڑا۔ دونوں کی اندرونی تنظیم بھی تبدیلی آئی۔

بہادر شاہ کے انتقال کے بعد جہاندار شاہ و فرخ سیر کے ذریعے راجپوت راجاؤں کو دی گئی مراعات اعلیٰ عہدوں اور منصبوں وغیرہ کا ہم تذکرہ کرچکے ہیں کہ ان رعایتوں کی وجہ سے اورنگ زیب کے زمانے چلی آ رہی راجپوتوں کی مسلح جدوجہد اور مغلوں کی طرف سے بے چینی عام طور سے ختم ہو جاتی ہے۔ نئے دور میں راجپوت راجاؤں کے مطالبات کی شکل پہلے سے مختلف ہو جاتی ہے۔ اب راجپوت راجاؤں کی اپنی اپنی اعلیٰ خواہشات زیادہ اہم ہو جاتی ہیں۔ ان کا اثر ایک جانب ان کے اندرونی مسائل پر پڑتا ہے اور دوسری جانب مغلوں اور مرہٹوں کے ساتھ ان کے تعلقات پر پڑتا ہے۔ عزت و احترام ذرائع اور جنگی طاقت سبھی کے نقطہ نظر سے میواڑ ریاست راجپوتانہ میں سب سے اعلیٰ سمجھی جاتی تھی۔

1710ء میں مہارانہ امر سنگھ کی موت کے بعد پور منڈل وغیرہ کو مہارانہ سے لے کر بنارس خاں میواتی اور اندر سنگھ کو دینے کی ناکام کوشش کی گئی مہارانا کے ساتھ جنگ میں بنارس خاں کا انتقال ہونے سے ناراض ہوکر بہادر شاہ نے سنگرام سنگھ ثانی کو ٹیکہ نہیں دیا۔ فرخ سیر کے تخت نشین ہونے پر سیدوں کے کہنے سے مہارانا کو 7000/7000 کا منصب اور آٹھ کروڑ دام انعام میں عطا کیے گئے اسی وقت پور' منڈل وغیرہ پھر سے اسے جاگیر میں دے دیئے گئے اور مہارانا کے ڈونگر پور بانسواڑہ وغیرہ سے پیش کش وصول کرنے کے حق کو بھی منظور کرلیا گیا۔

اس طرح مغلوں کے لئے مہارانا کے دل میں جو بے چینی تھی اس کی خاص وجوہات دور ہوگئیں لیکن ساتھ ہی ساتھ مہارانا کی اولوالعزمی بھی بڑھی۔ پڑوسی ریاستوں پر میواڑ کا تسلط قائم کرنے کی خواہش میواڑ کے راجاؤں میں بہت پرانی تھی۔ مالوہ کے کئی راج گھرانے بھی سسودیہ خاندان کے تھے۔ مالوہ کے شمال مغربی حصے میں کوٹہ اور دیولیا (پرتاپ گڈھ) کی ریاست کے درمیان قائم رامپورہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ جس کے اوپر سسودیوں کی چند راوت کھانپ کی حکومت تھی۔ یہ ریاست مالوہ و میواڑ کے درمیان ایک کڑی یا ڈھال کی شکل میں تھی۔ اکبر سے پہلے رامپور میواڑ ریاست کا حصہ تھا۔ لیکن اکبر نے وہاں کے حاکم کو خودمختار بنا دیا تھا۔ اورنگ زیب کے دور حکومت میں رامپورہ کے گوپال سنگھ اور اس کے بیٹے رتن سنگھ کے جھگڑے کی وجہ سے رتن سنگھ مسلمان بن گیا تھا اور اسلام خاں کے نام سے رامپورہ اسے دے دیا گیا۔ گوپال سنگھ نے

کوٹہ کے راجا رائے سنگھ ہاڑہ کے بیٹے بھیم سنگھ کی مدد سے رامپورہ پر اپنا قبضہ جمانے کی ناکام کوشش کی اس کے بعد گوپال سنگھ جگہ جگہ بھٹکتا رہا اور آخر میں اس نے مہاراجہ کی پناہ لی۔ 1708ء کے معاہدے کی رو سے اجیت سنگھ، جے سنگھ اور مہارانا نے گوپال سنگھ کو رامپور کی گدی پر بیٹھانے کا فیصلہ کیا اس کے مطابق مہارانا نے گوپال سنگھ کے ہمراہ رامپورہ پر ایک فوج بھیجی لیکن گوپال سنگھ پھر ناکام رہا۔

1708ء میں اودے پور میں تینوں مخصوص راجپوت راجاؤں کے معاہدے کا راجستھان کی تاریخ میں ایک خاص مقام ہے لیکن اس اہمیت کا صحیح اندازہ مورخین نے نہیں کیا۔ حقیقت میں اس معاہدے کے دو پہلو تھے۔ ایک پہلو تھا راجاؤں کو مل کر اپنی اپنی ریاستوں کو مغلوں کے تسلط سے آزادی دلانا اور اپنی ریاست پر اپنا قبضہ جمانا۔ دوسرا پہلو راجستھان کی اندرونی سیاست سے متعلق تھا۔

اپنی بیٹی چند کنور بائی کی شادی جے سنگھ کے ساتھ کرکے مہاراجہ اس کے ساتھ خصوصی تعلق قائم کرنا چاہتے تھے۔ جے سنگھ کے انتقال کے بعد اس شادی کا نتیجہ جے پور ریاست کے لئے خطرناک ثابت ہوا تو بھی اس معاہدے کا یہ مقصد نہیں تھا بلکہ رانا امر سنگھ کو غالباً راجستھان میں اپنی حیثیت کو مضبوط کرنے کے لئے اور اپنی دوسری اہم خواہشات کو پوری کرنے کے لئے کسی دوست کی ضرورت تھی۔ کئی وجوہات کی بنا پر وہ اجیت سنگھ کو اپنا دوست نہیں بنا سکتے تھے۔ میواڑ اور ماڑ وار ریاستوں میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے اور حسد کا جذبہ روایتی تھا۔ خاص طور سے دونوں ریاستیں گوڑ وار کے پرگنے پر اپنا قبضہ جمانا چاہتی تھیں۔ فوجی و مالی نقطہ نظر سے یہ پرگنہ دونوں کے لئے اہم تھا جسونت سنگھ کے دور میں یہ پرگنہ اس کی جاگیر میں تھا۔ جسونت سنگھ کی موت کے بعد یہ پرگنہ خالصہ ہوگیا۔ حالانکہ رانا راج سنگھ نے اجیت سنگھ کا پورا ساتھ دیا۔ خفیہ طریقہ سے درگا داس نے بہادر شاہ کے ساتھ گوڑ وار کا پرگنہ اجیت سنگھ کو دینے کی بات شروع کردی اس سے گوڑ وار کے بارے میں کشمکش پھر شروع ہوگئی۔ ساتھ ہی ساتھ ان دونوں ریاستوں کی دشمنی بڑھنے کی وجہ خود درگا داس بن گیا۔ اجیت سنگھ کے ساتھ جھگڑے میں درگاداس کو مہارانا کی پشت پناہی حاصل تھی۔ 1708ء کو راجپوت جنگ میں درگاداس نے سارے کام اجیت سنگھ کے حکم سے نہیں رانا کی ایماء سے کئے درگا داس اور رانا کے حاصل ہونے والے خط و کتابت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔

رفتہ رفتہ جے سنگھ اور اجیت سنگھ میں بھی کشیدگی بڑھتی گئی اور جے سنگھ اور رانا کی دوستی مضبوط ہوتی گئی۔ 1713ء میں مار واڑ کی جنگ کے وقت جے سنگھ نے اجیت سنگھ کے خلاف حسین علی کا ساتھ دیا۔ رانا نے بھی ایک فوج بھیج کر حسین علی کی ہی حمایت کی۔ اس طرح اجیت سنگھ اکیلا رہ گیا۔ آخر فرخ سیر کے دور حکومت میں رامپور پر بھی رانا سنگرام سنگھ کا تسلط قائم ہوگیا۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ 1712ء میں رتن سنگھ مالوہ کے صوبہ دار امانت خاں کے ساتھ جنگ کرتا ہوا مارا گیا۔ گوپال سنگھ نے مہاراجہ کی مدد سے رامپور پر اپنا قبضہ جمالیا لیکن

مہارانا نے گوپال سنگھ کو ریاست کا ایک چھوٹا حصہ ہی دیا اور زیادہ تر حصہ میواڑ ریاست میں ملالیا۔ راٹھور درگاداس جو کچھ وقت قبل اجیت سنگھ کو چھوڑ کر مہارانہ کی خدمت میں چلا گیا تھا۔ رامپورہ کا حاکم بنا دیا گیا۔ 1717ء میں سید برادران کے توسل سے مہارانا نے فرخ سیر سے رامپورہ کی زمینداری اپنے نام لکھالی۔ کچھ کشمکش کے بعد گوپال سنگھ نے رانا کا دست نگر ہونا قبول کرلیا۔ اور اس کے بدلے رانا نے اسے رامپورہ کا تقریباً نصف حصہ جاگیر میں دے دیا۔ لیکن ساتھ ہی گوپال سنگھ کو میواڑ ریاست کی خدمت گزاری میں یہ وعدہ کرنا پڑا کہ وہ مہارا کا حکم مانے گا اور دوسرے ٹھاکروں کی طرح ان کے دربار میں تہواروں وغیرہ پر حاضر ہوگا۔

اس طرح میواڑ ریاست کی طاقت اور حدود دونوں میں ترقی ہوئی جے سنگھ کی دوستی کی وجہ سے ہی رفتہ رفتہ رانا سنگرام سنگھ نے سید برادران سے منہ موڑ لیا۔ سید برادران کے زوال کے بعد رانا اور جے سنگھ کی دوستی اور بھی مضبوط ہوگئی۔ 26-1725ء میں جے سنگھ کے اشارے سے ایڈر اور سروہی پر بھی مہارانا کا قبضہ ہوگیا۔ دونوں پرگنوں پر پہلے بھی کسی زمانے میں میواڑ کا تسلط تھا لیکن اکبر کے دور حکومت سے قبل یہ پر گنے میواڑ سے الگ ہوگئے تھے اس طرح رانا سانگا کے بعد سنگرام سنگھ ثانی کے دور حکومت میں میواڑ ریاست کا عروج انتہا کو پہنچ گیا۔

رانا اور جے سنگھ کی دوستی کا اثر راجستھان کی بیرونی و اندرونی سیاست پر پڑا۔ مغل دربار کی جانب سے میر بخشی خاں دوراں نے ان دونوں راجاؤں کے ساتھ خصوصی دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی۔ راجپوتوں کی جانب بھی ان دونوں راجاؤں کی پالیسی میں بڑا تال میل رہا۔ لیکن ان راجاؤں کی دوستی کے لئے مصیبت تب آن پڑی جب 1726ء میں جے سنگھ کا رانا کی بٹی چندر کنور سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ اس سے قبل دوسری رانیوں سے جے سنگھ کے دو بیٹے پیدا ہوچکے تھے۔ 1709ء کے معاہدے کے مطابق رانا اس بات کے لئے بضد ہو سکتا تھا کہ گدی کا وارث رانا کے نواسے مادھو سنگھ کو بنایا جائے۔ ممکنہ خانہ جنگی کے ٹالنے کے لئے جے سنگھ نے رانا سے یہ درخواست کی کہ وہ 1709ء کی صلح پر ضد نہ کریں اور رامپورہ کی ریاست مادھو سنگھ کو دے دیں یہ دونوں تجاویز مہارانا کے لئے قبول کرنا آسان نہیں تھا لیکن جے سنگھ کی دوستی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور راجاستھان میں امن قائم رکھنے کے مقصد سے آخر 1722ء میں سنگرام سنگھ نے ان تجاویز کو قبول کرلیا مادھو سنگھ کو رامپورہ کی ریاست دے کر اس کا رانا کے سردار کی حیثیت سے اعلان کر دیا گیا اور جے پور کی گدی پر جے سنگھ کے بڑے بیٹے ایشوری سنگھ کا حق تسلیم کرلیا گیا۔ مہارانا کے اس دور اندیشانہ فیصلے کا یہ اثر ہوا کہ بنیادی طور سے 1742ء تک راجستھان میں مداخلت کرنے کا بہت کم موقعہ ملا مادھو سنگھ کے بارے میں پالیسی بدلنے کی ذمہ داری خاص طور سے سنگرام سنگھ کے وارث رانا جگت سنگھ ثانی پر ہے اور کسی حد تک ایشوری سنگھ پر۔

میواڑ ریاست کی طرح اس زمانے میں امیر ریاست کی سرحدوں اور طاقت میں بھی

بہت ترقی ہوئی۔ کچھواہا راجاؤں کے پاس ایک یا دو پرگنوں سے زیادہ اپنی ریاست میں کبھی نہیں رہے۔ کچھواہا راجاؤں کو شاہی منصبوں کی بنیاد پر راجستھان میں یا اس کے باہر بڑی بڑی جاگیریں ملا کرتی تھیں۔ جے سنگھ نے اپنی ریاست کی سرحدوں کو بڑھانے کے لئے امیر کے پاس کے بہت سے پرگنوں کو بادشاہ سے اجارہ استمرار پر لے لیا رفتہ رفتہ یہ سب پرگنے جے پور ریاست کے حصے بن گئے۔ اس طرح پرگنے امرسر، ملارنا، لالسور وغیرہ جو اس زمانے میں اجارہ استمرار میں لیے گئے بعد میں جے پور ریاست کے حصے بن گئے۔

اگرچہ اپنی سرحد پر جاٹوں کی قوت کا بڑھنا امیر کے راجاؤں کو پسند نہیں تھا ساتھ ہی آگرہ و متھرا کے قریبی علاقوں پر وہ اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے تھے لیکن 1717ء میں سید عبداللہ خاں کی خفیہ مخالفت کی وجہ سے جے سنگھ چوڑا من جاٹ کو ہرانے میں ناکام رہا تھا۔ سید برادران اور بادشاہ محمد شاہ کی کشمکش کے وقت چوڑا من نے دونوں جماعتوں کو لوٹا تھا اس نے بہت سے شاہی علاقے دبا لیے تھے 1721ء میں اس کے بیٹے محکم سنگھ نے آگرے کے نائب صوبے دار نیل کنٹھ ناگر کو جنگ میں مار ڈالا تھا اس لئے اپریل 1722ء میں خان دوراں کی گزارش پر جاٹوں کے خلاف مہم کی قیادت جے سنگھ کو سونپی گئی۔ لڑائی میں کوئی رکاوٹ نہ پڑے اس مقصد کے لیے جے سنگھ نے آگرہ صوبے کی صوبے داری کا مطالبہ کیا۔ ستمبر 1722ء میں جے سنگھ کو آگرے کا صوبے دار مقرر کیا گیا۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد ہی جے سنگھ نے جاٹوں کے خلاف مہم کے لئے کوچ کیا۔

جے سنگھ نے راجاگر دھر بہادر ناگر، اور چھاکے راجا ...راؤ اجیت سنگھ، گنج سنگھ نروری اور مظفر خان کے ساتھ سولہ ہزار سواروں کو ہمراہ لے کر کوچ کرکے تھون کے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ اپنے پچھلے تجربے سے فائدہ اٹھا کر جے سنگھ نے تھون کے آس پاس کے جنگلوں کو کٹوا ڈالا تاکہ جاٹوں کو ان میں چھپنے کا موقعہ نہ ملے جے سنگھ کی مہم سے قبل ہی چوڑا من جاٹ کا انتقال ہوچکا تھا اور اس کا بیٹا محکم سنگھ اس وقت جاٹوں کی قیادت کر رہا تھا۔ خاندانی جھگڑے کی بناء پر اس کا چچا زاد بھائی بدن سنگھ اس سے پہلے مغلوں سے جاکر مل گیا تھا۔ وہ تھون قلعے کی سبھی کمزوریوں سے واقف تھا۔ اسی کے اشارے پر جے سنگھ تقریباً ایک ماہ کی جدوجہد کے بعد ہی تھون جیسے طاقتور قلعے کو فتح کرنے میں کامیاب ہوا۔ اپنی شکست کو قریب دیکھ کر ایک رات محکم سنگھ نے اپنی بارود میں آگ لگا دی اور اپنے ہیرے جواہرات وغیرہ کے ساتھ چپ چاپ بھاگ گیا۔ 15 نومبر کے جے سنگھ قلعے میں داخل ہوا جاٹوں کی طاقت کم کرنے کے لئے اس نے تھون کے قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور زمین پر گدھوں سے ہل چلوا دیا۔ جاٹوں کی شکست کی خاص وجہ ان کی آپس ناچاقی اور محکم سنگھ کی بے عملی سمجھنی چاہئے سیاسی حالات بھی جے سنگھ کے حق میں تھے۔

اس فتح سے مغل بادشاہ بہت خوش ہوا اور جے سنگھ کا احترام بہت بڑھ گیا۔ دربار میں لوٹنے کے بعد اسے "راجائے راجیشور" کے خطاب سے نوازا گیا۔ جاٹوں کے اوپر اس کا تسلط

رکھنے کی نیت سے جاٹوں کا علاقہ جے سنگھ کو جاگیر میں دے دیا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ تمام علاقہ امیر ریاست کا حصہ بن گیا۔ جے سنگھ اور بدن سنگھ جاٹ کے تعلقات کے بارے میں مورخین کے بہت سے مبالغہ آمیز خیالات ہیں۔ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جے سنگھ کی گزارش پر بد سنگھ کو چوڑامن جاٹ کی جگہ پر جاٹ علاقے کی زمینداری دے دی گئی۔ ایک دستاویز سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ بدن سنگھ نے جے سنگھ کو اس زمینداری کے لئے 83000 ہزار روپیہ پیش کش میں دینا قبول کرلیا تھا۔ کسی جاگیر کو کسی بڑے زمیندار کے ساتھ اس قسم کا معاہدہ کرنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس کا مطلب محض اتنا تھا کہ جاٹ علاقوں میں گاؤں در گاؤں مالگزاری طے کرنے کی ذمہ داری جے سنگھ بادشاہی افسروں پر نہیں ہوگی۔ کسی خود مختار زمیندار کی طرح بدن سنگھ اس علاقے کی مالگزاری کے عوض میں طے شدہ رقم وہاں کے جاگیر دار کو دیتا رہے گا۔ بدن سنگھ دسہرے کے موقعے پر جے سنگھ کے دربار میں جایا کرتا تھا اور جے سنگھ نے اسے ٹیکہ' نشان' نقارہ اور پنچ رنگی پرچم وغیرہ دیئے تھے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ بدن سنگھ جے' سنگھ کے دیگر سرداروں کے برابر ہو گیا تھا۔ یہ سب کچھ جے سنگھ کی جانب احسان مندی ظاہر کرنے اور احترام دینے کی غرض سے ہی کیا گیا تھا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ بدن سنگھ کے کام امیر ریاست کے بڑھتے ہوئے اثر کا ایک کھلا اعلان تھا اور اس کے پردے میں جے سنگھ کو بہت سے شاہی علاقوں کو امیر ریاست میں ملانے کا موقعہ ملا تھا۔

جے سنگھ نے اپنا حلقہ اثر ہاڑوتی پر بھی بڑھانے کی کوشش کی بوندی و کوٹہ ریاست کے پرانے جھگڑوں کا تذکرہ ہم گزشتہ صفحات میں کر چکے ہیں سیدوں کے تعاون سے کوٹہ کے بھیم سنگھ نے بوندی پر بھی قبضہ جمالیا تھا بدھ سنگھ جے سنگھ کے پاس جودھ پور چلا گیا تھا سیدوں کے زوال کے بعد بوندی پر پھر سے بدھ سنگھ کا قبضہ ہوگیا۔ بوندی پر اپنا اثر قائم کرنے کی نیت سے جے سنگھ نے اپنا دودھ شریک بھائی ناگراج بدھ سنگھ کا دیوان بنا کر بھیج دیا۔ ریاست کا سارا انتظام ناگ راج کے ہاتھوں میں آگیا۔ بدھ سنگھ کی رانی اپنی بہن کے احتجاج پر جے سنگھ نے ناگ راج بوندی سے واپس بلالیا لیکن جے سنگھ بوندی کے معاملات میں مداخلت کرتا رہا کچھ دنوں بعد بدھ سنگھ کو حکومت کے لئے نااہل گروان کر جے سنگھ نے بوندی پر حملہ کر دیا اور بدھ سنگھ کو ہٹا کر اس کے ایک جاگیردار رانا سالم سنگھ کے بیٹے دلیل سنگھ کو اپنی حکمرانی میں بوندی کی گدی دے دی۔

جے سنگھ کے حملہ کا نتیجہ اس کے یا بوندی کے لئے اچھا نہیں رہا کچھ مدت تک بوندی پر جے سنگھ کا اثر رہا۔ لیکن اس کی بہن کچھواہی رانی نے اپنے بھائی سے انتقام لینے کا عہد کیا اس سے قبل کوٹہ کے راجہ درجن سنگھ کے خلاف اس کے بھائی شیام سنگھ کو جے سنگھ نے مدد دی تھی اس لئے درجن سنگھ نے کچھواہی رانی کی طرفداری اور حمایت کی بدھ سنگھ نے رانا سنگرام سنگھ سے مدد مانگی۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی جے سنگھ کے خلاف کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔ آخر میں ان حالات کا فائدہ اٹھا کر مرہٹوں کو ہاڑوتی اور راجستھان میں داخل ہونے کا موقعہ مل گیا۔

آگرے کے علاقے اور ہاڑوتی کے علاوہ ایک دوسرے علاقہ مالوہ میں بھی جے سنگھ کی

بڑی دلچسپی تھی۔ بہادر شاہ کے دور حکومت میں جے سنگھ نے مالوہ کی صوبہ داری کا بار بار مطالبہ کیا تھا۔ آخر میں سید برادران کے ہاتھوں میں طاقت آجانے کے بعد 1713ء میں جے سنگھ کو مالوہ کا صوبے دار مقرر کیا گیا تھا جسے سنگھ نے حکومت کا کام بڑی مستعدی سے کیا تھا۔ اور 1715ء میں اس نے مرہٹوں کو بری طرح شکست دی تھی۔ اس کے بعد تقریباً دو سال تک مرہٹوں کو مالوہ میں داخل ہونے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ اسی زمانے میں فرخ سیر کے اصرار پر جے سنگھ کو مالوہ چھوڑ کر دلی آنا پڑا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں مرہٹوں نے دوبارہ مالوہ پر حملے کرنے شروع کر دیئے تھے۔ حالانکہ فرخ سیر نے جے سنگھ سے وعدہ کیا تھا کہ مالوہ کی حفاظت کے لئے وہ کسی بڑے امیر کی قیادت میں ایک بڑی فوج تعینات کرے گا اور وہ اس کے تعاون سے کام کرنے گی لیکن 1717ء میں بغیر کسی اطلاع کے اس نے مالوہ محمد امین خان کو سونپ دیا۔ یہ بات جے سنگھ کو بہت ناگوار گزری۔

اکتوبر 1729ء میں جے سنگھ دوبارہ مالوہ کا صوبے دار مقرر کیا گیا۔ اس سے قبل بھی وہ مالوہ کے معاملے میں دل چسپی لے رہا تھا اور اس کے بارے میں مرہٹے اور مغل بادشاہ کے ساتھ خفیہ بات چیت کر رہا تھا اس کا پس منظر یہ تھا کہ نظام کے دلی چھوڑ کر چلے جانے کے بعد نظام اور مغل بادشاہ دونوں نے اپنے آپ کو مضبوط کرنے کے لئے مراٹھوں سے مدد مانگی حالانکہ شاہو نے اس جنگ میں غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کیا تھا الگ الگ سرداروں نے اس مسئلے پر دونوں فریقین سے بات چیت شروع کر دی۔ پیشوا باجی راؤ نے نظام کا ساتھ دیا۔ بادشاہ نے کانوجی بھونسلے وغیرہ سرداروں کے ساتھ جے سنگھ کے توسل سے بات چیت شروع کی۔ کانو جی بھونسلے نے نظام کی فتح کے بعد لکھا۔ "بادشاہ کے فرمان کے مطابق اور اس بلند پکان راجا (جے سنگھ) کے خط کے مطابق مبارز کو دس ہزار سوار اور دیگر سامان جنگ دے دیا گیا تھا اور اس سے کہا گیا تھا کہ اس علاقے (مہاراشٹر) میں پہنچنے سے پہلے جنگ نہ کرے لیکن خان نے بات نہ مانی اور جلد بازی کی وجہ سے اپنی بھی جان گنوا دی۔"

نظام الملک اور مرہٹے

مغل بادشاہ اور اس کے وزیراعظم نظام الملک دونوں کا مرہٹوں سے امداد مانگنے کا یہ واضح مطلب تھا کہ اب کسی امیر یا راجہ کا مرہٹوں سے بات چیت کرنا یا ان سے مدد مانگنا حکومت سے غداری نہیں رہی تھی۔ مغل بادشاہ کو اس وقت سب سے بڑا خطرہ نظام الملک اور باجی راؤ کی دوستی سے تھا۔ 1725ء کے بعد جے سنگھ کے مرہٹوں کے لئے پالیسی بدلنا اور مرہٹہ اور مغل بادشاہ کے ساتھ بات چیت کرنے کی کوشش اسی پس منظر میں جانچی جانی چاہئے۔ ساتھ ہی مالوہ میں جے سنگھ کے اپنے مفادات تھے۔ ہاڑوتی راجستھان اور مالوہ کے درمیان ایک کڑی تھی اور ایک طرح سے دکن سے آنے کا راستہ تھا۔ مشرقی راجستھان کے ساتھ ساتھ جے سنگھ ہاڑوتی پر بھی اپنا اثر جمانا چاہتا تھا۔ اس کام کے لئے مالوہ پر اس کا تسلط یا وہاں کے حاکم کے ساتھ سمجھوتہ ضروری تھا۔ 1725ء میں مرہٹے مالوہ کے ذریعے ہاڑوتی کی سرحد تک پہنچ چکے تھے۔ ساتھ ہی گجرات کے راستے سے انہوں نے میواڑ کے کچھ علاقوں پر قدم بڑھائے۔ مارواڑ میں ابھے سنگھ اور ان کے بھائیوں کی باہمی رنجش کا فائدہ اٹھا کر انہوں نے راجستھان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنی چاہی۔ 1725ء میں ابھے سنگھ کے بھائیوں کی مدد کرنے کی غرض سے مرہٹوں نے کپڈر پر حملہ کیا اور مہارانا کے قریبی علاقوں کو اجاڑ دیا۔ اگلے سال انہوں نے سیدھے جودھ پور پر دھاوا بول دیا۔

اس سارے پس منظر میں جے سنگھ اور مہارانا نے مرہٹوں سے صلح کی بات چیت شروع کی۔ 1725ء میں مہارانا نے اپنے وکیل جوشی رائے کو ساہو کے پاس بھیجا اس نے ساہو کی جانب سے یہ تجویز بھجوائی کہ ساہو کو شاہی افواج دی جائیں اور اسے 20 لاکھ کی جاگیر مالوہ و گجرات میں دی جائے ساتھ ہی اس کے چار خصوصی سرداروں کو شاہی منصب دیئے جائیں۔

مرہٹوں کی حقیقی خواہش کے بارے میں رانا سنگرام سنگھ اور جے سنگھ کو شک تھا۔ جے سنگھ کو لکھے گئے ایک خط میں مہارانا نے کہا تھا۔ "دکنی (مرہٹے) بڑے مطلبی ہیں جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔" انہوں نے یہ بھی لکھا اپنی خوش حالی کے لئے (راجپوت) راجاؤں کو دکنیوں کے خلاف ایک ہونا چاہئے۔ تو بھی مرہٹوں کی اب دو ریاستیں ہیں اور پہلے کی طرح راجپوت ان پر فتح حاصل کرسکتے ہیں یہ ان کے وکیل نے لکھا یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر اس قسم کی صلح کی تجویز مغل بادشاہ مان لیتا تو اس کا مرہٹوں پر کیا اثر پڑتا اس وقت ساہو کی اندرونی حالت مضبوط نہیں تھی پیشوا باجی راؤ اور نمائندے میں طاقت کی کشمکش چل رہی تھی ایسی حالت میں ہو سکتا ہے۔ کہ ساہو مغل بادشاہ کے 20 لاکھ روپے کے عوض حملہ آورانہ پالیسی چھوڑ دیتا یا شمالی ہندوستان کی بجائے دکن کی جانب دھیان دیتا۔ لیکن راجاؤں کی یہ تجویز مغل بادشاہ نے منظور نہیں کی۔

راجپوت راجاؤں کی مرہٹوں کے ساتھ صلح کی تجویز کی بنیاد دونوں فریقین کا ہندو ہونا

نہیں تھا۔ جے سنگھ کے وہ خط جنہیں کہا جاتا ہے کہ اس نے مالوہ کے سردار نند لال مندلوئی کو لکھے تھے اور جن میں اس نے یہ لکھا تھا کہ وہ ہندو نے کے ناطے مرہٹوں کی مخالفت نہیں کرے گا۔ اب جعلی ثابت ہوچکے ہیں۔ جے سنگھ اور مہارانا کی پالیسی مذہب سے نہیں بلکہ ان کے سیاسی مفادات اور حالات سے متاثر ہوئی تھی۔ 1729ء میں جے سنگھ دوبارہ مالوہ کا صوبے دار بنایا گیا۔ اس وقت اس نے اپنی پالیسی واضح کرتے ہوئے مغل بادشاہ کو یہ عرض لکھی۔" اس گروہ کا واسطہ یعنی حملہ صوبہ مالوہ سے بڑی مدت سے چلا آ رہا ہے۔ اگر اس سال ایک بڑی فوج تیار کرکے اس صوبے میں داخل نہ ہونے دیا جائے یا داخلہ پانے کے بعد انہیں جنگ و جدل کے ذریعے پسپا کیا جائے۔" آپ جانتے ہیں' ہر سال اس طرح کتنا خرچ ہوگا اس لئے یہ امید ہے کہ راجہ ساہو کو جو خلد مکاں (اورنگ زیب) کے زمانے سے شاہی خدمت پر مامور ہے اس کے بیٹے کش سنگھ کے نام سے دس لاکھ روپے کی جاگیر اس شرط پر عطا کی جائے کہ وہ مالوہ میں جھگڑا کرنا بند کردے اور وہاں کے صوبے دار کی مدد کے لئے ایک فوج رکھے اس طرح بادشاہی ملک محفوظ رہے گا اور فوجی کاروائی کے خرچے سے چھٹکارہ ملے گا۔

جے سنگھ کی مرہٹی پالیسی کسی حد تک نظام کی پالیسی سے ملتی تھی۔ 1725ء میں نظام نے جے سنگھ کو لکھا تھا۔ "اس سے قبل مرہٹوں کو ہرانے کے لئے بہت سے صوبے داروں کو تعاون و مدد کی ضرورت پڑی تھی۔ اورنگ زیب بادشاہ کے زمانے میں اور اس کے قبل کے بادشاہوں کے دور میں اس کام کے لئے بڑا بھاری خزانہ صرف کیا گیا اور بڑے بڑے راجاؤں کو تعینات کیا گیا لیکن اس وقت مرہٹے حکومت کے رگ و ریشے میں داخل ہوگئے ہیں اور ان کی طاقت آسمان تک پہنچ گئی ہے۔

اپنی وصیت میں نظام نے اپنے ورثاؤں کو یہ صلاح دی۔ "دکن کے حکمرانوں کو چاہئے کہ وہ مرہٹوں کے ساتھ جو اس ملک کے زمیندار ہیں صلح و معاہدے سے کام لیں لیکن ساتھ ہی اسلام کی عزت و اقبال کو کم نہ ہونے دیں اور انہیں حد سے آگے نہ بڑھنے دیں۔ اس طرح نظام اور جے سنگھ دونوں کی پالیسی یہ تھی کہ مرہٹوں کے ساتھ صلح کی بات کریں اور ساتھ ہی ان کی طاقت کو حد سے زیادہ نہ بڑھنے دیں حالات کو دیکھتے ہوئے کسی دوسری پالیسی کو اپنانا مشکل تھا۔

جے سنگھ کی صلح کن پالیسی حالانکہ محمد شاہ نے 1728ء میں مان لی تھی لیکن اس کے فوراً بعد اس نے جے سنگھ کو مالوہ سے معزول کر دیا اس طرح جے سنگھ کی پالیسی کو عمل میں لانے کی کوشش نہیں کی گئی۔

جب تک مہارانا سنگرام سنگھ زندہ رہے انہوں نے جے سنگھ کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے اور جے سنگھ کی پالیسیوں کی حمایت کی۔ 1732ء میں جب جے سنگھ تیسری بار مالوہ کا صوبے دار مقرر کیا گیا تو اس نے مہارانا کے ساتھ یہ معاہدہ کیا وہ 24' 25 ہزار سوار جے سنگھ کے ساتھ مرہٹوں کا سامنا کرنے کے لئے مالوہ بھیجے گا اور مالوہ کی آمدنی جس میں منصب داروں کی جاگیروں کا اجارہ اور زمینداروں کی پیش کش شامل ہے۔ 1 : 2 کے تناسب سے مہارانا اور جے

سنگھ کے بیچ بانٹی جائے گی۔ اس طرح مہارانا اور جے سنگھ کی دوستی اور تعاون اس زمانے کی سیاست اور راجستھان کے لئے اہم تھے۔

مالوہ اور گجرات پر مرہٹوں کی پیش قدمی : حالانکہ 1720ء کے بعد بھی میواڑ و امیر جے پور ریاست کی حدود اور طاقت میں ترقی ہوئی تو بھی سید برادران کے زوال کی وجہ سے جودھ پور ریاست کی طاقت و عزت کو دھچکا لگا۔ حالانکہ سید برادران نے اجیت سنگھ کو اجمیر و گجرات کا صوبے دار مقرر کیا تھا لیکن ان کے بار بار اصرار کرنے پر بھی اجیت سنگھ جودھ پور میں بیٹھا رہا۔ اور اپنے صوبے کے انتظام کے لئے کوئی خاص اقدامات نہیں کئے۔ اس نے گجرات اور راجستھان کے کچھ علاقوں کو اپنی ریاست میں ملا لیا۔

عبداللہ خاں کی شکست کے بعد بادشاہ محمد شاہ نے حیدر قلی خاں کو گجرات کا اور بخشی الملک خان دوراں کے چھوٹے بھائی مظفر خان کو اجمیر کا صوبے دار مقرر کیا۔ یہ سن کر اجیت سنگھ 30 ہزار فوج کے ہمراہ جودھ پور سے اجمیر آیا اور اس پر قبضہ کرلیا۔ اس نے شہر کے سب معزز لوگوں کو جمع کرکے محمد شاہ کے والد جہان شاہ کا ایک فرمان پڑھ کر سنایا جس میں اجیت سنگھ کو گجرات و اجمیر کی صوبے داری مستقلاً عطا کی گئی تھی۔ اجیت سنگھ نے گئو کشی کا حکم دیا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے اسلامی روایت میں کوئی روک ٹوک نہ کرنے کا یقین دلایا۔ بادشاہ کو اس نے اس مطلب کی عرضی بھی بھیجی کہ اسے گجرات یا اجمیر ایک صوبے کا حاکم رہنے دیا جائے۔

اس وقت تک مغل دربار میں اجیت سنگھ کے لئے کوئی خاص پالیسی طے نہیں تھی۔ دربار میں الگ الگ فریق اور گروہ بن رہے تھے۔ شاہی خزانے میں پیسے کی بہت کمی تھی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے شمشام الدولہ خان دوراں کا خیال تھا کہ اجیت سنگھ کے ساتھ صلح کرلی جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اجیت سنگھ کو جنگ میں شکست بھی ہو جائے تو ایسی حالت میں وہ اس علاقے کے دشوار گزار پہاڑوں اور گھاٹیوں میں جاکر چھپ جائے گا۔ جہاں اس کا پیچھا کرنا ممکن نہیں ہوگا . یہ کہنا مشکل ہے کہ خان دوراں جنگ سے گھبراتا تھا یا اورنگ زیب کے زمانے کے حالات کو دوبارہ پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ حیدر قلی اور دوسرے کچھ امیر اجمیر کو اجیت سنگھ کے ہاتھوں میں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ وہاں خواجہ چشتی صاحب اجمیری کی درگاہ وغیرہ مسلمانوں کے مقدس مقامات بھی تھے۔

جس زمانے میں یہ مباحثہ دربار میں چل رہا تھا مظفر خاں جسے نہ جنگ کا تجربہ تھا اور نہ جس کے پاس لڑائی کا پورا سامان وہ تین ماہ تک منوہر پور میں پڑاؤ ڈالے رہا۔ اس زمانے میں تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے مظفر خاں کے سپاہیوں نے بغاوت کر دی۔ جو کچھ بھی ہاتھ لگا لوٹ لیا۔ مظفر خاں جان بچاکر امیر آیا اور فقیر بن گیا۔ ادھر اجیت سنگھ نے سانبھر جھنڈوانہ' ٹوڈہ' ٹونک اور امرسر پر اپنا قبضہ جمالیا۔

اس کے بعد خان دوراں، حیدر قلی، قمرالدین خاں سبھی بڑے امیروں کو باری باری سے اجمیر کا صوبہ دار بننے کے لئے کہا گیا لیکن سب نے ٹال مٹول کر دی۔ آخر میں عبداللہ خاں کے چچا سید نصرت خاں بارہا نے یہ بیڑہ اٹھایا۔ اسی وقت اجیت سنگھ کے حکم سے ابھے سنگھ نے نیم رانہ، شاہ جہاں پور، الور، تجارہ وغیرہ پرگنوں کو لوٹا۔ کہا جاتا ہے کہ ابھے سنگھ نے دلی سے 9 کوس کے فاصلے تک لوٹ مار کی۔ لیکن اسی زمانے میں نظام کے دکن سے دلی لوٹ کر آنے کی اطلاعات ملی اس لئے اجیت سنگھ نے اجمیر خالی کردیا اور معافی نامہ بھیجا۔ لیکن خان دوران کے توسل سے اسے نہ صرف معاف ہی کردیا بلکہ اجمیر کی صوبے داری بھی سونپ دی گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خان دوراں راجپوت راجاؤں کی دوستی کے ذریعے اپنا ایک الگ گروہ بنانا چاہتا تھا۔ نظام نے اس پالیسی کی نکتہ چینی کی اور اجیت سنگھ کو اس طرح معاف کرنا کمزوری کا ثبوت مانا۔ اس طرح پھر دربار میں گروہ بندی شروع ہوگئی۔

دربار میں امیروں کا ایک بااثر گروہ اجیت سنگھ کو شک کی نظر سے دیکھتا تھا اس لئے اجیت سنگھ کی طاقت کم کرنے کے لئے طاہر خاں کو جو اس سے قبل گجرات کا دیوان تھا اور سانبھر کا فوجدار مقرر کر دیا گیا تھا صوبہ اجمیر کا دیوان بنایا گیا۔ اجیت سنگھ اور ناہر خاں کی دیرینہ دشمنی تھی لیکن راجستھان میں داخل ہوکر ناہر خاں نے راجپوتوں کے پاس اپنا خیمہ ان کو دوست سمجھ کر لگا لیا۔ رات میں ناہر خاں کو قتل کر دیا گیا (6 جنوری 1723ء) اس اطلاع سے بادشاہ محمد شاہ برہم ہوا اور اس نے شرف الدولہ خاں کو 7000 / 6000 منصب کے ساتھ اجمیر کا صوبے دار مقرر کیا اور یہ حکم دیا ہے کہ "اس بدکار باغی کو چوہے کے بل سے بھی پکڑ کر لانا۔" اس مہم کے لئے اسے دو لاکھ روپے بھی نقد دیئے گئے۔ اسی زمانے میں جے سنگھ کی جاٹوں کے خلاف مہم ختم ہوئی تھی اس لئے محمد خاں بنگش اور راجاگر دھر کے ساتھ اسے بھی شرف الدولہ کا ساتھ دینے کا حکم دیا گیا۔

اس طرح اورنگ زیب کی وفات کے بعد تیسری بار مغلوں نے جودھ پور کی ریاست پر حملہ کیا پہلے دو حملوں (1702ء، 1713ء) کے مقابلے میں یہ حملہ زیادہ سخت تھا۔ کیونکہ اس وقت کوئی بھی راجپوت راجا اجیت سنگھ کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں تھا اسی زمانے میں حیدر قلی خاں گجرات کی صوبے داری سے نظام کے ذریعہ نکالے جانے کے بعد ریواڑی پہنچا کیونکہ وہ تجربہ کار اور محمد شاہ کا معتمد تھا اس لئے اسے اجمیر کی صوبہ داری اور سانبھر کی فوجداری دی گئی اور وہاں جانے کی اجازت دی گئی۔

8 جون 1723ء کو مغل افواج اجمیر پہنچ گئیں اور انہوں نے گڑھ (بٹیلی گرہ) کا محاصرہ کرلیا۔ حالانکہ اجیت سنگھ اس سے پہلے ہی اجمیر چھوڑ کر جودھ پور آگیا تھا۔ لیکن گڑھ بٹیلی کے قلعے دار اوداون نے مضبوطی کے ساتھ شاہی فوج کا مقابلہ کیا۔ ڈیڑھ ماہ کے بعد جے سنگھ کے

توسل سے صلح ہوگئی۔ اجیت سنگھ کو معاف کر دیا گیا اور اس کا پرانا منصب دوبارہ اسے دے دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اجیت سنگھ کو ناگور کی جاگیر راؤ اندر سنگھ کو واپس دینی پڑی یہ جاگیر 1713ء میں اجیت سنگھ نے اندر سنگھ سے چھین لی تھی جے سنگھ نے بذات خود جاکر اندر سنگھ کو ناگور کا قبضہ دلایا اجیت سنگھ کا یہ مطالبہ بھی مان لیا گیا کہ اسے خود مغل دربار میں حاضری نہیں دینی پڑے گی۔ اس کی جگہ پر اس کے بیٹے ابھے سنگھ کو دربار میں حاضر ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ رعایتیں خان دوراں کے اثر سے حاصل ہوئیں کیونکہ وہ راجپوت راجاؤں کو اپنا دوست اور حامی بنانا چاہتا تھا۔

اس کے تھوڑے دنوں بعد 23 جون 1723ء کو اجیت سنگھ کے بیٹے بخت سنگھ نے اس کو قتل کر دیا اس واقعے کی بہت سی وجوہات بتائی جاتی ہیں۔ کچھ مصنفین کا کہنا ہے کہ وزیر قمر الدین خاں نے ابھے سنگھ کو یقین دلایا تھا کہ اجیت سنگھ کا زندہ رہنا مار واڑ ریاست کے فائدے میں نہیں ہے۔ لیکن باپ کے قتل کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ مار واڑ میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ حالانکہ محمد شاہ نے راجا کا ٹیکہ ابھے سنگھ کو دیا۔ جیتاوت' کوپاوت' اور اوداوت راٹھور سرداروں کی حمایت سے ابھے سنگھ کے دیوان بھنڈاری رگھوناتھ نے بغاوت کو دبانا چاہا۔ اس کی مدد کے لئے جے سنگھ نے اپنے سپہ سالار رائے شیو داس کے تحت ایک فوج بھی بھیجی لیکن بغاوت بڑھتی گئی۔ اور جودھ پور شہر کے لئے خطرہ پیدا ہوگیا۔ آخر میں بادشاہ سے مالی مدد لے کر ابھے سنگھ کو خود مار واڑ آنا پڑا۔ جے سنگھ کے کہنے سے رانا نے بھی ایک سو دیہ فوج ابھے سنگھ کی حمایت کے لئے بھیجی اس طرح سے 1725ء میں امیر جے پور اور میواڑ کی افواج کی مدد سے ابھے سنگھ اپنے بھائیوں کو شکست دے پایا لیکن یہ خانہ جنگی 1728ء تک چلتی رہی آنند سنگھ اور رائے سنگھ نے مرہٹوں سے مدد مانگی۔ اگر راجپوت راجا یہ مشورہ مان لیتے کہ ایڈر کی جاگیر ابھے سنگھ کے بھائیوں کو دے دی جائے تو شاید یہ حالات پیدا نہ ہوتے لیکن مہارانا خود ایڈر چاہتے تھے۔ 1728ء میں جب کنٹھ جی اور پلاجی نے گجرات کی جانب سے جالور پر حملہ کیا تب مہارانا کی آنکھیں کھلیں۔ بھنڈاری کھیوسی کے ذریعے انہوں نے یہ معاہدہ کیا کہ ایڈر ابھے سنگھ اور رائے سنگھ کو دے دیا جائے اور مرہٹے جالور خالی کردیں گے۔

اس نزاع کے دو نتیجے نکلے۔ اول خانہ جنگی اور اپنی اپنی ریاستوں کی توسیع کی خواہش کی وجہ سے مراٹھوں کو راجستھان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے کا موقعہ ملا۔ دوم یہ کہ اس پورے زمانے میں شاہی وزیر کے بار بار کوشش کرنے پر بھی ابھے سنگھ گجرات جانے اور وہاں کے صوبے دار سربلند خاں کی مدد کرنے میں حیلہ سازی کرتا رہا۔ اس نے فوجی اخراجات کے لئے وزیر سے ایک بڑی رقم مانگی جسے وہ دینے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ کسی جانب سے بھی مدد نہ ملنے کی وجہ سے فروری 1727ء میں سربلند خاں کو مرہٹوں کے مقابلے میں شکست تسلیم کرنی پڑی

اور گجرات کی چوتھ کتھ جی کدپ اور پلاجی گائیکواڑ کو دینا منظور کرنا پڑا اس طرح مرہٹے گجرات میں جم گئے اور گجرات کی سمت سے مرہٹوں کے لئے راجستھان میں داخل ہونے کا راستہ کھل گیا۔

1730ء میں ابھے سنگھ کو گجرات کا صوبے دار بنایا گیا۔ 1733ء میں جب اومابائی داماڈے نے احمد آباد کا محاصرہ کیا تو ابھے سنگھ کو گجرات کی چوتھ و سردیش مکھی دینا قبول کرنا پڑا مایوس ہوکر ابھے سنگھ گجرات کا کام اپنے نائب رتن سنگھ بھنڈاری کے سپرد کرکے جودھ پور چلا آیا۔ اپنے باپ اجیت سنگھ کی طرح اسے بھی بیکانیر ریاست پر اپنا قبضہ جمانے اور اجمیر کی صوبے داری حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ 1733ء میں اس نے بیکانیر پر حملہ کیا۔ بیکانیر کے حاکم نے 12 لاکھ روپے دے کر اپنی جان چھڑائی جب وزیر قمرالدین خاں نے اس سے گجرات واپس جانے کے لئے کہا تو اس نے اجمیر کی صوبے داری اور 25 لاکھ روپے فوجی اخراجات کے لئے طلب کیے 1734ء میں ہورڑہ میں سب راجپوت راجاؤں نے مرہٹوں کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن آپسی کش مکش کی وجہ سے مرہٹوں کے خلاف کوئی متحدہ محاذ نہ بن سکا۔ 1734ء کی مہم میں مغل پھر ناکام رہے ۔ اس کے بعد ابھے سنگھ دلی پہنچا۔ وہاں اس نے خان دوراں کے خلاف وزیر قمر الدین خاں کی حمایت کی اور اجمیر کی صوبے داری حاصل کرنے میں لگا رہا۔ حالانکہ وہ 1737ء تک گجرات کا صوبے دار رہا لیکن اس نے وہاں کے انتظامی معاملات میں 1733ء کے بعد کوئی دلچسپی نہیں لی۔

شروع میں ابھے سنگھ اور جے سنگھ کے تعلقات اچھے تھے۔ 1728ء کے بعد دونوں میں کشیدگی بڑھتی گئی۔ اور 1735ء کے بعد تو دونوں دربار میں مخالف گروہوں میں شامل ہوگئے۔ اس طرح زیادہ دنوں تک اس دور میں راجپوت راجاؤں نے مشترکہ طور پر کسی ایک پالیسی پر اتفاق نہیں کیا حالانکہ سیاست میں ان کا اہم حصہ رہا۔

اس دور میں صرف مغل امیروں ہی کی قوت نہیں بڑھی بلکہ راجپوت اور مرہٹہ دونوں ریاستوں میں سرداروں کی طاقت میں بھی خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ راجپوت سرداروں کی قوت بڑھنے کی سب سے خاص مثال یہ ہے کہ میواڑ کے مہارانا امرسنگھ دوم نے سرداروں کے طبقے قائم کئے۔ ساتھ ہی یہ بھی فیصلہ کیا کہ جاگیروں کے وقتاً فوقتاً تبادلے کرنے کی مغلوں کی روایت کو ختم کر دیا جائے۔ اس طرح سرداروں کی جاگیریں ان کی آبائی جائیدادیں ہوگئیں اور ان کے اوپر دربار کا کنٹرول کم ہوگیا۔ شاید دوسری راجپوت ریاستوں کا بھی یہی مزاج تھا۔

اٹھارہویں صدی کی پہلی تین دہائیوں میں مرہٹوں کا عروج ہندوستانی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اس کا اثر مغل شہنشاہیت ہی پر نہیں سارے ملک پر پڑا بہادر شاہ کے دور حکومت میں مغلوں اور مراٹھوں کے تعلقات پر کہیں گزشتہ سطور میں تذکرہ کیا جاچکا ہے۔ اس کے بعد

مرہٹہ حکومت کی سلسلے وار ترقی اور اب ہم مغلیہ سیاست میں مراٹھوں کے زیادہ سے زیادہ حصہ لینے اور شمالی ہندوستان میں ان کی آمد اور عمل کا جائزہ لیتے ہیں۔

ساہو کے مغل کیمپ سے بھاگ کر مہاراشٹر میں داخل ہونے کی وجہ سے مہاراشٹر میں ایک سنگین خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ حالانکہ سنبھا جی کے بہیمانہ قتل کے بعد اس کے بھائی راجہ رام نے حکومت کا کام سنبھالا تو بھی گدی کا اصل وارث سنبھا جی کے بیٹے ساہو کو جو قید میں تھا مانا گیا تھا۔ لیکن راجہ رام کی موت کے بعد اس کی بیوہ تارا بائی نے اپنے کم عمر بیٹے شیوا جی دوم کو گدی کا وارث تسلیم کرانے کی کوشش کی اس لئے ساہو کے مہاراشٹر لوٹ آنے کے بعد مرہٹوں میں دو گروہ ہوگئے۔ برار خاندیش اور بڈالانہ کے باثر مرہٹہ سردار پر سوجی بھونسلے' نیپا جی سندھیا بیت راؤ سنبھل کر اور ساہو کے خسر رستم جی جادو وغیرہ نے ساہو کا ساتھ دیا۔ پونہ کے نزدیک کھیٹ کی جنگ میں تارا بائی کی بھیجی گئی فوج کو شکست دینے کے بعد ساہو نے ستارا پر حملہ کیا۔ حالانکہ پرسو رام پنت نمائندے نے پھر بھی اس کی مخالفت کی۔ ستارا کے مغل قلعے دار شیخ میر نے ساہو کو اصلی وارث تسلیم کرتے ہوئے قلعے کے دروازے کھول دیئے۔

12 جنوری 1708ء کو ساہو نے دھوم دھام سے ستارا میں تخت نشینی کا جشن منایا۔ اس کے بعد اس نے پنھالہ پر اپنا قبضہ جمایا اگر سب مرہٹہ سردار ساہو کا ساتھ دیتے تو وہ شیوا جی کی ساری ریاست پر اپنا قبضہ جما لیتا۔ لیکن بہت سے سردار ساہو کو زیادہ طاقتور نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ بہادر شاہ کے وزیر منعم خاں نے بھی تارا بائی کا ساتھ دیا۔

اسی زمانے میں بالا جی وشوناتھ کا عروج ہوتا ہے بالا جی کے آباؤ اجداد کو "کنکڑ" کے سرپور دھن علاقے کے دیش مکھ تھے۔ 1695ء سے 1707ء تک بالا جی پونہ اور دولت آباد کے سر صوبے دار تھے۔ یہ علاقے اس زمانے میں مغلوں کے ماتحت تھے۔ معلوم پڑتا ہے کہ بالا جی نے راجہ رام اور اس کے وزیروں اور ساتھ ہی مغل حاکموں اور ساہو کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھے۔ کھیڈ کی جنگ میں بالا جی نے ساہو کا ساتھ دیا۔ اس کے بعد انہیں سپہ سالار بنایا گیا۔ بالا جی کے بڑھتے ہوئے اثر اور نئے عہدے کی وجہ سے کئی مرہٹہ سردار ناراض ہوگئے۔ خاص طور پر اروجی جادو کا بیٹا چندر سین جادو اس سے بہت ناخوش ہوا۔ اس نے اور کئی مرہٹہ سرداروں نے تارا بائی اور مغلوں دونوں کے ساتھ بات چیت شروع کر دی۔ شکار کھیلتے ہوئے بالا جی کے ساتھ جھگڑا ہونے اور ساہو کو اس کا ساتھ نہ دینے کے بہانے سے اگست 1711ء میں چندر سین مغلوں سے جاملا۔ اس سے قبل راؤ رمبھا تبالکر بھی مغلوں کی خدمت میں جاچکا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زیادہ تر مرہٹہ سرداروں میں غرور و خود غرضی کا جذبہ زیادہ تھا۔ اور وفاداری اور آزادی کا جذبہ کم۔ ان سرداروں کو مغل سلطنت میں بغیر کسی سے پوچھے لوٹ مار کرنے اور اس سے حاصل شدہ دولت آپس میں بانٹ لینے کی عادت پڑ گئی تھی۔ شیواجی کے

ذریعے چلائی گئی مرہٹہ تحریک کی شکل بدل چکی تھی کسانوں کے مفادات کی فکران طاقتور مرہٹہ سرداروں کو کم تھی۔ اس لئے ساہو کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اپنے سرداروں پر کنٹرول قائم کرنا تھا۔

اپنی خود غرضی کی وجہ سے ان سرداروں نے نہ صرف ساہو کا ساتھ چھوڑ دیا بلکہ دیگر سرداروں نے بھی تارا بائی کے ساتھ سازش کرنا شروع کردیا۔ خاص طور سے مرہٹوں کی بحری فوج کے سالار کانھوں جی آنگرے نے کلیان وغیرہ علاقوں پر اپنا قبضہ جمالیا اور ستارا پر بھی حملہ کرنے کی دھمکی دی ان حالات میں ساہو کو اپنے سرداروں کو خوش کرنے کے لئے کئی اقدامات کرنے پڑے پر سورام امبک کو جسے تارا بائی کا خفیہ معاون ہونے کے الزام میں قید میں ڈال دیا گیا تھا اس کو نمائندے کا عہدہ دیا گیا۔ اس وقت پرسو رام اور بالا جی ایک دوسرے کے معاون تھے۔ پرسوم رام امبک نے بالا جی کو پیشوا بنانے کے لئے زور دیا لیکن بالا جی نے یہ شرط لگائی تھی کہ کانھوں جی کے خلاف مہم پر وہ تبھی جائے گا جب اسے پیشوا کے عہدے پر تعینات کر دیا جائے گا۔

17 نومبر 1713ء کو ساہو نے بالا جی کو پیشوا مقرر کردیا بالا جی نے بڑی ہوشیاری سے کانھوں جی وغیرہ کو توڑ لیا۔ اس کے کہنے کے مطابق ساہو نے اس کے کئی قابل اعتماد لوگوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ اس طرح سید برادران کی طرح بالا جی بھی رفتہ رفتہ اپنی قوت بڑھا رہا تھا اور اپنے حامیوں کا گروہ تیار کر رہا تھا۔

1714ء میں تارا بائی کو اس کی سوت جس بائی نے سازش کرکے قید کرلیا اور اس نے اسے کے بیٹے شیوا جی دوم کی جگہ پر اپنے بیٹے سنبھا جی دوم کو تخت پر بٹھایا۔ سنبھا جی کی تخت نشینی کولھا پور میں ہوئی۔ ستا راؤ کولھا پور ریاستوں کے آپسی جھگڑے سے پہلے کے مطابق چلتے رہے اور بعد میں مغلوں اور نظام الملک نے برابر ان جھگڑوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن تارا بائی کے زوال کے بعد کچھ وقت کے لئے ساہو بے فکر ہوگیا۔ اسی کی وجہ سے مرہٹوں کو اپنی طاقت بڑھانے اور مغل دربار کی گروہ بندیوں سے پیدا شدہ حالت سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملا۔

فرخ سیر کے تخت نشین ہونے کے بعد نظام الملک کو دکن کا صوبے دار مقرر کیا گیا تھا۔ نظام الملک نے داؤد خاں کے معاہدے کو جس کے مطابق دکن کی چوتھ و سردیش مکھی صوبے دار خود ساہو کو دے دیتا تھا۔ ماننے سے انکار کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرہٹوں نے پھر سے جگہ جگہ لوٹ مار شروع کردی خافی خاں کہتا ہے کہ نظام نے مرہٹوں کو کئی بار پسپا کیا لیکن مرہٹوں نے الگ الگ علاقوں میں مٹی کی چھوٹی چھوٹی گڑھیاں بنا رکھی تھیں۔ یہ گڑھ بڑے مضبوط تھے اور ضرورت کے مطابق مرہٹے جاکر ان میں چھپ جاتے تھے اور شاہی فوج کے لوٹ

جانے کے بعد پھر لوٹ مار کرنا شروع کر دیتے تھے۔ نظام کے لئے ان سب گڑھیوں کو مسمار کرنا ممکن نہیں تھا لیکن اسی زمانے میں نظام نے تارا بائی اور کولھا پور کے مرہٹہ سرداروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کئے۔

1715ء میں نظام الملک کی جگہ پر میر بخشی سید حسین علی خاں کو دکن کا صوبیدار بنایا گیا دکن پہنچنے کے بعد کچھ وقت تک حسین علی نے نظام کی پالیسی پر عمل کیا۔ اس نے اور اس کے بخشی نے بڑی مستعدی سے جگہ جگہ مرہٹوں کو شاہی حدود سے باہر نکال دیا لیکن مرہٹوں کی سرگرمیاں بڑھتی ہی گئیں۔ برہان پور کے پاس کھانڈوڈاماڈے نے حسین علی کے بخشی ذوالفقار علی خاں کو بری طرح شکست دی۔ اس کے انتقام میں حسین علی کے دیوان راجہ موکھم سنگھ چندر سین جادو بیاجی سندھیا نے ستارا تک مرہٹوں کا علاقہ تہس نہس کر دیا۔ حالانکہ شاہی حلقوں میں اس فتح پر بڑی خوشی منائی گئی لیکن ایک طرف تو اس سے حسین علی کے مسائل کا حل نہیں نکلا اور دوسری طرف فرخ سیر نے خفیہ طور پر ساہو اور کرناٹک کے زمینداروں وغیرہ کو حسین علی کی مخالفت کرنے کے لئے اکسایا۔

آخر میں اپنے چچا سید انور خان کے مشورے سے اور شنکراجی ملہار کے توسل سے حسین علی نے ساہو کے ساتھ صلح کرلی۔ مغلوں اور مرہٹوں کے تعلقات کے لئے یہ صلح جو فروری 1718ء میں ہوئی بہت اہم ہے کیونکہ یہ مستقبل کے سب معاہدوں کی بنیاد ہے۔ اس میں یہ طے کیا گیا کہ: (1) ساہو کو رسمی طور پر شیواجی کا "سوراج" دے دیا گیا لیکن خاندیش کے بدلے اسے پنڈار پور اور تربنگ پرگنوں سے لگے ہوئے علاقے دے دیئے گئے۔ (2) برار گونڈ وانہ اور کرناٹک کے علاقوں میں مرہٹوں کے حال میں فتح کئے گئے علاقے بھی اسے دیدیے گئے۔ (3) ساہو کو دکن کے چھ صوبوں سے اپنے کامبش داروں کے ذریعے چوتھ وسردیش مکھی وصول کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ اس شرط کے ساتھ کہ مراٹھے راہ داری وصول نہیں کریں گے بلکہ وہ صرف حکومت کی جانب سے طے کئے گئے ٹیکس وصول کریں گے (4) مندرجہ بالا رعائتوں کے بدلے میں ساہو نے یہ وعدہ کیا کہ وہ دس لاکھ پیش کش دے گا' مغل صوبے دار کے لئے پندرہ ہزار گھوڑ سوار تعینات کرے گا ملک کو آباد کرے گا شب مفسدوں کو سزا دے گا اور اگر کسی کا سرمایہ چرالیا جائے یا برباد کیا جائے تو اسے واپس دلائے گا اور چوروں کو سزا دے گا اور اگر سرمایہ واپس نہ دلا سکے تو اسے بذات خود دے گا۔ (5) سردیش مکھی کے حصول کے لئے وہ روایتی سرمائے کے لئے طے شدہ شرح سے پیش کش دے گا۔ یہ رقم ایک سال کی آمدنی کے ساڑھے چھ گنا کے حساب سے 117516762 روپے ہوتی تھی لیکن ساہو نے صرف اس کا دسواں حصہ یعنی 1719390 روپے بارہ آنے دینا منظور کیا۔

خافی خاں کا کہنا ہے کہ مراٹھوں نے چوتھ وسردیش مکھی کے لئے ہر پرگنے میں الگ

الگ تحصیلدار تعینات کیے جس کے نتیجے میں رعایا کو اب دو یا تین عاملوں کو مال گزاری دینی پڑتی تھی۔ مرہٹے مال گذاری کے علاوہ راہ داری اور دیگر ٹیکس بھی وصول کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے جمع بندی کا تقریباً آدھا حصہ انہیں حاصل ہوجاتا تھا۔ امن و امان کے انتظام کے لئے ساہو نے کوئی توجہ نہیں دی۔ نہ ہی اس نے سردیش مکھی کی سند کے بدلے ایک کروڑ سے زیادہ رقم جس کا اس نے وعدہ کیا تھا۔ ادا کی۔ فرخ سیر کو تخت سے ہٹانے کے بعد یہ سب سندیں سیدوں نے نئے بادشاہ سے دلوا دیں۔ بعد میں محمد شاہ نے بھی تخت نشین ہونے کے بعد ان سندوں کی تصدیق کی یہی چیز آگے چل کر مرہٹوں کے قانونی اختیارات کی بنیاد بنی۔

ان سندوں کے حاصل کرنے سے سید برادران اور مرہٹوں کی دوستی اور زیادہ مضبوط ہوگئی۔ نظام کی بغاوت کے وقت عبداللہ خاں نے ساہو کو ایک خط میں لکھا تھا کہ میں نے اپنے نائب علی خاں کو دکن میں اکیلے آپ ہی کے بل بوتے اور حمایت پر چھوڑا ہے لیکن چوتھ وسر دیش مکھی کی فنڈوں کے حصول کی وجہ سے مراٹھوں کی اندرونی حالت پر بھی ایک اہم اثر پڑا ساہو اب سب کی نظر میں مرہٹوں کا واحد حاکم تھا۔ اور شیوا جی کا قانونی وارث بن گیا اس کے بعد بھی مرہٹوں نے جو کچھ علاقے جیتے ان کا قانونی اختیار مغل بادشاہ سے حاصل کرنے کی انہوں نے برابر کوشش کی۔ اس طرح دوسرے مغلیہ امیروں کی طرح مرہٹوں نے مغل بادشاہ کے لئے وفاداری دکھاتے ہوئے سلطنت کو کھوکھلا کیا۔

دوسرے چوتھ وسر دیش مکھی کا بٹوارہ بالا جی نے ایک خاص طریقے سے کیا چوتھ کا 25 فی صد حصہ مرہٹہ راجہ کا مانا گیا۔ راجہ کے حصے کو اکٹھا کرنے کی ذمہ داری اس کے اعلیٰ عہدے داروں' نمائندہ' پیشوا اور پنت سکریٹری کو سونپی گئی اس کے علاوہ چھ فی صد سہوترہ کے نام سے پنت سکریٹری کو انتظام کے لئے دے دی گئی۔ تین فیصد نالگونڈہ کے نام سے ساہو کے پاس محفوظ رہا کہ چاہے جس سردار کو دے دے۔ بچا ہوا 66 فی صد حصہ مقاسا کے نام سے مختلف سرداروں کو دے دیا گیا۔ اسی طرح بعد میں سردیش مکھی کا بٹوارہ کیا گیا۔

یہ انتظام کسی طرح سے بھی ایک معیاری انتظام نہیں کہا جاسکتا۔ حقیقت میں یہ اس دور کے سرداروں کی قوت کا مظاہرہ تھا اس کا بنیادی اثر یہ پڑا کہ سرداروں کی قوت اور بڑھ گئی اپنے حصے کی چوتھی یعنی چوتھ کے 25 فی صد حصے کے لئے بھی ساہو اپنے اعلیٰ عہدے داروں پر منحصر ہوگیا۔ یہی نہیں ساہو کا حصہ کا خود استعمال کرنے کے لئے اس کے اعلیٰ عہدے دار' نمائندہ ' پیشوا اور پنت سکریٹری میں باہمی کش مکش ایک فطری بات تھی۔ مغلیہ دربار کے حالات اور مرہٹہ راجا کے دربار کے حالات میں ہمیں کئی طرح سے یکسانیت دکھائی دیتی ہے۔ دونوں میں امیروں اور سرداروں کی طاقت بڑھانا۔ ان میں جاگیر یا مقاسہ' سرجام وغیرہ کے لئے آپسی کش مکش اور گروہ بندی اور حاکم اور اس کے وزیر اعلیٰ۔ وزیر یا پیشوا میں طاقت کے لئے کش مکش

یہ تینوں عنصر دکھائی دیتے ہیں لیکن یہاں یکسانیت ختم ہوجاتی ہے کہ مغل حکومت میں وزیر طاقت حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے لیکن مرہٹوں میں پیشوا کی طاقت روز بروز بڑھتی جاتی ہے لیکن سب سے اعلیٰ ہو جانے کے بعد وہی سرداروں کے ساتھ کشمکش کرنے کا مسئلہ پیشوا کے سامنے بھی آجاتا ہے۔ ان پورے واقعات کے سلسلے پر تبصرہ کرنا حالانکہ اس کتاب کا مقصد نہیں ہے لیکن اس کی جانب اشارہ کرنا ہمارے لئے نامناسب بھی نہیں ہے۔

پیشوا کو مرہٹہ حکومت میں سب سے اعلیٰ بنانا مرہٹوں کی طاقت مالوہ اور گجرات میں قائم کرنا اور راجستھان بندیل کھنڈ اور گنگا کے علاقے میں مرہٹہ افواج کے داخلے ان سب کا سہرا بالا جی وشو ناتھ کے بیٹے اور وارث باجی راؤ کے سر ہے۔

مغلیہ طاقت کے روزبروز زوال اور دربار میں مختلف گروہوں کے درمیان کش مکش نے مرہٹوں کو اپنی قوت میں ترقی کرنے کا موقعہ دیا حقیقت میں مرہٹوں نے اس موقعہ کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اب مرہٹوں کی جدوجہد اپنی اور مراٹھا حکومت کی حفاظت کی بجائے مرہٹہ سلطنت کے قیام کے لئے اور مرہٹوں کے ذریعے چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے والے علاقوں کی فلاح و بہبود کے لئے شروع ہوئی۔ باجی راؤ کے طاقت حاصل کرنے تک یہ تبدیلی واضح طور پر سامنے نہیں آئی تھی۔ مرہٹہ دربار میں مرہٹوں کی مستقبل کی پالیسی کے بارے میں اور دوسرے معاملات میں باجی راؤ اور نمائندہ سری پت راؤ کے درمیان زبردست اختلاف رائے تھا۔ ہم عصر مصنف چٹنس کے مطابق دونوں آدمیوں کے کام کرنے کے ڈھنگ اور جوازات پر تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ چٹنس کے کہنے میں مبالغہ آرائی اور پرجوش انداز بیان کا استعمال جگہ جگہ کیا گیا ہے اور بہت سے ایسے الفاظ جو شاید صرف چٹنس کے اپنے خیالات ہوں مخصوص کرداروں کی زبان سے ادا کرائے گئے ہیں۔ اختلاف رائے اور کش مکش کے مندرجہ ذیل معاملات تھے۔

(1) توسیع پسندانہ پالیسی اور اس کی راہوں اور وقت کا تعین

(2) نظام الملک کا رویہ اور اس سے دوستانہ تعلقات بنائے رکھنے کے امکانات۔

(3) اندرونی انتظام خاص طور پر مرہٹہ سرداروں پر قابو رکھنا اور فوجی و مالی انتظامات آخری سوال طاقت کا تھا یعنی شاہی نشستوں میں بالادستی پیشوا کی ہوگی یا نمائندے کی۔

حقیقت میں نمائندہ توسیع پسندانہ پالیسی کے خلاف نہیں تھا لیکن وہ چاہتا تھا کہ سب سے پہلے کونکن کی جانب ریاست کو پھیلایا جائے۔ اس کا جواز تھا کہ کرناٹک پر تسلط قائم کیا جائے۔ جہاں زنجیرہ کے سدہ نے بہت سے علاقے دبا لیے تھے اور کرناٹک کی فتح پایہ تکمیل تک پہنچائی جائے جس کی ابتدا شیوا جی نے کی تھی۔ اس کا یقین تھا کہ دکن میں اپنی حالت مضبوط کرنے کے بعد ہی شمال کی جانب بڑھنا چاہئے۔ نمائندے نے ہوشیاری کی پالیسی پر زور دیا اور تنبیہہ کی کہ مرہٹے ایسی پالیسی پر عمل نہ کریں کہ دوبارہ مہاراشٹر کو مغلوں کے حملے کا سامنا کرنا پڑے۔ اس

کے علاوہ وہ طاقتور نظام الملک کے ساتھ بھی دوستانہ تعلقات بنائے رکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس کی رائے تھی کہ جب تک کافی مالی ذرائع اور ایک طاقتور فوج اور مستقل انتظامی ڈھانچہ قائم نہ ہو جائے تب تک کوئی بڑی فوجی کارروائی نہ کی جائے۔

برخلاف اس کے باجی راؤ نے مغلیہ دربار کی کمزوریوں اور کاہلی پر زور دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ مغل دربار امیروں کی اندرونی چپقلش اور گروہ بندی کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اور مرہٹوں کی مدد سے بادشاہ تخت سے اتارے یا بٹھائے جا رہے ہیں۔ کرناٹک کی فتح کو اس نے ایک گھریلو معاملہ بتایا جسے حضرت راجہ کی گھریلو فوج پر چھوڑا جاسکتا ہے۔ شیوا جی کے ہندو بادشاہی کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس نے ہندو راجاؤں کی نام نہاد دوستی کا تذکرہ کیا۔

نظام الملک کی طاقت کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس نے کہا کہ میں نظام کو روکنے کے ساتھ ہی شمال کی جانب مرہٹہ قوت کو بڑھا سکتا ہوں۔ آخر میں اس نے مرہٹہ سرداروں کو لوٹ مار سے حاصل ہونے والی دولت کا لالچ دیتے ہوئے کہا کہ دکن تو مسلسل جنگوں کی وجہ سے ویران ہوچکا ہے لیکن شمالی ہندوستان مال و زر سے بھرا پڑا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے پرجوش الفاظ میں کہا: "تنے پر وار کرنے سے شاخیں اپنے آپ گر جائیں گی اور میری بات سنو تو میں اٹک کی دیواروں پر مرہٹوں کا بھگوا پرچم لہرا دوں گا۔

باجی راؤ کی شمال کی جانب توسیع پسندانہ پالیسی سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے۔ کہ وہ دکن کی فتح کی جانب دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ 1724ء میں ہی جب بادشاہ نے نظام الملک کے خلاف مرہٹوں سے مدد مانگی اسی وقت باجی راؤ نے مطالبہ کیا تھا کہ حیدر آباد کی صوبے داری اس کو دے دی جائے اور ان کی رضامندی سے دکن کے صوبے دار کا تقرر کیا جائے۔

اس سے واضح ہے کہ باجی راؤ بھی دکن میں مرہٹوں کا تسلط قائم کرنے کے لئے حق میں تھا لیکن وہ نمائندے کی اس تخیلاتی رائے سے متفق نہیں تھا کہ نظام الملک کی مخالفت کے بغیر مراٹھے آسانی سے کرناٹک پر قبضہ کرلیں گے۔ بالفاظ دیگر وہ سمجھتا تھا کہ نظام جیسے چالاک اور مدبر دشمن کی موجودگی میں اپنے موجودہ ذرائع سے مرہٹے سارے دکن پر اپنا تسلط قائم نہیں کرسکتے تھے۔ اس لئے اس کی واضح پالیسی تھی کہ مرہٹے مالوہ و گجرات جیسے خوش حال علاقوں کو فتح کریں۔ اٹھارہویں صدی کی ابتدا سے ہی ان صوبوں پر مرہٹے مسلسل حملے کرتے آرہے تھے اور وہاں لوٹ مار کرکے دولت حاصل کررہے تھے باجی راؤ نے ان بے ضابطہ حملوں کو نہ صرف ایک مستقل شکل دی بلکہ اس نے ان علاقوں کی سیاسی و فوجی اہمیت کو بھی سمجھا مرہٹوں کا مالوہ و گجرات پر مضبوط کنٹرول ہونے پر وہ نظام الملک اور دلی کے رابطوں کو توڑ سکتے تھے۔ ایسی حالت میں مرہٹے نظام کے علاقے پر آسانی سے تین طرف سے حملہ کرسکتے تھے اور نظام کسی بھی طرح کی مدد دلی سے حاصل نہیں کرسکتا تھا یا مرہٹے وہاں سے دوآبہ اور اس کے پورب و پچھم کی

جانب آگے بڑھ سکتے تھے۔

اس لئے ایک بڑی مرہٹہ سلطنت کے قیام کے لئے مالوہ و گجرات پر مرہٹوں کا تسلط پہلا قدم تھا۔ تاریخی نقطہ نظر سے یہ خیال ٹھیک نہیں کہ باجی راؤ نے اس کے آگے اپنا منصوبہ بنایا ہوگا۔ اٹک پر مرہٹوں کا پرچم لہرانے کا اس کا قول ایک سیاست داں تک مرہٹوں کی قوت کے باہر تھا۔ باجی راؤ اتنا زمانہ شناس تھا۔ کہ اس نے عملاً اس مقصد کے حصول کے لئے کوشش نہیں کی جس کا حاصل کرنا پوری طرح ناممکن تھا۔

شمالی ہندوستان اور مرہٹے : نظام نے سیدوں پر یہ الزام لگایا تھا کہ سید برادران ہندو (دس راجپوتوں اور مراٹھوں کے دوست ہیں لیکن اپنی کامیاب بغاوت کے بعد نظام الملک نے اس شاہی فرمان (جس کے مطابق مرہٹوں کو دکن کی چوتھ و سردیش مکھی کا اختیار دیا گیا تھا) کا تو احترام کیا۔ لیکن اس نے مرہٹہ عہدے داروں کے دارالحکومت اورنگ آباد کے پاس رہنے پر اعتراض کیا۔ اس کے کچھ دن بعد ہی 4 جنوری 1721ء کو اس نے باجی راؤ کے ساتھ پہلی ملاقات کی اس ملاقات میں کن مسائل پر بات چیت ہوئی یہ نامعلوم ہے لیکن اتنا واضح ہے کہ نظام الملک نے جوان العمر باجی راؤ کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرلئے تھے تو بھی دونوں کے مابین کسی طرح کا معاہدہ نہ ہوسکا۔ نظام الملک کا بیجاپور اور گول کنڈہ پر قبضہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو بیجا پوری اور حیدر آبادی دونوں کرناٹکوں کا مالک سمجھتا تھا جبکہ مراٹھے اس کے اس دعوے کو غلط سمجھتے تھے۔ شاہ جی کے زمانے سے ہی مرہٹے کرناٹک پر اپنا خصوصی حق سمجھتے اور وقتاً فوقتاً اسے لوٹتے رہتے تھے۔

نظام الملک اکتوبر 1721ء میں اورنگ آباد سے دلی لوٹ آیا اور 1724ء تک دربار کی اس سیاست میں پھنسا رہا اس کی غیر حاضری میں اس کے نائب مبارزالملک نے مرہٹوں کے ساتھ چوتھ دینے کے معاہدے کو ماننے سے انکار کردیا جس سے مرہٹوں کے ساتھ پھر سے کش مکش شروع ہوگئی لیکن اس دوران میں بھی نظام الملک نے مرہٹوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات بنائے رکھنے کی کوششوں کو جاری رکھا۔ گجرات کی مہم کے دوران 24 فروری 1723ء کو نظام اور باجی راؤ کی دوبارہ ملاقات ہوئی۔

نظام کے دلی چھوڑ کر دکن چلے جانے کے وقت 1724ء میں مراٹھوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے بادشاہ نے ساہو کو لکھا۔ مبارز خاں نے بھی مرہٹوں کے ساتھ دوستی کے لئے سیدھی بات چلائی۔ اس کوشش کو روکنے کے لئے نظام الملک نے باجی راؤ کے ساتھ تیسری بار ذاتی طور پر ملاقات کی حالانکہ ساہو نے اپنے سرداروں کو غیر جانبدار رہنے کا حکم دیا تھا لیکن شاکر کھیڑا کی جنگ میں باجی راؤ اپنے گھوڑ سواروں کے ساتھ نظام کے حق میں لڑا اس کے کاموں سے خوش ہوکر نظام الملک نے اسے (7000) سات ہزاری کا منصب دے کر اس کی عزت افزائی کی۔ کچھ ہم عصر مورخین کی رائے ہے کہ نظام الملک نے مرہٹوں کی حمایت کے بدلے میں

باجی راؤ کو گجرات و مالوہ کی جانب پیش قدمی کرنے کے لئے اپنے علاقے سے گزرنے کی اجازت دے دی تھی۔

مرہٹوں کی شمالی ہندوستان کی طرف بڑھنے کی پالیسی کو سمجھنے کے لئے مرہٹوں اور نظام کے تعلقات کو سمجھنا ضروری ہے۔ نظام الملک کے دوستانہ تعلقات کے بارے میں پیشوا اور نمائندہ شری پت راؤ کے درمیان اختلاف رائے تھا۔ نمائندہ نظام کے ساتھ مستقبل میں دوستی بنے رہنے کی جانب کافی پرامید تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ مبارز خاں کے خلاف فتح کے بعد کرناٹک میں نظام اور مرہٹے مشترکہ طور پر دوبارہ مہم کرچکے تھے لیکن نمائندہ ان کارروائیوں کے پردے میں نظام کے مقاصد اور اندرونی جذبے کو سمجھنے میں ناکام رہا۔ نظام باجی راؤ کی شمالی ہندوستان کی جانب پیش قدمی میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتا تھا کیونکہ مغلیہ دربار کا رویہ اس کے لئے دشمنانہ تھا۔ ساتھ ہی وہ مرہٹوں کو اتنا طاقت ور بننے کا موقعہ دینے کے حق میں بھی نہیں تھا کہ وہ مالوہ و گجرات پر اپنا پورا تسلط قائم کرلیں کیونکہ ایسی حالت میں وہ اس کے اور مغل دربار کے بیچ دیوار کا کام کرتے اور اس کی حالت خطرے میں پڑ جاتی۔ نظام الملک کی پالیسی کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اس کے دونوں دشمن یعنی مرہٹے اور مغل بادشاہ آپس میں لڑتے رہیں ساتھ ہی وہ ان میں سے کسی ایک کو بھی اتنا طاقتور نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ وہ دوسرے فریق پر حاوی ہو جائے اس لئے مراٹھوں کے ساتھ دوستی دکھاتے ہوئے بھی اس نے دربار کے ساتھ اپنے تعلقات کو ٹھیک کرنے اور دلی کے لئے اپنا راستہ صاف رکھنے کی بھی کوشش کی۔ مراٹھوں پر اندرونی بندش رکھنے کے مقصد سے اس نے مرہٹوں کے مختلف گروہوں اور سرداروں اور خاص طور سے کولھاپور کے سنبھاجی کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کیے یہ پالیسی انتہائی گنجلک تھی اور اسے نظام الملک جیسا مدبر اور ہوشیار سیاست داں ہی عملی جامہ پہنا سکتا تھا اگرچہ کسی حد تک سوائی جے سنگھ نے بھی نظام کی بنیادی پالیسی کی تقلید کی لیکن اس میں اسے نظام جیسی کامیابی نہیں ملی۔

ڈاکٹر ستیش چندر کہتا ہے کہ نظام کی اس مشکل پالیسی کی وجہ سے ہمیں بار بار ایسے دور دکھائی دیتے ہیں جن میں نظام اور مراٹھوں کی دوستی دشمنی میں بدل جاتی ہے اور دشمنی دوستی میں۔ اس کا اثر شمالی ہندوستان کی سیاست پر پڑنا لازمی تھا۔ نظام اور مرہٹوں کے تعلقات کا تفصیلی جائزہ لینا ہمارے لئے ضروری نہیں ہے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ 1721ء سے 1727ء تک دوستانہ تعلقات کے بعد نظام اور مراٹھوں میں کشمکش کی حالت پیدا ہوگئی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس مدت میں مالوہ و گجرات میں مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے اثر سے نظام الملک بے چین اور خوف زدہ ہوگیا تھا۔ اس نے کرناٹک کے خلاف مرہٹوں کی مہم کی بھی مخالفت کی حالانکہ 26-1725ء اور 28-1727ء میں کرناٹک میں ساہو کی مہم کے دوران اس نے اپنا تعاون دیا تو بھی اس نے اپنے سپہ سالاروں کو مرہٹوں کی مخالفت کرنے کے لئے خفیہ حکم دے رکھا تھا۔ جب مراٹھوں کی فوج کا بڑا حصہ باجی راؤ کی قیادت میں کرناٹک میں تھا تو نظام نے اپنا نقاب اتار دیا اس نے دکن کی چوتھ و سردیش مکھی کے سلسلے میں ساہو اور سنبھاجی کے درمیان اختلاف کو

بنیاد مان کر ساہو کو چوتھ و سردیش مکھی دینے سے انکار کردیا اس کے ساتھ ہی شاہی نمائندے کی حیثیت سے اس نے ساہو کو اپنا دعوی پیش کرنے کی غرض سے مدعو کیا۔ اس نے ساہو کو یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ باجی راؤ کو پیشوا کے عہدے سے ہٹا دے اپنا مقصد پورا کرنے کے .لئے نظام نے کولھا پور کے سنبھاجی کے ساتھ ساز باز کرلی تھی۔

نظام کے اس رویے نے ساہو کو شش و پنج میں ڈال دیا۔ نمائندہ شری پت راؤ کی صلاح سے ساہو نے تنازعے کو نپٹانے کی غرض سے نظام کی ثالثی منظور کرلی۔ لیکن وہ جلد ہی حقیقت کو سمجھ گیا اور مرہٹہ افواج کو فوراً واپس آنے کے لئے لکھا۔ اس نے مرہٹہ سالاروں کو بھی اپنے اپنے قلعے میں ہوشیار رہنے کا حکم دیا کرناٹک سے لوٹ کر باجی راؤ نے نظام کے خلاف لڑائی چھیڑنے کی رائے دی اس لئے ساہو نے نمائندے کی صلح کی تجویز کو رد کردیا۔ نظام الملک کو مراٹھوں کے ساتھ جنگ چھڑنے کی امید نہیں تھی باجی راؤ نے ایک بڑے گھوڑ سوار دستے کو لے کر نظام الملک کو پالکھیڑہ کے مقام پر گھیر لیا مرہٹوں نے نظام تک رسد پہنچنا روک دیا لیکن نظام کے طاقتور توپ خانے کی مار کی وجہ سے انہوں نے نظام کی فوج پر حملہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس لئے ڈیڑھ ماہ کے محاصرہ کے بعد دونوں نے صلح کرنی زیادہ مفید سمجھی مارچ 1728ء میں منگی شیو گاؤں میں سمجھوتہ ہوا جس کے مطابق نظام ساہو کو دکن کی چوتھ و سردیش مکھی دینے اور کولھا پور کے سنبھاجی کو کسی بھی طرح پناہ نہ دینے پر رضا مند ہوگیا۔

کچھ مورخین کا خیال ہے کہ منگی شیو گاؤں کی صلح کے نتیجے میں دکن میں مرہٹوں کی خود مختاری قائم ہوگئی تھی لیکن یہ تاریخی نقطہ نظر سے ٹھیک نہیں ہے کیونکہ دکن پر اپنا تسلط جمانے کے لئے مرہٹوں کو برابر جدوجہد کرنی پڑی اور یہ جدوجہد 1761ء اور اس کے بعد چلتی رہی۔ لیکن اس صلح میں دکن کی چوتھ و سردیش مکھی پر ساہو کے دعوے کو صحیح تسلیم کرلیا گیا اور ایک لمبی مدت سے چلا آرہا تنازعہ ختم ہوگیا۔ باجی راؤ ساہو کے دربار میں نمائندہ شری پت راؤ کا اثر کم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کا سب سے اہم نتیجہ یہ نکلا کہ اب مرہٹے اپنا پورا دھیان مالوہ و گجرات کی طرف لگا سکے۔ اس طرح منگی شیو گاؤں کی صلح صرف دکنی ہندوستان کے لئے ہی اہم نہیں ہے۔ بلکہ اس کا پورا اثر شمالی ہندوستان کی سیاست پر بھی پڑا بلکہ یہاں تک کہا جاسکتا ہے۔ کہ 1725ء میں نظام کے مغل دربار چھوڑ کر چلے جانے کے بعد 1729ء میں نادر شاہ کے حملے تک سیاست کا مرکز مغلیہ دربار نہیں دکنی ہندوستان ہو جاتا ہے اور شمالی ہندوستان کی سیاست کافی حد تک دکنی ہندوستان کی سیاست کے زیر اثر طے ہوتی ہے۔

مالوہ اور بندیل کھنڈ کی فتح (42-1732)

مالوہ کی چوتھ کے سلسلے میں مرہٹوں کے ساتھ زبانی معاہدے کے بعد 1731ء میں محمد امین خاں بنگش کو اس صوبہ کی صوبہ داری سے علیحدہ کرکے جے سنگھ سوائی کو مقرر کیا گیا۔ اس شرط پر کہ وہ تیس ہزار سوار اور اتنی ہی پیدل سپاہ دے گا اور اس کو زمینوں اور خراج وغیرہ سے ملنے والی آمدنی کا دو تہائی حصہ ملے گا۔ خود اس پر نگہداری کے خیال سے ایک دیوان کا بھی تقرر کیا گیا جسے 18 ہزار سوار مہیا رکھنے اور مال گزاری کا ایک تہائی حصہ بذریعہ اپنے اہل کاروں کے وصول کرنے کا اختیار دیا گیا۔

جے سنگھ سے قبل کسی گورنر کو اتنے اختیارات کبھی نہ دیئے گئے تھے۔ نیز اس کے پاس مالوہ اور آگرہ کا صوبہ تھا اپنی فوج میں وہ جے پور کی افواج کے ذریعہ 48 ہزار سوار اور پیادوں کا اضافہ بھی کرسکتا تھا۔ مالوہ کی مال گزاری کے علاوہ شہنشاہ کی طرف سے اس کو 20 لاکھ کی رقم دی گئی۔ (13 لاکھ بطور وظیفے کے اور سات لاکھ بطور قرض کے۔)

جے سنگھ دسمبر 1722ء میں مالوہ پہنچا۔ ہولکر کی سرکردگی میں مرہٹے صوبہ کے اندر داخل ہوئے اور ہولکر نے منڈسور میں جے سنگھ کی افواج کو گھیر لیا۔ مرہٹوں سے امن کی تجویز پیش کردی۔ مارچ 1733ء میں اس نے چھ لاکھ روپیہ بطور ضمانت کے اور چوتھ کی جگہ مالوہ کے اٹھائیس پرگنہ پیشوا کو دینے منظور کرلئے۔

نیا موڑ : ابھی تک تو مرہٹے صرف چوتھ اور سردیش مکھی کی ہی مانگ کر رہے تھے جسے سالانہ یک مشت رقم کی صورت میں یا جاگیر کی صورت میں طلب کر رہے تھے لیکن اب چوتھ کی جگہ انہوں نے چند پرگنوں کی مانگ شروع کردی تھی۔ اور چوتھ کی مانگ کو گویا اپنی سرحدوں کی توسیع کا وسیلہ بنالیا تھا۔ اس کے بعد مالوہ میں چوتھ اور سردیش مکھی کی مانگ مانند پڑنے لگی۔ 1732ء تک اس صوبہ پر مکمل قبضہ کی مانگ کا آغاز ہوگیا اور مالوہ میں مرہٹے خود کو مضبوط اور محفوظ سمجھنے لگے۔

34-1733ء میں مرہٹوں نے ایک طرف تو راجپوتانہ پر حملہ کیا اور دوسری طرف دتیا اور چھا وغیرہ ریاستوں پر بھی دباؤ ڈالا۔ مرہٹوں کی فوج میں چھترسال بندیلہ کے بیٹے بھی آکر شامل ہوگئے۔

مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کے لئے 1732ء اور 1735ء کے درمیان مرہٹوں کو مالوہ سے بے دخل کرنے کی تین مہمیں بروئے کار لائی گئیں۔ 33-1732ء میں وزیراعظم قمرالدین خاں اسی نوے ہزار فوج کو لے کر مالوے کی سرحد تک پہنچا۔ نیز اس نے عظیم اللہ خاں کو مرہٹوں کو پسپا کرنے کے لئے روانہ کیا۔ عظیم اللہ نے پلاجی کو جاپکڑا اور شیوداس کے بقول ان کو شکست فاش دی اور انہیں نربدا کے اس پار لوٹ جانے پر مجبور کردیا۔ اس فتح سے

مطمئن ہو کر عظیم اللہ پھر وزیر کی افواج سے آملا۔

1733ء و 1734ء میں مظفر خاں' خان دوران کا بھائی' مرہٹوں پر حملہ کیے بغیر سورنج تک بڑھا اور آئندہ کے لئے مرہٹوں کے حملوں کا سدباب اور مالوہ کی حفاظت کا انتظام کیے بغیر واپس لوٹ آیا۔

یہ شاہی مہمات نقطہ عروج کو 35-1734ء میں پہنچ گئیں جبکہ وزیر اعظم قمرالدین خاں اور بخشی الملک خان دوراں کی سرکردگی میں دو زبردست افواج مرہٹوں کو نربدا کے پار پسپا کرنے کے لئے روانہ کی گئیں۔ خان دوراں کے ساتھ تمام راجپوت بشمولیت جے سنگھ' ابھے سنگھ اور درجن لال کور شامل تھے۔ راجپوتانہ پر ہولکر کے حملہ نے ان کی آنکھیں کھول دی تھی۔ اور 1734ء میں جے سنگھ کے مشورے پر راجاؤں نے مجلس مشاورت طلب کی اور مرہٹوں کے خلاف متحد ہو کر اقدام کرنے کا فیصلہ کیا۔

وزیر کی افواج 25 ہزار اور خان دوراں کی 50 ہزار سے بھی زائد تھیں۔ لیکن یہ زبردست افواج مرہٹوں کے اسپ سوار دستوں کے سامنے دوبارہ بے بس ہوگئیں۔ خان دوراں اور جے سنگھ تو ڈانیک کے مقام پر محاصرہ میں لے لیے گئے۔ اور اپنی افواج سے علیحدہ ہوگئے۔ اب جے پور کو مرہٹوں سے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ بالآخر جے سنگھ کے مشورے پر خان دوراں نے صلح کی گفتگو کو آغاز کیا اور مالوہ کی چوتھ کی صورت میں مرہٹوں کو 22 لاکھ روپے سالانہ دینا منظور کیا۔

قمرالدین خان کا نارو کے مقام پر پلاجی جادو سے ہلکا سا مقابلہ ہوا لیکن وہ بھی مرہٹہ افواج کو کوئی قابل لحاظ نقصان نہ پہنچا سکا۔ ان مہمات سے ایک بار پھر یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مغلوں کے پاس مرہٹوں کے اسپ سوار دستوں کی چابکدستی کا کوئی جواب نہ تھا۔ یہ ناکامی ملک عنبر اور شاہ جی بھونسلے کے وقت سے شروع ہوتی ہے جب کہ مرہٹوں کے اسپ سوار دستوں نے دکن میں منظم مظاہرہ کیا تھا۔ مرہٹوں کی ان پالیسیوں کا اس وقت تک کوئی جواب نہ ہوسکا جب تک کہ روہیلوں کے پیدل سپاہیوں نے تیز بندوقوں سے گولیوں کی بارش نہیں کی۔ یہ جنگی حکمت عملی پہلی بار پانی پت کی جنگ میں نادر شاہ کامیابی سے اختیار کرچکا تھا۔ مغل افواج اپنے لمبے چوڑے اسلحوں اور بھاری توپوں کے ذریعہ کسی ایک مقام پر جم کر لڑنے کے لئے ہی نہایت مناسب تھیں۔ ایسی جنگ اگرچہ بڑی مشکلات پیش کرتی تھی لیکن مرہٹوں کے نربدا پار کرنے سے قبل تک ہی ممکن تھی۔ 1732ء میں مکمل طور پر جنوبی مالوہ میں مرہٹوں کے قیام سے شاہی افواج کے لئے جنگی مسائل نے ایک دوسری صورت اختیار کرلی۔ اب تو ان کو کھلے میدانوں میں حکمت عملی والی جنگ لڑنی تھی۔ جس کے لئے مرہٹوں کی اسپ سوار فوج نہایت کارگزار ثابت ہوئی تھی کیونکہ ان کے ذریعہ وہ مغل توپوں کی رسائی سے دور کے علاقوں میں مغل افواج پر باآسانی آگ برسا دیتے تھے۔ اور ان کے رسل و رسائل اور رسد کے راستے بند کردیتے تھے۔ اب صرف کھلے میدانوں ہی میں مرہٹوں کو شکست دے کر مغل مرہٹوں کو مالوہ سے باہر نکال سکتے

تھے اور نربدا کے کنارے اپنے دفاع کو مضبوط کرسکتے تھے۔ مغلوں کے پاس اس مسئلہ کا کوئی حل نہ تھا اور اس لئے انہوں نے دیکھا کہ مالوہ میں زبردست افواج کو بھیجنا مرہٹوں پر بہت زیادہ اثر انداز نہ ہوسکا اور اس کے نتیجہ میں یہ خطرہ لاحق ہوگیا تھا کہ راجپوتانہ اور دہلی کے علاقے مرہٹوں کی زد میں آگئے ہیں۔

دربار میں امن پسند اور جنگ پسند گروہ اور مرہٹے

مندرجہ بالا حالات میں دو مختلف پالیسی کی حمایت کرنے والے دو متضاد گروہ دربار میں منظر عام پر رونما ہوئے۔ خان دوراں اور جے سنگھ کی سرکردگی میں ایک گروہ تو مرہٹوں کے ساتھ امن کا خواہش مند تھا۔ دوسرا گروہ قمر الدین خاں اور سعادت خاں کی سربراہی میں نظام کی مدد لے کر اور زیادہ بہتر تیاری کے ساتھ جنگ کو جاری رکھنے کی حمایت میں تھا۔ محمد سربلند خاں اور روشن الدولہ بھی جنگ کے حامی تھے۔ تین سال کی مہم کے نتیجہ میں صرف جے سنگھ کے 1733ء والے چوتھ کی ادائیگی کے معاہدہ کی توثیق ہوسکی۔ سعادت خاں نے جے سنگھ پر دھوکہ دہی کا الزام لگایا اور اس کو اپنے ہم مذہبوں کا ساتھ دینے اور اس کی ہم نوائی کرنے میں اتہام لگایا گیا۔ مرہٹوں کے ساتھ خفیہ طور پر دوستی کرکے جے سنگھ نے حکومت کو تباہ کر دیا ہے۔ یہ سعادت خاں کے الفاظ تھے۔ "مجھے صرف آگرہ اور مالوہ کی صوبہ داری دیدیجئے۔ مجھے اس کے لئے روپیہ پیسہ درکار نہیں "جے سنگھ تو کروڑوں طلب کرسکتا ہے لیکن مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرا خزانہ خود ہی معمور ہے۔ نظام میرا دوست ہے وہ مرہٹوں کے نربدا کے پار اترنے میں مزاحمت کرے گا۔

وہ جب خود شہنشاہ خاں دوراں اور جے سنگھ کی غلطیوں پر احتجاج کرنے میں شامل ہوا تو خان دوراں نے جواب دیا۔ "مرہٹوں کو جنگ کے ذریعہ پوری طرح دبایا نہیں جاسکتا۔ البتہ گفت و شنید کے ذریعہ پیشوا یا اس کے بھائی کو جہاں پناہ کے حضور میں حاضر ہونے پر مائل کیا جاسکتا ہے اگر اس کی مانگیں قبول کرلی جائیں تو آئندہ مستقل قریب میں شاہی سرحدوں پر کسی طرح کی بدامنی نہ ہوگی۔ لیکن اگر سعادت خاں اور نظام مل گئے تو وہ کسی نئے حکمران کو تخت نشین کردیں گے۔

خان دوراں اور جے سنگھ کھلے طور پر اس رائے کے تھے کہ مرہٹوں سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرنا آسان نہ تھا اس لئے ان کے ساتھ امن پسندی کی پالیسی کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ کار نہ تھا۔ انہوں نے شہنشاہ کے خدشات کو ہوا دی کہ اگر ان کے اختیار میں بڑی تعداد میں شاہی افواج دے دی گئیں تو سازشیں کرکے بااثر امراء کسی نئے حکمراں کو تخت نشین کردیں گے۔ اس طرح انہوں نے امن کی بات چیت شروع کرنے کے لئے شہنشاہ کی اجازت حاصل کرلی۔ انہوں نے نظام الملک کے ارادوں کی طرف سے شہنشاہ کے خدشات کو اور تقویت پہنچائی یقیناً

نظام کی پیچیدہ حکمت عملی کو سمجھنا دشوار تھا اور اس کی یقین دہانی پر اعتماد کرنا بھی سخت مشکل تھا۔ اس نے 1725ء اور 1728ء میں مرہٹوں سے دوستی کرلی تھی اور دونوں دفعہ ان کو دھوکہ بھی دیا تھا۔ 1731ء میں اس نے محمد خاں بنگش کے ساتھ مرہٹوں کے خلاف ایک مشترکہ مہم کی تجویز رکھی تھی لیکن 1732ء میں اس نے باجی راؤ کے ساتھ صلح کرلی تھی۔ اور پہلے کی طرح وہ اس صلح نامہ کو توڑنے کے لئے بھی تیار ہوگیا تھا۔

1735ء میں وہ برہان پور تک وزیراعظم کے ساتھ مالوہ والی مہم میں شریک رہا۔ اس کی کمک کے لئے اس نے پانچ ہزار سوار بھی روانہ کیے اور پلاجی سے واپس جانے کے لئے بھی زور دیا۔ دربار میں ان تمام امور کا ہر ایک کو علم تھا۔ پھر بھی نظام پر کسی کو بھروسہ نہ تھا۔ سعادت خاں بھی اس سے بدگمان تھا اگرچہ اس کی اس کے ساتھ خط و کتابت بھی تھی۔

اب ان دو قسم کی متضاد تجویزوں کے حامیوں میں ایک طویل کشمکش شروع ہوگئی۔ پہلے تو شہنشاہ "جنگ کے حامیوں" کی طرف مائل ہوا۔ ابھے سنگھ وزیر کا ہم خیال بن گیا اور مرہٹوں کے وکیل نے بتایا کہ قمرالدین خاں کو اگرہ مالوہ یہاں تک کہ گجرات بھی دے دیئے جائیں اور دو زبردست افواج روانہ کی جائیں۔ اگر جے سنگھ نے ساتھ نہ دیا تو اس کے علاقوں میں لوٹ مار کی جائے اور حکم عدولی کی اس کو سزا دی جائے۔ ندیوں کے پایاب ہو جانے پر شہنشاہ بہ نفس نفیس میدان میں اترنے کا ارادہ رکھتا تھا جے سنگھ اور خان دوراں کو جے پور کے راستہ سے دکن بھیجا جانا تھا اور وزیراعظم اور ابھے سنگھ اور سعادت خاں گوالیار کے راستے سے روانہ ہونے تھے۔ محمد خاں بنگش سے بھی جو اس وقت فرخ آباد میں خانہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ جاگیریں اور دوسری مراعات کے وعدوں کا یقین دلا کر' جمنا کے گھاٹوں کو مرہٹوں سے محفوظ رکھنے کے لئے افواج اکٹھا کرنے کے لئے کہا گیا۔

جنگ کی حامی جماعت کا سدباب کرنے کے لئے 1734ء اور 1735ء میں پیشوا نے ایک چال چلی۔ اس کی ماں شمالی ہندوستان کی طرف یاترا کے ارادہ سے روانہ ہوئی وہ تمام بڑے بڑے راجاؤں کی راجدھانیوں میں گئی اور اس موقعہ پر مرہٹہ وکیلوں نے ان کی رائے کو اپنے حق میں ہموار کرلیا۔ جے سنگھ اور بندیلے دوستانہ تعلقات کی طرف مائل تھے ہی۔ مہاراجہ اودے پور کچھ متذبذب تھا اور ابھے سنگھ کا رخ یقینی تھا۔ جے سنگھ نے پیشوا کو شمالی ہندوستان آنے کی دعوت دی اور اس کے تمام اخراجات کو جو پانچ ہزار روپے روزانہ ہوتے تھے۔ برداشت کرنے کا وعدہ کیا اور مالوہ کی چوتھ دلوانے کا بھی یقین دلایا۔ اور اس کی جان کی حفاظت کی ذمہ داری میں اس کے تمام مطالبات کا تصفیہ کرانے کے لئے اس کو شہنشاہ کے روبرو پیش کرنے کا وعدہ کیا۔

جے سنگھ کا باجی راؤ کو شمالی ہندوستان کے لئے دعوت دینا بہت سے مصنفین کی نظر میں ایک باغیانہ عمل تھا اور یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ شاید جے سنگھ دہلی کے خلاف ایک مشترکہ منصوبہ بنانا چاہتا تھا۔ لیکن یہ خوب ظاہر ہے کہ جے سنگھ نے باجی راؤ کو ایک امن کی تجویز کے لئے بلایا تھا کیونکہ اس نے اس کو صرف پانچ ہزار سواروں کے ساتھ آنے کو کہا تھا اور مرہٹہ وکیل سے

کہہ دیا تھا کہ اگر اس کی آمد کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا تو پیشوا کوئی بھی پسندیدہ راستہ یعنی جنگ کا راستہ اپنا سکتا تھا۔ اس طرح اس سے قبل کی جنگ کے شعلے حکومت کے پایہ تخت تک پہنچنے لگے جے سنگھ کی امن کے لئے یہ آخری کوشش تھی۔ ظاہر ہے کہ جے سنگھ کا خیال تھا کہ اگر پیشوا شمالی ہندوستان میں بذات خود آگیا تو شہنشاہ سے اس کا کسی تصفیہ پر پہنچ جانا اس سے زیادہ آسان ہے کہ لوگوں کے ذریعہ مہاراشٹر میں بیٹھ کر گفت و شنید کرتا رہے۔ 1735ء و 1736ء میں شمالی ہندوستان میں باجی راؤ کی آمد یقیناً" اگر دربار کی اجازت سے نہیں تو اس کے علم میں ضرور تھی کیونکہ اس سال شاہی افواج نے مرہٹوں کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ جنوری 1736ء میں جیسے ہی پیشوا نے نربدا کو پار کیا۔ مرہٹہ افواج کے اخراجات کے لئے خاں دوراں کے توسل سے فوراً" روپیہ دربار سے فراہم ہونا شروع ہوگیا۔ اکتوبر 1735ء میں پیشوا دکن سے روانہ ہوگیا۔ نومبر کے آخر تک اس نے نان دربار کے مقام پر تاپتی کو پار کیا اور جنوری 1736ء میں وہ میواڑ کی سرحد میں داخل ہوگیا۔ اور بانس واڑہ پہنچا۔ فروری کے پہلے ہفتہ میں وہ اودے پور پہنچا اور وہاں اس کا راجہ جے سنگھ کے دیوان اور سفیروں نے استقبال کیا۔ دربار سے روانہ شدہ امن کے سفراء بھی جلد ہی وہاں پہنچ گئے۔ 14 مارچ کو بھا مولاؤ کے مقام پر جے سنگھ کی پیشوا سے پہلی ملاقات ہوئی اور وہ کئی دن تک اس کی ہمراہی میں رہا۔ مرہٹوں سے امن کی تجویز میں خود جے سنگھ کا اپنا ایک ذاتی مقصد بھی تھا۔ وہ مغلوں کی طرف سے مطمئن نہ تھا اور سمجھتا تھا کہ مالوہ میں اس کے استحکام کے لئے پیشوا کی دوستی لازمی تھی۔ اس کی شدید خواہش تھی کہ مالوہ اور آگرہ کے صوبے مستقل طور پر اس کے تصرف میں آجائیں۔ اس طرح وہ سعادت خاں اور نظام الملک کے اتباع میں اپنے لئے ایک علیحدہ علاقہ نکال لینا چاہتا تھا۔

1736ء میں قیام امن کے لئے بات چیت

فروری سے لے کر جون 1736ء تک خاں دوران اور جے سنگھ کے توسط سے شہنشاہ اور پیشوا کے درمیان مستقل طور پر مذاکرات ہوتے رہے۔ ان پیچیدہ مذاکرات کا احاطہ کرنا دشوار ہے کیونکہ یہ تین مختلف مراکز یعنی دہلی جے پور اور پیشوا کے پڑاؤ سے متعلق ہیں۔ اور ان میں متعدد قسم کے درمیانی لوگ شامل رہے۔ ان مذاکرات کا تعلق متعدد و موضوعات سے رہا۔ لیکن ان طول طویل اور پیچیدہ مذاکرات کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا کیونکہ دربار میں جے سنگھ اور خان دوراں کے اثرات کچھ کمزور تھے۔ جنگ کی حامی جماعت مستقل طور پر مخالفت میں اڑی ہوئی تھی۔ نظام طرح طرح کی چالیں چل رہا تھا۔ پیشوا کے مطالبات بھی حد سے گزرے ہوئے تھے اور وہ بذات خود دربار میں حاضر ہونا اور مغلوں یعنی جنگ کی حامی جماعت کے ہاتھوں میں پڑنے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ مرہٹہ وکیل نے بھی راؤ کو خبردار کر دیا تھا۔ کہ تمام مغل ایک طرف ہوگئے ہیں۔ خان دوراں اور جے سنگھ اور چند دوسرے سردار دوسری جانب ہیں۔ معلوم ہوتا ہے سعادت خاں اور قمرالدین ان کے شکست کھا جانے تک ان کے فیصلوں پر عمل درآمد نہیں ہونے دیں گے۔ مغل ناقابل اعتماد فریب اور بے وفا ہیں۔ باجی بھیو راؤ نے بھی لکھا "دہلی میں مغلوں نے ایک وفاق بنا لیا ہے خان دوراں اور جے سنگھ شہنشاہ کے ساتھ ہیں نظام کے جاسوسوں کی آمدورفت شب و روز جاری ہے۔ نظام الملک کے مشورے پر قمرالدین' روشن الدولہ' سعادت خاں اور اجے سنگھ نے ایک وفاق بنالیا ہے اور آپ کو کامیاب نہ ہونے دینے کا فیصلہ کررکھا ہے۔ آپ ان پر اعتماد کرکے دہلی کا رخ نہیں کرسکتے۔ جب آنجہانی بالا جی دہلی گئے تھے تو سید قابل اعتماد تھے اور شنکر جی درمیان میں تھا۔ مغل بالکل بے اثر تھے اور نظام اپنے گھر میں چھپا بیٹھا تھا۔ آج وہ اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہیں اور ان کی طاقتیں مضبوط اور متحد ہوچکی ہیں۔

باجی راؤ نے اپنے وکیل دھوند و مہادیو کے توسط سے اپنے مطالبات پیش کیے۔ اس نے اپنے لئے شاہی حکومت کے تحت ایک موروثی علاقے کا اور اپنے سرداروں کے لیے منصبوں اور جاگیروں کا مطالبہ کیا۔ اور اپنی فوج کے خلاف عداوت پسندی کے رجحانات کو ختم کرنے کو کہا اور اس نے جنگ کے اخراجات کے بطور 13 لاکھ زرضمانت طلب کیا اور سال رواں کے لئے 20 لاکھ بطور چوتھ کے مانگا۔ اس نے مالوہ کی صوبہ داری اور شہنشاہ کی تحویل میں لئے ہوئے قلعہ کو چھوڑ کر اس کے تمام علاقوں پر اختیار بشمولیت جاگیرداروں کی زمین اور پرانے مال گزاروں اور بے محصول زمینوں اور اخراجات روزانہ اور باقی تمام زمیندار جو کہ صرف مرہٹوں کو مال گزاری دے کر ہی اپنی جگہ قائم رہ سکیں گے۔ یہ سب طلب کیا۔

پیشوا نے بندیل کھنڈ کے سرداروں سے خراج وصول کرنے کا اختیار بھی مانگا۔ لیکن

سب سے زیادہ اہم مطالبہ یہ تھا کہ دکن کے سردیش پانڈے کا موروثی عہدہ بھی پیشوا کو دیا جائے۔ اس عہدے سے وابستہ دکن کے محصول مال گزاری کا پانچ فیصد اور کچھ غیر واضح انتظامی امور سے متعلق مطالبات بھی تھے۔

ان تمام مطالبات کو تسلیم کرلیا گیا۔ یادگار خاں جس کو خان دوران کی فہم و فراست کی کنجی کہا جاتا تھا مالوہ اور گجرات کی صوبہ داری کا فرمان لے کر ان صوبوں پر بزور تلوار قابض ہوچکا تھا اور بندیل کھنڈ کے راجاؤں سے خراج وصول کرنے کے حق کا پروانہ بھی اسے عطا کیا گیا۔ پھر بھی کوئی فیصلہ کن سمجھوتہ نہ ہوسکا اس کی خاص وجہ اس وقت دکن سے متعلق باجی راؤ کے نہایت دوررس مطالبات تھے۔ پیشوا نے خاندیش اورنگ آباد اور بیجاپور میں پچاس لاکھ کی جاگیر کا مطالبہ کیا تھا۔ اور ولی عہد کو دکن کا گورنر مقرر کیے جانے کے ساتھ ساتھ خود کو اس کا نائب حکمران بنائے جانے کا مطالبہ بھی پیش کر دیا تھا۔ تمام انتظامی امور خود پیشوا کے ذریعہ انجام پذیر ہونے تھے اور دکن میں جو زائد محصول و مال گزاری وصول کی جائے اس میں سے نصف کا حصہ دار خود پیشوا ہوتا۔ اس طرح باجی راؤ نے دراصل دکن کو اپنے تصرف میں لے لینے کا مطالبہ کیا تھا۔ ایک دوسری یادداشت میں مالوہ اور بندیل کھنڈ سے متعلق مطالبات بھی پیش کیے گئے تھے اس میں بھوپال سے یار محمد خاں کی بیدخلی مانڈو دھار اور ائے سین کے قلعوں سے دست برداری اور مکمل مالوہ بشمولیت ریاستہائے قلعہ کو بطور جاگیر کے زیر تحویل لینے کے مطالبات بھی شامل تھے۔ پیشوا نے ہندوؤں کے مذہبی مراکز یعنی پریاگ بنارس متھرا اور گیا کو بھی بطور جاگیر کے مانگا تھا شہنشاہ یار محمد خاں کے اخراج پر تو راضی ہوگیا تھا لیکن باجی راؤ کے شہنشاہ کے حضور میں آنے کی صورت میں اس کے خاندان کی حفاظت کے لئے صرف ایک قلعہ سے زیادہ دینے پر راضی نہ ہوسکا۔

ان مطالبات نے شہنشاہ کو عجیب کشمکش میں ڈال دیا۔ وہ پیشوا کو دکن پر سردش پانڈے کا اختیار دینے اور اس طرح نظام اور اس کے درمیان مخاصمت کو ہوا دینے کے لئے تو تیار تھا لیکن وہ تمام وکمال دکن اس کے حوالے کرنے پر رضا مند نہ تھا۔ اس تمام عرصہ میں مستقل طور پر نظام الملک کی طرف سے شہنشاہ کو روزانہ مراسلات وصول ہوتے رہے جن میں شہنشاہ سے ثابت قدم رہنے اور مرہٹوں کے خلاف اس کی مدد کرنے کی استدعا کی گئی تھی۔ مالوہ اور گجرات کو مرہٹوں سے بچانے کی کچھ نہ کچھ امید شہنشاہ کے رجحانات پر اثر انداز ہوئی اگرچہ شہنشاہ دیر تک ایک ارادہ پر کبھی قائم نہ رہتا تھا۔ بہرحال باجی راؤ کے مطالبات حد سے زیادہ متجاوز تھے اور انہیں مطالبات نے شہنشاہ کو جنگ کے حامی گروہ اور نظام الملک کی طرف راغب کردیا۔ باجی راؤ مالوہ میں مئی کے آخر تک اپنے مطالبات کے جوابات کے انتظار میں وقت گنواتا رہا اور پھر بالآخر دوسرے سال اپنے مطالبات کو منوانے یا سلطنت کے اندر داخل ہوکر جنگ کرنے کے ارادے سے مہاراشٹر لوٹ گیا۔

خان دوراں باجی راؤ کے شہنشاہ کے حضور میں آنے اور اس کی ملازمت سے وابستہ

ہو جانے میں بہت دلچسپی رکھتا تھا اور اس نے دوسرے سال بھی اس کو آنے کی دعوت دی۔ اس نے یقین دلایا کہ اجین کے مقام پر اخراجات کے پانچ لاکھ کی پہلی قسط ادا کی جائے گی اور آگرہ میں اسے جے سنگھ اور میر خاں ملیں گے جو اسے شہنشاہ سے کسی سواری کے دوران (یعنی دربار میں نہیں) ملاویں گے۔ جے سنگھ نے پیشوا کو دستی خط لکھ کر بوندی اور خود اس کے علاقے پر فوج کشی نہ کرنے کی درخواست کی۔

دو آب پر مرہٹوں کے حملے : باجی راؤ شہنشاہ کو ناراض نہ کرنے اور اس کے اعزاز و احترام کو ٹھیس نہ لگانے یا مغل حکمران کی بجائے ہندو یا مرہٹہ حکمراں کو تخت نشین کرنے کا خواہش مند نہ تھا۔ اگرچہ مرہٹے اکثر ہندو۔ پد ۔ پادشاہی کی گفتگو کرتے تھے لیکن پیشوا یہ بھی جانتے تھے کہ وہ تیموریوں کو معزول کرکے اس کی جگہ کوئی مرہٹہ یا راجپوت حکمران مقرر نہ کرسکتے تھے کیونکہ ایسا کرنے سے ان کے خلاف پورا ہندوستان متحد ہو سکتا تھا۔ اس لیے پیشواؤں کا مقصد آل تیمور کو تاج و تخت کا مالک رکھ کر ان کی حشمت و جلال اور ان کے نام کی عظمت کے سائے میں پورے ہندوستان پر اپنا سیاسی تسلط قائم کرنا تھا۔ گویا باجی راؤ کے فوری مقاصد مالوہ اور بندیل کھنڈ پر اپنی فتوحات اور اس کے نواح پر اپنے قبضے کی شاہی توثیق و تصدیق حاصل کرنا اور شہنشاہ کی اجازت سے پورے دکن پر قابض ہونے کے علاوہ کچھ اور متفرق مطالبات بھی تھے۔ جو 1736ء میں پیش کیے گئے تھے۔ ایک قابل ذکر مطالبہ ایک خطیر نقد رقم کا تھا۔ جس کے ذریعہ پیشوا اپنے گرانقدر قرضوں کی ادائیگی کرسکے۔ لیکن ان مقاصد کا حصول اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک دربار میں "جنگ" کی حامی جماعت کی شکست یا معزولی نہ ہوجاتی۔ اس مقصد کے پیش نظر 1736ء میں دسہرہ کے دن پیشوا دکن سے روانہ ہوا تاکہ دوآب پر حملہ آور ہو کر شہنشاہ پر اپنی فوجی برتری کا مظاہرہ کرسکے۔

فروری 1737ء تک پیشوا آگرہ تک پہنچ چکا تھا دہلی میں جنگ کی حامی جماعت نے زبردست تیاریاں کر رکھی تھیں۔ دو فوجیں ایک قمر الدین خان اور دوسری خان دوراں کی سربراہی میں روانہ ہوئی تھیں۔ سعادت خان اور ابھے سنگھ کو آگرہ میں آکر مل جانا تھا۔ تب اس مشترک اور متحدہ فوج کو مرہٹوں کے خلاف فوج کشی کرنی تھی۔ محمد خاں بنگش بارہ ہزار سوار لے کر خان دوران کے ساتھ شامل ہو ہی چکا تھا۔

پیشوا کے لئے اس مہم کا آغاز کچھ سازگار نہ ہوا۔ دوآب میں مل کر یہ حملہ کرکے سعادت خاں نے مرہٹوں کو سخت نقصان پہنچا کر پیچھے پسپا کر دیا تھا۔ شاہی فوجیں آگرہ پر آکر ملنے والی تھیں اس لئے باجی راؤ کو تیزی سے اقدام کرنا تھا۔ ایک شدید حملہ کا فیصلہ کرکے وہ مغل افواج سے تیزی سے بچتا ہوا اچانک دہلی پہنچ گیا۔ اس کا مقصد شہنشاہ کو نقصان پہنچانا یا دہلی کو لوٹ کر خود کو دشمن ثابت کرنا نہ تھا بلکہ خود اس کے الفاظ کے مطابق وہ تورانیوں کے غرور کو توڑنا اور شہنشاہ کو اس کی طرف مائل کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرکے اور شہنشاہ کو تین روز تک اپنے رحم و کرم پر رکھ کر پیشوا واپس لوٹ گیا۔

باجی راؤ جنگ کی حامی جماعت کو شکست دینے کے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ شہنشاہ سعادت خاں پر نہایت غضبناک ہوا اور یہ کہا کہ اس کا ہولکر کے ساتھ جنگ کرنے میں جلدی کرنا ہی دہلی پر حملہ کا باعث ہوا۔ سعادت خاں نے یہ گزارش کی کہ اگر اس کو آگرہ مالوہ' گجرات اور اجمیر دے دیئے جائیں تو وہ مرہٹوں کی پیش قدمی کو روک دے گا لیکن اس کی اس مکرر یقین دہانی کو ٹھکرا دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ بغیر شہنشاہ کی ملاقات کا شرف حاصل کیے ہوئے اپنے منصبی عہدہ کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے روانہ ہو جائے۔ لیکن باجی راؤ شہنشاہ کو اپنے ساتھ امن قائم کرنے کے لئے مائل کرنے میں ناکام ہوگیا۔ اس کے حملہ سے ایک زبردست ہلچل اور بیداری پیدا ہوگئی۔ اب شہنشاہ امن کی پیش کشوں سے بیزار ہوکر نظام الملک کی عرض داشتوں کو سننے پر اور بھی مائل ہوگیا اور موخر الذکر کو دربار میں طلب کرنے کے فرمان جاری کر دیئے گئے۔

اس طرح باجی راؤ پھر اپنے پرانے حریف نظام کے مدمقابل آکر کھڑا ہوگیا۔ اب کسی بات کا اس وقت تک اقدام نہیں ہو سکتا تھا۔ جب تک کہ ان دو حریفوں کے مسئلہ کا مستقل طور پر فیصلہ نہ ہو جائے۔

بھوپال کی جنگ

نظام الملک شمالی ہندوستان کی طرف مرہٹوں کی نقل و حرکت کا بغور مطالعہ کر رہا تھا۔ وہ مرہٹوں اور دہلی دربار کے مابین طاقت کا ایک توازن قائم کرنا چاہتا تھا اور کبھی کبھی حکومت کے خلاف مرہٹوں کو بھڑکا کر اپنے لیے کچھ مہلت حاصل کرلینے سے بھی گریز نہ کرتا تھا۔ لیکن نظام الملک شمالی ہندوستان میں مرہٹوں کی طاقت کے استحکام کا خواہش مند تھا۔ 1735ء تک مرہٹوں نے اپنی کامیابی حاصل کرلی تھی کہ شمالی ہندوستان کے اہم علاقوں پر اپنا اثر قائم ہوتا نظر آنے لگا تھا۔ 1736ء کے معاہدہ سے نظام الملک ناخوش تھا کیونکہ اس کو خوف تھا کہ شہنشاہ اس کی قیمت پر مرہٹوں کی دوستی کو خرید سکتا ہے۔ اس کے یہ خدشات بے جا نہ تھے کیونکہ 1736ء کے معاہدہ میں پیشوا کو دکن کے چھ صوبوں میں سردیش پانڈے اور شاہی نائب حکمراں کو مقرر کنے کا حق دیا گیا تھا۔ اس لئے نظام دہلی دو مقاصد لے کر پہنچا اول دکن میں اپنا استحکام دوم شمالی ہندوستان اور دہلی دربار میں مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے اثرات کی روک تھام۔ اس کے علاوہ وہ اپنے لئے کچھ مزید مراعات بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر شاہی افواج کی مدد سے وہ مرہٹوں کو شکست دے سکتا تو وہ ہندوستان کا صحیح معنوں میں حکمران بن سکتا تھا۔

چنانچہ اب مرہٹوں اور نظام الملک کے درمیان کی کشمکش دراصل شمالی اور جنوبی ہندوستان پر تسلط کی کشمکش تھی۔ بہرحال باجی راؤ ان حالات سے پوری طرح باخبر تھا۔ لیکن خود اس کے لئے یہ جنگ شمالی ہندوستان سے زیادہ جنوبی ہندوستان پر تسلط جمانے کی جنگ تھی۔ اس نے اپنے بھائی چمنا جی کو بھوپال کی 1732ء کی جنگ کے موقع پر تحریر کیا کہ اگر ایک ایک مرہٹہ اس جدوجہد میں شامل ہوجائے تو فقط ایک متحد کوشش ہی ہم کو دکن کا خود مختار حکمران بنا سکتی ہے۔ اس کے خطوط میں یہ عبارت بار بار دہرائی گئی ہے کہ اگر نواب نظام الملک کا کوئی انتظام کرلیا جائے تو جنوبی ہند کو مکمل خطروں سے آزاد کرایا جاسکتا ہے۔

نظام الملک کے دہلی پہنچنے سے قبل اس کو مرہٹوں کو پسپا کر دینے کی شرط پر آگرہ اور مالوہ کا صوبہ دار مقرر کر دیا گیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مرہٹوں کے خلاف مہم کی کامیابی پر آلہ آباد گجرات اور اجمیر کے صوبوں کو نظام کے احباب اور اس کے نامزد لوگوں کو دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ بالکل واضح تھا کہ شہنشاہ کے لئے اب ان دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کے زیر اثر آئے بغیر چارہ نہ تھا جب تک کہ کوئی غیر متوقع موافق حالات بھی پیدا نہ ہو جائیں۔

نظام الملک 12 جولائی 1737ء کو دہلی پہنچا اس کا شاہانہ استقبال ہوا۔ ماہ اگست میں اسے باجی راؤ کی جگہ پر قانونی طور پر مالوہ کا صوبہ دار بھی مقرر کر دیا گیا۔ بارش ختم ہونے پر وہ مالوہ کی طرف بڑھا اس عزم مصمم کے ساتھ کہ مرہٹوں کے مرض کا پورا پورا علاج کر دیا جائے۔ اس کے پاس 30 ہزار فوج تھی اور بندیل کھنڈ اور راجپوتانہ کے ان حکمرانوں کے فوجی دستے بھی

تھے جو بادل ناخواستہ اس کے ساتھ شریک ہوگئے تھے۔

پیشوا نے اس کا مقابلہ 80 ہزار افواج سے کیا۔ نظام کو دکن سے اور سعادت خاں سے کمک ملنے کی توقع تھی۔ صفدر جنگ کی سربراہی میں ایک دستہ آکر ضرور شامل ہوگیا لیکن مرہٹہ افواج دکن کے دستوں کے نظام کے ساتھ شامل ہونے میں حائل ہوگئیں ان حالات میں نظام کی بھاری اسلحہ اور آہستہ آہستہ چلنے والی فوجیں مرہٹوں کی بھاری تعداد والی فوجوں سے گھر کر بھوپال میں محصور ہوکر رہ گئیں۔ اس سے قبل بھی یہ کہانی دہرائی گئی تھی کہ آہستہ چلنے والی شاہی فوجیں مرہٹوں کی تیز قدم اور ہلکے اسلحہ والی فوجوں کے خلاف کامیاب نہ ہوسکی تھیں۔ نظام کی حالت راجپوت مددگاروں پر شبہ کرنے سے اور بھی خراب ہوگئی۔

وہ صرف گھونگے یا کچھوے کی رفتار سے چل سکتا تھا اس سے زیادہ تیزی سے وہ آگے بڑھ نہیں سکتا تھا اور نہ میدان میں آکر لڑ ہی سکتا تھا اور اس کی رسد بھی ختم ہوتی جا رہی تھی دوسری جانب مرہٹے نظام کے زبردست اسلحہ کے سبب اس پر دھاوا بھی نہ بول سکتے تھے اس لئے گفت و شنید کا راستہ نکالا گیا اور بہت کچھ سودے بازی کے بعد 7 جنوری 1739ء کو نظام الملک مندرجہ ذیل شرطوں پر راضی ہوگیا۔

(1) (پیشوا کے لئے) مالوہ کی صوبہ داری اور اس پورے علاقہ کا اس کے لئے جاگیر تصور کیا جانا۔

(2) نربدا اور چنبل کے درمیان کے علاقہ کی خود مختاری اور سپردگی (مرہٹوں کے حق میں)

(3) نظام مندرجہ بالا شرائط کے لئے شہنشاہ سے توثیقی فرمان حاصل کرے اور جنگی اخراجات کے لئے 50 لاکھ کی کسی نہ کسی طرح فراہمی۔ نظام اپنے حالات کے مطابق اس رقم کو ادا کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ بشرطیکہ شہنشاہ ادا کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔

اس طرح بھوپال کے صلح نامہ کے بعد باجی راؤ نے 1736ء میں شہنشاہ کو پیش کی گئی اہم شرائط کی توثیق حاصل کرلی بجزان شرائط کے جن کا تعلق دکن سے تھا۔ مالوہ اور بندیل کھنڈ کو تو سپرد کر ہی دیا گیا اور وہ پچاس لاکھ جو باجی راؤ نے بنگال کے خزانے سے مانگے تھے۔ اب شہنشاہ کے ذمہ ان کو بھی کسی خزانے سے ادا کیا جانا تھا۔ مرہٹے اس سے بھی زیادہ مانگ سکتے تھے لیکن جیسا کہ باجی راؤ نے چمنا جی کو لکھا تھا۔ چونکہ نظام بھاری اسلحہ سے لیس تھا اور بندیلے اور راجپوت اس کے بڑی حد تک مددگار تھے میں نے تمہاری صلاح کو قبول کیا اور جن شرائط کو میں منوا سکتا تھا ان سے کم پر ہی راضی ہوگیا۔

حکومت کے سب سے زیادہ قوی اور باثر سپہ سالار کی شکست کے بعد یہ زیادہ ممکن اور غالب تھا کہ شہنشاہ خود مالوہ اور بندیل کھنڈ کی سپردگی پر خاموش ہوکر بیٹھ جاتا اور نظام الملک کے کئے ہوئے معاہدہ کو توثیق کر دیتا خصوصاً جب کہ جے سنگھ اور خان دوران اس قسم کے معاہدے کے لئے ایک مدت سے کوشاں تھے۔ لیکن اس کے بعد کیا صورت حال وجود میں آئی اس کا تصور ممکن نہیں ہے شاید باجی راؤ مالوہ کو مستقر بناکر دوآب پر حملہ آور ہونے کا منوبہ بنالیتا

یا شاید وہ شہنشاہ سے صلح کرلیتا اور اپنے منصوبوں کو دکن میں پورا کرنے کی کوشش کرتا یعنی دکن پر مکمل تسلط جمالیتا اور متعلقہ صوبوں کی نظامت کو بھی اپنی طرف منسوب کرا لیتا۔ اب جلد یا بہ دیر مکمل ہندوستان مرہٹوں کے تسلط میں آتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن اس ممکن و غالب صورت حال کو نادر شاہ کے حملہ نے ایک نئی سمت پر ڈال دیا یہ حملہ متعدد مشاہدین کی نظر میں قہر خداوندی سے کم نہیں تھا اس لیے کہ ہندوستان کی شمالی مغربی سرحدوں کو وہ مغل طاقت کے سبب ناقابل تسخیر سمجھے ہوئے تھے۔

نادر شاہ کا حملہ : مرہٹوں کے لئے نادر شاہ کا حملہ اس میدان میں دخل اندازی بن کر ثابت ہوا۔ جہاں پر مرہٹے اپنا تسلط جمانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اور نادر شاہ ہندوستان میں قیام پزیر ہو کر چغتائیوں کی جگہ کسی نئی نسل کی حکمرانی کی بنیاد ڈالنے والا تھا اور یہ افواہیں بھی تھیں کہ وہ خود کو شہنشاہ ہندوستان ہونے کا اعلان کر کے جنوبی ہند پر حملہ آور ہونے کا بھی ارادہ رکھتا تھا تو اس کا یہ منصوبہ مرہٹوں کے ارادوں کے لئے ایک صدمہ عظیم ثابت ہوتا اور نربدا سے آگے بڑھ کر ان کی نئی فتوحات کا راستہ رک جاتا۔ ان حالات میں ایک نئے طریقہ کار کی سخت ضرورت لاحق ہوگئی۔ شاہو نے باجی راؤ کو شہنشاہ کی کمک کے لئے جلد از جلد اقدام کرنے کی صلاح دی اور اورنگ زیب کو دی ہوئی اس ضمانت کے پیش نظر کہ جب کبھی شاہی حکومت کو خطرہ لاحق ہوگا ہم ضرور مدد کریں گے۔ راجپوتوں اور بندیلوں کی افواج کا پیشوا کی افواج سے اشتراک کا منصوبہ بھی زیر بحث آیا۔ ناصر جنگ کو خطوط لکھے گئے۔ لیکن مرہٹہ فوج باسین کے محاصرہ میں لگی ہوئی تھی راگھو جی بھونسلے اپنے ہی منصوبوں میں الجھا ہوا تھا۔ دابھاوے مفاہمت سے کترا رہا تھا اس لئے بغیر ایک بھاری فوج کے باجی راؤ نے اقدام کرنا نامناسب سمجھا۔

جب کہ پیشوا کی فوجیں باسین کے محاصرہ میں لگی ہوئی تھیں نادر شاہ ایران کو واپس چلا گیا۔ اس نے باجی راؤ کو ایک دھمکی آمیز خط لکھنے ہی پر اکتفا کیا اس کو مغل حکمراں کا فرمانبردار رہنے کا حکم دیا ورنہ وہ واپس آکر اس کی سرزنش کرے گا۔ باجی راؤ نے بہت سوچ بوجھ کا جواب دیا اور ایک سو ایک مہر بطور نذر کے بھجوا دیں۔

نادر شاہ کے حملے نے دنیا کی نظروں میں مغل سلطنت کی کمزوری کا پردہ فاش کر دیا اور مرہٹے تو ایک مدت سے اس کمزوری سے باخبر ہو ہی چکے تھے لیکن اس سے مواخر الذکر کی نظر میں بیرونی حملہ کے خدشے کے امکان کا ضرور احساس ہو گیا۔ اس کے سبب سے باجی راؤ نے ایک دلچسپ تجویز سامنے رکھی۔ اس نے تجویز کیا کہ تمام امراء چاہے بڑے ہوں یا چھوٹے وہ سب اپنی فوجوں کو ایک وفاق کی صورت میں ملا کر تیموری حکومت کو ایک بہتر تنظیم کی صورت دیں اور دشمن یعنی بیرونی حملہ آور کا مقابلہ کریں۔ محمد خان بنگش ان امراء میں تھا جس کے سامنے یہ تجویز رکھی گئی۔ باجی راؤ مالوہ تک پہنچا اور اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ شہنشاہ سے ملنے کے لئے آیا ہوا تھا۔ اس نے محمد خان کو یہ بھی اطلاع دی کہ جادو رائے کو شہنشاہ کے پاس بھیج دیا گیا تھا اور اب وہ امراء میں اختلاف کے ختم کیے جانے کی تجویز کے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسا کہ متوقع

تھا کہ باجی راؤ کے منصوبے کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی مرہٹوں کی جانب سے ایک نئے سیاسی طریقہ کار کا آغاز ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ باجی راؤ کو شہنشاہ کی مفاہمت اور اس کے وزراء شمالی ہند کے اور سربرآوردہ امراء کی مدد کی شمالی مغربی سرحد کی حفاظت کے پیش نظر ضرورت کا حساس ہوچلا تھا اس کے منطقی نتیجہ کی روشنی میں یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ پیشوا کی رہنمائی میں اس نئے طریقہ کار میں ایک فوجی وفاق کا قیام عمل میں آنا تھا اس میں شامل طاقتوں کی بہت کچھ خود مختاری کی تجویز بھی شامل تھی اور ساتھ ہی ساتھ اتحاد کی علامت اور بیرونی حملہ کے خطرہ کے دفاع کے مرکز کے طور پر تیموری شہنشاہیت کو باقی رکھنا بھی تھا۔ اس طرح کے قدیمی اتحاد اور علاقائی آزادی کے مابین ایک توازن کے پیدا کیے جانے کی کوشش کی جارہی تھی۔

مالوہ اور بندیل کھنڈ کی مکمل سپردگی : نادر شاہ کے حملے کے بڑے دور میں نتائج نکلے جس سے دربار کے مختلف گروہ اثر و رسوخ کے اعتبار سے بدلنے لگے۔ سعادت خاں جو کہ مرہٹہ دشمن جماعت کے عمائدین میں سے نہایت اہم تھا دنیا سے رخصت ہوچکا تھا اور نظام الملک اور قمر الدین خاں دونوں محمد شاہ کی نظروں سے گر چکے تھے۔ نظام الملک نے دربار کو خیرباد کہا اور اس نے دوبارہ مرہٹوں سے مفاہمت کرلی۔ مخالف گروہ میں خان دوراں بھی مارا جاچکا تھا۔ اب پرانے امراء میں سے صرف جے سنگھ سوائی ہی اہم ترین رہ گیا تھا۔ 1741ء میں اس کے مشورے سے مرہٹوں کے ساتھ صلح کرلی گئی لیکن اس سے قبل شہنشاہ نے مالوہ اور گجرات کو واپس لینے کی ایک آخری کوشش اور کی اس سے نئے پیشوا بالاجی راؤ کی طرف سے ایک نئے حملے کا مزید خدشہ پیدا ہوگیا۔

جے سنگھ کی وساطت سے جو شرائط آخری طور پر مرہٹوں کے ساتھ طے پائیں وہ تقریباً وہی تھیں جو 1736ء و 1738ء میں باجی راؤ نے پیش کی تھیں۔ مالوہ حوالے کر دیا گیا۔ اگرچہ شہنشاہ کے وقار کو بچانے کے لئے اس کو صرف اس صوبے کی نائب صوبے داری سے تعبیر کیا گیا گویا کہ اس صوبہ کا صوبہ دار شہنشاہ کی طرف سے مقرر کردہ شہزادہ تھا جو صرف رسمی طور پر صوبہ دار تھا۔ پیشوا کے منصب میں تمام فوجداری یعنی اس صوبہ پر مکمل اختیارات اور اس کی تمام ریاستوں پر بھی اختیارات شامل تھے۔ چنبل کے جنوب کی تمام ریاستوں سے چوتھ وصول کرنے کے اختیارات بھی قبول شدہ معلوم ہوتے ہیں۔ پیشوا کے 50 لاکھ نقد کے مطالبہ کے عوض بنگال۔ بہار اور اڑیسہ کی چوتھ بھی اس کے سپرد کر دی گئی۔ دکن کے سلسلے میں کسی معاہدہ کا پتہ نہیں چلتا شاید اس لئے کہ نظام الملک اور پیشوا دوبارہ اچھے تعلقات قائم کرچکے تھے۔ 50 لاکھ کی نقد رقم پیشوا قسطوں میں دی جاتی تھی اس کے بدلے میں پیشوا نے یہ تحریری ضمانت دی۔

(1) یہ کہ وہ شہنشاہ سے ملاقات کرے گا۔

(2) یہ کہ مرہٹے نربدا کے پار نہیں آئیں گے اور اگر کسی گروہ نے ایسا کیا تو وہ خود ذاتی طور پر اس کے لئے ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔

(3) یہ کہ مالوہ کے علاوہ کسی اور صوبہ میں بدامنی کی صورت پیدا کی جائے گی۔

(4) یہ کہ منظور شدہ رقم سے زیادہ مستقبل میں کوئی مزید رقم نہ مانگی جائے گی۔
(5) یہ کہ ایک مرہٹہ سپہ سالار 500 سواروں کے ساتھ شہنشاہ کی خدمت کے لئے مقرر کیا جائے گا۔
(6) اور یہ کہ وہ 4 ہزار نفر کی فوج لے کر ہر شاہی مہم میں شریک ہوگا اور اگر اس سے زیادہ کی کمک طلب کی گئی تو اس کا نقد معاوضہ دیا جائے گا۔

ان شرائط کے پیش نظر شہنشاہ اور پیشوا کے درمیان ایک قسم کا تعلق و اتحاد تصور کیا جاسکتا ہے۔ مرہٹوں کو دکن میں پوری آزادی دے دی گئی تھی اور اس کے بدلے میں شہنشاہ کے شمالی علاقوں میں بدامنی پیدا نہ کرنا بلکہ ضرورت میں اس کو کمک پہنچانا شامل تھا (بشرطیکہ کسی غیر ملکی حملہ کا خدشہ ہو) اس کے بعد سے ایک معتبر اور معتمد مرہٹہ ترجمان مہادیو بھٹ ہنگا نے دہلی دربار میں رہنے لگا اور شاہی سیاسیات کا ایک بااثر جزو بن گیا۔

مرہٹوں کو آخری طور پر مالوہ اور بندیل کھنڈ کے سپرد کیا جانا مغل مرہٹہ تعلقات کا ایک مرحلہ ختم کر دیتا ہے اور اس کے بعد سے ایک ہی نئے عہد کا آغاز ہوتا ہے جب کہ مرہٹوں نے ہندوستان میں اختیار کلی حاصل کرنے کی کوشش شروع کی۔

باب 9

انگریزوں کا زمانہ (یورپین اقوام کی آمد)

واسکو ڈے گاما: قدیم زمانے سے ہندوستان اور یورپ کے درمیان تجارت کا سلسلہ رہا ہے یہ تجارت زیادہ تر بحیرہ قلزم کے راستہ سے ہوا کرتی تھی۔ لیکن پندرھویں صدی میں جب اس راستہ پر ترکوں کا قبضہ ہوگیا۔ تو یہ تجارت یورپ والوں کے لئے تقریباً بند ہوگئی۔ اس لئے اہل یورپ کو یہ دھن سمائی کہ وہ ہندوستان پہنچنے کے لئے کوئی اور راستہ دریافت کریں جو ترکوں کی دست برد سے محفوظ ہو۔ اسی دھن میں کولمبس 1492ء میں امریکہ جا پہنچا۔

1498ء میں واسکو ڈے گاما : جو پرتگال کا ایک جہاز ران تھا۔ راس امید کا چکر کاٹ کر کالی کٹ کی بندگارہ پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ اور اس طرح ایک نیا راستہ دریافت ہوا۔ جسے راس امید کا راستہ کہتے ہیں۔ واسکو ڈے گاما نے کالی کٹ کے ہندو راجہ سے جو زمورن کہلاتا تھا۔ پرتگیزوں کے لئے تجارت کرنے کی اجازت حاصل کرلی۔

پرتگیز : چونکہ راس امید کا راستہ پرتگیزوں نے دریافت کیا تھا۔ اس لئے یورپین اقوام میں سب سے پہلے پرتگیز ہی ہندوستان میں آئے۔ اور انہوں نے مغربی ساحل پر کئی تجارتی کوٹھیاں (کالی کٹ ۔ کوچین۔ کنا نور) قائم کرلیں۔ 1502ء میں واسکو ڈے گاما دوبارہ آیا اور 1503ء میں واپس پرتگال چلا گیا۔

پرتگیزوں کا پہلا وائسرائے فرانسکو المیڈا تھا۔ وہ فتوحات کا خواہشمند نہ تھا۔ بلکہ اس کی پالیسی یہ تھی۔ کہ پرتگیزوں کو ہندوستانی سمندروں پر تسلط قائم کرنا چاہیے۔ اس نے عرب سوداگروں کو جو ان دنوں ہندوستان کے ساتھ تجارت کیا کرتے تھے۔ شکست فاش دی۔ اور اس طرح سے ہندوستان کی ساری تجارت پرتگیزوں کے قبضہ میں آگئی۔ مسلمان تاجروں سے ان کا سلوک بڑا ظالمانہ تھا۔ 1509ء میں المیڈا کے قتل کے بعد البوقرق وائسرے مقرر ہوا۔ وہ پرتگیزوں کا قابل ترین وائسرائے تھا۔ اس نے ہندوستان میں پرتگیزی سلطنت قائم کرنے کا خیال کیا۔ چنانچہ اس نے 1510ء میں گوا فتح کرکے اسے صدر مقام بنایا۔ اس کے بعد اس نے کئی اور مقامات پر بھی قبضہ کرلیا۔ اس نے گوا کا انتظام نہایت قابلیت سے کیا اور اشاعت تعلیم کے لئے مدرسے قائم کئے اور رسم ستی کو بھی ختم کر دیا۔(1962ء میں پنڈت نہرو نے گوا کا الحاق ہندوستان سے کیا)۔

البوقرق کے بعد بھی فتوحات کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور سولھویں صدی کے آخر تک پرتگیزوں کی سلطنت مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ سینکڑوں میلوں میں پھیل گئی۔ لیکن پرتگیزوں کی حکومت کوئی سو سال تک ہی قائم رہی۔ اور پھر اسے زوال آگیا۔

البوقرق بڑا ہمدرد انسان تھا۔ اس کی پالیسی یہ تھی کہ قلعے تعمیر کرنے کی بجائے وہ مقامی

باشندوں کو خراج پر آمادہ کرلیتا تھا۔ انتظامی اور عسکری صلاحیتیں اس میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ وہ ناکامیوں سے مایوس نہ ہوتا بلکہ اور زیادہ مستعدی سے حالات کو اپنے حق میں کرنے کی تیاری کرتا۔ وہ ایک ماہر سیاستدان بھی تھا۔ 1515ء میں گوا میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کی موت پر مقامی لوگوں اور پرتگیزوں نے بہت زیادہ اظہار افسوس کیا۔

اس کی وفات کے بعد 1534ء میں پرتگالیوں نے "دیو اور بسین" پر قبضہ کرلیا۔ 1538 میں "دمن" فتح ہوا۔ اسی سال انہیں گوا میں فیکٹری بنانے کی اجازت مل گئی۔ 1545ء میں گجرات کے حکمران نے دیو کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا لیکن وہ ناکام رہا۔ 1517ء میں بیجاپور، احمد نگر اور کالی کٹ کی متحدہ فوجوں نے پرتگالیوں پر حملہ کردیا۔ لیکن وہ ان سے گوا کو چھڑانے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔

پرتگالیوں کے لئے ساز گار حالات

1۔ پرتگیزوں نے ساحل مالا بار کے چھوٹے چھوٹے شہزادوں سے تعلقات قائم کرلئے۔ جو آپس میں ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے۔
2۔ کوچین اور کالی کٹ کے نواحی علاقے کم زرخیز تھے۔ اس لئے مقامی اقوام کمزور ہونے کی وجہ سے پرتگیزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا مقابلہ نہ کرسکتی تھیں۔
3۔ پرتگیزوں کو سمندری معاملات میں برتری حاصل تھی۔ اپنے ملک میں پرتگالی شہزادہ ہنری (پیدائش 1393ء) نے ملاحوں کی تربیت کے لئے باقاعدہ سکول کھولے تھے اور فن جہاز رانی میں دلچسپی لینے والوں کی بہت حوصلہ افزائی کی تھی۔ چنانچہ ساحل افریقہ کے نشیب و فراز سے وہ جلدی ہی واقف ہوگئے۔ اور 1471ء میں وہ خط استوا پار کرگئے حتیٰ کہ 1481ء میں دریائے کانگو میں اپنی کشتیاں ڈال دیں۔ 1487ء میں ایک پرتگیز جہاز ران "بارتھو لو میوڈ یاز" ایک زبردست سمندری طوفان کی وجہ سے مغربی افریقہ کے ساحل کا چکر کاٹ کر راس امید تک پہنچنے میں کامیاب ہوچکا تھا۔ بعد میں 1497ء میں شہنشاہ عمانویل کی سرپرستی میں واسکوڈے گاما۔ بارتھو لومیوڈیاز کی تقلید میں راس امید کو پار کرکے موزمبیق تک جا پہنچا اور پھر عرب جہاز رانوں کی مدد سے 1498ء میں ہندوستان کی بندرگاہ کالی کٹ پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس طرح پرتگیزوں کی بحریہ سرد و گرم چشیدہ تھی اور بڑی سے بڑی مشکل کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھی۔

زوال : سترھویں صدی کے شروع میں اسے زوال آنا شروع ہوا جس کے اسباب کچھ اس طرح ہیں۔

1۔ پرتگیزی افسر بڑے مغرور اور جابر تھے۔ اور ان کا سلوک اپنی رعایا کے ساتھ بہت برا تھا۔
2۔ وہ اپنی رعایا کو زبردستی عیسائی بناتے تھے اور خاص کر مسلمانوں سے بہت نفرت کرتے تھے۔

3۔ یہ لوگ بحری قزاق بھی تھے اور ہندوستانی جہازوں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ اسکے علاوہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو اغوا کرکے لے جاتے تھے۔ اور انہیں غلام بناکر فروخت کرتے تھے۔

4۔ 1580ء میں پرتگال اور اسپین کا اتحاد ہوگیا۔ اسپین اس وقت یورپین جنگوں میں مشغول تھا۔ اس کے علاوہ اس نے امریکہ میں اپنی کئی بستیاں قائم کر رکھی تھیں۔ چنانچہ پرتگال کو اپنا مفاد سپین کی خاطر قربان کرنا پڑا۔ اس کی مالی حالت بگڑ گئی۔ اور وہ ہندوستانی مقبوضات کو اپنے قابو میں نہ رکھ سکا۔

5۔ ریاست وجے نگر کی تباہی سے بھی پرتگیزی طاقت کو دھچکا لگا۔ کیونکہ اس ریاست کے ساتھ پرتگیزوں کی تجارت تھی۔

6۔ پرتگال ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ یہ صورت اتنی مدت ہی فوقیت رکھ سکتا تھا۔ جب تک مقابلے میں کوئی حریف نہ تھا۔ جب ولندیز اور انگریز وغیرہ آگئے۔ تو پرتگال ان کا مقابلہ نہ کرسکا۔ اور رفتہ رفتہ پرتگیزوں کی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔

دوسرے لفظوں میں ہسپانیہ سے پرتگال کے الحاق نے جو ہسپانیہ کے والی فلپ ثانی کے عہد میں 1580ء میں وقوع پذیر ہوا۔ پرتگال کی حیثیت ایک طرح سے ختم کرکے رکھ دی کیونکہ ہسپانیہ بھی بڑی تیزی سے زوال پذیر تھا۔ 1604ء میں پرتگیزوں کو ولندیزوں نے "امبوائینا" سے نکال دیا۔ 1662ء میں ایرانیوں نے "ہرمز" پر قبضہ کرلیا۔ 1631ء میں شاہجہان بادشاہ نے بنگال میں پرتگیزوں کی سرکوبی کی اور انہیں سختی سے دبا دیا۔ ولندیزوں نے 1640ء میں "لنکا" بھی دے بیٹھے۔ پھر 1739ء میں مرہٹوں نے بسین بھی ان سے چھین لیا۔ اور اٹھارہویں صدی کے وسط تک صرف تین تجارتی مراکز یعنی گوا' دمن اور دیو پر ان کا قبضہ تھا۔ بعد میں جن کی آبادی 40-1939ء میں 5 لاکھ تھی۔ پرتگیز ناکام اس لئے بھی ہوئے کہ البوقرق کے جانشین نااہل تھے۔ انتظامی امور سے نابلد تھے۔ اور ان کی مذہبی پالیسی بھی متعصبانہ تھی کیونکہ وہ غیر عیسائی رعایا سے برا سلوک کرتے۔ زبردستی عیسائی بناتے حتی کہ 1540ء میں پرتگیزوں نے گوا میں مقامی لوگوں کی ساری عبادت گاہیں مسمار کر دی تھیں۔ ادھر مغل راج کے قیام نے بھی ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا پھر انگریزوں کی ہندوستان میں آمد سے معاملہ مزید بگڑ گیا۔ ایشیائی اقوام میں شادیاں کرنے سے بھی ان کی نسل زوال کا شکار ہوگئی اور مخلوط سی نسل اپنے اقتدار کو سنبھالنے سے قاصر رہی۔

مسلمان جہاز رانوں سے انہیں پرخاش رہی۔ وہ انکے جہاز لوٹ لیتے ان کی عورتیں اور بچے غلام بنالیتے۔ اور جبراً عیسائی بناکر انہیں بیچ دیتے چنانچہ شاہجہان نے ان کو ہگلی سے نکالا جب کہ اورنگ زیب عالمگیر نے ان کو چاٹگام اور جنوبی بنگال سے نکال باہر کیا۔

ڈچ یا ولندیز

(The rise and fall of the Dutch in the East)

(مشرق میں ڈچ لوگوں کی ترقی اور زوال کا حال)

اہل ہالینڈ کو ڈچ یا ولندیز کہتے ہیں۔ انہوں نے بھی پرتگیزوں کی ترقی کو دیکھ کر 1602ء میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی بنا کر ہندوستان سے تجارت کرنی شروع کر دی۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں پرتگیزوں کو ہندوستانی سمندروں سے نکال دیا۔ لیکن ڈچ لوگوں کا اصلی مدعا گرم مصالحہ کے جزیروں پر قبضہ کرنا تھا۔ کیونکہ ان دنوں گرم مصالحوں کی تجارت بڑی نفع بخش تھی۔ چنانچہ انہوں نے جزیرہ جاوا کو فتح کرکے "بٹیویا" کو مشرقی مقبوضات کا صدر مقام قرار دیا۔ اور جلدی ہی ان جزیروں سے اپنے تمام حریفوں کو نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔

ہندوستان میں بھی انہوں نے کئی تجارتی کوٹھیاں قائم کر رکھی تھیں۔ اور دریائے ہگلی کے کنارے چنسرا ان کی تجارت کا بڑا مرکز تھا۔ مگر یہاں انگریزوں کے مقابلہ میں ان کی کوئی پیش نہ گئی۔ اور رفتہ رفتہ ان کے تمام مقبوضات چھن گئے۔ 1759ء میں انگریزوں نے چنسرا بھی فتح کر لیا۔ اور ولندیزوں کی طاقت کا خاتمہ ہوگیا۔ مگر مجمع الجزائر شرق الہند پر ان کا قبضہ برقرار رہا۔

تبصرہ : پرتگیز اور ولندیز دونوں قومیں مشرق میں باہمی دوست بن کر آئیں۔ جو پروٹسٹنٹ عقیدہ رکھتی تھیں۔ جبکہ ہسپانیہ کیتھولک خیال کا حامی تھا۔ ولندیز ملایا کے جزائر میں اپنی اجارہ داری مستحکم کرنے کے خواہشمند تھے۔ چنانچہ انہوں نے 1623ء میں "امبوائینا" میں مقیم انگریزوں کو قتل کردیا اور انہیں وہاں سے نکال دیا۔ اگرچہ کرامویل کے زمانے میں ولندیزی حکومت نے انگریزوں کو بطور "خوں بہا" پچاسی ہزار پونڈ ادا کر دیئے۔ ولندیزوں نے پرتگالیوں سے 1641ء میں ملاکا چھینا۔ اور 1685ء میں لنکا بھی چھین لیا۔ اور اس طرح انہوں نے نیکا پٹم، چنسرا، قاسم بازار اور پٹنہ میں تجارتی کوٹھیاں قائم کرلیں۔ لیکن انگریزوں کی آمد کے بعد ولندیزوں نے اپنے کاروبار آہستہ آہستہ انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دیئے اور خود نقل مکانی کر گئے۔

ولندیزوں کا مقصد چونکہ گرم مصالحہ جات علاقوں پر قبضہ کرنا تھا اس لئے اپنا مقصد حاصل کرنے کے بعد وقتی مفاد کے پیچھے پڑے رہے۔ اور جب ان کو اپنا کاروبار انگریزوں کے ہاتھ بیچنا بھی مفاد کا سودا محسوس ہوا تو سب کچھ بیچ کر کنارا کر گئے۔ لہٰذا ان کی حیثیت انڈیا میں اکثر و بیشتر غیر مستحکم ہی رہی۔

انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کا عروج

(The growth of the English East India Company till the end of the 17th Century.)

سترھویں صدی کے خاتمہ تک انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے عروج کا مختصر حال

1588ء میں انگلینڈ نے سپین کے جنگی بیڑے کو شکست فاش دی تھی۔ جس سے انگریزوں کی بحری طاقت بہت بڑھ گئی۔ اور انہوں نے بھی مشرقی ممالک کے ساتھ تجارت کا ارادہ کیا۔ چنانچہ 1600ء میں لنڈن کے کچھ تاجروں نے مل کر ملکہ الزبتھ سے اجازت لے کر انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی۔

شروع شروع میں اس کمپنی نے گرم مصالحہ کے جزیروں پر قبضہ جمانا چاہا۔ لیکن وہاں ڈچ لوگوں کے مقابلہ میں ان کی کوئی پیش نہ گئی۔ اس لئے مجبوراً" انہیں ہندوستان کا رخ کرنا پڑا۔ مگر یہاں پر تگیزوں نے ان کی سخت مخالفت کی۔

1608ء میں کیپٹن ہاکنس جہانگیر کے دربار میں آیا۔ اور اس نے سورت کے مقام پر تجارتی کوٹھی قائم کرنے کی اجازت حاصل کی۔ لیکن پر تگیزوں کی چالبازیوں سے یہ اجازت منسوخ ہوگئی۔ 1612ء میں انگریزوں نے پر تگیزوں کو سورت کے نزدیک سوالی کی بحری لڑائی میں شکست فاش دی۔ اور ان کے اقتدار کا خاتمہ کردیا۔

1615ء میں سرٹامس رو بادشاہ انگلستان کا سفیر بن کر جہانگیر کے دربار میں آیا۔ وہ کوئی تین سال یہاں رہا۔ اور اس نے کمپنی کے لئے بہت سے تجارتی حقوق حاصل کئے۔

1639ء میں کمپنی نے چندرگری کے راجہ سے کچھ زمین مول لے کر مدراس شہر کی بنیاد ڈالی۔ اور وہاں قلعہ سینٹ جارج تعمیر کرایا۔ یہ قلعہ سرزمین ہند پر انگریزوں کی سب سے پہلی ملکیت تھی۔

اس کے بعد ڈاکٹر باٹن نے شاہجہان کی لڑکی کا علاج کرکے کمپنی کے لئے بنگال میں بلا محصول تجارت کرنے اور تجارتی کوٹھیاں کھولنے کی اجازت حاصل کی۔ چنانچہ ہگلی اور دیگر مقامات پر انگریزوں نے تجارتی کوٹھیاں قائم کرلیں۔

1668ء میں چارلس دوم نے بمبئی کا شہر جو اسے اپنی شادی کے وقت (1661ء میں) شاہ پرتگال کی طرف سے جہیز میں ملا تھا۔ دس پونڈ سالانہ کرائے پر کمپنی کو دے دیا۔ اس کے علاوہ اس نے کمپنی کا اپنا سکہ چلانے۔ اپنے بچاؤ کے لئے قلعے بنوانے اور بوقت ضرورت لڑائی لڑنے وغیرہ کا بھی اختیار دے دیا۔

1690ء میں انگریزوں نے دریائے ہگلی کے کنارے شہر کلکتہ کی بنیاد ڈالی۔ اور سُوتی

چھ سال بعد وہاں اپنے بادشاہ کے نام پر فورٹ ولیم نام کا قلعہ بنوایا۔

1698ء میں انگلینڈ کے کچھ تاجروں نے ایک نئی کمپنی بنالی۔ یہ دونوں کمپنیاں کچھ عرصہ تو ایک دوسرے کا مقابلہ کرتی رہیں۔ مگر آخر کار 1708ء میں آپس میں متحد ہوگئیں۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اس متحدہ کمپنی نے ہندوستان میں انگریزی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ 1857ء کے بعد اس کمپنی کا خاتمہ کردیا گیا۔

برصغیر میں فرانسیسی ایسٹ انڈیا کمپنی کا حال

دوسرے ملکوں کی دیکھا دیکھی فرانسیسیوں نے بھی 1664ء میں ایک تجارتی کمپنی قائم کی۔ اور جلد ہی مسولی پٹم اور سورت میں تجارتی کوٹھیاں قائم کرلیں۔ 1674ء میں انہوں نے پانڈیچری کی بنیاد ڈالی۔ اور اسے اپنا صدر مقام بنایا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ انہوں نے اور کئی مقامات حاصل کیے۔

1735ء سے 1741ء تک ایک شخص ڈیوما فرانسیسی مقبوضات کا گورنر رہا۔ اور اس نے فرانسیسی طاقت کو خوب مضبوط کیا۔ اس کا جانشین ڈوپلے ایک بڑا لائق اور دور اندیش مدبر تھا اس کے زمانہ میں باہمی رقابت کی وجہ سے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ جس میں انجام کار انگریز کامیاب ہوئے اور فرانسیسی اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔ لیکن 40-1939ء تک (بلکہ آزادی حاصل کرنے تک) مندرجہ ذیل پانچ مقامات فرانسیسیوں کے قبضہ ہی میں تھے۔

(1) ماہی (2) کاریکل (3) پانڈیچری (4) ینانون (5) چندر نگر۔

انگریزوں اور فرانسیسیوں میں باہمی کش مکش

(The struggle between the English and the French for Empire in India in the eighteenth centrury)

کش مکش کی وجہ : انگریزی اور فرانسیسی کمپنیاں ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کی غرض سے قائم ہوئی تھیں۔ لیکن جب انہوں نے سلطنت مغلیہ کی کمزوری کو دیکھا۔ تو ہر دو نے اپنی اپنی سلطنت قائم کرنی چاہی۔ اس خواہش کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ جو تقریباً بیس سال تک رہی۔ اس میں انجام کار انگریزوں کو فتح ہوئی۔ جنگ کا یہ سلسلہ تین حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ جنہیں کرناٹک کی تین لڑائیاں کہتے ہیں۔

کرناٹک کی پہلی جنگ 1746ء سے 1748ء : 1744ء میں یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان آسٹریا کی تخت نشینی کی جنگ چھڑ گئی۔ جس کی وجہ سے ہندوستان میں بھی ان دونوں حریفوں کی لڑائی شروع ہو گئی۔

واقعات : 1746ء میں فرانسیسی بیڑے نے مدراس فتح کر لیا۔ اور اس کے بعد فرانسیسیوں نے فورٹ سینٹ ڈیوڈ کو لینے کی کوشش کی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اتنے میں انگلینڈ سے کمک آ پہنچی۔ اور انگریزوں نے پانڈیچری پر حملہ کیا۔ لیکن سخت نقصان اٹھا کر پسپا ہوئے۔ چنانچہ 1748ء میں یورپ میں صلح نامہ "ایکس لا شاپل" ہو گیا۔ جس سے ہندوستان میں بھی لڑائی بند ہو گئی۔ اور مدراس انگریزوں کو واپس مل گیا۔

کرناٹک کی دوسری جنگ 1749ء سے 1755ء : وجہ۔ 1748ء میں نظام الملک آصف جاہ والئے حیدر آباد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے ناصر جنگ اور اس کے نواسے مظفر جنگ میں تخت نشینی کے لئے جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ عین اس وقت کرناٹک کی گدی کے لئے بھی جھگڑا شروع ہو گیا۔ چندا صاحب جو کرناٹک کے سابقہ نواب کا داماد تھا۔ انور الدین نواب کرناٹک کے مقابلہ میں تخت کا دعوے دار بن بیٹھا اور ڈوپلے نے ان حالات سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اس نے مظفر جنگ اور چندا صاحب کی مدد کرنا منظور کیا۔

واقعات : 1749ء میں مظفر جنگ۔ چندا صاحب اور فرانسیسیوں نے مل کر انور الدین کو امبر کے مقام پر شکست دی۔ انور الدین لڑائی میں مارا گیا۔ اور اس کا بیٹا محمد علی بھاگ کر ترچنا پلی میں پناہ گزین ہوا۔ چندا صاحب فرانسیسیوں کی مدد سے کرناٹک کا نواب ہو گیا۔

فرانسیسیوں کے اقتدار کو اس طرح بڑھتے دیکھ کر انگریزوں نے فریق مخالف یعنی ناصر جنگ اور محمد علی کو مدد دینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن حیدر آباد میں بھی فرانسیسیوں کو ہی کامیابی ہوئی۔ جنگ کے دوران میں ناصر جنگ اور مظفر جنگ دونوں مارے گئے اور فرانسیسی جرنیل بسے نے ناصر

جنگ کے ایک بھائی صلابت جنگ کو نظام بنا دیا اور خود اس کی نگہبانی کے لئے حیدر آباد میں رہا۔ نئے نظام نے شمالی سرکار کا علاقہ فرانسیسیوں کو دے دیا۔

اس وقت سارے دکن میں فرانسیسی اقتدار عروج پر تھا۔ اور انگریزوں کی حالت بڑی نازک تھی۔ لیکن لارڈ کلائیو نے ایک تدبیر سے جنگ کا رخ بالکل پلٹ دیا۔ اور ڈوپلے کے منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ اس وقت چندا صاحب اور فرانسیسیوں نے محمد علی کو ترچناپلی میں گھیر رکھا تھا اور اس کے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ کلائیو نے اس نازک موقعہ پر غیر معمولی دور اندیشی کا ثبوت دیا۔ چندا صاحب کی توجہ ترچناپلی کے محاصرہ سے ہٹانے کے لئے اس نے پانچ سو سپاہیوں کی ایک مختصر سی فوج کو ساتھ لے کر چندا صاحب کی راجدھانی ارکاٹ پر 1751ء میں قبضہ کرلیا۔ جب چندا صاحب کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے اپنے بیٹے رضا صاحب کے ماتحت ایک کثیر فوج روانہ کی۔ جس نے ارکاٹ کا محاصرہ کرلیا۔ کلائیو 53 دن تک مقابلے پر ڈٹا رہا۔ اتنے میں انگریزی کمک آپہنچی۔ رضا صاحب کو محاصرہ اٹھانا پڑا۔ کلائیو نے آگے بڑھ کر ترچناپلی کے مقام پر چندا صاحب کو شکست دی۔ چندا صاحب بھاگ نکلا۔ اور قتل ہوگیا۔ انگریزوں نے محمد علی کو نواب کرناٹک بنا دیا۔ اس ناکامی کے بعد فرانسیسی سرکار نے ڈوپلے کو واپس بلا بھیجا۔

نتیجہ۔ 1755ء میں عہد نامہ پانڈیچری کی رو سے دونوں کمپنیوں میں صلح ہوگئی۔ ایک دوسرے کے مفتوحہ علاقے واپس کر دیئے گئے اور محمد علی کو نواب کرناٹک تسلیم کرلیا گیا۔

کرناٹک کی تیسری جنگ 1758ء سے 1763ء

وجہ : 1756ء میں یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ جو ہفت سالہ جنگ کے نام سے موسوم ہے۔ اس پر ہندوستان میں بھی ان دونوں حریفوں میں جنگ شروع ہوگئی۔

واقعات : فرانسیسی سرکار نے کونٹ ڈی لالی کو گورنر اور کمانڈر انچیف بنا کر بھیجا۔ وہ 1758ء میں ہندوستان پہنچا۔ اور اس نے آتے ہی فورٹ سینٹ ڈیوڈ پر قبضہ کر لیا۔ اور پھر مدراس کو فتح کرنے کے لئے اس نے فرانسیسی جرنیل بسے کو حیدر آباد سے بلا بھیجا۔ یہ اس کی ایک اہم غلطی تھی۔ کیونکہ بسے کی غیر حاضری میں انگریزوں نے شمالی سرکار کو فتح کرلیا۔ اور نظام صلابت جنگ بھی انگریزوں سے مل گیا۔ اس طرح دکن سے فرانسیسی اقتدار بالکل زائل ہوگیا۔

اب لالی اور بسے نے مل کر مدراس پر حملہ کیا۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ 1760ء میں انگریزی جرنیل سرآئر کوٹ نے فرانسیسیوں کو ونڈواش کے مقام پر شکست فاش دی۔ اس سے اگلے سال یعنی 1761ء میں انگریزوں نے پانڈیچری پر بھی قبضہ کرلیا۔ اور ہندوستان سے فرانسیسی اقتدار کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔

نتیجہ : 1763ء میں صلح نامہ پیرس کی رو سے جنگ ختم ہوگئی۔ پانڈیچری اور کئی دیگر فرانسیسی مقبوضات واپس کر دیئے گئے۔ لیکن اس کے بعد فرانسیسی ہندوستان میں انگریزوں کا مقابلہ نہ کرسکے۔

انگریزوں کی کامیابی کی وجوہات : انگریزوں اور فرانسیسیوں کی باہمی کش مکش میں انگریزوں کی کامیابی اور فرانسیسیوں کی ناکامی کے بڑے بڑے اسباب مندرجہ ذیل تھے۔

1۔ **بہتر مالی حالت :** انگریزی کمپنی تجارت کی وجہ سے مالا مال ہوگئی تھی۔ اس لئے وہ جنگ کو کامیابی کے ساتھ چلا سکی۔ برعکس اس کے فرانسیسی کمپنی کی مالی حالت بہت کمزور تھی۔ جس سے وہ ٹھیک انتظام نہ کرسکی۔

2۔ **گورنمنٹ کی حمایت :** انگریزی کمپنی اگرچہ ایک پرائیویٹ کمپنی تھی۔ تو بھی انگریزی حکومت اور انگریزی قوم اس کی حمایت پر تھی اس کے برعکس فرانسیسی کمپنی اگرچہ حکومت فرانس کا ایک صیغہ تھی۔ تو بھی فرانسیسی حکومت اس کی خاطر خواہ حمایت نہیں کرتی تھی۔ بلکہ بعض اوقات ناجائز طور پر دخل اندازی کرتی تھی۔ اور رنگ میں بھنگ ڈال دیتی تھی۔

3۔ **تجارتی مقصد :** انگریزوں نے یہ بات ایک لمحہ کے لئے بھی نظر انداز نہیں کی۔ کہ ان کا اصلی مقصد تجارت کی ترقی ہے۔ چنانچہ جنگ کے دوران میں بھی وہ تجارت کرکے فائدہ

اٹھاتے رہے۔ اس کے برعکس فرانسیسی تجارت سے لاپرواہ ہوکر فضول جنگوں میں روپیہ برباد کرتے رہے۔ اور جنگی کامیابی کو ہی منزل بنالیا۔

4۔ **بحری فوقیت** : انگریزوں کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ ان کی بحری فوقیت بھی تھی۔ تمام بحری راستے ان کے قبضے میں تھے اور وہ فوجیں اور سامان جنگ بڑی آسانی سے ہندوستان پہنچا سکتے تھے۔ لیکن فرانسیسی ایسا نہیں کرسکتے تھے۔

5۔ **فتح بنگال** : بنگال کا زرخیز صوبہ 1757ء میں انگریزوں کے قبضہ میں آگیا۔ وہاں سے انہیں روپیہ اور سپاہی بڑی آسانی سے مل جاتے تھے۔ اس کے برعکس فرانسیسیوں کے پاس ہندوستان میں کوئی موزوں فوجی مرکز نہ تھا۔

6۔ **پٹ صاحب کی پالیسی** : انگریزوں کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ انگلینڈ کے وزیر جنگ پٹ صاحب کی زبردست حکمت عملی تھی۔ اس نے جنگ کا انتظام اس طریقہ سے کیا۔ کہ حکومت فرانس کی تمام تر توجہ یورپ کے معاملات میں ہی لگی رہی۔ اور اس کے لئے ہندوستان میں مدد بھیجنا نہایت مشکل ہوگیا۔

7۔ **انگریزوں میں اتفاق** : انگریزی حکام میں آپس میں بڑا اتفاق تھا۔ وہ ہر کام مل جل کر کرتے تھے۔ اس کے برخلاف فرانسیسی افسر آپس میں بغض و کینہ رکھتے تھے۔ اور مشکل کے وقت ایک دوسرے سے عدم تعاون کرتے تھے۔ اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں اپنی طاقت زائل کرتے رہتے۔

8۔ **حکومت فرانس کی بدسلوکی** : فرانسیسی حکومت واپس آئے ہوئے افسروں کے ساتھ اتنا برا سلوک کرتی تھی کہ دوسرے افسروں کی حوصلہ افزائی ممکن ہی نہیں ہوسکتی تھی۔ ڈوپلے کا واپسی پر بڑا حسرتناک انجام ہوا۔ اور لالی کا تو ناکامی کی وجہ سے سر قلم کیا گیا۔

ڈوپلے

(The career of Dupleix in india and account for his failure to set up a French empire)

ڈوپلے ہندوستان میں فرانسیسی مقبوضات کا قابل ترین گورنر جنرل تھا۔ وہ پہلے پہل چندر نگر کا گورنر مقرر ہوکر ہندوستان آیا تھا۔ 1741ء میں وہ فرانسیسی مقبوضات کا گورنر جنرل بنا دیا گیا۔ اس عہدہ پر وہ تیرہ سال رہا۔

اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا۔ کہ وہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر یہاں ایک زبردست فرانسیسی سلطنت قائم کرے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے اس نے دو کام کئے۔ ایک تو ہندوستانی سپاہیوں کو بھرتی کرکے یورپین طریقہ پر قواعد سکھلانی شروع کی۔ اور دوسرے دیسی ریاستوں کے جھگڑوں میں دخل دے کر فرانسیسی اقتدار بڑھانا چاہا۔

ڈوپلے کو اپنے مقصد میں کچھ عرصہ کے لئے تو امید سے بڑھ کر کامیابی ہوئی۔ اور ارکاٹ کے محاصرہ تک اس نے تمام جنوبی ہند میں فرانسیسی اقتدار کو افضل بنا دیا۔ لیکن کلایو کی بروقت آمد اور شاندار فتوحات نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور اپنے مدعا میں وہ ناکام رہا۔ اس ناکامی کے بعد 1754ء میں ڈوپلے کو واپس فرانس بلا لیا گیا۔ جہاں اس کا بڑا حسرتناک انجام ہوا۔ اور دس سال بعد 1764ء میں سخت افلاس اور ناداری کی حالت میں اس نے وفات پائی۔

ڈوپلے بلاشبہ ایک اولوالعزم۔ روشن دماغ اور اپنے زمانے کا بہترین فرانسیسی مدبر تھا۔ اور اس نے اپنی قوم کے اقتدار کو بڑھانے کے لئے اپنی جوانی۔ اپنی دولت اور اپنی زندگی تک صرف کردی۔ لیکن آخر وہ ناکام رہا اور اس کی ناشکری قوم نے اس کی قدر شناسی نہ کی۔

ناکامیابی کی وجوہات : ڈوپلے کی ناکامیابی کی کئی وجوہات تھیں۔

1۔ حکومت فرانس نے ڈوپلے کی وقت پر مدد نہ کی۔ بلکہ اسے موقوف کر دیا۔

2۔ ڈوپلے کے ماتحت فرانسیسی افسروں میں اتفاق نہ تھا۔ وہ ایک دوسرے سے بغض و کینہ رکھتے تھے۔

3۔ ڈوپلے خود مرد میدان نہ تھا۔ اور اس میں کسی قدر تکبر بھی تھا۔

4۔ لیکن ڈوپلے کی ناکامیابی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ انگریزوں کی بحری طاقت فرانسیسیوں کی بحری طاقت کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھی۔

5۔ افسوس کہ اپنے ہیرو کے ساتھ فرانس کی حکومت نے بھی اچھا سلوک نہ کیا۔ جس سے چلتی کا نام گاڑی والی مثل برآمد ہوتی ہے۔ جو فرانسیسی حکومت کی تنگ دلی اور کسی حد تک جہالت کا پتہ دیتی ہے۔ جو اپنی ناکامیوں کا غصہ دوسروں پر نکالتی تھی۔

کونٹ لالی (Lally) کا مختصر حال

ایک بڑا دلیر اور بہادر مگر خود سر فرانسیسی جرنیل تھا۔ یورپ میں ہفت سالہ جنگ کے شروع ہونے پر فرانس کی سرکار نے اسے ہندوستان میں فرانسیسی مقبوضات کا گورنر بنا کر بھیجا۔ اس نے آتے ہی فورٹ سینٹ ڈیوڈ فتح کرلیا۔ اور پھر بے سوچے سمجھے اپنی مدد کے لئے بسے کو شمالی سرکار سے بلا لیا۔ یہ اس کی ایک زبردست غلطی تھی۔ کیونکہ بسے کے وہاں سے آتے ہی حیدر آباد سے فرانسیسی اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔ اور انگریز قابض ہوگئے۔ انجام کار 1760ء میں لالی کو وندواش کے مقام پر شکست ہوئی۔ اور اسے قیدی بنا کر انگلینڈ بھیج دیا گیا۔ لیکن وہاں اسے فرانس جانے کی اجازت مل گئی۔ اور فرانس میں حکومت کی طرف سے اسے موت کی سزا دی گئی۔

بسے (Bussy) کا مختصر حال : بسے کرناٹک کی جنگوں میں فرانس کا قابل ترین جرنیل تھا۔ فرانسیسیوں اور ان کے ساتھیوں چندا صاحب اور مظفر جنگ کو جو کامیابی ان جنگوں میں ہوئی۔ وہ اسی کی ہمت کا نتیجہ تھی۔ شمالی سرکار کا علاقہ بھی اسی نے فرانس کیلئے حاصل کیا لیکن جب لالی نے اسے وہاں سے بلا بھیجا۔ تو اس علاقہ پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا۔ وندواش کی لڑائی میں بسے کو ہار ہوئی۔ اور اسے گرفتار کرلیا گیا۔ رہائی کے بعد وہ واپس فرانس چلا گیا۔ ایک دفعہ پھر وہ ہندوستان آیا۔ لیکن جلدی ہی مرگیا۔

بنگال کی فتح اور انگریزوں کی چالبازی

بنگال کا صوبہ محمد شاہ رنگیلا کے زمانہ میں علی وردی خاں کے ماتحت سلطنت مغلیہ سے خود مختار ہوگیا تھا۔ 1756ء میں علی وردی خاں کا نواسہ سراج الدولہ جو ایک ناتجربہ کار اور عیاش نوجوان تھا۔ بنگال کا نواب بنا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس کا انگریزوں سے جھگڑا ہوگیا۔ جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان دنوں انگریز کلکتہ میں اپنے قلعہ فورٹ ولیم کو مضبوط کر رہے تھے۔ سراج الدولہ نے انہیں منع کیا لیکن وہ باز نہ آئے۔ دوسرے انہوں نے ایک شخص کشن داس کو جس سے نواب ناراض تھا اپنے ہاں پناہ دی تھی۔ اور نواب کے مطالبہ پر بھی اسے اس کے حوالے نہ کیا تھا۔

ان باتوں سے نواب غضبناک ہو اٹھا۔ اس نے قاسم بازار کی انگریزی کوٹھی پر قبضہ کرلیا۔ اور پھر کلکتہ فتح کرلیا۔ کہتے ہیں کہ کلکتہ میں ایک سو چھیالیس انگریزی قیدیوں کو ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ دوسرے دن جب دروازہ کھولا گیا۔ تو ان میں سے صرف 23 آدمی زندہ نکلے۔ اس واقعہ کو بلیک ہول کا حادثہ کہتے ہیں۔ (بعض مورخ اس حادثہ کو صحیح تسلیم

نہیں کرتے۔ بلکہ انگریزوں کی درفنطنی قرار دیتے ہیں۔ بہرحال جب اس واقعہ کی خبر مدراس پہنچی۔ تو کلایو اور امیر البحر واپس فوج لے کر کلکتہ پہنچے اور جاتے ہی کلکتہ فتح کرلیا۔ اس پر نواب نے گھبرا کر صلح کرلی اور کمپنی کے تمام حقوق واپس کر دیئے اور نقصانات کی تلافی کرنے کا وعدہ کیا۔

نواب کے خلاف سازش : صلح کے باوجود انگریزوں نے نواب پر در پردہ فرانسیسیوں کے ساتھ ساز باز کرنے کا الزام لگایا۔ انگریزوں نے اس طرح کلایو نے اس کی نوابی کا خاتمہ کرنا چاہا۔ اور موقعہ بھی بہت اچھا تھا۔ چنانچہ انگریز میر جعفر کو جو سراج الدولہ کی فوجوں کا سپہ سالار تھا۔ نواب بناکر بیوقوف بنانا چاہتے تھے۔ ایک سکھ سوداگر امیں چند کی معرفت کلایو بھی اس ساری سازش میں شریک ہوگیا۔ جب سازش کا معاملہ طے پاگیا۔ تو امیں چند نے دھمکانا شروع کیا کہ اگر اسے تیس لاکھ روپیہ دیئے جانے کا وعدہ نہ کیا گیا۔ تو وہ سارا راز افشا کر دے گا۔ تب لارڈ کلایو نے دغا بازی سے کام لیا۔ اور معاہدہ کی دو نقلیں تیار کیں۔ ایک اصلی اور ایک جعلی۔ اصلی معاہدہ میں تو مطلوبہ رقم دینے کا ذکر تک نہ کیا گیا۔ لیکن جعلی معاہدہ میں روپیہ دیئے جانے کی شرط درج کر دی گئی۔ اور اس پر واٹس کے جعلی دستخط بھی کسی سے کروا لئے گئے۔ اس طرح سے امیں چند کو خاموش کر دیا گیا۔

پلاسی کی لڑائی 23 جون 1757ء : جب میر جعفر کو بنگال کا نواب بنانے اور سراج الدولہ کو تخت سے معزول کرنے کی سازش تیار ہوگئی۔ تو کلایو نے سراج الدولہ کو ایک خط لکھا۔ جس میں اس پر سابقہ عہد نامہ کو توڑنے اور فرانسیسیوں کے ساتھ درپردہ ساز باز کرنے کا الزام لگایا۔ جب اس خط کا کوئی جواب نہ آیا۔ تو کلایو تقریباً تین ہزار سپاہیوں کے ساتھ پلاسی کی جانب روانہ ہوا۔ جہاں نواب 50 ہزار پیادہ فوج اور اٹھارہ ہزار گھوڑ سواروں کے ساتھ پیشتر ہی سے خیمہ زن تھا۔

23 جون 1757ء کو پلاسی کی مشہور لڑائی ہوئی۔ دوپہر کے بعد انگریزی فوج نے یورش کی۔ نواب کی فوجوں کو مکمل شکست ہوئی۔ اور نواب میدان سے بھاگ نکلا۔ لیکن پکڑا گیا۔ اور میر جعفر کے لڑکے میران نے اسے قتل کر دیا۔ میر جعفر بنگال کا نواب بنا دیا گیا۔ میر جعفر نے انگریزوں کو بہت سا روپیہ دیا۔ اور کمپنی کو 24 پرگنے کے علاقے کی زمینداری عطا کی۔

اہمیت : پلاسی کی لڑائی ایسی لڑائی نہ تھی جس میں کوئی بہادری کے کارنامے دکھائے گئے ہوں۔ تاہم پولیٹیکل لحاظ سے اس کا شمار تاریخ کی اہم ترین لڑائیوں میں کیا جاتا ہے۔ اس لڑائی سے بنگال جیسے زرخیز اور دولت مند صوبے پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہوگیا۔ اور اسی صوبے کی دولت سے انگریز دکن میں فرانسیسیوں کے خلاف کامیاب ہوئے۔ فی الواقع پلاسی کی لڑائی سے ہندوستان کی فتح کی کنجی انگریزوں کے ہاتھ لگ گئی۔

1764ء میں بکسر کی لڑائی ہوئی۔ جس کے نتیجہ کے طور پر کمپنی کو بنگال۔ بہار اور

اڑیسہ کی دیوانی مل گئی۔ اس طرح سارے بنگال میں انگریزی عملداری قائم ہوگئی۔

بعض تفصیلات : علی وردی خاں : اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغل بادشاہ اور حاکم عیش و عشرت کا شکار ہوگئے چنانچہ صوبائی گورنروں نے خود مختاری کا اعلان کردیا۔ چنانچہ ترک مہم جو علی وردی خاں 1726ء میں یہاں بنگال میں آیا۔ اور محمد شاہ رنگیلا کے عہد میں 1740ء میں وہ خود مختار ہوگیا۔ مرہٹے اس کے لئے فتنہ سے کم نہ تھے چنانچہ اس نے مرہٹوں کو اڑیسہ حوالے کرنے کے علاوہ بارہ لاکھ روپے سالانہ چوتھ کی شکل میں ادا کرنے کے بدلے خرید لیا۔ انگریزوں سے بھی اس کے تعلقات اچھے تھے تاہم علی وردی خاں نے انگریزوں کو ان کی کوٹھیوں کے گرد مضبوط فصیلیں بنانے کی اجازت نہ دی۔ اس نے ہندوؤں کی سرپرستی کرتے ہوئے انہیں بڑے بڑے عہدے دیئے۔ اور ان کی تجارت بڑھانے میں بھی مدد دی کیونکہ وہ ہندوؤں کی دولت مندی کو اپنی دولت مندی سمجھتا تھا۔ بہرحال اس کا حالات پر مکمل کنٹرول تھا۔ 1756ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔

سراج الدولہ (1756ء تا 1757ء) : اب سراج الدولہ (علی وردی خاں کا نواسہ اس کی جگہ) نواب بنا لیکن اس کی جانشینی کو اس کی خالہ گھسیٹی بیگم کے دیوان راج بلکھ اور چچیرے بھائی نے سخت ناپسند کیا۔ تاہم حکومت بنگال سنبھالتے ہی سراج الدولہ کا انگریزوں سے جھگڑا ہوگیا۔ اس کے بعد اپنے رشتہ داروں وغیرہ کی مخالفت نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اور انگریزوں نے ان سے مل کر سازش تیار کی۔

حادثہ بلیک ہول : سراج الدولہ نے انگریزوں کو اپنی خود مختاری کا احترام کرنے کے لئے کہا تو انگریزوں نے اکڑ فوں دکھائی۔ چنانچہ سراج الدولہ نے پہلے قاسم بازار اور پھر کلکتہ کو فتح کرلیا۔ لیکن ہال ویل نامی انگریز نے ایک ڈس انفارمیشن پھیلا کر حادثہ بلیک ہول (Black-hole) کی کہانی گھڑی اور الزام لگایا کہ سراج الدولہ نے اٹھارہ مربع فٹ کے ایک کمرے میں 146ء انگریزوں کو بند کردیا اور (جون کے مہینے میں) اگلے دن صرف 23 آدمی زندہ بچے باقی مرگئے۔ لیکن یہ ایک من گھڑت افسانہ ہے۔ جس کا ذکر کسی دوسری معاصر تاریخ مثلاً سیرالمتاخرین میں یا ریاض السلاطین وغیرہ میں قطعاً نہیں ملتا۔ لیکن انگریزوں کے سامنے سراج الدولہ کی معزولی کا مقصد سرفہرست تھا۔ اس لئے لارڈ کرزن نے لارڈ کلائیو اور واٹسن کے حوالے سے اسے درست قرار دے کر اس افسانے کو خوب ہوا دی چنانچہ نواب پر جنگ پلاسی (1757ء) مسلط کردی گئی۔

جنگ پلاسی : کلائیو اور واٹسن کلکتہ کی طرف بڑھے۔ جہاں نواب کا سالار مالک چند بڑی فوج کے ساتھ موجود تھا۔ لیکن انگریزوں نے اسے خرید لیا اور وہ نورا کشتی لڑتا ہوا مرشد آباد کی طرف بھاگ گیا۔ اور کلکتہ پر انگریز قابض ہوگئے۔

غدار مشیروں کے مشورے : اب سیٹھ اومی چند وغیرہ سرداروں نے نواب سراج الدولہ کو انگریزوں سے صلح کے لئے اکسایا۔ چنانچہ 9 فروری 1757ء کو سراج الدولہ نے عالم گڑھ کے مقام پر انگریزوں سے صلح کا معاہدہ کرلیا۔ لیکن معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انگریزوں نے چند ہی دنوں میں فرانسیسی نو آبادی چندر نگر پر قبضہ کرلیا۔

ہندو بھی نواب کے اسلامی تشخص کے خلاف تھے اس لئے وہ تین سال پیشتر ہی سے اسلامی حکومت کے خاتمے کے منتظر تھے۔ اومی چند کو انگریزوں نے خرید لیا اور میر جعفر کو نوابی کا لالچ دے کر سراج الدولہ کے خلاف غداری پر آمادہ کرلیا اور جعلی باہمی معاہدہ کرکے اومی چند کو مطمئن کر دیا اور پھر فرانسیسیوں کے ساتھ ساز باز کے بہانے انگریزوں نے سراج الدولہ کو للکارا اور 3200 انگریز فوج سے مرشد آباد پر حملہ کر دیا۔ نواب کے سالار میر جعفر نے سازش کے تحت کوئی مزاحمت نہ کی۔ سراج الدولہ کو سازش کا علم ہوا تاہم وہ سالاری کے عہدہ پر قائم رہا اور پچاس ہزار فوج کے ساتھ 22 جون 1757ء کو پلاسی کے میدان میں خیمہ زن ہوگیا۔

سراج الدولہ کے وفادار ساتھی میر مدن اور موہن لال تھے۔ میر مدن ایک ہلکی سی جھڑپ میں شہید ہوگیا۔ تو میر جعفر نے جنگ بندی کا مشورہ دے کر اگلے روز بھرپور حملہ کا یقین دلایا۔ اور ساتھ ہی نواب کے وفاداروں موہن لال وغیرہ کو محاذ جنگ سے واپس بلالیا اور میر جعفر موہوم اقتدار کے نشے میں غرق ساری خفیہ خبریں کلائیو کو پہنچاتا رہا۔ آخر سراج الدولہ کو مرشد آباد کی طرف بھاگنا پڑا۔ اور وہاں سے پٹنہ پہنچا جہاں میر جعفر کے لڑکے میرن نے اسے قتل کردیا۔ اس طرح پلاسی کی جنگ کا نتیجہ انگریزوں کی فتح کی صورت میں نکلا اور انہوں نے کٹھ پتلی کے طور پر میر جعفر کو بنگال کا نواب بنا دیا۔ جس نے فوراً چوبیس پرگنوں پر مشتمل علاقہ انگریزوں کو دے دیا اور خزانہ سے بھی انگریزوں کی مدد کرکے ملک کو کنگال کر دیا اور انگریزوں کو من مانی کرنے کی آزادی دے دی اس جنگ میں کامیابی کے بعد انگریزوں نے فرانسیسیوں اور دیگر یورپی باشندوں کو برصغیر سے بھگا دیا اور ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کی راہ ہموار ہوگئی۔

اور بنگال کی دولت انگلستان منتقل ہونے لگی۔ اور انگریز نواب گر (Nawab Makers) بن کر لاکھوں کروڑوں کمانے لگ گئے۔ حتیٰ کہ انہوں نے اس اتھل پتھل میں پانچ کروڑ روپیہ کھرا کیا۔ میر جعفر نے بعد میں انگریزوں سے آزاد ہونے کی کوشش کی لیکن غلامی کی زنجیریں جو اس نے اپنے ہاتھوں پہنی تھیں اس کی سوجھ بوجھ کو برحق ثابت کرنے میں مانع رہیں۔ کیونکہ میر جعفر نے غلامانہ بصیرت پر اعتماد کرکے اپنے آپ کو خود ہی دھوکا دیا تھا اور بقول اقبال۔

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا

میر جعفر اور میر قاسم

میر جعفر بنگال کے صوبہ دار علی وردی خاں کا بہنوئی اور نواب سراج الدولہ کی فوجوں کا سپہ سالار تھا۔ پلاسی کی لڑائی کے بعد 1757ء میں اسے انگریزوں نے بنگال کا نواب بنا دیا۔ مگر وہ برائے نام نواب تھا۔ اصل میں ساری طاقت کلایو کے ہاتھوں میں تھی۔ میر جعفر ہرگز یہ پسند نہ کرتا تھا کہ وہ انگریزوں کے ہاتھوں میں محض کٹھ پتلی بنا رہے۔ چنانچہ اس نے آزاد ہونے کے لئے چنسرا کے ڈچ لوگوں سے ساز باز کی۔ مگر کلایو نے انہیں شکست دی۔

میر جعفر نے نواب بننے کے وقت انگریزوں کو سلطنت کی طرف سے نذرانے دیئے تھے۔ اور ابھی وعدہ کے مطابق بہت سا روپیہ دینا تھا۔ مگر اس کا خزانہ خالی ہوچکا تھا۔ چنانچہ نہ تو وہ اپنے اقرار ہی پورے کرسکا اور نہ انتظام سلطنت ہی ٹھیک طور پر چلا سکا۔ آخر 1761ء میں اسے معزول کر دیا گیا۔ اور اس کے داماد میر قاسم کو نواب بنایا گیا۔ 1763ء میں میر جعفر کو میر قاسم کی معزولی پر دوبارہ نواب بنایا لیکن جنوری 1765ء میں وہ انتقال کرگیا۔

میر قاسم 1761ء سے 1763ء : میر قاسم میر جعفر کا داماد تھا۔ 1761ء میں اسے انگریزی حکام نے بنگال کا نواب مقرر کیا۔ اس کے بدلہ میں میر قاسم نے انگریزوں کو بردوان ۔ مدنا پور اور چٹا گانگ کے اضلاع دے دیئے۔

میر قاسم ایک قابل حکمران تھا۔ لیکن انگریزوں نے اسے آرام سے حکومت کرنے کا موقعہ نہ دیا کمپنی کے ملازم اپنی نجی تجارت بھی بلا محصول کرنے لگ گئے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ ہندوستانی سوداگروں سے بھی کچھ روپیہ لے کر انہیں پروانے لکھ دیتے تھے۔ جس سے وہ بھی محصول کی ادائگی سے بچ جاتے تھے۔ ان باتوں سے نواب کی آمدنی گھٹنے لگی۔ اس نے کلکتہ کونسل سے شکایت کی۔ لیکن انہوں نے ایک نہ سنی۔

اب نواب نے انگریزی اقتدار سے آزاد ہونا چاہا۔ چنانچہ اس نے اپنا دارالخلافہ مرشد آباد کی بجائے منگیر بنالیا۔ اور تمام تاجروں کو محصول معاف کر دیا۔ اس سے انگریز بہت برا فروختہ ہوئے اور میر قاسم سے جنگ چھڑ گئی۔ اور اسے معزول کر دیا گیا۔ جنگ میں میر قاسم کو شکست ہوئی۔ اور وہ پٹنہ کو بھاگ گیا۔ جہاں اس نے اپنے ایک جرمن ملازم سمرو کو حکم دے کر کوئی دو سو انگریزوں کو جو اس کی حراست میں تھے ۔ قتل کروا دیا۔ اس واقعہ کو پٹنہ کا قتل کہتے ہیں۔ یہ واقعہ 1763ء میں ہوا۔ اس کے بعد میر قاسم بھاگ کر اودھ کے نواب کے پاس چلا گیا۔ اور انگریزی حکام نے پھر میر جعفر کو مسند نشین کردیا۔ میر قاسم نے شجاع الدولہ نواب اودھ اور شاہ عالم مغلیہ شہنشاہ کو ساتھ ملا کر انگریزوں کے خلاف جنگ کی۔ لیکن وہ بکسر کے مقام پر شکست کھا کر بھاگ نکلا۔ اور لاپتہ ہوگیا۔

بکسر کی لڑائی 1764ء : وجہ ۔ میر قاسم بنگال کے مسند سے معزول ہوا اور انگریزوں

سے شکست کھانے کے بعد اودھ کے نواب شجاع الدولہ کے پاس پہنچا۔ ان دنوں مغل بادشاہ شاہ عالم بھی وہیں موجود تھا۔ شاہ عالم اور شجاع الدولہ نے اس کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ شجاع الدولہ۔ شاہ عالم اور میر قاسم تینوں نے مل کر بنگال پر چڑھائی کی۔

انگریزی جرنیل میجر منرو نے بکسر کے مقام پر ان کا مقابلہ کیا اور انہیں شکست فاش دی۔ میر قاسم بھاگ گیا۔ اور لاپتہ ہوگیا۔ شاہ عالم اور شجاع الدولہ نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالہ کردیا۔

نتیجہ۔ 12 اگست 1765ء کو کلایو نے شاہ عالم اور شجاع الدولہ کے ساتھ عہد نامہ الہ آباد طے کیا۔ اس کی رو سے مغل بادشاہ شاہ عالم نے انگریزوں کو بنگال۔ بہار اور اڑیسہ کی دیوانی عطا کی۔ اس طرح سے سارے بنگال میں انگریزی عملداری ہوگئی۔ اور اس کے بعد انگریز تمام شمالی ہندوستان میں سب سے طاقت ور شمار ہونے لگے۔ حقیقت یہ ہے کہ پلاسی کی رہی سہی کسر جنگ بکسر نے پوری کردی۔

علامہ اقبال نے میر جعفر کی غداری کا نقشہ اس شعر میں کھینچا ہے۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگ دنیا، ننگ دیں، ننگ وطن

بنگال میں دوہری حکومت : میر جعفر کی موت کے بعد انگریزوں نے 1765ء میں اس کے بیٹے نجم الدولہ کو نواب بنا دیا جس نے کلکتہ کونسل کو بیش بہا تحائف پیش کیے۔ اور کلائیو نے بڑی چالاکی سے نواب کو دیوانی انتظامات کا ذمہ دار قرار دیا۔ اور کمپنی نے افواج اور مالیاتی امور کو اپنے قبضے میں رکھا چنانچہ کمپنی نواب صاحب کو صرف 53ء لاکھ روپے سالانہ دے کر باقی سب کچھ خود ہڑپ کر جاتی۔ مالئے کی وصولی کے لئے کلائیو نے محمد رضا خاں اور شتاب رائے نامی دو گماشتے مقرر کیے تھے۔

نقائص : اس دو عملی حکومت میں مال سارا کمپنی کھا جاتی اور نظم و نسق کا بوجھ نواب کو برداشت کرنا پڑتا۔ اس طرح حالات دگرگوں ہونے لگے۔ 1770ء میں جب بنگال میں قحط پڑا تو کمپنی یا نواب نے عوام کی کوئی مدد نہ کی۔

چنانچہ 1772ء میں لارڈ وارن ہیسٹنگز نے چارج سنبھالتے ہی اس دو عملی کو ختم کر دیا اور نواب کو سبکدوش کرکے کمپنی کی طرف سے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی واضح طور پر بنگال، بہار اور اڑیسہ کی حکمران بن گئی۔

غدر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

لارڈ رابرٹ کلائیو

The early career of Clive and a brief account of his first and second administrations of Bengal

رابرٹ کلائیو : رابرٹ کلائیو 1725ء میں انگلینڈ کے ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہوا تھا۔ اسے پڑھائی لکھائی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ 1744ء میں جب کہ اس کی عمر انیس سال کی تھی۔ وہ کمپنی کی ملازمت میں کلرک بھرتی ہو کر ہندوستان چلا آیا۔

کچھ عرصہ اس نے مدراس میں بطور کلرک کام کیا۔ مگر اس کام سے اس کی طبیعت بہت جلد اکتا گئی۔ یہاں تک کہ ایک دو دفعہ اس نے پستول سے خودکشی کرنے کی ناکام کوشش بھی کی۔ آخر وہ کلرکی چھوڑ کر فوج میں بھرتی ہوگیا۔

کرناٹک کی دوسری جنگ میں اس نے خوب جوہر دکھائے۔ عین اس وقت جب کہ ڈپلے اپنے ارادوں میں کامیاب ہوا ہی چاہتا تھا اس نے ارکاٹ پر قبضہ کرکے جنگ کا رخ بالکل بدل دیا۔ اور اس طرح سے انگریزی اقتدار کو دکن سے زائل ہونے سے بچا لیا۔ 1753ء میں کلائیو خراب صحت کی وجہ سے واپس انگلینڈ چلا گیا۔

1756ء میں کلائیو دوبارہ ہندوستان آیا۔ اور 1757ء میں اس نے پلاسی کی لڑائی میں فتح حاصل کی۔ جس سے انگریزوں کے قدم بنگال میں بڑی مضبوطی سے جم گئے۔ اب کلائیو بنگال میں انگریزی مقبوضات کا گورنر مقرر ہوگیا۔

گورنری کا پہلا دور 1757ء سے 1760ء : 1757ء سے 1760ء تک کلائیو پہلی مرتبہ بنگال کا گورنر رہا۔ اس عرصہ کے مشہور واقعات مندرجہ ذیل تھے۔

1۔ مغل شہزادہ علی گوہر نے نواب اودھ شجاع الدولہ کی مدد سے بہار پر چڑھائی کی۔ لیکن کلائیو نے اسے پٹنہ کے نزدیک شکست دے کر پسپا کر دیا۔

2۔ میر جعفر نے انگریزوں سے آزاد ہونے کے لئے چنسرا کے ڈچ لوگوں سے سازش کی۔ لیکن کلائیو نے انہیں شکست دی۔ اور ان کی طاقت کا خاتمہ کر دیا۔

3۔ کرنل فورڈ کو بھیج کر فرانسیسیوں کے علاقہ شمالی سرکار پر قبضہ کرلیا۔ اور دکن سے ان کے اقتدار کو زائل کردیا۔

اس طرح سے کلائیو نے بنگال اور دکن میں انگریزوں کی طاقت کو مضبوط کردیا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے چونکہ اس کی صحت خراب ہوگئی تھی۔ اس لئے وہ 1760ء میں انگلینڈ واپس چلا گیا۔ اور وہاں اسے لارڈ بنایا گیا۔

گورنری کا دوسرا دور 1765ء سے 1767ء : کلائیو ہندوستان سے پانچ سال

غیر حاضر رہا۔ اور اس کی غیر حاضری میں بنگال میں اندھیر نگری مچ گئی۔ کمپنی کے ملازم بھی تجارت میں مصروف ہوگئے۔ اور تمام جائز اور ناجائز طریقوں سے روپیہ کمانے لگے۔ اس سے کمپنی کے کاروبارہ کو سخت نقصان پہنچا۔ ایسی حالت میں کمپنی کے ڈائریکٹروں نے لارڈ کلایو کو دوبارہ گورنر بنگال بنا کر بھیجا۔ تاکہ وہ کمپنی کے معاملات میں اصلاح کرے۔ 1765ء میں کلایو بنگال میں پہنچا۔ اور ڈیڑھ سال تک گورنر رہا۔ اس عہد کے مشہور واقعات مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ عہد نامہ آلہ آباد۔ کلایو نے سب سے پہلے شاہ عالم اور شجاع الدولہ کے ساتھ آلہ آباد کے مقام پر 1765ء میں عہد نامہ کیا۔ جس کی شرائط یہ تھیں۔

(1) شجاع الدولہ کو پچاس لاکھ روپیہ کے عوض اودھ کا صوبہ واپس کر دیا گیا۔ لیکن کڑا اور آلہ آباد کے اضلاع اس سے لے لئے گئے۔

(2) شاہ عالم نے کمپنی کو بنگال۔ بہار اور اڑیسہ کی دیوانی یعنی لگان وصول کرنے کے اختیارات عطا کئے۔ اس کے بدلے میں کمپنی نے اسے 26 لاکھ روپیہ سالانہ دینے کا اقرار کیا۔ اور کڑا اور آلہ آباد کے دو اضلاع بھی دے گئے۔

2۔ بنگال میں دو عملی : دیوانی حاصل کرلینے کے بعد کلایو نے بنگال۔ بہار اور اڑیسہ میں ایک نیا نظام حکومت قائم کیا۔ جسے دو عملی کہتے ہیں۔ اس سے انتظام حکومت دو حصوں میں بٹ گیا۔ ملکی حفاظت کا کام کمپنی نے اپنے ذمہ لے لیا۔ اور باقی انتظام نواب کے ہاتھ میں رہنے دیا۔ اور اسے اخرجات کے لئے 53 لاکھ روپیہ سالانہ دینا منظور کیا۔ لیکن یہ طریقہ حکومت ناکامیاب ثابت ہوا۔

3۔ اصلاحات۔ کلایو نے مندرجہ ذیل اصلاحات کیں۔

(1) کمپنی کے ملازموں کو ہندوستان سے تحفے تحائف لینے کی ممانعت کر دی گئی۔

(2) کمپنی کے ملازموں کی نجی تجارت بند کر دی گئی۔

(3) کمپنی کے ملازمین کی تنخواہیں بڑھا دی گئیں۔

(4) فوجی افسروں کا ڈبل بھتہ موقوف کر دیا گیا۔ ڈبل بھتہ کے بند کئے جانے سے فوجی افسروں میں ایک شورش سی برپا ہوگئی۔ لیکن کلایو نے نہایت مستقل مزاجی سے اس شورش کو جلد دبا دیا۔

کلایو کی واپسی : 1767ء میں کلایو خرابی صحت کی وجہ سے واپس انگلینڈ چلا گیا۔ وہاں اس کے خلاف رشوت ستانی کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا۔ پارلیمنٹ نے اسے باعزت بری کردیا۔ لیکن اس مقدمے کا اس کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ 1774ء میں اس نے خود کشی کرلی۔

کلایو کا کیریکٹر : کلایو بڑا دلیر۔ مستقل مزاج اور دور اندیش شخص تھا۔ اسے اپنے ملک اور قوم سے محبت تھی۔ وہ مرد میدان تھا اور سخت سے سخت مشکل کے وقت بھی ہرگز نہ گھبراتا تھا۔ پٹ کے الفاظ میں وہ "پیدائشی جرنیل" تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک اعلٰے پایہ کا مدبر بھی تھا۔ اس

نے اپنے حوصلہ اور ہمت سے ہندوستان میں انگریزی حکومت کی بنیاد ڈالی۔

لیکن وہ نقائص سے خالی نہ تھا۔ اس نے ناجائز طور پر تحفے تحائف حاصل کئے۔ اور اپنے لئے بہت دولت جمع کی۔ اس نے واٹسن کے جعلی دستخط کرائے۔ اور امیں چند کو دھوکا دیا۔ ان نقائص کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کلایو نے اپنے ملک کی بیش بہا خدمت کی۔ اور کمپنی کے نام اور طاقت کو چار چاند لگا دیئے۔

کلایو کی دو عملی (The Dual Government of Clive) :

1765ء میں عہد نامہ آلہ آباد کی رو سے کمپنی کو بنگال اور اڑیسہ کی دیوانی یعنی لگان وصول کرنے کا حق مل گیا تھا۔ اس طرح بنگال کی حکومت مکمل طور پر انگریزوں کے ہاتھ آچکی تھی۔ مگر کمپنی اتنے بڑے علاقہ کا سارا انتظام ہاتھ میں لینے کے لئے تیار نہ تھی۔ کیونکہ اتنے بڑے علاقے کا انتظام کرنے کے لئے اس کے پاس لائق اور تجربہ کار آدمی کافی نہ تھے۔ اس لئے کلائیو نے بنگال کی حکومت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس نظام حکومت کو دو عملی یعنی دو حاکموں کی حکومت کہتے ہیں۔

اس دو عملی کے مطابق ملکی حفاظت کا انتظام تو کمپنی نے اپنے ذمہ لے لیا۔ اور باقی سارا انتظام نواب کے ہاتھوں میں رہنے دیا۔ اور اسے 53 لاکھ روپیہ سالانہ اخراجات کے لئے دینا منظور کیا۔ دو عملی کا یہ طریقہ سات سال تک جاری رہا۔

کلائیو کا یہ نظام حکومت یعنی دو عملی کا طریقہ بالکل ادھورا اور غیر تسلی بخش ثابت ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام اختیارات تو کمپنی کے ہاتھوں میں تھے۔ مگر ذمہ داری ساری نواب کی تھی۔ نواب میں انتظام حکومت کی قابلیت نہ تھی اور کمپنی انتظام کو بہتر بنانے کے لئے تیار نہ تھی۔ چنانچہ کلائیو کے واپس جاتے ہی بنگال میں سخت بدانتظامی پھیل گئی۔ رعایا کا بہت برا حال ہوا۔ اور غیر ذمہ دار انگریز افسروں نے ہندوستانیوں پر بڑے بڑے مظالم ڈھائے۔

آخر 1773ء میں وارن ہیسٹنگز نے دو عملی کا خاتمہ کر دیا۔ اور بنگال کا سارا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

لارڈ کلائیو۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کا بانی!

ایک جائزہ ایک تبصرہ

عام خیال یہ ہے کہ : ہندوستان میں انگریزی حکومت کا بانی فی الواقع کلائیو ہی تھا۔ اس نے اپنی بہادری۔ تدبر اور مستقل مزاجی سے انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کو جو محض ایک تجارتی کمپنی تھی حکمران طاقت بنا دیا۔ اور پھر یہ رفتہ رفتہ ایسی زبردست سلطنت بن گئی۔ جس کی مثال دنیا میں کم ہی ملتی تھی۔

1۔ کرناٹک کی دوسری جنگ میں جب کہ انگریزوں کی حالت بڑی نازک تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈوپلے اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جائے گا۔ کلائیو نے ارکاٹ پر قبضہ کرکے اس کے تمام منصوبوں کا خاتمہ کردیا۔ اور انگریزی اقتدار کو دکن سے زائل ہونے سے بچالیا۔

2۔ 1757ء میں کلایو نے پلاسی کا مشہور معرکہ فتح کرکے ہندوستان میں انگریزی حکومت کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔ بنگال میں اقتدار قائم ہو جانے کی وجہ سے انگریزوں کو اپنے حریفوں کے خلاف بڑی مدد مل سکی۔ اور وہ جلدی ہی فرانسیسی اقتدار کو ملیا میٹ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

3۔ 1675ء میں کلایو نے شاہ عالم کے ساتھ الٰہ آباد کے مقام پر ایک عہد نامہ کیا۔ جس کی رو سے انگریزوں کو بنگال۔ بہار اور اڑیسہ کی دیوانی مل گئی۔ یعنی انہیں ان علاقوں سے لگان وصول کرنے کا حق مل گیا۔ اس واقعہ سے ہندوستان میں انگریزی حکومت کی بنیاد مستحکم ہوگئی۔

4۔ کلایو نے اپنی اصلاحات سے کمپنی کے نظم و نسق کو بھی بہتر بنا دیا۔

چنانچہ مندرجہ بالا وجوہات کی بناء پر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کا بانی کلایو ہی تھا۔

سلطان حیدر علی۔ 1722ء تا 1782ء

(حیدر علی کی زندگی اور کارناموں کا مختصر حال)

ابتدائی زندگی : حیدر علی اٹھارھویں صدی میں ریاست میسور کا نامور سلطان اور انگریزوں کا ایک زبردست حریف ہو گزرا ہے۔ وہ ایک غیر معمولی قابلیت کا شخص تھا۔ وہ 1722ء میں

پیدا ہوا۔ حیدر علی نے اپنی زندگی میسور کی فوج میں بطور ایک سپاہی کے شروع کی۔ لیکن وہ اپنی خدا داد قابلیت سے ترقی کرتے کرتے سپہ سالار کے اعلیٰ رتبے تک جا پہنچا۔ 1766ء میں میسور کے راجہ کی وفات پر اس نے تخت پر قبضہ کرلیا۔ اور میسور کا نواب بن بیٹھا۔

کیریکٹر : حیدر علی ایک بڑا قابل حکمران اور زبردست فوجی جرنیل تھا۔ وہ اگرچہ ان پڑھ تھا مگر تھا بڑا ذہین اس کا حافظہ غیر معمولی تھا۔ جس بات کو ایک دفعہ سن لیتا۔ اسے کبھی نہ بھولتا۔ بڑے بڑے حساب زبانی کرلیا کرتا تھا۔ اور پانچ زبانیں بخوبی بول سکتا تھا وہ بالکل غیر متعصب اور پرلے درجے کا مردم شناس تھا۔

انتظام سلطنت : حیدر علی سلطنت کے کام کو نہایت باقاعدہ اور پھرتی سے انجام دیتا تھا۔ ہر محکمہ کی دیکھ بھال بذات خود کرتا تھا اور مجرموں کو خواہ وہ اس کے وزیر ہی کیوں نہ ہوں عبرت ناک سزائیں دیتا تھا۔ وہ ہندو مسلمانوں میں کوئی فرق نہ سمجھتا تھا۔ ملازمت قابلیت کے لحاظ سے دیا کرتا تھا۔

حیدر علی انگریزوں کا زبردست حریف تھا۔ اور اس نے ان کے خلاف دو جنگیں کیں۔ جنہیں میسور کی پہلی اور دوسری جنگ کہتے ہیں۔ دوسری جنگ کے دوران میں حیدر علی 1782ء میں وفات پاگیا۔

میسور کی پہلی جنگ 1767ء سے 1769ء

(Th first Mysore War)

یہ جنگ حیدر علی اور انگریزوں کے درمیان ہوئی۔

وجہ۔ اس جنگ کی وجہ یہ تھی کہ حیدر علی کی ترقی دکن کی دوسری طاقتوں کے لئے خطرے کا موجب تھی۔ چنانچہ نظام۔ مرہٹوں اور انگریزوں نے اس کے خلاف اک اتحاد قائم کرلیا۔

واقعات : حیدر علی نے مرہٹوں کو کچھ دے دلا کر انگریزوں سے الگ کر دیا۔ اور نظام کو بھی اپنی طرف گانٹھ لیا۔ پھر نظام اور حیدر علی کی متحدہ فوجوں نے انگریزوں پر حملہ کیا۔ لیکن انگریزی افسر کرنل سمتھ نے 1767ء میں ترنولی اور چنگامہ کے مقام پر انہیں شکست دی۔ اس کے بعد نظام حیدر علی کا ساتھ چھوڑ کر انگریزوں سے مل گیا۔ لیکن حیدر علی اکیلا ہی کرناٹک کو اجاڑتا ہوا مدراس تک جا پہنچا۔ مدراس گورنمنٹ نے خوف زدہ ہوکر حیدر علی کی پیش کردہ شرائط پر صلح کرلی۔

نتیجہ : مدراس کے عہد نامہ کی رو سے دونوں نے ایک دوسرے کے فتح کئے ہوئے علاقے

واپس کر دیئے۔ اور بوقت ضرورت جنگ میں ایک دوسرے کی مدد کا وعدہ کیا۔

نوٹ . 1771ء میں مرہٹوں نے میسور پر چڑھائی کی۔ حیدر علی نے انگریزوں سے مدد کی درخواست کی۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ اس وعدہ خلافی کی وجہ سے حیدر علی انگریزوں کا جانی دشمن بن گیا۔

وارن ہیسٹنگز گورنر بنگال

(1772ء سے 1774ء)

(1) اصلاحات (2) روہیلوں سے لڑائی (3) ریگولیٹنگ ایکٹ

ہیسٹنگز کا تقرر اور ابتدائی مشکلات : کلایو کی طرح وارن ہیسٹنگز بھی تقریباً 18 سال کی عمر میں ایک کلرک کی حیثیت سے ہندوستان آیا تھا لیکن اپنے حسن لیاقت اور قابلیت کی وجہ سے رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہوا اعلیٰ عہدہ پر پہنچ گیا۔ 1772ء میں وہ بنگال کا گورنر مقرر ہوا۔

ہیسٹنگز کی تقرری کے وقت بنگال کی حالت بہت خراب تھی۔ دو عملی کی وجہ سے حکومت کا سارا نظام درہم برہم ہوچکا تھا۔ لگان وصول کرنے کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ خزانہ تقریباً خالی پڑا تھا۔ ملک میں قحط پڑا ہوا تھا۔ محکمہ انصاف کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اور ہر علاقے میں ڈاکو اور رہزن پھر رہے تھے۔ چنانچہ وارن ہیسٹنگز نے سب سے پہلے دو عملی کا خاتمہ کیا۔ اور انتظام حکومت کو سدھارنے کے لئے اصلاحات رائج کیں۔

وارن ہیسٹنگز کی اصلاحات (The Reforms of Warren Hastings) : وارن ہیسٹنگز کی اصلاحات تین حصوں میں تقسیم ہوسکتی ہیں۔

(الف) مالگزاری کی اصلاحات : ہیسٹنگز نے مالگزاری کا انتظام بہتر بنانے کے لئے مندرجہ ذیل اقدام کیے۔

1۔ زمین کا بندوبست پنج سالہ کر دیا اور زمین سب سے زیادہ بولی دینے والے کو دی جانے لگی۔ بعد ازاں یہ ٹھیکہ سالانہ کر دیا گیا۔

2۔ مالگزاری یعنی معاملہ زمین وصول کرنے کے لئے ہر ضلع میں ایک ایک انگریز کلکٹر مقرر کیا گیا۔

3۔ کلکتہ میں ایک ریونیو بورڈ قائم کیا گیا۔ تاکہ لگان کا باقاعدہ حساب رکھا جاسکے۔

(ب) عدالتی اصلاحات : محکمہ انصاف کا انتظام بہتر بنانے کے لئے ہیسٹنگز نے مندرجہ ذیل باتیں کیں۔

1۔ ہر ضلع میں ایک دیوانی اور فوجداری عدالت قائم کی گئی۔ دیوانی عدالت کا جج انگریز کلکٹر ہی ہوتا تھا۔ جو لگان بھی وصول کیا کرتا تھا۔
2۔ کلکتہ میں اپیل کی دو عدالتیں قائم کی گئیں۔ ایک صدر دیوانی عدالت جو مالی اور دیوانی مقدمات فیصل کرتی تھی اور دوسری صدر نظامت عدالت جو فوجداری مقدمات کی اپیل سنتی تھی۔
3۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے قوانین کا ایک سادہ سا مجموعہ تیار کیا گیا۔ تاکہ اس کے مطابق مقدموں کا فیصلہ ہو سکے۔

(ج) اخراجات میں بچت :

1۔ بنگال کے نواب کا وظیفہ 50 فیصد کر دیا گیا۔
2۔ شاہ عالم کا 26 لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ بند کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ انگریزوں کی پناہ چھوڑ کر مرہٹوں کی حفاظت میں چلا گیا تھا۔
3۔ کڑا اور الہ آباد کے اضلاع شاہ عالم سے واپس لے لئے گئے۔ اور وہ شجاع الدولہ نواب اودھ کے ہاتھ پچاس لاکھ روپے میں بیچ دیئے گئے۔
4۔ روہیلوں کے خلاف شجاع الدولہ کی مدد کرنے کے عوض 40 لاکھ روپیہ کمپنی کے لئے حاصل کیا۔

روہیلوں کی لڑائی 1774ء : روہیلے کون تھے کے عنوان سے ان کا الگ ذکر بھی کہیں ملے گا۔ مختصراً واضح ہو۔ کہ روہیلے جنگجو افغان تھے۔ وہ اودھ کے شمال مغربی علاقہ میں جسے ان کے نام پر روہیلکھنڈ کہتے ہیں رہا کرتے تھے۔ ان کا سردار ایک شخص حافظ رحمت خان تھا۔ مرہٹے ان کے زرخیز ملک پر اکثر حملے کرتے رہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے شجاع الدولہ نواب اودھ سے مرہٹوں کے خلاف مدد مانگی۔ اور اس مدد کے بدلے 40 لاکھ روپے دینے کا اقرار کیا۔

1773ء میں مرہٹوں نے روہیلکھنڈ پر حملہ کیا۔ لیکن کسی وجہ سے وہ بغیر لڑائی لڑے واپس چلے گئے۔ اب نواب شجاع الدولہ نے اپنی رقم کا مطالبہ کیا لیکن روہیلوں نے ٹال مٹول کی۔ اس پر نواب نے انتقام لینے کے لئے ہیسٹنگز سے مدد مانگی۔ اور وعدہ کیا کہ میں جنگ کا تمام خرچ بھی برداشت کروں گا۔ اور کمپنی کو 40 لاکھ روپیہ بھی دوں گا۔ ہیسٹنگز نے انگریزی فوج کا ایک دستہ بھیج دیا۔ روہیلوں کو میراں پور کٹرہ کے مقام پر شکست ہوئی۔ اور ان کا سردار حافظ رحمت خاں مارا گیا۔ ہزارہا روہیلے ملک چھوڑ کر چلے گئے اور روہیلکھنڈ اودھ میں شامل کر لیا گیا۔

ہیسٹنگز کا روہیلوں کے خلاف نواب اودھ کی مدد کرنا اخلاقی طور پر سراسر ناجائز تھا۔ کیونکہ روہیلوں نے کمپنی کے برخلاف کبھی کوئی کارروائی نہیں کی تھی۔ البتہ سیاسی لحاظ سے اس کی صفائی میں اتنا کہا جا سکتا ہے۔ کہ کمپنی کو ایک معقول رقم مل گئی۔ اور روہیلکھنڈ کا علاقہ نواب اودھ کے قبضہ میں آجانے سے انگریزوں کی شمال مغربی سرحد مضبوط ہوگئی۔

وارن ہیسٹنگز کا ریگولیٹنگ ایکٹ 1773ء : وجہ۔ ریگولیٹنگ ایکٹ کے پاس ہونے کی ایک وجہ یہ تھی کہ انگریزی کمپنی اب صرف تجارتی کمپنی ہی نہیں بلکہ کچھ علاقے فتح کرکے وہ ایک حکمران کمپنی بن چکی تھی۔ اس لئے پارلیمنٹ نے مناسب سمجھا کہ کمپنی کے معاملات کی نگرانی کی جائے دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ کمپنی کے ملازم ذاتی تجارت سے خوب روپیہ کما رہے تھے۔ اس لئے کمپنی کی مالی حالت اس قدر ابتر ہو چکی تھی کہ 1772ء میں کمپنی کے ڈائریکٹروں نے انگلینڈ کی سرکار سے اپنا کام جاری رکھ سکنے کے لئے دس لاکھ پونڈ قرض مانگا۔ اور جب کمپنی کے کام کی تحقیقات کی گئی۔ تو پتہ لگا کہ کمپنی کی حالت نہایت نازک ہے۔ چنانچہ پارلیمنٹ نے کمپنی کے معاملات کی اصلاح کرنے کے لئے 1773ء میں ریگولیٹنگ ایکٹ پاس کیا۔

ریگولیٹنگ ایکٹ کی دفعات :

1۔ کمپنی کے ڈائریکٹروں کے لئے یہ لازمی قرار دیا گیا کہ وہ دیوانی اور فوجی معاملات کے متعلق تمام ضروری کاغذات کشور انگلستان کے وزیروں کے سامنے پیش کیا کریں۔
2۔ بنگال کے گورنر کو ہندوستان میں انگریزی مقبوضات کا گورنر جنرل بنا دیا گیا۔ اور اس کے صلاح مشورے کے لئے چار ممبروں کی ایک کونسل بنائی گئی۔ گورنر جنرل کو اکثریت کا فیصلہ ماننا لازمی تھا۔ لیکن اسے کاسٹنگ ووٹ کا اختیار تھا۔
3۔ احاطہ بمبئی اور مدراس کے گورنرز خارجی پالیسی یعنی جنگ اور صلح کے معاملات میں گورنر جنرل کے ماتحت کر دیئے گئے۔ لیکن انہیں یہ اختیار دیا گیا کہ اشد ضرورت کے وقت وہ اپنی مرضی سے کام کرسکتے ہیں۔
4۔ کلکتہ میں ایک عدالت عالیہ قائم کی گئی۔ جس میں چیف جسٹس کے علاوہ تین اور جج تھے۔
5۔ کمپنی کے تمام ملازموں کو ذاتی تجارت میں حصہ لینے اور نذرانے قبول کرنے وغیرہ کی ممانعت کر دی گئی۔

ریگولیٹنگ ایکٹ کے نقائص : ریگولیٹنگ ایکٹ میں کئی نقائص تھے۔ جن سے یہ ادھورا اور نامکمل ثابت ہوا۔

1۔ سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ گورنر جنرل کو اپنی کونسل پر پورا اختیار نہ تھا۔ اور چونکہ ہر ایک بات کثرت رائے سے پاس ہوتی تھی۔ اس لئے کونسل کے ممبر گورنر جنرل کے خلاف متحد ہو کر جو چاہیں کرسکتے تھے۔
2۔ اس ایکٹ میں یہ واضح نہیں کیا گیا تھا کہ عدالت عالیہ کے کیا اختیارات ہوں گے۔ اور اس کا تعلق گورنر جنرل کی کونسل کے ساتھ کیا ہوگا۔
3۔ بمبئی اور مدراس کے گورنر اگرچہ خارجی پالیسی میں گورنر جنرل کے ماتحت تھے۔ لیکن

اشد ضرورت کا بہانہ کر کے وہ اپنی مرضی سے کام کرتے تھے۔
ان خامیوں کے باوجود ریگولیٹنگ ایکٹ انگریزی نظام حکومت کی بنیاد تھا۔

وارن ہیسٹنگز۔ پہلا گورنر جنرل 1774ء سے 1785ء

واقعات

(1) کونسل سے جھگڑا (2) نند کمار کو پھانسی (3) مرہٹوں کی پہلی جنگ (4) میسور کی دوسری جنگ (5) چیت سنگھ کی معزولی (6) بیگمات اودھ کا معاملہ (7) پٹس انڈیا بل۔

کونسل سے جھگڑا : ریگولیٹنگ ایکٹ کا نفاذ 1774ء میں ہوا۔ اور پہلا گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز بنا۔ اس کی کونسل کے چار ممبر فرانس ۔ کلیورنگ۔ مانسن اور بارویل تھے۔ لیکن سوائے بارویل کے تمام اس کے دشمن تھے۔ اور چونکہ کونسل میں ان کی اکثریت تھی۔ اس لیے ہیسٹنگز کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر دو سال بعد مانسن مرگیا۔ اور اس سے اگلے سال کلیورنگ فوت ہوگیا۔ اس سے ہیسٹنگز کو کونسل میں اقتدار حاصل ہوگیا۔ 1780ء میں فرانس بھی ہیسٹنگز کے ساتھ لڑائی میں زخمی ہوکر واپس چلا گیا۔ اور ہیسٹنگز کو مخالفوں سے نجات مل گئی۔

نند کمار : راجہ نند کمار ایک اعلے خاندان کا بنگالی برہمن تھا۔ اور کسی وجہ سے گورنر جنرل سے عداوت رکھتا تھا۔ 1775ء میں اس نے ہیسٹنگز پر یہ الزام لگایا۔ کہ اس نے میر جعفر کی بیوہ (منی بیگم) سے ساڑھے تین لاکھ روپیہ رشوت لی ہے۔ جب کونسل نے ہیسٹنگز سے اس الزام کی باز پرس کی۔ تو اس نے جوابدہی سے انکار کیا۔ اور نند کمار کے خلاف سازش کا مقدمہ کھڑا کر دیا۔ لیکن ابھی اس مقدمہ کا فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ کلکتہ کے ایک سیٹھ موہن پرشاد نے نند کمار کے خلاف جعل سازی کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اور اسے عدالت عالیہ سے پھانسی کی سزا ملی۔
نند کمار کے پھانسی دیئے جانے کے بعد بعض لوگوں نے یہ الزام لگایا کہ چونکہ چیف جسٹس امپے اور وارن ہیسٹنگز پرانے ہم جماعت تھے۔ اس لئے چیف جسٹس نے وارن ہیسٹنگز کا لحاظ کرتے ہوئے نند کمار کو پھانسی کی سزا دی ہے۔ یہ بات اغلباً غلط معلوم ہوتی ہے۔ لیکن غلط یا ٹھیک اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ لوگ وارن ہیسٹنگز سے ڈرنے لگے۔ اور پھر کسی کو یہ ہمت نہ پڑی کہ وارن ہیسٹنگز پر کوئی الزام لگائے۔

مرہٹوں کی پہلی جنگ 1775ء سے 1782ء

(The First Maratha War)

جنگ کی وجہ : 1772ء میں نارائن راؤ مرہٹوں کا پانچواں پیشوا بنا۔ لیکن اس کے چچا راگھوبا نے جو پیشوا بننے کا بڑا خواہشمند تھا۔ اسے قتل کروا دیا۔ اور خود پیشوا بننے کی کوشش کرنے لگا۔ نانا فرنویس نے جو ایک لائق مرہٹہ سردار تھا اس کی مخالفت کی۔ اور نارائن راؤ کے بیٹے مادھیو راؤ نرائن کو جو اپنے باپ کی وفات کے بعد پیدا ہوا تھا۔ پیشوا کی گدی پر بٹھا کر خود اس کا سرپرست بن گیا۔ اور بہت سے مرہٹہ سردار نانا فرنویس کے ساتھ مل گئے۔

اس طرح ناکام رہنے کے بعد راگھوبا نے حکومت بمبئی سے مدد مانگی۔ اور معاہدہ سورت طے پایا۔ جس کی رو سے فیصلہ ہوا کہ راگھوبا اس مدد کے عوض سالسٹ اور بیسن کے علاقے انگریزوں کو دے دے گا۔ اس معاہدہ کے فوراً بعد انگریزوں نے سالسٹ پر قبضہ کرلیا۔ مگر بنگال گورنمنٹ نے اس معاہدہ کو مسترد کردیا۔ کیونکہ یہ ان کی منظوری کے بغیر طے پایا تھا۔ اور انہوں نے نانا فرنویس کے ساتھ 1776ء میں پورندھر کے مقام پر ایک نیا عہد نامہ کرلیا۔ جس سے فیصلہ ہوا کہ اگر سالسٹ کا جزیرہ انگریزوں کے پاس رہنے دیا جائے۔ تو وہ راگھوبا کی مدد نہیں کریں گے۔ لیکن اتنے میں عہد نامہ سورت کے متعلق انگلینڈ سے ڈائریکٹروں کی منظوری آگئی۔ اس لئے انگریزی حکومت کو راگھوبا کا ہی ساتھ دینا پڑا۔

واقعات : انگریزی فوج کا ایک دستہ راگھوبا کی مدد کے لئے بمبئی سے پونا کی طرف روانہ ہوا۔ مگر اسے راستے میں ہی شکست فاش ہوئی۔ اور انگریزی افسروں کو وار گاؤں کے مقام پر ایک ذلت آمیز معاہدہ کرنا پڑا۔ لیکن ڈائریکٹروں نے اس معاہدہ کو نامنظور کر دیا۔ اور جنگ بدستور جاری رہی۔ جنرل گوڈارڈ نے احمد آباد فتح کرلیا۔ اور میجر پوپ ہم نے گوالیار کے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔

اب وارن ہیسٹنگز جنگ کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ایک تو خرچ بڑا ہی ہو رہا تھا۔ اور دوسرے دکن میں حیدر علی کا اقتدار بڑھتا جاتا تھا۔ چنانچہ 1782ء میں عہدنامہ سلبئی کی رو سے جنگ ختم ہوگئی۔

نتیجہ : عہد نامہ سلبئی 1782ء کی رو سے (1) مادھو راؤ نرائن کو پیشوا تسلیم کرلیا گیا۔ (2) سالسٹ کا جزیرہ انگریزوں کو مل گیا۔ (3) راگھوبا کی تین لاکھ روپے سالانہ پنشن مقرر کر دی گئی۔

میسور کی دوسری جنگ 1780ء سے 1784ء

اسباب :

(1) میسور کی پہلی جنگ کے بعد انگریزوں نے حیدر علی والئے میسور سے وعدہ کیا تھا کہ اگر کبھی کسی دشمن نے اس پر چڑھائی کی۔ تو وہ اس کی مدد کریں گے۔ مگر اس وعدے کے کچھ عرصہ بعد جب مرہٹوں نے اس پر حملہ کیا۔ تو انگریزوں نے اس کی مدد نہ کی۔ اس سے حیدر علی بہت ناراض تھا۔

(2) امریکہ کی جنگ آزادی میں جو حکومت انگلستان اور امریکہ کے نو آباد کاروں کے درمیان ہوئی۔ فرانس 1778ء میں انگلینڈ کے خلاف شامل ہوگیا تھا۔ اس پر انگریزوں نے ہندوستان میں فرانسیسی مقبوضات پر قبضہ کرلیا۔ ان میں ایک بندرگاہ ماہی بھی تھی۔ جس سے حیدر علی کو بہت فائدہ تھا۔ چنانچہ اس نے انگریزوں سے ماہی کو خالی کر دینے کا مطالبہ کیا۔ لیکن انگریزوں نے اس کی پرواہ نہ کی۔ اس پر حیدر علی نے جنگ چھیڑ دی۔

واقعات : حیدر علی ایک جرار لشکر کے ساتھ کرناٹک پر حملہ آور ہوا۔ اور تمام علاقے کو تہ و بالا کر دیا۔ انگریزی کرنل بیلی کو شکست ہوئی۔ اور بکسر کا فاتح میجر منرو بھی اپنی توپیں کانجی درم کے ایک تالاب میں پھینک کر مدراس کو بھاگ گیا۔ اس کے بعد سرآئر کوٹ حیدر علی کے خلاف بڑھا اور اس نے پورٹو نووو پولی لور اور سولن گڑھ کے مقامات پر حیدر علی کو شکستیں دیں۔ اس وقت فرانس سے ایک امدادی فوج پہنچی۔ جس سے حیدر علی کا حوصلہ بڑھ گیا۔ لیکن ابھی لڑائی جاری تھی۔ کہ 1783ء میں حیدر علی انتقال کرگیا۔ حیدر علی کی موت کے بعد اس کے لڑکے ٹیپو سلطان نے جنگ جاری رکھی۔ اور کئی ایک علاقے بھی فتح کئے۔ آخر 1784ء میں عہد نامہ منگلور کی رو سے فریقین میں صلح ہوگئی۔

نتیجہ : عہد نامہ منگلور کی رو سے ایک دوسرے کے مفتوحہ علاقے اور جنگی قیدی واپس کر دیئے گئے۔

ہیسٹنگز کی مالی مشکلات : وارن ہیسٹنگز کو بڑی سخت مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ مرہٹوں اور حیدر علی کے خلاف جنگوں پر بہت سا روپیہ خرچ آگیا تھا۔ اس کے علاوہ انتظام حکومت کے لئے بھی روپیہ درکار تھا۔ ادھر کمپنی کے ڈائریکٹروں کی طرف سے بھی روپیہ کا مطالبہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ روپے کی ضرورت سے پریشان ہوکر ہیسٹنگز نے چند ایک ناجائز کاروائیوں سے روپیہ حاصل کیا۔ ان کاروائیوں میں سے دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

چیت سنگھ کی معزولی : چیت سنگھ کمپنی کے ماتحت بنارس کا راجہ تھا۔ وہ ہر سال ساڑھے چوبیس لاکھ روپیہ کمپنی کو خراج دیا کرتا تھا۔ ہیسٹنگز نے اس سے 5 لاکھ روپیہ سالانہ کا مزید مطالبہ

کیا۔ چیت سنگھ نے دو سال تو یہ رقم ادا کی۔ لیکن پھر ٹال مٹول کی اس پر ہیسٹنگز نے راجہ پر 50 لاکھ روپیہ جرمانہ کیا۔ اور اس کی وصولی کے لئے بنارس گیا اور راجہ کو گرفتار کرلیا۔ اس واقعہ سے رعایا ہیسٹنگز کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور وارن ہیسٹنگز جان بچا کر چنار کی طرف بھاگ نکلا۔ اس معاملہ سے کمپنی کو کوئی خاص روپیہ ہاتھ نہ لگا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ چیت سنگھ کو معزول کرکے اس کے بھتیجے کو راجہ بنا دیا گیا۔ اور خراج کی رقم بڑھا کر چالیس لاکھ روپیہ سالانہ کر دی گئی۔

2۔ **بیگمات اودھ کا معاملہ** : جب بنارس سے کوئی خاص روپیہ ہاتھ نہ لگا۔ تو ہیسٹنگز نے ایک اور طریقہ سوچا۔ آصف الدولہ نواب اودھ کے ذمہ انگریزوں کا بہت سا روپیہ تھا۔ کیونکہ اس نے پچھلے کئی سالوں سے اپنے صوبہ میں مقیم انگریزی فوج کا خرچ ادا نہیں کیا تھا۔ ہیسٹنگز نے اس سے روپیہ طلب کیا۔ مگر اس نے جواب دیا کہ میرے پاس روپیہ نہیں۔ کیونکہ میری ماں اور دادی (بیگمات اودھ) نے تمام روپیہ اپنے قبضہ میں کر لیا ہوا ہے۔ اگر آپ بیگمات سے روپیہ حاصل کرنے میں میری مدد کریں تو میں اپنا تمام قرضہ بیباق کر دوں گا۔ ہیسٹنگز نے اس کام میں اس کی مدد کی۔ اور بیگمات کو تنگ کرکے 76 لاکھ روپیہ حاصل کرلیا۔

ہیسٹنگز کی مندرجہ بالا دونوں کاروائیاں ناجائز تھیں۔ اس نے چیت سنگھ اور بیگمات کے ساتھ جابرانہ سلوک کیا۔ چنانچہ جب وہ واپس انگلینڈ گیا۔ تو اس پر ان دو اور چند دیگر الزامات مثلاً رشوت خوری اور روہیلوں کی لڑائی میں نواب اودھ کی مدد کرنے کی بناء پر مقدمہ چلایا گیا۔ جو تقریباً سات سال جاری رہا۔ اس میں اس کا سب اندوختہ روپیہ خرچ ہوگیا۔ مگر آخر کار وہ بری کر دیا گیا۔ اور اس کی پینشن مقرر کر دی گئی۔

پٹس انڈیا بل 1784ء

(A short note on Pitt's India Bill)

وجوہات :

1۔ ریگولیٹنگ ایکٹ میں کئی خامیاں رہ گئی تھیں۔ اس لئے 1784ء میں انگلینڈ کے وزیر اعظم پٹ نے ہندوستان کے نظام حکومت کو درست کرنے کے لئے ایک نیا قانون بنوایا۔

2۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ 1783ء میں امریکہ انگریزوں سے آزاد ہوگیا تھا۔ اور اب انہیں ڈر تھا کہ کہیں ہندوستان بھی ہاتھ سے نہ جاتا رہے۔ اس لئے وہ ایسٹ انڈیا کمپنی پر قابو پانا چاہتے تھے۔

بل کی دفعات :

1۔ اس بل کی خاص بات یہ تھی کہ کمپنی کا تجارتی کام سیاسی کام سے الگ کر دیا گیا۔ تجارتی کام تو ڈائریکٹروں کے ماتحت ہی رہنے دیا گیا۔ لیکن سیاسی کام چھ ممبروں کے ایک بورڈ کے سپرد کیا گیا۔ جسے بورڈ آف کنٹرول کہتے تھے ان ممبروں کو بادشاہ خود مقرر کرتا تھا۔

2۔ کونسل کے ممبروں کی تعداد چار کی بجائے تین کر دی گئی۔

3۔ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ کمپنی کو عدم مداخلت کی پالیسی پر کاربند رہنا چاہئے۔ یعنی دیسی راجاؤں سے صلح یا جنگ نہیں کرنی چاہئے۔

اس بل کے پاس ہونے سے کمپنی کے معاملات میں پارلیمنٹ کو بہت عمل دخل حاصل ہوگیا۔

نظریہ ضرورت : البتہ ایک اور قانون کی رو سے گورنر جنرل کو اشد ضرورت کے وقت کونسل کی کثرت رائے کو رد کرنے کا بھی اختیار دے دیا گیا۔

وارن ہیسٹنگز کے کارنامے : وارن ہیسٹنگز ایک غیر معمولی قابلیت کا انسان تھا۔ اس کا شمار ہندوستان کے بہت بڑے گورنر جنرلوں اور انگلستان کے صف اول کے مدبروں میں کیا جاتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے کمپنی کے مقبوضات کو نہایت نازک وقت میں تباہ ہونے سے بچالیا۔ اور مفتوحہ علاقے میں ایک باقاعدہ اور منظم حکومت قائم کی۔

وارن ہیسٹنگز کی تقرری کے وقت کلایو کی دو عملی کی وجہ سے بنگال میں سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ نظام حکومت نہایت ناقص تھا۔ نہ کوئی قانون تھا اور نہ حکمرانی کا کوئی معیار۔ خزانہ بالکل خالی پڑا تھا۔ لگان کی وصولی کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ اور محکمہ انصاف کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔

وارن ہیسٹنگز نے آتے ہی دو عملی کا خاتمہ کیا۔ اور مفید اصلاحات جاری کیں۔ اس نے لگان وصول کرنے کا بہتر انتظام کیا۔ ہر ضلع میں انگریز کلکٹر مقرر کئے۔ دیوانی اور فوجداری عدالتیں قائم کیں۔ ایک مجموعہ قوانین تیار کیا اور کئی طرح سے اخراجات میں بچت کر کے کمپنی کی مالی حالت کو بہتر بنایا۔ اس طرح اس نے ملک کے اندر بد نظمی کو دور کر کے ایک باقاعدہ اور منظم حکومت قائم کر دی۔

اس کے علاوہ یہ زمانہ کمپنی کے لئے ایک کڑی آزمائش کا زمانہ تھا۔ مرہٹے اور حیدر علی انگریزوں کے دشمن تھے۔ ادھر انگلینڈ امریکہ کی جنگ آزادی میں مصروف تھا۔ اور وہاں سے کوئی مدد نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اس پر طرفہ یہ کہ ہسٹنگز کی اپنی کونسل اس کے خلاف تھی۔ لیکن ہیسٹنگز نے ایسے نازک وقت میں بڑے حوصلہ اور تدبر کا ثبوت دیا۔ اس نے مرہٹوں اور حیدر علی کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ اور کمپنی کے مقبوضات کو تباہ ہونے سے بچائے رکھا۔ بلکہ انگریزی حکومت کی بنیادوں کو مضبوط اور مستحکم کرنے والا ہیسٹنگز ہی تھا۔ بدیں وجہ ہیسٹنگز ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قائم کرنے والوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتا ہے۔ جس سے آج کل مسلمان حاکموں کو بھی سبق حاصل کرنا چاہئے۔ جو قومی اور ملی مفادات کو یکسر بھول جاتے ہیں۔

لارڈ کارنوالس 1786ء سے 1793ء

واقعات

(1) اصلاحات (2) بندوبست استمراری (3) میسور کی تیسری جنگ

Brief account of the administration of Lord Cornwallis with Special reference to his judicial and revenue reforms.

کارنوالس کا تقرر : کارنوالس انگلستان کا ایک بڑا معزز دولت مند اور بارسوخ زمیندار تھا۔ وہ گورنر جنرل کے عہدہ کے علاوہ کمانڈر انچیف بھی مقرر ہوکر آیا تھا۔ اور اسے ایک ترمیم کی رو سے اپنی کونسل کی رائے کو رد کرنے کا اختیار بھی مل گیا۔

اصلاحات : لارڈ کارنوالس کا نام اصلاحات کی وجہ سے مشہور ہے اس کی یہ اصلاحات تین حصوں میں تقسیم ہوسکتی ہیں۔ (1) رشوت ستانی کا انسداد (2) عدالتی اصلاحات (3) مالگزاری کی اصلاحات یعنی بنگال کا بندوبست استمراری۔

1۔ رشوت ستانی کا انسداد : اس وقت کمپنی کے ملازمین کی تنخواہیں بڑی قلیل تھیں۔ اور پنشن کا بھی کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس لئے کمپنی کے ملازم اپنی آمدنی کو بڑھانے کے لئے ذاتی تجارت بھی کرتے تھے اور رشوت بھی خوب لیتے تھے۔ کارنوالس نے آتے ہی اس خرابی کا خاتمہ کر دیا۔ اس نے تنخواہیں معقول کر دیں اور ذاتی تجارت اور رشوت ستانی کے خلاف سخت قانون بنا دیئے۔

2۔ عدالتی اصلاحات

(1) کارنوالس کی آمد سے پیشتر کلکٹر کے ذمہ دو کام تھے وہ ضلع کی مالگزاری بھی وصول کرتا تھا۔ اور دیوانی عدالت کا جج بھی ہوتا تھا۔ کارنوالس نے یہ دونوں کام علیحدہ کر دیئے۔ کلکٹر کا کام صرف مالگذاری وصول کرنا مقرر کیا گیا۔ اور دیوانی عدالتوں کے لئے علیحدہ ڈسٹرکٹ جج مقرر کئے گئے۔

(2) ان ڈسٹرکٹ عدالتوں کے خلاف اپیل سننے کے لئے چار بڑی عدالتیں کلکتہ۔ ڈھاکہ۔ مرشد آباد اور پٹنہ میں قائم کی گئیں۔ لیکن اپیل کی آخری عدالتیں پہلے کی طرح صدر دیوانی عدالت اور صدر نظامت عدالت ہی رہیں۔

(3) پرانے زمانہ کی وحشیانہ سزائیں ہاتھ پاؤں کاٹ دینا وغیرہ منسوخ کر دی گئیں۔

(4) ایک نیا ضابطہ قوانین شائع کیا گیا۔ جسے کارنوالس کوڈ کہتے تھے۔

(5) محکمہ پولیس میں بھی اصلاح کی گئیں۔ پولیس کے انتظام کے لئے ہر ایک ضلع کئی تھانوں

میں تقسیم کیا گیا۔ اور ہر تھانہ میں ایک داروغہ مقرر کیا گیا۔ جس کے ماتحت کئی سپاہی ہوتے تھے۔

کارنوالس کی اصلاحات بڑی مفید تھیں۔ لیکن اس نے ایک غلطی کی۔ کہ اس نے یہ قاعدہ بنا دیا کہ ہندوستانی لوگ کسی اعلے عہدہ پر مقرر نہ کئے جائیں۔ کیونکہ اسے ان کی قابلیت پر اعتماد نہ تھا۔ اس سے نظام حکومت بہت مہنگا ہو گیا کیونکہ اس کی اعلیٰ انگریز آفیسروں کو خطیر تنخواہیں دینا لازمی تھا۔

3۔ **بندوبست استمراری** : کارنوالس کے زمانے کا سب سے مشہور واقعہ بنگال کا بندوبست استمراری (Permanent Settlement of Bengal) ہے۔ انگریزی حکومت قائم ہونے سے پہلے مالگذاری وصول کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ مقامی افسر جنہیں زمیندار کہتے تھے۔ کاشتکاروں سے لگان وصول کرکے سرکاری خزانہ میں داخل کرا دیتے تھے اور اپنی کمیشن رکھ لیتے تھے۔ رفتہ رفتہ زمینداری کا عہدہ موروثی ہو گیا۔

جب عہد نامہ آلہ آباد کی رو سے 1765ء میں بنگال بہار اور اڑیسہ کی دیوانی انگریزوں کو مل گئی۔ تو کلایو نے مالگزاری وصول کرنے کے سابقہ طریقہ میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ مگر وارن ہیسٹنگز نے آمدنی بڑھانے کے لئے زمینیں ٹھیکے پر دینی شروع کر دیں۔ یعنی جو شخص زیادہ بولی دے۔ وہ زمیندار مقرر ہو جائے۔ پہلے تو یہ ٹھیکہ پانچ سال کے لئے دیا گیا۔ لیکن پھر سالانہ کر دیا گیا۔ مگر یہ طریقہ نہایت ناتسلی بخش ثابت ہوا۔ اس میں کئی نقائص تھے۔

اول : یہ کہ زمیندار نیلامی کے وقت اتنی زیادہ بولی دے دیتے تھے کہ وہ اس رقم کو زمین کی آمدنی سے پورا نہ کرسکتے تھے۔ اس سے حکومت کی آمدنی نہایت غیر یقینی ہو گئی۔

دوم : یہ کہ چونکہ کسی زمیندار کو یقین نہیں ہوتا تھا کہ آیا اگلے سال اس زمین کا ٹھیکہ اسے ہی ملے گا یا نہیں۔ اس لئے وہ زمین کی حالت بہتر بنانے میں چنداں دلچسپی نہ لیتے تھے۔

سوم : انہیں یہ بھی ڈر تھا کہ زمین کی حالت بہتر ہو جانے کی صورت میں ٹھیکہ کی رقم بڑھا دی جائے گی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت ساری زمینیں بنجر ہو گئیں۔ چنانچہ کمپنی کے ڈائریکٹروں نے اس طریقہ کو ناپسند کیا۔ جب لارڈ کارنوالس گورنر جنرل بن کر آیا۔ تو بڑے غور و خوض کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ زمین کی حالت کو بہتر بنانے اور کمپنی کی آمدنی کو یقینی کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ زمینداروں کو اس امر کا یقین دلایا جائے کہ زمین ہمیشہ انہیں کے پاس رہے گی۔ اور زمین کی حالت بہتر بنانے کی صورت میں لگان نہیں بڑھایا جائے گا۔ چنانچہ 1793ء میں لارڈ کارنوالس نے زمین ہمیشہ کے لئے زمینداروں کی ملکیت قرار دے دی۔ اور سرکاری لگان بھی ہمیشہ کے لئے ایک ہی مقرر کر دیا۔ اس طریقے کو بندوبست استمراری یا دوامی بندوبست کہتے ہیں۔

بندوبست استمراری کے فائدے :

1۔ چونکہ لگان کی رقم ہمیشہ کے لئے مقرر ہوگئی تھی۔ اس لئے اب زمینداروں نے اپنی زمینوں کو بہتر بنانا شروع کیا۔ اور زراعت زیادہ ہونے لگ گئی۔
2۔ سرکار کی آمدنی جو پہلے غیر یقینی ہوتی تھی۔ اب مستقل اور معین ہوگئی۔ اور سالانہ بجٹ بنانا آسان ہوگیا۔
3۔ سرکار کو بار بار بندوبست کرنے کی پریشانی سے نجات مل گئی۔
4۔ بنگال ہندوستان میں سب سے زرخیر صوبہ بن گیا۔ زمیندار دولت مند ہوگئے۔ اور خوفناک قحط پیشتر کی نسبت کم ہوگئے۔
5۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بنگال میں زمینداروں کی ایک وفادار جماعت قائم ہوگئی۔ کیونکہ وہ اس حکومت کی مہربانی سے ہی امیر بنے تھے۔ ان لوگوں نے غدر کے ایام میں سرکار انگریزی کی بہت خدمت کی۔

بندوبست استمراری کے نقائص :

1۔ بندوبست دوامی سے اگرچہ زمینداروں کو فائدہ ہوا۔ مگر کاشت کاروں کی حالت پہلے سے بدتر ہوگئی۔ کیونکہ اس بات پر کوئی پابندی نہ تھی کہ زمیندار کاشت کاروں سے کتنی رقم وصول کریں۔ وہ بچارے زمینداروں کے رحم پر ہوگئے۔ اور ان کی حفاظت کے لئے بعد میں کئی قانون بنانے پڑے۔
2۔ گورنمنٹ کے اخراجات آئے دن بڑھتے جاتے تھے مگر چونکہ ان کی آمدنی کی رقم مقررہ تھی۔ اس لئے گورنمنٹ کو نقصان رہنے لگا۔
3۔ اس نقصان کو پورا کرنے کے لئے سرکار کو دوسرے صوبوں پر زیادہ ٹیکس لگانے پڑے۔

میسور کی تیسری جنگ 1790ء سے 1792ء

وجہ : 1789ء میں ٹیپو سلطان نے ٹراونکور کی ہندو ریاست پر حملہ کردیا۔ وہاں کا راجہ انگریزوں کی حفاظت میں تھا۔ چنانچہ اس نے کارنوالس سے مدد کی درخواست کی۔ کارنوالس نے مرہٹوں اور نظام کو ساتھ ملا کر سلطان ٹیپو کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔

واقعات : شروع شروع میں انگریز کو ناکامیابی ہوئی۔ اس لئے لارڈ کارنوالس نے خود فوج کی کمانڈ کی۔ اس نے بنگلور پر قبضہ کرلیا۔ اور آگے بڑھ کر ٹیپو کو۔۔ شکست دی۔ لیکن سامان رسد کی کمی کے باعث گورنر جنرل کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ 1793ء میں کارنوالس نے پھر جنگ شروع کردی۔ اور ٹیپو کو سرنگا پٹم میں محصور کرلیا۔ آخر مقابلہ کی تاب نہ لاکر ٹیپو نے صلح کرلی۔ آخر مقابلہ کی تاب نہ لاکر ٹیپو نے صلح کرلی۔ اور عہد نامہ سرنگا پٹم قرار دیا۔

عہد نامہ سرنگا پٹم 1792ء : اس عہد نامہ کی رو سے ٹیپو نے اپنی آدھی سلطنت انگریزوں کے حوالے کر دی۔ اور تین کروڑ روپیہ تاوان جنگ اور دو بیٹے یرغمال کے طور پر دیئے۔

نتیجہ : مفتوحہ علاقہ اتحادیوں نے آپس میں بانٹ لیا۔ ڈنڈیگل۔ بارامحل اور مالا بار کے اضلاع انگریزوں کو ملے۔ میسور کا کچھ حصہ نظام کو اور کچھ مرہٹوں کو ملا۔ (میسور اور اس کی جنگوں کی تفصیلات کسی اور جگہ بھی ملاحظہ کریں)

سرجان شور 1793ء سے 1798ء

لارڈ کارنوالس کے بعد سر جان شور گورنر جنرل مقرر ہوا۔ وہ عدم مداخلت کی پالیسی کا زبردست حامی تھا۔

کرولا کی جنگ 1795 : مرہٹے ان دنوں عروج پر تھے۔ جب انہیں یقین ہوگیا کہ جان شور دیسی ریاستوں کے جھگڑوں میں مداخلت نہیں کرے گا۔ تو انہوں نے نظام پر چڑھائی کردی۔ نظام نے ایک سابقہ عہد نامہ کی شرائط کے مطابق انگریزوں سے مدد کی درخواست کی۔ لیکن سر جان شور نے صاف انکار کیا۔ نظام کو کھار دار (یا کرولا) کے مقام پر شکست فاش ہوئی۔ اس سے مرہٹوں کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ ساتھ ہی نظام انگریزوں سے بدظن ہوگیا۔ اور اس نے انگریزی افسروں کو نکال کر فرانسیسی افسر رکھ لئے۔

عدم مداخلت کی پالیسی : عدم مداخلت کی پالیسی سے یہ مراد ہے۔ کہ سرکار انگریزی دیسی ریاستوں کے معاملات میں دخل نہ دے۔ یوں تو اس پالیسی پر پہلے بھی کافی حد تک عمل ہوتا تھا۔

مگر پٹس انڈیا ایکٹ میں تو یہ بات درج کر دی گئی تھی کہ سرکار انگریزی دیسی ریاستوں کے معاملات میں دخل نہ دے۔ اور توسیع سلطنت کے خیال کو ترک کر دے۔

عدم مداخلت کی یہ پالیسی انگریزی اقتدار کے لئے نقصان دہ تھی۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ جب انگریز جان بوجھ کر کسی کار آمد موقعہ سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ تو ان کے دشمن اس سے فائدہ اٹھا کر اپنی طاقت کو مضبوط کرلیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ کئی گورنر جنرلوں نے اس پالیسی پر عملدرآمد نہ کیا۔

سر جان اشور اور سرجارج بارلو نے تو خاص کر اور لارڈ منٹو نے بھی کسی حد تک اس پالیسی پر عمل کیا۔ جس سے انگریزون کے وقار کو بہت نقصان پہنچا۔ لیکن لارڈ ولزلی اور مارکوئس آف ہیسٹنگز نے تو اس پالیسی کو ترک کر دیا۔ اور انگریزی سلطنت کو بہت وسعت دی۔ اس کے بعد عدم مداخلت کی پالیسی کا ذکر نہیں ملتا۔

لارڈ ولزلی 1798ء سے 1805ء

واقعات

(1) سب سڈی ایری سسٹم کا اجراء (2) میسور کی چوتھی جنگ (3) عہد نامہ بسین (4) مرہٹوں کی دوسری جنگ (5) مرہٹوں کی تیسری جنگ (6) الحاقات

لارڈ ولزلی : لارڈ ولزلی 1790ء سے 1805ء تک ہندوستان میں انگریزی مقبوضات کا گورنر جنرل رہا۔ وہ ایک نہایت ہی مدبر اور بیدار مغز حکمران تھا۔ اس کا شمار ہندوستان کے صف اول کے گورنر جنرلوں میں کیا جاتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے حب الوطنی اور قوم پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کمپنی کو ہندوستان میں افضل ترین طاقت بنا دیا۔

ولزلی کی پالیسی : ولزلی کی تقرری کے وقت کمپنی کی حالت بڑی نازک تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سر جان شور کی عدم مداخلت کی پالیسی نے کمزور ریاستوں کو انگریزی حکومت سے بدظن کر دیا تھا اور طاقتور ریاستیں اپنی اپنی طاقت کو بڑھانے اور کمپنی کی حکومت کا خاتمہ کرنے کی چالوں میں مصروف تھیں۔

نظام حیدر آباد انگریزوں کی عہد شکنی کی وجہ سے ان کا دشمن بنا ہوا تھا۔ ٹیپو سلطان اپنی سابقہ شکست کا انتقام لینا چاہتا تھا اور اس مدعا کے لئے فرانسیسیوں اور افغانستان کے امیر شاہ زمان سے سلسلہ جنبانی کر رہا تھا۔ مرہٹے وسط ہند میں خوب زوروں پر تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دیسی فرمانرواؤں کے درباروں میں فرانسیسی اقتدار بہت بڑھ گیا تھا۔ اس پر طرفہ یہ کہ فرانسیسی جرنیل نپولین بوناپارٹ ہندوستان کی فتح کے ارادہ سے مصر تک آپہنچا تھا۔

جب ولزلی نے کمپنی کی اس تشویشناک حالت پر غور کیا۔ تو وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ

انگریزی حکومت کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہندوستان میں حاکم اعلیٰ ہو کر رہے۔ چنانچہ اس نے عدم مداخلت کی پالیسی کو خیرباد کہہ کر پیش قدمی کی حکمت عملی اختیار کی اور سب سڈی ایری سسٹم کو اپنی پالیسی کا بنیادی اصول ٹھہرایا۔

سب سڈی ایری سسٹم : یہ کیا تھا؟ لارڈ ولزلی نے انگریزی طاقت کو ملک میں سب سے افضل بنانے کے لئے ایک خاص قسم کی سکیم تیار کی۔ جو سب سڈی ایری سسٹم یا امدادی طریقہ کے نام سے مشہور ہے۔

شرائط : اس سکیم کے ماننے والے فرمانرواؤں کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کی پابندی لازمی تھی۔

1۔ وہ کمپنی کو اپنا حاکم اعلیٰ تسلیم کریں۔
2۔ غیر انگریزی یورپین کو اپنی ریاست کی ملازمت سے نکال دیں۔
3۔ کسی فرمانروا کے ساتھ انگریزوں کی اجازت کے بنا صلح یا جنگ نہ کریں۔
4۔ اپنے دربار میں انگریزی ریزیڈنٹ رکھیں۔
5۔ اگر ان کے درمیان کوئی باہمی تنازعات اٹھ کھڑے ہوں تو انگریزوں کو ثالث مانیں۔
6۔ اپنے علاقے میں ایک کنٹنجنٹ انگریزی فوج رکھیں اور اس کا خرچ ادا کریں (بعد میں خرچ نقد دینے کی بجائے کوئی علاقہ دیا جانے لگا)۔ ان شرائط کی پابندی کے عوض کمپنی اس ریاست کو بیرونی حملوں اور اندرونی بغاوتوں سے بچانے کی ذمہ داری ہوگی۔

وجہ تسمیہ : چونکہ جو رقم فوج کے اخراجات کے لئے راجہ یا نواب ادا کرتے تھے۔ اسے سب سڈی کہتے تھے اس لئے اس سکیم کا نام سب سڈی ایری سسٹم پڑ گیا۔

کس کس نے مانا : ولزلی نے تمام بڑی بڑی ریاستوں کو سب سڈی ایری سسٹم کو قبول کرنے کی دعوت دی۔ اور اسے اپنے مدعا میں کافی کامیابی ہوئی۔

1۔ سب سے پہلے نظام حیدر آباد نے اسے قبول کیا کیونکہ وہ مرہٹوں سے شکست کھا کر کمزور ہو گیا تھا۔
2۔ ولزلی کے مجبور کرنے پر نواب اودھ نے بھی اسے قبول کرلیا۔
3۔ ٹیپو سلطان نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا۔ چنانچہ اس کے خلاف جنگ چھڑ گئی وہ میسور کی چوتھی جنگ میں مارا گیا۔ اور میسور کے راجہ کرشن نے اسے تسلیم کرلیا۔
4۔ پیشوا باجی راؤ ثانی نے ہلکر کے ہاتھوں شکست کھا کر بمبئی گورنمنٹ سے عہد نامہ بسین کیا۔ اور سب سڈی ایری سسٹم قبول کرلیا۔
5۔ بھونسلہ اور سیندھیا نے مرہٹوں کی دوسری جنگ میں شکست کھا کر اسے تسلیم کرلیا۔
6۔ اس کے علاوہ گائیکواڑ اور کئی راجپوت ریاستوں نے اسے قبول کرلیا۔

فوائد : انگریزوں کے لیے یہ سسٹم بڑا فائدہ مند ثابت ہوا اس سے انگریزوں کی پوزیشن مضبوط ہوگئی۔ بہت سی ریاستوں پر سرکار انگریزی کا اقتدار قائم ہوگیا۔ اور وہ آپس میں انگریزوں کے خلاف عہد و پیمان کرنے سے قاصر ہوگئیں۔ فرانسیسی اثر و رسوخ کا خاتمہ ہوگیا۔ اور انگریزوں کی ضرورت کے لئے ایک تربیت یافتہ فوج بغیر انگریزی خرچ کے تیار ہوگئی۔ مختصر یہ کہ کمپنی ملک میں افضل ترین طاقت بن گئی۔

نقائص : لیکن اس سسٹم میں ایک بڑا بھاری نقص بھی تھا۔ اور وہ یہ کہ چونکہ راجاؤں اور نوابوں کو بیرونی حملوں اور اندرونی بغاوتوں کا ڈر نہ رہا۔ اس لئے وہ لاپرواہ اور عیاش ہوگئے۔ اور ریاستوں میں بدامنی پھیل گئی۔

میسور کی چوتھی جنگ 1799ء

یہ جنگ انگریزوں اور ٹیپو سلطان کے درمیان ہوئی۔

وجوہات :

(1) ٹیپو انگریزوں سے اپنی سابقہ شکست کا انتقام لینے کے لئے فرانسیسیوں سے ساز باز کر رہا تھا۔ جب اس سے وجہ پوچھی گئی تو اس نے بڑا تحقیر آمیز جواب دیا۔

(2) ولزلی نے اسے سب سڈی ایری سسٹم قبول کرنے کو کہا۔ لیکن اس نے انکار کیا۔ اس پر جنگ شروع ہوگئی۔

واقعات : ٹیپو کے خلاف دو فوجیں روانہ کی گئیں۔ ایک مدراس سے جنرل ہیرس کے ماتحت اور دوسری بمبئی سے جنرل سٹورٹ کے ماتحت۔ نظام نے اپنی امدادی فوج گورنر جنرل کے بھائی آرتھر ولزلی (جو بعد میں ڈیوک آف ولنگٹن کے نام سے مشہور ہوا) کے ماتحت روانہ کی۔ ٹیپو نے پہلے بمبئی والی فوج کا مقابلہ کیا۔ لیکن سدا سیر کے مقام پر شکست کھائی۔ پھر اس نے مدراس والی فوج کا مقابلہ کیا۔ لیکن ملاولی کے مقام پر شکست کھائی۔ اور ٹیپو اپنے قلعہ سرنگا پٹم میں محصور ہوگیا۔ اور وہیں لڑتا ہوا شہادت پا گیا۔

نتیجہ : اس جنگ سے انگریزوں کے ایک زبردست حریف ٹیپو سلطان کا خاتمہ ہوگیا۔ اور فرانسیسی ہندوستانی مدد سے محروم ہوگئے۔ ریاست میسور کا کچھ حصہ پرانے معزول شدہ ہندو خاندان کے ایک راج کمار کرشن کے حوالے کیا گیا اور ٹیپو کے لڑکوں کو ویلور بھیج دیا گیا۔ ریاست میسور سب سڈی ایری سسٹم کے ماتحت آگئی۔ کیونکہ نئے راجہ نے اسے قبول کر لیا تھا۔

عہد نامہ بسین 1802ء

(A short note on the treaty of Bassein)

1800ء میں مرہٹہ مدبر نانا فرنویس انتقال کرگیا۔ اور اس کے مرتے ہی مرہٹوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ دولت راؤ سیندھیا اور جسونت راؤ ہلکر جو اس وقت مرہٹوں میں سب سے طاقت ور سردار تھے۔ پیشوا باجی راؤ ثانی کو اپنے اپنے زیر اثر لانا چاہتے تھے۔ پیشوا نے سیندھیا کا ساتھ دیا۔ لیکن ہلکر نے پیشوا اور سیندھیا کی متحدہ فوجوں کو پونا کے مقام پر شکست فاش دی۔ پیشوا بھاگ کر بسین میں انگریزوں کی پناہ میں چلا گیا اور وہاں اس نے 31 دسمبر 1802ء کو عہد نامہ بسین کرلیا۔

اس عہد نامہ کی رو سے پیشوا نے سب سڈی ایری سسٹم کی تمام شرائط تسلیم کرلیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ

1۔ وہ انگریزوں کو حاکم اعلیٰ تسلیم کرے گا۔
2۔ فرانسیسیوں کو اپنے دربار میں نہ رکھے گا۔
3۔ ایک امدادی فوج اپنے پاس رکھے گا۔ جس کے خرچ کے لئے 26 لاکھ روپیہ سالانہ دے گا۔
4۔ انگریزوں کی اجازت کے بغیر کسی سے صلح یا جنگ نہیں کرے گا۔
5۔ گائیکواڑ اور نظام کے ساتھ جو اس کے تنازعات ہیں۔ ان میں انگریزوں کو ثالث منظور کرے گا۔

اس پر انگریزوں نے اسے پونا میں بحفاظت پہنچا کر پیشوا کی گدی پر بٹھا دیا۔

اہمیت : یہ عہد نامہ ہندوستان کے اہم ترین عہد ناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ پیشوا کے سب سڈی ایری سسٹم قبول کرلینے سے ظاہر طور پر تمام مرہٹہ سرداروں کی آزادی چھن گئی۔

مرہٹوں کی دوسری جنگ 1803ء

وجہ : سیندھیا اور بھونسلا نے عہد نامہ بسین کو قومی توہین سمجھا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا۔ کہ پیشوا کا انگریزوں کی اطاعت قبول کر لینا گویا ساری مرہٹہ قوم کی آزادی کا چھن جانا ہے۔ اس لئے انہوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی لیکن ہلکر اس لڑائی سے الگ رہا۔

واقعات : اس جنگ کے دو مرکز تھے۔ (1) دکن (2) شمالی ہندوستان۔

دکن کی کمان گورنر جنرل کے بھائی سر آرتھر ولزلی کے سپرد کی گئی۔ اس نے سب سے

پہلے احمد نگر پر قبضہ کرلیا۔ اور پھر سیندھیا اور بھونسلہ کی متحدہ فوجوں کو 1803ء میں اسئی کے مقام پر شکست فاش دی۔ اس کے جلدی ہی بعد بھونسلہ کو ارگاؤں کے مقام پر ایک اور شکست ہوئی۔ اس پر بھونسلہ نے 1803ء میں عہد نامہ دیوگاؤں کی رو سے صلح کرلی۔ کٹک اور بالاسور کا علاقہ انگریزوں کو دے دیا۔ اور سبسڈی ایری سسٹم قبول کرلیا۔

شمالی ہندوستان کی کمان لارڈ لیک کے سپرد تھی۔ اس نے سیندھیا کی فوجوں کو شکست دے کر آگرہ علی گڑھ اور دہلی پر قبضہ کرلیا۔ اس سے مغل بادشاہ شاہ عالم انگریزوں کی پناہ میں آگیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد سیندھیا کو لاسواڑی کے مقام پر شکست ہوئی۔ اور اس نے ارجن گاؤں کا معاہدہ کرلیا۔ اس معاہدہ کی رو سے سیندھیا نے احمد نگر۔ بھڑوچ اور گنگا اور جمنا کا درمیانی دوآب بمعہ دہلی اور آگرہ کے انگریزوں کو دے دیا۔ اور سب سڈی ایری سسٹم قبول کرلیا۔

نتیجہ : اس جنگ سے کمپنی کے مقبوضات بہت بڑھ گئے۔ اور مرہٹوں کی طاقت کمزور ہوگئی۔

مرہٹوں کی تیسری جنگ 1804ء سے 1805ء

ہلکر اگرچہ مرہٹوں کی دوسری جنگ میں شریک نہیں ہوا تھا۔ لیکن وہ اپنے طور پر انگریزوں کی زیر سایہ راجپوت ریاستوں کو تاخت و تاراج کر رہا تھا۔ ولزلی نے اسے اس حرکت سے باز رہنے کو کہا۔ لیکن ہلکر نے کوئی پروا نہ کی۔ اس پر ولزلی نے جنگ چھیڑ دی۔

واقعات : ہلکر کو شروع شروع میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ اور اس نے انگریزی کرنیل مانسن کو شکست فاش دی۔ اس پر بھرت پور کا راجہ بھی انگریزوں کی اطاعت سے منحرف ہوکر ہلکر سے مل گیا اور دونوں نے مل کر دہلی پر حملہ کیا۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے بعد لارڈ لیک نے ہلکر کو ڈیگ اور فرخ آباد کے مقام پر شکست دی۔ اور بھرت پور کا محاصرہ کرلیا۔ اس قلعہ پر پے در پے چار دفعہ ہلہ بولا گیا۔ لیکن ہر بار پسپا ہونا پڑا۔ آخر راجہ بھرت پور نے انگریزوں سے صلح کرلی۔ اور ہلکر بھاگ کر پنجاب میں رنجیت سنگھ کے پاس چلا گیا۔

ہلکر سے لڑائی ابھی جاری تھی کہ ولزلی کو واپس بلا لیا گیا۔ کیونکہ ڈائریکٹرز اس کی پیش قدمی کی پالیسی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس طرح ہلکر کی طاقت توڑی نہ جاسکی۔

لارڈ ولزلی کے الحاقات

(The annexations of Lord Wellesley)

الحاقات : ولزلی کی یہ بھی پالیسی تھی کہ وہ چھوٹی اور کمزور ریاستوں کو انگریزی عملداری میں شامل کرلے۔ چنانچہ اس نے مندرجہ ذیل علاقے انگریزی سلطنت میں ملا لئے۔

1۔ تنجور : تنجور کی ریاست کا انتظام بہت خراب تھا۔ چنانچہ وہاں کے راجہ کی موت پر ولزلی نے راجہ کے متبنے کو پنشن دے دی۔ اور تنجور انگریزی عملداری میں شامل کرلیا۔

2 ۔ سورت : سورت کے نواب کو بھی پنشن دے کر تخت سے الگ کر دیا گیا۔ اور یہ علاقہ بھی انگریزی سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔

3۔ کرناٹک : کرناٹک کا علاقہ 1801ء میں اس الزام کی بناء پر انگریزی عملداری میں شامل کرلیا گیا کہ وہاں کا نواب (عمدہ الامرا) ٹیپو کے ساتھ انگریزوں کے خلاف خفیہ طور پر خط و کتابت کرتا رہتا تھا۔ نئے نواب کو پنشن دے دی گئی۔ اور اسے اقتدار سے علیحدہ کردیا گیا۔

لارڈ ولزلی : لارڈ ولزلی نے والیان ریاست سے امدادی فوج کے خرچ کے لئے نقد روپیہ کی بجائے کوئی علاقہ لینا شروع کر دیا۔ چنانچہ نواب اودھ سے روہیلکھنڈ ۔ گورکھ پور اور گنگا اور جمنا کا درمیانی علاقہ جسے دوآب کہتے ہیں۔ حاصل کئے ۔ اور نظام حیدر آباد سے بلاری اور کڈاپہ کے علاقے لے لئے۔

5۔ مندرجہ بالا علاقوں کے علاوہ میسور کی چوتھی جنگ سے کنارہ اور قائمبٹور اور مرہٹوں کی دوسری جنگ سے کٹک۔ بالاسور۔ بھڑوچ۔ احمد نگر وغیرہ کے علاقے حاصل کئے۔

لارڈ ولزلی کے مشہور کارنامے

(The outstanding achievements of Lord Wellesley)

سلجھا ہوا قوم پرست : لارڈ ولزلی ایک سلجھا ہوا قوم پرست اور اعلیٰ پایہ کا مدبر اور بیدار مغز حکمران تھا۔ اس کا شمار ہندوستان کے صف اول کے گورنر جنرلوں میں کیا جاتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے کمپنی کو ہندوستان میں افضل ترین طاقت بنا دیا۔

ولزلی کی تقرری کے وقت کمپنی کی حالت بڑی تشویشناک تھی۔ سرجان شور کی عدم مداخلت کی پالیسی نے مقامی فرمانرواؤں کو انگریزی حکومت سے بدظن کر رکھا تھا۔ اور وہ اپنا اپنا اقتدار بڑھانے اور انگریزی اقتدار کا خاتمہ کرنے کی چالوں میں مصروف تھے۔ نظام انگریزی حکومت کی وعدہ شکنی کی وجہ سے ان کے خلاف ہوگیا تھا۔ ٹیپو سابقہ شکست کا انتقام لینے کی فکر میں تھا۔ اور فرانسیسیوں سے ساز باز کر رہا تھا۔ مرہٹے ہند میں زوروں پر تھے۔ اور دیسی فرمانرواؤں کے درباروں میں فرانسیسی اقتدار بہت بڑھا ہوا تھا۔ ادھر مشہور فرانسیسی جرنیل نپولین بونا پارٹ ہندوستان کی فتح کے ارادہ سے مصر تک پہنچ چکا تھا۔ مختصر یہ کہ ہر طرف کمپنی کے دشمن ہی دشمن تھے۔

کمپنی کی ایسی نازک حالت کو دیکھ کر ولزلی نے پیش قدمی کی پالیسی اختیار کی۔ اور انگریزی طاقت کو افضل ترین بنانے کے لئے اس نے سب سڈی ایری سسٹم کو اپنی پالیسی کا بنیاد

اصول ٹھہرایا۔ سب سے پہلے نظام حیدر آباد نے جو مرہٹوں سے شکست کھا کر کمزور ہو چکا تھا اسے قبول کیا۔ اس طرح انگریزوں کا ایک حریف ان کے بالکل ماتحت ہوگیا۔ اس کے بعد نواب اودھ نے بھی اس سسٹم کو تسلیم کرلیا۔

ٹیپو سلطان کو بھی جو انگریزوں کے خلاف فرانسیسیوں سے ساز باز کر رہا تھا سب سڈی ایری سسٹم کے قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ لیکن اس نے انکار کیا۔ اس پر اس کے خلاف جنگ چھیڑ دی گئی۔ جسے میسور کی چوتھی جنگ کہتے ہیں۔ ٹیپو نے مردانہ وار انگریزی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ اور آخر 1799ء میں اپنے دارالخلافہ سرنگا پٹم میں محصور ہو کر لڑتا ہوا شہادت پا گیا۔ اس طرح انگریزوں کے دوسرے زبردست حریف کا خاتمہ ہوگیا۔ ریاست میسور کے نئے حکمران کرشن نے سب سڈی ایری سسٹم کو قبول کرلیا۔

مرہٹوں کی باہمی خانہ جنگیوں نے جو نانا فرنویس کی موت پر شروع ہوئیں۔ ولزلی کو ان کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کا بھی موقعہ بہم پہنچا دیا۔ 1802ء میں آخری پیشوا باجی راؤ ثانی نے ہلکر کے ہاتھوں شکست کھا کر انگریزی حکومت کے ساتھ عہد نامہ بسین کرلیا۔ جس کی رو سے اس نے سب سڈی ایری سسٹم کی تمام شرائط کو مان لیا۔ اس سے مرہٹی کنفیڈریسی کا سردار اعلیٰ بھی انگریزی حکومت کے ماتحت ہوگیا۔

سیندھیا اور بھونسلہ نے عہد نامہ بسین کو قومی توہین خیال کرتے ہوئے انگریزوں سے جنگ چھیڑ دی۔ جسے مرہٹوں کی دوسری جنگ کہتے ہیں۔ اس میں انہیں شکست ہوئی۔ اور انہوں نے سب سڈی ایری سسٹم قبول کرلیا۔ اس کے بعد ہلکر نے جو مرہٹوں کی دوسری جنگ میں الگ رہا تھا۔ انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ جسے مرہٹوں کی تیسری جنگ کہتے ہیں۔ اس میں ہلکر کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس طرح مرہٹوں کی طاقت بھی بہت حد تک کمزور ہوگئی۔

ولزلی نے نہ صرف کمپنی کے دشمنوں کا ہی ایک ایک کرکے خاتمہ کیا۔ بلکہ انگریزی سلطنت کو بھی بہت وسعت دی۔ کرناٹک۔ تنجور اور سورت کے علاقے انگریزی سلطنت میں ملا لئے گئے۔ اس کے علاوہ کئی اور علاقے امدادی فوج کے خرچ کے عوض حاصل کئے۔ موجودہ احاطہ مدراس پر انگریزی عملداری ولزلی کے زمانہ میں ہی ہوئی۔

مختصر یہ کہ لارڈ ولزلی کے سات سال کے عرصہ حکومت میں ہندوستان کا نقشہ ہی بدل گیا۔ حیدر آباد اور میسور کی ریاستیں انگریزی پناہ میں آگئیں۔ مرہٹوں کی طاقت کو شدید نقصان پہنچا۔ فرانسیسیوں کے اثر و رسوخ کا خاتمہ ہوگیا۔ تنجور۔ سورت۔ کرناٹک اور دیگر کئی علاقے انگریزی حکومت میں ملا لئے گئے۔ سچ تو یہ کہ ولزلی کی تقرری کے وقت انگریزی حکومت بھی ہندوستان میں ایک حکومت تھی اور ولزلی کی واپسی کے وقت انگریزی حکومت ہی ایک بڑی سلطنت تھی۔

سر جارج بارلو 1805ء سے 1807ء

لارڈ ولزلی کی واپسی پر لارڈ کارنوالس دوبارہ گورنر جنرل مقرر ہو کر آیا۔ لیکن وہ اپنی آمد کے تین ماہ بعد ہی غازی آباد کے مقام پر انتقال کر گیا۔ اور اس کی جگہ کونسل کا سینئر ممبر سر جارج بارلو اس کا جانشین مقرر ہوا۔

سر جارج بارلو عدم مداخلت کی پالیسی کا حامی تھا۔ اس لئے اس نے آتے ہی ہلکر کے ساتھ بڑی نرم شرائط پر صلح کر لی۔ اس کے عہد کا سب سے مشہور واقعہ ویلور کی بغاوت ہے۔

ویلور کی بغاوت 1806ء : 1806ء میں احاطہ مدراس میں ویلور کے مقام پر دیسی سپاہیوں نے بغاوت کر دی۔ اور ایک سو سے زیادہ انگریزی سپاہی اور کچھ افسر قتل کر دیئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ فوج میں کچھ نئے قوانین نافذ ہوئے تھے۔ مثلاً یہ کہ سپاہی ایک خاص قسم کی پگڑی باندھیں۔ اپنی ڈاڑھی ایک خاص وضع پر ترشوائیں۔ اور ماتھے پر تلک وغیرہ نہ لگائیں۔ سپاہیوں نے خیال کیا کہ شاید سرکار انہیں عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ اس لئے انہوں نے بغاوت کر دی۔ لیکن یہ بغاوت دبا دی گئی۔ اور تمام نئے قوانین منسوخ کر دیئے گئے۔ ٹیپو کے لڑکوں پر جو ان دنوں ویلور میں رہتے تھے۔ شک گزرا کہ انہوں نے سپاہیوں کو بھڑکایا ہے۔ اس لئے انہیں کلکتہ بھیج دیا گیا۔ اور ولیم بینٹنک کو جو اس وقت مدراس کا گورنر تھا واپس انگلینڈ بلا لیا گیا۔

لارڈ منٹو 1807ء سے 1813ء

منٹو کے عہد کے مشہور واقعات

(The events of the administration of Lord Minto)

1۔ ٹراونکور میں بغاوت : 1808ء میں ٹراونکور کے وزیر نے ریذیڈنٹ کے ساتھ اختلاف ہونے کی وجہ سے بغاوت کر دی اور کچھ انگریز سپاہی قتل کر دیئے اور ریذیڈنٹ پر بھی حملہ کیا' لیکن یہ بغاوت جلد ہی دبا دی گئی اور وزیر نے خودکشی کر لی۔

2۔ بندھیلکھنڈ میں بدامنی : بندھیلکھنڈ کے علاقوں میں وہاں کے مقامی سرداروں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ منٹو کو مجبوراً" دخل اندازی کرنی پڑی۔ باغی سرداروں کو شکست ہوئی اور ملک میں امن و امان قائم ہو گیا۔

3۔ عہد نامہ امرت سر : پنجاب کا راجہ رنجیت سنگھ ان دنوں اپنی طاقت کو بڑھا رہا تھا۔ اس نے موقعہ پا کر ستلج پار کی سکھ ریاستوں کو بھی اپنی سلطنت میں ملانا چاہا۔ لارڈ منٹو اس بات کو انگریزی مفاد کے لئے نقصان دہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے سر چارلس مٹکاف کو رنجیت سنگھ کے

پاس امرت سر روانہ کیا اور 1809ء میں انگریزوں اور رنجیت سنگھ کے درمیان عہد نامہ امرت سر قرار پایا۔ اس عہد نامہ کی رو سے دریائے ستلج مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مشرقی حد قرار دی گئی۔ رنجیت سنگھ مرتے دم تک اس عہد نامہ پر کاربند رہا۔

4۔ غیر ممالک میں سفارتیں : ان دنوں انگلینڈ اور فرانس میں جنگ ہو رہی تھی اور اس بات کا سخت خدشہ تھا کہ کہیں فرانسیسی خشکی کے راستے ایران اور افغانستان کی راہ سے ہندوستان پر حملہ آور نہ ہوں۔ اس خطرہ کی پیش بندی کے لئے لارڈ منٹو نے سفیر بھیج کر شاہ ایران' امیر کابل اور امیران سندھ کے ساتھ دوستانہ معاہدے کر لئے اور انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ کسی یورپین قوم کو اپنے ملک میں سے نہیں گزرنے دیں گے۔

5۔ بحری جنگ : لارڈ منٹو نے ایک بحری مہم بھیج کر فرانسیسی جزیروں بوربن اور ماریشس پر قبضہ کر لیا۔ کیونکہ یہاں سے فرانسیسی بحری جہاز انگریزی جہازوں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ولندیزوں سے جزیرہ جاوا فتح کر لیا گیا۔ کیونکہ یہ لوگ ان دنوں فرانسیسیوں کے حمایتی تھے۔ لیکن جنگ کے بعد سوائے ماریشس کے باقی تمام علاقے واپس کر دیئے گئے تھے۔

چارٹر 1813ء : 1813ء میں کمپنی کو نیا چارٹر عطا ہوا جس سے ہندوستان کی تجارت سب انگریزوں کے لئے کھول دی گئی۔ لیکن چین کی تجارت کا اجارہ کمپنی کے پاس ہی رہنے دیا گیا۔ اس کے علاوہ کمپنی کے لئے یہ لازمی قرار دیا گیا کہ وہ ہر سال ہندوستان میں تعلیم کی اشاعت کے لئے ایک لاکھ روپیہ خرچ کرے۔ پادریوں اور عیسائی مذہب کے مشنریوں کو بھی ہندوستان میں تبلیغ کرنے کی اجازت حاصل ہو گئی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ (1780ء تا 1839ء)

ابتدائی حالات : مہاراجہ رنجیت سنگھ جس کو "شیر پنجاب" بھی کہتے ہیں پنجاب میں سکھ سلطنت کا بانی تھا۔ وہ سکرچکیہ مثل کے سردار مہاں سنگھ کا بیٹا تھا۔ اس مثل کا صدر مقام گوجرانوالہ تھا۔ رنجیت سنگھ کا جنم 1780ء میں گوجرانوالہ کے مقام پر ہوا۔ ابھی اس کی عمر بارہ برس کی ہی تھی کہ اس کا باپ مرگیا اور وہ اپنی مثل کے سردار بنا۔ اس کی شادی کنہیا مثل میں ہوئی اور ان دو مثلوں کے ملاپ سے رنجیت سنگھ کی طاقت اور بھی مضبوط ہوگئی۔

فتوحات : اب رنجیت سنگھ نے اپنے مقبوضات کو بڑھانا شروع کیا۔ چنانچہ 1799ء میں جب کہ اس کی عمر انیس سال کی تھی۔ اس نے لاہور پر قبضہ کرلیا اور اس کے تین سال بعد 1802ء میں بھنگی مثل سے امرت سر بھی فتح کرلیا اور اس کے بعد چند ہی سالوں میں اس نے ستلج تک تمام وسطی پنجاب کو زیر کرلیا۔

پھر اس نے ستلج پار سرہند کی سکھ ریاستوں پر بھی تسلط جمانا چاہا اور دریائے ستلج کو پار کرکے لدھیانہ پر قبضہ کرلیا۔ لیکن لارڈ منٹو رنجیت سنگھ کی اس پیش قدمی کو انگریزی مفاد کے خلاف سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے سر چارلس مٹکاف کو امرت سر بھیج کر 1809ء میں رنجیت سنگھ کے ساتھ ایک عہد نامہ کیا۔ جسے عہد نامہ امرت کہتے ہیں۔ اس کی رو سے دریائے ستلج رنجیت سنگھ کی سلطنت کی مشرقی حد قرار پایا۔ رنجیت سنگھ نے مرتے دم تک اس عہد نامے کو بڑی وفاداری سے نبھایا۔

چونکہ عہد نامہ امرت سر سے مشرق کی طرف رنجیت سنگھ کی پیش قدمی رک گئی تھی۔ اس لئے اس نے اپنی توجہ اب دوسری طرف خاص کر شمالی مغربی سرحد کے پٹھانوں کی طرف مبذول کی اور لگاتار لڑائیوں کے بعد اٹک، ملتان، کشمیر، ہزارہ، بنوں، ڈیرہ جات، پشاور فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرلئے۔ اس طرح اس نے ایک زبردست سکھ سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ 1839ء میں ایک کامیاب حکومت کے بعد رنجیت سنگھ نے وفات پائی۔

نظام حکومت، ملکی انتظام : رنجیت سنگھ نے اپنی سلطنت کو چار صوبوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ صوبہ لاہور، صوبہ ملتان، صوبہ کشمیر اور صوبہ پشاور۔ صوبے کئی کئی ضلعوں میں تقسیم تھے۔ ہر ایک ضلع کے انتظام کے لئے افسر مقرر تھے۔ جنہیں کار دار کہتے ہیں۔ وہ مالگزاری وصول کرتے تھے اور مقدمات کا فیصلہ بھی کرتے تھے۔ انصاف کا طریقہ بڑا سیدھا سادھا تھا۔ کوئی خاص ضابطہ قوانین مقرر نہیں تھا۔ بہت سے جرموں کی سزا جرمانہ ہی تھی۔ لیکن بعض اوقات مختلف اعضاء بھی کاٹ دیئے جاتے تھے۔ دیہات میں پنچائتیں مقدمات کا فیصلہ کرتی تھیں۔ ملازمت دینے میں مہاراجہ سنگھ۔ ہندو یا مسلمان کا خیال نہ کرتا تھا۔ اس کے سول افسروں میں

فقیر عزیز الدین راجہ دینا ناتھ۔ دیوان ساون مل۔ راجہ گلاب سنگھ۔ راجہ دھیان سنگھ بہت مشہور تھے۔

آمدنی کے وسائل : آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ لگان تھا۔ جو کہ کل پیداوار کے ایک تہائی حصے سے لے کر آدھے حصے تک وصول کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ جرمانہ کی رقم اور کئی ٹیکس بھی آمدنی کا ذریعہ تھے۔ اس آمدنی کا بیش تر حصہ فوج پر خرچ ہوتا تھا۔

فوجی انتظام : رنجیت سنگھ کا فوجی انتظام بڑا اعلیٰ تھا۔ اس کی فوج بڑی زبردست تھی اور سے اطالوی اور فرانسیسی افسروں نے یورپ کے طریقہ پر قواعد سکھا رکھی تھی۔ رنجیت سنگھ کو گھوڑوں کا خاص شوق تھا اور اس کے اصطبلوں میں ہر قسم کے گھوڑے موجود تھے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس ایک اعلیٰ درجہ کا توپ خانہ بھی تھا۔ فوجی افسروں میں سردار ہری سنگھ نلوہ جو گوجرانوالہ کا رہنے والا تھا سب سے مشہور تھا۔ اس نے پٹھانوں کے خلاف بڑی کامیابی حاصل کی۔ وہ کئی سال تک قلعہ جمرود کا حاکم رہا اور آخر وہیں پٹھانوں کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔

رنجیت سنگھ کا کیریکٹر : رنجیت سنگھ ایک بڑا بہادر اور نڈر سپاہی تھا اور اسے جنگ سے خاص رغبت تھی۔ اس میں انتظام سلطنت کی صلاحیت بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ ان پڑھ تھا۔ تاہم وہ عالموں اور بہادروں کا قدر دان تھا اور انہیں انعام و اکرام دیتا تھا۔ اس کی سپاہ اس سے بڑی مانوس تھی۔ وہ عیش و طرب کا دلدادہ تھا لیکن یہ چیزیں اس کے فرائض کی انجام دہی میں حائل نہ ہوتی تھیں۔ اس نے اپنی عقل اور ہمت سے پنجاب میں خالصہ حکومت قائم کی۔ اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز اس کی فوجی طاقت اور خداداد قابلیت تھی۔

پنجاب کی حالت : 1839ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ مرگیا اور اس کی موت کے ساتھ ہی سکھ سلطنت میں بدنظمی پھیل گئی۔ رنجیت سنگھ کا کوئی بھی جانشین ایسا نہ نکلا جو سلطنت کو قابو میں رکھ سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوج کی طاقت بہت بڑھ گئی اور چونکہ اس فوج کو باقاعدہ تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ اس لئے اس نے صوبہ بھر میں اودھم مچا رکھا تھا۔ چند ہی سالوں میں کئی شہزادے اور کئی وزیر موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ آخر 1845ء میں مہاراجہ کا سب سے چھوٹا بیٹا دلیپ سنگھ تخت نشین ہوا اور اس کی ماں رانی جنداں اس کی سرپرست مقرر ہوئی۔ لیکن سکھ سردار خالصہ فوج کی طاقت سے بہت خائف تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کا زور گھٹانے کے لئے اسے انگریزوں کے برخلاف جنگ کے لئے اکسایا۔ چنانچہ سکھوں کی پہلی جنگ ہوئی۔ جس میں سکھوں کو شکست ہوئی اور دوآبہ بست جالندھر انگریزوں کو مل گیا۔ 1849ء میں سکھوں کی دوسری جنگ ہوئی۔ جس میں سکھ مکمل طور پر ہار گئے۔ اور مارچ 1849ء میں پنجاب انگریزی عملداری میں شامل کرلیا گیا۔

(سکھ عہد کی تفصیلات کسی دوسری جگہ ملاحظہ فرمائیں)

مارکوئس آف ہیسٹنگز 1813ء سے 1823ء

(MARQUIS OF HASTINGS)

واقعات : (1) جنگ نیپال (2) پنڈاروں کا خاتمہ (4) مرہٹوں کی چوتھی اور آخری جنگ

مارکوئس آف ہیسٹنگز 59 سال کی عمر میں گورنر جنرل مقرر ہوا۔ وہ شروع شروع میں عدم مداخلت کی پالیسی کا زبردست حامی تھا۔ لیکن یہاں کے حالات نے اسے اس پالیسی کو خیرباد کہنے پر مجبور کیا۔ اس کے زمانہ میں بہت سی لڑائیاں ہوئیں۔

جنگ نیپال 1814ء سے 1816ء : وجہ۔ نیپال کے گورکھوں نے اپنی حدود کو وسیع کرنے کے لئے انگریزی علاقے پر ہاتھ صاف کرنے شروع کئے۔ 1814ء میں انہوں نے دو انگریزی اضلاع شو راج اور بٹوال پر بھی قبضہ کرلیا۔ جب لارڈ ہیسٹنگز نے ان اضلاع کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ تو گورکھوں نے انکار کیا۔ اس وجہ سے اعلان جنگ کیا گیا۔

واقعات : نیپال پر چار مختلف جگہوں سے چڑھائی کی گئی۔ لیکن کچھ تو گورکھوں کی بہادری اور کچھ ملک کے حالات کی ناواقفیت کی وجہ سے انگریزوں کو شروع شروع میں ناکامیابی ہوئی۔ انگریزی فوج کے چار دستوں میں سے تین کو شکست کھا کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ لیکن چوتھے دستے نے جس کا کمانڈر جنرل اختر لونی تھا۔ نیپال میں داخل ہو کر گورکھوں کے سپہ سالار امر سنگھ کو ملون کے قلعے میں شکست دی اور اختر لونی گورکھوں کو ہراتا ہوا نیپال کی راجدھانی کھٹمنڈو کے قریب پہنچ گیا۔ یہ دیکھ کر گورکھوں نے صلح کرلی اور عہدنامہ سگولی لکھا گیا۔

نتیجہ : عہد نامہ سگولی 1816ء کی رو سے (1) گورکھوں نے گڑھوال۔ کماؤں اور ترائی کے علاقے انگریزوں کو دے دیئے اور (2) ایک ریزیڈنٹ اپنے دربار میں رکھنا منظور کیا۔

اس عہد نامہ سے انگریزوں کے قبضے میں ایسے پہاڑی علاقے آگئے۔ جہاں شملہ۔ الموڑہ۔ نینی تال وغیرہ صحت افزا مقامات بس گئے۔ اس کے علاوہ گورکھوں اور انگریزوں میں دوستانہ تعلقات قائم ہوگئے اور گورکھے بڑی چاہ سے انگریزی فوج میں بھرتی ہوتے تھے۔

پنڈاروں کا خاتمہ : پنڈارے لٹیروں کی ایک جماعت تھی۔ جن کا کام قتل و غارت اور لوٹ مار تھا۔ وہ کسی قوم سے تعلق نہ رکھتے تھے۔ بلکہ ان میں ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگ شامل تھے۔ یہ لوگ بڑے ظالم۔ سفاک اور بے رحم تھے اور ان کے غول کے غول گھوڑوں پر سوار ہو کر لوٹ مار کے لئے گھوما کرتے تھے۔ ان کے انسانیت سوز مظالموں سے کیا مرد' کیا عورتیں' کیا معصوم بچے کوئی بھی محفوظ نہ تھا۔ یہ زیادہ تر وسط ہند کے علاقے میں لوٹ مار کرتے

تھے۔ ان کی بڑے بڑے سردار امیر خاں۔ کریم خاں۔ واصل محمد اور چیتو تھے۔ ان لٹیروں کو مرہٹہ سرداروں کی بھی حمایت حاصل تھی۔

انگریزوں کی عدم مداخلت کی پالیسی سے ان کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے اور انہوں نے انگریزی علاقہ پر بھی دھاوے مارنے شروع کئے۔ آخر ہیسٹنگز نے ان کی بیخ کنی کا مصمم ارادہ کرلیا۔ پہلے تو اس نے نہایت عقلمندی سے مرہٹوں کو پنڈاروں سے علیحدہ کر دیا اور پھر ایک لاکھ بیس ہزار فوج کے ساتھ پنڈاروں کو مالوہ کے علاقے میں چاروں طرف سے گھیر لیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں ان کو برباد کر دیا۔ امیر خاں نے اطاعت قبول کرلی اور اسے ٹونک کی ریاست دے دی گئی۔ جہاں عرصہ تک اس کی اولاد حکمران رہی۔ کریم خاں نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کردیا اور اسے نیپال کی سرحد کے قریب گنش پور کی جاگیر عطا ہوئی۔ واصل محمد نے زہر کھا کر خودکشی کرلی۔ چیتو بھاگ نکلا۔ لیکن اسے ایک شیر نے پھاڑ ڈالا۔ اس طرح سے پنڈاروں کا خاتمہ ہوگیا۔

مرہٹوں کی چوتھی جنگ (1817ء سے 1818ء)

وجوہات : اصلی وجہ یہ تھی کہ پیشوا باجی راؤ ثانی عہد نامہ بسین کی شرائط سے مطمئن نہ تھا۔ بلکہ دل ہی دل میں کڑھتا رہتا تھا اور اپنے آپ کو انگریزوں کی محکومی سے آزاد کرانے کے لئے ایک عرصہ سے دوسرے مرہٹہ سرداروں کے ساتھ ساز باز کر رہا تھا۔

فوری وجہ : اس جنگ کی فوری وجہ یہ ہوئی کہ پیشوا اور گائیکواڑ کے درمیان کچھ عرصہ سے خراج کے متعلق جھگڑا تھا۔ 1815ء میں گائیکواڑ کا وزیر گنگا دھر شاستری انگریزی حفاظت کے وعدہ پر اس جھگڑے کو نپٹانے کے لئے پونا میں گیا۔ لیکن پیشوا کے وزیر ترمبک جی نے اسے قتل کرا دیا۔ سرکار انگریزی نے پیشوا کو مجبور کیا۔ کہ ترمبک جی کو ہمارے سپرد کر دیا جائے۔ چنانچہ ترمبک جی کو قید کر دیا گیا۔ لیکن وہ جلدی ہی قید سے فرار ہوگیا۔ اس کی فراری میں پیشوا پر شبہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ پیشوا اپنا قدیمی اقتدار حاصل کرنے کے لئے مرہٹہ سرداروں سے ساز باز بھی کر رہا تھا۔ چنانچہ پونا کے انگریز ریزیڈنٹ نے اسے ایک نیا معاہدہ کرنے پر مجبور کیا۔ جس کی رو سے پیشوا کو کچھ علاقہ انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا اور اس نے مرہٹوں کی سرداری کا دعویٰ چھوڑ دیا۔ اس نئے معاہدہ سے برافروختہ ہوکر پیشوا نے جنگ چھیڑ دی۔

واقعات : پیشوا نے پونا کی ریزیڈنسی پر حملہ کیا اور اسے جلا ڈالا۔ مگر انگریزی فوج نے اسے کرکی کے مقام پر شکست دی۔ اور وہ جنوب کو بھاگ گیا۔

اسی اثناء میں آپا صاحب بھونسلہ اور ہلکر سپاہ نے بھی انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ آپا صاحب بھونسلہ کو سیتا بلدی کے مقام پر شکست ہوئی اور ہلکر فوجوں نے مہد پور کے مقام پر شکست فاش کھائی۔

پیشوا نے انگریزوں سے پھر جنگ چھیڑ دی۔ لیکن کوری گاؤں اور آشتی کے مقامات پر شکست کھائی اور اس نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کردیا۔ اور جنگ ختم ہوگئی۔

نتیجہ :

(1) پیشوا کا تمام ملک کمپنی کے قبضہ میں آگیا اور اسے آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ پینشن دے کر کانپور کے نزدیک بٹھور میں بھیج دیا گیا۔

(2) پیشوا کا عہدہ اڑا دیا گیا اور ستارہ کی ریاست شیوا جی کے خاندان کے ایک راجہ کو دے دی گئی۔

(3) ہلکر اور بھونسلہ کا بہت سا علاقہ انگریزی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ اس طرح مرہٹہ طاقت کا خاتمہ ہوگیا اور انگریزی حکومت ملک میں افضل ترین بن گئی۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ مرہٹوں کی چوتھی جنگ سے ولزلی کا شروع کیا ہوا کام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

مارکوئس آف ہیسٹنگز کے کارہائے نمایاں : ہیسٹنگز ہندوستان کے مشہور گورنر جنرلوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ولزلی کے کام کو جو اس نے ہندوستان میں کمپنی کی طاقت کو افضل ترین بنانے کے لئے شروع کیا تھا پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔

مارکوئس آف ہیسٹنگز کی تقرری کے وقت کمپنی کے وقار میں بڑا فرق آگیا تھا اور مختلف دیسی ریاستیں بلا خوف و خطر اپنی طاقت بڑھا رہی تھیں۔ اس کی وجہ ولزلی کے جانشینوں (کارنوالس۔ بارلو اور منٹو) کی عدم مداخلت کی پالیسی تھی۔ چنانچہ گورکھے اپنے پہاڑی ملک نیپال سے بڑھ کر انگریزی علاقے پر ہاتھ مار رہے تھے۔ وسط ہند میں پنڈاروں نے اپنے بے رحمانہ مظالم سے لوگوں پر عرصہ زندگی تنگ کر رکھا تھا۔ ادھر مرہٹے انگریزی حکومت کے جوئے کو اپنے کندھوں سے اتار پھینکنے کے لئے آخری متحدہ کوشش کرنے کی فکر میں تھے اور باہم نامہ و پیام کر رہے تھے۔ جب ہیسٹنگز نے ان حالات کا مطالعہ کیا۔ تو اس نے ولزلی کی طرح عدم مداخلت کی پالیسی ترک کرکے پیش قدمی کی حکمت عملی اختیار کی۔

سب سے پہلے ہیسٹنگز گورکھوں کی طرف متوجہ ہوا اور انہیں شکست دے کر انگریزی حکومت کا وفادار بنا لیا۔ اس کے بعد اس نے پنڈاروں کی طرف توجہ دی جنوں نے وسط ہند میں لوٹ مار اور تباہی مچا رکھی تھی اور ایک زبردست فوج کی مدد سے ان کا قلع قمع کر دیا اور وہاں کے لوگوں کو امن کا سانس لینا نصیب ہوا۔ اسی اثناء میں مرہٹوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ یہ ان کی آخری جنگ تھی۔ لیکن ہیسٹنگز نے پیشوا۔ بھونسلہ ۔ ہلکر سب کو شکست دی اور مرہٹوں کا زور توڑ دیا۔ پیشوا کا عہدہ اڑا دیا گیا اور اس کا تقریباً سارا علاقہ انگریزی عملداری میں شامل کر لیا گیا۔ اس طرح موجودہ احاطہ بمبئی پر انگریزی حکومت قائم ہوگئی۔ ان جنگی کارناموں کے علاوہ ہیسٹنگز نے چند ایک آئینی اصلاحات بھی رائج کیں اور تعلیم کی اشاعت کی طرف خاص دھیان دیا۔

مختصر یہ کہ ہیسٹنگز نے کمپنی کو ملک کا حاکم بنا دیا اور اس طرح ولزلی کے شروع کردہ کام کو پایہ اختتام تک پہنچا دیا۔

مرہٹوں کے زوال کے اسباب

The causes of the decline and downfall of the Maratha power

مرہٹوں کے زوال کے اسباب مندرجہ ذیل تھے۔

1۔ شیوا کے جانشین نالائق تھے۔ اس کا بیٹا سمبھاجی نہایت بدچلن تھا اور اس کا پوتا مغلوں کی قید میں رہنے کے سبب عیاش اور ناکارہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ اس نے حکومت کا کام پیشواؤں کے سپرد کر دیا۔ مگر آخری تین چار پیشوا بڑے کمزور تھے۔

2۔ شیوا جی افسروں کو نقد تنخواہ دیا کرتا تھا۔ مگر پیشوا بالا جی وشو ناتھ نے جاگیروں کا طریقہ جاری کیا۔ اس سے مرہٹے سردار زور پکڑ گئے اور مرکزی حکومت کمزور ہوگئی۔

3۔ پانی پت کی تیسری لڑائی میں مرہٹوں کو جو شکست فاش ہوئی۔ اس سے مرہٹے کافی کمزور ہوگئے۔

4۔ پانی پت کی تیسری لڑائی کے بعد مرہٹوں کا مقابلہ انگریز قوم سے ہوا۔ جو بلحاظ جنگی طاقت اور بلحاظ تدبر۔ مرہٹوں سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ نانا فرنویس کی موت کے بعد مرہٹوں میں کوئی ایسا مدبر نہ رہا جو حکمت عملی میں انگریزوں کا مقابلہ کرسکتا۔

5۔ جب تک لائق مرہٹہ مدبر نانا فرنویس زندہ رہا۔ مرہٹوں میں اتفاق رہا۔ لیکن اس کے مرتے ہی مرہٹہ حکومت کی تمام عقلمندی اور تدبر کا خاتمہ ہوگیا اور ان میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ جس نے مرہٹہ سلطنت کو ایک کاری ضرب لگائی۔

6۔ جتنی دیر مرہٹے اپنے پہاڑی علاقوں تک محدود رہے۔ ان کا طریقہ جنگ ایسا تھا۔ جس کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا تھا جب ان کی سلطنت میدانوں میں پھیل گئی' تو انہیں جم کر حریف کا مقابلہ کرنا پڑا لیکن اس میدانی طریقہ جنگ میں مرہٹے دشمنوں کا مقابلہ نہ کرسکے۔

7۔ مرہٹوں کا سلوک اپنی غیر مرہٹہ رعایا سے اچھا نہ تھا۔ اس لئے ان کی حکومت کی جڑیں مفتوحہ علاقہ میں گڑ نہ سکیں۔

لارڈ ایمرسٹ 1823ء سے 1828ء

واقعات

(1) برما کی پہلی جنگ (2) بھرت پور کی تسخیر

برما کی پہلی جنگ 1824ء سے 1826ء : وجہ۔ برمی لوگ اپنی سلطنت کو بڑھا رہے تھے اور آسام اراکان وغیرہ پر قابض ہوگئے تھے۔ 1823ء میں انہوں نے کمپنی کے ایک جزیرہ شاہپور پر جو خلیج بنگال میں تھا قبضہ کرلیا۔ اس پر لارڈ ایمرسٹ نے 1824ء میں اعلان جنگ کردیا۔

واقعات : برما پر خشکی اور سمندر دونوں طرف سے چڑھائی کی گئی۔ ایک فوج آسام کی راہ سے برما پہنچنے کے لئے روانہ ہوئی اور دوسری فوج سمندر کی راہ بھیجی گئی۔ تاکہ رانگون فتح کرکے دریائے ایراوتی کے راستے برما کی راجدھانی آوا تک پہنچا جائے۔ خشکی کے راستے تو کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ کیونکہ راستہ بڑا دشوار گزار تھا۔ لیکن دوسری فوج نے سر آرچیبالڈ کمپل کی ماتحتی میں رنگون فتح کرلیا۔ برمی جنرل مہابندوالا اس فوج کے خلاف بڑھا۔ لیکن شکست کھائی اور مارا گیا۔ انگریزی فوجیں بڑھتی ہوئیں یندبو تک جو آوا سے 40 میل کے فاصلہ پر ہے پہنچ گئیں۔ برمیوں نے اب صلح کی درخواست کی اور 1826ء میں عہد نامہ یندبو قرار پایا۔

نتیجہ : عہد نامہ یندبو کی رو سے :

(1) آسام، اراکان اور تنا سرم کے علاقے انگریزوں کو مل گئے۔
(2) ایک کروڑ روپیہ تاوان جنگ ملا۔
(3) ایک انگریزی ریذیڈنٹ برما میں رہنے لگا۔

تسخیر بھرت پور : 1825ء میں بھرت پور کے راجہ کی وفات پر تخت نشینی کے لئے جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ حقیقی وارث کے لئے طرف داروں نے لارڈ ایمرسٹ سے مدد کی درخواست کی اور اس نے لارڈ کمبرمیئر کو فوج دے کر بھرت پور روانہ کیا۔ قلعہ کا محاصرہ کرلیا گیا۔ آخر قلعہ فتح ہوگیا اور جائز حقدار کو جو مرحوم راجہ کا لڑکا تھا گدی نشین کردیا گیا۔ اس قلعہ کی تسخیر سے سارے ملک میں انگریزوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ کیونکہ یہ قلعہ ناقابل تسخیر خیال کیا جاتا تھا اور لارڈ لیک بھی اسے فتح نہ کرسکا تھا۔

لارڈ ولیم بنٹنک 1828ء سے 1835ء

(Lord William Bentinck)

ولیم بنٹنک کا نام اس کی اصلاحات کی وجہ سے تاریخ ہند میں بہت مشہور ہے وہ پہلا گورنر جنرل تھا۔ جس نے اس اصول پر عملدر آمد کیا کہ سرکار انگریزی کا اولین فرض رعایا کی خوشحالی اور بہبودی کا خیال رکھنا ہے نہ کہ ملک کو فتح کرنا۔ بنٹنک کے عہد حکومت کے مشہور اصلاحات مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ مجلسی اصلاحات : رسم ستی کی ممانعت۔ ولیم بنٹنک کی سب سے بڑی اصلاح رسم ستی کی ممانعت تھی۔ ستی کی رسم ہندو عورتوں کی اپنے خاوند کے لئے محبت اور قربانی کی ایک یکتا مثال تھی۔ مگر زمانے کے گزرنے پر اس رسم میں بہت سی برائیاں آگئیں۔ جائیداد کی خاطر بیوہ عورتوں کو ستی ہونے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ بنٹنک نے 1829ء میں ایک قانون جاری کیا۔ جس نے ستی ہونا سنگین جرم قرار دیا گیا اور ستی کی ترغیب دینے والے کے لئے وہی سزا مقرر ہوئی۔ جو قتل عمد کے لئے دی جاتی ہے۔ اس نیک کام میں بنگال کے مشہور ریفامر راجہ رام موہن رائے نے بڑی مدد کی۔

2۔ ٹھگی کا انسداد : بنٹنک کی دوسری قابل تحسین مجلسی اصلاح ٹھگی کا انسداد ہے۔ ٹھگ لوگ یوں تو ملک کے ہر حصہ میں بھیس بدل کر گھومتے پھرتے تھے۔ مگر وسط ہند میں ان کا خاص زور تھا۔ ان لوگوں نے اپنے کچھ خفیہ اشارے اور خاص زبان مقرر کر رکھی تھی اور ان کا طریق کار یہ تھا کہ جہاں کہیں وہ بھولے بھٹکے مسافروں کو پاتے۔ چکنی چپڑی باتوں سے انہیں اپنے دام میں پھانس لیتے اور موقعہ پاکر ان کا گلا گھونٹ دیتے اور ان کا مال و اسباب لوٹ لیتے تھے۔ بنٹنک نے ان کی بیخ کنی کا کام میجر سلیمن کے سپرد کیا۔ جس نے کوئی چھ سال کے عرصہ میں ان ٹھگوں کا قلع قمع کر دیا۔

دختر کشی کا انسداد : راجپوتوں میں یہ ایک برا رواج تھا کہ وہ اکثر لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار دیتے تھے۔ بنٹنک نے اس بری رسم کا بھی خاتمہ کیا۔

4۔ انسانی قربانی کا انسداد : اڑیسہ کی وحشی اور جنگلی قوموں میں انسانی قربانی کی رسم بھی پائی جاتی تھی۔ بنٹنک نے اس کا بھی خاتمہ کیا۔

2۔ مالی اصلاحات : لارڈ ہیسٹنگز اور امھرسٹ کے زمانے میں کمپنی کا بہت سا روپیہ لڑائیوں میں صرف ہو گیا تھا۔ بنٹنک نے کمپنی کی مالی حالت درست کرنے کے لئے مندرجہ ذیل طریقے اختیار کئے۔

1۔ سول سروس کی تنخواہیں کم کر دی گئیں۔
2۔ کئی فوجی افسروں کا بھتہ گھٹا کر نصف کر دیا گیا۔ جو کلکتہ سے چار سو میل کے فاصلہ کے اندر اندر تعینات ہوتے تھے۔
3۔ ہندوستانیوں کو جنہیں لارڈ کارنوالس کے عہد میں اعلیٰ عہدوں سے سبکدوش کر دیا گیا تھا بڑے بڑے عہدے دیئے گئے۔ جس سے خرچ میں بچت ہوگئی کیونکہ مقامی افسروں کو کم تنخواہیں ملتی تھیں۔
4۔ صوبہ آگرہ (جس کا نام ان دنوں ممالک مغربی و شمالی تھا) میں نیا بندوبست شروع کیا گیا اور اس طرح کمپنی کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوگیا۔
5۔ کئی ایک زمیندار اپنی زمینوں کو سابقہ بادشاہوں کے عطیے ظاہر کر کے ان پر مالیہ ادا نہیں کرتے تھے۔ ولیم بنٹنک نے ان سب کی سندوں کی پڑتال کی اور کئی ایک زمینوں پر مالگذاری لگا دی گئی۔
6۔ مالوہ کی افیون پر محصول لگا دیا گیا۔ اور افیون کے ٹھیکہ کا بہت اچھا انتظام کیا گیا۔
ان اصلاحات کی بدولت کمپنی کی آمدنی میں کافی اضافہ ہوگیا۔

3۔ انتظامی اصلاحات :

1۔ لارڈ کارنوالس نے ہندوستانیوں کو اعلیٰ سرکاری عہدوں سے محروم کر رکھا تھا۔ لیکن اب ہندوستانیوں کو بلا لحاظ رنگ و مذہب اعلےٰ عہدے دیئے جانے لگے۔
2۔ عدالتوں کی برائیوں کو دور کیا گیا۔ اور کارنوالس کی قائم کی ہوئی صوبجاتی عدالتوں کو توڑ دیا گیا۔
3۔ کلکٹر اور ڈسٹرکٹ جج کے عہدے جو کارنوالس کے وقت علیحدہ کیے گئے تھے ملا کر ایک کر دیا گیا۔ اور بہت سے ہندوستانی مجسٹریٹ مقرر کیے گئے۔
4۔ آلہ آباد میں ایک صدر عدالت اور ایک محکمہ مال کا دفتر قائم کیا گیا۔
5۔ فارسی کی بجائے دیسی زبانیں اور انگریزی دفتری زبانیں قرار دی گئیں۔
6۔ انتظامیہ کونسل میں قانونی ممبر کی نئی آسامی قائم کی گئی۔ پہلا قانونی ممبر میکالے تھا۔
7۔ فوج کی بھی اصلاح کی گئی۔ اور بنٹنک خود کمانڈر انچیف کے فرائض بھی انجام دینے لگا۔

4۔ تعلیمی اصلاحات :

1813ء سے لے کر کمپنی ایک لاکھ روپیہ سالانہ ہندوستان میں تعلیم کی اشاعت پر صرف کرتی تھی۔ لیکن یہ رقم صرف مشرقی زبانوں یعنی سنسکرت' فارسی اور عربی کے سکھانے پر ہی خرچ ہوتی تھی۔ بنٹنک کے عہد میں اس بات پر بہت بحث ہوئی کہ تعلیم کس زبان میں ہو۔ اس پر دو فریق ہوگئے۔ ایک فریق جس کا لیڈر میکالے انگریزی زبان کے حق میں تھا۔ دوسرا فریق جس کا لیڈر ایچ۔ ایچ ولسن تھا دیسی زبانوں کے حق میں تھا۔ آخر میکالے کی تجویز مان لی گئی اور 1835ء میں حکومت نے اعلان کیا کہ ذریعہ تعلیم انگریزی ہوگا اور آئندہ

سے روپیہ انگریزی تعلیم پر خرچ کیا جائے گا۔
اس کے علاوہ کلکتہ میں ایک میڈیکل کالج کھولا گیا اور بمبئی میں الفنسٹن کالج قائم کیا گیا۔

ریاستوں کا الحاق : لارڈ ولیم بنٹنک دیسی ریاستوں کے معاملات میں دخل دینے کے حق میں نہ تھا مگر مندرجہ ذیل موقعوں پر اسے مجبوراً" دخل دینا پڑا۔

1۔ **میسور** : میسور کا راجہ کرشن جسے لارڈ ولزلی نے گدی پر بٹھایا تھا بڑا ہو کر نہایت نااہل اور بے رحم نکلا۔ چنانچہ 1831ء میں بنٹنک نے راجہ کو گدی سے اتار دیا اور میسور کا انتظام انگریزی افسروں کے سپرد کر دیا۔ 50 سال بعد لارڈ رپن نے 1881ء میں یہ ریاست کرشن کے متبنے کو واپس کردی۔

2۔ **کچھار** : کچھار بنگال کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ 1832ء میں جب وہاں کا راجہ مر گیا۔ تو ریاست کے باشندوں کی درخواست پر کچھار کو انگریزی علاقے میں شامل کرلیا گیا۔

3۔ **کورگ** : کورگ کا علاقہ میسور اور سمندر کے درمیان واقع ہے۔ یہاں کا راجہ نہایت ظالم اور بے رحم تھا۔ اس نے اپنے خاندان کے سب آدمیوں کو قتل کر دیا تھا اور اس کا انتظام بھی نہایت خراب تھا۔ بنٹنک نے راجہ کو گدی سے اتار دیا اور 1834ء میں ریاست کے باشندوں کی درخواست پر کورگ انگریزی سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔

رنجیت سنگھ سے ملاقات : 1831ء میں روپڑ کے مقام پر ولیم بنٹنک اور رنجیت سنگھ کے درمیان ملاقات ہوئی۔ گورنر جنرل نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ انگریزوں اور سکھوں کے درمیان مستقل دوستی کا عہد و پیمان ہوگیا۔
1832ء میں ولیم بنٹنک نے سندھ کے امیروں سے بھی ایک عہد نامہ کیا۔

چارٹر 1833ء : 1833ء میں کمپنی کے چارٹر کی تجدید ہوئی۔ اور کئی ایک اہم تبدیلیاں وجود میں آئیں۔

1۔ کمپنی سے تجارت کرنے کا حق چھین لیا گیا اور کمپنی صرف حکمران کمپنی رہ گئی۔
2۔ گورنر جنرل بنگال کی جگہ اس عہدہ کا نام گورنر جنرل ہند قرار پایا۔
3۔ قانون سازی کے لئے گورنر جنرل کی کونسل میں ایک نئے ممبر کا اضافہ ہوا۔ پہلا قانونی ممبر لارڈ میکالے تھا۔
4۔ بمبئی اور مدراس کی حکومتیں کامل طور پر گورنر جنرل کے ماتحت کر دی گئیں۔ اور ان سے قانون سازی کے اختیارات چھین لئے گئے۔
5۔ یہ بھی قرار پایا کہ کوئی ہندوستانی محض اپنے رنگ مذہب یا جائے پیدائش کی وجہ سے کسی عہدہ سے محروم نہیں رکھا جائے گا۔

سر چارلس مٹکاف 1835ء سے 1836ء

ولیم بنٹنک کے بعد سر چارلس مٹکاف گورنر جنرل کے عہدہ پر مقرر کیا گیا۔ اس کے زمانہ کا قابل ذکر واقعہ صرف یہی ہے کہ اس نے اخبارات سے تمام پابندیاں ہٹا دیں۔ اس کے اس کام کو ڈائرکٹروں نے پسند نہ کیا۔ چنانچہ مٹکاف نے استعفٰے دے دیا۔

لارڈ آک لینڈ 1836ء سے 1842ء

لارڈ ایلن برا 1842ء سے 1844ء

لارڈ آک لینڈ کے عہد کا اہم ترین واقعہ افغانستان کی جنگ تھی۔

افغانستان کی پہلی جنگ 1839ء سے 1842ء : افغانستان کی پہلی جنگ لارڈ آک لینڈ کے زمانے کا سب سے مشہور واقعہ ہے۔ یہ جنگ آک لینڈ کے زمانہ میں شروع ہوئی اور ایلن برا کے عہد میں ختم ہوئی۔

وجہ : اس جنگ کی وجہ روسی حملے کا خطرہ تھا۔ ان دنوں روس وسط ایشیا میں اپنا اقتدار بڑھا رہا تھا اور اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں وہ ایران اور افغانستان کی راہ سے ہندوستان پر حملہ آور نہ ہو جائے۔ اس خطرہ کی روک تھام کرنے کے لئے آک لینڈ نے ایک سفارت دوست محمد خاں امیر کابل کے دربار میں بھیجی۔ لیکن امیر نے دوستی کے عوض یہ شرط پیش کی کہ انگریز اسے رنجیت سنگھ سے پشاور واپس دلا دیں آک لینڈ نے اس شرط کو منظور نہ کیا۔ اس پر دوست محمد نے انگریزی سفارت کو لوٹا دیا اور روس سے ساز باز کرنے لگا۔ اس لئے آک لینڈ نے شاہ شجاع کو جو تخت کا دعویدار تھا اور اس وقت لدھیانہ میں انگریزوں کی پناہ میں تھا۔ تخت پر بٹھانا چاہا اور اس مطلب کے لئے رنجیت سنگھ۔ شاہ شجاع اور انگریزوں کے درمیان اتحاد ثلاثہ قائم ہوا۔

واقعات : انگریزی فوجیں سندھ سے گزر کر افغانستان میں داخل ہوگئیں۔ قندھار' غزنی اور کابل فتح کر لئے گئے۔ دوست محمد خاں کابل سے بھاگ گیا اور شاہ شجاع کو کابل کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد دوست محمد خاں نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا اور اسے شاہی قیدی بنا کر کلکتہ بھیج دیا گیا۔

کچھ عرصہ تو حالات پرسکون رہے۔ لیکن افغان لوگ شاہ شجاع کو پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ اس نے انگریزوں کی مدد سے تخت حاصل کیا تھا۔ چنانچہ سارے ملک میں شورشیں برپا ہوگئیں۔ پٹھانوں نے دوست محمد خاں کے لڑکے اکبر خاں کے ماتحت پولٹیکل ایجنٹ برنز اور انگریزی سفیر میکناٹن کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد انگریزی فوج کو جس کی تعداد سولہ ہزار تھی بالکل نہتہ کرکے واپس ہندوستان جانے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن کچھ تو سخت سردی کی وجہ سے اور

کچھ افغانوں کی گولہ باری کی وجہ سے ساری فوج تباہ ہوگئی۔ صرف ایک شخص ڈاکٹر برائڈن بچ نکلا۔ اس خونی داستان کی خبر سے سارے ملک میں ہیجان برپا ہوگیا۔ آک لینڈ واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ لارڈ ایلن براگورنر جنرل مقرر ہوکر آیا۔

آیلن برا نے آتے ہی اس تباہی کا انتقام لینے کے لئے دو فوجیں افغانستان بھیجیں۔ جو پٹھانوں کو شکست دیتی ہوئی کابل جا پہنچیں۔ شہر پر قبضہ کرلیا گیا اور اس کے سب سے بڑے بازار (بالا حصار) کو بارود سے اڑا دیا گیا۔ اس کے بعد انگریزی فوجیں واپس چلی آئیں اور جنگ ختم ہوگئی۔

نتیجہ :

1۔ چونکہ شاہ شجاع قتل ہوچکا ہوا تھا۔ اس لئے دوست محمد خاں کو ہی بادشاہ تسلیم کرلیا گیا۔

2۔ اس جنگ میں انگریزوں کا بہت سا مال و جان بے فائدہ ہی ضائع ہوا۔

الحاق سندھ 1843ء : کچھ عرصہ سے سندھ پر بلوچی سرداروں نے قبضہ کرکے وہاں تین ریاستیں قائم کر رکھی تھیں۔ ان بلوچی سرداروں کو امیران سندھ کہتے تھے۔ پہلے پہل انگریزی سرکار کا واسطہ ان امیروں کے ساتھ لارڈ منٹو کے زمانہ میں پڑا۔ کیونکہ ان دنوں خشکی کی راہ ہندوستان پر فرانس کے حملے کا ڈر تھا۔ چنانچہ لارڈ منٹو نے امیران سندھ کے ساتھ مستقل دوستی کا عہد و پیمان کیا اور امیروں نے وعدہ کیا کہ وہ فرانسیسیوں کے علاقہ سے نہ گزرنے دیں گے۔

ولیم بنٹنک کے زمانہ میں سرکار انگریزی نے امیران سندھ کے ساتھ ایک اور عہد نامہ کیا۔ جس کی رو سے انگریزوں کو سندھ میں تجارتی کرنے کی اجازت حاصل ہوگئی مگر یہ بھی فیصلہ ہوا۔ کہ انگریز کبھی اپنی فوجیں سندھ سے نہیں گزاریں گے۔

افغانستان کی پہلی جنگ کے وقت اس معاہدہ کی صریحاً" خلاف ورزی کرتے ہوئے سندھ کے علاقہ سے انگریزی فوجیں گزاری گئیں۔ اس وعدہ خلافی کے باوجود امیران سندھ جنگ کے دوران میں انگریزوں کو تباہ ہوتے دیکھ کر بھی ان کے وفادار رہے۔ مگر جب جنگ ختم ہوگئی۔ تو لارڈ ایلن برا نے امیروں پر یہ بے بنیاد الزام لگایا۔ کہ وہ جنگ کے دوران میں انگریزوں کے خلاف سازشیں کرتے رہے ہیں۔ اس نے سر چارلس نیپیئر کو اس معاملہ کی تحقیقات کے لئے پورے اختیارات دے کر سندھ روانہ کیا۔ اصل بات یہ تھی کہ سرکار انگریزی سندھ کو اپنے قبضہ میں کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ ایک تو افغانستان کے خلاف فوجی کارروائی کرنے کے لئے سندھ ایک زبردست فوجی چھاؤنی کا کام دے سکتا تھا اور دوسرے دریائے سندھ تجارت کے لئے بڑا مفید تھا۔

چارلس نیپیئر بھی سندھ پر قبضہ کرنے کا زبردست حامی تھا۔ چنانچہ اس نے سندھ پہنچ کر اپنے سخت رویہ اور ناجائز مطالبات سے بلوچیوں کو سخت برانگیختہ کیا۔ اور انہوں نے انگریزی

ریزیڈنسی پر دھاوا بول دیا۔ نیپیئر تو یہی چاہتا تھا۔ آخر جنگ چھڑ گئی۔ اور امیروں کو میانی اور وابو کی لڑائیوں میں شکست فاش ہوئی۔ اور سندھ کو 1843ء میں انگریزی علاقہ میں شامل کرلیا گیا۔

لارڈ ہارڈنگ 1844ء سے 1848ء

اصلاحات : لارڈ ہارڈنگ ایک بڑا تجربہ کار اور جنگ آزما سپاہی تھا۔ اس کے عہد حکومت کا سب سے مشہور واقعہ سکھوں کی پہلی جنگ ہے۔ لیکن اس نے اپنے عہد حکومت کے پہلے ہی سال میں چند ایک مفید اصلاحیں بھی کیں۔

(1) ہندوستان میں ریلوں کی سکیم تیار کی گئی۔
(2) نہر گنگ جاری کرنے کی تجویز پر غور کیا گیا۔
(3) تعلیم کو زیادہ ترقی دی گئی۔ اور رڑکی میں انجینئرنگ کالج کھولا گیا۔
(4) ماتحت ریاستوں میں ستی اور دختر کشی کو روکنے کی کوشش کی گئی۔
(5) آڑیسہ کی وحشی قوموں میں انسانی قربانی کی رسم کا خاتمہ ہوگیا۔

سکھوں کی پہلی جنگ 1845ء سے 1846ء : وجہ۔ 1839ء میں رنجیت سنگھ مرگیا۔ اس کے مرتے ہی پنجاب میں ابتری مچ گئی اور چھ سال تک کشت و خون اور سازشوں کا دور دورہ رہا۔ خالصہ فوج بہت طاقت ور ہوگئی۔ اور رنجیت سنگھ کے دو بیٹے اور کئی وزیر موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ آخر کار 1845ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کا سب سے چھوٹا بیٹا دلیپ سنگھ جس کی عمر پانچ سال کی تھی تخت نشین ہوا۔ اور اس کی ماں رانی جنداں اس کی سرپرست بنی۔ لال سنگھ وزیر مقرر ہوا۔ لیکن رانی جنداں اور دیگر سکھ سردار خالصہ فوج سے بہت خائف تھے اور وہ چاہتے تھے کہ اسے انگریزوں سے لڑا کر اس کا زور توڑ دیا جائے۔ اس لئے انہوں نے خالصہ فوج کو انگریزی علاقے پر حملہ کرنے کے لئے اکسایا۔ دسمبر 1845ء میں سکھ فوج ستلج پار کرکے انگریزی علاقے میں داخل ہوگئی۔ اس پر لارڈ ہارڈنگ نے اعلان جنگ کردیا۔

واقعات : انگریزی فوجوں کا کمانڈر انچیف سرہیوگف تھا۔ لیکن لارڈ ہارڈنگ خود بھی اس جنگ میں شریک ہوا۔ یہ جنگ چار مقامات پر لڑی گئی۔ مدکی۔ فیروز شاہ ۔ علی وال اور سبراں۔

سب سے پہلی لڑائی مدکی کے مقام پر ہوئی۔ اور اگرچہ سکھوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ دوسری لڑائی فیروز شاہ کے مقام پر ہوئی۔ لیکن شکست کھائی۔ دوسری لڑائی فیروز شاہ کے مقام پر ہوئی۔ یہ بڑی گھمسان کی لڑائی تھی۔ اس میں انگریزوں کا بہت نقصان ہوا۔ لیکن انجام کار سکھ شکست کھا کر پسپا ہوئے۔ تیسری لڑائی علی وال کے مقام پر ہوئی۔ اور اس میں بھی سکھوں کو شکست ہوئی۔ اس جنگ کی آخری اور فیصلہ کن لڑائی سبراؤں کے مقام پر ہوئی۔ ایک زبردست مقابلہ کے بعد سکھوں نے شکست کھائی اور ان کے کئی سردار

مارے گئے۔ مشہور سکھ سردار شام سنگھ اٹاری والا بھی اس لڑائی میں بہادر سے لڑتا ہوا کام آیا اور آخر کار عہد نامہ لاہور کی رو سے لڑائی ختم ہو گئی۔

عہد نامہ لاہور 1846ء : اس عہد نامہ کی شرائط مندرجہ ذیل تھیں۔

(1) دو آبہ بست جالندھر انگریزوں کو دے دیا گیا۔
(2) سکھ فوج گھٹا کر صرف بیس ہزار پیادہ اور بارہ ہزار سوار رہنے دی گئی۔
(3) سر ہنری لارنس کو لاہور میں ریزیڈنٹ مقرر کیا گیا۔
(4) ایک انگریزی فوج قیام امن کے لئے لاہور میں رکھی گئی۔
(5) ڈیڑھ کروڑ روپیہ سکھوں کو تاوان جنگ ادا کرنا پڑا۔

نوٹ : سکھوں کے پاس تاوان کی رقم ادا کرنے کے لئے صرف 50 لاکھ روپیہ تھا۔ چنانچہ بقایا ایک کروڑ روپیہ کے بدلے جموں و کشمیر کا علاقہ ڈوگرا سردار گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ دیا گیا۔ گلاب سنگھ خالصہ دربار کی طرف سے جموں کا صوبہ دار تھا۔ لیکن اس طرح وہ خود مختار حاکم تسلیم کر لیا گیا اور آج کل کے مسئلہ کشمیر کے ڈانڈے اسی فروخت سے جا ملتے ہیں۔

لارڈ ڈلہوزی 1848ء سے 1856ء

لارڈ ڈلہوزی کا شمار ہندوستان کے مشہور گورنر جنرلوں میں کیا جاتا ہے۔ اس عہدہ کا چارج لینے کے وقت اس کی عمر 36 سال تھی۔ اس نے سلطنت انگریزی کو خوب وسعت دی۔ اور ملک میں کئی اصلاحات نافذ کیں۔ زیادہ کام کرنے کی وجہ سے اس کی صحت بہت خراب ہوگئی۔ اور وہ واپسی کے چار سال بعد ہی مرگیا۔

لارڈ ڈلہوزی کے عہد کے مشہور واقعات مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) سکھوں کی دوسری جنگ اور الحاق پنجاب۔
(2) برما کی دوسری جنگ۔
(3) مسئلہ الحاق۔
(4) الحاقات۔
(5) خطابات و پنشنوں کی ضبطی۔
(6) چارٹر 1853ء۔
(7) اصلاحات۔

سکھوں کی دوسری جنگ 1848ء سے 1849ء : وجوہات۔ سکھ اپنی سابقہ شکست سے شرمندہ تھے۔ اور اپنی کھوئی ہوئی آزادی کو دوبارہ واپس لینے کے لئے بیتاب تھے۔

(2) بڑی بڑی آسامیوں پر انگریز افسر تعینات کر دیئے ہوئے تھے اور اصلی حکومت انہی کے ہاتھوں میں تھی اور سکھ اس بات سے بہت ناراض تھے۔

(3) جنگ کی فوری وجہ مولراج کی بغاوت تھی۔ دیوان مولراج دربار لاہور کی طرف سے ملتان کا حاکم تھا۔ جب اس سے حساب طلب کیا گیا۔ تو اس نے استعفےٰ دے دیا۔ اس کی جگہ سردار کاہن سنگھ کو مقرر کیا گیا۔ اور دو انگریز افسر (اگینو اور اینڈرسن) چارج دلوانے کے لئے اس کے ساتھ گئے۔ لیکن ان انگریزوں کو کسی برخاست شدہ سپاہی نے ملتان میں قتل کر دیا۔ اس کے بعد دیوان مولراج نے بغاوت کر دی۔ جب یہ خبر لاہور پہنچی تو خالصہ دربار نے شیر سنگھ اٹاری والا کو فوج دیکر بغاوت فرو کرنے کے لئے بھیجا۔ لیکن شیر سنگھ مولراج سے مل گیا۔ ایک انگریز افسر ایڈورڈز نے تھوڑی سی فوج اکٹھی کرکے مولراج کو ملتان کے قلعہ میں محصور کرلیا۔ اس اثناء میں تمام پنجاب میں بغاوت پھیل گئی اور سکھوں نے انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے۔

واقعات : انگریزی فوجوں کا کمانڈر انچیف لارڈ گف تھا۔ شروع شروع میں دریائے چناب کے کنارے رام نگر اور سعد اللہ پور کے مقام پر معمولی لڑائیاں ہوئیں۔ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اس جنگ کی پہلی مشہور لڑائی چیلیانوالہ کے مقام پر ہوئی۔ جس میں سکھوں نے خوب داد شجاعت

دی اور اگرچہ انجام کار انگریز جیت گئے۔ لیکن ان کا بہت نقصان ہوا۔ جب اس معرکہ کی خبر انگلینڈ پہنچی۔ تو گف کی بجائے سر چارلس نیپئر (فاتح سندھ) کو سپہ سالار بنا کر بھیجا گیا۔ لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی گف نے سکھوں کو گجرات کے مقام پر ایک فیصلہ کن شکست دے کر بدنامی کے دھبے کو دھو ڈالا۔ اس اثناء میں ملتان پر بھی قبضہ ہو چکا تھا۔ آخر سکھوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور لڑائی ختم ہو گئی۔

نتائج :

(1) مارچ 1849ء میں پنجاب کو انگریزی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔

(2) مہاراجہ دلیپ سنگھ کی پچاس ہزار پونڈ سالانہ پنشن مقرر ہو گئی۔ اور اسے انگلستان بھیجا گیا۔ جہاں اس نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔

(3) مولراج کو قتل کے الزام میں پھانسی کی سزا کا حکم ہوا۔ مگر بعد میں یہ سزا کالے پانی میں بدل دی گئی لیکن رستے میں اس نے خودکشی کر لی۔

برما کی دوسری جنگ 1852ء : وجہ۔ برما کی پہلی جنگ کے بعد بہت سے انگریز تاجر رنگون میں آباد ہو گئے تھے۔ شاہ برما ان سے نہایت غیر مناسب سلوک کرتا تھا۔ اور جب کبھی اس سے شکایت کی جاتی تھی۔ وہ مطلق پروانہ نہ کرتا تھا۔ آخر 1852ء میں لارڈ ڈلہوزی نے اعلان جنگ کر دیا۔

واقعات : مختصر سی لڑائی کے بعد رنگون اور پروم فتح کر لئے گئے اور اس کے بعد پیگو کا صوبہ بھی انگریزی حکومت میں شامل کر لیا گیا۔ اور جنگ ختم ہو گئی۔

نتیجہ : تناسرم۔ اراکان اور پیگو کو ملا کر لوئر برما کے نام سے ایک نیا صوبہ قائم کیا گیا۔ جس کی راجدھانی رنگون مقرر کی گئی۔

مسئلہ الحاق کے اثرات : سب سڈی ایری سسٹم کی رو سے چونکہ انگریزی حکومت اپنی ماتحت ریاستوں کو اندرونی بغاوتوں اور بیرونی حملوں سے بچانے کی ذمہ دار تھی۔ اس لئے ان ریاستوں کے راجہ اور نواب عیش و عشرت میں پڑ گئے تھے اور رعایا کا برا حال تھا۔ ڈلہوزی کا خیال تھا کہ اگر دیسی ریاستوں کا انتظام انگریزی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے تو ان کی رعایا کو بے حد فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے الحاق کے اصول پر خوب عمل کرنا شروع کیا۔ الحاق کا اصول یہ تھا کہ اگر کسی ماتحت یا باجگزار ریاست کا راجہ یا نواب بنا اولاد نرینہ کے مر جائے۔ تو اس کے متبنے کو گدی نشین نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ وہ ریاست انگریزی سلطنت میں شامل کر لی جائے گی۔ یہ کوئی نیا مسئلہ نہ تھا بلکہ پہلے (لارڈ ولیم بنٹنک نے بھی اس پر عمل کیا تھا) سے موجود تھا۔ صرف اتنا تھا کہ لارڈ ڈلہوزی نے اس پر سختی سے عمل کیا۔

ایسا اتفاق ہوا کہ لارڈ ڈلہوزی کے زمانہ میں بہت سے والیان ریاست اولاد نرینہ

چھوڑے بنا مرگئے۔ جس سے سات ریاستیں انگریزی عملداری میں شامل کرلی گئیں۔ ان میں سے زیادہ مشہور ستارہ۔ جھانسی اور ناگپور تھیں۔ باقی چھوٹی چھوٹی ریاستیں۔ جیت پور (بندھیلکھنڈ میں) سنبھل پور (اڑیسہ میں) بگھاٹ اور اودے پور (ممالک متوسط میں) تھیں۔ الحاق کی اس پالیسی نے دیسی فرمانرواؤں کو انگریزی حکومت سے بدظن کردیا۔ اور انہیں یہ خدشہ پیدا ہوگیا کہ ان کی ریاستیں جلد یا بدیر انگریزی حکومت میں ملا لی جائیں گی۔

الحاقات : لارڈ ڈلہوزی نے اپنے زمانہ حکومت میں کئی علاقوں کا الحاق کرکے انگریزی سلطنت کو بہت وسعت دی۔ اس کے الحاقات مندرجہ ذیل حصوں میں منقسم کئے جاسکتے ہیں۔

1۔ الحاقات بذریعہ فتوحات : پنجاب کا صوبہ سکھوں کی دوسری جنگ کے نتیجہ کے طور پر اور پیگو اور پروم کے علاقے برما کی دوسری جنگ کے نتیجہ کے طور پر انگریزی عملداری میں شامل کئے گئے۔

2۔ مسئلہ الحاق کی رو سے الحاقات : مسئلہ الحاق کی رو سے سات ریاستیں انگریزی سلطنت میں ملا لی گئیں۔ ان میں سے ستارہ۔ جھانسی اور ناگپور زیادہ مشہور تھیں۔ اور باقی چار ریاستیں جیت پور۔ سمبل پور۔ اودے پور اور بگھاٹ تھیں۔

3۔ بدنظمی کی وجہ سے الحاق : اودھ کا انتظام بڑا خراب تھا۔ اور ریاست میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ 1856ء میں ایک اعلان کے ذریعے اودھ کو بدانتظامی کی بناء پر انگریزی سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔ اور وہاں کے نواب واجد علی شاہ کو ایک معقول پنشن دے کر کلکتہ بھیج دیا گیا۔

4۔ امدادی فوج کے خرچ کے بدلے : 1853ء میں برار کا علاقہ حیدر آباد نے امدادی فوج کے خرچ کے بدلے انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

خطابات وغیرہ کی ضبطی :

(1) کرناٹک کے نواب اور تنجور کے راجہ کی وفات پر ان کے خطابات ختم کر دیئے گئے۔

(2) پیشوا باجی راؤ ثانی کی وفات پر اس کی آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ کی پنشن اس کے متبنے دھوندو پنتھ المعروف نانا صاحب کو دینے سے انکار کیا گیا۔

(3) یہ بھی فیصلہ ہوا کہ مغل بادشاہ بہادر شاہ کی وفات پر اس کی اولاد کو قلعہ اور محل خالی کر دینے پڑیں گے۔

چارٹر ایکٹ 1853ء : 1853ء میں کمپنی کے چارٹر کی آخری بار تجدید ہوئی۔ اس کی رو سے یہ فیصلہ ہوا کہ

(1) پارلیمنٹ جب چاہے کمپنی کی حکومت ختم کر دے۔

(2) گورنر جنرل کو بنگال کی گورنری سے سبکدوش کر دیا گیا اور اس صوبے کے انتظام کے

لئے ایک لفٹنٹ گورنر مقرر کیا گیا۔

(3) سول سروس کے لئے لنڈن میں مقابلہ کا امتحان ہونا قرار پایا۔

(4) مجلس قانون ساز بھی بنائی گئی۔

اصلاحات اور لارڈ ڈلہوزی : لارڈ ڈلہوزی نے ملک کے اندر کئی مفید اصلاحات نافذ کیں۔

1۔ محکمہ تعمیرات عامہ : لارڈ ڈلہوزی نے محکمہ تعمیرات عامہ یعنی پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ قائم کیا۔ جس نے بہت سی سڑکیں۔ نہریں اور پل بنوائے ۔ دریائے گنگا سے نہر گنگ نکالی گئی۔ مشہور گرانڈ ٹرنک روڈ یعنی جرنیلی سڑک اسی زمانے میں تعمیر ہونی شروع ہوئی۔

2۔ محکمہ ڈاک اور تار : ملک میں جا بجا موجودہ طرز کے ڈاک خانے اور تار گھر قائم کئے گئے۔ جس سے خبر رسانی کا کام بہت آسان ہوگیا۔ دو پیسے کا ٹکٹ لگا کر خط بھیجنے کا طریقہ اسی کے زمانہ میں شروع ہوا۔ اس سے پہلے خط بھیجنے کا خرچ فاصلہ کی کمی بیشی کے حساب سے دینا پڑتا تھا۔

3۔ ریل : ریلوے لائن بھی ہندوستان میں ڈلہوزی کے زمانہ میں ہی شروع ہوئی۔ جس سے سفر کرنے میں آہستہ آہستہ بہت آسانی ہوگئی۔ 1853ء میں بمبئی اور تھانہ کے درمیان پہلی ریلوے لائن تعمیر کی گئی۔

4۔ محکمہ تعلیم : لارڈ ڈلہوزی نے محکمہ تعلیم کی طرف خاص طور پر دھیان دیا۔ 1854ء میں بورڈ آف کنٹرول کے پریذیڈنٹ سرچارلس وڈ کی مشہور تعلیمی رپورٹ ہندوستان پہنچی۔ اس رپورٹ کو موجودہ تعلیم کا سنگ بنیاد مانا جاتا ہے۔ اس میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ ہر صوبہ میں ایک ایک محکمہ تعلیم قائم کیا جائے۔ کلکتہ۔ بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں کھولی جائیں۔ اور لوگوں کو دیسی زبان میں تعلیم دینے کے لئے سکول جاری کئے جائیں۔ پرائیویٹ سکولوں کو سرکاری مدد دی جائے۔ ڈلہوزی نے اس رپورٹ پر عمل کیا اور محکمہ ہائے تعلیم قائم کئے گئے۔

5۔ مجلسی اصلاحات :

(1) ہندو بیواؤں کو دوبارہ شادی کی اجازت دی گئی۔

(2) یہ بھی فیصلہ ہوا کہ اگر کوئی ہندو اپنا مذہب بدل لے تو بھی وہ موروثی جائیداد کا حق دار ہوگا۔

لارڈ ڈلہوزی کے کارہائے نمایاں ایک نظر میں

(The outstanding achievements of Lord Dalhousie)

لارڈ ڈلہوزی کا شمار کمپنی کے مشہور ترین گورنر جنرلوں میں کیا جاتا ہے اس کا سب سے بڑا کارنامہ انگریزی حکومت کو غیر معمولی طور پر وسعت دینا اور اصلاحات کا رائج کرنا ہے۔

لارڈ ڈلہوزی کو ہندوستان آئے ابھی چند ہفتے ہی ہوئے تھے کہ اسے سکھوں جیسی نڈر اور بہادر قوم سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن ڈلہوزی نے سکھوں کے مقابلہ کے لئے وسیع اور اعلے پیمانہ پر تیاریاں کیں اور سکھوں کی دوسری جنگ 48-1849ء میں انہیں شکست فاش دی اور 1849ء میں پنجاب کا صوبہ انگریزی عملداری میں شامل کر لیا گیا۔

اس کے بعد اسے برما کی دوسری جنگ لڑنی پڑی۔ اور اس کے نتیجہ کے طور پر پیگو اور پردم پر انگریزی قبضہ ہوگیا۔ اور صوب لوئر برما قائم کیا گیا۔

پنجاب اور لوئر برما کے علاوہ ڈلہوزی نے کئی اور علاقے انگریزی حکومت میں ملا لئے۔ ستارہ۔ جھانسی۔ ناگپور وغیرہ سات ریاستیں مسئلہ الحاق کی رو سے انگریزی عملداری میں شامل کرلی گئیں۔ اودھ کا علاقہ بدنظمی کی بناء پر اور برار امدادی فوج کے خرچ کے عوض سلطنت انگریزی میں شامل کیا گیا۔ اس طرح سے ڈلہوزی نے انگریزی سلطنت کو بہت وسعت دی۔ اس کے بعد ہندوستان کے نقشہ میں کوئی زیادہ تبدیلیاں نہیں ہوئیں۔

انگریزی سلطنت کی وسعت کے علاوہ ڈلہوزی نے ملک میں کئی اصلاحات نافذ کیں۔ محکمہ ہائے پبلک ورکس ۔ ریل۔ تار و ڈاک وغیرہ اسی نے قائم کیے۔ ریل اور تار کی وجہ سے ہندوستان کے دور افتادہ حصوں میں میل ملاپ بڑھ گیا۔ جس سے قومیت کے جذبہ نے نشوونما پانی شروع کی۔ موجودہ تعلیم کا سسٹم بھی ڈلہوزی کے زمانے سے شروع ہوا۔ اس کے پہلے گورنر جنرلوں نے یا تو انگریزی علاقہ کو وسیع کیا۔ یا وہ اصلاحات کے لئے مشہور ہوئے۔ لارڈ ڈلہوزی نے سب سے زیادہ علاقہ انگریزی حکومت میں شامل کیا۔ اور سب سے زیادہ اصلاحات کیں۔ اسی لئے کتنی ہی دیر یہ کہاوت مشہور رہی۔ کہ "موجودہ ہندوستان لارڈ ڈلہوزی کا بنایا ہوا ہے"

لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ڈلہوزی کے اس قدرالحاقات اور زود رفتار اصلاحات نے دیسی فرمانرواؤں اور عوام کو انگریزی حکومت سے بدظن کردیا۔ اور جو جنگ آزادی لارڈ کیننگ کے زمانہ میں رونما ہوئی۔ اس کی ذمہ داری بہت حد تک ڈلہوزی پر عائد ہوتی ہے۔

لارڈ کیننگ 1856ء سے 1858ء

انگریزوں کے بقول : لارڈ کیننگ کے زمانے کا سب سے مشہور واقعہ 1857ء کا غدر ہند ہے۔ جسے برصغیر کے لوگوں نے جنگ آزادی کا نام دیا۔ جنگ آزادی کی وجوہات کچھ اس طرح تھیں۔

1۔ سیاسی
2۔ مجلسی و مذہبی
3۔ فوجی
4۔ متفرق

1۔ سیاسی وجوہات : لارڈ ڈلہوزی کی الحاق کی پالیسی نے سارے والیان ریاست میں بے چینی پھیلا رکھی تھی۔ اور وہ بہت بددل ہو رہے تھے :

(1) پیشوا کا متبنے نانا صاحب پنشن نہ ملنے کی وجہ سے انگریزوں کا جانی دشمن بن گیا تھا۔
(2) جھانسی کی نوجوان رانی لکشمی بائی متبنے بنانے کی اجازت نہ ملنے کے سبب سخت ناراض تھی۔
(3) اودھ کے الحاق سے وہاں کے تمام تعلقدار بگڑے بیٹھے تھے۔
(4) دہلی کا بادشاہ اس خیال سے کہ اس کی موت کے بعد اس کی اولاد کو شاہی محل خالی کرنا پڑے گا۔ سخت پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

2۔ مجلسی و مذہبی وجوہات : مغربی تہذیب نے لوگوں کو بد دل کر دیا تھا :

(1) ریلوے کا اجرا۔
(2) تار برقی کا سلسلہ۔
(3) عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں۔
(4) مغربی تعلیم کی اشاعت۔
(5) ستی کا انسداد۔
(6) بیوگان کی شادی کا قانون وغیرہ وغیرہ ایسی باتیں تھیں۔ جنہیں عوام خوف اور شک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ جنہیں عوام خوف اور شک کی نظروں سے دیکھتے تھے اور ان کا یہ خیال تھا کہ انگریزی حکومت لوگوں کو عیسائی بنانے پر تلی ہوئی ہے اور یہ آواز زوروں پر تھی کہ ہمارا مذہب اور روایات خطرے میں ہیں۔

3۔ فوجی وجوہات : اس جنگ کی سب سے بڑی وجہ ہندوستانی فوج کی ناراضگی تھی (1) ان کی تنخواہیں قلیل تھیں۔ اور ان سے پہلا سا سلوک بھی نہ ہوتا تھا (3) ایک ایکٹ پاس ہوا۔

جسے (General Service Enlistment Act) کہتے تھے۔ جس کی رو سے ہندوستانی سپاہیوں کو ہر جگہ لڑنے کے لئے بھیجا جاسکتا تھا۔ لیکن برہمن سپاہی سمندر کو پار کرنا اپنے مذہب کے خلاف سمجھتے تھے۔ (3) بنگال کی فوج میں زیادہ تر اودھ کے سپاہی تھے۔ جو اودھ کے الحاق کی وجہ سے بڑے ناراض تھے (4) ہندوستانی فوج کی زیادہ تعداد نے ان کے حوصلے اور بھی بڑھا دیئے تھے۔

4۔ متفرق : (1) یہ کہاوت مشہور تھی کہ دہلی کا راج سو سال کے بعد بدل جاتا ہے۔ اس لئے یہ افواہ زوروں سے گشت لگا رہی تھی کہ پلاسی کی لڑائی کے سو سال بعد انگریزی حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

(2) مفسد لوگ ہمیشہ اس تاک میں رہتے ہیں کہ ملک میں بدامنی پھیلے۔ ایسے لوگ بھی عوام کو اور خاص کر فوجیوں کو سرکار انگریزی کے خلاف بھڑکا رہے تھے۔

فوری وجہ : ان دنوں میں سپاہیوں کو نئے رائفل دیئے گئے تھے۔ جن میں چربی والے کارتوس استعمال ہوتے تھے۔ اس پر طرفہ یہ کہ کارتوسوں کو رائفل میں چڑھانے سے پیشتر منہ سے کاٹنا پڑتا تھا۔ یہ افواہ پھیل گئی کہ یہ چربی گائے اور سور کی ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ کئی ایک چھاؤنیوں میں بغاوت پھوٹ نکلی۔

سب سے پہلے بارک پور اور برہام پور وغیرہ میں شورش ہوئی۔ لیکن غدر کا آغاز ایت وار 10 مئی 1857ء سے میرٹھ کے مقام سے مانا جاتا ہے۔ وہاں کچھ (85) سپاہیوں نے چربی والے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کردیا تھا۔ اور وہ قید کر دیئے گئے تھے۔ 10 مئی کو ان کے ساتھیوں نے جیل خانہ پر ہلہ بول کر قیدیوں کو رہا کروا لیا اور انگریز افسروں کو قتل کرکے دہلی پہنچے۔ جنگ آبادی کے بڑے بڑے مراکز دہلی، کانپور، لکھنؤ اور وسط ہند تھے۔

1۔ دہلی : میرٹھ کے باغی سپاہیوں یا حریت پسندوں نے دہلی پہنچ کر آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو تخت نشین کردیا۔ اور بہت سے انگریز افسر اور سپاہی قتل کر دیئے۔ کئی اور مقامات سے بھی ہندوستانی فوجیں باغی ہوکر دہلی آپہنچیں۔ اور باغیوں نے دہلی پر قبضہ کرلیا۔ مگر پنجاب سرجان لارنس کے ماتحت وفادار رہا۔ اور انگریزوں نے پنجابی فوجوں کی مدد سے دہلی کا محاصرہ کرلیا۔ تین ماہ کے محاصرہ کے بعد جنرل نکلسن کی سرکردگی میں دہلی فتح ہوگیا۔ لیکن عین فتح کے وقت نکلسن مارا گیا۔ بہادر شاہ کو قیدی بنا کر رنگون بھیج دیا گیا۔ اور اس کے دو بیٹے اور ایک پوتا اس کے سامنے گولی سے اڑا دیئے گئے۔

2۔ کانپور : کانپور میں باغیوں کی باگ ڈور آخری پیشوا کے متبنے دھوندو پنتھ المعروف نانا صاحب کے ہاتھ میں تھی۔ انگریزوں نے کچھ دنوں تک اس کا مقابلہ کیا۔ مگر آخر اپنے آپ کو اس کے رحم پر چھوڑ دیا۔ نانا نے وعدہ کیا کہ وہ انہیں بخیریت الٰہ آباد پہنچا دے گا۔ لیکن جب وہ الٰہ آباد کے لئے کشتیوں پر سوار ہو رہے تھے۔ تو گولیوں سے اڑا دیئے گئے۔ نانا نے قریباً دو سو

انگریز عورتوں اور بچوں کو بھی قید کر رکھا تھا۔ جب اس نے سنا کہ جنرل ہیولاک اس کے خلاف آ رہا ہے۔ تو اس نے ان تمام عورتوں اور بچوں کو قتل کروا کر ان کی لاشیں ایک کنوئیں میں پھکوا دیں۔ آخر جنرل ہیولاک نے نانا صاحب کو شکست دی۔ اور وہ کہیں بھاگ کر لاپتہ ہوگیا۔

3۔ لکھنؤ : لکھنؤ میں باغیوں نے سر ہنری لارنس اور تمام انگریزوں کو ریزیڈیسی میں محصور کرلیا۔ ہنری لارنس تو شروع محاصرہ میں ہی مارا گیا۔ مگر محصورین مقابلہ پر ڈٹے رہے۔ آخر جنرل ہیولاک اور اوٹرم ان کی مدد کو آپہنچے۔ اور لڑتے بھڑتے ریزیڈنسی کے اندر داخل ہوگئے۔ مگر انہیں بھی باغیوں نے محصور کرلیا۔ انجام کار سر کولن کیمبل نے لکھنؤ کو فتح کرلیا۔

4۔ وسط ہند : وسط ہند اور بندھیل کھنڈ میں باغیوں کے لیڈر جھانسی کی نوجوان رانی لکشمی بائی اور نانا صاحب کی فوجوں کا سپہ سالار تانتیا ٹوپی تھے۔ سرہیو روز ان کے خلاف بڑھا۔ رانی جھانسی نے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اور آخر لڑتی ہوئی میدان جنگ میں ماری گئی۔ تانتیا ٹوپی شکست کھا کر بھاگ گیا۔ مگر آخر کار پکڑا گیا۔ اور اسے پھانسی دی گئی۔ اس طرح سے جنگ کا خاتمہ ہوا۔

جنگ کے نتائج : 1۔ سب سے اہم نتیجہ یہ ہوا۔ کہ کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ اور ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ اور پارلیمنٹ کے ماتحت ہوگیا۔

اگست 1858ء کو ایک قانون پاس ہوا۔ جس کی رو سے بورڈ آف کنٹرول اور کورٹ آف ڈائرکٹرز ہٹا دیئے گئے۔ اور ان کی جگہ وزیر ہند (سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا) مقرر کیا گیا۔ اس کی مدد کے لئے ایک کونسل بنائی گئی۔ جس کا نام انڈیا کونسل رکھا گیا۔ گورنر جنرل کو وائسرائے کا خطاب دیا گیا۔ پہلا وائسرائے لارڈ کیننگ ہی تھا۔

(1935ء کے قانون کے مطابق انڈیا کونسل ہٹا دی گئی ہے۔)

(1) سرکار انگریزی کو اپنے طرز حکومت کے نقائص معلوم ہوگئے۔ اور انہوں نے اس طرز حکومت میں اصلاح کرنی شروع کی۔

(2) دیسی راجاؤں کو یقین دلایا گیا۔ کہ ان کے علاقے کسی صورت میں بھی سلطنت انگریزی میں نہیں ملائے جائیں گے۔ اور انہیں متبنے بنانے کی اجازت دی گئی۔

(3) رعایا کو مذہبی آزادی کا یقین دلایا گیا۔

ملکہ وکٹوریہ کا اعلان 1858ء

Queen Victoria's Proclamation

1857ء کی جنگ آزادی کے ناکام ہو جانے کے بعد جب ہندوستان کی حکومت کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر براہ راست تاج برطانیہ کے ماتحت ہوگئی۔ تو ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے نہایت اہم اعلان کیا گیا۔ جو یکم نومبر 1858ء کو الہ آباد میں پڑھ کر سنایا گیا۔ اس اعلان کی مشہور باتیں یہ تھیں۔ (ایسا ہی اعلان لاہور میں بھی پڑھ کر سنایا گیا)

(1) دیسی راجاؤں اور نوابوں کو یقین دلایا گیا۔ کہ ان کی ریاستیں انگریزی علاقہ میں شامل نہیں کی جائیں گی۔ اور انہیں متبنے بنانے کا حق ہوگا۔

(2) تمام رعایا کو یقین دلایا گیا کہ ان کے مذہب میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی اور سب کو اپنے مذہب پر چلنے کی پوری پوری آزادی ہوگی۔

(3) یہ بھی اعلان کیا گیا کہ کوئی ہندوستانی محض اپنے رنگ اور مذہب کی وجہ سے کسی ایسے عہدے سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ جس کے فرائض کو انجام دینے کی وہ خاطر خواہ قابلیت رکھتا ہو۔

(4) اس بات کا بھی اعلان کیا گیا کہ ان تمام باغیوں کو جنہوں نے انگریزوں کے قتل میں حصہ نہیں لیا۔ معاف کر دیا جائے گا۔

(5) یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ ہندوستان کی مالی۔ تجارتی اور صنعتی ترقی کے لئے ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔

نوٹ : یہ اعلان ہندوستانی آزادی کا سب سے بڑا اور پہلا چارٹر تصور کیا جاتا ہے۔

ہندوستان تاج برطانیہ کے ماتحت

پہلا وائسرائے لارڈ کیننگ کمپنی (ایسٹ انڈیا کمپنی) کے تحت آخری گورنر جنرل تھا۔ چنانچہ ملکہ وکٹوریہ کے اعلان یکم نومبر 1858ء کے بعد لارڈ کیننگ کو ہی تاج برطانیہ کی طرف سے پہلا وائسرائے مقرر کیا گیا۔ وہ انتقامی ذہن کا آدمی نہ تھا اس لئے انگریز اسے طنزاً رحمدل کیننگ (Clemency Canning) کہا کرتے تھے۔ وہ علم دوست بھی تھا چنانچہ وائسرائے شپ سے پہلے 1857ء میں اس نے کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم کی تھیں۔ چنانچہ بطور وائسرائے بھی اس نے اصلاحات کا ڈول ڈالا۔

(1) فوج کو نئے سرے سے ترتیب دیا اور کمپنی کی افواج اور شاہی افواج کو مدغم کر دیا گیا۔

(2) 1860ء سے لارڈ میکالے کے تیار کردہ ضابطہ تعزیرات ہند پر عملدرآمد شروع کر دیا

گیا۔

(3) 1861ء میں بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں ایک ایک ہائی کورٹ قائم کی گئی۔

(4) خزانے کو بھرنے کے لئے کئی قسم کے ٹیکس لگائے گئے۔ تاکہ سابقہ نقصانات کا ازالہ ہو سکے۔ 1862ء میں وہ واپس چلا گیا اور کچھ عرصہ بعد انتقال کر گیا۔ اس کی جگہ لارڈ ایلگن اول ہند کا وائسرائے بنا۔ اور اگست 1947ء تک انگریزوں کی حکومت رہی آخر 14 اگست 1947ء کو آزادی پاکر مسلمانوں کا ملک پاکستان معرض وجود میں آیا اور 15 اگست 1947ء کو بھارت نے آزادی پائی۔ اور انگریز برصغیر سے نکل گئے۔
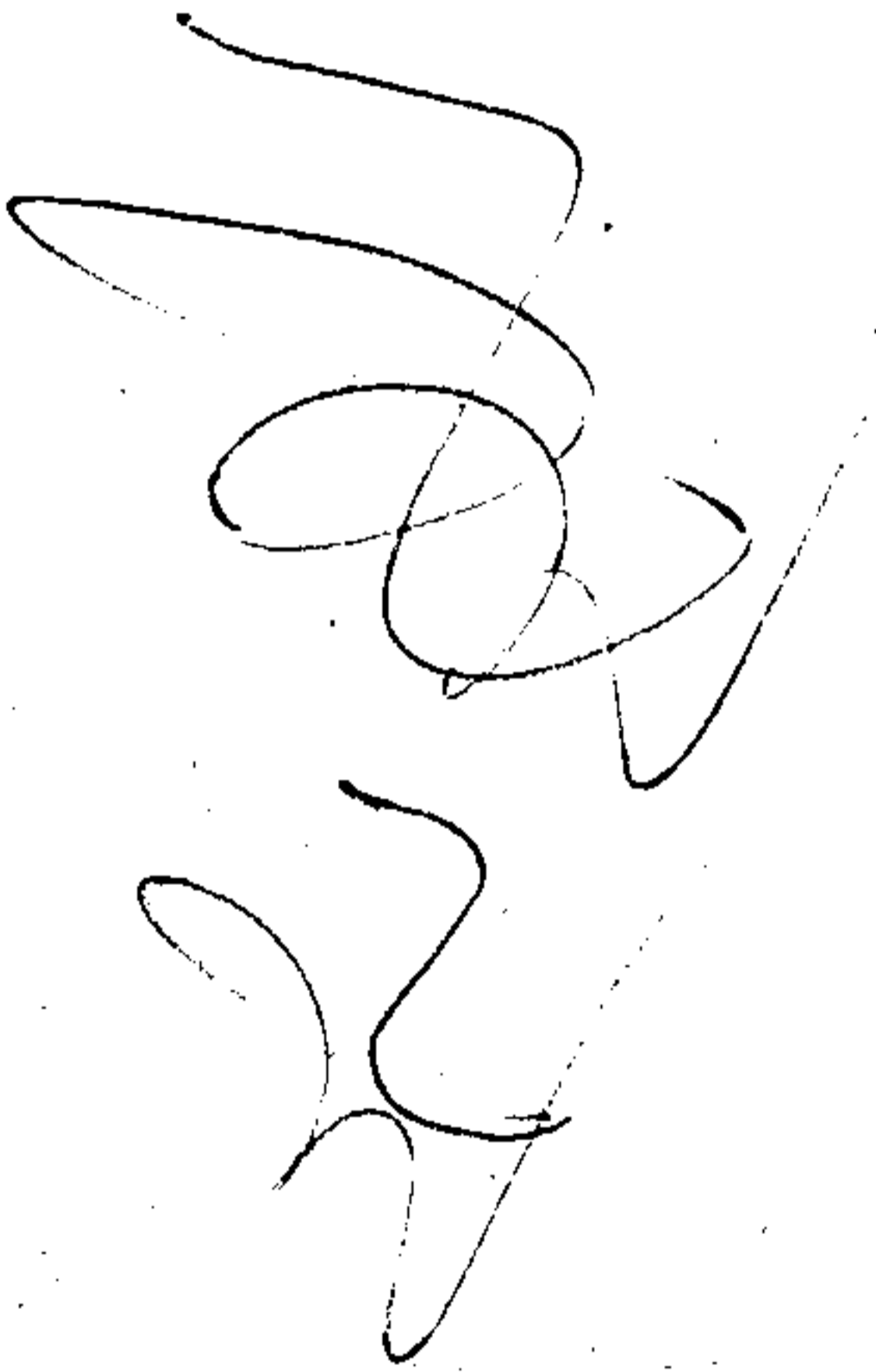
باب 10

برصغیر پر انگریزی تسلط اور اٹھارویں صدی میں مسلم معاشرہ کی حالت

اس موضوع پر جناب خلیق احمد نظامی نے اپنی تصنیف تذکرہ مشائخ چشت میں لکھا ہے کہ ہندوستان کی غلامی کے اسباب مختلف نوعیت کے تھے یعنی اقتصادی ' سیاسی اور سماجی ایک طرف اگر ہندوستان کا اقتصادی نظام ابتر ہوچکا تھا۔ تو دوسری طرف انگریز سب سے پہلے ہندوستان کے اس حصے پر قدم جما رہے تھے جو اس ملک کا سب سے زیادہ خوش حال علاقہ تھا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان کا اقتصادی مرکز ثقل بنگال کی طرف منتقل ہوگیا تھا۔ اورنگ زیب تک کے اخراجات آخری زمانہ میں بنگال کے محاصل سے چلتے تھے۔ انگریزوں کے بنگال پر مسلط ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کی اقتصادی شہ رگ ان کے قبضہ میں چلی گئی۔ بادشاہوں اور امراء کی تنگ نظری اور کوتاہ اندیشی کے باعث انگریزوں کو اپنا اقتدار بڑھانے کے مواقع ملے۔ 1714ء میں فرخ سیر نے کمپنی کو بغیر محاصل اور چنگی کے ملک میں تجارت کرنے کی اجازت دے دی۔ پھر جعفر اور صادق جیسے ننگ وطن لوگوں نے ان کو اپنی طاقت بڑھانے میں مدد دی اور برطانوی سامراج کے پنجے اس ملک میں مضبوطی سے جم گئے۔

پانی پت کی تیسری جنگ 1760ء کے بعد کچھ بیدار مغز لوگوں نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے خطرہ کو محسوس کرلیا تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے بھی انگریزوں کی نیت اور ارادوں کا پتہ لگا لیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اپنی واپسی سے قبل شاہ عالم کی طاقت کا استحکام کر جائے لیکن شاہ عالم اس وقت دہلی نہ آیا اور حالات انگریزوں کے موافق ہوگئے۔ فروری 1771ء میں نواب شجاع الدولہ نے جنرل بار کو اطلاع دی تھی کہ مرہٹے' روہیلے اور افغان ایک معاہدہ کرنے والے ہیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ جب ہندوستان کے لوگوں نے غیر ملکی اقتدار کو بڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ اپنے اختلاف کو دور کرکے اس پر آمادہ ہوگئے کہ سب متحد ہو کر انگریزوں کا مقابلہ کریں۔ حد یہ ہے کہ مولانا سید احمد شہید جن کی تحریک عموماً لیکن غلط طور پر صرف سکھوں کی مخالفت کے پس منظر میں دیکھی جاتی ہے' غیر ملکی اقتدار ختم کرنے کے لئے ہندوؤں سے تعاون اور اشتراک عمل کے لئے کوشاں ہوئے۔ راجہ ہندو رائے کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ (بحوالہ مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا۔

(از ابوالحسن علی ندوی صفحہ 273 ۔ 274)

جناب کو خوب معلوم ہے کہ پردیسی سمندر پار کے رہنے والے دنیا جہاں کے تاجدار یہ

سودا بیچنے والے سلطنت کے مالک بن گئے ہیں۔ بڑے بڑے اہل حکومت اور ان کی عزت و حرمت کو انہوں نے خاک میں ملا دیا ہے' جو حکومت و سیاست کے مرد میدان تھے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں' اس لئے مجبوراً چند غریب و بے سرو سامان کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہوگئے اور محض اللہ کے دین کی خدمت کے لئے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ یہ اللہ کے بندے ہرگز دنیا دار اور جاہ طلب نہیں ہیں۔ محض اللہ کے دین کی خدمت کے لئے اٹھے ہیں۔ مال و دولت کی ذرہ برابر ان کو طمع نہیں جس وقت ہندوستان ان غیر ملکیوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششیں بار آور ہوں گی۔ حکومت کے عہدے اور منصب ان لوگوں کو ملیں گے جن کو ان کی طلب ہوگی۔

انگریزوں نے اپنی شاطرانہ چالوں سے ہندوستان کی ہر ایسی تحریک کا جو ان کے مفاد کے خلاف کام کر سکتی تھی۔ رخ بدل دیا۔ 1857ء میں پھر ایک بار غیر ملکی حکومت کو ختم کرنے کے لئے ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر کوشش کی' لیکن تنظیم کی کمی' غداروں کی کثرت اور اقتصادی مشکلات کے باعث وہ تحریک بھی ناکام رہی۔ بقول خلیق احمد نظامی۔

مولانا غلام رسول مہر نے اپنی تصنیف "سید احمد شہید" میں تاریخی شواہد سے ثابت کیا ہے کہ ان کی تحریک حقیقت میں انگریزوں کے خلاف تھی۔ اگرچہ حالات اور واقعات بتاتے ہیں کہ انہوں نے سکھوں کے خلاف جہاد کیا تھا اور شہادت پائی۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مسلمانوں کی حالت

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے پاک و ہند کی تاریخ مسلمانوں کے در دوالم کی ایک طویل داستان ہے۔ 1739ء میں نادر شاہ کا حملہ ہوا۔ اور مسلمانوں کی پریشانیوں کا ایک ایسا باب کھل گیا جو 1857ء کے بعد تک جاری رہا۔ ہر صبح ان کے لئے ایک نئے فتنے کا پیغام لاتی تھی۔

ان حالات میں صبر و استقلال کا قائم رکھنا آسان کام نہ تھا۔ جب نادر شاہ نے آگ اور خون کا ہنگامہ برپا کیا تو دہلی کے وہ باشندے جنہوں نے شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے عہد میں امن اور چین کے ساتھ زندگی بسر کی تھی۔ بدحواس ہوگئے۔ مایوسی' وحشت' کم ہمتی اور خود فراموشی نے ان کے قوائے عمل کو ایسا شل کر دیا کہ علاوہ انہیں کوئی راہ ہی نظر نہ آئی' اور انہوں نے آگ میں جل مرنے کا فیصلہ کیا۔ شاہ ولی اللہ نے جب قوم کی پستی کا یہ عالم دیکھا تو حضرت امام حسین رضی اللہ تعالٰی عنہ کی شہادت اور مصائب کے واقعات بیان کرکے ان کی ڈھارس بندھائی اور ان کی قنوطیت کو دور کیا۔ لیکن نادر شاہ کا قتل عام مسلمانوں کے مصائب کی انتہا نہ تھی' ابتدا تھی' ابھی موج خون سر سے نہ گزری تھی۔ نادر شاہ کے حملہ کے بعد ملک میں وہ ابتری اور انتشار پیدا ہوگیا کہ بقول ہرچرن داس لوگوں پر دیوانگی سی کیفیت طاری ہوگئی۔

(بحوالہ ملفوظات شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی مطبوعہ میرٹھ)

مرہٹے' جاٹ' سکھ ـــ تینوں کی ہنگامہ آرائی نے زندگی کو ایک مصیبت بنادیا۔ پھر افغانوں کے حملوں نے تو جان ہی نکال لی۔ شاہ ولی اللہ نے کرب و بے چینی کے عالم میں نجیب الدولہ کو خط لکھا۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے خواہ وہ دہلی کے ہوں خواہ اس کے علاوہ کسی اور جگہ کے بہت سے صدمات دیکھے ہیں اور چندر بار لوٹ مار کا شکار ہوئے ہیں۔ چاقو ہڈی تک پہنچ گیا ہے۔ رحم کا مقام ہے۔ خدا کا اور اس کے رسول کا واسطہ دے کر تاکید کی جائے کہ کسی مسلمان کے مال کے درپے نہ ہوں۔

(بحوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی خطوط' صفحہ 23)

ان حالات میں شاہ جہاں آباد ایسا اجڑا کہ دور دور تک خاک اڑنے لگی۔ گھر کے گھر بے نور و بے چراغ ہوگئے۔ میر تقی میر نے اسی زمانے میں لکھا تھا۔

(1) جس جاکہ خس و خار کے اب ڈھیر لگے ہیں
وہاں ہم نے ان ہی آنکھوں سے دیکھی ہیں بہاریں
(2) قافلہ در قافلہ ان رستوں میں تھے لوگ
یا ایسے گئے یاں سے کہ پھر کھوج نہ پایا
(3) سرسری تم جہان سے گزرے

ورنہ ہر جا جہاں دیگر تھا
اب خرابہ ہوا جہان آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا
بے زری کا نہ کر گلہ غافل
رہ تسلی کہ یوں مقدر تھا

سکھوں' مرہٹوں اور جاٹوں کے حملوں سے جب نجات ملی تو غیر ملکی حکومت کا تسلط سر پر پایا۔ مسلمان پانچ سو سال سے زیادہ حکمرانی کر چکے تھے۔ اور ان ہی سے سیاسی اقتدار چھینا بھی گیا تھا۔ اس بناء پر انگریزی حکومت نے ان پر سختی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ 1857ء کے ہنگامہ میں مسلمانوں کی جان' مال اور آبرو سب پر مصیبت آئی اور پوری قوم پر نکبت اور افسردگی کا عالم طاری ہوگیا۔

(تاریخ مشائخ چشت صفحہ 41-42 شاہ کلیم اللہ سے اللہ بخش تونسوی تک)

سیاسی سماجی اور اقتصادی حالات کا مختصر جائزہ

اورنگ زیب نے تقریباً 26 سال تک اپنی سلطنت کے سب ذرائع کا رخ دکن کی جانب کر دیا تھا۔ ان لڑائیوں میں کروڑوں روپیہ صرف ہوا تھا۔ لیکن عالمگیر کے تدبر معاملہ فہمی' انتظامی قابلیت اور سیاسی بصیرت نے ملک کی اقتصادی حالت کو بگڑنے سے بچا لیا تھا۔ اس نے ان تمام اخراجات کے باوجود چوبیں کروڑ روپیہ آگرہ کے قلعہ میں چھوڑا تھا۔ لیکن اس کے نااہل جانشینوں نے یہ روپیہ آنکھ بند کر کے لٹایا۔ ادھر ملک کے ذرائع محدود ہوتے چلے گئے' اور رفتہ رفتہ سارا اقتصادی نظام متزلزل ہوگیا۔ اور یہ سیاسی اور سماجی نظام کے گر جانے کا پیش خیمہ تھا۔

اورنگ زیب کا جانشین بہادر شاہ حد سے زیادہ فیاض تھا۔ اس کی فیاضی نے سلطنت کی مالی حالت کو تباہ کر دیا۔ پھر جہاں دار شاہ نے اپنی عیاشی پر بے دریغ دولت کو لٹایا۔ اس کی محبوبہ لعل کنور پر دو کروڑ روپیہ سالانہ خرچ ہوتا تھا۔ دربار میں عیش و طرب کی جو محفلیں بجتی تھیں۔ ان میں اس کثرت سے چراغاں کیا جاتا تھا کہ دہلی میں تیل کی قلت ہوگئی تھی اور تیل کا نرخ بڑھ گیا تھا۔ گیہوں سات سیری روپیہ بکنے لگا تھا۔ فرخ سیر تخت پر بیٹھا تو حالات اور خراب ہوگئے۔ اس کو گھوڑوں کا شوق تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں گھوڑے اس کے اصطبل میں بے کار بندھے رہتے تھے' اور ہزاروں روپیہ روزانہ ان پر خرچ ہوتا تھا۔

اس گرتے ہوئے مالی نظام پر نادر شاہ کے حملے نے ضرب آخر کا کام کیا۔ وہ ستر کروڑ سے زیادہ روپیہ ہندوستان سے باہر لے گیا۔ اس کے بعد شاہی خزانے اور امراء کے محلات بالکل خالی نظر آنے لگے۔ (بحوالہ لیٹر مغلز جلد 1 صفحہ 194' 397 جلد 2 صفحہ 370 - 371)

احمد شاہ کے زمانے میں شاہی خزانے کی یہ حالت تھی کہ دو دو ڈھائی ڈھائی سال تک

محلات کے ملازمین کو تنخواہیں نہیں ملتی تھیں۔ بادشاہ کی ساکھ اس قدر گر گئی تھی کہ مہاجن اور ساہو کار بھی قرض دینے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ اس زمانے میں شہزادیوں کو تین تین دن کے فاقے کرنے پڑے ہیں۔ سرسید احمد خاں لکھتے ہیں۔

اکبر شاہ اگرچہ تخت نشین ہوئے' مگر اخراجات کی تنگی کا وہی عالم تھا جو شاہ عالم کے وقت میں تھا' شاہ عالم کے وقت میں اخراجات کی نہایت تنگی تھی۔ تمام کارخانے ابتر ہوگئے تھے۔ شہزادوں کو جو قلعے کے نو محلے میں رہتے تھے۔ ماہواری روپیہ نہیں ملتا تھا اور چھتوں پر چڑھ کر چلاتے تھے کہ بھوکے مرتے ہیں۔ بھوکے مرتے ہیں۔" (بحوالہ سیرت فریدیہ صفحہ 23-24)

ان شہزادوں کو بھوک سے مرنے دیا جاتا تھا' لیکن کوئی مزدوری یا ملازمت کرنے کی اجازت محض اس وجہ سے نہ تھی کہ یہ ان کی شان کے خلاف تھا۔

فضول خرچی کے مرض میں امراء بھی مبتلا تھے۔ راجہ جنگل کشور نے اپنے بڑے بیٹے کنور آنند کشور کی شادی دہلی میں اس طرح کی کہ سارے شہر کو کھانے پر بلایا۔ جس کے متعلق یہ خیال ہوا کہ شاید "صلائے عام" کو اپنے لئے باعث ننگ سمجھ کر نہ آئے گا۔ اس کے گھر پر خود گیا اور ان الفاظ میں مدعو کیا۔ "آپ کے بھتیجے کی شادی ہے۔ اگر آپ شریک نہ ہوئے تو محفل بے رونق رہے گی۔" اس کے بعد کا ذکر ہے کہ میر تقی میر اپنی عسرت اور پریشان حالی سے مجبور ہوکر اس کے پاس گئے اور اظہار مدعا کیا تو اس نے نہایت عجز اور شرمساری کے ساتھ جواب دیا: میرے پاس ایک پرانی شال ہے' کچھ اور مقدرت ہوتی تو اس سے دریغ نہ کرتا۔" گویا ملک کے اکثر و بیشتر امراء اپنی فضول خرچیوں کی وجہ سے مفلسی اور تنگدستی کا شکار ہوگئے تھے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی حجتہ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

> "اس زمانے میں ملک کی تباہی اور ویرانی کے زیادہ تر دو سبب ہیں۔ ایک بیت المال یعنی ملک کے خزانے پر تنگی۔ وہ اس طرح کہ لوگوں کو یہ عادت پڑگئی ہے کے کسی محنت کے بغیر خزانے سے روپیہ اس دعوے سے حاصل کریں کہ وہ سپاہی ہیں یا عالم ہیں جن کا حق اس خزانے کی آمدنی میں ہے یا ان لوگوں میں ہیں جن کو بادشاہ خود انعام و اکرام دیا کرتے ہیں جیسے زہد پیشہ صوفی اور شاعر اور دوسرے گروہوں میں سے جو ملک و سلطنت کے کسی کام کے بغیر کسی نہ کسی ایسے طریقے سے روزی حاصل کرتے ہیں جو محنت کے بغیر ان کو ملتی ہے۔ یہ لوگ ان کے اور دوسروں کے ذرائع آمدنی کو کم کردیتے ہیں۔ اور ملک پر بوجھ ہیں۔"

دوسرا سبب کاشتکاروں' بیوپاریوں اور پیشہ وروں پر بھاری محصول لگانا اور ان پر اس بارے میں سختی کرنا ہے۔ یہاں تک کہ جو بے چارے حکومت کے مطیع اور اس کا حکم مانتے ہیں وہ تباہ ہو رہے ہیں اور جو سرکش اور نادہند ہیں وہ سرکش ہو رہے ہیں اور حکومت کے محصول ادا نہیں کرتے حالانکہ ملک اور سلطنت کی آبادی سے محصول اور فوج اور عہدہ داروں کے بقدر

ضرورت تقرر پر ہے ۔ چاہیے کہ اس زمانے کے لوگ ہوشیار ہوکر سیاست کے اس راز کو سمجھیں۔"

(حجتہ اللہ البالغہ صفحہ 24. مطبوعہ بریلی 1286ھ)

شاہ صاحب نے اپنے مکتوبات میں معاشی زندگی کے اور گوشوں پر بھی بحث کی ہے۔ ان کی نظر میں جاگیر داری اور اجارہ داری کی رسمیں ہی سب معاشی مصائب کا بنیادی سبب تھیں۔ ان کی وجہ سے معاشی زندگی کا توازن بگڑ گیا تھا۔ مغل شہنشاہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ (شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات صفحہ 4)

"موجب ضعف امور سلطنت کی خالصہ و قلت خزانہ است۔"

سوداگروں اور صنعت پیشہ لوگوں کی حالت سب سے زیادہ تباہ تھی۔ شاہ ولی اللہ اہل حرفت کو ملک کی اقتصادیات کا مرکزی نقطہ سمجھتے تھے۔ اور ان کی تباہ حالی پر سخت پریشان تھے۔

جب انگریزوں کا تسلط قائم ہوگیا تو ہندوستان کے معاشی حالات بد سے بدتر ہوگئے۔ اور جو فضول خرچیاں ہوتیں وہ ملک کی دولت ملک میں رکھنے کا باعث بنتی تھیں لیکن انگریزوں نے برصغیر کی دولت سمیٹ کر اسے انگلستان بھجوانا شروع کردیا۔

معاشرہ اور تمدن

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہندوستان کے معاشرہ اور تمدن کی خصوصیات کا جائزہ لینے کے لئے دہلی کے تہذیبی حالات پر ایک نظر ڈال لینی کافی ہوگی۔

دہلی' اسلامی ہند کی ابتداء سے تہذیب و تمدن کا ایک بڑا مرکز رہی ہے۔ دجلہ و فرات سے علم و عرفان کی جو موجیں اٹھی ہیں وہ جمنا ہی کے کناروں سے آکر ٹکرائی ہیں' بغداد و بخارا سے جو علمی و روحانی قافلے چلے ہیں وہ یہیں آکر ٹھہرے ہیں۔ کبھی اس کی رونق کا یہ عالم تھا کہ چپہ چپہ پر خانقاہیں تھیں۔ قدم قدم پر مدرسے تھے۔ کوچہ کوچہ میں مسجدیں تھیں۔ تشنگان معرفت اپنی روحانی پیاس بجھانے کے لئے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کرتے تھے اور یہاں پہنچتے تھے۔ ہندوستان کا یہ دارالسلطنت "رشک بغداد و غیرت مصر" بنا ہوا تھا۔

(بحوالہ تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی' صفحہ 241)

اٹھارہویں صدی میں جب سلطنت مغلیہ پر نزع کا عالم طاری ہوا تو یہ شہر "بمنزلہ لعب صبیان" ہوگیا۔ دکن سے جو طوفان اٹھتا وہ لال قلعہ سے آکر ٹکراتا' پنجاب سے جو آندھی اٹھتی' اس کے زلزلے دہلی میں محسوس ہوتے' جاٹوں کا جو ہنگامہ برپا ہوتا اس کی جولا نگاہ یہی بدبخت شہر بنتا۔ لیکن ان تمام مصیبتوں کے باوجود بھی دہلی انتہائی بارونق تھی' ابھی کچھ نقوش باقی تھے جن سے "کاروان رفتہ" کی عظمت و شوکت کا اندازہ ہوتا تھا۔ اس زمانے میں بھی اگر کسی نے یہاں کے علماء سے دہلی کی حالت کے متعلق سوال کرلیا تو بے اختیار کہہ اٹھے۔

(شاہ عبدالعزیز کا شعر بحوالہ آثار الصنادید صفحہ 74)

(ترجمہ) دوسرے شہر لونڈیاں ہیں اور دلی ملکہ' یہ موتی ہیں اور باقی سب پیسیاں۔

اور اس میں واقعی کوئی مبالغہ بھی نہ تھا۔ یہاں اب بھی علم و عرفان کے ایسے چشمے ابل رہے تھے جن سے ہندوستان ہی نہیں۔ بلکہ بیرون ہند بھی مستفیض ہو رہا تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ اسلامی ہند نے اپنے زوال اور انحطاط کے زمانے میں دنیا کے مسلمانوں کو مشعل راہ دکھائی۔ ایک ایسے نازک دور میں جب کہ دنیائے اسلام حدیث و سنت کو بھول چکی تھی' دہلی ہی نے اس کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا' جس کا اعتراف مصر کے مشہور فاضل علامہ رشید رضا نے اس طرح کیا تھا۔

ہمارے ہندوستانی بھائیوں میں جو علماء ہیں اگر حدیث کے علوم کی طرف ان کی توجہ نہ ہوتی تو مشرقی ممالک سے یہ علم ختم ہوچکا ہوتا' کیونکہ مصر' شام' عراق' حجاز میں دسویں ہجری سے یہ علم ضعف کا شکار ہوچکا تھا۔ اور چودھویں صدی کے اوائل تک ضعف کے آخری درجہ تک پہنچ گیا تھا۔

چند نفوس قدسیہ کی موجودگی نے تو دہلی کو تمام ممالک اسلامیہ کی توجہ کا مرکز بنا دیا

تھا۔ شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ میں شام' مصر' چین اور حبش کے لوگوں کے جمگھٹے لگے رہتے تھے تو دوسری طرف شاہ عبدالعزیز صاحب کے خرمن کمال کے خوشہ چین ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے تھے اور علوم دینی کا چرچا کر رہے تھے۔ سلطنت دم توڑ رہی تھی۔ سیاسی زوال و پستی کی آخری منزلیں طے ہو رہی تھیں۔ لیکن ذہنی شعور ابھی مردہ نہ ہوا تھا۔ کچھ بیدار مغز انسان تجدید و احیاء کے نئے راستے تلاش کر رہے تھے' وہ اس سیاسی زوال کو مذہبی اور ذہنی زوال کا پیش خیمہ بنانا نہیں چاہتے تھے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود دہلی دھوپ اور چھاؤں کا شہر تھی۔ یہاں خانقاہیں بھی تھیں' شراب خانے بھی۔ مدرسے بھی تھے اور قمار بازی کے اڈے بھی۔ دہلی کی یہ متضاد خصوصیات اس زمانے کے بہت سے لوگوں کی زندگی میں بھی پائی جاتی تھیں۔ لوگ بڑی عقیدت اور ارادت کے ساتھ خانقاہوں اور مزارات پر حاضر ہوتے تھے' پھر اس جوش اور ولولہ کے ساتھ طوائفوں کی محفلوں میں شرکت کرتے تھے۔ ان کی رندی اور مذہبیت ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے احمد شاہ ابدالی کو لکھا تھا اگر حالات نہ بدلے تو مسلمان۔

ترجمہ۔ یعنی تھوڑا زمانہ نہ گزرے گا۔ کہ وہ ایسی قوم بن جائیں گے کہ نہ اسلام کا علم ہوگا نہ کفر کا۔

اس زمانے کے لوگوں کا یہ حال تھا کہ نہ رندی سے واقف تھے۔ نہ مذہبیت سے وہ متضاد چیزوں کو ایک ساتھ لے کر چلتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ نہ رندی ہاتھ سے جاوے نہ مذہبیت کا دامن چھوٹے۔ لیکن یہ ایک خود فریبی تھی۔

بقول امیر خسرو۔

نیک و بد در آدمی پنہاں نمی ماند چنانکہ
نافہ در جیب ملوک و بادہ در جام بلور

یہ مذہبیت جو رندی کے پہلو بہ پہلو چلتی تھی' فسق و فجور سے زیادہ متعفن تھی۔ یہ ضمیر کی آواز کو کچلنے کا ایک ظالمانہ انداز تھا!

آیئے دہلی کے محلات' مدرسوں' خانقاہوں' بازاروں اور ادبی محفلوں پر ایک نظر ڈال لیں تاکہ حالات کا صحیح اندازہ ہو جائے۔

محلات شاہی : "بزم آخر" میں منشی فیاض الدین نے دہلی کے آخری دو بادشاہوں' اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ کے طریق معاشرت کی تصویر پیش کی ہے۔ اس پوری تصویر میں صرف آسائش اور عیش کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ رات اور دن جشن میں گزرتے تھے۔ کبھی تورے بندی ہے کبھی رتجگے' کبھی نو روز' کبھی آخری چہار شنبہ' کبھی خواجہ صاحب کی چھڑیاں' کبھی سلونو' کبھی پھول والوں کی سیر۔۔۔ غرض بزم ہی بزم ہے' رزم کا کہیں نام نہیں۔ قلعہ معلے کے باہر جو طوفان برپا ہے اس سے بے خبر' فکر فردا سے بے نیاز۔ ایسا معلوم ہوتا ہے "رقص پری پیکراں" اور "غو غائے رامشگراں" میں دنیا سمٹ کر آگئی ہے۔

امراء کی مجلسیں : مرزا منو محمد شاہ کے زمانے میں دہلی کے ایک امیر زادے ہیں۔ ان کا خال یہ ہے۔

"خانہ اش بہشت شداداست' وکاشانہ اش آشیانہ مجمع پریزاد' ہر نو خطے رنگیں کہ بایں محفل ربط ندارد و فرد باطل است' وہر ملیحے کے با ایں مجمع مربوط نیست و درحلیہ اعتبار عاطل' مجلس دارالعیار شاہداں است و بزمش محک امتحان گلر خاں۔ نقد قراضہ حسن تابدار الضرب بزمش رجوع نکند' کامل عیار نیست چہ شد مثل طلائے دست افشار است وسیم جمال تا در کوزہ بمعش گزار نیابد چاندی نیست چہ شد کہ زر نقرہ خالص است"

یعنی اس کا گھر شداد کی بہشت تھا اور اس کے کاشانہ کی یہ شان تھی کہ وہاں پری زادوں کے جمگھٹے لگے رہتے۔ جس نو عمر لڑکے کا اس محفل کی رنگینوں سے ربط نہ ہوتا اس کی کوئی حیثیت نہ ہوتی۔ اور وہ حسن ملیح جو اس محفل سے گریزاں ہوتا اس کی عزت اور وقار نہ تھا۔

اس (امیر زادے) کی مجلس معشوقوں کے لئے کسوٹی کا حکم رکھتی تھی۔ اور اس کی بزم گل رخوں کے لئے یہی درجہ رکھتی تھی۔ جب تک کوئی حسن تابدار اس کی بزم کی ٹکسال سے حسن کی مہر نہ لگوا لیتا۔ اس کو حسن زیبا نہ سمجھا جاتا۔ خواہ وہ سچ مچ خالص۔سونا یا چاندی کے مصداق ہی ہوتا۔

بازار : میر نے لکھا تھا:

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

لیکن دو بازار تھے' چوک سعد اللہ خاں اور چاندنی چوک جو سارے شہر کی جان تھے۔ چوک سعد اللہ خاں کی رونق کا یہ عالم تھا کہ اس کو دیکھ کر۔

"نظر از ملاحظہ محسوسات رنگا رنگ دست و پاگم می کند"

کسی طرف رقص امارہ خوش رو قیامت آباد" تھا تو دوسری طرف "کرسی ہائے چوبیں از قبیل منابر" نصب تھیں تاکہ نماز اور روزہ کی تلقین کی جائے۔ کسی گوشہ میں اہل تنجیم و رمال نظر آتے تھے' تو کسی طرف آتشک و سوزاک کی دوا بیچنے والے۔ ایک جانب "اسلحہ فروش" تھے دوسری طرف "میوہ فروش"

چاندنی چوک سب جگہوں سے زیادہ دلفریب تھا۔ کپڑا' جواہرات' عطریات وغیرہ کی وہاں

دوکانیں تھیں۔ ہر وقت روساء کے جمگھٹے رہتے تھے۔ ایک یتیم رئیس زادہ چاندنی چوک کی سیر کرنا چاہتا ہے۔ بیوہ ماں تہی دستی کا عذر کرنے کے بعد اس کو ایک لاکھ روپیہ دیتی ہے اور کہتی ہے کہ چوک کے نوادر اور نفائس اس قلیل رقم سے نہیں خریدے جاسکتے ہیں۔ مگر اس قلیل رقم کو اپنے ضروری مصارف کے لئے لے جاؤ۔ (حوالہ مرقع دہلی از نواب سالار جنگ مرتبہ سید مظفر حسین)

مدرسے : مدرسہ رحیمیہ' بازار خانم کا مدرسہ اور اجمیری دروازہ کا مدرسہ اورنگ زیب کی وفات سے لے کر 1857ء تک ان مدرسوں سے علم و عرفان کے چشمے ابلے تھے۔ یوں تو دہلی میں سینکڑوں درس گاہیں تھیں۔ لیکن ان تینوں مدرسوں کی امتیازی شان تھی۔ مدرسہ رحیمیہ میں شاہ ولی اللہ مسند درس پر متمکن نظر آتے تھے۔ تو بازار خانم کے مدرسے میں شاہ کلیم اللہ کے جانشین۔ اجمیری دروازہ کے مدرسہ میں شاہ فخر الدین کا چشمہ فیض جاری رہتا تھا۔ مدرسہ رحیمیہ سے علوم اسلامی کو زندہ کرنے کی عظیم الشان تحریک اٹھی۔ آج پاکستان اور ہندوستان میں علوم دینی کی جتنی درس گاہیں ہیں وہ سب مدرسہ رحیمیہ کے چشمہ فیض کا نتیجہ ہیں۔ جب مسلمانوں کی دینی زندگی بے روح ہو رہی تھی تو اسی مدرسہ کے معلموں نے ان کے دینی احساس کو بیدار کرنے کی سعی کی۔ شاہ عبدالعزیز' شاہ رفیع الدین' شاہ محمد اسمٰعیل کے وعظ اور درس اسی مدرسے میں ہوتے تھے۔

خانقاہیں : اس زمانے میں دہلی میں بہت سے سلسلوں کے عظیم المرتب مشائخ موجود تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کا بیان ہے۔ (حوالہ ملفوظات شاہ عبدالعزیز صفحہ 106)

(ترجمہ) محمد شاہ کے زمانے میں بائیس بزرگ صاحب ارشاد ہر سلسلہ اور ہر طریقہ کے دلی میں تھے۔ ایسا اتفاق کم ہوتا ہے۔

شاہ فخر الدین صاحب' مرکز مظہر جان جاناں اور دیگر مشائخ کی خانقاہیں رشد و ہدایت کا منبع تھیں۔ غدر سے کچھ پہلے تک خانقاہوں کی یہ رونق باقی رہی۔ شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ دین دار لوگوں کا ملجی و ماوی تھی۔ ان کی صحبت کا اثر یہ ہوتا تھا کہ بقول خالد کر دی۔

دہد سنگ سیہ خاصیت لعل بدخشانی

پھر شاہ ابو سعید' شاہ عبدالغنی' شاہ محمد آفاق' خواجہ نصیر وغیرہم کی خانقاہیں تھیں۔ جہاں تزکیہ باطن اور تہذیب نفس کے درس دیئے جاتے تھے اور باطنی زندگی کو سنوارنے کے لئے رات دن کوشش کی جاتی تھی۔

میلے : دہلی کے میلے کیا تھے' عیش و نشاط کے ہنگامے تھے جہاں اوباش اور شہوت پرستوں کی محفلیں سجتی تھیں اور کوئی اخلاقی جرم ایسا نہ تھا جو وہاں نہ ہوتا ہو۔ ہر مہینے کی 27 کو ایک ناگل کا میلہ ہوتا تھا۔ جہاں شوقین مزاج' تماشہ بین عورتیں بن سنور کر پہنچتی تھیں اور ہر طرح کی عیاشی میں حصہ لیتی تھیں۔ (مرقع دہلی صفحہ 34)

ایک محمد شاہی امیر کسل سنگھ نے ایک محلہ کسل پوری آباد کیا تھا۔ جہاں فواحشان روزگار' اور زنہائے بازاری کو بسایا تھا۔ محتسب کی مجال نہ تھی کہ وہاں قدم رکھ سکے۔ ہر وقت وہاں چنگ و رباب کی آواز سنائی دیتی تھی۔

مشاعرے : مشاعرے غدر سے پہلے کی دلی کی ادبی محفلوں کی جان تھے۔ قلعہ معلےٰ میں اکثر مشاعروں کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔ امراء و روسا کو بھی اس سے دلچسپی تھی۔ شعراء کی آپس کی چشمکیں بڑی دلچسپ اور رنگین ہوتی تھیں' مومن و غالب کی علمی مجلسیں اور مشاعرے اپنی نظیر آپ تھے۔

جنگ آزادی 1857ء کے اثرات دہلی پر : 1857ء کی جنگ نے یک دم دلی کی بساط الٹ دی۔ پرانی مجلسیں درہم برہم ہوگئیں۔ علمی و مذہبی محفلیں سرد پڑگئیں۔ گھر کے گھر بے نور و بے چراغ ہوگئے۔

مسجدیں مسمار ہوگئیں' خانقاہیں تباہ و برباد ہوگئیں۔ مدرسوں میں کھیتی ہونے لگی۔ مسجد اکبر آبادی ایسی تباہ و برباد ہوئی کہ نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ مدرسہ رحیمیہ جہاں سے شاہ ولی اللہ کی حکمت کا چشمہ ابلا تھا اور جہاں شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد اسحاق نے قرآن و حدیث کے درس دیئے تھے' وہاں "مدرسہ رائے بہادر لالہ رام کشن داس کا تختہ لگ گیا۔ میاں کالے صاحب مغفور کا گھر اس طرح تباہ ہوا جیسے جھاڑو دیدی۔"

اچھے اچھے گھرانے تباہ و برباد ہوگئے۔ عزت و ناموس کا بچانا محال نظر آنے لگا۔ جب مصائب ناقابل برداشت ہوگئے۔ تو بڑے بڑے بزرگ اور عالم دہلی چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ میاں کالے صاحب کے بیٹے میاں نظام الدین نے حیدر آباد کا رخ کیا اور شاہ فخرالدین کی خانقاہ سونی پڑگئی۔ شاہ احمد سعید نے حرمین شریفین کی راہ لی۔ اور شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ کا چراغ گل ہوگیا۔ ہر طرف حسرت اور مایوسی چھاگئی جو اس ہنگامہ دارو گیر سے بجادہ کافور و کفن کی تمنا کرنے لگا۔ زندگی وبال معلوم ہونے لگی۔

ہندوؤں پر مسلمانوں کے علمی' ادبی اور ثقافتی اثرات

اسلامی حکومت کے علاقوں میں برطانوی عہد سے قبل ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات انتہائی شگفتہ تھے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں خلوص و محبت' اتحاد یگانگی کے اثرات کار فرما نظر آتے تھے۔ کیونکہ مسلمان تہذیب و شائستگی اور حکومت سے وابستہ تھے جبکہ ہندو غیر متعصب انداز میں ان کی تہذیب اور تعلیم اپنا کر مفاد حاصل کر رہے تھے۔ چنانچہ ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک مشترکہ علمی اور ادبی ذوق پیدا کرلیا تھا۔ ہندی اور فارسی کا مطالعہ ہندو اور مسلمان دونوں کرتے تھے ان دونوں زبانوں کے امتزاج سے ایک نئی زبان کی تشکیل کا سامان بہم پہنچا رہے تھے۔ غلام علی آزاد بلگرامی' ٹیک چند' آنند رام مخلص وغیرہ کے علمی کارناموں کو ہندو اور مسلمان سب ہی نے پسند کیا تھا۔

اردو ہندو اور مسلمان دونوں کی محبوب زبان تھی۔ گلشن بے خار میں شیفتہ نے 61 ہندو شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ "نغمہ عندلیب" میں حکیم میر قطب الدین باطن نے 80 ہندو شعراء اردو کا تذکرہ لکھا ہے۔ اگر اس دور کے تذکروں سے اردو کے ہندو شعراء کی فہرست تیار کی جائے تو تعداد یقیناً" اس سے کہیں زیادہ ہوگی۔

(2) مغلیہ دور کا ایک مشترکہ کلچر تھا' جس میں ہندو اور مسلمان دونوں یکساں طور پر رنگے ہوئے تھے۔ کنور پریم کشور فراقی' اپنا "نجی" روزنامچہ اس طرح شروع کرتا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یافتاح

"حمد و ثناء پادشا ہے راسزاکہ سلطنت کونین بوجود اوست و شاہان روئے زمین و خداوندان چترونگین راافتخاربہ فضل اوودر ودو تحیات و سلام زاکیات برآں سرور کہ درشان او "لولاک لماخلقت الافلاک" نازل شدہ' وہ صلوات بیغایات و نیاز ہے نہایات براہن عم ووصی اعظم اوکہ مظہر العجائب و اسد اللہ الغالب و صاحب ذوالفقار و قسیم الجنت والنار است صلوات اللہ علیہما و علی آلہ اجمعین۔"

ترجمہ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یافتاح۔ اے کامیابی عطا کرنے والے خدا! حمد و ثناء اس بادشاہ کے لئے ہے کہ کونین کی سلطنت اس کے وجود سے ہے اور جس کے فضل سے دنیا جہان کے حکمرانوں اور بادشاہوں کو فخر حاصل ہے۔ اور درود و سلام و تحیات اس سرور عالم صلی اللہ علیہ و آلہ

وسلم پر کہ جس کی شان میں "لولاک لما خلقت الافلاک" والی حدیث قدسی نازل ہوئی ہے اور بے انتہا درود و سلام پر حضور کے چچا زاد اور وصی اعظم ؑ پر کہ وہ مظہر العجائب اور اسد اللہ الغالب اور صاحب ذوالفقار اور جنت اور دوزخ کے قاسم ہیں۔ ان پر اور ان کی آل سب پر درود ہو۔

اسی طرح ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں دلچسپی لیتے تھے۔ مذہبی رواداری کا یہ حال تھا کہ خود شاہان مغلیہ ہولی اور دسہرہ کا تہوار مناتے تھے۔

چنانچہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے سماجی تعلقات کا بھی یہ عالم تھا کہ ہندو مسلمان امیروں کے یہاں اور مسلمان' ہندو امیروں کے یہاں ملازمت کرتے تھے۔ میر تقی میر جب عسرت و تنگی کا شکار تھے تو ہندوؤں ہی نے ان کی مدد کی۔ خان آرزو' سرور' مصحفی' غالب وغیرہ کے محسنوں کی فہرست میں کتنے ہی ہندوؤں کے نام ملتے ہیں۔

سرسید احمد خاں کے نانا نواب دبیرالدولہ فرید الدین خاں نے اپنے انتقال سے قبل جو جائیداد تقسیم کی تو اپنے ایک قدیم ہندو دیوان لالہ تلوک چند کو برابر کا حصہ دیا۔ (سیرت فریدیہ صفحہ 38)

کھیلیں : ہندو مسلمان کھیلوں میں شریک ہوتے تھے اور ایک دوسرے سے محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ 1857ء سے پہلے کا ذکر ہے کہ دہلی میں تیر اندازی کا ایک کلب تھا جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوتے تھے۔ سرسید نے ایک ذی عزت ہندو کا قصہ لکھا ہے کہ وہ تیر لگاتے وقت "اللہ غنی" کہتا تھا۔ اس لئے اس کا نام "اللہ غنی" ہی پڑگیا تھا۔ (سیرت فریدیہ صفحہ 44)

مسلمانوں کی مذہبی اور اخلاقی حالت

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مسلمانان ہند کی مذہبی اور اخلاقی حالت انتہائی زبوں تھی۔ فکرو عمل' اخلاق و عادات' کردار و اطوار سب پر انحطاطی زنگ چھایا ہوا تھا۔ زندگی سکرودوام میں تبدیل ہو رہی تھی اور ہر قوم کو سیاسی زوال سے پہلے اور اس کے بعد جو اخلاقی زوال کی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں وہ نہایت سرعت کے ساتھ طے کی جارہی تھیں اخلاقی قدروں کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی اور سماجی نظام کا سارا ڈھانچہ بگڑ رہا تھا۔عالم گیر نے "فتاوی عالم گیری" کی تدوین کرا کر جس کرتے ہوئے اخلاقی اور سماجی نظام کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی وہ اس کے کمزور اور نااہل جانشینوں کے عہد میں منہدم ہو رہا تھا۔

کسی بزرگ نے کہا ہے۔

دین کو محض بادشاہوں' برے علماء اور پیروں نے خراب کیا۔

اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مسلمانوں کے زوال کا ذمہ دار علامہ اقبال نے ان ہی تینوں کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ ہم عام مسلمانوں کی اخلاقی اور مذہبی زندگی کے ساتھ ساتھ خصوصیت سے بادشاہوں' علماء سوء اور صوفیہ خام کی حالت کا جائزہ لیں گے۔

سلاطین و امراء کی اخلاقی اور مذہبی حالت : حضرت مجدد الف ثانیؒ کا قول ہے۔ سلطان روح کی مانند ہے اور رعایا جسم کی مانند۔ اگر روح صالح ہوتی ہے تو جسم بھی صالح رہتا ہے۔ اگر روح فاسد ہو جاتی ہے تو بدن میں بھی فساد پڑ جاتا ہے۔ (بحوالہ مکتوبات شریف)

اورنگ زیب کے جانشینوں کی اخلاقی حالت اور عوام پر اس کے اثرات دیکھ کر اس کلیہ کی حقیقت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ مغل بادشاہوں کی ہر بے راہ روی کا اثر عوام کی زندگی پر پڑتا تھا اور عیش و طرب کی جو محفلیں دربار میں سجتی تھیں' ان کے مہلک جراثیم جھونپڑوں تک اپنا کام کرتے تھے۔

شاہ عالم بہادر شاہ' اورنگ زیب کا بیٹا اور جانشین تھا۔ اس کے مذہبی رجحانات کے خلاف ملک میں متعدد بلوے بھی ہوئے۔ گوارادت خاں نے یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ اس کا مذہبی عقیدہ درست تھا' اور جو کچھ اس کی مخالفت ہوئی وہ متعصب لوگوں کی غلط فہمی کا نتیجہ تھی۔ لیکن صحیح صورت یہ ہے کہ شیعہ مذہب کی طرف اس کا رجحان ہوگیا تھا۔ اور اس کی ترویج کی طرف اس کا خاص زور تھا۔ چانچہ سیرالمتاخرین میں لکھا ہے۔

بہادر شاہ' بدستور' شیعہ مذہب کو رواج دینے اور تقویت پہنچانے کی کوشش کرتا رہا۔
(سیرالمتاخرین صفحہ 7)

ترک اینڈ انڈیا (صفحہ 199) میں لکھا ہے کہ اس نے خطبہ میں اپنے نام کے ساتھ سید کا لفظ شامل کرایا تھا۔ بقول خافی خاں حضرت علی کرم اللہ تعالی وجہہ کے نام کے ساتھ خطبوں میں

وصی مصطفےٰ کا اضافہ کیا تھا۔ اسی اضافہ پر لاہور' احمد آباد اور دیگر مقامات پر سخت قسم کے فسادات ہوئے۔ حاجی یار محمد نے نہایت جرات اور ہمت سے بادشاہ کی مخالفت کی اور جب وہ ناراض ہوا تو کہا: "حق تعالیٰ کی چار نعمتیں ہیں۔ علم' حفظ قرآن' حج اور شہادت بفضل الٰہی تین نعمتیں مجھے حاصل ہیں' کیا ہی اچھا ہو کہ آپ کے ذریعے سے چوتھی بھی حاصل ہو جائے۔"

بہادر شاہ کے بعد جہاندار شاہ (1713ء) تخت پر آیا۔ اس نے حکومت کی باگ ڈور ایک ناچنے والی عورت لعل کنور کے ہاتھ میں دے دی۔ اس کی ابروئے چشم کے اشارہ پر لوگوں کی قسمتیں بنتی اور بگڑتی تھیں۔ کوئی ایسا اخلاقی' سماجی اور انسانیت کا گناہ نہ تھا جو اس عورت کے اثر میں نہ کیا گیا ہو۔ عبرت نامہ کا مراج میں ہے کہ لعل کنور نے ایک دن اس سے کہا کہ میں نے ڈوبتی کشتی میں آدمیوں کی جو حالت ہوتی ہے وہ نہیں دیکھی۔ حکیم شاہی ہوا کہ یہ خواہش بھی پوری کرکے دکھا دی جائے! خود بادشاہ کا یہ عالم تھا کہ لعل کنور کے ساتھ بازاروں میں پھرتا تھا اور اس کے ساتھ شراب خانوں میں شراب پیتا تھا۔ کبھی راون کے قلعے بنوا کر آگ لگاتا تھا۔ عیش و عشرت کے اس ماحول نے عوام کی زندگی پر بھی اثر ڈالا۔ اور حالات یہاں تک پہنچ گئے کہ "قاضی قرابہ کش اور مفتی پیالہ نوش" ہوں۔ (تاریخ ہند از مولوی ذکا اللہ جلد 9 صفحہ 89)

جہاندار شاہ کے جانشین فرخ سیر (1719 - 1713ء) میں سب سے بڑی برائی اس کی کمزوری تھی۔ جس کے باعث ملک میں متعدد فتنے کھڑے ہوگئے۔ یہ حضرت شاہ عبدالرحیم (شاہ ولی اللہ کے والد ماجد رحمتہ اللہ علیہ) کا اثر تھا کہ وہ اتنے دنوں تخت پر متمکن رہ سکا۔ (بحوالہ انفاس العارفین صفحہ 62)۔ ان کے وصال کے 50 دن بعد وہ قید ہوگیا۔ شاہ عبدالرحیم صاحب نے صرف اس غرض سے کہ مغلوں کا سیاسی اقتدار کہیں ان جلد جلد تبدیلیوں کی نذر نہ ہو جائے' اس کو قائم رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن کمزوری ایک ایسا مرض تھا جس نے اسے کبھی حالات پر قابو نہ پانے دیا۔

فرخ سیر کے زمانے میں ایک شخص نمود نے نبوت کا دعویٰ کیا' اپنا علیحدہ مسلک' قواعد اور زبان ایجاد کی۔ آقوسہ مقدمہ نامی کتاب کو الہامی کتاب بتایا اور دعویٰ کیا کہ نبوت اور وصیت کے درمیان ایک لاہوتی عہدہ بیگوکت ہوتا ہے اور وہ اسی پر قائم ہے۔ فرخ سیر اس شخص سے اتنا متاثر ہوا کہ تنہائی میں اس سے ملاقات کی۔ بادشاہ کی اس دلچسپی اور احترام سے اس مفسد دینی کو اپنے کام میں بڑی مدد مل گئی۔

محمد شاہ الفنون کا شوقین اور عیش و عشرت کا دلدادہ تھا۔ دن رات حرم میں پڑا رہتا تھا۔ 28 سالہ دور حکومت میں اگر وہ کبھی محل سے باہر نکلا ہے تو صرف لونی پارک میں گھومنے کے لئے یا گڈھ کا میلہ دیکھنے کے لئے۔ اس کے جانشین احمد شاہ کا بھی یہی عالم تھا۔ ایک میل تک اس کا زنانہ محل تھا۔ ہفتوں تک کسی مرد کی شکل اس کے سامنے نہ پڑتی تھی۔ شاہ عالم ثانی کے دربار کا حال پولیر نے لکھا ہے جو مطالعہ کے قابل ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بادشاہوں کے مشاغل' ذہنی اور فکری صلاحتیں کیا تھیں اور وہ کس حد تک اس زمانے کے سیاسی نظام کو

سنبھالنے کی قابلیت رکھتے تھے۔

سلاطین کی عادتوں اور دلچسپیوں کی نقل امراء کرتے تھے۔ اٹھارہویں صدی میں امراء کے گھر عیاشی کے اڈے تھے۔ مخرب اخلاق عادتیں ان کا معمول تھیں اور ان کے ضمیر کی آواز اتنی دھیمی پڑچکی تھی کہ کبھی انہیں بھول کر بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ ان کی حرکات اخلاق و مذہب کی توہین ہیں۔

دور زوال میں شاہ ولی اللہ کا کردار : شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے "الفوز الکبیر" میں مسلمانوں کی حالت زار کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔ اگر احبار یہود کی حالت دیکھنا چاہو تو آج کل کے علماء کو دیکھ لو اور اگر عیسائیوں کا نقشہ دیکھنا چاہتے ہو تو آج کل کے مشائخ کے سامنے بیٹھ کر تصویر کھینچ لو۔"

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے کے صوفیہ خام اور علماء سوء صد ہاقسم کی گمراہیوں کا شکار تھے اور ان کی گمراہی کا اثر لوگوں پر پڑتا ہے۔

دنیا پرستی سے زیادہ بری کوئی لعنت علماء سوء کے لئے نہیں ہوسکتی۔ اس دور کے علماء اسی میں گرفتار تھے اور مختلف امراء اور روساء سے منسلک ہوکر سیاست میں حصہ لے رہے تھے۔ ایسی سیاست جس کا مقصد دوسروں کی فلاح و بہبود نہ تھا بلکہ اپنے لئے جاہ و منزلت حاصل کرنا تھا۔ اکبر کے زمانے میں علماء میں اس دنیا پرستی کے خلاف حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی صاحبؒ نے آواز اٹھائی تھی۔ اس دور میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے خاندان نیز شاہ کلیم اللہ جہاں جہان آبادی' اور ان کے منسلکین نے اس رجحان کے خلاف جنگ کی اور علماء کو ان کے فرائض یاد دلائے۔

اس دور کے علماء عموماً یونانی علوم میں پھنسے ہوئے تھے۔ ان کا سارا وقت دورازکار بحثوں میں صرف ہوتا تھا۔ قرآن و حدیث سے ان کا رابطہ تقریباً ٹوٹ چکا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے اس ماحول میں للکارا اور اعلان کیا۔

"یاد رکھو! علم یا تو قرآن کی کسی آیت محکم کا نام ہے یا سنت ثابتہ قائمہ کا"

یہ خاندان ولی الٰہی کا وہ اعلان تھا جس سے علم کے متعلق سارے ہندوستان کے نظریئے بدل گئے حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی' حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے تایا شیخ ابوالرضا السندی کے شاگرد تھے۔ اس لئے علم کے متعلق ان کا نظریہ بھی وہی تھا جو خود حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے بزرگوں کا تھا۔ علوم دینی کے متعلق اس دور کے مشائخ چشت کے خیالات کی اساس و بنیاد اسی پر تھی اور انہوں نے زمانے کے عام رجحانات کے خلاف اس سلسلہ میں سخت جنگ بھی کی۔

صوفیہ خام کا حال اس سے بدتر تھا۔ انہوں نے نہ صرف مشائخ متقدمین کی روایات کو فراموش کر دیا تھا بلکہ غیر اسلامی فکر کردار ان کا سرمایہ زندگی بن گیا تھا۔ تصوف کے سرچشمے قرآن و حدیث سے ہٹ کر ویدانت اور اپنیشد کی طرف منتقل ہوگئے تھے۔ عملیات اور تعویذ

گنڈوں میں حد سے زیادہ اعتقاد بڑھ گیا تھا۔ پیر کی غیر شرعی حرکات حجت سمجھی جاتی تھیں۔ شاہ ولی اللہ نے ان لوگوں کو اس طرح مخاطب کیا۔

"میں ان متقشف واعظوں' عابدوں اور خانقاہ نشینوں سے کہتا ہوں کہ اے زہد کے مدعیو! تم ہر وادی میں بھٹک نکلے اور ہر رطب دیا بس کو لے بیٹھے تم نے لوگوں کو مصنوعات اور اباطیل کی طرف بلایا۔ تم نے خلق خدا پر زندگی کا دائرہ تنگ کر دیا۔ حالانکہ تم فراخی کے لئے مامور تھا۔ نہ کہ تنگی کے لئے۔ تم نے مغلوب الحال عشاق کی باتوں کو اپنا مدار علیہ بنالیا ہے' حالانکہ یہ چیزیں پھیلانے کی نہیں' لپیٹ کر رکھ دینے کی ہیں۔"

اس قسم کے صوفیہ نے مذہبی تعلیم کو مسخ کرنے کے ساتھ ساتھ' ملت کے قوائے عمل کو شل کر دیا تھا۔ اس دور کے مشائخ چشت نے اس قسم کے صوفیہ کے خلاف آواز بلند کی اور تصوف کی خالص اسلامی صورت نکھار کر پیش کی۔

عام مسلمانوں کی دینی زندگی : جب بادشاہ علماء اور صوفیہ ہی صدہا اخلاق عیوب اور دینی گمراہیوں میں مبتلا تھے' تو عام مسلمانوں کی زندگی کا ذکر ہی بے کار ہے۔ "الناس علی دین ملوکھم" قرون وسطی کا ایک ناقابل تردید اصول تھا۔

اس دور میں عام مسلمانوں کی زندگی کا جائزہ لینے کے لئے شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصانیف کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ اس حکیم الامت نے ملت کی بیماریوں کا تجزیہ بڑی بالغ نظری کے ساتھ کیا ہے۔ اور اس کی ایک ایک دکھتی ہوئی رگ کو پکڑا ہے۔ اس زمانے کے صوفیہ کرام کی کوششوں کی اصلی نوعیت پر غور کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ حضرت والی محدث دہلوی نے جن خرابیوں کی طرف اشارہ کیا ہے' ان ہی کے ازالہ کی کوششیں ہیں۔

(1) شرک :

"تم غیر اللہ کے لئے قربانیاں کرتے ہو اور مدار صاحب اور سالار صاحب کی قبروں کا حج کرتے ہو' یہ تمہارے بدترین افعال ہیں۔" (تفہیمات)

"تم نے یہود و نصاری کی طرح اپنے اولیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا رکھا ہے۔" (تفہیمات)

(2) ارکان دین سے غفلت : (الف) "تم نمازوں سے غافل ہو' کوئی اپنے کاروبار میں اتنا مشغول ہوتا ہے کہ نماز کے لئے وقت نہیں پاتا' اور کوئی اپنی تفریحوں اور خوش گپیوں میں اتنا منہمک ہوتا ہے کہ نماز فراموش ہو جاتی ہے۔" (تفہیمات)

(ب) "تم زکوۃ سے بھی غافل ہو' تم میں کوئی مال دار ایسا نہیں جس کے ساتھ بہت سے کھانے والے لگے ہوئے نہ ہوں۔ وہ ان کو کھلاتا اور پہناتا ہے۔ مگر زکوۃ و عبادت کی نیت نہیں کرتا۔ (تفہیمات)

(ج) "تم رمضان کے روزے بھی ضائع کرتے ہو اور اس کے لئے طرح طرح کے بہانے بناتے ہو۔" (تفہیمات)

3۔ فسق و فجور : "چاہئے کہ تم اپنی شہوانی خواہشوں کو نکاح کے ذریعے پورا کرو۔ خواہ تمہیں ایک سے زیادہ ہی نکاح کیوں نہ کرنا پڑے۔ تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو۔" (تفہیمات)

4۔ بری رسوم : "اے بنی آدم! تم نے ایسی فاسد رسمیں اختیار کرلی ہیں جن سے دین متغیر ہوگیا ہے۔ مثلاً یوم عاشورہ کو تم باطل حرکات کرتے ہو۔ ایک جماعت نے اس دن کو ماتم کا دن بنا رکھا ہے' کچھ لوگوں نے اس دن کو کھیل تماشوں کا دن بنا لیا ہے' اور کچھ دوسرے لوگوں نے اسے مذہبی مناسک کا دن بنا رکھا ہے۔ پھر تم شب برات میں جاہل قوموں کی طرح کھیل تماشے کرتے ہو اور تم میں سے ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ اس روز مردوں کو کثرت سے کھانا بھیجنا چاہئے۔ (تفہیمات)

5۔ غیر شرعی حرکات : "پھر تم نے ایسی رسمیں بنا رکھی ہیں جن سے تمہاری زندگی تنگ ہو رہی ہے۔ مثلاً شادیوں میں فضول خرچی' طلاق کا ممنوع بنالینا' بیوہ عورت کو بٹھا رکھنا تم نے موت اور غمی کو عید بنا رکھا ہے۔" (تفہیمات)

کاہلی اور فضول خرچی : "اتنا کمانے کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضرورتیں پوری ہوں۔ دوسروں کے سینوں کے بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو کہ ان سے مانگ مانگ کر کھایا کرو تم ان سے مانگو اور وہ نہ دیں۔ اس طرح بادشاہوں اور حکام کے اوپر بھی بوجھ نہ بن جاؤ۔ تمہارے لئے یہی پسندیدہ ہے کہ تم خود کما کر کھایا کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو خدا تمہیں معاش کی راہ بھی سمجھائے گا۔ (تفہیمات)

"اپنے مصارف وضع قطع میں تکلف سے کام نہ لیا کرو۔ اسی قدر خرچ کرو جس کی تم میں سکتے ہو۔" (تفہیمات)

شیعہ سنی تنازعات : اٹھارہویں صدی کا ایک اہم مسئلہ شیعہ سنی تعلقات کا بھی تھا۔ اورنگ زیب کے بعد شیعوں کا سیاسی اثر بڑی تیزی کے ساتھ بڑھنے لگا تھا کہ اتنا کہ اورنگ زیب کا جانشین بہادر شاہ تک شیعوں کے اثر میں آگیا تھا۔ اس کے بعد سادات بارہہ کے اقتدار سے شیعوں کو بہت تقویت حاصل ہوگئی اور ایرانی اور تورانی پارٹیوں کے اختلافات کی بنیاد صرف سیاست نہ تھی' بلکہ مذہبی اختلافات کو بھی اس میں کافی دخل تھا۔ مرزا مظہر جان جاناں کی شہادت میں مذہبی اور سیاسی دونوں عوامل کو دخل تھا۔ ان کا سنی عقیدہ اور روہیلوں میں ان کا اثر شیعہ حلقوں میں کافی خطرناک سمجھا جاتا تھا۔

حضرت مجدد" صاحب کے زمانے میں بھی شیعوں کے اقتدار کا مسئلہ نور جہاں کی وجہ سے بہت اہم ہوگیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک رسالہ "ردروافض" کے نام سے لکھا تھا۔ اس زمانے میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے فاضلانہ کتاب "ازالتہ الخفاعن خلافتہ الخلفا" کے ذریعے خلافت راشدہ سے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ کیا۔ مولانا عبدالحی فرنگی محلی کا خیال ہے کہ پورے اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر ایسی کتاب موجود نہیں ہے۔ شاہ کلیم اللہ دہلوی نے بھی ایک کتاب رد وافض کے نام سے تصنیف فرمائی تھی۔

چشتیہ سلسلہ کے بزرگوں نے شیعوں کے عقائد کی اصلاح کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے۔ حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی نے اپنے خلیفہ شاہ نظام الدین اورنگ آبادی کو ہدایت کی کہ وہ "معتقدارت رفض" کو روکنے کے لئے پوری جدوجہد کریں۔ شاہ فخر الدین صاحب نے شیعوں کی مخالفت کا مقابلہ سختی سے نہیں بلکہ محبت سے کیا۔ جس شخص نے مرزا مظہر جان جاناں کو شہید کیا تھا اس نے ان کو بھی شہید کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن ان کی مجلس میں پہنچ کر ایسا متاثر ہوا کہ اپنے ارادہ سے توبہ کرلی۔ شاہ فخرالدین صاحب نے بہت سے شیعوں کو بھی مرید کیا تھا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے ایک بار اس پر اعتراض کیا تو فرمایا ۔ "مرید ہوکر وہ تبرے سے تو باز آجاتے ہیں۔" آخری زمانے میں شاہ سلیمان تونسوی نے یہ راہ اختیار کی کہ سنی مسلمانوں کو شیعوں کی صحبت اور اثر سے بچنے کی تلقین کی۔

شیعوں سے مذہبی عقائد کے اختلاف کے باوجود ان بزرگوں نے اپنے عادلانہ اور منصفانہ رویے میں فرق نہ آنے دیا۔ وہ ہر چیز کو اس حقیقی صورت میں دیکھتے تھے' اور وقتی مخالفت کی رو میں بہہ کر عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے تھے۔ ایک شخص نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے شیعوں کو کافر قرار دینے کے متعلق فتویٰ دریافت کیا تو شاہ صاحب نے اختلاف کیا۔ وہ شخص یہ کہہ کر کہ "ایں شیعی است" چلا گیا۔ (ملفوظات شاہ عبدالعزیز (ص 32) میں ہے۔ کہ آفتاب نامی ایک روہیلہ پٹھان شاہ عبدالعزیز کے درس میں شریک ہوتا تھا۔ ایک دن شاہ صاحب نے علی المرتضیٰ کے مناقب بیان فرمائے تو بقول شاہ صاحب اس کو اس قدر غصہ آیا کہ اس نے۔

بندہ راشیعہ فہمید و آمدن درس موقوف کرد

"بندہ کو شیعہ سمجھا اور درس میں آنا بند کردیا

(بحوالہ مشائخ چشت مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی)

باب 11

اسلامی تحریکیں

برصغیر پاک و ہند میں اشاعت اسلام کا آغاز

اس موضوع پر جناب ڈاکٹر لیاقت علی خان نیازی لکھتے ہیں کہ :
برصغیر پاک و ہند میں اشاعت و تبلیغ اسلام کا حال مختلف تاریخی ادوار میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

1۔ ابتدائی مرحلے (فتح سندھ) 711ء سے 980ء تک اور غزنی و لاہور 980ء سے 1186ء تک۔
2۔ دور توسیع و اشاعت (خاندان غلاماں اور خاندان خلجی) 1186ء سے 1321ء تک۔
3۔ دور نفوذ و ترویج (خاندان سادات اور لودھی کے عہد حکومت تک)۔
4۔ مغلیہ دور۔
5۔ زمانہ محکومیت کا دور 1800ء سے 1947ء تک۔

(1) ابتدائی مرحلے : یہ دور فتح سندھ سے شروع ہوتا ہے۔ فتح سندھ و ملتان کے بعد مسلمانوں کی رفتار ترقی بہت ست پڑ گئی۔ محمد بن قاسم نے اپنی شخصیت اور رواداری کے نقوش چھوڑے۔ ملتان سے دہلی پہنچنے میں مسلمانوں کو کوئی پونے پانچ سو سال لگے۔ یہی ست رفتاری اشاعت دین میں بھی نظر آتی ہے چونکہ سندھ اور ملتان میں قرامطہ کی حکومت قائم ہو چکی تھی اس لیے وہاں جو تھوڑی بہت اشاعت اسلام ہو رہی تھی اس کا بھی رخ بدل گیا۔ غالباً سندھ میں توسیع اسلام ابتدائی دور کا حصہ نہیں بلکہ بعد کا واقعہ ہے۔ اس دور میں شیخ ابو تراب کو اگر شامل کیا جائے تو وہ پہلے ملکی حاکم تھے جن کے معجزات (کرامات) سے عوام مرعوب ہوئے اور ان کا مزار بزرگوں میں سب سے قدیم ہے۔

عہد غزنویہ میں سب سے زیادہ فروغ لاہور نے پایا۔ نہ صرف عرب بلکہ بلاد عجم سے بھی علماء و مشائخ آنا شروع ہو گئے۔ اس دور کے علماء و مشائخ جنہوں نے تبلیغ اسلام کا بیڑا اٹھایا قابل ذکر ہیں۔ سب سے قدیم زیارت گاہ اچ شریف (بہاولپور) میں شیخ صفی الدین حقانی گارزونی کا مزار ہے۔ ان کی تبلیغی اور روحانی کوششوں نے اچ شریف کو شہرہ آفاق بنا دیا۔ فوائد الفواد اور اخبار الاخیار میں ان کے تبلیغی کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ شاہ یوسف گردیزی ملتانی بھی قابل ذکر ہیں۔ شاہان اسلام نے انہیں بہت سی جاگیریں دے دیں۔ خطہ لاہور کے مشہور علماء مشائخ اسماعیل لاہوری کا نام سب سے پہلے مبلغ اسلام کی حیثیت سے آتا ہے۔ حضرت داتا گنج بخش لاہوری'' ' امام حسن صفانی لاہوری'' ' سلطان سخی سرور قابل ذکر ہیں جنہوں نے خاصی تبلیغ کی۔

(2) دور توسیع و اشاعت اسلام 1186ء سے 1321ء تک : اس دور میں توسیع حکومت اور اشاعت اسلام ہوئی۔ محمد بن قاسم کے قریباً تین سو سال بعد سلطان محمود غزنوی نے سرزمین ہند میں قدم رکھا۔ اس سے فتح ہندوستان کا راستہ صاف ہو گیا۔ کابل اور پشاور میں اسلامی حکومت قائم کر دی گئی۔ علاؤ الدین خلجی کے دور میں اسلامی حکومت کو وسعت و استحکام نصیب ہوا۔ فتح سندھ سے حضرت خواجہ اجمیریؒ کی آمد تک اشاعت اسلام کی رفتار اس سرزمین میں بڑی سست رہی مگر اس کے بعد اشاعت اسلام کا ایک انقلاب آیا جس کی وجوہات یہ تھیں۔

1۔ دہلی میں اسلامی حکومت کا قیام اور توسیع اور مسلمانوں' صوفیوں اور مبلغوں کی دوسرے ممالک سے آمد تاتاریوں کا حملہ بھی علماء و مشائخ کی برصغیر ہندوستان میں آمد کا سبب بنا۔ سرایڈورڈ میکلیگن کا یہ نظریہ ضلع ملتان کے GAZETTEER میں ملتا ہے۔

2 ۔ صوفیائے کرام کا طریقہ کار بھی تبلیغ کا سبب بنا دور حاضر کے مشنریوں اور مبلغوں سے ان کا مطمع نظر مختلف تھا۔ ان کا مطمع نظر اسلام کی اشاعت نہیں بلکہ "اسلام حقیقی" کی توسیع تھا۔

3۔ آریہ سماج کے آغاز کی وجہ سے مظلوم شودر اور اس قسم کے طبقوں نے دین اسلام قبول کیا اور بہتر معاشرتی مقام پایا الغرض بزرگان کرام نے لوگوں کی روحانی اور اخلاقی اصلاح کی۔

اس دور کے اولیائے کبار میں خاص مرتبہ سلطان الہند حضرت معین الدین اجمیریؒ کا ہے۔ ان جیسے صوفیا کرام کی وجہ سے اشاعت اسلام ہوئی۔ ہندوؤں نے بھی ان صوفیوں کو نگاہ احترام سے دیکھا۔ آپ نے جو بیج بویا وہ اس طرح پھلا پھولا کہ تمام ملک میں چشتیہ سلسلہ کی شاخیں پھیل گئیں۔ صوفی حمید الدین ناگوری آپ کے خلفائے کبار میں سے تھے۔ اس قافلہ کے ایک اور بزرگ سید علاؤ الدین نذر باری تھے۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی چشتی سلسلہ سے تھے۔ سلطان التمش نے آپ کو شیخ الاسلام کا عہدہ پیش کیا۔ بابا فرید گنج شکرؒ کو اسلام کی اشاعت اور چشتیہ سلسلہ کی ترویج دونوں میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ مغربی پنجاب کی بہت سی ہندو آبادیاں ان کے ہاتھ پر اسلام لائیں۔ مخدوم علاؤ الدین صابری بھی قابل ذکر ہیں۔ سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی نے بھی سلسلہ چشتیہ کو بڑی وسعت دی۔ بو علی قلندر نے چشتیہ سلسلہ میں صابریہ طریق کی بنیاد رکھی۔

ملتان میں تبلیغی اور صوفیانہ سرگرمیاں قابل ذکر ہیں۔ سہروردی اور دوسرے سلسلے ٹھوس تبلیغی کاموں میں چشتیہ کے مقابلے میں زیادہ بھاری ہیں۔ ان میں شیخ بہاؤ الدین زکریا سہروردی اور شیخ رکن الدین قابل ذکر ہیں۔

اچ میں تبلیغی اور صوفیانہ سرگرمیاں بھی قابل داد ہیں۔ مغربی پنجاب میں ملتان کے بعد اشاعت کا دوسرا مرکز اچ شریف تھا۔ ایک سلسلہ گیلانیہ دوسرا قادریہ کہلاتا تھا۔ سب سے پہلے

بزرگ سید جلال الدین بخاری ہیں۔ حضرت مخدوم جہانیاں نے کافی مقامات پر تبلیغ کی۔ آرنلڈ کے مطابق انہوں نے گجرات میں اشاعت اسلام کا کام شروع کیا ان کے بھائی سید راجو قتال بھی صاحب اثر بزرگ تھے۔

مغربی پنجاب میں اشاعت اسلام : سبزوار سے پیر شمس تبریز اور کاشان سے قاضی قطب الدین ملتان تشریف لائے۔ جنہوں نے تبلیغ اسلام کی جھنگ اور ملتان کا سیال قبیلہ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا اور جو یہ قبیلہ شیخ رکن عالم نے مسلمان کیا۔ اس طرح کھرل اور وٹو قبیلے بھی مسلمان بنے۔

اسی دور میں سندھ میں بھی اشاعت اسلام ہوئی۔ مخدوم لال شہباز قلندر کی خدمت قابل قدر ہیں۔ سندھ میں پیروں کا سلسلہ بابر کے زمانے میں شروع ہوا۔ اس کے علاوہ پیر منگھو یا گلہ پیر بھی ان کے ہم عصر تھے۔ اسی دور میں شیخ جلال الدین تبریزی شمالی ہندوستان کے راستے بنگال تشریف لے گئے۔ آئینہ ہندوستان شیخ سراج بھی قابل ذکر ہیں۔ اس دور کے بارے میں ابن بطوطہ بنگال کے ایک بادشاہ فخر الدین کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ صوفیوں سے اس قدر محبت کرتا تھا کہ اس نے ایک صوفی شیدا کو اپنا نائب مقرر کر دیا۔ شیخ علاؤ الدین علا الحق بنگالی' حضرت نور قطب عالم' شیخ جلال مجرو سلہٹی اور بنگال کے غازی اولیاء مثلاً شاہ جلال نیک اتی تبلیغی کام کیے۔

بلبن سلاطین کے دور میں بنگال میں اسلام کو وسعت نصیب ہوئی اور اس کی بنیادیں اور گہری ہوئیں۔ اسی طرح گجرات (موجودہ بھارت) میں میمن جماعتوں' قرامطہ' خوجوں اور دیگر گروہوں میں خوب تبلیغ ہوئی۔ شاہ شمس تبریز نے بھی کافی تبلیغ کی۔ پیر صدر الدین کی خدمات بھی قابل ستائش ہیں۔ اس طرح بوہروں میں بھی تبلیغ ہوئی۔ اسی طرح میسور میں بقول ہرکلت قلندر عرف بابا بڈھن نے کافی تبلیغ کی۔

حضرت سید بندہ نواز گیسو درازؒ بھی اس دور کی اہم شخصیت ہیں۔

توسیع اسلام کے بارے میں ڈاکٹر ٹائی ٹس کا نظریہ : اہل مغرب نے پاک و ہند کے مختلف علاقوں میں توسیع اسلام کو تعصب کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سرزمین میں مسلمان بادشاہوں نے بزور شمشیر اسلام پھیلایا۔ ڈاکٹر ٹائی ٹس نے بھی اپنی تصنیف (Islam Indian) میں اس نظریئے کی تائید کی ہے۔ اس کی تردید فقط اس قدر کی جا سکتی ہے کہ دہلی' آگرہ' لکھنؤ' احمد نگر اور احمد آباد جو صدیوں تک مسلمانوں کی حکومت کے مرکز رہے۔ آج بھی وہاں مسلمانوں کی تعداد دس سے 15 فیصد سے زیادہ نہیں۔ اگر تلوار کے زور سے اسلام پھیلتا تو سب سے زیادہ مسلمان ان علاقوں میں ہوتے۔ دراصل اسلام کی توسیع کا سب سے بڑا سبب اسلامی مساوات تھی جس سے نیچ ذاتوں کو آزادی اور ترقی کا کام ملا۔ اس نظریئے سے ARNOLD بھی اتفاق کرتا ہے۔

ڈاکٹر تارا چند اور پروفیسر تھامس لکھتے ہیں کہ اس دور کی وجہ سے آج سرزمین ہندوپاک کی آبادی کا ایک بڑا حصہ مسلمان ہے۔ اس سے مذہبی معاشرتی اور سیاسی تبدیلیاں آئیں۔ توحید کا احیاء ہوا اور تصوف کو ترقی ملی۔

دور نفوز ترویج 1321ء سے 1526ء تک : اس دور میں سلطان محمد تغلق نے صوفیا کا اثر کم کرنے کی کوشش کی اور ان پر سختی کی۔ اس دور کے مبلغ حضرت مخدوم نصیرالدین چراغ دہلی ہیں۔ محمد بن تغلق کا رویہ ان کے بارے میں ظالمانہ تھا لیکن آپ نے صبر جمیل سے کام لیا۔ آپنے ملک میں تبلیغ اسلام کا کام اپنے خلفا سے لیا۔ علاؤ الدین خلجی نے مذہبی معاملات میں دلچسپی نہ لی لیکن غیاث الدین تغلق کے دور میں شرع اور اہل شرع کو نیا وقار ملا۔ اس دور میں فقہ کو فروغ ہوا۔ فقہ فیروز شاہی اور 9 جلدوں میں الفتاویٰ' تاتارا خانیہ شائع ہوا۔ شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیری کی حیثیت بڑی حد تک صوبجاتی اور مقامی تھی تاہم ان کی تصانیف اور تالیف سے ملک میں خاصی تبلیغ ہوئی۔ اسلامی تصوف پر اسی دور میں کشف المحجوب لکھی گئی۔ عین الحق ملتانی اور شیخ علی مہائی بھی اس دور کی مبلغ شخصیات ہیں جن کی تفسیر تبصیر القرآن کی نظیر نہیں ملتی۔

بقول مولانا عبدالحیٰ "ہندوستان کے ہزار سالہ دور میں شاہ ولی اللہ کے سوا حقیقت نگاری میں شیخ علی مہائی کی کوئی نظیر نہیں" اس دور کی ایک اور اہم شخصیت شیخ جمال ہیں۔ اس دور میں تصوف اور بھگتی کے اتصال سے ایک نئی تحریک وجود میں آئی جس کا مقصد یہ تھا کہ مذہب کے اختلافات کو مٹا کر سب انسانوں کی ایک برادری قائم کی جائے لیکن یہ تحریک نہ چل سکی اس میں مبلغین کا بڑا حصہ ہے۔

(4) مغلیہ دور : مغلیہ دور کی ابتداء بابر سے ہوتی ہے۔ اس دور میں مہدوی تحریک نے جنم لیا۔ جس کے روح رواں سید محمد جونپوری تھے۔ یہ تحریک تجدید دین کے لیے تھی۔ اس کے بعد سوری دور میں شیخ محمد غوث شطاری اور پیر روشن میاں نے اشاعت اسلام کے لیے کافی کام کیا۔ یہ مذہبی تمدنی اور سیاسی تحریک کے رہنما تھے۔ قادریہ سلسلہ میں مخدوم محمد گیلانی' مخدوم عبدالقادری ثانی اور چشتیہ سلسلہ میں شیخ عبدالعزیز چشتی دہلوی کی خدمات بھی قابل تحسین ہیں۔ عہد اکبری میں نیا مذہب ظہور پذیر ہوا جو "دین اکبری" کہلاتا ہے۔ ڈاکٹر اشیاق حسین قریشی اپنی کتاب میں فرماتے ہیں "اکبر کو مذہبی انتشار تھا"

تاہم اس کا عہد اشاعت اسلام کے لیے نمایاں زمانہ ہے۔ اس دور کی شخصیت مجدد الف ثانی" ' شیخ احمد فاروقی سرہندی اہم ترین ہیں۔ بقول شیخ محمد اکرام (رود کوثر)

> "انہوں نے اکبری الحاد کے خاتمے میں حصہ لیا اور احیائے اسلام کی کوشش کی۔ ان کے کام کی اہمیت سے انکار نہیں وہ قیوم اول ہیں۔"

ان کے بارے میں رائے ساردا اپنی انگریزی کتاب اجمیر میں کہتا ہے کہ "انہوں نے

مخلوق کی صلح جوئی اور خیر خواہی کی۔"

علاوہ ازیں شیخ عبدالحق محدث دہلوی بھی اس دور کی اہم شخصیت ہیں۔ تذکرہ علما ہند میں ان کی علمی خدمات کا ذکر ہے۔ ان کی وجہ سے دینی درس و تدریس کا پورا سلسلہ ملک میں عام ہو گیا۔ علاوہ ازیں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی بھی اہم شخصیت تھے۔ عبداللہ نیازی عہد جہانگیری کے سب سے زیادہ مشہور افغانی بزرگ تھے۔ حضرت پیر بابا اور حضرت اخند بابا نے پشاور کے علاقے میں کافی تبلیغ کی۔ عہد جہانگیر میں فقہ اور شریعت کو فروغ ہوا۔ اس کی وجہ اورنگ زیب عالمگیر کی ذاتی دلچسپی تھی۔ فتاویٰ عالمگیری ان کے دور میں شیخ نظام کی زیر نگرانی آٹھ سال کی محنت سے تیار ہوا جس پر دو لاکھ روپے اس دور میں صرف ہوئے۔ یہ حنفی علماء کی فقہ ہے۔ بقول شیخ محمد اکرام:

"اس کتاب نے علماء اور طلباء کو تمام کتابوں سے بے نیاز کر دیا۔" (رود کوثر) پروفیسر محمد فرمان اپنی کتاب حیات مجدد میں کہتے ہیں "جہانگیر' شاہ جہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کے دلوں میں اسلام کی محبت اور شریعت کی ترویج کا خیال تھا۔"

بنگال میں وشنو تحریک کے اثر کو مٹانے کے لیے سید سلطان بہرام سقا' مولانا حمید اور شاہ نعمت اللہ قادری نے بڑا کام کیا۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے اجتہاد کی تعلیم و ترغیب دی اور تبلیغ اسلام کی تحریک میں نئی روح پیدا کی۔ انہوں نے حجتہ اللہ البالغہ لکھی اصلاح معاشرت کا کام سرانجام دیا۔ شیعہ' سنی اختلافات کو دور کرنے کی کوشش کی۔ بقول شیخ محمد اکرام (رود کوثر) انہوں نے شیعہ سنی خیالات کی تطبیق کی۔ یہ بڑا نازک سیاسی دور تھا جب آپ نے اصلاح کا کام شروع کیا۔ دور مغلیہ کے زوال میں (1708ء ---- 1857ء) علوم اسلامی کو فروغ ہوا۔ درس نظامی قائم ہوا جو بحر العلوم ملا نظام الدین نے بنایا۔ اس دور میں شیعہ فرقہ کو بھی کافی فروغ ہوا۔ حاجی محمد محسن شیعہ اکابرین میں سے ہیں دکن' مرشد آباد' عظیم آباد اور لکھنؤ شیعہ ثقافتی مراکز ہے۔ اٹھارویں صدی میں چشتیہ سلسلے کا بھی احیا ہوا۔

(5) زمانہ محکومیت کا دور (1800ء سے 1947ء) تک : 1857ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی حالت ابتر ہو گئی۔ آخرکار مسلسل جدوجہد سے حالات بدلے اور 1947ء میں پردیسی حکمران رخصت ہوئے۔ مولانا سید احمد دہلوی کی تحریک جہاد اسی زمانے سے متعلق ہے۔ دیوبند کا مدرسہ اور ندوۃ العلما اور دار المصنفین اسی زمانے میں قائم ہوئے۔ قرآن کی اشاعت کی کوشش ہوئی۔ سیرت نگاری میں ایک نیا معیار قائم ہوا۔ برصغیر میں سید امیر علی اور مبلغ خواجہ کمال الدین' اقبال' شبلی نعمانی' سید احمد' شاہ اسماعیل شہید' مولانا محمد قاسم دیو بندی' مولانا اشرف تھانوی اور مولانا ابوالکلام آزاد ایسی روشن شمعیں ہیں کہ اس کو مذہبی خشک سالی کا دور نہیں کہا جا سکتا۔ نیز شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا بڑا احسان ہے جن کے بارے میں اقبال نے کہا:

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصہ قدیم و جدید

اشاعت دین ایک معجزہ ہے۔

رہنماء کاروان انسانیت محمد عربی ؐ کا پیغام جس تیزی سے دنیا میں پھیلا وہ ایک معجزہ ہے۔ بغیر پریس کے اتنا بڑا مشن مکمل ہوا۔ نہ صرف ایک پاک و ہند بلکہ دنیا کے کونے کونے میں دین کی اشاعت ہوئی۔ "انٹرنیشنل ائربک 1963ء" کے مطابق مسلمانوں کی تعداد مندرجہ ذیل ممالک میں یہ تھی۔

چین پانچ کروڑ۔
روس ساڑھے تین کروڑ۔
ہندوستان چار کروڑ ستر لاکھ۔
فراس چھ لاکھ۔
یوگوسلاویہ تیس لاکھ۔
جرمنی پچاس لاکھ۔
فن لینڈ دو لاکھ۔

ظاہر ہے اب مندرجہ بالا ممالک میں تعداد بہت زیادہ بڑھ چکی ہے۔ ٹائم میگزین 23 مئی 1988ء کے صفحہ نمبر 50 پر ایک بہت خوبصورت مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے (امریکن مکہ کی طرف منہ کئے ہوئے) اس میں بتلایا گیا ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کی تعداد آٹھ سو ملین ہے۔

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور' مورخہ 7 نومبر 1997ء بروز جمعہ بمطابق 6 جب 1417ھ)

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام کی تبلیغ کا کام اہل اللہ کی خاموش مساعی کا مرہون منت ہے جس کے پیچھے اسلام کی حقانیت کی بے پناہ قوت ہے اور اسلامی اصولوں کی بالادستی اور اس کے عملی پہلوؤں کی ہمہ جہت روشنی بھی اس معاملے میں ممد و معاون ہے۔

صوفیائے اسلام کی تبلیغی مساعی سے کسی کو بھی جرات انکار نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کے پس منظر میں روحانی تسکین کا جو سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہے وہ اپنے اندر ایک مداومت لیے ہوئے ہے۔ جس کی روشنی سے علامہ اقبال جیسے جدید دور کے فلسفی اور مفکر بھی فیض یاب ہوئے اور اپنے خطبات میں تصوف کی حقانیت کا اعتراف بھی برملا کیا کیونکہ اس چشمے کے سوتے سید المرسلین ؐ کی نبوت کے فیضان سے پھوٹ رہے ہیں:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

مغلیہ دور میں اسلامی اقدار کا تحفظ

اکبری الحاد کے خلاف حضرت مجدد الف ثانیؒ کی رہنمائی میں اسلامیان ہند نے جدوجہد کا آغاز کیا کیوں کہ اکبری دور میں اسلامی مملکت کی انتظامی مشنری میں ہندو اہلکاروں کی اکثریت تھی۔ جو ازیں پیشتر ادوار میں ہرگز نہ تھی اور بقول حضرت مجدد الف ثانیؒ انتظامیہ پر ہندوؤں کے چھا جانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ:

ترجمہ : اسلام کی کسمپرسی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ کفار برملا اسلام پر طعن کرتے ہیں اور مسلمانوں کی مذمت بے باکی سے کرتے ہیں اور بے دھڑک مراسم کفر کوچہ و بازار میں ادا کرتے اور کفر کی تعریف و توصیف کرتے ہیں اور مسلمانوں کو اسلامی احکام کی ادائیگی سے برملا منع کیا جاتا ہے اور اہل اسلام کو رسوا کیا جاتا ہے اور انہیں طعن و تشنیع کا ہدف بنایا جاتا ہے۔ گویا:

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ و ناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بو العجبی است

(پری تو چہرہ چھپانے پر مجبور ہے اور طاغوت دندناتا پھر رہا ہے۔ عقل حیران ہے کہ یہ عجیب چکر کیسا ہے۔)

سبحان اللہ ! مشہور تو یہ ہے کہ شریعت اسلامی تلوار کے سایہ میں ہے اور دین حق کی رونق بادشاہوں کے دم سے وابستہ ہے لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹ چکا ہے۔ کتنے افسوس' حسرت اور ندامت کا مقام ہے۔

(مکتوبات شریف جلد نمبر1 مکتوب نمبر2 صفحہ 82)

جہانگیر کی زندگی میں اسلام سے محبت کی جھلک ملتی ہے۔ جہانگیر کی زندگی کے اس انقلاب میں چونکہ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اہم کردار ادا کیا تھا اس لیے ہندوستان کے صوفیائے کرام سے اس کی قلبی عقیدت ایک فطری امر تھا۔ لہذا حضرت مجددؒ کا عقیدت مند ہونے کے ساتھ ساتھ وہ دیگر صوفیاء کی خدمت میں بھی حاضر ہوتا اور ان کی صحبتوں میں بیٹھ کر روحانی استفادہ کرتا۔

حضرت میاں میر رحمتہ اللہ علیہ (ولادت 938 ھ وفات1045 ھ) اس زمانے میں لاہور میں علم و عرفان کے موتی لٹا رہے تھے۔

"آپ کے کمالات کا شہرہ سن کر شہنشاہ جہانگیر کو آپ سے ملنے کا شوق ہوا۔ لاہور سے چلنے کے بعد اس نے ایک شخص کو آپ کی خدمت میں بھیجا اور یہ پیغام بھیجا کہ لاہور سے روانہ ہونے کے بعد اس کو آپ کا نام معلوم ہو سکا۔ اگر لاہور میں ہوتا تو وہ خود حاضر خدمت ہوتا۔ اب آپ خود ہی ازراہ نوازش اس کے پاس تشریف لے آئیں۔"

آپ نے جہانگیر کی درخواست منظور فرمائی۔ جہانگیر نے آپ کی بہت آؤ بھگت کی۔

بہت دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ جہانگیر آپ سے بہت متاثر ہوا اور اسی حالت میں آپ سے عرض کیا۔

"جو کچھ سلطنت کا زر و مال ہے اور جواہر وغیرہ ہے وہ میری نظر میں اینٹ کے پتھر کے برابر ہے اگر آپ توجہ فرمائیں تو میں دنیاوی تعلقات کو چھوڑ دوں۔"

آپ نے یہ سن کر جہانگیر سے فرمایا: "تم پہلے اپنے جیسا خلقت کی نگہبانی کے لیے کوئی شخص مہیا کرو پھر میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا کر مشغول کروں گا۔"

جہانگیر یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اس نے آپ سے عرض کیا کہ "اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو فرمائیں۔" آپ نے وعدہ لے لیا کہ جو طلب کریں گے وہ دے گا۔

جہانگیر نے کہا: "ہاں ضرور دوں گا۔" آپ نے فرمایا۔

"تو بس یہی چاہتا ہوں کہ مجھے رخصت دو۔" جہانگیر نے آپ کو نہایت عزت و احترام سے رخصت کیا۔

(ڈاکٹر ظہور الحسن شارب "تذکرہ اولیائے پاک و ہند" ص 284)

جہانگیر اسی طرح حضرت مادھو لال حسین کا بھی عقیدت مند بن گیا اور اس نے آپ کا روزنامچہ لکھنے کی خدمت بہادر خاں کے سپرد کی۔

(ایضاء ص 263)

حضرت شیخ سلیم چشتی کے صاحبزادے شیخ قطب الدین کو جہانگیر نے اونچے عہدے پر فائز کیا۔

(تاریخ فرشتہ بحوالہ ایضاء ص 248)

ترویج و تحفظ اسلام کے سلسلے میں خاندان مجددیہ کا زریں کردار

حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کی وفات (1034 ھ) کے بعد آپ کے صاحبزادگان اور نامور خلفا نے حضرت مجددؒ کے مشن کو جاری رکھا۔ اگرچہ حکمران طبقہ کی اصلاح ہو چکی تھی لیکن عوام کے اندر بعض غیر اسلامی رسوم و رواج کا خاتمہ اور انہیں روحانیت کی تعلیم دینا ان حضرات کا مشن تھا۔ خانقاہ مجددیہ اس دور میں ایک عظیم الشان اسلامی مرکز کی حیثیت اختیار کر گئی۔ اس خانقاہ کے اندر اسلام کے اصول و ضوابط پر سختی سے کاربند رہنے کی تلقین کی جاتی تھی اور مسلمانوں کے کردار و شخصیت کو مثالی بنانے کے لیے ان کی تربیت ہوتی تھی' یہ کام اتنی ٹھوس بنیادوں پر ہوا کہ اس کے اثرات بعد کی صدیوں میں ظہور پذیر ہوئے۔

اکبری دور کی خرافات کی بدولت بے راہرو مسلمانوں کو تشکیک کی دلدل سے نکال کر یقین اور حقانیت اسلام کے عقیدے کو اس طرح دلوں میں جاگزیں کر دیا گیا کہ "دو قومی نظریہ" کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی گئیں۔

سید ابو الحسن علی ندوی "خانقاہ مجددیہ" کی منظر کشی یوں کرتے ہیں:

"حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (متوفی 103[illegible] ھ) کے جلیل القدر خلیفہ حضرت سید آدم بنوری (م 1052ھ) کی خانقاہ میں ایک ایک ہزار آدمی روزانہ ہوتے تھے جو دونوں وقت خانقاہ میں کھانا کھاتے تھے۔

ان کی سواری کے ساتھ ہزاروں ہزار آدمی اور سینکڑوں علماء ہوتے تھے' تذکرہ آدمیہ میں ہے کہ 1054 ھ میں جب آپ لاہور تشریف لے گئے تو سادات و مشائخ اور دوسرے طبقوں کے دس ہزار آدمی آپ کے ہم رکاب تھے۔ طالبین کا اتنا مجمع ہر وقت رہتا تھا کہ شاہجہان کو ان کی طرف سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا' مجدد صاحب کے نامور خلیفہ اور صاحبزادہ معصوم (م 1079 ھ) کے ہاتھ پر نو لاکھ انسانوں نے بیعت و توبہ کی اور سات ہزار آدمی خلافت سے مشرف ہوئے"

(سید ابو الحسن علی ندوی بحوالہ نزہتہ الخواطر "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" ص 244)

شاہجہان جو جہانگیر کے بعد ہندوستان کی اسلامی سلطنت کا حکمران بنا تھا' بحیثیت مجموعی ایک اچھا حکمران تھا' اس نے اسلامی عظمت و سطوت کے اظہار کے لیے مساجد بنوائیں۔ اولیائے کرام سے خصوصی عقیدت و لگاؤ رکھتا تھا اور ہندوؤں کے متعلق اس کا رویہ نرم نہیں تھا بلکہ اس نے نئے مندروں کی تعمیر روک دی تھی۔

شاہجہاں کی یہ مذہبی پالیسی ہندوستان میں مسلم قومیت کے احیاء کے لیے اہم کوشش تھی اور بالواسطہ طور پر حضرت مجدد کی بے مثال تحریک کا ایک نتیجہ۔

روحانیت سے اس کے تعلق کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر ظہور الحسن شارب حضرت میاں میر کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

"شہنشاہ شاہجہاں دو مرتبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے شاہجہاں کو نصیحت فرمائی۔ عادل بادشاہ کو اپنی رعایا اور سلطنت کی خبر گیری کرنی چاہئے اور اپنی تمام ہمت' اپنی تمام ولایت کو آباد کرنے میں صرف کرنی چاہیے کیونکہ اگر رعیت آسودہ حال اور ملک آباد ہے تو سپاہ آسودہ اور خزانہ پر ہو گا۔

(سکینۃ الاولیاء بحوالہ تذکرہ اولیائے پاک و ہند صفحہ 285)

"شاہجہاں نے اپنے زمانے میں اکثر بدعتوں کو جو جہانگیری دور میں باقی رہ گئی تھیں دور کیا اور حکم دیا کہ اشرفی اور روپے کے سکوں پر کلمہ طیبہ اور خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم' کے اسمائے گرامی کندہ کیے جائیں اور تمام شہروں' قصبوں اور دیہات میں مسجدیں اور مدرسے بنائے جائیں چنانچہ بکثرت مساجد اور مدارس تعمیر کیے گئے اور علماء و فقرا اور حفاظ کے وظائف مقرر کیے گئے اور دین اسلام کی ترویج میں بے حد کوشش کی گئی۔"

(روضہ القیومیہ رکن دوم' صفحہ 18' بحوالہ انوار معصومیہ صفحہ 44 از سید زوارح حسین

حضرت مجدد کے صاحبزادگان حضرت خواجہ محمد سعید اور حضرت خواجہ محمد معصوم رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی زندگی میں مکاتیب کا سلسلہ جاری رکھا۔ حکمرانوں کے نام ان کے خطوط اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ وہ حکمرانوں کی اصلاح سے غافل نہیں رہے۔ اس سے واضح ہو رہا ہے کہ حکمرانوں کی قلبی تطہیر میں صوفیائے کرام کا کس قدر ہاتھ تھا۔

شاہجہاں سے متعلق لکھتے ہیں:

Like his father. Shah Jahan was the son of a Rajput mother, so that by blood he was more than half a Hindu, but he is the first of the dynasty who can be descri-bed as an orthodox Muslim. It would be going too far to call him a systematic persecutor, but the admin-istration was invigorated on the religious side, and the interests of Islam were put first. Hindus were prevented from building new temples, the Jesuit missionaries at Agra were for a short time actively persecuted, in the Chronicles Moslems stand out quite clearly as the ruling class.

(A short History of India (P - 240)

ترجمہ : اپنے باپ کی طرح شاہجہاں ایک راجپوت ماں کا بیٹا تھا۔ اس طرح خونی رشتے کی وجہ سے وہ نصف سے زیادہ ہندو تھا لیکن شاہی خاندان کا وہ پہلا فرد تھا جسے ایک سنی مسلمان کہا جا سکتا ہے۔ اسے ظالم کہنا تو زیادہ مناسب نہ ہو گا لیکن انتظامیہ مذہبی طرف دار ضرور بن گئی تھی اور اسلام کے مفادات کو مقدم رکھا جاتا تھا۔ ہندوؤں کو نئے مندر تعمیر کرنے سے روک دیا گیا تھا۔ عیسائیوں کا آگرہ میں تبلیغی مشن مختصر عرصے میں تیزی سے تباہ کر دیا گیا اور تاریخ میں مسلمان بالکل واضح طور پر حکمران طبقہ بن گئے۔"

نظام حکومت میں اتنی واضح تبدیلیاں حضرت مجدد کی تحریک کی مرہون منت نہیں تھیں تو اور کیا تھا؟ مغلیہ سلطنت کا نامور حکمران اورنگ زیب عالمگیر ایسی شخصیت ہے جس پر حضرت مجدد الف ثانی" کی تعلیمات و افکار کا براہ راست انقلاب آفریں اثر نظر آتا ہے۔ وہ ایک مثالی مسلمان حکمران تھا۔ جس نے خود اپنے کردار سے ثابت کیا کہ ایک مسلمان حکمران کی شخصیت اور کردار کس سانچہ میں ڈھلا ہوا ہونا چاہیے۔ اس کے دور میں برصغیر میں اسلام' نظام حکومت و سیاست کے ہر شعبہ میں اس طرح دخیل ہو چکا تھا کہ اس کی واضح اور گہری چھاپ دکھائی دیتی تھی۔ اسلامی علوم اور خصوصاً اسلامی فقہ پر حکومتی سطح پر "ریسرچ" ہوتی تھی اور نتیجتاً ایک عظیم علمی ذخیرہ "فتاوی عالمگیری" کے نام سے مسلمانان ہند کے سامنے آیا۔ جو مسلمانان عالم کے لیے وجہ افتخار بنا۔ مختصر یہ کہ اسلام اس کے دور میں عروج پر تھا اور ہندوؤں کی پالیسیاں دم توڑ چکی تھیں۔ اسی لیے تو متعصب انگریز اور ہندو مصنفین اسی کے متعلق لکھتے ہیں :

Aurangzeb had many good qualities, great personal courage, a cool and clear head, Untiring industory, a deep sense of religion and complete control over the ordinary possions of human nature; but these could not avail against his lack of statesmanship himself a rigid Molsim, his guiding principle was to organise the empire in strict accordance with the public law of Islam, and he persued this course without any recognition of the facts which it is a stateman business to take into account. His reign was thus tragedy, for his religions, as he understood it compelled him to wreck his Sirhindi by reversing the policy adopted by Akbar, which had made its existance possible.

ترجمہ : اورنگ زیب بہت سی اچھی خصوصیات کا حامل تھا۔ عظیم ذاتی حوصلہ معتدل مزاج' کبھی نہ تھکنے والا جسم' مذہب کا گہرا شعور اور انسانی فطرت کے عام جذبات پر مکمل کنٹرول لیکن یہ خصوصیات اس کی حکومت کرنے کی صلاحیت کی کمی کو پورا نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ ایک سخت مسلمان تھا۔ اس کا رہنما اصول سلطنت کو اسلام کے مخصوص قانون کے مطابق سختی سے منظم کرنا تھا اور اس نے یہ راستہ ان حقائق کو تسلیم کیے بغیر اختیار کیا جن کو خاطر میں لانا ایک حکمران کا کام ہوتا ہے۔ اس کا دور حکومت اس طرح اس کے مذہب کے لیے ایک المیہ تھا جیسا کہ وہ خود بھی سمجھتا تھا۔ مذہبی جذبے نے اسے اپنی سلطنت کو تباہ کرنے اور اکبر کی اختیار کردہ پالیسی سے انحراف پر مجبور کیا جس (پالیسی) نے اس کی موجودگی کو ممکن بنایا تھا۔

(بحوالہ ایضاء " 249)

کتاب مذکورہ کے ہندو اور انگریز مصنفین نے اس پیرایہ میں جس خبث باطن کا اظہار کیا ہے اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اورنگ زیب کا عہد جو مسلمانان برصغیر کے لیے ایک زریں عہد تھا ہندوؤں کے لیے کتنا کٹھن تھا۔ اس میں اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کو اسلام کے لیے المیہ قرار دیا گیا ہے۔ شاید اس سے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اورنگ زیب کے بعد مغلیہ سلطنت کی شان و شوکت کا خاتمہ ہو گیا اور یہ سب اورنگ زیب کی پالیسی کی وجہ سے ہوا۔ اگر اورنگ زیب یہ پالیسی اختیار نہ کرتا تو شاید مغلیہ سلطنت ختم نہ ہوتی اسی لیے تو لکھا ہے کہ اس نے (اورنگ زیب نے) اکبر کی پالیسی کو تبدیل کرنے کی کوشش کی جس پالیسی نے اس کے وجود کو ممکن بنایا تھا' یعنی اکبر اگر ہندوانہ پالیسی اختیار نہ کرتا تو ہندو مغلیہ سلطنت کے خاتمہ سے پہلے ہی اس کا خاتمہ کر دیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت کا خاتمہ اورنگ زیب کی پالیسیوں کے نتیجہ میں نہیں ہوا بلکہ اس کے جانشین نا اہل ثابت ہوئے اور باہمی لڑائیوں کی وجہ سے مغلیہ سلطنت کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ وگرنہ اورنگ زیب نے ایک کامیاب حکمران کی طرح حکومت کا نظام چلایا۔

یہاں اس کا تذکرہ ضروری ہے کہ اورنگ زیب کو برسر اقتدار لانے میں خاندان مجدد کی قوتیں ہمراہ تھیں۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی حضرت مجدد کے صاحبزادہ حضرت شیخ محمد معصوم عروۃ الوثقیٰ کی دعاؤں کی مرہون منت تھی ورنہ شاہجہاں کے بعد اس کے بیٹے داراشکوہ کی تخت نشینی کا زیادہ امکان تھا۔ شاہجہان کے آخری دنوں میں وہی سیاہ و سفید کا مالک بن گیا تھا۔

"داراشکوہ کو ہندوستان پر پوری طرح تسلط حاصل ہو گیا تو اس نے شاہجہان کے پاس امور سلطنت اور رعایا کی خبریں پہنچانی بند کر دیں۔ وہ نہ ہی بادشاہ کی خیریت و عافیت کی اطلاع رعایا کو دیتا حتیٰ کہ شہزادوں کے خطوط بھی بادشاہ تک پہنچانے کی ممانعت کر دی بلکہ بادشاہ کی طرف منسوب کر کے خود اپنی حسب منشا خطوط کے جوابات دینے اور جملہ احکامات جاری کرنے لگا۔ اورنگ زیب کو جب ان حالات کا علم ہوا تو اس کو بہت غصہ آیا چونکہ حضرت عروۃ الوثقیٰ (خواجہ محمد معصوم) نے اس کو سلطنت ہند کی بشارت دی ہوئی تھی اس نے مراد بخش کو اپنے

ساتھ ملا کر چالیس ہزار سوار اپنے ہمراہ لیکر ہند کا رخ کیا۔ یہ دونوں دریائے نربدا کے پار آ گئے۔ جب ان کی آمد کی خبر داراشکوہ کو ہوئی تو بادشاہ کی طرف سے ان کو حکم امتناعی صادر کر دیا لیکن اورنگ زیب نے کہلا بھیجا کہ تم اتنی مدت باپ کی خدمت میں رہے ہو اب ہمیں ان کی خدمت میں رہنے دو۔ داراشکوہ نے دوبارہ حکم امتناعی بھیجا لیکن اورنگ زیب نے پرواہ نہ کی اور اکبر آباد کا رخ کیا۔ جب داراشکوہ نے دیکھا کہ اورنگ زیب سر پر چلا آ رہا ہے تو مجبوراً ہندوستان کے مہاراجہ (جسونت) سے کہا کہ جس طرح بھی ہو سکے اورنگ زیب کو ہندوستان نہ آنے دو۔ مہاراجہ ایک کثیر لشکر لے کر اورنگ زیب کے مقابلہ کے لیے روانہ ہو گیا نیز داراشکوہ نے قاسم خاں نامی ایک رکن سلطنت کو بھی ایک کثیر فوج دے کر مہاراجہ کے ساتھ کیا۔ ابھی یہ (دونوں) مالوہ پہنچے تھے کہ اورنگ زیب سر پر آ پہنچا۔ مہاراجہ جسونت نے اورنگ زیب کو پیغام بھیجا کہ بادشاہ کا حکم ہے کہ واپس چلے جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں آگے بڑھنے نہیں دوں گا۔ اورنگ زیب نے حضرت عروۃ الوثقیٰ کے فرزند محمد اشرف کی خدمت میں (جنہیں حضرت عروۃ الوثقیٰ تسلی کے لیے اس کے پاس چھوڑ گئے تھے) دعا و توجہ کی درخواست کی۔ آپ نے توجہ بالخیر کے بعد فرمایا کہ انشاء اللہ آپ کی فتح ہو گی اور چونکہ حضرت عروۃ الوثقیٰ کا باطن مبارک (دلی توجہ) آپ کی طرف ہے اس لیے نہ صرف یہ فتح بلکہ اور بہت سی فتوحات کی قوی امید ہے۔"

اورنگ زیب یہ خوشخبری سن کر نہایت فرحاں و شاداں ہوا اور فاتحہ پڑھ کر جنگ کے لیے روانہ ہو گیا۔ دونوں طرف سے جنگ کا بازار گرم ہوا۔ آخر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اورنگ زیب کو فتح حاصل ہوئی اور مہاراجہ شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اورنگ زیب شکر الٰہی بجا لایا۔"

(انوار معصومیہ ص 97)

خاندان مجددیہ کی طرف سے اورنگ زیب عالمگیر کی روحانی حمایت کس قدر اہم فیصلہ تھا اور اس فیصلہ کا برصغیر کی مستقبل کی سیاست پر کتنا گہرا اثر پڑنے والا تھا اس کا اندازہ اورنگ زیب اور داراشکوہ کی شخصیات کے باہمی جائزے سے کیجئے۔

"ان کے درمیان فقط ذاتی مقاصد و خواہشات ہی کی دیوار حائل نہ تھی بلکہ ان کے خیالات' ان کے عقائد' ان کے طور طریقوں اور ان کی طبیعتوں میں بعد المشرقین تھا۔ داراشکوہ اور اورنگ زیب دونوں مذہب میں دلچسپی لیتے تھے۔ لیکن ان کے مذہب میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ داراشکوہ آزاد خیال صوفیوں کا پیرو تھا اورنگ زیب متشرع بلکہ متشدد علماء کا۔ دارا کی وسعت مشرب کا تو یہ عالم تھا کہ وہ ہندو موحدین کی مجلس میں اسی ذوق و شوق سے شریک ہوتا جس طرح مسلمان صوفیہ کی محفل میں اورنگ زیب کا یہ حال تھا اس کے نزدیک شیعہ مسلمان بھی زندیق تھے۔ بعد میں یہ رنگ ہلکا ہو گیا لیکن شرع میں جو اورنگ زیب کا حال تھا اس کا اندازہ ایک خط سے ہوتا ہے جو اس نے ایام شہزادگی میں شاہجہان کو لکھا اور جس میں والی گولکنڈہ کی نسبت کہا ہے۔

"رفض و سب اصحاب کبار را کہ محض کفر و زندقہ است در قلمرو خویش شائع گردانیدہ"

ترجمہ : عظیم المرتبت صحابہ کرام کی شان میں گستاخیاں جو کفر اور گمراہی ہیں اس کی حدود سلطنت میں عام ہو رہی ہیں۔

(شیخ محمد اکرم رود کوثر' ص 455' 456)

بنا بریں اس امر میں کسی قسم کا ابہام نہیں رہ جاتا کہ خاندان مجددیہ نے اورنگ زیب کا انتخاب کیوں کیا تھا؟

"حضرت خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم شاہجہاں کے آخری ایام میں 1556-57ء میں اکٹھے حج کے لیے روانہ ہوئے اور تقریباً تین سال ہندوستان سے باہر رہے جب وہ روانہ ہوئے تو داراشکوہ کا ستارہ عروج پر تھا۔ واپس پہنچے تو عالمگیر تخت سلطنت پر متمکن تھا۔ دونوں بھائیوں کی بلکہ خاندان مجددیہ کے تمام سربرآوردہ افراد کی قدر دانی ہوئی لیکن خواجہ محمد سعید کی صحت اب ٹھیک نہ رہتی تھی۔ وہ سفر حج میں ہی ایک دفعہ اتنے بیمار ہوئے تھے کہ امید زیست نہ رہی تھی۔

واپسی پر ایک دفعہ اورنگ زیب کی دعوت پر دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں سخت بیمار ہو گئے۔ بادشاہ نے علاج میں بڑا اہتمام کیا لیکن طبیعت نہ سنبھلی چنانچہ آپ سرہند کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ سرہند میں مدفون ہوئے۔ آپ کا سال وفات 1070ھ بتایا جاتا ہے۔

(ایضاء صفحہ 36-335)

"حضرت شیخ محمد معصوم عروۃ الوثقی (حضرت مجدد کے تیسرے صاحبزادے) جب خانقاہ مجددیہ پر رونق افروز تھے۔ آپ نے اپنے صاحبزادے شیخ سیف الدین کو اورنگ زیب کے لشکر میں ارشاد و ہدایت کے لیے بھیجا۔ اورنگزیب آپ کے ارشادات کو توجہ اور ادب سے سنتا تھا۔"

(ایضاء صفحہ 336)

حضرت عروۃ الوثقی کی وفات اورنگ زیب کے دسویں سال جلوس 1079ھ (1668-69ء) میں ہوئی مزار مبارک سرہند میں ہے۔

(ایضاء صفحہ 338)

حضرت عروۃ الوثقی کے بعد آپ کے صاحبزادہ شیخ محمد صبغتہ اللہ قدس سرہ (1032ھ تا 1121ھ) مسند نشین خانقاہ مجددیہ رہے۔ اورنگ زیب آپ کا بھی معتقد رہا اور حاضری دیتا رہا۔

(انوار معصومیہ' صفحہ 118)

حضرت خواجہ محمد نقشبند حجتہ اللہ قدس سرہ 1034ھ تا 1114 / 1665 تا 1702 حضرت عروۃ الوثقی کے فرزند دوم تھے۔ حضرت خواجہ محمد نقشبند جب حج کے لیے جانے لگے تو شاہجہاں آباد میں اورنگ زیب عالمگیر نے آپ کا استقبال کیا اور شاہی محل میں ٹھہرایا اور بڑے

تزک و احتشام سے رخصت کیا۔ وہ ان کا اس قدر معتقد تھا کہ اپنے چہیتے بیٹے شاہزادہ کام بخش کو حضرت کی صحبت میں رہنے کا مشورہ دیا اور وہ آپ کے ساتھ رہنے لگا۔ اس کا تذکرہ حضرت خواجہ محمد نقشبند" نے اپنے مکتوبات میں بھی کیا ہے۔

(انوار معصومیہ' صفحہ 125)

1099 ھ / 1687ء میں اورنگ زیب عالمگیر نے حضرت حجتہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر ابو الحسن تانا شاہ پر چڑھائی کرنے کے سلسلہ میں عرض کیا حضرت نے فرمایا کہ آج رات ہم اس بارے میں استخارہ کرتے ہیں جو کچھ حق تعالیٰ کی جانب سے ظاہر ہو گا بتا دیا جائے گا۔ دوسرے دن بادشاہ حاضر خدمت ہوا تو حضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تم کو فتح ہو گی اور مخالفین رسوا اور ذلیل ہوں گے۔

(ماثر عالمگیری ص 188 / 190 بحوالہ ایضاً)

"اورنگ زیب کو حضرت حجتہ اللہ سے اس درجہ عقیدت تھی کہ وہ ایک عام آدمی کی حیثیت سے آپ کی محفل میں حاضر ہوتا اور مریدین کی صف میں مراقبے میں شامل ہو جاتا۔

حضرت اس سے اس وقت بات چیت کرتے جب مراقبہ اور وظائف سے فارغ ہو جاتے حتیٰ کہ جب حضرت حجتہ اللہ سواری پر سوار ہوتے تو اورنگ زیب احتراماً پاپیادہ ساتھ ساتھ چلتا رہتا۔"

(روضہ القیومیہ' رکن سوم ص 111 تا 113 بحوالہ ایضاً 127)

جب کبھی حضرت خواجہ محمد نقشبند حجتہ اللہ دارالحکومت میں قیام پذیر ہوتے تو اورنگزیب عالمگیر راتوں کو تہجد کے وقت حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتا اور تنہائی میں فیض حاصل کرتا۔

(روضہ القیومہ رکن سوم ص 123 بحوالہ ایضاء ص 129)

شاہی خاندان کے تمام افراد آپ کے معتقد تھے' شاہجہاں کی بیٹی گوہر آراء آپ کی مرید اور عقیدت مند تھی اور شاہجہاں آباد میں وہی آپ کے قیام کا انتظام کرتی تھی۔

(ایضاء بحوالہ صفحہ 129)

حضرت شیخ محمد معصوم عروۃ الوثقی کے تیسرے صاجزادہ حضرت شیخ محمد عبیداللہ مروج الشریعہ (1037 ھ ' 1117 ھ) اور چوتھے صاجزادے حضرت شیخ محمد اشرف محبوب اللہ (1042 ھ تا 1150 ھ) یکے بعد دیگرے سربر آرائے مسند خانقاہ مجددیہ ہوئے۔ آپ کے پانچویں صاجزادے حضرت خواجہ سیف الدین محی السنہ 1049/1639ء تا 1096 ھ / 1685ء تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر حضرت خواجہ سیف الدین کا مرید تھا۔ آپ کو ہی حضرت عروۃ الوثقی نے اورنگ زیب کی باطنی تطہیر کے لیے شاہجہان آباد بھیجا تھا۔ ممکن ہے کہ اسی دور میں اورنگ زیب آپ سے بیعت ہوا ہو۔ آپ کی شخصیت اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ خاندان مغلیہ میں ابھی تک جو غیر اسلامی نقوش باقی تھے وہ آپ نے ختم کیے۔ آپ جب شاہی محل پہنچے تو وہاں کے

آپ کو ہندو اثرات کے تحت بنی ہوئی تصاویر نظر آئیں۔ آپ نے محل میں داخل ہونے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ جب تک یہ تصاویر نہیں ہٹائی جائیں گی میں اندر داخل نہیں ہوں گے۔ نتیجتاً وہ تصاویر ہٹالی گئیں۔

(ماثر عالمگیری صفحہ 57 بحوالہ انوار معصومیہ' صفحہ 136)

اورنگ زیب شروع سے ہی مذہبی خیالات کا حامل تو تھا ہی لیکن آپ کی صحبت اور وعظ و تربیت نے کچھ اور رنگ دکھایا اور یوں وہ ایک مثالی اسلامی حکمران بن گیا۔ یہ آپ کی ہی تبلیغ کا نتیجہ تھا کہ اس نے ہندوستان کے ساحلوں پر عیسائیوں کے شاہجہاں کے زمانے میں تعمیر کردہ قلعوں کو ختم کیا جو انہوں نے تعمیر کیے تھے۔ یہ قلعے ساحلی شہروں کے علاوہ پہاڑوں اور دشوار گزار مقامات پر بھی بنائے گئے تھے اور باقاعدہ دیہات آباد کر لیے گئے۔ اذان اور نماز پر پابندی لگا دی گئی۔ جب کوئی شخص مرجاتا تو اس کی نابالغ اولاد کو گرجا میں تربیت دی جاتی۔ جہاں پادری اسے عیسائیت کی طرف مائل کرتے۔ اس طرح انہوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کی کافی تعداد کو عیسائی بنانا شروع کر دیا۔ اورنگ زیب عالمگیر کو پتہ چلا تو اس نے ان کے مرکزی مقام گوا (جزیرہ) پر فوج کشی کا حکم دیا۔ گلشن آباد کے فوجدار معتبر خاں نے بڑی آسانی سے قلعہ فتح کیا۔

(منتخب اللباب صفحہ 356 بحوالہ ایضاً" صفحہ 124)

علاوہ ازیں اس نے امور مملکت کو جس طرح چلایا اس کا خاکہ شیخ محمد اکرام نے اپنی تصنیف میں یوں کھینچا ہے۔

(صفحہ 458 - 459)

"تخت نشین ہونے کے بعد ہی اس نے بھنگ وغیرہ کاشت کرنے کی ممانعت کر دی۔ شراب نوشی ممنوع قرار دی۔ جوا بند کر دیا۔ بدکاری کے خلاف پوری کوشش کی۔ بازاری عورتوں کو حکم دیا کہ یا تو وہ شادی کر لیں یا ملک چھوڑ دیں۔ ان احکام کی تعمیل کرانے کے لیے محتسب مقرر کیے۔ 1664ء میں اس نے ستی کی ممانعت کی اور بچوں کو بطور غلام یا خواجہ سرا بیچنے کے خلاف احکام جاری کیے۔

اس کے علاوہ اس نے خود اپنی پرہیزگاری اور سادگی سے اپنی رعایا کے لیے نیک مثال قائم کی۔ بادشاہ کے درشن کو موقوف کیا۔ اگرچہ وہ خود موسیقی کا ماہر تھا لیکن اس نے گانے والوں اور گانے والیوں کو دربار سے ہٹا دیا۔ اس کی سالگرہ پر جو اسراف ہوتا تھا اسے ترک کر دیا اور شاہجہاں کی ضیافتوں اور فضول خرچیوں کی وجہ سے رعیت پر جو ٹیکسوں کا بوجھ پڑا ہوا تھا اسے ہلکا کر دیا۔ اس نے تقریباً اسی (80) ٹیکس معاف کیے۔

وہ عالموں اور بزرگوں کی قدر کرتا۔ اس نے ملک کا انتظام شرع کے اصولوں پر قائم کیا تھا اور عدل و انصاف کا محکمہ علماء کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت اسلامی قوانین سے متعلق کوئی مستند اور جامع کتاب نہ تھی۔ اس نے تمام ملک کے قابل علماء کو جمع کر کے فتاویٰ عالمگیری کے نام سے فقہ حنفی کی ضخیم کتاب مرتب کروائی۔ جو اب تک بڑی اہم اور مستند سمجھی جاتی ہے۔

وہ خود بڑی سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ بیت المال کے پیسے کو ہاتھ نہ لگاتا تھا۔ اپنی روزی ٹوپیاں بنا کر اور قرآن شریف لکھ کر کماتا۔ اس نے 21 فروری 1707ء کو بروز جمعہ نوے سال کی عمر میں بمقام احمد نگر وفات پائی اورنگ آباد سے بارہ کوس کے فاصلے پر "روضہ خلد آباد" میں دفن ہوا۔ مرتے وقت وصیت کی تھی کہ چار روپے دو آنے جو میں نے ٹوپیاں بنا کر کمائے ہیں میرے کفن پر خرچ ہوں اور تین سو پانچ روپے جو میں نے قرآن شریف لکھ کر ہدیۃً حاصل کیے ہیں مساکین میں تقسیم کیے جائیں۔ حسب وصیت اس کی تدفین نہایت سادہ ہوئی اور اس کی قبر پر کوئی عالی شان عمارت نہیں۔

ایک کامیاب حکمران ہونے کے علاوہ وہ ایک زاہد و عبادت گزار متقی مسلمان تھا۔ وہ کابل و قندھار سے لیکر دکن تک کا حکمران ہونے کے ساتھ ساتھ اول وقت میں نماز پڑھتا تھا۔ جمعہ کی نماز جامع مسجد میں ادا کرتا تھا۔ سنن و نوافل کی پابندی کرتا تھا۔ سخت گرمی میں رمضان کے روزے رکھنے اور تراویح پڑھنے کے علاوہ عشرہ اخیر میں اعتکاف کرتا تھا۔ ہر ہفتہ' بدھ' جمعرات اور جمعہ روزہ رکھتا تھا۔ ہمیشہ باوضو رہ کر اذکار میں مصروف رہتا۔ ہر صبح تلاوت قرآن مجید کرتا۔ اس کی اس نہج پر تربیت حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کے پوتے حضرت خواجہ سیف الدین رحمتہ اللہ علیہ نے کی۔ جن کا وہ مرید تھا اور ان کی صحبت میں اکثر حاضر ہو کر ان سے باطنی استفادہ کرتا۔

(انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر صفحہ 374-375)

حضرت خواجہ سیف الدین رحمتہ اللہ علیہ نے حکمران کی تربیت کے ساتھ "عوامی اصلاحی مہم" بھی شروع کر رکھی تھی' شیخ سیف الدین سرہندی متوفی 1096 ھ کی خانقاہ (دہلی) میں طالبین کے ہجوم کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صاحب ذیل الرشحات کے بیان کے مطابق ایک ہزار چار سو آدمی دونوں وقت ان کے دستر خوان پر اپنی فرمائش اور خواہش کے مطابق کھانا کھاتے تھے۔

(ایضاً" صفحہ 344)

حضرت خواجہ سیف الدین سرہندی کی تعلیمات کا اتنا گہرا اثر اورنگ زیب پر پڑا کہ اس نے مسلم ہندوستان سے ہندوؤں کی اس تہذیبی یلغار کے خاتمہ کا منصوبہ تیار کر لیا جو وہ اکبر اور جہانگیر کے ابتدائی دور میں کر چکے تھے۔ مندروں کے انہدام سے متعلق ایک واضح پالیسی اختیار کی گئی اور ہندوؤں کے مقدس مقامات بنارس اور متھرا کے مندر بھی منہدم کر دیے گئے۔ ستی کی رسم ممنوع قرار دی گئی۔ اس نے مندروں کو گرا کر اس کی جگہ گائے کے مذبح خانے تعمیر کرائے۔

Aurangzeb thus destroyed the foundations on which akbar had built the empire ---- the acquiscence of the masses and the active support of the Rajputs.

ترجمہ : اورنگ زیب نے اس طرح وہ بنیاد تباہ کر دی جس پر اکبر نے سلطنت کی تعمیر کی تھی۔ یعنی عوام کی اطاعت اور راجپوتوں کی بھرپور حمایت۔

(اے شارٹ ہسٹری آف انڈیا' صفحہ 350)

بڑی ستم ظریفی کی بات ہے کہ اورنگ زیب نے ایک جہد مسلسل کے بعد مسلمانوں کے جس کھوئے ہوئے وقار کو بحال کیا تھا اور ان کے اندر ایک نئی روح پھونک کر ایک لازوال کارنامہ سرانجام دیا تھا اور ہندوؤں کا اثر و نفوذ ختم کر کے مغلیہ سلطنت کو حقیقی اسلامی سلطنت بنایا تھا اورنگ زیب کے بعد آنے والوں نے اس وقار کو ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔ ہندو مرہٹے ہر جگہ دندنانے لگے اور ہندوستان کی اسلامی سلطنت ایک دفعہ پھر بحران کا شکار ہو گئی لیکن اس دفعہ بحران مذہبی کے ساتھ ساتھ سیاسی بھی تھا۔ جس کا تعلق براہ راست مغلیہ سلطنت کے زوال مملکت کی حدود میں کمی اور مرکز کے وجود کی غیراثر پذیری سے تھا۔

"اورنگ زیب کے فوراً ہی بعد اس کے تینوں بیٹوں میں اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ معظم نے اپنے بھائیوں اعظم اور کام بخش کا خاتمہ کر کے خود اقتدار سنبھالا۔" "قطب الدین شاہ عالم بہادر" (1707 ۔ 1712ء) بنا۔

(تاریخ پاک و ہند صفحہ 7۔ 8 از سید ریاض احمد شاہ' بحوالہ روضہ القیومیہ)

اورنگ زیب کی وفات کے بعد خواجہ محمد زبیر شمس الدین (1093 ۔ 1152) نے ہی شاہزادہ محمد معظم (بہادر شاہ) کو تخت و تاج کی خوشخبری دی تھی۔ شاہزادہ بہادر شاہ کے دور میں سکھوں نے بھی سر اٹھایا۔ انہوں نے کافی لوٹ مار مچائی۔ سرہند کے فوجدار وزیر خاں کو شہید کیا اور سرہند پر قبضہ کر لیا۔ مساجد اور مزارت کو منہدم کیا' ادھر سکھوں کی بغاوت پھیل رہی تھی اور ادھر شہزادہ معظم بہادر شاہ بھی اسی راستے پر چل نکلا جس پر اکبر چلا تھا۔ یعنی دین میں ترمیم کرنے اور عقائد کو بگاڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ خواجہ محمد زبیر نے اپنے پند و نصائح سے اسے راہ راست پر لانے کی کوشش کی لیکن جب اس کی اصلاح کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو آپ نے اس کے لیے بددعا کی اور وہ مر گیا۔

(روضہ قیومیہ رکن چہارم صفحہ 90)

شاہ عالم کے بعد اس کے چار بیٹوں میں جنگ شروع ہوئی۔ جہاندار شاہ (1712 ۔ 1713ء) اپنے بھائیوں کی لاشوں سے گزر کر قصر شاہی تک پہنچا لیکن اس کے مقتول بھائی عظیم الشان کے بیٹے فرخ نے بغاوت کر دی۔ اس کے لیے اس نے الہ آباد کے صوبیدار سید عبداللہ اور اس کے بھائی سید حسین علی خاں کی مدد سے جہاں دار شاہ کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ آگرہ میں لڑائی ہوئی اور جہاندار شاہ کو قتل کر دیا گیا۔

(تاریخ پاک و ہند مذکورہ بالا صفحہ 7)

خاندان مغلیہ کے ساتھ خاندان مجددیہ کا برابر رابطہ جاری تھا۔ سجادگان خانقاہ مجددیہ حکمرانوں کو وعظ و نصیحت کر رہے تھے لیکن باہمی آویزش اور قتل و غارت گری شاید انہیں اس

طرف توجہ کی مہلت نہیں دے رہی تھی۔ خانقاہ مجددیہ کے سجادہ نشین اور حضرت عروۃ الوثقی کے چھٹے صاحبزادہ حضرت شیخ محمد صدیق محبوب الٰہی (1057ھ تا 1130ھ) شہنشاہ فرخ سیر کے پیر طریقت تھے۔ 1123ھ میں فرخ سیر سلطنت کا سربراہ بنا تو اس نے خانقاہ مجددیہ میں تحائف اور ہدایا بھیجے۔ 1128ھ میں فرخ سیر نے سکھوں کے خلاف کارروائی کا فیصلہ کیا اور کارروائی شروع کرنے سے پہلے حضرت خواجہ محمد زبیر سے دعائے خیر کرائی۔ آپ نے دعائے خیر کے ساتھ ساتھ سکھوں کے خلاف بھرپور تحریک کی تلقین کی۔ جس کے نتیجہ میں عبدالصمد خاں نے گورداسپور میں سکھوں کے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ بالآخر سکھوں کا گرو گوبند گرفتار ہوا جسے بعد میں بمع دو تین ہزار فوج دہلی میں قتل کر دیا گیا۔

(انوار معصومیہ' صفحہ 158)

فرخ سیر کو حکمران تو بنا دیا گیا لیکن اصل حکمرانی سید عبداللہ خاں اور حسین علی خاں کی تھی۔ لہٰذا فرخ کو قتل کر کے رفیع الدرجات جیسے دمہ کے مریض کو کٹھ پتلی حکمران بنا دیا گیا جو تین ماہ بعد چل بسا یہی حال رفیع الدولہ کا ہوا۔ اس کے بعد ان ہی سید برادران نے شاہ عالم کے پوتے روشن اختر کو محمد شاہ کے لقب سے 1748ء میں بادشاہ بنوایا جو 1759ء تک حکمران رہا۔ محمد شاہ ہی نے ان سید برادران کا خاتمہ کرایا مگر یہ عیاش حکمران اتنا نا اہل تھا کہ وہ مرکز کو مضبوط نہ رکھ سکا۔ جس کی وجہ سے سردار چن قلیچ خاں نے دکن کے صوبوں میں خودمختار ریاست قائم کر لی اور حیدر آباد کو دارالحکومت بنایا جبکہ سعادت خاں نے اودھ میں خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ علی وردی خاں نے بنگال بہار اڑیسہ میں اپنی علیحدہ حکومت قائم کر لی۔

(تاریخ پاک و ہند از سید ریاض احمد شاہ صفحہ 11 ـ 12)

جب سلطنت مغلیہ روبہ زوال تھی تب بھی خانقاہ مجددیہ نے اپنا کردار ادا کیا چونکہ حکمرانوں سے پیران طریقت کا بلاواسطہ رابطہ قائم تھا اس لیے وعظ و نصیحت کا سلسلہ جاری رہا لیکن مغلیہ خاندان کے افراد اب عیش و عشرت اور لہو و لعب میں پڑ چکے تھے اس لیے ان نصائح کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا اور وہ دن بدن کمزور ہوتے گئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت جو پہلے بنگال اور مخصوص علاقہ جات تک محدود تھی اس کی حدود بڑھنے لگیں۔ اس صورتحال کو دیکھ کر خانقاہ مجددیہ کے سجادہ نشین خواجہ محمد زبیر نے عیاش حکمرانوں سے کہا کہ:

"برے کاموں باز آ جاؤ ورنہ تم پر ایسی بلا نازل ہو گی جو پہلے تم پر نازل نہ ہوئی ہو گی۔"

(انوار معصومیہ صفحہ 128)

لیکن حکمران عیاشیوں اور باہمی جھگڑوں میں الجھے رہے۔ ادھر اندرون خانہ اقتدار کی کشمکش جاری تھی اور ادھر ہندو مرہٹے اپنی خونریز کارروائیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ دراصل جو علاقے خودمختار ہوئے وہ بھی انہی کی کارروائیوں کے نتیجہ میں ہوئے کیونکہ مرہٹوں نے جنوبی ہند کے کچھ علاقہ جات پر قبضہ کر لیا تھا اس حد فاصل کی وجہ سے مرکز اور جنوب کے صوبوں کا رابطہ

نہ رہ سکا۔

"جنوبی ہند میں آزاد مسلم ریاستیں بن گئیں جنہیں مرہٹوں نے شمال کے مسلمانوں سے علیحدہ کر دیا اور انہوں نے (مرہٹوں نے) ملک کے مرکز گجرات سے اڑیسہ تک قبضہ میں کر لیا اور اپنا اثر دہلی اور آگرہ کے مضافات تک بڑھا لیا۔"

(اے شارٹ ہسٹری آف انڈیا' صفحہ 265)

یہ ہندوؤں کے عزائم کی ایک واضح جھلک تھی وہ مغلیہ سلطنت کو کمزور ہوتا دیکھ کر اس پر قبضہ کے خواب دیکھ رہے تھے اور ہندومت کے نفاذ کے جلد از جلد خواہاں تھے۔

نادر شاہ نے دہلی پر حملے کر کے رہی سہی کسر پوری کر دی پھر حکمران یکے بعد دیگرے نا اہل ثابت ہو رہے تھے۔ شاہ عالم ثانی (1759ء تا 1806ء) کے دور میں انگریزوں نے جو کہ بنگال پر قبضہ کر چکے تھے دہلی' آگرہ اور الہ آباد پر بھی قبضہ کر لیا اور برائے نام بادشاہت رہ گئی۔ اس کے بعد اکبر شاہ ثانی 1806ء تا 1838ء) بھی اپنے باپ کی طرح انگریز کا وظیفہ خوار تھا۔

(تاریخ پاک و ہند' از سید ریاض احمد شاہ' صفحہ 17)

اکبر شاہ ثانی کا بیٹا سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ ثانی اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس نے اپنے بڑھاپے میں بھی انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی کی قیادت کی لیکن بدقسمتی سے یہ جیتی ہوئی جنگ شکست میں بدل گئی اور اس طرح مسلم ہندوستان سے مسلمانوں کی حکومت کا باب ختم ہو گیا۔

چار اہم شخصیات : اس مرحلہ پر اٹھارویں صدی عیسوی کی ان چار اہم شخصیات کا مختصر تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے جنہوں نے مسلمانوں کے اقتدار کی بحالی کی بھرپور کوشش کی اور حتیٰ الوسع اسلامی حکمرانی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی مدہم لو کو ایک بار پھر جلا بخشنے کی کوشش کی۔ اپنی سعی میں کسی حد تک یہ شخصیات کامیاب بھی ہوئیں لیکن عیش و عشرت کی وجہ سے تباہی و بربادی برصغیر کے مسلمانوں کا مقدر بن چکی تھی۔ یہ چار شخصیات جنہوں نے ڈوبتے ہوئے اسلامی اقتدار کو سہارا دینے کی کوشش کی۔ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ' حیدر علی' ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ کی تھیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنے دور 1703ء سے 1763ء میں مسلمانوں کے فکری انتشار کو دور کرنے کی کوشش کی۔ جبکہ حیدر علی' ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ نے میدان کارزار میں عملی جہاد کے ذریعہ بیرونی طاقتوں کے اقتدار کے خاتمہ کے لیے جدوجہد کی۔

شیخ محمد اکرام کے الفاظ میں :

"شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ قومی زندگی کے ایک بڑے نازک دور میں پیدا ہوئے۔ ان کا ظہور اس زمانے میں ہوا جب اسلامی حکومت کی بنیادیں اکھڑ رہی تھیں اور اس ملک میں صدیوں تک جاہ و جلال سے حکومت کرنے کے بعد مسلمان اس قدر آرام طلب اور کمزور ہو گئے تھے کہ وہ مرہٹوں اور سکھوں کے مقابلے میں تساہل اختیار کرتے تھے۔ شاہ صاحب کو اس

صورتحال کا افسوس ہوتا ہو گا لیکن جو شخص عملی کام کرنا چاہے اسے اپنا دائرہ عمل محدود اور معین کرنا پڑتا ہے۔ شاہ صاحب اپنے آپ کو اس امر کے لیے موزوں نہیں سمجھتے تھے کہ وہ عملی زندگی میں دخل انداز ہو کر واقعات کو روکیں لیکن جس کام کے لیے وہ موزوں تھے اور جو کچھ کم ضروری نہ تھا (یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت باطنیہ) اس کے لیے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ وہ ان عیوب اور کوتاہیوں سے پوری طرح واقف تھے جو مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں گھر کر گئی تھیں اور جن کی وجہ سے انہیں یہ روز بد دیکھنا نصیب ہو رہا تھا۔ شاہ صاحب نے انہیں پوری طرح بے نقاب کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کا ازالہ ہو جائے۔"

(رود کوثر صفحہ 585)

یہاں شیخ محمد اکرام کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ وہ عملی کام کے لیے اپنے آپ کو موزوں نہیں سمجھتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے عملی جدوجہد کی تاکہ مسلمان اپنا اقتدار بحال کر سکیں اور اس کی واضح مثال احمد شاہ ابدالی کو آپ کی طرف سے دعوت ہے جس نے ہندوستان میں آ کر مرہٹوں کی کمر توڑ دی۔ جن کی یورشوں سے ہندوستان کے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو چکا تھا۔

"نواب نجیب الدولہ شاہ ولی اللہ کے خاص عقیدت مندوں میں سے تھے اور شاہ صاحب ہی کے مشورہ پر انہوں نے اور ان کے رفقاء نے احمد شاہ ابدالی کو بلایا تھا۔ اس طرح شاہ صاحب نے دہلی کی حکومت کے اشتراک سے اپنے پروگرام کا ایک حصہ مکمل کر لیا۔ چنانچہ پانی پت میں احمد شاہ ابدالی کی کامیابی نے دہلی کے سیاسی افق کو مرہٹوں کے بڑھتے ہوئے خطرات سے محفوظ کر دیا۔ اس واقعہ کے دو برس بعد 1174ھ یعنی 1763ء میں امام ولی اللہ نے وفات پائی۔

(شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک صفحہ 60 از عبیداللہ سندھی)

حیدر علی اور ٹیپو سلطان دونوں باپ بیٹا وہ بہادر جرنیل ہیں جنہوں نے عزم و استقامت کے ساتھ بیرونی طاقتوں کا مقابلہ کیا جو مسلم ہندوستان پر اپنے قدم جما رہی تھیں۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے برسرپیکار تھے جو تاجر کی حیثیت سے یہاں آئے تھے اور اب مسلمانوں کا زوال دیکھ کر مسلم ہند پر حکمرانی کے منصوبے بنا رہے تھے اور مختلف علاقوں پر قبضہ جما رہے تھے۔

اگرچہ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا حلقہ جدوجہد ایک ریاست یعنی میسور تک محدود تھا لیکن انہوں نے انگریزوں کے مقابلہ میں علم جہاد بلند کر کے مسلمانان برصغیر کی تاریخ میں درخشندہ روایات قائم کیں۔

"حیدر علی نے انگریزوں کو وہ سبق دیا جسے وہ آج تک نہیں بھلا سکے۔ بنگلور پر قبضہ کے آٹھ دن بعد حیدر علی نے اپنے لڑکے ٹیپو سلطان کی مدد سے انگریزوں کو ناک چنے چبوا دیے۔

پوری انگریزی فوج گرفتار کر لی گئی۔ جس میں ایک جنرل' 146 اعلیٰ افسر' 540 دیگر فوجی عہدے دار اور چھ ہزار سے زائد سپاہی شامل تھے۔ ان کا تمام اسلحہ اور دیگر سازوسامان پر قبضہ کر لیا گیا۔

(تحریک آزادی صفحہ 133)

حیدر علی (82 - 1717) کی زندگی ایک مجاہد کی زندگی تھی جو اس نے ہندو اور انگریز کے خلاف لڑتے ہوئے گزار دی۔ اسے اسی خطرہ کا احساس ہو گیا تھا کہ انگریز ہندو کی سازش کی وجہ سے مسلم ہند پر برسر اقتدار آ جائے گا۔ اس لیے اس نے اپنی زندگی کا مقصد انگریز کے خلاف جہاد بنا لیا۔ اسے جب بھی آرام کا مشورہ دیا گیا اس نے جواب دیا۔

"مسلمان اور مسلمان کی سرزمین کفار کے ہاتھوں خطرہ میں ہے۔ میں نے آرام کیا تو خدا کو کیا جواب دوں گا۔"

(ایضاً صفحہ 134)

اس کے بہادر بیٹے فتح علی ٹیپو سلطان نے بھی اس کے نقش قدم پر چل کر اپنی زندگی مسلمانوں کے اقتدار کی بحالی کے لیے وقف کر دی۔ اسے اس بات کا شدید رنج تھا کہ بیرونی حملہ آور آگے بڑھتے جا رہے ہیں اور مسلمان انتشار کا شکار ہیں۔ اس نے نظام علی خاں نظام الملک کو ایک خط میں لکھا:

"مسلمانوں کے باہمی نفاق کا فائدہ اٹھا کر مرہٹے اور انگریز ملک پر حاوی ہو چکے ہیں' اگر مسلمان اب بھی اشتراک عمل کر لیں تو ان کی بگڑی بن سکتی ہے ورنہ نا اتفاقی حیدر آباد اور میسور دونوں اسلامی سلطنتوں کا خاتمہ کر دے گی۔ مصلحت کا تقاضا ہے کہ دونوں سلطنتیں انگریزوں اور دیگر اسلام دشمن عناصر کے مقابلہ میں متحد ہو کر ڈٹ جائیں۔"

(تاریخ پاک و ہند صفحہ 425 - 426' از ایم اے قدوس و سعید اطہر)

لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ 5 مئی 1799ء کو جب اس مجاہد کو سپرد خاک کیا گیا تو گویا شجاعت و عزم کے پیکر کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا گیا۔

اس سے قبل بنگال میں نواب سراج الدولہ نے انگریزوں کے خلاف جو جنگیں لڑیں وہ بھی ہماری تاریخ کا روشن حصہ ہیں لیکن اس سے غیروں کی بجائے اپنوں نے بے وفائی کی اور بالآخر 1757ء میں اسے شہید کر دیا گیا۔

ہم اس حقیقت سے پہلو تہی نہیں کر سکتے کہ ان شخصیات کے مسلمان قوم پر بہت احسانات ہیں کہ انہوں نے زوال کے وقت بھی مسلم تشخص کے وقار کو بحال رکھا اور مسلمان قوم کی خودداری اور شجاعت کی روایات کو مٹنے نہیں دیا۔

اس طرح امت مسلمہ کو احساس دلاتے رہے کہ وہ خطرات میں گھر چکے ہیں اسی لیے اپنے آپ کو بچانے کے لیے میدان عمل میں آ جائیں لیکن افسوس کہ ان کی آواز پر زیادہ توجہ نہ دی گئی۔

(بحوالہ ماہنامہ نور اسلام شرق پور 'حضرت مجدد الف ثانی نمبر جلد سوم مقالہ از پیرزادہ سردار علی قادری بی اے' ایل ایل بی' صفحہ 106 تا 127' مدیر اعلیٰ صاحبزادہ میاں جمیل احمد شرقپوری)

1۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کی تحریک

حالات زندگی : آپ 4 شوال المکرم 1114 ھ (10 فروری 1703ء) کو بوقت طلوع آفتاب موضع پھلت ضلع مظفر نگر (یو۔ پی) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم کا سلسلہ نسب 29 واسطوں سے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ جبکہ والدہ محترمہ کا سلسلہ نسب حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ملتا ہے۔

(تفہیمات الہیہ صفحہ 154)

آپ کے والد بزرگوار تصوف میں نقشبندی بزرگ آدم بنوری سے صاحب خلافت تھے اور آپ کے زیر اہتمام دینی مدرسہ رحیمیہ بھی چل رہا تھا۔ شاہ ولی اللہ کی پیدائش سے پہلے شاہ عبدالرحیم کو اشارہ ہوا تھا کہ اپنے ہونے والے بیٹے کا نام قطب الدین احمد رکھنا۔ چنانچہ ولادت کے فوراً بعد شاہ ولی اللہ کا پہلا نام قطب الدین احمد ہی رکھا گیا لیکن ولی اللہ کو بھی اس نام کا جزو بنا دیا گیا جبکہ تاریخی نام آپ کا عظیم الدین رکھا گیا لیکن ان اسماء کی بجائے آپ نے شاہ ولی اللہ کے نام سے شہرت دوام پائی۔

آپ چار سال کی عمر میں مکتب میں بٹھا دیئے گئے۔ ساتویں سال والد محترم نے نماز' روزہ کی پابندی کا حکم دیا۔ اسی سال آپ نے قرآن حکیم حفظ کر لیا اور فارسی و عربی کی تعلیم بھی حاصل کرنے لگے۔ دسویں سال میں تھے کہ ملا جامی کی شرح پڑھ لی۔ چودہ برس کی عمر میں آپ کی پہلی شادی کر دی گئی۔ شادی کے ایک سال بعد اپنے والد محترم کے ہاتھ پر بیعت کی اور سلسلہ نقشبندیہ کے اذکار و اشغال میں مشغول ہو گئے۔ قرآن مجید کو سادہ ترجمہ کے ساتھ والد صاحب سے پڑھا۔ رفتہ رفتہ زمانے کے مروجہ علوم عربیہ' تفسیر' حدیث' فقہ' اصول فقہ' ادب' کلام' معانی' منطق' فلسفہ' طب اور تصوف وغیرہ میں مہارت حاصل کرنے کے بعد باقاعدہ سند اور تدریس کی اجازت حاصل کر لی۔ صحاح ستہ کی سند حاجی شیخ محمد افضل سے حاصل کی۔ تقریباً سترہ سال کے تھے کہ آپ کے والد صاحب نے 1131 ھ میں وفات پائی۔ اس کے بعد دہلی میں بارہ سال تک تدریس میں منہمک رہے۔ 1143 ھ میں حج کے لئے گئے اور ادائے حج کے بعد مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں چودہ ماہ تک قیام کیا اور حرمین کے مشائخ سے حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ اس ضمن میں آپ کے استاد شیخ ابوطاہر مدنی' شیخ تاج الدین حنفی' شیخ وفد اللہ اور شیخ عبداللہ بن سالم البصری تھے۔ اسی قیام کے دوران آپ کو جو عارفانہ مشاہدات اور فیوضات محمدی حاصل ہوئے ان کو آپ نے حضور علیہ السلام کی اجازت سے "فیوض الحرمین" کے نام سے قلمبند

کیا اور اس کی عام اشاعت کی گئی۔ آپ رجب 1145 ھ میں واپس دہلی آئے اور اپنے والد محترم کی درس گاہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہ درس گاہ (مدرسہ رحیمیہ) کوٹلہ فیروز شاہ میں تھی۔ اب اس کا انتظام اس طرح گیا کہ ہر مضمون کی تدریس کے لئے باکمال اساتذہ رکھے گئے اور خود وہ اس مدرسہ کے سربراہ تھے۔ طالب علموں کی تعداد گنجائش سے بڑھی تو محمد شاہ بادشاہ نے کوچہ چیلاں میں ایک وسیع حویلی شاہ صاحب کو درس کے لئے پیش کر دی۔ اسی درس و تدریس میں مصروف رہ کر آپ نے 29 محرم 1176 ھ (20 اگست 1762ء) کو بوقت ظہر داعی اجل کو لبیک کہا۔

شادی اور اولاد : شاہ ولی اللہ کی پہلی شادی بعمر چودہ سال آپ کی ماموں زاد سے ہوئی جبکہ دوسری شادی 1157ھ میں مولوی سید حامد سونی پتی کی صاحبزادی سے ہوئی۔ دوسری اہلیہ کے بطن سے چار بیٹے پیدا ہوئے جو علم اور شہرت کے فلک پر چاند بن کر چمکے۔ یعنی شاہ عبدالعزیز (پ۔ 1159) شاہ رفیع الدین' شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی ان چاروں بیٹوں نے شاہ ولی اللہ سے ہی علوم کی تکمیل کی اور سند فراغت حاصل کی (ملفوظات شاہ عبدالعزیز صفحہ 80) شاہ صاحب ہندی نژاد ہونے کے باوجود عربی اہل زبان کی طرح نہایت شستہ لکھتے اور دقیق علمی مباحث کو شگفتہ طریق سے بیان کر دیتے تھے۔ فارسی میں بھی خوب دسترس پائی تھی۔ عربی اور فارسی شاعری میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ آپ کا لکھا ہوا قصیدہ "اطیب النغم" عربی میں ہے اور فارسی میں شعر گوئی کا ذکر کلمات طیبات کے آخر میں ہے۔

مختلف کارنامے :

1۔ آپ نے مسلمانوں کے مختلف طبقات میں علمی اور فقہی اختلافات اور افکار میں تطابق پیدا کر کے قومی اور ملی یکجہتی کو فروغ دینے کی سعی کی اور اختلافی مسائل میں الجھے رہنے کی بجائے انہیں متفقہ مسائل کی طرف مائل کیا۔ فرقہ وارانہ نزاعات میں غلو و تعصب کو مٹانے کی کوشش کی۔
2۔ یونانی فلسفہ کی بجائے ایمانی فلسفہ (دانش ایمانی) کو رواج دیا۔
3۔ تعلیمی نصاب کے پرانے ڈھانچے میں ترمیم کی اور اسے عقلی موشگافیوں (بے ضرورت معقولات اور اخلاقیات کی نظری الجھنوں) سے پاک کر دیا۔
4۔ قرآن حکیم کو بامعنی پڑھنے پر زور دیا۔ اس لئے آپ نے قرآن حکیم کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا اور آپ کے بیٹوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے قرآن کے اردو میں تراجم کئے۔
5۔ علم حدیث کی تعلیم و تدریس پر زور دیا۔
6۔ بادشاہوں' حاکموں' امراء اور وزراء' سپہ سالاروں' حکومتی اور فوجی عہدہ داروں' علماء اور صوفیاء اور عوام کے حالات کا جائزہ لے کر ان میں موجود غلط رویوں کی مذمت کی

اور اصلاح احوال پر زور دیا اور ان کے بھیانک نتائج سے آگاہ کیا۔

7۔ غلط عقیدہ اور عمل کی خرابیاں واضح کیں۔

8۔ غربت اور امارت کے درمیان اقتصادی تفاوت رفع کرنے کی کوشش کی اور معاشی مسائل کا حل پیش کیا۔

9۔ سیاسی احوال اور طوائف الملوکی کی اصلاح کر کے اسلامی حکومت کے غلبہ کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں مرہٹوں کی سرکوبی کے لئے احمد شاہ ابدالی کو نامہ لکھ کر بلایا۔

تصانیف : آپ کی تصانیف' تقریباً' ہر موضوع پر موجود ہیں۔ علم حدیث میں :

1۔ تفسیر فتح الرحمٰن بترجمہ القرآن پیش کی۔ جس میں قرآن حکیم کا فارسی ترجمہ اور اس کے ساتھ ایک جامع مقدمہ ہے اور تفسیر بھی۔۔۔ یہ ترجمہ آئندہ ترجموں کے لئے بنیاد بنا۔

2۔ فوز الکبیر فی اصول التفسیر فارسی میں مختصر مگر پرمغز رسالہ ہے جو اصول تفسیر میں ہے۔ اس کا عربی ترجمہ 1285 ھ میں قاہرہ سے شائع ہوا۔

3۔ فتح الخبیر (عربی) فوز الکبیر کا ایک حصہ ہے اس میں قرآن سے مشکل الفاظ کی تشریح ہے۔

4۔ تاویل الاحادیث فی رموز قصص انبیاء والمرسلین۔ یہ قرآنی قصص پر اچھوتا تبصرہ ہے۔ جس میں لطائف و نکات کے ساتھ اصول شرعیہ کا بیان بھی ہے۔ نیز بعض بلند پایہ علمی اور فقہی اشارات بھی ہیں۔ جسے شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد (پاکستان) نے شائع کیا اور اس کا انگریزی ترجمہ جی این جلبانی نے کیا جو لاہور سے 1973ء میں شائع ہوا۔

6-5۔ المصفٰی اور المسوی (عربی) یہ یحییٰ المصمودی کے مرتب کردہ نسخہ موطا امام مالک کی ترتیب نو ہے۔ جس میں بعض نئے ابواب بھی قائم کئے ہیں اور قرآنی آیات سے استدلال کر کے موضوع کو تقویت دی ہے۔ فارسی میں اس کا جامع مقدمہ لکھا کیونکہ شاہ صاحب موطا امام مالک کو حدیث کی اصل قرار دیتے ہیں۔

7۔ حجتہ اللہ البالغہ (عربی) یہ کتاب فقہ' اسرار شریعت' تصوف' احادیث' عقائد' عبادات' معاملات و تدبیر و منزل' مملکت' اخلاق و معاشرت اور تمدن و معیشت کے مباحث پر مشتمل ہے۔ پہلی بار 1286 ھ میں بریلی سے شائع ہوئی پھر مختلف بلاد عرب اور برصغیر سے متعدد بار شائع کی گئی۔ اس کے متعدد اردو تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔

8۔ در ثمین (حضور علیہ السلام کے مبشرات (رویا) کے بارے میں ہے جو عربی میں ہے) اسی میں آپ کے بزرگوں سے متعلقہ خوابوں کا بیان ہے۔ جو ان کو یا اور لوگوں کو ان کے بارے میں آئے۔

اصول فقہ : میں الانصاف (یہ فقہ میں اختلاف کے اسباب پر ہے۔ عربی میں ہے) اس طرح عقید الجید عربی) بھی فقہی مسائل اور تقلید کے جواز میں ہے۔

[illegible] و کلام میں ازالہ الخفا (فارسی) ہے جو خلفائے راشدین کی خلافت کے اثبات پر

ہے۔ اس میں اسلام کے عمرانی اصولوں اور نظریہ سیاست پر بھی سیر حاصل بحث ملتی ہے۔ یہ 1286 ھ میں بریلی سے شائع ہوئی تھی۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی افضلیت پر فارسی میں قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین لکھی۔ خبر میں عقلاً" اور نقلاً" بحث ملتی ہے۔ توحید پر آپ نے تحفۃ الموحدین (فارسی) لکھی جبکہ اسلام کے بنیادی عقائد پر عربی میں "حسن العقیدہ" تحریر کی۔

تصوف : اس موضوع پر "الطاف القدس" فارسی میں لکھی جس میں تصوف کے بنیادی مسائل کی تشریح کی گئی ہے۔ اس کا انگریزی میں ترجمہ از جی این جلبانی 1982ء میں لندن سے چھپا۔

ہمعات : یہ کتاب فارسی میں ہے۔ تصوف اور اہل تصوف کے کوائف و احوال اور اشغال اور ان پر بڑی اہم مفید' مستند اور ضخیم تصنیف ہے۔ یہ لاہور سے 1944ء میں چھپ چکی ہے۔

سطحات : یہ فارسی میں ہے۔ یہ 24 صفحات کا ننھا سا رسالہ فلسفیانہ اور متصوفانہ اصطلاحات اور فلسفہ وحدت الوجود کی تعبیرات پر مشتمل ہے اور اس میں "ربط الحادث بالقدیم" کے معاملے کو حل کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس میں طبی اصطلاحات اور حکمت کے مباحث بھی شامل ہیں۔ بعض جگہ ذاتی تحقیق اور فلسفیوں اور متکلمین کی آراء سے اختلاف بھی کیا ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی از جی این جلبانی 1970ء میں لاہور سے طبع ہو چکا ہے۔

القول الجمیل (عربی) : اس میں بیعت کا جواز' مرشد و مرید کے لئے شرائط اور طریقہ تعلیم و تربیت اور بعض مباحث کے ساتھ آخر میں سلسلہ قادریہ' چشتیہ اور نقشبندیہ کے اوراد و اشغال بیان کئے ہیں۔

الانتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ (فارسی) : یہ تاریخ سلاسل تصوف اور مختصر تذکرہ تعلیمات و تصوف پر مشتمل ہے۔ یہ 1311 ھ میں اردو ترجمہ کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔

فیوض الحرمین (عربی) : آپ کے روحانی مشاہدات اور تجربات پر مشتمل ہے جو آپ کو 1143ھ میں حرمین شریفین میں قیام کے دوران اللہ تعالیٰ اور رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص رحمت اور فیضان سے مشاہدہ کرائے گئے اس کا سلیس اور آسان ترجمہ محمد سرور نے بعنوان "مشاہدات و معارف" شائع کرایا۔ ہر پڑھنے والے کو اس کی سمجھ آتی ہے۔ اگر کوئی دل کی آنکھیں بند کر کے پڑھے تو واقعی کچھ پلے نہیں پڑے گا۔

ہوامع : یہ فارسی میں ہے اور دعائے حزب البحر کی شرح پر مشتمل ہے۔ یہ دہلی سے 1350 ھ میں شائع ہوئی۔

الخیرا لکثیر (عربی) : یہ کتاب فلسفہ' طبیعیات' تصوف اور حکمت الاشراق کے مباحث پر ہے۔ جس میں اللہ کی ذات' اسماء حسنی کی حقیقت اور حقیقت وحی کی تشریح ہے۔ نیز زمان و مکان' عرش و کرسی و افلاک' عالم مثال' نبوت اور عالم آخرت وغیرہ پر دلچسپ مباحث ہیں۔ اس کا انگریزی ترجمہ از جی۔ این جلبانی۔۔۔۔۔ لاہور سے 1974ء میں شائع ہوا۔

البدور البازغہ (عربی) : پہلی بار یہ 1354 ھ میں سورت (ڈابھیل) سے چھپی۔ اسرار شریعت' طبیعیات' اخلاقیات اور ارتفاقات' عمرانی' معاشرتی احکام آداب' خلافت الہیہ کا تصور اور اسلامی نظام حکومت پر مباحث اس میں شامل ہیں۔ اثبات نبوت' اقسام وحی' انبیاء علیہم السلام کے درجات وغیرہ بھی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ نیز ارکان اربعہ (نماز' روزہ' زکوۃ اور حج) کے اسرار و مقاصد شریعت پر بھی بحث ہے۔

لمعات : یہ فارسی میں ہے اس کا موضوع تصوف ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ از جی این جلبانی لاہور سے 1970ء میں شائع ہو چکا ہے۔

شفاء القلوب : فارسی میں ہے اور تصوف پر ہے۔ غالباً ابھی چھپ نہیں سکی۔

المقدمہ السنیہ : یہ عربی میں ہے۔ جو حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کے ایک رسالہ کا ترجمہ ہے جو آپ نے اپنے استاد شیخ ابوطاہر کی فرمائش پر 1144ھ میں حرمین شریفین میں کیا تھا۔ یہ دہلی سے طبع ہو چکا ہے۔

طبع الودود لمعرفہ الجنود (عربی) : یہ بھی تصوف اور اخلاقیات پر ہے۔

عوارف : یہ عربی میں ہے اور تصوف کے موضوع پر ہے۔

اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم : یہ آپ کے عربی میں نعتیہ قصائد کا مجموعہ ہے جو 1308 ھ میں دہلی سے شائع ہوا۔

سرور المخزون فی سیرت النبی المامون : یہ فارسی میں ہے جو مرزا مظہر جان جاناں رحمتہ اللہ علیہ کی فرمائش پر لکھی گئی کتاب "نور العیون" (سیرت النبی) کا خلاصہ ہے جسے "ابن سید الناس" نے تحریر کیا تھا۔ شاہ صاحب نے اس کتاب کے لازمی حصص کو خلاصہ کی صورت میں ڈھال دیا تھا۔ اس کے متعدد اردو تراجم شائع ہو چکے ہیں۔

انفاس العارفین : یہ درج ذیل رسائل پر مشتمل ہے۔

1۔ بوارق الولایہ۔ (فارسی) جو آپ کے والد شاہ عبدالرحیم کے حالات پر مشتمل ہے جس میں ان کے احوال و معارف بھی آ گئے ہیں۔
2۔ شوارق المعرفہ۔ یہ آپ کے چچا ابوالرضا محمد کے احوال و معارف پر ہے۔
3۔ الامداد فی ماثر الاجداد (شاہ ولی اللہ کے خاندانی حالات)

4۔ النبذۃ الابریزیہ فی لطیفہ العزیزیہ (شاہ ولی اللہ کے جد اعلیٰ شیخ عبدالعزیز دہلوی کے حالات)
5۔ العطیہ الصمدیہ (آپ کے نانا شیخ محمد پھلتی (ضلع مظفر نگر) کے حالات)
6۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین یہ رسالہ شاہ صاحب کے مکی مدنی اساتذہ اور شیوخ کے حالات پر مشتمل ہے۔
7۔ الجزء اللطیف یہ شاہ ولی کی خود نوشت سوانح العمری ہے۔ اس کا عربی ترجمہ مکتبہ سلفیہ لاہور سے الگ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اسی طرح ان رسائل میں سے بعض الگ بھی شائع ہو چکے ہیں۔ انفاس العارفین کا اردو ترجمہ سید محمد فاروق قادری نے لاہور سے شائع کیا۔ ازیں پیشتر اس کا ترجمہ دہلی سے بھی شائع ہوا تھا۔ جسے حافظ محمد بخش دہلوی نے کیا۔

تفہیمات الہیہ (دو جلدیں) : یہ عربی اور فارسی میں ہے۔ جو مصنف کے قلبی واردات اور وجدانی مضامین پر مشتمل ہے۔ کتاب کا مفید ترین حصہ وہ ہے جس میں مسلمانوں کے مختلف طبقات کو مخاطب کیا گیا ہے۔ یہ پہلی بار 1355ھ میں مجلس علمی ۔ ڈابھیل (سورت۔ بھارت) سے شائع کی تھی۔

مکتوب مدنی : شاہ ولی اللہ کے بہت سے مکتوبات مختلف ناموں سے چھپ بھی چکے ہیں اور بعض ابھی غیر مطبوعہ بھی ہیں۔ مکتوب مدنی' عربی میں ہے۔ جو تفہیمات الہیہ کی دوسری جلد میں بھی شامل ہے اور اکیس صفحات پر مشتمل ہے۔ یہی مکتوب "فیصلہ وحدت الوجود والشہود) کے نام سے الگ بھی طبع کیا گیا۔

وفات : شاہ ولی اللہ کا وصال 29 محرم 1176ھ (20 اگست 1763ء) بوقت ظہر ہوا اور دہلی میں دفن کئے گئے۔ تاریخ وفات "اوبود امام اعظم دین" سے نکلتی ہے۔

آپ کے سیاسی مکتوبات جو کہ فارسی میں ہیں۔ ان کا ترجمہ خلیق احمد نظامی نے کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ کی تصانیف کی تعداد حافظ ابراہیم سیالکوٹی نے اپنی کتاب تاریخ اہل حدیث میں دو سو سے زیادہ بتائی ہے۔ لیکن ڈاکٹر مظہر اللہ بقا نے اپنی کتاب "اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ" میں کافی چھان پھٹک کے بعد آپ کی 73 تصانیف کی فہرست دی ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اپنے زمانے میں تصوف' روحانیت اور شریعت و طریقت اور فقہ و حدیث میں کمال رکھتے تھے۔ آپ کی نظر میں مسلمان فرقوں کی فروعات کی زیادہ اہمیت نہ تھی بلکہ آپ نے ان میں تطبیق اور ہم آہنگی کی پوری کوشش کی تاکہ امت مسلمہ یکجہتی کے ساتھ عالم میں اپنا کردار ادا کرے۔

شاہ ولی اللہ کا دور اور ملکی حالات : آپ کے دور میں مغلوں کی سلطنت انحطاط کا شکار تھی اور زوال کے سائے گھنے ہو رہے تھے۔ ہر طرف افراتفری اور انتشار کی فضا تھی۔ مرکزی حکومت کی چولیں ڈھیلی ہو چکی تھیں۔ نظم و نسق کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اخلاقی اقدار کا

جنازہ نکل چکا تھا۔ فتنوں اور بغاوتوں نے جڑ پکڑ لی تھی اور ان کی بیخ کنی کرنے والی قوتیں ماند پڑ چکی تھیں۔

عیش و عشرت اور زن پرستی نے اخلاقیات کا دامن داغ داغ کر دیا تھا۔ حکومت کے کرتا دھرتا گروہ بندیوں اور سازشوں کے ذریعے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں مصروف تھے۔ وہ نہ صرف دینی اور اصولی حدیں عبور کر چکے تھے بلکہ ملک و ملت کے دشمنوں سے مل کر ساز باز کرنا بھی ان کے لئے عار نہ تھا۔ زندگی اور ملکی حالات کو راہ راست پر لانے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت تھی۔

1۔ مادی قوت اور حسن انتظام کے بل پر اصلاحی اقدامات اور ان کی تکمیل۔

2۔ روحانی قوت اور اخلاق عالیہ کی بالا دستی کے ذریعے باطل کی بیخ کنی۔

شاہ ولی اللہ کے پاس دوسری قوت موجود تھی۔ آپ کی تالیف فیوض الحرمین کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل سے باطنی استعداد سے نوازا تھا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی آپ کو خصوصی فیض سے مشرف فرمایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے جو کتابیں لکھیں وہ ایک عام انسان کے بس کی بات نہیں تھی کیونکہ ان میں سے ہر کتاب ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنے علمی تبحر اور صحیح ترین فکر و دانش کے بل پر حالات کو مسلمانوں کے حق میں ڈھالنے کی کوشش کی۔

ملکی صورت حال شاہ ولی اللہ کے سامنے تھی جس سے آپ نے یہ نتیجہ نکالا:

1۔ مسلمانوں اور اسلامی حکومت کا زوال اسلام کے ساتھ لوگوں وابستگی میں نقص کی نشاندہی کرتا ہے کیونکہ مسلمانوں نے ہر سطح پر اسلامی اصولوں کی پیروی چھوڑ دی تھی اور لوگ لہو و لعب ور تعیش پرستی کو ہی زندگی کی معراج سمجھنے لگے تھے۔

2۔ بھگتی کی تحریکوں نے بھی مسلمانوں سے اسلام کی حقانیت اوجھل کر دی تھی اور دانشور طبقہ رواداری کی آڑ میں حمیت اور اسلام کے ساتھ تمسک کو ثانوی حیثیت دینے لگا تھا۔ اگرچہ اس کی ابتداء دراشکوہ کے عہد میں زوروں پر تھی۔ لیکن عالمگیر کی اسلام پسندی نے اسے سہارا جو دیا تو وہ عالمگیر کی وفات کے بعد قائم نہ رہ سکا اور مسلمان من حیث القوم مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور معاشرتی انتشار میں مبتلا ہو گئے۔

شاہ ولی اللہ اور سیاسی حالات : شاہ ولی اللہ نے سیاسی زوال اور اسلامی حکومت کی بے بسی اور ناقدری کو آنکھوں سے دیکھا۔ امراء کی باہمی چپقلش اور ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوششیں تباہی کا پیش خیمہ تھیں۔ غیر مسلم طاقتیں یعنی مرہٹے جاٹ اور سکھ طاقت پکڑ رہے تھے۔ عالمی سطح پر جہاد بھی شاہ صاحب کا مطمع نظر تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سب سے پہلے شاہ ولی اللہ نے وزیر الملک آصف جاہ کو خط لکھا اور اصلاح کی کوشش کی لیکن پانی شاید سر سے گزر چکا تھا اس لئے آصف جاہ نے کچھ نہ کیا۔ پھر وہ احمد شاہ ابدالی کی طرف امیدیں لگا بیٹھے اور مرہٹوں کا زور توڑنے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے اور مرہٹوں کی کمر ٹوٹ گئی۔

ایرانی اور تورانی امراء کی چپقلشوں نے رنگ دکھایا تو شاہ ولی اللہ نے دونوں مکاتب میں بعد پیدا کرنے والی باتوں کا تجزیہ اس انداز میں کیا کہ دونوں میں اختلاف کم سے کم تر رہ جائے اور وہ متفقہ معاملات کو قوت کے ساتھ پکڑ لیں۔

شاہ ولی اللہ نے قرآن کی اشاعت پر زور دیا۔ اور حدیث شریف کی اشاعت کے لئے بھی درس و تدریس کا کام جاری رکھا اور اقتصادی میدان میں بھی اسلام سے رہنمائی لینے پر زور دیا اور قرآن و سنت کو مسلمانوں کا محور قرار دیا۔ مرہٹوں کی سرکوبی کے لئے احمد شاہ ابدالی سے مدد حاصل کی۔ اتحاد بین المسلمین کے لئے کوششیں کیں اور اسلامی سلطنت کی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لئے زندگی وقف کر دی۔

حضرت مجدد الف ثانی نے اسلامی احیاء کی جو تحریک شروع کی تھی' شاہ ولی اللہ نے اس کی تکمیل کے لئے بھرپور کوشش کی۔ علمی سطح پر آپ کے چاروں صاحبزادوں نے بڑے اہم کام سرانجام دیئے اور آپ کے پیروکاروں نے بہت کام کیا۔ اور آپ نے تورانی نظریہ مسترد کر دیا کہ شیعہ حضرات اسلام سے خارج ہیں۔ اسی طرح ایرانیوں کے عقائد میں جو غلو پایا جاتا تھا اس کو بھی بنظر استحسان نہ دیکھا اور مسلمانوں کو فرقہ واریت کے ناسور کی تباہیوں سے آگاہ کیا۔ لیکن اسلامی حکومت کو برصغیر میں استحکام حاصل نہ ہو سکا بلکہ روز بروز حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ غیر مسلم اقوام نے اسلامی سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور سرکشی پر آمادہ ہوئیں لیکن مسلمانوں نے من حیث القوم یکجہتی کا مظاہرہ نہ کیا اور وہ ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر کوئی اقدام نہ کر سکے اور آخر حکمران قوم غلامی گہرائیوں میں جا گری۔ جن کو سرسید جیسے دانشوروں نے سہارا دیا اور بڑی مشکلوں سے وہ مسلمانوں کو قعر مذلت سے نکالنے میں کافی حد تک کامیاب ہوئے۔

2۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تحریک

آپ 25 رمضان 1159ھ (11 اکتوبر 1746ء) کو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ہاں بوقت سحر پیدا ہوئے۔ والد گرامی نے آپ کا نام عبدالعزیز رکھا اور تاریخی نام آپ کا "غلام حلیم" رکھا گیا۔

(حیات ولی از رحیم بخش صفحہ 320' ملفوظات صفحہ ۔ 109)

آپ نے بچپن میں ہی قرآن حکیم حفظ کر لیا تھا۔ نیز تجوید و قرات پر عبور بھی حاصل کیا۔ گیارہ سال کی عمر میں باقاعدہ تعلیم پانے لگے۔ دو سال میں آپ نے عربی کے مختلف علوم میں حیرت انگیز ترقی کی اور طبیعت میں ایسی جولانی اور تیزی پیدا ہو گئی کہ سبحان اللہ۔

پھر والد ماجد کے ساتھ حلقہ درس میں شریک ہونے لگے۔ اس حلقہ میں صرف اعلیٰ دماغی صلاحیتوں کے حامل طلباء ہی شریک ہو سکتے تھے۔ عمر کے سولہویں سال تک آتے آتے آپ

نے تفسیر' حدیث' فقہ' اصول' عقائد' منطق' کلام' ہندسہ' ہیئت' ریاضی' تاریخ اور جغرافیہ وغیرہ علوم میں مہارت حاصل کر لی۔

شاہ عبدالعزیز کو زیادہ شغف قرآن حکیم سے تھا۔ اس میں وہ اپنے استاد کی خاص توجہ سے بہت طاق تھے۔ جن کو شاہ ولی اللہ صاحب نے اس مقصد کے لئے خصوصی تاکید کی تھی۔ تقریر میں بھی شروع ہی سے اچھا خاصا مقام بنا لیا تھا۔ آپ کی تقریر شستہ اور فصیح ہوتی۔ آپ کے والد بزرگوار جب فوت ہوئے تو آپ کی عمر سولہ برس تھی۔ چنانچہ آپ نے درس و تدریس کا کام سنبھال لیا۔ مشکل مسائل کو حل کر کے سمجھاتے وقت ایسا طریقہ اختیار کرتے کہ بڑے بڑے فضلاء محو حیرت رہ جاتے۔

ساتھ ہی ساتھ سلسلہ ارشاد بھی جاری کیا۔ چنانچہ ایک طرف آپ طالبان علم کو سیراب کرتے اور دوسری جانب دعوت و ارشاد کا مسلک نبھاتے ہوئے مریدوں اور عقیدت مندوں کی تربیت و تکمیل کا فریضہ انجام دیتے (اتحاف النبلا صفحہ 296 از نواب صدیق حسن خان) آپ کی علمی شان و شوکت کے پیش نظر کسی عالم نے آپ کو سراج الہند کا لقب دیا تھا۔ جس طرح کہ کی زمانے میں شیخ نصیر الدین چشتی کو چراغ دہلی کا لقب دیا گیا تھا۔

(الیانع الجنی برحاشیہ کشف الاستار مطبوعہ دہلی 1349ھ صفحہ 73 تا 75)

حافظہ : شاہ عبدالعزیز کا حافظہ نہایت قوی تھا۔ اکثر مشہور کتابوں کی طویل عبارتیں محض یادداشت کی بناء پر لکھوا دیا کرتے تھے۔ آپ کے معاصر فضل امام خیر آبادی (م۔ 1244ھ) نے لکھا ہے کہ:

"کچھ مدت سے بیماری اور نقاہت کی وجہ سے کتب بینی کی طاقت نہیں رہی تاہم تمام علوم و فنون عقلی و نقلی ازبر ہیں۔"

(تراجم الفضلاء صفحہ 15' 30۔ مطبوعہ پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی کراچی)

باطنی فیوض کی برکات سے اور قوائے روحانی کی حدت سے جب آپ علمی وقائق بیان فرماتے تو ایسے لگتا جیسے ایک بحر ذخار کا دہانہ کھل گیا ہے اور علم و عرفان کا بحر بیکراں موجزن ہے۔ جب بات کرتے تو سامعین پر استغراق کی حالت طاری ہو جاتی اور دلوں کی بستیاں انوار ربانی سے جگمگانے لگتیں۔

(حیات ولی صفحہ 326' رحیم بخش مطبوعہ دہلی 1319ھ)

جب انگریزوں کا عمل دخل شروع ہوا تو آپ نے بہ نیت مباح انگریزی سیکھنے کا فتویٰ دے دیا۔ اس سے آپ کی طبیعت کے حقیقت رس ہونے کا ثبوت ملتا ہے (بحوالہ فتاوی عزیزی جلد 1 صفحہ 186) حالانکہ ایسا فتویٰ دینے میں شاہ عبدالعزیز کی وفات کے پچاس ساٹھ برس بعد بھی اکثر علماء متوقف رہے اور بعض نے تو انگریزی سیکھنے کو کچھ کا کچھ قرار دے دیا۔

آپ کی مجلس وعظ میں ہر مذہب و ملت کا آدمی بصد شوق شریک ہوتا اور فیض پا کر بڑی خوشی محسوس کرتا اور آپ کی کوئی بات مخالف ترین سامع کو بھی گراں نہ گزرتی تھی۔

علماء مشائخ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر فیض و رہنمائی حاصل کرتے' آپ کو کثرت حفظ کی بناء پر دوسروں پر ایک گونہ تفوق حاصل تھا۔ تعبیر خواب میں بھی آپ کو کمال حاصل تھا وعظ و انشاء میں سلیقہ سے پوری طرح آگاہ تھے۔ تحقیق و تدقیق و جستجو میں بھی لاثانی تھے۔ مذاکرہ اور مباحثہ میں بھی ایسا کمال حاصل تھا کہ بڑے بڑے علماء اور دانشور دنگ رہ جاتے۔ آپ کی شاگردی میں رہ کر کچھ سیکھنا اور آپ کی شاگردی کا ٹائیٹل حاصل کرنا بڑے بڑے علماء کے لئے باعث صد افتخار تھا اور آپ کی تحریریں اہل علم و دانش کے نزدیک معتمد علیہ ہیں۔

(اتحاف النبلاء' صفحہ 97-296)

1239 ھ کے رمضان شریف کے آخری عشرہ میں طبیعت پر علالت نے حملہ کیا اور اس کی شدت نے آپ کو اللہ تعالیٰ سے ملنے کا مژدہ سنایا۔ چنانچہ آپ نے اپنے پاس جو نقدی تھی وہ شرعی حصص کے مطابق مستحقین میں تقسیم کر دی۔ پھر وصیت فرمائی کہ میرا کفن اسی کپڑے کا ہو جو میں پہنا کرتا تھا۔ آخر علم و فضل کی یہ شمع 7 شوال 1239 ھ (5 جون 1824ء) کو صبح کے وقت بجھ گئی۔ یکے بعد دیگرے آپ کی نماز جنازہ پچپن مرتبہ ادا کی گئی۔ (الروض الممطور صفحہ 201-200 مطبوعہ 1307 ھ)

اولاد : آپ کی صرف تین صاحبزادیاں تھیں۔ آخری بیٹی کی اولاد میں سے شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب آپ کے جانشین ہوئے۔ جو 1256 ھ میں برصغیر سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے تھے۔

تصانیف : آپ کی تصانیف کا ذکر مندرجہ ذیل ہے:

1۔ قرآنی تفسیر فتح العزیز معروف بہ تفسیر عزیزی : پہلی جلد پہلے سوا پارہ پر مشتمل ہے۔ دوسری اور تیسری جلد میں آخری دو پاروں کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ یہ پہلی بار 1248 ھ میں کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔ اس کا اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔

2۔ تحفہ اثناء عشریہ : یہ 1204 ھ میں لکھی گئی۔

3۔ بستان المحدثین : یہ کتاب دہلی اور لاہور سے تیرہویں صدی میں چھپی تھی۔ اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

4۔ عجالۂ نافعہ : یہ اصول حدیث سے متعلق ہے اور دہلی سے 1212ھ میں مکتبہ مجتبائی سے چھپ چکی ہے۔

5۔ سرّ الشہادتین : یہ واقعہ کربلا کے بارے میں ہے۔ دہلی سے 1261 ھ میں چھپ چکی ہے۔ سید علی اکبر نے "اظہار السعادۃ" کے نام سے اس کو فارسی میں ڈھالا تھا۔ اس کتاب کی شرح بھی شاہ عبدالعزیز کے ایک شاگرد مولوی سلامت اللہ دمشقی نے فارسی میں لکھی تھی جو 1882ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔

6۔ عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس : یہ خلفائے راشدین کے فضائل پر مشتمل ہے۔ یہ 1322 ھ میں دہلی سے شائع ہوئی تھی اس کے فارسی اور اردو میں تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔

7۔ میزان العقائد : یہ عقائد کے بارے میں تحقیقی نظریہ پر مشتمل ہے۔ جو 1321 ھ میں دہلی سے چھپی۔

8۔ فتاویٰ عزیزیہ (فارسی) : یہ دو جلدوں میں ہے۔ 1341 ھ میں دہلی سے چھپ چکی ہے۔ اس کے پہلے حصہ کا اردو ترجمہ 1313ھ میں مولوی نواب علی اور مولوی عبدالجلیل نے حیدر آباد دکن سے شائع کیا تھا۔

9۔ رسائل خمسہ فارسی : ان میں سے بعض رسالے فتاوی عزیزی میں شامل ہیں۔

10۔ تحقیق الرؤیا (فارسی) : یہ خوابوں کی تعبیر کے بارے میں ہے۔

11۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز (فارسی) : یہ کتابی شکل میں مطبع مجتبائی میرٹھ سے 1314ھ میں چھپ چکے ہیں۔ ان کا اردو ترجمہ محمد علی لطفی اور مفتی انتظام اللہ شہابی نے کیا تھا جسے پاکستان میں ایجوکیشنل پبلشرز کراچی سے 1960ء میں شائع کیا تھا۔

12۔ شرح میزان منطق

13۔ حواشی بدیع المیزان

14۔ میزان البلاغت یا اعجاز البلاغت

آخری تینوں کتابوں کا ذکر حیات ولی اور تذکرہ عزیزیہ میں ملتا ہے مگر ان کے بارے میں مزید معلومات ناپید ہیں۔ مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی" علماء و مشائخ کے لئے روشنی کا مینار تھے۔ تمام علوم متداولہ پر آپ کو عبور حاصل تھا۔ فنون عقلیہ اور نقلیہ میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ آپ کا حافظہ بہت قوی تھا۔ صحاح ستہ ازبر تھیں۔ تعبیر خواب میں بڑا کمال حاصل تھا' وعظ فرماتے تو علماء' فضلاء' مشائخ' فقراء اور سلاطین دم بخود سراپا گوش ہو جاتے۔ شیعہ اور سنی آپ کے گرویدہ تھے۔ اور آپ کی مدح میں رطب اللسان تھے۔ آپ دلائل اور براہین کے میدان شہسوار تھے۔ عقل سلیم سے وافر حصہ پایا تھا۔ مخالف و موافق سبھی آپ کے معتقد تھے۔ ہر بات آپ کی قاطع صحبت اور دلیل محکم تھی آپ کی تفسیر عزیزی اگرچہ مختصر سی ہے لیکن نہایت ہی محبوب علماء و مقبول خلائق ہے اور اپنی طرز میں ممتاز و منفرد ہے۔ ساری عمر آپ نے دینی خدمات میں صرف کر دی۔ برصغیر میں علم و عمل' وعظ و نصیحت' تدریس و درس' افتاء و تفقہ' وعظ و پندار' تربیت و تکمیل' اخلاق و اخلاص کا سکہ آپ کے اور آپ کے برادران (جو شاہ ولی اللہ کے خلف تھے) پر ہی ختم ہے۔ آپ کے خاندان سے علمی تعلق ہندوستان اور بیرون ہند کے علماء کے

لئے باعث افتخار تھا۔ آپ کا خاندان علم حدیث اور حنفی فقہ میں اعلیٰ استعداد رکھتا تھا۔

شاگردان : آپ کے شاگردوں میں شاہ رفیع الدین (آپ کے بھائی) شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی (آپ کے نبیرہ) مفتی صدر الدین خان دہلوی، مولانا رشید الدین خاں دہلوی، شاہ غلام علی دہلوی نقشبندی، مولانا مخصوص الدین، شاہ رفیع الدین، مولوی عبدالحئی صاحب (آپ کے داماد)، اور مولوی فضل حق خیر آبادی، مولانا حسن علی لکھنوی، مولانا حسین احمد ملیح آبادی، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، ایسے بزرگ آسمان شہرت کا آفتاب و ماہتاب تھے۔ آپ کی زبان سے جو نکلتا تھا، وہ درست ہوتا اور اس کے لئے آپ کے پاس دلائل و براہین کا ذخیرہ بھی ہوتا۔

آپ کی ذات مسلمانوں کے لئے ایک نعمت : آپ کا وجود کرامت سے کم نہ تھا۔ وہ زمانہ انگریزوں کی برتری اور ترقی کا زمانہ تھا۔ پادری حضرات مسلمانوں کو علمی سطح پر نیچا دکھانے کی کوشش کرتے تاکہ عوام کو اسلام سے بدظن کر کے انہیں عیسائیت قبول کرنے کے لئے ترغیب دے سکیں۔ ان کا حملہ ہر جہت میں اور ہر ملت پر یکساں تھا۔ ہندو، سکھ، مسلمان اور اچھوتوں سمیت وہ سبھی کے لئے عیسائیت قبول کرنے پر زور دیتے تھے۔ دوسری طرف دیگر غیر مسلم حضرات یعنی ہندو وغیرہ بھی مسلمانوں کو بیخ و بن سے اکھاڑنے اور انہیں بے وقعت اور بے وقار بنانے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ یہاں چند مثالیں دی جاتی ہیں۔ جن سے آپ کی حاضر جوابی، تبحر علمی اور زبان کی تاثیر ظاہر ہوتی ہے۔

1۔ ابھی آپ کا لڑکپن تھا کہ والد صاحب اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ آپ کے ننھیال قصبہ پھلت سے کچھ شاگرد پیشہ مولوی قصبہ پھلت سے بیل گاڑی کرایہ لے کر دہلی کو چلے۔ گاڑی بان ہندو تھا۔ اس نے مولوی صاحبان سے پوچھا کہ خدا ہندو ہے یا مسلمان۔۔۔۔۔ ہر ایک نے اپنی اپنی بات کہی لیکن سائل کی تسلی نہ ہو سکی۔ آخر سب نے کہا کہ دہلی جا کر بڑے استاد سے پوچھیں گے۔ آپ سے پہلی ملاقات میں ہی ہندو گاڑی بان نے اپنا سوال داغ دیا۔ آپ نے اسے کہا کہ اگر خدا ہندو ہوتا تو گئو ہتیا نہ ہوتی۔ اس بات پر غور کر کے وہ ہندو مسلمان ہو گیا۔

(کمالات عزیزی صفحہ 10-11 مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ لاہور)

2۔ ایک پادری صاحب دہلی میں بغرض مباحثہ آئے۔ انگریز ایجنٹ کی وساطت سے وہ آپ تک پہنچے۔ مباحثہ پر شرط کے طور پر انگریز ایجنٹ مسٹر منکا صاحب نے دو ہزار کا مطالبہ کیا کیونکہ انہیں خیال تھا کہ مولوی صاحب تو فقیر ہیں۔ آخر شرط لگ گئی۔ پادری صاحب نے کہا کہ ہمارے سوال کا جواب منطقی اور معقول ہونا چاہئے نہ کہ منقول (جو قرآن و حدیث سے دیا گیا ہو) چنانچہ پادری نے کہا کہ تمہارے پیغمبرؐ حبیبؐ اللہ ہیں۔ انہوں نے امام حسین کے قتل کو وقت فریاد کیوں نہ کی ورنہ اگر وہ فریاد کرتے تو محبوب خدا ہونے کے حوالے سے ان کی فریاد ضرور سنی جاتی۔ اس کا جواب دیں۔ شاہ عبدالعزیز

نے جواب میں فرمایا کہ ہمارے پیغمبر صاحب' فریاد کے لئے اللہ کے پاس آسمانوں پر گئے تو پردہ غیب سے آواز آئی ۔۔۔۔ ہاں تمہارے نواسے پر قوم نے ظلم کر کے شہید کر دیا ہے لیکن اس وقت ہمیں اپنے بیٹے عیسیٰ کو سولی پر چڑھانا یاد آیا ہوا ہے۔ چنانچہ مزید کچھ کہے بغیر ہمارے پیغمبر صاحب واپس تشریف لے آئے۔ پادری صاحب یہ جواب سن کر لاجواب ہو گئے اور شرط کی رقم ادا کر کے واپس چلے گئے۔

(کمالات عزیزی صفحہ 11)

3۔ ایک دفعہ انگریز ریذیڈنٹ دہلی ۔۔۔۔ حضرت شاہ صاحب کے پاس ملاقات کو آئے اور باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ میں ایک بات پوچھتا ہوں۔ لیکن اس کا کوئی بھی اطمینان بخش جواب نہیں دیتا اور کہا کہ ایک شخص سفر پر جاتا ہے' راستہ بھول گیا۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ ایک آدمی سرراہ سو رہا ہے اور ایک شخص اس کے پاس بیٹھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ بھٹکا ہوا مسافر کس سے راستہ پوچھے۔ آپ نے فرمایا کہ راستے چلنے کے لئے ہے نہ کہ بیٹھنے کے لئے۔ پس تیسرے آدمی کو چاہئے کہ وہ بھی وہاں بیٹھ جائے۔ جب سونے والا جاگے تو دونوں (سونے والے سے) راستہ پوچھ کر اپنی اپنی راہ لیں۔ یہ جواب سن کر ریذیڈنٹ لاجواب ہو گیا۔

(کمالات عزیز صفحہ 13)

4۔ تعبیر خواب کے سلسلے میں ایک شخص نے آپ سے پوچھا کہ اس نے خواب دیکھا کہ کھلی (سرسوں کے بیج کا تیل نکالنے کے بعد بچ رہنے والا بھوسہ) تیل چٹتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ صاحب خواب کی بیوی دراصل اس کی والدہ ماجدہ ہے۔ وہ بولا۔ حضرت یہ بھلا کیسے ممکن ہے۔ لیکن جب اس نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ شیر خوارگی کے دنوں میں وہ اپنی ماں سے بچھڑ گیا تھا۔ جب جوان ہوا تو ایک بیوہ سے نکاح کر لیا۔ جو درحقیقت اس کی والدہ تھی۔ اور یوں حضرت کی برکت سے ایک شخص ایک بیہودگی سے آئندہ کے لئے محفوظ ہو گیا۔

(ایضاً۔ صفحہ 16)

5۔ ایک شخص نے طوائف کا جنازہ پڑھنے کا سوال کیا؟ فرمایا جو مرد حضرات طوائفوں کے پاس جاتے ہیں تم ان کا جنازہ پڑھ کر انہیں دفن کرتے ہو یا بغیر جنازہ پڑھے دفن کر دیتے ہو۔ وہ شخص بولا۔ کہ ان کا جنازہ تو ہم ضرور پڑھتے ہیں۔ تو فرمایا "تو ان طوائفوں کا جنازہ بھی پڑھ لیا کرو۔"

(ایضاً۔ صفحہ 20)

6۔ فقہی مسائل میں آپ کی اپج لاجواب تھی۔ ایک شخص نے سفر پر روانہ ہوتے وقت اپنی بیوی پر شرط لگائی کہ اگر تم (میری غیر حاضری میں) اپنے باپ کے گھر جاؤ گی تو میری طرف سے تمہیں طلاق ہے۔ واپسی پر پتہ چلا کہ عورت کا والد وفات پا گیا تھا تو اس غم

کے موقع پر وہ اپنے باپ کے گھر گئی تھی۔ اور علماء وقت نے فتویٰ دیا تھا کہ اسے طلاق ہو گئی ہے۔ شوہر نامدار مایوس ہو کر آخر آپ کے پاس آئے۔ آپ کی عمران دنوں 12 سال کے قریب تھی۔ آپ نے فتویٰ لکھا کہ جب عورت کا والد فوت ہو گیا اور وہ اس وقت اس کے گھر گئی تو اس وقت درحقیقت وہ گھر اس کے (مردہ) باپ کا گھر نہ تھا بلکہ ورثاء کا تھا لہٰذا عورت کو طلاق نہیں ہوئی۔ یہ فتویٰ دوسرے علماء نے بھی پسند کیا اور قبول فرمایا۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ اہل اسلام کی گرتی ہوئی ساکھ کے لئے ایک مضبوط ستون کی حیثیت رکھتے تھے۔

سیاسی مقاصد کے لئے کوششیں : شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے خلیفہ سید احمد بریلوی بھی تھے اور سید احمد کے قابل ترین رفیق کار مولوی عبدالحیٔ شاہ عبدالعزیز کے داماد تھے جبکہ شاہ اسمٰعیل شہید آپ کے بھتیجے تھے۔ ان سب کی تربیت میں شاہ صاحب کو دخل حاصل تھا۔ سید احمد کے مریدوں میں حنبلی فقہ کے لوگ بھی شامل تھے۔

شاہ ولی اللہ نے بھی ملکی سیاسیات کی جہت درست کرنے کی کوشش کی تھی اور جب مرہٹوں نے اسلامی سلطنت ہند کو ہڑپ کر کے مسلمانوں کو مٹانا چاہا تھا تو شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو مدد کے لئے پکارا۔ چنانچہ 1761ء کے معرکہ میں احمد شاہ نے مرہٹوں کو شکست فاش دی اور مسلمان برصغیر میں زندہ رہ گئے ورنہ ان کا مستقبل تاریک تر ہوتا۔

شاہ ولی اللہ کے بعد آپ کے چاروں صاحبزادوں نے اپنے والد کی جانشینی کا حق ادا کیا۔ خصوصاً" شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے بھرپور کردار ادا کیا۔ آپ نے مسلمان مجاہدوں کو بھی حوصلہ دیا۔ سید احمد بریلوی کو اپنے ساتھیوں کی ایک جماعت کے ساتھ 1819ء میں حج پر جانے کا ارشاد فرمایا تھا۔ آٹھ سو افراد کی یہ جماعت دو تین سال کے بعد حج کر کے واپس آئی اور حج کی ادائیگی کر کے ایک اسلامی رکن کے احیاء کا کارنامہ انجام دیا جو مخدوش سیاسی حالات کی وجہ سے ناممکن ہو رہا تھا اور لوگ حج کے لئے جانے سے پہلوتہی کر رہے تھے۔ آپ کے ایک شاگرد فضل حق خیر آبادی نے جنگ آزادی (1857ء) میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

شاہ عبدالعزیز کی تحریک شاہ ولی اللہ کی تحریک کا ہی حصہ تھی۔ شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی اصلاح کے لئے جو اقدامات کئے اور علمی اور روحانی میدان میں جو کوششیں کیں، شاہ عبدالعزیز کی خدمات بھی اسی کا تسلسل تھیں۔ شاہ عبدالعزیز کی وفات پر بہت کچھ لکھا گیا۔ مولانا شاہ رؤف احمد صاحب جو حضرت مجدد الف ثانی کی اولاد امجاد سے تھے تاریخ وفات کہی جس کے پہلے دو شعر اس طرح ہیں۔

شاہ	عبدالعزیز	فخر	جہاں
عالم	علم	آیت	قرآں
صبح	یکشنبہ	هفتمین	شوال

از بدن گشتہ روح او پراں

حکیم مومن خان مومن دہلوی نے آپ کا قطعہ تاریخ یوں رقم کیا:

انتخاب نسخہ دیں مولوی عبدالعزیز
بے عدیل و بے نظیر و بے مثال و بے مثل
جانب ملک عدم تشریف فرما کیوں ہوئے
آ گیا تھا کیا کہیں مردوں کے ایماں میں خلل
ہے ستم اے چرخ تو کس کو یہاں سے لے گیا
کیا کیا یہ ظلم تو نے بیکسوں پر اے اجل
جب اٹھائی نعش اک عالم تہ و بالا ہوا
لوٹتا تھا خاک پر ہر قدسئی گردوں محل
کیا کس و ناکس پہ تھا صدمہ کیا جس وقت دفن
ڈالتا تھا خاک سر پر ہر عزیز و مبتذل
مجلس درد آفرین تعزیت میں میں بھی تھا
جب پڑھی تاریخ مومن نے یہ آ کر بے بدل
دست بے داد اجل سے بے سروپا ہو گئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل
(ق ی ض ن ط ر ل م = 1230ھ)

سید احمد شہید کی تحریک جہاد

حالات زندگی : سید احمد 28 نومبر 1786ء کو رائے بریلی (اودھ) میں سید محمد عرفان کے ہاں پیدا ہوئے۔ سلسلہ نسب 36 واسطوں سے علی المرتضیٰ ؓ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے بزرگ التمش کے زمانے میں کڑہ مانک پور میں آئے اور شاہی عہدوں پر متمکن رہے۔ سید احمد نے ابتدائی تعلیم گھر پر پائی۔ مردانہ کھیلوں میں زیادہ شوق سے حصہ لیتے تھے۔ ہم عمر کھلنڈرے لڑکوں کے ساتھ لشکر بنا کر ان کی قیادت کرنا اور کھیل ہی کھیل میں جہاد کی تکبیریں بلند کرنا ان کا کھیل اور مشغلہ تھا۔ کچھ عرصہ لکھنؤ میں رہے پھر حصول تعلیم کے لئے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی خدمت میں دہلی آ گئے۔ انہوں نے سید صاحب کو شاہ عبدالقادر کی خدمت میں بھیج دیا۔ سید صاحب سنی' حنفی مسلک کے پیروکار تھے۔ شاہ عبدالقادر ان دنوں اکبر آبادی مسجد میں تشریف رکھا کرتے تھے۔ وہاں انہوں نے میزان' کافیہ اور مشکوۃ شریف پڑھی (بحوالہ ارواح ثلاثہ اردو' مطبوعہ سہارن پور 1370ھ) تصوف میں شاہ عبدالعزیز کے دست حق پرست پر 1807ء میں بیعت کا شرف پایا اور سلوک کی منزلیں طے کیں اور سال ہا سال تک عشا کے وضو سے فجر کی نمازیں ادا کرتے رہے۔ شاہ عبدالعزیز نے سید احمد کے رتبہ جو انہیں تصوف اور سلوک میں حاصل تھا' کی تعریف کی ہے۔

(بحوالہ آثار الصنادید)

1808ء میں واپس وطن کو آئے تو شادی کے بندھن میں جکڑ دیئے گئے۔ انہی دنوں راجپوتانہ کی ریاست ٹانک کے نواب امیر خاں کے پاس گئے جن کے پاس بھاری توپ خانہ اور مضبوط فوج بھی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ نواب امیر خاں کو قائل کر کے تحریک جہاد میں ان کا تعاون حاصل کریں وہ یہاں آٹھ سال تک اسی امید پر مقیم رہے کہ ایک نہ ایک دن وہ نواب صاحب کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن 1817ء میں نواب کو انگریز کی طرف سے کھٹکا محسوس ہوا تو نواب صاحب نے ان کے ساتھ معاہدہ امن کر لیا اور اپنی فوج کو منتشر کر دیا اور ٹونک کی ریاست قبول کر کے انگریزوں کے زیر سایہ "امن چین" سے رہنے لگے۔ سید احمد کو نواب صاحب کی پالیسی پسند نہ آئی چنانچہ وہ یہاں سے مایوس ہو کر 1818ء میں دہلی پہنچے گئے اور اہل اسلام کی اخلاقی اور دینی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا اور ساتھ ہی جہاد کی تیاریاں کرنے لگے۔

یہاں انہیں مولانا عبدالحیٔ اور شاہ اسمٰعیل بن عبدالغنی (بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) کی رفاقت حاصل ہو گئی جنہوں نے جہاد کی فضیلت پر وعظ و نصائح کا سلسلہ شروع کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اچھی خاصی جمعیت کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔

ان دنوں عبدالوہاب نجدی کی اصلاحی تحریک کا زور تھا۔ اور سید صاحب کی اصلاحی

تحریک بھی اسی طرح کی شدومد سے جاری تھی۔ چنانچہ ان کی تحریک کو وہابی تحریک کا نام دیا گیا۔ اتفاق سے سید احمد کے پیروکاروں میں کچھ حنبلی فقہ کے لوگ بھی شامل تھے چنانچہ ان کی وجہ سے بھی ان کی تحریک کو "وہابی" کہنے والوں کی سپورٹ مل گئی حالانکہ سید احمد تصوف کے نہ صرف قائل تھے بلکہ وہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے مرید اور خلیفہ بھی تھے۔ بحری راستوں پر انگریز قابض تھے اور حج کی ادائیگی مشکل ہو گئی تھی چنانچہ 1819ء میں شاہ عبدالعزیز کے ارشاد پر سید احمد نے اپنے آٹھ سو رفقاء کے ساتھ حج کا سفر کیا اور 2 سال گیارہ ماہ کے عرصہ میں یہ فریضہ ادا کر کے واپس آئے اور آتے ہی تحریک جہاد شروع کر دی (بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد دوم صفحہ 137 تا 139) سید احمد کی تحریک جہاد کی کامیابی کی بڑی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں ہر فرقہ اور ہر مکتب فکر کے مسلمان شریک تھے اور اس کی بنیاد اعتقادات کی بجائے شاہ ولی اللہ کے ان اصولوں پر تھی۔ جو آپ نے اپنی تحریروں سے مسلمانوں میں یکجہتی پیدا کرنے کے لئے پیش کئے تھے۔

سید احمد نے اسلامی روایات کا پاس کرتے ہوئے بیوگان کی شادی پر زور دیا اور اس کی مثال خود قائم کرتے ہوئے ایک بیوہ سید زادی سے شادی کی۔

سکھوں کے مظالم : ان دنوں سکھوں نے ہر طرف تباہی مچا رکھی تھی۔ خصوصاً مسلمانوں کا جینا حرام کر رکھا تھا کیونکہ وہ مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھنے لگے تھے کیونکہ جہانگیر اور عالمگیر کے عہد میں مغل بادشاہوں نے سکھوں کی شورشیں دبانے کے لئے ان پر یلغاریں کی تھیں۔ مرکزی حکومت کمزور ہوتے ہی سکھوں نے اپنی طاقت بڑھا لی اور بغاوتوں پر اتر آئے حتیٰ کہ انہوں نے بعض علاقوں پر قبضہ کر کے وہاں خود مختار حکومتیں قائم کر لیں۔ چنانچہ سکھوں کی بارہ راجدھانیاں قائم ہو گئیں جن کو مسلیں کہا جاتا تھا۔

سکھوں کے مظالم کی داستانیں سید احمد تک بھی پہنچیں۔ چنانچہ انہوں نے اسلامی لشکر تیار کر کے 21 دسمبر 1826ء کو سکھوں کے خلاف جہاد شروع کر دیا کیونکہ سکھوں نے مسلمانوں پر مظالم کی انتہا کر دی تھی اور گائے ذبح کرنے پر پابندی لگا دی تھی اور مساجد کو برباد کر کے ان میں اصطبل اور اسلحہ خانے قائم کر لئے تھے۔

17 جنوری 1826ء کو سید احمد نے ہند سے ہجرت کی اور شمال مغرب میں سرحدی علاقہ کو جہاں پٹھانوں کی کثرت تھی، اپنا مستقر قرار دیا۔ چنانچہ رائے بریلی سے مجاہدین کا لشکر کالپی پہنچا۔ یہاں سے گوالیار، ٹونک، اجمیر، پالی، امرکوٹ، حیدر آباد سندھ سے پیر کوٹ، شکار پور، ڈھاڈر، بولان، کوئٹہ، قندھار، غزنی، کابل اور جلال آباد ہوتا ہوا پشاور پہنچ گیا۔ پہلے پہل مجاہدین کی تعداد پانچ چھ سو کے قریب تھی اور اثاثوں کی مالیت پانچ ہزار روپے تھی۔ چنانچہ سید صاحب دوسرے مجاہدین کو بھی دعوت دیتے رہے اور لوگ شامل ہوتے رہے۔ اس طرح ایک لشکر بن گیا جو اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔

سکھوں کی کاروائی : ان دنوں رنجیت سنگھ کی حکومت کا زور تھا۔ سید احمد کے جہاد کا شہرہ سن کر رنجیت سنگھ نے بدھ سنگھ کی قیادت میں دس ہزار سکھ فوج کو اکوڑہ خٹک بھیج دیا۔ 20 دسمبر 1826ء کو نو سو غازیوں نے شب خون مارا اور سات سو سکھ قتل کر ڈالے چنانچہ سکھ سردار پسپا ہو گیا اور مسلمان اس کامیابی پر بہت خوش ہوئے۔ 11 جنوری 1827ء کو ہنڈ کے مقام پر بہت سے خان صاحبان اور علماء نے سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کی اور جہاد کے لئے لڑنے مرنے کا عہد کیا۔ ان میں پشاور کے درانی سردار یار محمد اور سلطان محمد وغیرہ بھی شامل تھے اور اس طرح مسلمان مجاہدین کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہو گئی۔

سکھوں نے یار محمد سے سازباز کر کے اسے اپنے ساتھ ملا لیا۔ چنانچہ اس نے سید احمد کو لڑائی سے ایک رات پہلے زہر دلوا دیا۔ لیکن سید احمد علاج معالجہ سے صحت یاب ہو گئے۔ جنگ ہوئی تو مجاہدین کا پلہ بھاری تھا لیکن یار محمد اور سلطان محمد نے سکھوں سے سازباز کر رکھی تھی لہٰذا عین میدان جنگ میں انہوں نے "شکست شکست" کا شور مچا کر مجاہدین کو ہراساں کر دیا اور خود اپنے ساتھیوں سمیت میدان جنگ سے فرار ہو گئے اس طرح مجاہدین کے قدم بھی اکھڑ گئے اور سکھوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔

اب سید احمد نے پنجتار (خدو خیل) کو تحریک کا مرکز بنا لیا اور بنیر اور سوات کا دورہ کیا اور جہاد فی سبیل اللہ کا وعظ کرتے رہے۔ ادھر ہندوستان سے بھی مجاہدین کی کمک پہنچ گئی اور مردان کے میدانی اور پہاڑی علاقوں سے بہت سے مسلمان بھی جہاد میں شرکت کے لئے آ گئے۔ چنانچہ مجاہدین نے ہزارہ کے محاذ پر سکھوں کو بمقام ڈمگلہ اور شنگیاری شکست دی لیکن بعد میں خان صاحبان یار محمد اور سلطان محمد کی دوغلی پالیسی نے مجاہدین کو سخت نقصان پہنچایا۔ 1830ء کی سردیوں میں سلطان محمد درانی نے دو سو مجاہدین کا لشکر دھوکے سے شہید کر دیا۔ یہ مجاہدین مختلف دیہاتی علاقوں میں متعین تھے۔ جو لشکر اسلام کا لب لباب تھے اور تحریک جہاد کی جان تھے۔ اس شکست کے بعد سید احمد نے سرحد سے کوچ کرنے کا فیصلہ کیا اور وہ کشمیر کے علاقہ کو مستقر بنانے کے لئے آگے بڑھے۔ چنانچہ پہاڑی راستے طے کرتے ہوئے وہ راج دواری (بالائی ہزارہ) جا پہنچے اور غازی بھوگٹ منگ، گولش اور بالا کوٹ کے مقامات پر مجاہدین کے مراکز قائم کر دیئے اور مظفر آباد (آزاد کشمیر) بھی جا پہنچے اور اس علاقے میں آباد مسلمانوں کو سکھوں سے بچانے کے لئے بالا کوٹ (تحصیل مانسہرہ) میں ہیڈ کوارٹر قائم کر لیا۔

مجاہدین کے مقابلہ کے لئے رنجیت سنگھ اپنے بیٹے شیر سنگھ کو دس ہزار کا لشکر دے کر بھیجا۔ شیر سنگھ مظفر آباد کے اردگرد چکر لگاتا پھر رہا تھا اور اسلامی لشکر کی خبر پہنچی تو وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر پہاڑی پگڈنڈیوں کے ذریعے مٹی کوٹ کے ٹیلے پر اپنی فوج لے جانے میں کامیاب ہو گیا یہ جگہ بالا کوٹ کے بالمقابل مغرب میں واقع ہے۔ 6 مئی 1831ء کو جمعہ کے روز چاشت کے وقت بالا کوٹ اور مٹی کوٹ کے درمیانی میدان میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ سکھ تعداد میں مجاہدین سے کئی گنا زیادہ تھے۔ یہ لڑائی دو گھنٹے جاری رہی۔ تین سو غازی اور بے شمار سکھ جان

سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ سید احمد اور شاہ اسمٰعیل بھی دوسرے مجاہدین کے ساتھ شہادت پا گئے اور سکھ کامیاب ہو کر ابھرے۔

سید صاحب کی لاش تلاش کروائی گئی۔ سر اور دھڑ الگ الگ جگہوں سے دستیاب ہوئے چنانچہ سید احمد کی نعش کے دونوں حصے ایک قبر میں اعزاز کے ساتھ دفنا دیئے گئے۔ (عمدۃ التواریخ جلد 3 صفحہ 1‘ 35 از سوہن لال سوری)

دوسرے تیسرے دن ننگ سکھوں نے سید حمد کی لاش قبر سے نکال کر دریا میں بہا دی۔ جو بہتی ہوئی گڑھی حبیب اللہ سے تین میل شمال کی طرف دریائے کنہار کے مشرقی کنارے پر مسلمان کسانوں کو ملی۔ چنانچہ ان کسانوں نے لاش کے نچلے حصے (دھڑ) کو دریا سے نکال کر ایک غیر معروف جگہ پر دفن کر دیا۔ جبکہ سید احمد کا سر گڑھی حبیب اللہ کے سردار کی وساطت سے الگ دفن کیا گیا۔

شاہ اسمٰعیل کی لاش بالا کوٹ سے شمال میں ست بنے نالے کے پار سے دستیاب ہوئی۔ جسے وہیں سپرد خاک کر دیا گیا اور پھر سکھ حکومت کی سرحدیں پشاور تک وسیع ہو گئیں۔

فرائضی تحریک اور بنگال کے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لئے اس تحریک کا کردار

یہ تحریک بنگال میں شروع ہوئی جس کے سربراہ اور بانی حاجی شریعت اللہ تھے۔ اس تحریک کی روح رواں بنگال کے کاشت کار تھے۔ اس تحریک کا نعرہ یہ تھا کہ ہندوانہ رسوم ترک کی جائیں اور اسلامی ارکان پر عمل کیا جائے۔ حاجی شریعت اللہ کی نظر میں ہندوستان دارالحرب تھا اور اسلامی مساوات اس تحریک کا مقصود تھی۔ اس تحریک کے تحت کسانوں نے بیگار کے خلاف محاذ قائم کیا اور ناجائز ٹیکس دینے سے بھی انکار کر دیا۔ اور بڑے زمینداروں کے گھروں میں کسانوں کی بہو بیٹیاں کام کاج کرنے سے روک دی گئیں جس سے وہ پریشان ہو گئے۔ زمینداروں نے فرائضی تحریک کے خلاف پرانے خیال کے کسانوں کو شہہ دی اور اس طرح ایک محاذ کھڑا ہو گیا۔ حتیٰ کہ 1781ء میں دونوں کسان گروہ لڑنے لگے جنہیں اندیشہ نقص امن کے تحت گرفتار کر لیا گیا اور حاجی شریعت اللہ کے حامیوں کو دو سو روپے جرمانہ ایک ایک سال قید بامشقت کی سزا دلوائی گئی۔ لیکن حاجی شریعت اللہ کے خلاف جرم ثابت نہ ہو سکا۔ یہ تحریک دراصل احیائے اسلام کی تحریک تھی جو آہستہ آہستہ کسانوں کی تحریک کا روپ دھار گئی۔ دودھو میاں حاجی شریعت اللہ کے مددگار اور ساتھی تھے۔ انہوں نے کاشت کاروں کو زرعی لگان کی ادائگی سے منع کر دیا اور کسانوں کو سرکاری اراضی کاشت کرنے کے لئے کہا۔ اس طرح زمینداروں کی زمین بغیر کاشت کئے بیکار پڑی رہی۔ چنانچہ زمینداروں نے دودھو میاں کے خلاف مقدمے دائر کئے لیکن

عدم ثبوت کی بناء پر وہ ہر بار بری ہو جاتے رہے اور "زمین اللہ کی ہے" کا نعرہ کئی سال تک کاشت کاروں میں مقبول رہا۔ مقدمات میں سرکاری اور عدالتی اہلکاروں نے رشوت کا بازار گرم کرتے ہوئے زمینداروں کی طرف داری کی اور غیر عادلانہ فیصلے کئے چنانچہ کاشت کار طبقہ مجاہدانہ انداز میں ظالموں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ ہندو زمینداروں نے پانچ روپے فی کس کا جگا ٹیکس لگا کر مسلمان کاشت کاروں کو زچ کرنا شروع کیا۔ بعض ہندو زمینداروں نے داڑھی رکھنے والے مسلمانوں پر اڑھائی روپے ماہوار داڑھی ٹیکس لگا دیا۔ چنانچہ ان ظالمانہ اقدامات کے خلاف مسلمان اٹھ کھڑے ہوئے اور تحصیل داروں اور وصول کنندگان سے ان کا جھگڑا ہوا اور سرکاری مدد سے کاشت کاروں کی ہر آواز دبا دی گئی۔ 1799ء میں مالیہ کی جبری وصولی کا قانون جلتی پر تیل ثابت ہوا اور کاشت کاروں کے خلاف زمینداروں نے مقدمات کی بھرمار کر دی جن کی سماعت کا اختیار بھی زمینداروں کو حاصل تھا۔ اس طرح ظلم کے سائے مزید گہرے ہوتے گئے آخر اس طرح کی ظالمانہ روش کے خلاف مسلمانوں میں جہاد کی تحریک ابھری اور مسلمان اپنے بچاؤ کی خاطر جہاد کے لئے متحد ہونے لگے۔ دوسری طرف سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد شمالی ہند میں کامیاب ہو رہی تھی۔ بنگال میں شریعت اللہ تیتو میر کی قیادت میں مسلمان مجاہد آگے بڑھنے لگے اور انگریزوں کے خلاف باغیانہ روش بھی چل نکلی اور اسلامی حکومت کے قیام کا فیصلہ منوایا جانے لگا لیکن اکتوبر، نومبر 1830ء میں یہ تحریک، جو اسلامی حکومت کے قیام کا نعرہ لے کر اٹھی تھی سخت مخالفت کی زد میں آ گئی۔ انگریزوں نے 19 نومبر 1831ء کو میجر اسکاٹ کی سرکردگی میں اس تحریک کو بزور شمشیر کچل کر رکھ دیا اور اہل تحریک کو مقدمات میں پھنسا کر کڑی سزائیں دیں اور یوں یہ تحریک دم توڑ گئی۔

اٹھارہویں صدی کے زرعی بحران کے اسباب اور اس کا جائزہ

بادشاہوں کے جاگیرداری نظام میں کبھی کبھی چھوٹے کاشت کاروں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جاتے تھے۔ جاگیردار طبقہ بادشاہ کی طرف سے مالی مانگ کو پورا کرنے کے لئے بھی ان پر ظلم کرتا۔ حتیٰ کہ ان کے بیوی بچوں کو فروخت کر کے رقم حاصل کی جاتی، لگان کی عدم ادائگی ہر طرح سے ایک جرم تھی جس کی وصولی کے لئے جاگیردار حضرات ہر حربہ استعمال کر گزرتے تھے حتیٰ کہ بیوی بچوں کی گرفتاری اور ان کی فروخت بھی معمول کی بات تھی۔ آخر کاشت کاروں نے زمینداروں کی زمین کاشت کرنا ہی چھوڑ دی وہ نقل مکانی کر کے دور چلے گئے۔ ان کی زرعی زمینیں بے کار رہنے لگیں تو ان کی آنکھیں کھلیں۔ لیکن اب زرعی پیداوار کم ہو کر ملک میں قحط کی صورت پیدا ہونے لگی تو زمیندار زمینوں کی کاشت کے لئے کاشت کاروں کو مجبور کرتے لیکن

کاشت کار نقل مکانی کرنے لگے اور سرکاری زمینوں پر چلے جاتے۔ اس طرح جاگیرداروں اور زمینداروں میں بھی چپقلش شروع ہو گئی۔ کیونکہ کاشت کار نئی جگہ زرعی وسائل پیداوار کے علاوہ باغی قسم کے جاگیرداروں کی فوج میں شامل ہو کر ان کے دست و بازو بن جاتے۔

جاٹوں کی بغاوت : متھرا کے قریب تلسٹ کے بڑے زمیندار گوکلا جاٹ نے ایسے ہی ستائے ہوئے کاشت کاروں کو اپنی فوج میں شامل کر کے علم بغاوت بلند کر دیا۔ مرہٹوں' سکھوں اور جاٹوں کی بغاوتوں کا سہرا ان کاشتکار فوجیوں کے سر جاتا ہے جن کو سرکاری سطح پر بہت ستایا گیا تھا۔ ستنامی بھی کاشتکاری کرتے تھے اور تھوڑی زمین سے اپنی محنت کا بہتر صلہ اچھی اور زیادہ پیداوار کی شکل میں حاصل کرتے اور مقابلتاً بہتر زندگی گذارتے تھے۔ غیر مسلم نیچ اقوام جب بھوکوں مرنے لگتیں تو سکھ سردار ان کو پاہل کی رسم پر آمادہ کر کے سکھ بنا لیتے اور اپنے لوٹ مار کے جتھوں میں شریک کر لیتے۔ مرہٹوں کو طاقت ملی تو انہوں نے بھی غریب کسانوں کو پھر سے لوٹنا شروع کیا۔ سکھوں کو حکومت ملی تو وہ بھی غریب کسانوں کے دشمن بن کر ابھرے اور کئی کئی نقلی جاگیردار مسلط کر کے وہی کھیل شروع کر دیا جس نے انہیں بغاوت پر آمادہ کیا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے زرعی بحران نے ملک کو تباہی اور ویرانی کے سوا کچھ نہ دیا۔

1753-54ء کی خانہ جنگی کے اسباب اور نتائج

بادشاہ محمد شاہ 1748ء (1161ھ) میں وفات پا گیا تو 18 اپریل 1748ء کو اس کا بیٹا ابوالناصر احمد شاہ مجاہد الدین کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ یہ عورتوں کا رسیا اور عیاش حکمران تھا۔ اس کے زنان خانہ کی وسعت ایک میل سے زیادہ رقبہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ چنانچہ وہ امور سلطنت سے بے پرواہ ہو کر عیش و عشرت میں مگن رہا۔

ادھر امرائے سلطنت کا کردار بھی ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنا رہ گیا تھا اور وہ جاہ و حشمت کے حصول میں تمام اخلاقی حدود پھاند گئے حتیٰ کہ مغلوں کے دشمن جاٹوں سے مل کر سلطنت مغلیہ کے خلاف سازشوں میں شریک ہو گئے۔ احمد شاہ کے وزیر غازی الدین نے مرہٹوں کی مدد حاصل کی اور بادشاہ کے خلاف فوج کشی کر دی۔ سکندرہ کے مقام پر شاہی فوج کو شکست ہوئی۔ احمد شاہ گرفتار ہوا اور اس کی والدہ بھی ساتھ ہی گرفتار کر لی گئی۔ 5 جون 1754ء کو دونوں اسیروں کی آنکھیں نکال دی گئیں۔ اور انہیں سلیم گڑھ کے قلعہ میں قید کر دیا گیا جہاں 1770ء میں احمد شاہ نے وفات پائی اور ساری زندگی میں سے صرف چھ سال تک اس کی عیاشانہ حکومت قائم رہ سکی۔ اس کے بعد ذلت اور کسمپرسی نے آن گھیرا۔

احمد شاہ کو قید کر کے امراء نے جہاندار شاہ کے بیٹے عز الدین ثانی کا لقب دے کر بادشاہ بنا دیا جبکہ غازی الدین اس کا وزیر بن گیا اور اس نے پنجاب پر قبضہ کو مستحکم کرنے کی ٹھانی لیکن احمد شاہ ابدالی نے پنجاب اور پھر دہلی کو تاراج کیا اور روہیلہ سردار نجیب الدولہ خاں کو اپنا

قائم مقام بنا کر واپس چلا گیا۔ غازی الدین خاں نے مرہٹوں سے سازباز کر کے ان کا دہلی اور پنجاب پر قبضہ کروا دیا اور نجیب الدولہ روہیل کھنڈ کی طرف بھاگ گیا۔

پنجاب کے پٹھان حاکم فریاد لے کر کابل پہنچے۔ احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں پر حملہ کر کے ان کا اقتدار چھین لیا۔ غازی الدین نے عالمگیر ثانی کو قتل کر دیا اور وہ خود سورج مل نامی جاٹ کے ہاں پناہ گزین ہو گیا۔ مرہٹوں کی شکست نے مسلمانوں کو کسی حد تک سنبھالا دیا۔

باب 12

برصغیر کی خود مختار اور نیم خود مختار حکومتیں

تغلق خاندان کے بعد سے الگ الگ صوبوں کے حاکم خود مختار بن گئے تھے اور دہلی کی حکومت سمٹ کر رہ گئی تھی۔ شیر شاہ سوری نے اس بدانتظامی کو دور کیا لیکن اس کی عمر نے وفا نہ کی لہٰذا وہ زیادہ کامیاب نہ ہو سکا۔ سوریوں کے عہد میں ملتان کا صوبہ خود مختار تھا۔ جہاں لنگاہ خاندان کی حکومت تھی۔ دہلی' آگرہ اور بنگالہ میں پٹھانوں کی حکوت تھی۔ راجپوتانہ اور مارواڑ میں راجپوت حکمران تھے۔ ان میں رانا اودے پور بڑا طاقتور حکمران تھا۔

مالوہ کی اسلامی حکومت بھی خود مختار تھی جبکہ دکن پر بہمنیہ خاندان کے اختتام کے بعد یہ ملک پانچ ریاستوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ گجرات پر مظفر شاہ کی حکمرانی تھی۔ گولکنڈہ میں قطب شاہی خاندان حکمران تھا۔ بیجا پور پر عادل شاہی' بیدر میں برید شاہی' احمد نگر میں نظام شاہی خاندانوں کی حکومت تھی۔ ادھر وجیانگر میں ہندوؤں کی مضبوط سلطنت قائم تھی اور سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ ٹراونکور (یا سامری کی) ریاست اپنی بحری طاقت کی وجہ سے شہرت رکھتی تھی۔ ایک عرصہ تک یہ ریاستیں قائم رہیں پھر دکن کی اسلامی ریاستوں نے وجیانگر کی ہندو ریاست کو زیر کر لیا اور اسے اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ پھر مغل دور آگیا اور اس دور میں آہستہ آہستہ یہ ساری ریاستیں متحدہ اسلامی سلطنت میں جذب ہو کر رہ گئیں۔ حتی کہ اورنگ زیب کے عہد میں دکن کا کل علاقہ سلطنت مغلیہ کا حصہ تھا اور اورنگ زیب کی سلطنت کی وسعت کا یہ حال تھا کہ اس کی سلطنت بلخ سے لے کر راس کماری تک اور کراچی سے آسام تک تھی اور اس کے ساتھ چین کی سرحد تھی۔ اس بادشاہ نے پچاس برس سے زیادہ برصغیر پر حکومت کی اور 90 سال کی عمر میں وفات پائی۔ اب یہاں بعض خود مختار اور نیم خود مختار حکومتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ (روہیل کھنڈ کی راجدھانی کے بارے میں باب۔3 میں "روہیلے کون تھے" کا عنوان ملاحظہ کیجئے)

دکن کی حکومت

دکن کا لفظ سنسکرت کے لفظ دکشن (Dakshina) سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے دائیں طرف (جنوب) والا۔

شمالی ہندوستان کو جنوبی ہند سے جدا کرنے والی روایتی لائن کوہ وندھیاچل کے جنوب مغربی جانب کو الگ کرتی ہے۔ اس کو ست پڑا کہتے ہیں۔ اس خط کے جنوب میں جزیرہ نمائے ہند کا جو حصہ واقع ہے اس کی تقسیم اس طرح ہے۔

1۔ دکن خاص۔ یہ تنگ بھدرہ تک پھیلا ہوا ہے۔
2۔ جنوبی ہند۔ یہ علاقہ جزیرہ نما کے انتہائی جنوب تک پھیلا ہوا ہے۔
طبعی لحاظ سے ان دونوں حصوں کی ساخت ایسی ہے کہ ان کو دو الگ الگ وحدتیں کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ تنگ بھدرہ کی طرف کا علاقہ جنوب میں "گوا" کی بندرگاہ کو چھوتا ہے' چنانچہ کہا جاتا ہے کہ دکن کے پانچ حصے ہیں۔

1۔ مغربی حصہ۔ اس کے اردگرد سمندر اور مغربی گھاٹ ہیں۔ اسے دیش کہتے ہیں۔ اور یہی علاقہ مرہٹوں کا اصل وطن ہے۔ یہ علاقہ گھاٹوں سے آگے تک چلا گیا ہے۔ اور اس میں احمد نگر اور پونا جیسے بڑے بڑے شہر واقع ہیں۔
2۔ یہ وہ علاقہ ہے جسے قرون وسطیٰ میں "برار" کہتے تھے۔ یہاں مشہور شہر ناگپور واقع ہے۔
3۔ مرٹھ وادہ۔ قدیم ریاست حیدر آباد کا وہ حصہ ہے جہاں مرہٹی زبان بولی جاتی ہے اور اس کا صدر مقام اورنگ آباد ہے۔
4۔ تلنگانہ۔ یہاں کی اکثرت تلنگانہ بولی بولتی ہے۔ اس کا مرکزی شہر حیدر آباد ہے۔
5۔ جنوب مغربی علاقہ۔ اس کا مشہور اور بڑا شہر بیجا پور ہے۔ کہتے ہیں کہ رام اور راون کی دیومالائی جنگ اسی علاقہ میں وقوع پذیر ہوئی تھی۔

اگر اس افسانوی کہانی کو نظرانداز بھی کر دیں تو یہ بات یقینی ہے کہ یہاں آریائی تمدن موریہ حکومت کے خاتمے تک پھیل چکا تھا۔ موریاؤں کے بعد آندھروں نے یہاں تقریباً پانچ سو سال تک حکومت کی۔

اسلامی ادوار : پہلے پہل 693ھ (1294ء) سلطان جلال الدین فیروز خلجی کے بھتیجے علاؤ الدین نے دیوگری (دولت آباد) پر چڑھائی اور "یادون" کے راجہ رام چندر کو خراج دینے پر مجبور کیا۔ پھر اس ریاست کا الحاق 718ھ (1318ء) میں دہلی کی اسلامی سلطنت کے ساتھ ہو گیا۔ پھر محمد بن تغلق نے "وارنگل" کے مقبوضات کو اپنی حکومت میں مدغم کر لیا اور دیوگری کو اپنا دوسرا دارالخلافہ بنایا۔ جس کا نام دولت آباد رکھا گیا۔ آخر 746ھ (1345ء) میں اس کے دکنی امراء نے بغاوت کر دی اور اسمٰعیل مخ کو دکن کا پہلا حکمران چنا گیا۔ 748ھ (134آء) میں اس کی جگہ ظفر خان بادشاہ ہوا اور اس نے علاؤ الدین حسن بہمن شاہ کا لقب اختیار کیا اور اس طرح اس نے بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھ دی۔ بہمنوں نے دکن کی سلطنت کو خوب وسعت دی اور اسے پورے دکن تک پھیلا دیا۔ دارالخلافہ کے طور پر پہلے احسن آباد یعنی گلبرکہ کو اعزاز بخشا پھر محمد آباد یعنی بیدر کو دارالحکومت بنایا گیا۔

پندرھویں صدی کے آخر اور سولھویں صدی کے آغاز میں بہمنی صوبوں کے والیان نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور آزاد ہو گئے اور بہمنی سلطنت کے گویا پانچ حصے ہو گئے۔
1۔ احمد نگر۔ 2۔ بیجا پور۔ 3۔ برار۔ 4۔ بیدر۔ 5۔ گولکنڈہ۔
یہ پانچ حکومتیں قائم ہو گئیں تو ان کا انتظام اس طرح تھا۔

1۔ احمد نگر میں نظام شاہی حکمران برسر اقتدار آئے۔
2۔ بیجاپور پر عادل شاہیوں نے حکومت کرنا شروع کر دی۔
3۔ برار میں عماد شاہی خاندان حکومت کرنے لگا۔
4۔ بیدر پر برید شاہی قابض ہو گئے۔
5۔ گولکنڈہ پر قطب شاہی حکومت کرنے لگے۔

پھر یہ ہوا کہ برار اور بیدر کو جلد ہی احمد نگر کی سلطنت میں شامل کر لیا گیا پھر شاہجہان کے عہد میں 1042ھ (1632ء) میں احمد نگر مکمل طور پر سلطنت دہلی کا حصہ بن گیا۔ 1097ھ (1686ء) میں بیجاپور کو دہلی کی سلطنت میں شامل کیا گیا جبکہ 1098ھ (1687ء) میں گولکنڈہ بھی مغل سلطنت کا حصہ بن گیا۔ یہ الحاقات اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ہوئے۔

مرہٹوں کی چھیڑ چھاڑ : دکن میں مرہٹوں نے شورشیں جاری رکھیں اور مغلوں کے لئے یہ علاقہ دردِ سر بنا رہا۔ مرہٹوں نے 1085ھ (1674ء) میں شیوا جی کی قیادت میں اپنی الگ حکومت قائم کر لی۔ چنانچہ اس کا قلع قمع کرنے کے لئے اورنگ زیب نے اپنی مہمات کی قیادت کے لئے اورنگ آباد کو مرکزی مقام ٹھہرایا اور اس کا انتقال بھی اسی مقام پر 1119ھ (1707ء) میں ہوا۔

آصف جاہ کی حکومت : دکن کی تاریخ میں دوسری اہم تاریخ 1136ھ (1724ء) ہے۔ جب نظام الملک آصف جاہ نے مبارز خاں کو "شکر کھیڑا" کے مقام پر شکست فاش دی اور پورے دکن پر قبضہ جما لیا۔ آصف جاہی خاندان نے پہلے اورنگ آباد اور پھر حیدر آباد میں رہ کر دکن پر بڑے موثر انداز میں حکومت کی۔ پھر 1948ء میں بھارت نے اس ریاست پر حملہ کر کے اسے بھارت میں شامل کر لیا اور نظام دکن سر میر عثمان علی خاں آصف جاہ ہفتم کو بھارت کے صدر نے ریاست حیدر آباد دکن کا آئینی سربراہ بنا دیا۔ پھر 1956ء میں اس ریاست حیدر آباد دکن کو لسانی اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور ان کو صوبہ آندھرا، صوبہ بمبئی اور صوبہ میسور میں شامل کر دیا گیا۔

بنگال یا بنگالہ کا صوبہ

یہ نام بنگا یا ونگا سے مشتق ہے۔ یہاں کسی زمانے میں غیر آریائی قوم آباد تھی جس کا نام بنگا یا ونگا تھا۔ اس بات کا ذکر سنسکرت کی رزمیہ کتابوں اور دھرم ساستروں میں ملتا ہے۔ چنانچہ بنگا کا لفظ اس علاقے کے لئے بولا جانے لگا جہاں یہ قوم آباد تھی۔ بارھویں صدی کے آخر تک بنگالہ اس سرزمین کو کہا جانے لگا۔ جو موجودہ بنگال کے مشرقی اور جنوبی حصوں پر مشتمل تھی۔ غیاث الدین بلبن کے عہد میں ضیاء الدین برنی نے "فاتح اقلیم لکھنوتی اور عرصہ بنگالہ" کا ذکر کیا ہے۔ لکھنوتی اور بنگالہ دو الگ الگ حصے تھے۔ بنگال کے یہ دونوں حصے سلطان الیاس شاہ کے عہد میں متحد ہو گئے تھے۔ اور ان کا نام بنگال یا بنگالہ رکھا گیا۔ چنانچہ الیاس شاہ نے اپنا لقب شاہ بنگال یا شاہ بنگالیاں اختیار کیا تھا (بحوالہ تاریخ فرشتہ جلد 2 صفحہ 296) چنانچہ اسی دور سے بنگال سے مراد وہ جغرافیائی خطہ مراد لیا جانے لگا جو تلیاگڑھی سے چاٹگام تک ہمالیہ کی ترائی سے خلیج بنگال تک پھیلا ہوا ہے۔

آئین اکبری اور تزک جہانگیری میں بنگالہ کی حدود تقریباً وہی ہیں جو برطانوی ہند میں صوبہ بنگال کی تھیں۔ یہاں قدیم زمانے سے لے کر اسلامی دور تک مختلف لوگ حکمران رہے۔

اسلامی دور : قطب الدین ایبک کے ایک ترک سپہ سالار اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی نے جنوبی بہار میں مسلم سلطنت کی توسیع کے لئے بنگال کی طرف کوچ کیا اور صرف اٹھارہ سواروں کے ساتھ 1201ء میں سین راجہ کے دارالحکومت ندیا میں داخل ہو گیا۔ یہ سنتے ہی لکشمن سین محل کے پچھلے دروازہ سے فرار ہو گیا اور اس طرح ندیا پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ پھر وریندرا اور گور کے علاقے بھی مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ محمد بن بختیار خلجی 1205ء میں فوت ہوا تو علی بن مردان نامی ایک سردار دہلی پہنچا اور بادشاہ سے اختیار نامہ لے کر ایبک کے ایک گورنر کی حیثیت سے بنگال کا حاکم بن گیا اور لکھنوتی کو صدر مقام بنا کر حکومت کرنے لگا۔ اور یہاں کے پہلے نام نہاد حاکم عز الدین محمد شیران کو شکست دے کر بھگا دیا چنانچہ بنگال کا پہلا مسلمان بادشاہ علی بن مردان ہی تھا۔

1210ء میں قطب الدین ایبک لاہور میں پولو کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر وفات پا گیا تو علی بن مردان نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ لیکن اس کے ظلم و جور سے تنگ آئے ہوئے خلجی امراء نے اسے 1211ء میں قتل کر دیا اور حسام الدین خلجی سلطان غیاث الدین کے لقب سے بادشاہ بن گیا۔ اس کے عہد میں بنگال نے بڑی ترقی کی اور اس کی طاقت کا یہ حال تھا کہ اڑیسہ، کام روپ اور وکرم پور کے راجے خراج دینے لگے۔

1219ء میں اس بادشاہ نے بحری جہازوں کا بیڑہ تیار کیا اور جب 1225ء میں سلطان شمس الدین التمش نے بہار اور بنگال پر حملہ کیا تو بادشاہ حسام الدین خلجی نے اس کی اطاعت قبول

کر لی لیکن اس کے واپس ہوتے ہی بگڑ بیٹھا چنانچہ التمش کے لڑکے ناصر الدین نے اسے 1227ء میں شکست دی اور بادشاہ کو گرفتاری کے بعد قتل کر دیا گیا اس طرح بنگال کی پہلی آزاد حکومت ختم ہو گئی۔

اس کے بعد (1227ء تا 1287ء) بنگال کا صوبہ دہلی کی سلطنت کا ایک حصہ رہا۔ اور یہاں متعدد صوبیدار مقرر ہوئے لیکن ان میں سے اکثر خود مختار رہے۔ بلبن کے عہد میں (1265ء تا 1287ء) اس علاقہ کا گورنر غیاث الدین بلبن کا معتمد خاص اور اس کا غلام مغیث الدین طغرل تھا۔ 1279ء میں جب بادشاہ کی عدالت کے باعث اس کی وفات کی افواہ گرم ہوئی تو ان دنوں طغرل نے اڑیسہ اور گونڈوانہ میں فتوحات حاصل کی تھیں۔ چنانچہ اس نے مال غنیمت کا پانچواں حصہ بادشاہ کو بھجوانے کی بجائے اپنے ہی پاس رکھ لیا اور اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور بلبن کے بھیجے ہوئے دو لشکروں کو یکے بعد دیگرے شکست بھی دی اور اپنی خود مختاری کو قائم رکھا۔ آخر غیاث الدین بلبن بذات خود لشکر کی قیادت کرتا ہوا 1280ء میں بنگال پر حملہ آور ہوا۔ چنانچہ طغرل تاب نہ لا کر جاج نگر کی طرف فرار ہو گیا اور بنگال کے وسیع علاقے سلطنت دہلی کے قبضہ میں آ گئے۔ آخر طغرل کا تعاقب جاری رہا اور اسے 1284ء میں قتل کر دیا گیا اور بلبن نے اپنے بیٹے بغراخاں کو لکھنوتی اور عرصہ بنگال کا حاکم مقرر کر دیا اور خود واپس دہلی آ گیا۔

بغرا خاں کے بعد سے بنگالہ کی صوبیداری موروثی ہو گئی۔ چنانچہ یہ بلبنی حکمران سلطنت دہلی کی سیادت کو تسلیم تو کرتے تھے لیکن اپنے صوبے کے معاملات میں خود مختار بھی تھے۔

1290ء میں دہلی کی حکومت خلجیوں کو ملی اور 1320ء میں اس پر تغلقوں کا قبضہ ہوا لیکن بنگال میں بلبنی حکمران ہی رہے اور دہلی کی سیادتوں کو بنگال کے حکمرانوں کی آزادی طوعاً یا کرہاً تسلیم ہی کرنا پڑی اور اسلامی حکومت کے عہد میں یہاں بہت ترقی ہوئی اور یہاں دو خاندان حکمران رہے۔ ایک حاجی الیاس کا خاندان دوسرا علاؤ الدین حسین کا خاندان۔ الیاس شاہی حکومت 1342ء میں حاجی ملک الیاس نے قائم کی اور 1486ء میں اس کے فوجی حبشیوں نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ آخر 1493ء میں حبشیوں کا زور توڑ دیا گیا اور حسین شاہی خاندان (1493ء تا 1537ء) برسر اقتدار آ گیا اور حسین شاہ نے باگ ڈور سنبھال لی۔ آخر وہ 1519ء میں وفات پا گیا اور اس کا بیٹا حاکم مقرر ہوا۔ جس کا شاہی نام نصرت شاہ تھا۔ اس کے عہد میں راماین اور مہا بھارت کا بنگالی میں ترجمہ کیا گیا اور اس عرصہ میں بابر نے چندیری کا قلعہ فتح کر لیا اور آخر نصرت شاہ نے بابر کی اطاعت کی اور خراج گزاری قبول کر لی۔ 1532ء میں نصرت شاہ اپنے ایک غلام کے ہاتھوں قتل ہو گیا تو نصرت کا بیٹا علاؤ الدین فیروز شاہ تخت کا وارث ہوا جسے نصرت کے چھوٹے بھائی غیاث الدین محمود نے قتل کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ 38-1537ء میں شیر شاہ سوری نے بطور شیر خاں سور بنگالے پر حملہ کیا اور محمود کو بھگا دیا اور ہمایوں بھی اس کی مدد کو نہ پہنچ سکا۔ اتنے میں محمود کو اس کے دو بیٹوں کی ہلاکت کی خبر ملی جس نے اسے بھی موت کی وادی میں پہنچا دیا اور اس طرح بنگال کے خود مختار حکمرانوں کا خاتمہ ہو گیا اور 1538ء میں ہمایوں کا گوریا

غور پر قبضہ ہو گیا اور اس کا نام جنت آباد رکھا۔ پھر وہ 26 جون 1539ء کو بصد مشکل جان بچا کر دہلی پہنچا۔ کیونکہ شیر خان کی افواج نے اسے شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ چنانچہ شیر خان نے سب سے پہلے بنگال کو فتح کیا' یہاں ہمایوں کا مقرر کردہ گورنر قلی بیگ مارا گیا اور گور پر افغان قابض ہو گئے۔ 1541ء شیر خاں نے بنگال کا گورنر خضر خاں ترک کو مقرر کیا۔ پھر اسے پتہ چلا کہ خضر خاں سابقہ حکمران محمود کی بیٹی سے شادی کر کے خود مختاری کے خواب دیکھ رہا ہے تو اسے گرفتار کر لیا اور اس کی جگہ قاضی فضیلت کو گورنر بنگال بنا دیا۔

شیر شاہ سوری 1545ء تک بادشاہ بنا رہا لیکن اس کی اچانک حادثاتی موت کے بعد کہ بارود خانے کو آگ لگ گئی تھی۔ اس کا بیٹا اسلام شاہ بادشاہ بن گیا۔ اس کے عہد میں بنگال کا گورنر محمد خاں تھا۔ اسلام شاہ 22 نومبر 1554ء کو وفات پا گیا تو محمد خاں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور شمس الدین محمد شاہ غازی کے نام سے حکومت کرنے لگا۔ اس نے جونپور پر قبضہ کیا اور اراکان پر حملہ بھی کیا۔ وہ چھپر گھاٹ کے مقام پر ہیمو کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اور اس کا بیٹا خضر خاں غیاث الدین حکمران بن گیا۔ وہ 1560ء میں فوت ہوا تو خانہ جنگی میں حکمران خاندان مارا گیا۔ آخر 1563ء میں کررانی افغانوں کے سربراہ سلیمان خاں نے بنگال پر اقتدار حاصل کیا۔ اور مملکت میں اڑیسہ تک توسیع کر لی۔ وہ بے نام کا بادشاہ بن کر حکومت کرتا رہا حتیٰ کہ 11 اکتوبر 1572ء کو وفات پا گیا۔ اس نے اپنی حکمرانی کے دور میں اکبر کے نام کا خطبہ پڑھوا کر اقتدار کو قائم رکھا۔ پھر اس کے جانشین اپنا اقتدار قائم نہ رکھ سکے۔ آخر 1575ء میں پٹنہ کے قلعہ میں محصور آخری بنگالی حکمران داؤد بیگ شکست کھا گیا اور بنگال پر مغل قابض ہو گئے۔

اکبر کا مقرر کردہ حاکم بنگال منعم خاں جلد ہی وفات پا گیا تو حسین قلی بیگ نے حکومت سنبھالی لیکن 1580ء میں بنگال کا نیا ناظم مظفر خاں بنا جو ترتی کررانیوں کی بغاوت میں قتل ہو گیا تو وہاں کے امراء نے اکبر کے بھائی مرزا حکیم کی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور مجنوں خاں تقشال بنگال کا حاکم مقرر ہوا۔ مرزا کلیم کابل میں شکست کھا گیا ادھر تقشال بھی فوت ہو گیا۔ آخر اپریل 1582ء میں خان اعظم بنگال کا گورنر مقرر ہوا۔

جہانگیر کے دور میں مان سنگھ اور اسلام خاں بنگال کے گورنر رہے۔ 1619ء میں مغلوں کا کوچ بہار پر قبضہ ہوا جبکہ 1622ء میں کامروپ' نواکھلی اور مدناپور کے علاقے مغلوں کے زیر تسلط آئے۔ 1611ء میں سنار گاؤں پر مغل قابض ہو چکے تھے۔ اور 1612ء جیسور کی راجدھانی کا الحاق بھی مغلوں نے کر لیا۔ 1612ء میں ہی دو لسباپور کی جنگ میں خواجہ عثمان زخمی ہو کر 12 مارچ کو فوت ہو گیا۔ اس کا مددگار بایزید کررانی گرفتار ہو گیا۔ بعد ازاں اپریل 1612ء میں صدر مقام راج محل کی بجائے ڈھاکہ مقرر ہوا اور اس کا نام جہانگیر رکھا گیا۔ جہانگیر کے خلاف جب شہزادہ خرم نے بغاوت برپا کی تو وہ دکن سے اڑیسہ ہوتا ہوا مدن پور تک آیا اور پھر بردوان پر قابض ہو گیا۔ بنگال کا گورنر نور جہاں کا بھائی ابراہیم خاں تھا وہ ایک جنگ میں 1624ء میں کام آیا اور جہانگیر نگر پر شہزادہ خرم کا قبضہ ہو گیا اور اس نے خان خاناں کے لڑکے داراب

خاں کو بنگال کا گورنر بنا دیا۔ 1624ء میں ہی گورنر مہابت خاں کو مقرر کیا گیا اور داراب خاں مارا گیا۔ ادھر نورجہاں نے سازش کی اور مہابت خاں کو بغاوت کا سہارا لینا پڑا اور وہ جون 1626ء میں شہزادہ خرم کا حامی اور ساتھی بن گیا۔

اب بنگال کی گورنری فدائی خاں کو ملی اور اس نے پانچ لاکھ روپیہ سالانہ جہانگیر کو اور اتنی ہی رقم نور جہاں کو الگ الگ بھیجنا شروع کی اور پھر حضرت مجدد الف ثانی کے ارشاد کے مطابق مہابت خاں اور شہزادہ خرم نے بادشاہ سے صلح کر لی۔

جب خرم شاہجہان بن کر سامنے آیا تو اس کے اور عالمگیر عہد میں بھی تقریباً اسی (80) سال تک بنگال میں امن و امان قائم رہا۔

شہزادہ محمد شجاع' شائستہ خاں' اور شہزادہ عظیم الشان نے بنگال پر بالترتیب 21 سال' 23 سال اور دس سال تک حکومت کی۔

عالمگیر کے بعد : ریاست اراکان میں آباد پرتگیز آگے بڑھ کر ہگلی پر بھی قابض ہو چکے تھے اور بحری قزاق بن کر لوٹ مار مچانے لگے تھے اور اراکان کے راجے مغلوں کے خلاف جو بھی اقدام کرتے پرتگیز ان موقعوں پر اراکان حکمرانوں کی مدد کرتے۔ چنانچہ ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے مغل علاقوں میں تجارت اور استحکام سلطنت کو ضعف پہنچ رہا تھا۔ چنانچہ تین ماہ کے مسلسل محاصرے کے بعد ستمبر 1632ء میں مغلوں نے ہگلی پر قبضہ کر لیا اور پھر 38-1637ء میں "کام روپ" پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔

اپریل 1639ء سے اپریل 1660ء تک شہزادہ شجاع نے بنگال پر حکومت کی۔ اس نے پھر سے صدر مقام ڈھاکہ کی بجائے راج محل کو قرار دیا۔ اس کے عہد میں ولندیزوں اور انگریزوں کو تجارتی سہولتیں اور اجازت نامے دیئے گئے۔ شاہجہان کی علالت کے دنوں میں دہلی کی حکومت پر قابض ہونے کے لئے تخت نشینی کے لئے جو جنگ ہوئی اس میں شاہ شجاع نے عالمگیر کے سپہ سالار میر جملہ اور شہزادہ محمد سلطان سے کھجوا کے مقام پر شکست کھائی اور وہ 30 دسمبر 1658ء کو مونگیر اور رانگا مائی ہوتا ہوا بنگال کے دارالحکومت راج محل پہنچنے میں کامیاب ہو گیا' وہاں سے وہ ٹانڈہ پہنچا۔ اس موقع پر شجاع کو پرتگیزوں نے مدد دی اور پھر ایسا ہوا کہ شہزادہ محمد سلطان بھی شجاع سے جا ملا اور میر جملہ کو برسات میں شدت آنے کی وجہ سے کافی نقصان اٹھانا پڑا اور اس کی فوج نے میر جملہ کے حکم سے پسپائی اختیار کر لی لیکن 1660ء میں جونہی بہار سے میر جملہ کو کمک ملی اس سے شہزادہ شجاع کو گنگا کے پار دھکیل دیا اور وہ ادھر ادھر ہوتا ہوا مئی 1661ء میں اراکان جا پہنچا اور ڈھاکہ پر میر جملہ کا قبضہ ہو گیا اور اس طرح بنگال عالمگیر کے زیر نگیں آ گیا۔

اس کامیابی پر میر جملہ کو ہفت ہزاری منصب اور بنگال کی گورنری ملی اور ڈھاکہ پھر سے بنگال کا صدر مقام بن گیا۔ 1662ء میں میر جملہ نے کوچ بہار پر قبضہ کر لیا اور ساتھ ہی آسام کو زیر کر کے باجگزار بنا لیا۔ یہاں سے وہ چین کی طرف بڑھنے کا ارادہ رکھتا تھا کہ آسام کی

شدید بارشوں نے اس کا راستہ روک لیا اور اس مہم کی ناکامی نے اسے بہت ہی بددل کر دیا اور وہ اس مہم سے جہانگیر نگر واپس آتے ہوئے 1663ء میں وفات پا گیا۔

اس زمانے میں انگریزوں نے اپنی تجارتی کوٹھی ہگلی میں بھی قائم کر رکھی تھی اور ان کے گماشتے بغیر محصول ادا کئے مال لانے اور لے جانے میں بدنام تھے۔ انگریزوں نے کوٹھی کو قلعہ کی شکل دینا چاہی تو مغل حکام نے انہیں ایسا کرنے سے جبراً روک دیا۔ چنانچہ انگریزوں نے مغل حکومت کو نیچا دکھانے کے لئے جنگی جہازوں کی مدد سے چاٹگاؤں پر چھاپہ مارا تاکہ قبضہ جما سکیں لیکن ان کی یہ کوشش ناکام بنا دی گئی۔

انگریزوں سے 20 دسمبر 1686ء کو ہگلی چھن گیا۔ اگلے سال کے شروع میں بالاسور بھی ان سے چھین لیا گیا۔ اگست 1687ء میں انگریزوں نے مصالحت کی راہ اختیار کی تو انہیں ہگلی میں دوبارہ تجارتی کوٹھی بنانے کی اجازت مل گئی نیز کلکتہ کے نزدیک ایک قلعہ بنانے کی اجازت بھی مرحمت کر دی گئی۔ یہ قلعہ بمقام "الوبیریا" بنانے کی اجازت ملی تھی۔ لیکن انگریزوں نے بمبئی کے نزدیک مغل جہازوں پر حملہ کر کے قزاقی کا مظاہرہ کیا تو شائستہ خاں نے انگریزوں سے ہر دو مراعات واپس لے لیں نیز ایک شاہی فرمان کے ذریعے انگریزوں کی وہ کوٹھیاں' جو بنگال کے علاوہ اور جگہوں مثلاً" سورت وغیرہ میں تھیں' بھی ضبط کر لیں اور تمام انگریزوں اور ان کے گماشتوں کو گرفتار کر لیا' جو موقع سے فرار نہ ہو سکے تھے۔ یہ کاروائی 1685ء تا 1688ء وقوع پذیر ہوئی۔ چنانچہ انگریزوں کو ذلیل ہونا پڑا۔ اب انہوں نے مغل امیروں وزیروں کی منت سماجت اور خوشامد کر کے بعد مشکل دوبارہ تجارتی مراعات حاصل کیں لیکن یہ مراعات پہلے سے بہت زیادہ سخت شرائط پر حاصل کی گئیں۔

چنانچہ 1690ء میں کلکتہ شہر بسانے کا عمل شروع ہوا۔ اسی سال فرانسیسیوں نے چندر نگر کی بنیاد رکھی اور پھر غیر ملکی تاجروں کی ریشہ دوانیاں رنگ لانے لگیں۔ شائستہ خاں کے بعد ابراہیم خاں کو بنگال کا گورنر بنایا گیا اور اس کے بعد عظیم الدین کو لیکن اب حالات تیزی سے دگرگوں ہو رہے تھے۔ اورنگ زیب کے آخری زمانے میں اس کا پوتا عظیم الشان بنگال کا حاکم تھا۔ دسمبر 1700ء میں مرشد قلی خاں یہاں کا دیوان ہو کر آیا اور اس نے بہت سے اصلاحی اقدامات کئے جس سے خزانہ بھی بھر گیا۔ 1704ء میں اس نے ڈھاکہ سے سوا دو سو کلومیٹر دور مشرق میں مقصود آباد کو بطور دیوان اپنا صدر مقام بنا لیا۔ جس کا نام اسی کے نام سے مرشد آباد مشہور ہوا اور جب یہ بنگال کا صوبیدار ہوا تو اس نے مرشد آباد کو صوبے کا صدر مقام بنا لیا۔ 1707ء کے بعد مرشد قلی خاں بے روزگار ہو گیا۔ تاہم 1710ء میں شاہ عالم بہادر شاہ نے اسے پھر دیوان مقرر کر دیا اور فرخ سیر کے عہد میں اسے اگست 1717ء میں بنگال کا صوبیدار بنا دیا گیا۔

مرشد علی قلی خاں ایک اچھا منتظم بن کر ابھرا اور اس نے بہت سی اصلاحات نافذ کیں۔ چنانچہ لارڈ کلائیو مرشد آباد کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ شہر برطانیہ کے شہر لندن کے

برابر وسیع ہے اور یہاں لندن سے بھی زیادہ تعداد میں لکھ پتی لوگ آباد ہیں۔ زرعی ترقی کا یہ حال تھا کہ ان دنوں میں ایک روپے میں پانچ من چاول مل جاتے تھے۔ مرشد قلی خاں نے 30 جون 1727ء کو وفات پائی اور اس کا داماد شجاع الدولہ (جو اڑیسہ کا گورنر تھا) بنگال کا گورنر مقرر ہو کر آیا اور 1727ء سے 1739ء تک یہ خدمت انجام دیتا رہا۔ اس نے فوج کو ترقی دے کر اس کی تعداد پچاس تک بڑھالی اور اقتصادی اور زرعی اصلاحات کے نتیجہ میں ایک روپے کا آٹھ من چاول ملنے لگا۔

- محمد شاہ نے 1733ء میں بہار کو صوبہ بنگال اور اڑیسہ کے ساتھ ملحق کر دیا۔ شجاع الدولہ نے اپنی نظامت کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا یعنی:

1۔ ڈھاکہ
2۔ اڑیسہ
3۔ بہار

اور خود تینوں حصوں کی نظامت کے فرائض نبھانے لگا۔ جبکہ ڈھاکہ، بہار اور اڑیسہ میں مرشد قلی خاں دوم، علی وردی خاں اور محمد تقی خاں کو نائب ناظم مقرر کیا۔ 13 مارچ 1739ء کو شجاع الدولہ نے وفات پائی اور اس کا بیٹا سرفراز علاؤ الدولہ حیدر جنگ کے نام سے بنگال کے مسند پر بیٹھا۔ لیکن وہ علی وردی خان سے مات کھا گیا۔ کیونکہ سرفراز کے مشیروں نے ایک طرف تو علی وردی خاں کو بنگال پر حملہ کرنے کی دعوت دی اور دوسری طرف علی وردی خاں نے بہت کچھ دینا کر کے، معاوضے میں بنگال کی نظامت کی سند حاصل کر لی۔ آخر تلیا گڑھی کے نزدیک جنگ ہوئی جس میں سرفراز مارا گیا اور 10 اپریل 1740ء کو علی وردی خاں بنگال پر قابض ہو گیا اور مرشد آباد کے چہل ستون محل میں رہائش اختیار کر لی۔ اس کے فوراً بعد علی وردی خاں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اڑیسہ کے نائب مرشد قلی خاں دوم کو دکن سے بھگا دیا۔

اڑیسہ پر قبضہ ہوتے ہی علی وردی خاں کو مرہٹوں سے لڑنا پڑ گیا اور یہ سلسلہ گیارہ سال تک جاری رہا۔ دوسری طرف اس کے پٹھان سپاہی بھی علی وردی خاں کے لئے مشکلات کھڑی کرتے رہے کیونکہ میر حبیب، مرتضیٰ خاں اور شمشیر خاں وغیرہ امراء مرہٹوں کے ساتھ مل کر علی وردی خاں کے لئے مسئلہ بنتے رہے لیکن علی وردی خاں اپنی جگہ قائم رہا اور اسے کوئی زیادہ نقصان نہ پہنچایا جا سکا۔ علی وردی خاں غیر ملکی تاجروں کو بھی کھلی چھٹی نہیں دیتا تھا اور ان کی کوٹھیوں کے گرد فصیلیں بنانے اور دمدمے تعمیر کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ آخر اپریل 1756ء میں اس نے وفات پائی اور اس کا نواسہ سراج الدولہ مسند نشین ہوا۔

سراج الدولہ کو شروع ہی سے ایسے لوگوں خصوصاً رشتہ داروں سے نبرد آزما ہونا پڑا کہ جاہ طلبی جن کا مطمع نظر ہوتا تھا۔ ان میں سراج الدولہ کا چچا زاد بھائی شوکت جنگ (جو پورنیا کا حاکم تھا) بھی تھا اور فوج میں بخشی کے عہدہ پر متمکن اس کا سوتیلا پھوپھا میر جعفر بھی ایسا ہی جاہ

پرست تھا۔ ان کے ساتھ انگریز بہادر کے چیلے چانٹے اور انگریزی اہلکار بھی سازباز میں مصروف تھے۔ تاکہ ایک مخلص مقامی حکمران کو شکست دے سکیں لیکن سراج الدولہ نے بڑی ہمت دکھائی اور جرات سے کام لے کر اس نے گھسیٹی بیگم کے موتی جھیل محل پر قبضہ کر لیا اور پھر انگریزوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اور جون 1756ء تک وہ قاسم بازار اور کلکتہ پر قبضہ کر چکا تھا۔

اس کا سوتیلا پھوپھا میر جعفر سراج الدولہ کے بالمقابل شوکت جنگ کو بر سر اقتدار لانے کا خواہش مند تھا۔ تاکہ اسے کٹھ پتلی سربراہ بنا کر خود اقتدار اعلیٰ کے مزے لوٹ سکے۔ سراج الدولہ کو اس سازش کا بروقت پتہ چل گیا۔ چنانچہ اس نے اکتوبر 1756ء میں پورنیا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور شوکت جنگ اس لڑائی میں مارا گیا پھر وہ فروری 1757ء میں کلکتہ کی طرف بڑھا اور وہاں سے انگریزوں کو نکال باہر کیا۔

اب انگریزوں نے میر جعفر جیسے قوم فروش کو ساتھ ملایا نیز ہندو سیٹھوں کی خدمات بھی حاصل کیں۔ اور بعض مسلمان اہلکاروں کو خرید کر سراج الدولہ کے ساتھ ٹکر لینے کا منصوبہ بنایا۔

جنگ پلاسی : سراج الدولہ اور اس کی فوجیں پلاسی کے مقام پر جمع ہو گئیں۔ یہاں انگریزی فوج پہلے ہی ڈیرے ڈالے ہوئے تھی۔ 22 جون 1757ء کو انگریزوں نے سراج الدولہ سے جنگ چھیڑ دی اور اگلے روز میر جعفر اینڈ کمپنی کی غداری سے وہ سراج الدولہ کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔ سراج الدولہ شکست کھا کر مرشد آباد پہنچا اور وہاں سے عظیم آباد کو چلا کہ اثنائے راہ میں اسے گرفتار کر کے مرشد آباد لایا گیا جہاں میر جعفر کے بیٹے میرن کے حکم سے سراج الدولہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور 29 جون 1757ء کا منحوس دن تھا جب ایک غدار کو سراج الدولہ کے مسند پر بٹھا دیا گیا جس کی حکومت کا دارومدار انگریزوں کی خوشنودی پر تھا۔

چنانچہ انگریز کمپنی کی خواہس کے پیش نظر میر جعفر نے انگریزوں کو سرکاری طور پر فرانسیسی مقبوضات پر قبضہ کرنے کی اجازت مرحمت کر دی اور ساتھ ہی انگریزوں کو سراج الدولہ کے ساتھ جنگی نقصان کی تلافی کے لئے ایک کروڑ بائیس لاکھ روپیہ نقد اور چوبیس پرگنہ کا ضلع کمپنی کو دے دیا اور کمپنی کے ملازمین کو فائدہ پہنچانے کے لئے سوا کروڑ روپے مزید بھی ادا کر دیئے۔ اور اس رقم میں انگریز اہلکار کلائیو کا حصہ 23 لاکھ چالیس ہزار روپیہ تھا۔ جو بعد میں لارڈ کلائیو کے نام سے شہرت یاب ہوا۔ چونکہ خزانہ میں اتنی رقم موجود نہ تھی لہٰذا کٹھ پتلی میر جعفر نے آدھی رقم کا بندوبست سامان وغیرہ فروخت کر کے اور سیٹھوں سے ادھار رقم لے کر کیا اور اس طرح یہ غدار مسلمانوں کا کٹھ پتلی حکمران بنا دیا گیا اور "کلائیو کا گدھا" کا خطاب عوام سے پایا۔

میر جعفر کی معزولی : قریباً دو سال بعد انگریزوں کو شہزادہ علی گوہر اور مرہٹوں کا مقابلہ کرنے کے لئے مزید رقم درکار تھی۔ چنانچہ میر جعفر سے رقم کا مطالبہ کیا گیا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے چنانچہ انگریزوں نے "کلائیو کے گدھے" کو معزول کر کے اس کی جگہ اس کے داماد میر

قاسم کو مسند نشین کر دیا۔ یہ 1760ء کی بات ہے چنانچہ میر قاسم نے انگریزوں کی مانگ پوری کرنے کے لئے ان کو بردوان، مدن پور اور چاٹگاؤں کے پرگنے دے دیئے اور خود نام نہاد اقتدار نبھانے لگا۔ میر قاسم کی خواہش تھی کہ وہ ایک غیرت مند حکمران کی طرح آگے بڑھے لیکن انگریز اس کے سسر کی طرح اس کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ چنانچہ میر قاسم نے لڑائی سے بچنے کے لئے دارالحکومت مرشد آباد کو چھوڑ کر مونگیر کو پایہ سلطنت بنا لیا اور انگریزوں کو محصولات بھی معاف کر دیئے لیکن ساتھ ہی مقامی تاجروں کو بھی محصولات میں چھوٹ دے دی۔ اس سے انگریزوں کو غصہ چڑھا اور انہوں نے میر قاسم سے لڑائی چھیڑ دی اور 1763ء میں پھر سے میر جعفر کو بنگال کا نواب بنانے کا اعلان کر دیا۔

میر قاسم بہار سے ہوتا ہوا "اودھ" جا پہنچا اور مغل حکومت کے سامنے صورت حال رکھی۔ چنانچہ شاہ عالم اور نواب شجاع الدولہ اس کی مدد کے لئے تیار ہو گئے لیکن شجاع الدولہ نے دھوکے سے میر قاسم کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا اور اس کی فوج کو ساتھ لے کر انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لئے نکلا۔

بکسر کی جنگ : بکسر کے مقام پر 1764ء میں انگریزوں نے شجاع الدولہ کو شکست دی۔ شاہ عالم انگریزی لشکر میں آگیا اور اس نے بنگال کے تینوں صوبوں کی دیوانی کی سند انگریزوں کے نام لکھ کر دے دی۔ اور میر جعفر نام نہاد حاکم بنا رہا۔ وہ جنوری 1765ء میں مرگیا تو اس کا بیٹا نجم الدولہ بنگال کی گدی پر بیٹھا اور اس نے انگریزوں کے وظیفہ خوار کے طور پر یہ خدمت انجام دی اور بنگال پر مکمل طور پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

انگریزی دور : میر جعفر کی موت کے بعد نوابی کا سلسلہ عملاً ختم ہو گیا۔ کمپنی کا بڑا افسر کلائیو تھا۔ اس نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کا حقدار ایسٹ انڈیا کمپنی کو قرار دیا۔ محمد رضا خاں کو بنگال کا اور راجہ شتاب رائے کو بہار کا نائب دیوان مقرر کیا۔ اور فوج کی کمان اس نے اپنے ہاتھ میں رکھی۔ پھر اس نے کمپنی کی طرف سے مقامی تاجروں پر محصولات عائد کئے لیکن کمپنی کے ملازمین کو کھیلے بازی کی کھلی چھٹی دے دی۔ اس طرح رشوت کا بازار گرم ہوا۔

70-1769ء میں سخت قحط رونما ہوا۔ جس میں ایک تہائی لوگ فوت ہو گئے۔ کمپنی کا خزانہ بھی خالی ہو گیا۔ لیکن کمپنی کے ملازمین ہزار پتی سے لکھ پتی بنتے چلے گئے۔

کلائیو (Clive) کا عبرت ناک حشر : چنانچہ 1773ء میں کلائیو پر غبن کا مقدمہ چلا اور 1774ء میں اس نے خود کشی کر لی۔ اور اس طرح خدا کو بھلا کر محض دولت کی پرستش کرنے والا ایک انسان اپنے ظالمانہ رویہ کے قدرتی اور منتقمانہ بہاؤ میں خود ہی بہتا ہوا زندگی سے نجات پا گیا۔ اب اس کی جگہ وارن ہیسٹنگز بنگال کا گورنر ہوا اور اس نے انقلابی اقدام کئے مثلاً :

1۔ اس نے بنگال اور بہار کے دیوانوں کو برخاست کر دیا۔
2۔ اس کام کے لئے بورڈ آف ریوینیو مقرر کیا گیا۔

3۔ خزانہ کو مرشد آباد سے منتقل کر کے کلکتے لایا گیا۔
4۔ نواب کی پنشن 32 لاکھ کی بجائے آدھی یعنی سولہ لاکھ کر دی گئی۔
5۔ زمین کو پانچ سالہ ٹھیکہ پر دینے کو رواج دیا۔
6۔ اودھ کے نواب وزیر سے پچاس لاکھ روپے یک مشت لے کر کڑا اور الہ آباد کے پرگنے واپس کر دیئے گئے۔

ان اقدامات کا اثر یہ ہوا کہ کمپنی کا خرچہ 20 لاکھ سے کم ہو کر 13 لاکھ تک آ گیا۔ ریگولیٹنگ ایکٹ آیا تو وارن ہیسٹنگز نے بھی بطور گورنر جنرل مال بنانا شروع کر دیا حتیٰ کہ اس نے میر جعفر کی بیوہ منی بیگم سے ساڑھے تین لاکھ روپیہ وصول کیا۔

جب برطانوی پارلیمنٹ میں 1784ء میں پٹس انڈیا ایکٹ منظور کیا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان کی سیاسی اور تجارتی حقوق کی ملکیت حاصل ہو گئی اور اس کے لئے ایک بورڈ آف کنٹرول بھی قائم کیا گیا۔

اگلا گورنر میکفرسن کے ڈیڑھ سالہ دور میں رشوت اور بدعنوانی کا زور رہا اور اس کی جگہ لارڈ کارنوالس کو لایا گیا۔ 1789ء میں لارڈ کارنوالس نے پانچ سالہ پٹے کی بجائے زمین کو دس سالہ پٹہ پر دینے کا نظام جاری کیا اور یہی نظام 1793ء میں بندوبست استمراری میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن حالات نہ سدھر سکے کیونکہ محصولات کی وصولی کا کام ہندوؤں کے پاس تھا جو اپنے ظالمانہ طریق کار سے مسلمانوں کی اراضیات اپنے نام لگوانے لگے۔ پھر مسلم قانون کی جگہ انگریزی قانون کا نفاذ عمل میں آیا۔ چنانچہ مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا۔ دفتروں میں فارسی کی جگہ' انگریزی رائج کر دی گئی اور اس طرح ہندو فارسی کی بجائے انگریزی میں مہارت حاصل کر کے سرکار دربار میں جگہ پانے لگے جبکہ مسلمانوں کو انگریزوں نے سابقہ حکمران ہونے کی وجہ سے ہمیشہ نظر انداز کیا۔

فرائضی تحریکیں : جنگ پلاسی میں ہندو سیٹھوں نے انگریزوں کی بہت مدد کی تھی اور میر جعفر جیسے ننگ دین و وطن نے بھی انگریزوں اور ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں سے بدترین سلوک کیا تھا لہٰذا مسلمان قوم کو دلدروں کے سوا کچھ حاصل نہ ہو رہا تھا۔ پھر بندوبست استمراری نے ہندوؤں کو مسلمانوں کی زمینوں کا مالک بنا دیا۔ کاشت کاروں نے تنگ آ کر باغیانہ روش اپنائی چنانچہ تیتو میر کی قیادت میں یہ تحریک زور پکڑ گئی۔ اور تیتو میر1831ء میں (کلکتہ کے قریب) نارکل ڈانگا میں شہید ہو گئے۔ اور تحریک کو کچل دیا گیا۔

ایسی ہی دوسری تحریک "فرائضی تحریک" کہلائی۔ جس کے قائد فرید پور کے حاجی شریعت اللہ تھے ان کے بیٹے دو دو میاں نے "الارض للہ" (زمین اللہ کی ہے) کا نعرہ لگا کر لگان دینا بند کر دیا لیکن یہ تحریک بھی کچل دی گئی۔

پھر 1857ء کی جنگ آزادی کے دنوں میں بھی بنگال کے لوگوں کو زیادہ حصہ لینے کا موقع نہ ملا۔ صرف ڈھاکہ کے بنگالی سپاہیوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا لیکن ان کی بغاوت دبا دی گئی اور باغیوں کو توپ سے اڑا دیا گیا اور بنگال رجمنٹ کو توڑ دیا گیا۔

صوبہ اودھ

یہ صوبہ پہلے "صوبہ ہائے متحدہ آگرہ واودھ" کہلاتا تھا اور ایک انتظامی اکائی شمار ہوتا تھا۔ یہ بھی ایک خود مختار صوبہ تھا۔ حتیٰ کہ جب 1814ء میں غازی الدین حیدر اس صوبہ کا حکمران مقرر ہوا تو اس نے خود کو باقاعدہ بادشاہ اودھ کا لقب دیا۔ زمانہ قدیم میں بھی اودھ کا علاقہ زرخیز ترین علاقوں میں شمار ہوتا تھا اور یہ ہندو تہذیب کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اس کے قریب ہی قدیم شہر اجودھیا (فیض آباد) واقع تھا۔ جو کوشلیا کا پایہ تخت تھا۔ یہاں سورج بنسی خاندان کا راجہ دشرتھ حکمران تھا۔ راجہ دشرتھ رام چندر جی کا باپو تھا جس کے کارنامے رامائن میں بھی ملتے ہیں۔

اسلامی دور : قطب الدین ایبک کے عہد میں یعنی بارھویں صدی کے آخری عشرے میں مسلمان فاتحین نے اودھ پر قبضہ کر لیا تھا اور اسے دہلی کی سلطنت کا حصہ بنا لیا تھا۔ 1194ء میں قنوج کے راجہ جے چند نے مسلمانوں سے شکست کھائی اور اودھ کی مملکت درہم برہم ہو گئی۔ تیرھویں صدی کے اوائل میں اس علاقہ میں "بھار" قوم کے سیاہ فام لوگوں نے قبضہ کر لیا۔ یہ لوگ یہاں کے اصلی باشندے تھے اور نیچ ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے جنوبی اودھ اور بندھیل کھنڈ میں بڑی اہمیت حاصل کر لی۔ آخر 1247ء میں ان کو کچل دیا گیا۔ 1527ء میں بابر نے وسط ہند سے واپسی پر لودھی خاندان کو شکست دے کر اودھ کو مغل سلطنت میں شامل کر لیا۔ بابر کی وفات کے بعد اودھ پر شیر شاہ (شیر شاہ سوری) قابض ہو گیا اور ہمایوں کو ہندوستان سے بھاگ جانا پڑا۔ 1545ء میں شیر شاہ سوری بارود خانہ میں آگ لگنے سے وفات پا گیا تو ہمایوں نے واپسی پر 1555ء میں اپنی سلطنت قائم کر کے اودھ کو آہستہ آہستہ دوبارہ مغل حکومت میں شامل کر لیا۔

اکبری دور میں بقول ابوالفضل اودھ کو ایک الگ صوبہ بنا دیا گیا۔ جس میں پانچ سرکاریں (یا ڈویژن) تھیں اور ان میں 38 پرگنے تھے۔ آئین اکبری (جلد 2 صفحہ 170۔177) میں لکھا ہے کہ اس صوبہ میں ایک لاکھ اڑسٹھ ہزار دو سو پچاس کی تعداد میں پیادہ فوج رکھی گئی تھی۔ سات ہزار چھ سو چالیس فوجیوں پر مشتمل سوار فوج قائم تھی جبکہ انسٹھ 59 ہاتھی یہاں رکھے گئے تھے۔

شاہجہان کے بعد جنگ تخت نشینی میں بھی اودھ کی افواج نے کوئی خاص حصہ نہیں لیا۔ مغل سلطنت کے زوال کے بعد جب بعض صوبیداروں نے خود مختاری کا اعلان کیا تو ان میں اودھ کا صوبہ بھی شامل تھا۔

اودھ کی باغیانہ روش کا آغاز 1724ء سے ہوتا ہے جب یہاں نیشاپور کے سید خاندان کے ایک امیر محمد امین خاں کو سعادت خاں اور برہان الملک کے القاب سے نواز کر اودھ کا

صوبیدار مقرر کیا گیا۔ یہ شخص بڑا مدبر اور اعلیٰ پائے کا منتظم تھا۔ اس نے اجودھیا کے مغرب میں چند میل کے فاصلے پر ایک محل تعمیر کروایا جہاں وقت کے ساتھ ساتھ ایک شہر آباد ہو گیا جسے فیض آباد کہتے ہیں۔

محمد امین عرف سعادت خاں نے اپنے صوبے میں امن و امان قائم کیا اور صوبے کی سرحدوں کو نہ صرف محفوظ کیا بلکہ ان کو توسیع بھی دی اور اب اس کی حدود میں بنارس' غازی پور' جونپور اور چنار بھی شامل کر لئے گئے تھے۔ 1739ء میں یہاں اس کے بھتیجے اور داماد صفدر جنگ کو صوبیدار مقرر کیا گیا۔ سعادت خاں اور صفدر جنگ کے عہد میں اودھ کو بڑی ترقی ملی اور یہاں خوشحالی کا دور دورہ ہوا جدید قلعے تعمیر ہوئے۔ کنوئیں اور پل بنوائے گئے۔

لیکن صفدر جنگ کے بیٹے اور ولی عہد نواب وزیر شجاع الدولہ (1754ء تا 1775ء) کو انگریزوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور 1764ء میں بکسر کے مقام پر وہ شکست کھا گیا۔ جس کے بعد صوبہ اودھ انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔

1765ء میں عہد نامہ الہ آباد کی رو سے کانپور' فتح پوراور الہ آباد کے سوا اودھ کا باقی علاقہ شجاع الدولہ کو واپس دے دیا گیا اور اس نے بھی پچاس لاکھ روپیہ انگریزوں کو ادا کرنے کا اقرار کیا۔ پھر 1773ء میں عہد نامہ بنارس کی رو سے یہ رقم شہنشاہ دہلی کو ادا کر دی گئی تاکہ وہ اپنا وقار اور اقتدار قائم رکھ سکے۔

1775ء میں آصف الدولہ مسند نشین ہوا تو وارن ہیسٹنگز نے اس کے خراج کی رقم جو پہلے دو لاکھ دس ہزار تھی بڑھا کر دو لاکھ ساٹھ ہزار کر دی۔ اور جب آصف الدولہ یہ رقوم ادا کرنے سے قاصر رہا تو اسے مجبور کیا گیا کہ وہ غازی پور' جونپور اور بنارس کے اضلاع کے شاہی حقوق مستقل اور مکمل طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتقل کر دے۔

1781ء میں معاہدہ چنار کے موقع پر انگریز لارڈ نے آصف الدولہ کی افواج کو گھٹانے کی کوشش بھی کی اور پھر اس نے بیگمات اودھ سے خزانے حاصل کر کے ان کو ضبط بھی کر لیا۔ چنانچہ جب وارن ہیسٹنگز کے خلاف برطانیہ میں مقدمہ چلایا گیا تو ان ضبطیوں کی بازگشت اس پر الزامات کی شکل میں سنی گئی۔ آصف الدولہ والئی اودھ نے 1797ء میں وفات پائی۔

1801ء میں لارڈ ولزلی (Wellesley) نے آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی اور اس کے جانشین سعادت علی خاں (1798ء تا 1814ء) کو مجبور کیا کہ وہ پورا روہیل کھنڈ اور دو آب کا ایک حصہ انگریزوں کے حوالے کر دے چنانچہ ایسا کرنے کے بعد اس کی آمدنی انگریزی فوجوں کے خرچہ بھتہ کے لئے مختص کر دی گئی۔ سعادت علی خاں نے 1814ء میں وفات پائی اور اس کی جگہ اس کا بڑا بیٹا غازی الدین حیدر مسند نشین ہوا۔ اس نے شاہ اودھ کا لقب اختیار کیا اور یہ 1827ء تک حکمران رہا۔ اس کے بعد :

1۔ ناصر الدین حیدر (1827ء تا 1837ء)

2۔ محمد علی شاہ (1837ء تا 1842ء)

3۔ امجد علی شاہ (1842ء تا 1847ء)
4۔ واجد علی شاہ (1847ء تا 1856ء)

تخت کے وارث ہوئے اور اپنے اپنے دور میں حالات کے مطابق زندگی نبھاتے رہے۔
1856ء میں لارڈ ڈلہوزی (Dalhousie) نے صوبہ اودھ کا الحاق انگریزی علاقہ کے ساتھ کر لیا اور اس کے آخری حکمران واجد علی شاہ کو وظیفہ دینے کی منظوری دی نیز واجد علی شاہ کو کلکتہ میں رہائش رکھنے کی بھی اجازت مل گئی چنانچہ واجد علی شاہ کلکتہ میں ہی 1887ء میں وفات پا گیا۔ جس کے ساتھ ہی اودھ کی بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا۔

(کتب حوالہ : نجم الغنی۔ تاریخ اودھ۔ مطبوعہ مراد آباد 1909ء۔ گورسائے۔ تاریخ اودھ۔ تاریخ ہند از ذکاء اللہ وغیرہ)

ریاست میسور

میسور جنوبی ہند کی ایک ہندو ریاست تھی۔ جو مغل دور میں قائم تھی اور اس کے حکمرانوں کے مغلوں سے تعلقات بہت اچھے تھے۔ چنانچہ مہاراجہ میسور کے محل میں ہاتھی دانت اور سونے کا بنا ہوا ایک قیمتی تخت اب بھی موجود ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ تخت اورنگ زیب عالمگیر نے راجہ کو بطور تحفہ بھیجا تھا (اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد 21 صفحہ 972)

1169ھ (59-1758) کے قریب مہاراجہ میسور کے وفادار' بہادر اور جری سپہ سالار حیدر علی نے نظام دکن کی فوجی امداد کی اور مرہٹوں کو شکست دے دی۔ چنانچہ مغل شہنشاہ نے خوش ہو کر حیدر علی کو صوبہ "سرا" کی صوبیداری عطا فرمائی۔ اب یہ اعزاز ہندو مہاراجہ اور اس کے وزیراعظم کھنڈے راؤ کو ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ چنانچہ وزیراعظم نے مہاراجہ کو بہکایا اور کوشش یہ کی کہ کسی طرح حیدر علی کو میسور کی افواج کی سالاری سے بے دخل کر دیا جائے۔

سازش کا علم حیدر علی کو بھی ہو گیا اور اس نے مہاراجہ اور وزیراعظم کو شکست دے کر ریاست کے اقتدار پر قبضہ کر لیا البتہ مہاراجہ کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔

حیدر علی : حیدر علی کا باپ فتح محمد میسور کی ریاست میں فوجدار تھا۔ اس کے ہاں 1727ء میں حیدر علی پیدا ہوا۔ اور جوان ہوا تو وہ بھی فوج میں ملازم ہو گیا۔ فوج میں اعلیٰ خدمات بجا لانے کے عوض اسے بنگلور کی جاگیر عطا کی گئی اور جب اس کی قابلیت کا لوہا اجاگر ہوا تو اسے میسور کی افواج کا سپہ سالار مقرر کر دیا گیا اور ساتھ ہی "فتح حیدر بہادر" کا خطاب عطا ہوا۔ 1763ء میں راجہ مر گیا تو ریاست میں بدانتظامی نے گھر کر لیا۔ نیا راجہ نا اہل تھا اور اس کا وزیر نند راج بھی انتظامی امور میں کورا تھا۔ چنانچہ راجہ نے وزیر کو برطرف کر کے تمام انتظامی اختیارات حیدر علی کے سپرد کر دیئے۔

نند راج کے بعد وزیراعظم کا منصب کھنڈے راؤ نے سنبھالا۔ جب حیدر علی نے مرہٹوں کی گوشمالی میں اہم رول ادا کیا تو مغل بادشاہ نے اسے صوبہ سرا کی صوبیدار عطا کر دی۔

کھنڈے راؤ حیدر علی سے حسد کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے حیدر علی کو کانٹا سمجھ کر اسے راہ سے ہٹانے کی سازش کی اور اپنے ساتھ راجہ کو بھی ملا لیا اور سازباز کر کے مرہٹوں کو ریاست پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔ حیدر علی کو اس سازش کی خبر دیر سے ملی چنانچہ مرہٹہ فوج سرنگا پٹم کے بالکل قریب پہنچ گئی اور حیدر علی کو سرنگا پٹم خالی کرنا پڑا۔ لیکن بنگلور کے قریب جب مرہٹہ فوج نے اس کا تعاقب کیا تو حیدر علی نے مڑ کر اس پر حملہ کیا اور مرہٹہ فوج کو شکست دے کر بھگا دیا اور پھر واپس سرنگا پٹم آ کر شہر پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب حیدر علی نے وزیراعظم کھنڈے راؤ کو گرفتار کر کے نظربند کر دیا اور راجہ کو معزول کر کے حکومت کی باگ ڈور سنبھال

لی۔

فتوحات : حیدر علی نے اقتدار میں آتے ہی بڑی تیزی سے فتوحات حاصل کیں اور اس کی کوشش سے ہوسکوٹہ' نندی اور بدنور کی تسخیر عمل میں آئی اور پھر کوچین اور مالا بار وغیرہ پر حیدر علی کا پرچم لہرانے لگا۔ ادھر دکن میں نئی طاقت کا عروج مرہٹوں کے لئے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ چنانچہ مرہٹہ سردار پیشوا مادھو راؤ نے پہلے 1764ء اور پھر 1769ء میں بھاری لشکروں سے میسور پر یلغار کر دی اور حیدر علی کو خراج دے کر اقتدار قائم رکھنا پڑا۔ اب حیدر علی اپنی افواج کو مضبوط بنا کر پہلے بلاری پر قابض ہوا۔ پھر گتی' بادامی' اور دھاڑواڑ کے مرہٹہ علاقے بھی ان سے چھین لئے۔ حیدر علی انگریزوں کو بھی برصغیر سے نکال دینا چاہتا تھا لیکن مرہٹوں اور نظام حیدر آباد نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ چنانچہ انگریزوں اور حیدر علی کے درمیان جنگیں ہوتی رہیں۔

میسور کی پہلی جنگ : یہ جنگ 1767ء میں میسور کی اسلامی ریاست اور انگریزوں کے درمیان ہوئی جن کے حامی مرہٹے اور نظام حیدر آباد تھے۔ حیدر علی نے نظام حیدر آباد کو کرناٹک کا لالچ دیا اور وہ انگریزوں سے الگ ہو گیا جبکہ مرہٹوں کو روپیہ دے کر غیر جانبداری پر راضی کر لیا۔ انگریز سالار کرنل سمتھ نے چنگامہ اور ترمونالی کے مقامات پر حیدر علی کو شکست دی۔ حیدر علی کی پوزیشن کمزور پا کر نظام حیدر آباد انگریزوں سے جا ملا۔ لیکن حیدر علی نے جنگی چالیں چل کر انگریزوں کو صلح پر مجبور کر دیا اور صلح نامہ مدارس 1769ء میں لکھا گیا اور انگریزوں نے تاوان جنگ کے طور پر بھاری رقم ادا کی اور مفتوحہ علاقے فریقین کو واپس کر دیئے اور مشکل وقت میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ اس طرح جنوبی ہند میں حیدر علی کی دھاک بیٹھ گئی اور انگریزوں کو اس کی اہمیت کا پتہ چل گیا۔

میسور کی دوسری جنگ 1780ء تا 1784ء : انگریزوں نے صلح نامہ مدارس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حیدر علی کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ جبکہ 1770ء میں حیدر علی پر مرہٹوں پر حملہ کیا تھا۔ حالانکہ وہ حیدر علی کی مدد کرنے کے پابند تھے۔ لیکن اس بے وفائی نے حیدر علی کو انگریزوں کے خلاف بھڑکا دیا کیونکہ انگریزوں کے طرز عمل سے انتقام کی بو آ رہی تھی۔

1776ء میں یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی تو یہی جنگ برصغیر میں بھی چھڑ چکی تھی۔ انگریزوں نے فرانسیسی مقبوضات ماہی اور پانڈی چری پر قبضہ کر لیا۔ حالانکہ حیدر علی ماہی کو اپنا علاقہ سمجھتا تھا۔ ان دنوں نظام حیدر آباد اور مرہٹے انگریزوں کے خلاف تھے لہٰذا حیدر علی نے دونوں کو اپنے ساتھ ملایا اور انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ 1780ء میں حیدر علی نے اسی ہزار فوج سے کرناٹک پر حملہ کیا اور پائین گھاٹ' آرنی' کاویری' پٹن اور محمود بند پر قبضہ کر لیا۔ انگریز سالار کرنل بیلی نے پولی نور کے مقام پر حیدر علی سے شکست کھائی اور گرفتار ہو گیا۔ دوسرا انگریز جرنیل ہیکٹر منرو بھی حیدر علی کا سامنا نہ کر سکا اور اپنا

توپ خانہ ایک تالاب میں پھینک کر مدارس کی طرف بھاگا۔ حیدر علی نے کرناٹک کے صدر مقام ارکاٹ پر قبضہ کر لیا ادھر اس کے بیٹے ٹیپو نے میجر ہال کو ترچنا پلی کے مقام پر شکست دے کر گرفتار کر لیا۔

اب حیدر علی سے خائف انگریزوں نے بڑی چال چلی۔ پہلے مرہٹوں اور نظام کو اس کی حمایت سے الگ کیا۔ پھر بنگال سے تازہ دم فوج سر آئر کوٹ کی سربراہی میں حیدر علی کے مقابلہ کے لئے بھیجی اور اس نے "پورٹو نودہ" کے مقام پر حیدر علی کی فوجوں کو شکست دی۔

لیکن دوسری طرف شیر دل ٹیپو نے اناگدی کے مقام پر انگریزوں کو شکست دی اور وہ آگے بڑھتا ہوا پونانی تک پہنچ گیا۔ یہاں پر ہی ٹیپو کو اپنے والد کی وفات کی خبر ملی کہ حیدر علی ارکاٹ کے مقام پر 6 دسمبر 1882ء کو بعارضہ کینسر وفات پا گیا ہے۔ اب انگریزوں نے میسور پر دونوں طرف سے یلغار کر دی۔

اب ٹیپو سلطان نے جلدی جلدی رسم تاج پوشی ادا کی اور دوبارہ محاذ پر پہنچ گیا اور کئی مقامات پر انگریزوں کو شکست دی اور انگریز سالار جنرل سٹوارٹ بمقام ونداش سے اپنے خیمے اکھاڑ کر مدراس کی طرف بھاگ گیا۔ جنرل میتھیو کو گرفتار کر لیا گیا اور جنرل کیمبل نے منگلور کے قریب ہتھیار ڈال دیئے جس کے بعد انگریزوں نے خود درخواست کر کے صلح میں پہل کی اور 11 مارچ 1784ء کو صلح نامہ منگلور طے پایا جس کی رو سے فریقین نے قیدیوں کو چھوڑ دیا۔ البتہ انگریزوں کا جذبہ انتقام مزید تیز ہو گیا۔

سلطان ٹیپو

ٹیپو بروز جمعہ 20 ذوالحجہ 1163ھ (10 نومبر 1750ء) کو حیدر علی کے ہاں پیدا ہوا۔ اس کا نام ارکاٹ کے مشہور روحانی بزرگ ٹیپو کے نام پر ٹیپو رکھا گیا۔ والد نے اس کی علمی تربیت اچھی طرح کی۔ اور مجاہدانہ تربیت میں بھی کسر نہ اٹھا رکھی اور شیر دل ٹیپو ہر لحاظ سے اپنے والد کا قابل ترین جانشین ثابت ہوا۔ جب دسمبر 1782ء میں اسے حکومت میسور کا سارا بوجھ اٹھانا پڑا تو اردگرد کا ماحول میسور کے خلاف ہی تھا حیدر علی نے اپنے بیٹے کو سفارتی آداب بھی سکھائے تھے۔ 1767ء میں جب حیدر علی نے نظام حیدر آباد کے پاس ایک وفد تحائف دے کر بھیجا تھا تو اس کی سربراہی ٹیپو کے ہی سپرد تھی۔ نظام نے ٹیپو کو نصیب الدولہ اور فتح علی خاں بہادر کے خطابات دیئے تھے۔

1786-87ء کے بعد مرہٹوں اور نظام سے جب مصالحت کے لئے بات چیت ہوئی تو سلطان ٹیپو کا ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ اسے "بادشاہ" کہہ کر خطاب کیا جائے۔ چنانچہ فیصلہ یہ ہوا کہ آئندہ سے سلطان کو "نواب ٹیپو سلطان فتح علی خان بہادر" کہا جائے گا (بحوالہ حدیقتہ العالم صفحہ 372 از محب الحسن خان) سلطان ٹیپو کی کنیت ابوالفتح تھی۔ سلطان ٹیپو پالکی میں سوار ہونے والوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ (ولکس جلد 2 صفحہ 761) حیدر علی کی وفات کے بعد سلطان ٹیپو ارکاٹ پہنچا اور 20 محرم 1197ھ (26 دسمبر 1782ء) کو چک ملور کے مقام پر (جہاں حیدر علی کا لشکر خیمہ زن تھا) سلطان ٹیپو کی رسم تاجپوشی ادا کی گئی اور وہ جنگی محاذوں پر سرگرم ہو گیا۔

11 مارچ 1784ء کے بعد مرہٹہ سردار نانا فرنویس نے نظام کو ساتھ ملا کر سلطان ٹیپو کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ اور سلطان نے "ادھونی" پر حملہ کر دیا جہاں نظام کا داماد اور بھتیجا مہابت جنگ حکمران تھا اور مرہٹوں اور نظام نے بازو "ادھونی" سے مہابت جنگ کے اہل و عیال کو نکال لیا اور سلطان نے خالی ادھونی پر قبضہ کر لیا اور پھر سلطان ٹیپو نے نظام اور مرہٹوں کے ساتھ صلح کو ترجیح دی تاکہ وہ انگریزوں سے لڑ سکے۔ لارڈ کارنوالس نے ٹیپو کے خلاف جال بننے شروع کر دیئے تھے۔ چنانچہ ٹراونکور کے راجہ نے انگریزوں سے معاہدہ کر کے میسور کی حکومت کے خلاف محاذ کھول دیا۔

میسور کی تیسری لڑائی : وجوہات :

1۔ یہ جنگ 1790ء سے لے کر 1792ء تک جاری رہی۔ انگریز صلح نامہ منگلور کو اپنی ہتک سمجھتے تھے اور سلطان سے بدلہ لینا ان کا اولین مقصد تھا۔

2۔ ان دنوں برطانوی انگریزوں نے امریکہ سے شکست کھائی تھی اور اب نو آبادیات میں بھی یہ سلسلہ جاری تھی۔ لیکن لارڈ کارنوالس کی کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح سلطان ٹیپو کو مات دے دی جائے اس کے بعد مرہٹے اور نظام تو گھڑے کی مچھلی ہیں۔

3۔ سلطان ٹیپو نے فرانس سے مدد کی درخواست کی جبکہ انگریز اس امداد کے پہنچنے سے پہلے پہلے ٹیپو کو ٹھکانے لگا دینا چاہتے تھے۔

4۔ ٹراونکور کے راجہ کے ساتھ سرحد کی لائن کا تنازعہ سلطان ٹیپو کے ساتھ چل رہا تھا۔ انگریزوں نے ٹراونکور کے راجہ کو تحفظ کا یقین دلایا تھا لہٰذا اسی بہانے سلطان کے خلاف انگریزوں نے جنگ کا عندیہ دیا اور معاہدہ منگلور کو پس پشت ڈال دیا۔

سلطان نے اکیلے ہی ان سب متحدہ دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کا ارادہ کیا اور انگریز اور اس کے اتحادی سلطان کے خلاف کامیاب نہ ہو سکے۔

اب لارڈ کارنوالس نے فوج کی کمان خود سنبھال لی اور بنگلور پر قبضہ کر لیا پھر اتحادی افواج میسور میں ہر طرف سے داخل ہو گئیں اور سرنگا پٹم کی طرف بڑھنے لگیں۔ لیکن کارنوالس نے اس کام کو اگلے سال پر ڈال دیا لہٰذا اتحادہ فوجیں پسپا ہو کر واپس چلی گئیں۔

فروری 1792ء میں کارنوالس نے سرنگا پٹم پر دوبارہ حملہ کیا۔ مقامی غداروں کی مدد سے انگریزوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ ٹیپو نے یہ حالات دیکھے تو صلح کی درخواست کی اور صلح نامہ سرنگا پٹم 1792ء کی رو سے جنگ بند ہو گئی۔

نتائج :

1۔ سلطان نے اپنی آدھی سلطنت انگریزوں اور ان کے اتحادیوں کو دے دی۔

2۔ تین کروڑ تیس لاکھ روپے بطور تاوان جنگ ادا کئے اور اس کے دو بیٹے یرغمال بنا لئے گئے۔

3۔ اتحادیوں نے واگزار کردہ علاقے باہم تقسیم کر لئے۔

4۔ سلطان کو بے بس کر دیا گیا لیکن پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری۔

میسور کی چوتھی لڑائی 1799ء : سلطان ٹیپو نے اتحادی دشمنوں کے خلاف بھرپور تیاری کی۔ زراعت کو خوب ترقی دی۔ امن بحال کیا۔ فوج کو مضبوط بنایا۔ قلعوں کی مرمت کروائی۔ نیز غیر ممالک کے سربراہوں سے تعلقات بڑھانے کے لئے اپنے سفیر بھیجے اور کابل' قسطنطنیہ' عرب اور فرانس سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی۔

نپولین بوناپارٹ ان دنوں مصر میں تھا۔ اس سے بھی سلطان نے خط و کتابت کی۔ ادھر لارڈ ولزلی نے سلطان ٹیپو کو دشمن نمبر ایک سمجھ کر اسے ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سلطان کے امیروں کو لالچ کے جال میں پھانسنا بھی اس کی حکمت عملی تھی چنانچہ میر صادق پورنیا' میر غلام علی' میر معین الدین' میر قمر الدین' میر قاسم وغیرہ سلطان کا ساتھ چھوڑ کر خفیہ طور پر اتحادی فوجوں سے مل چکے تھے۔

واقعات : مارچ 1799ء میں لارڈ ولزلی نے نظام کی فوج کو ساتھ ملا کر میسور پر دو طرف سے حملہ کر دیا۔ جنرل ہارس کی سپاہ مدراس کی طرف سے آگے بڑھی اور جنرل سٹوارٹ کی فوج

بمبئی کی طرف سے میسور پر حملہ آور ہوئی۔ نظام کی بیس ہزار فوج کرنل ولزلی کی کمان میں تھی۔ سلطان نے ہر محاذ پر دشمن کا مقابلہ بہادری سے کیا۔ لیکن قدم قدم غداروں کی غداریاں آڑے آئیں اور سلطان گھرتا ہی چلا گیا۔ اسے بھی انگریزوں کی اطاعت کا مشورہ دیا گیا لیکن سلطان کا ایک ہی جواب تھا کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے افضل ہے۔"

آخر سلطان مردانہ وار لڑتا ہوا سرنگا پٹم کے دروازے کے عین سامنے شہید ہو گیا۔ میر صادق نے محافظ فوج کو تنخواہ بانٹنے کے بہانے ہٹا لیا تھا اور پھر سازش کے تحت باہر نکل گیا کہ ابھی کمک لاتا ہوں۔ کسی نے اسے للکارا اور تلوار مار کر ڈھیر کر دیا۔ میر صادق گھوڑے سے گر کر تڑپنے لگا کہ ایک اور مجاہد آگے بڑھا اور اس نے اس غدار اعظم کو ختم کر ڈالا۔

(نشان حیدری صفحہ 391)

سلطان کا جان نثار امیر سید غفار سلطان سے ذرا پہلے شہید ہوا۔ 4 مئی کو سلطان نے شہادت پائی اور اسے اس کے والد حیدر علی کے پہلو میں اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا۔ 6 مئی تک لوٹ مار کا سلسلہ جاری رہا۔ جس کے ہاتھ جو کچھ آیا لوٹ کر لے گیا۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ بیس لاکھ پونڈ کی رقم لوٹ سے فراہم ہوئی جس میں جنرل ہیرس کا حصہ ایک لاکھ بیالیس ہزار نو سو دو پونڈ تھا۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد 6 صفحہ 993)

سلطان کی شہادت کے بعد میسور کے علاقوں کی بندر بانٹ ہوئی۔ میسور کی حکومت سلطان کے کسی بیٹے کو نہ دی گئی بلکہ ان کے لئے دو لاکھ چالیس ہزار پگوڈا (سکہ) کی رقم بطور وظیفہ مقرر کی گئی۔ پہلے سلطان کے بیٹوں کو ویلور میں رکھا گیا۔ 1806ء میں وہاں فوجی بغاوت ہوئی تو شہزادوں کو کلکتے میں بھجوا دیا گیا۔

لارڈ ولزلی نے قدیم راجا کے خلف کو میسور کی گدی پر بٹھا دیا اور ریاست کی حدود بھی گھٹا دیں یعنی جو حدود ہندو راجہ کے زمانے میں تھیں وہی مقرر کر دیں۔

میسور کا نیا نام : میسور کا 1973ء سے نیا نام کرناٹک ہے۔ ریاست کا مشہور تاریخی شہر سرنگا پٹم بنگلور سے میسور کو جانے والی ریل کا ایک اسٹیشن ہے۔ 1610ء میں میسور کے راجہ وڈیر نے اسے ریاست کا دارالحکومت مقرر کیا تھا۔ جو 1799ء تک رہا۔ سرنگا پٹم آج کل ایک معمولی قصبہ ہے لیکن اسلامی شعائر کے لحاظ سے بڑا اہم شہر ہے۔

میسور کا شہر : یہ موجودہ ریاست کرناٹک کے صدر مقام بنگلور سے 130 کلومیٹر دور جنوب مغرب میں واقع ہے۔ مسلمانوں کی آبادی 1961ء کی مردم شماری کی رو سے 84ء8 فیصد ہے۔ یہاں 1916ء میں یونیورسٹی قائم ہوئی تھی۔

سلطان ٹیپو ☆ سلطنت خداداد کا عظیم حکمران

افواج پاکستان کے ایک ریٹائرڈ میجر میر ابراہیم کی نظر میں :

آج سے تقریباً" ایک ہزار سال یا اس سے بھی کچھ پہلے مسلمان حکمرانوں نے ہندوستان کا رخ کیا اور جنگی فتوحات کے بعد اپنی حکومتیں قائم کیں۔ جس میں محمد بن قاسم' سلطان محمود غزنوی' شیر شاہ سوری' شہاب الدین غوری' قطب الدین ایبک' مغل حکمران اور آخر میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے نام خاص طور پر نمایاں ہیں۔ ان سب حکمرانوں میں سے مغل حکمرانوں نے سب سے زیادہ حکومت کی جس کا عرصہ حکومت (1857ء ۔ 1525ء) تقریباً" 350 سال بنتا ہے۔ انگریز ابھی ہندوستان میں نہیں پہنچ پایا تھا کہ عرب تاجروں کے ذریعے ہندوستانی اشیاء یورپ کی منڈیوں میں پہنچ جاتی تھیں۔ جس میں الائچی' کالی مرچ' دار چینی' نیل اور اس کے علاوہ بیش قیمت اشیاء شامل تھیں۔ ہندوستانی اشیاء کی مانگ یورپ میں بہت زیادہ تھی اس وقت تمام سمندری راستوں پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی۔ انگریز ان راستوں سے کلی طور پر ناواقف تھے۔ واسکوڈے گاما پرتگیز سیاح عربوں کی رہنمائی میں ہندوستان آ پہنچا اور اس نے ہندوستان کے مغربی ساحل ملبار میں اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا اس کے بعد تجارتی کمپنیاں ہندوستان میں قائم ہو گئیں۔ جس میں برطانیہ' فرانس اور ڈنمارک کی تجارتی کمپنیاں بھی شامل تھیں۔ اس وقت برصغیر کے لوگ سادہ لوحی کا شکار تھے عام طور پر ان پڑھ تھے مگر مذہبی لگاؤ رکھتے تھے جس کی وجہ سے نہایت مخلص اور ایماندار تھے۔ ان کی نسبت یورپین تجارتی کمپنیوں کے انگریز مطلب پرست' مکار' چال باز تھے۔ بے رحمی اور حرص و ہوا ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ تاجر بن کر آئے اور حاکم بن کر برصغیر پر چھا گئے۔

مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد مسلمان عیش و عشرت کی زندگی میں پڑ گئے۔ مذہب کی طرف ان کا رجحان کم ہوتا گیا۔ انگریز کی مکارانہ چالوں سے مغل حکمران اپنا وقار کھو چکے تھے۔ انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف اپنی چالوں کا جال بچھانا شروع کر دیا اور اٹھارہویں صدی کے نصف تک انگریز برصغیر کے تین صوبوں بنگال' بمبئی اور مدراس پر قابض ہو چکے تھے۔ ان حالات میں بھی سلطنت خداداد کے غیرت مند اور جذبہ حب الوطنی سے سرشار بانی و حکمران حیدر علی اور ٹیپو سلطان اپنے عروج پر تھے۔ وہ اپنے جذبہ حب الوطنی اور دور اندیشی کے باعث انگریزوں کے خطرناک ارادوں کو بھانپ چکے تھے اور وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ انگریز تجارت کے بہانے ہماری آزادی' مذہبی سالمیت اور ہندوستان کی دولت پر قبضہ کرنے کی غرض سے یہاں آئے ہیں۔ ان دونوں باپ بیٹوں نے ان سے مقابلہ (جہاد) کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس وقت میسور ایک چھوٹی سی ریاست تھی مگر دیکھتے ہی دیکھتے حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے اپنے زور بازو' خداداد صلاحیتوں' ارادے کی پختگی' جذبہ حب الوطنی' دور اندیشی' فوجی قوت اور جنگی

حکمت عملی سے اپنی سلطنت کو ایک وسیع و عریض علاقے پر پھیلا دیا تھا۔ انہوں نے تجارت' زراعت و پیداوار اور صنعت کو خاص طور پر ترقی دی۔ ملک کے وسائل کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لا کر ذرائع آمدنی میں بہتر طور پر اضافہ کیا۔ جب تک غیرت و حریت کا پیکر ٹیپو سلطان زندہ رہا انگریز ہندوستان میں اپنے قدم نہ جما سکے اور ٹیپو سلطان کی طرف سے انگریزوں کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

حیدر علی اور ٹیپو سلطان کا نظریہ سلطنت اسلامی اصولوں کی بنیادوں پر استوار تھا جس کے دو اہم اور مضبوط ستون قرآن اور سنت تھے۔ ٹیپو سلطان ایک اچھا لیڈر' اعلیٰ منتظم اور مدبر حکمران تھا۔ ٹیپو شہید نے اسلام کے لازوال اصولوں کو اپنے ملک کے آئین کا بنیادی حصہ بنایا اور ان ہی روشن اصولوں کی بنیاد پر اس نے اپنے ملک پر حکمرانی کی۔ مغربی دنیا میں اس وقت جو اچھی باتیں تھیں ان سے بھی اس نے استفادہ حاصل کیا اس کے علاوہ ہر طبقہ فکر کے لوگوں سے رہنمائی حاصل کرتا تھا جس سے اس کی وسیع القلبی اور روشن دماغی کی عکاسی ہوتی تھی۔ سلطان شہید اس وقت کے مسلمان حکمرانوں کو اعلیٰ کردار اور بہترین صفات اپنانے کی تلقین کرتا تھا۔ اس کا دور عوام کی فلاح و بہبود اور ہر شعبے میں ترقی کے لحاظ سے ایک مثالی دور تھا۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی اعلیٰ صلاحیتوں کی بدولت اٹھارہویں صدی میں ان کی ریاست ماڈرن میسور کے نام سے مشہور تھی۔ یہاں کی کشادہ سڑکیں' زراعت و پیداوار اور صنعت و تجارت آج بھی اپنے عروج پر ہے۔ دنیا کے بہترین صندل کی کاشت یہاں پر ہوتی ہے۔ جس کا بنا ہوا صابن اپنی خوشبو کے اعتبار سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ ٹیپو سلطان نے اپنے ملک میں ریشم کی صنعت کو ترقی دینے کے لئے چین اور بنگال سے ریشم کے کیڑے منگوائے جس کی وجہ سے آج بھی ریشم کی صنعت میں 75 فیصد میسور کے ریشم کا حصہ ہے۔ ٹیپو سلطان نے اپنی سلطنت کی ترقی کے لئے دوسرے اہم اقدامات کے علاوہ بے روزگاری ختم کرنے کے لئے سمال انڈسٹریز کو خاص طور پر فروغ دیا۔ زراعت اور کاشت کاری کے نظام کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کے لیے اور اس سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لئے دریاؤں سے نہریں نکالیں۔ چھوٹے اور بڑے ڈیم بنوائے۔ کنوئیں کھدوائے اور بارش کے پانی کو مختلف طریقوں سے محفوظ کر کے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ ایک چھوٹی نہر سلطنت خداداد کے خرچے پر عراق میں نجف اشرف تک کھدوائی تاکہ وہاں سے پانی کی قلت کو ختم کیا جا سکے۔ ناریل' آم' چاول' اناج' ہاتھی دانت اور اس کے علاوہ ضروریات زندگی کی ہر شے سلطنت خداداد میں ملتی تھی۔

ہندوؤں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کو اس کی ریاست میں مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی اور انہیں ہر قسم کا مالی و جانی تحفظ حاصل تھا۔ یہاں تک کہ ہندوؤں کے مندروں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کی عبادت گاہوں کی دیکھ بھال کے اخراجات بھی سرکاری خزانے سے ادا کئے جاتے تھے۔ دیوداسی ہندوؤں کا ایک خاص رواج تھا کہ جن ہندوؤں کے ہاں اولاد نہ ہوتی وہ مندروں میں جا کر منتیں مانتے تھے۔ منت ماننے کے بعد اگر کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہوتی تو وہ

اس کو مندرز کی خدمت اور دیکھ بھال کے لئے وقف کر دیتے تھے۔ وہ لڑکی شادی نہیں کر سکتی تھی۔ جس کو ٹیپو شہید نے سختی سے روک دیا اور اس رسم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بالکل ختم کر دیا۔ سلطنت خداداد میں عصمت فروشی پر سخت پابندی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوؤں کی ایک نائر قوم جو ٹیپو کے علاقہ ملبار میں آباد تھی ان کے ہاں یہ رواج تھا کہ یہ عورتیں اپنا سینہ نہیں ڈھانپتی تھیں ٹیپو شہید نے اس رسم کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور عورتوں کو سینہ ڈھانپنے کا حکم دیا۔ ہندو آج بھی سلطان شہید کا یہ احسان سمجھتے ہیں۔

ٹیپو سلطان کے سکے مغلیہ حکمران کے اعلیٰ ترین سکوں کی طرح بڑے مفید اور قیمت والے تھے۔ جو حضور کے نام کی نسبت سے محمدی یا اشرفی مہر کہلاتے تھے۔ اس کے علاوہ ایسے سکے بھی تھے جو خلفائے راشدین اور اماموں کے نام سے منسوب تھے۔ ٹیپو شہید نے چاندی کے سکے پہلی مرتبہ دکن میں ایجاد کئے۔ دکن میں سونے چاندی اور تانبے کے سکے تیار کرنے کے ٹکسال تھے۔ ٹیپو سلطان نے اسلامی کیلنڈر میں بھی نمایاں تبدیلی کی اور شمسی کیلنڈر کے مطابق بتایا کہ زراعت کا لگان وصول کیا جا سکے۔ یہ کیلنڈر ہجرت کی بجائے اعلان نبوت سے شروع ہوتا تھا اور مولود محمدی کہلاتا تھا۔

پہلے وہ جنگی اسلحہ فرانسیسیوں سے منہ مانگے داموں خرید کر اپنے ملک لاتے تھے حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے آٹھ دس سال کے اندر اپنے ملک میں بہترین اسلحہ بنانے کے کارخانے تیار کئے اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ اسلحہ بنانے میں خود کفیل ہو گئے۔ انہوں نے "فتح المجاہدین" نامی کتاب لکھی جس میں جنگی حکمت عملی اور افسر و سپاہی کے فرائض کو نہایت ہی آسان لفظوں کی مدد سے اجاگر کیا گیا تھا۔ حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی فوج میں پاتیر' توپ خانے اور انجینئرز کے دستے بھی شامل تھے انہوں نے ایک نہایت ہی کارآمد راکٹ بھی تیار کیا جو میسور راکٹ کے نام سے مشہور تھا جس کو دشمن کے خلاف کم سے کم وقت میں فائر کر کے دشمن کا بہت زیادہ جانی و مالی نقصان کیا جا سکتا تھا اور یہی راکٹ آج کل کے راکٹ کی بنیاد بنا۔ اسی طرح انہوں نے جنگی سازوسامان سے لیس ایک بحری بیڑہ بھی تیار کر لیا تھا تاکہ انگریز کی بحریہ کو بھی شکست دی جائے۔ انہوں نے تقریباً سو جہاز بنانے کی تیاری کر لی تھی ریاست کے ہر فرد کو جنگی تربیت دی جاتی تاکہ وقت پڑنے پر وہ اپنے ملک کا دفاع کر سکے۔

مرہٹے بار بار ان کی سلطنت پر حملے کرتے تھے مرہٹوں کے ان غیر متوقع حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے انہوں نے اپنی رعایا کو Village Defence اور Town Defence کی ٹریننگ سے بھی آراستہ کر رکھا تھا۔ عوام کو ہتھیار رکھنے کی عام اجازت تھی اس کا ہر قلعہ مضبوط تھا۔ ریاست میں کم و بیش 50 بڑے قلعے اور 80 درمیانی قلعے تھے۔ جن کو تمام تر حفاظتی اقدامات کو مدنظر رکھتے ہوئے پختہ اور مضبوط بنیادوں پر تعمیر کیا گیا تھا۔

تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مسافروں کے لئے سرائیں تعمیر کی گئی تھیں۔ جن میں خوراک اور آرام کا خاص خیال رکھا گیا تھا بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کے لئے یتیم خانے بنائے

گئے جن کی تمام ضروریات سرکاری خرچ سے پوری کی جاتی تھیں۔ مسجدوں اور مندروں کی دیکھ بھال اور دوسرے ان کے ضروری اخراجات حکومت کے ذمہ تھے۔ بڑے بڑے دور دراز علاقوں سے مسلمان ان کے ہاں آ کر پناہ لیتے تھے۔ سلطان شہید انہیں تمام سہولتیں فراہم کرنے کا حکم صادر فرماتے۔ ٹیپو سلطان نہایت ہی فراغ دل اور مہمان نواز تھے۔ ٹیپو رشوت لینے اور دینے دونوں کے سخت خلاف تھے جو بھی اس جرم کا مرتکب ہوتا اسے فوری طور پر سزا دی جاتی۔ 2000 سے زائد آدمی جاسوسی پر مامور تھے جو ملک کے اندر اور باہر کی دنیا کی لمحہ لمحہ کی خبریں رکھتے تھے۔

سلطان نے اپنے ذوق و شوق کے مطابق اور اسلامی طرز تعمیر پر کئی عمارتیں مثلاً محل' مسجدیں' درگاہیں اور درس گاہیں تعمیر کروائیں۔ وہ اپنی ریاست کے ہر محکمے پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ وہ ہر محکمے کو فرمان اپنے ہاتھ سے جاری کرتے تھے اور اس فرمان پر دی گئی ہدایات پر سختی سے عمل بھی کرواتے تھے۔ منشیات پر سختی سے پابندی تھی جن میں شراب' بھنگ' افیون' گانجھا اور تاڑی وغیرہ شامل تھی۔ مگر فرانسیسی فوج جو کہ ان کی ریاست کی خدمت کے فرائض انجام دے رہی تھی ان کو شراب کے استعمال کی اجازت تھی اور ان کو چند منتخب مقامات سے شراب فراہم کی جاتی تھی۔ اگر ان کی ریاست کا کوئی فرد فرانسیسی فوجیوں سے شراب لیتے ہوئے پکڑا جاتا تو اسے بھی سزا دی جاتی۔ سلطان شہید اپنے جنگی قیدیوں سے بہت اچھا سلوک کرتے تھے۔ میسور کی تیسری جنگ میں مکار انگریز کی چالوں اور اپنوں کی غداری اور بے وفائی کی وجہ سے ان کو انگریزوں سے صلح کرنا پڑی اور دونوں کے درمیان امن معاہدہ طے پایا اس طرح سلطان نے انگریزوں کو تین کروڑ روپیہ جنگی جرمانہ ادا کیا اور اپنے دو بچوں کو دو سال تک انگریزوں کے پاس رہن رکھنا پڑا۔ میسور کے اس غیرت مند حکمران نے ساری رقم دو سال کے اندر اندر ادا کر دی اور لارڈ کارنواس سے اپنے بچوں کو واپس لے لیا اس جنگی جرمانے کی وجہ سے سلطنت کے خزانے کو بہت نقصان پہنچا۔ جس کا ٹیپو کو گہرا صدمہ تھا انہوں نے انگریزوں سے اس کا بدلہ لینے کا پکا اور مصمم ارادہ کر لیا جب تک انہوں نے یہ رقم انگریزوں کو ادا نہ کر دی وہ زمین پر سوتے تھے اور سادہ لباس پہنتے تھے۔ اس کے علاوہ دوسری سہولیات زندگی سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اس طرح انہوں نے ایک ایک پیسہ جمع کیا۔ "قرض اتارو ملک سنوارو" سکیم کے تحت سلطان کی رعایا نے اپنے خون پسینے کی کمائی کو سلطان کے قدموں میں ڈھیر کر دیا یہاں تک کہ اس سکیم کے تحت عورتوں نے اپنے سونے کے زیورات تک سرکاری خزانے میں جمع کرا دیئے۔

انگریزوں نے سلطان کو اتنا بڑا جرمانہ اس لئے کیا تھا کہ اس طرح سلطان کا خزانہ خالی ہو جائے گا اور اس کے ملک کی معیشت کمزور ہو جائے گی اور عوام سلطان سے بددل ہو جائے گی یہ ان کی سراسر غلط فہمی تھی اور ان کا یہ خواب ٹیپو سلطان کی حکمت عملی اور رعایا کے تعاون سے ریاست کا خزانہ دولت سے بھر گیا۔ اس کی سلطنت کی معیشت مضبوط سے مضبوط تر اور عوام خوشحال سے خوشحال تر ہوتے چلے گئے۔ انہوں نے اس نقصان کو پورا کرنے کے لئے

تجارت کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت پر بھی خصوصی توجہ دی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے افغانستان' ایران' عرب ممالک' پیگو اور چین سے رابطہ کر کے اعلیٰ کارکردگی کے کاریگر اور ماہرین حاصل کئے۔ ہیروں کا کاروبار شروع کیا' مچھلی فارم بنائے' زعفران کی حصول کا بندوبست کیا اور غوطہ خوروں کو سمندر سے موتی نکالنے کا کام سونپا۔ دنیا کا یہ غیرت مند سپوت اور حکمران اپنے ملک کا بنا ہوا کپڑا پہنتا تھا۔ برھان پور کی پگڑی باندھتا تھا وہ باہر کی چیزوں پر اپنے ملک کی بنی ہوئی چیزوں کو ترجیح دیتے تھے۔ یہاں تک کہ نمک بھی اپنے سمندر کے پانیوں سے تیار کروا کے استعمال کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کا بنا ہوا نمک استعمال نہیں کیا تھا۔ سلطان شہید کو انگریزوں سے سخت نفرت تھی۔ انہوں نے ہندوستان میں چرخے اور کھدر کے کپڑے کو رواج دیا۔ اس کو سودیشی کپڑا کہتے تھے۔ سلطان کی سلطنت کا رقبہ 80000 میل سے بھی زائد علاقے پر پھیلا ہوا تھا جو آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کے رقبے کے برابر بنتا ہے۔ حیدر علی اور ٹیپو کے زمانے میں مسلمان رعایا کی تعداد ان کی ریاست میں ایک یا ڈیڑھ فیصد تھی باقی سب رعایا کے لوگ دوسرے مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے تھے پھر بھی ان کی سلطنت خداداد میں قرآن و سنت کے احکامات کے مطابق قانون نافذ تھا۔ ان کے ملک کا قانون اور آئین اسلام کے بنیادی اصولوں پر بنایا گیا تھا۔ انہوں نے 40 سال حکومت کی مگر اتنے عرصے میں ان کی ریاست میں کوئی فرقہ واریت اور تعصب تک نہیں تھا۔ سلطان شہید اور حیدر علی نے انگریزوں کے خلاف چار جنگیں لڑیں' جو کہ دو دو سال کے طویل عرصے پر محیط تھیں۔ آٹھ یا نو جنگیں انہوں نے مرہٹوں سے لڑیں اس طرح انہوں نے اپنی عمر کے 34 سال جہاد فی سبیل اللہ مسلمانوں کی عزت و ناموس اور اسلام کی سربلندی کی خاطر وقف کر دیئے۔ پاکستان کے حصول کے لئے ان گنت قربانیوں کی ایک طویل داستان ہے جس کی ابتداء آج سے دو سو سال قبل شیر میسور نے کر دی تھی۔

(بحوالہ نوائے وقت۔ سنڈے میگزین مورخہ 7 ستمبر 1997ء صفحہ 19)

سندھ کا الحاق اور افغانستان کا مسئلہ

اورنگ زیب کی وفات کے بعد ماتحت علاقہ جات مرکزی حکومت سے کٹنے لگے تو سندھ میں بھی بغاوت ہو گئی اور 1711ء میں سندھ نے آزادی حاصل کر لی جس پر ایک بلوچ قبیلہ تالپور نے قبضہ کر لیا۔

ان دنوں سندھ تین حصوں میں منقسم تھا۔

1۔ خیرپور۔ 2۔ حیدر آباد۔ 3۔ میرپور خاص۔

اور ان تینوں حصوں پر تین الگ الگ حکمران قابض تھے۔ البتہ خیرپور کا امیر دوسروں سے بالاتر سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ اس کا ان دونوں پر کوئی کنٹرول نہ تھا۔ انگریز تاجر شاہجہان کے دور میں سندھ میں آباد ہوئے لیکن ان کی تجارت زیادہ نہ چمک سکی لہٰذا وہ اس صوبہ کی طرف پوری توجہ نہ دے سکے۔

1809ء میں ہندوستان پر فرانسیسی حکمران نپولین بونا پارٹ کی طرف سے حملہ کا خطرہ تھا۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ارباب نے سندھ کے تینوں حکمرانوں سے "دوامی دوستی" کا معاہدہ کیا۔ جس میں یہ بات قرار پائی کہ سندھ کے حکمران خاندان فرانسیسیوں کو سندھ سے خارج کر دیں گے۔ لیکن انگریزوں کو سندھ کی جغرافیائی اہمیت کا احساس نہ تھا۔ پس انہوں نے 1831ء تک سندھ کے معاملات میں دخل اندازی نہ کی۔ لیکن 1831ء میں برنیز (Burnes) نے دریائے سندھ کو جہاز رانی کے لئے استعمال کیا تو اسے معلوم ہوا کہ صوبہ سندھ کی فوجی اہمیت کس قدر ہے۔ چنانچہ انگریزوں نے مغربی دروں تک رسائی کے لئے سندھ کو انگریزی حکومت کے لئے ضروری سمجھا۔

1832ء کا معاہدہ : 1832ء میں انگریزوں نے سندھی امیروں سے مطالبہ کیا کہ وہ 1809ء کے دوامی دوستی کے معاہدہ پر نظر ثانی کریں۔ چنانچہ انہوں نے 1832ء میں زبردستی سندھی امیروں سے یہ معاہدہ کیا کہ انگریزی حکومت آئندہ سے دریائے سندھ اور سندھی حدود میں واقع شاہراہیں غیر فوجی مقاصد کے لئے استعمال کر سکے گی۔ سندھ امیروں نے انگریزوں کی بدنیتی اگرچہ بھانپ لی لیکن وہ زیادہ زور نہیں دے سکتے تھے۔ البتہ انہوں نے اس معاہدہ میں ایک شق یہ درج کروائی کہ انگریزوں کو سندھ میں آباد ہونے کا حق حاصل نہ ہو گا نیز یہ کہ انگریزی حکومت سندھ کی سرحدوں کا احترام کرے گی۔ 1839ء میں انگریزوں نے شاہ شجاع کو کابل کی حکومت دینے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ برطانوی حکومت روس سے بہت خوف زدہ تھی اور افغانستان کو وہ بطور بفرسٹیٹ (Buffer State) استعمال کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے افغانستان پر وہ اپنا حامی حکمران بٹھانا چاہتے تھے۔ اور شاہ شجاع جو بائیس 22 سال سے انگریزوں کی پناہ میں تھا۔ اس مقصد کے لئے نہایت موزوں شخص تھا کہ وہ کابل کے تخت کا امیدوار تھا۔

افغانستان کے حالات : 1793ء میں احمد شاہ ابدالی کا بیٹا تیمور شاہ فوت ہوا تو کابل پر زمان شاہ قابض ہوا لیکن افغانوں نے اس کا تختہ الٹ دیا اور وہ بھاگ کر کمپنی کے پاس آ گیا اور سیاسی پناہ حاصل کر لی اور افغانستان پر محمود نامی امیر نے قبضہ کر لیا۔ جسے شاہ شجاع نے بھگا دیا اور خود حکمران بن بیٹھا۔ 1809ء میں شاہ شجاع کو بھی ایسی ہی صورت حال سے پالا پڑا اور اسے کمپنی کے پاس پناہ لینی پڑی چنانچہ وہ کمپنی کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے لدھیانہ میں مقیم ہوا۔ اور افغانستان پر دوست محمد خاں نے قبضہ کر لیا۔ 1826ء میں دوست محمد خاں نے اپنی گرفت افغانستان پر مضبوط کر لی۔

ادھر انگریزوں کو روسی حکومت کا خوف تھا اور وہ افغانستان میں اپنی پسند کا حکمران چاہتے تھے۔ انہوں نے دوست محمد خاں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ ان دنوں رنجیت سنگھ پشاور پر بھی حکمران تھا۔ چنانچہ دوست محمد خاں نے مطالبہ کیا کہ پشاور کا علاقہ رنجیت سنگھ سے واگزار کروا کر اسے دلایا جائے۔ لارڈ آک لینڈ رنجیت سنگھ کا دوست تھا اور وہ اس کے ساتھ تعلقات بگاڑنا نہ چاہتا تھا اس لئے دوست محمد خاں کا مطالبہ پورا نہ ہو سکا اور افغانستان کے ساتھ انگریزوں کا معاہدہ نہ ہو سکا۔

اپریل 1838ء میں یہ گفت و شنید ناکام ہو گئی تو لارڈ آک لینڈ نے شاہ شجاع کی حمایت میں رنجیت سنگھ کے ساتھ مل کر افغانستان کے تخت پر اسے بٹھانے کا منصوبہ بنایا۔ رنجیت سنگھ انگریزوں کی حریصانہ چال سمجھتا تھا اور وہ اس منصوبہ میں آلہ کار بننا نہ چاہتا تھا لیکن آک لینڈ نے اپنی دوستی کا واسطہ دے کر اسے اس منصوبہ میں شامل کر لیا لیکن رنجیت سنگھ نے معاہدہ میں یہ بات لکھوا لی کہ انگریزی فوجیں پنجاب کی سرزمین سے نہیں گزریں گی۔ یہ سہ طاقتی معاہدہ جون 1838ء میں وجود میں آیا۔

لیکن جب انگریزی فوجیں افغانستان پر حملہ آور ہوئیں تو معاہدہ کی صریح خلاف ورزی کرتی ہوئی وہ بہاولپور' سندھ' بلوچستان اور درہ بولان کے راستے آگے بڑھیں۔ ڈاکٹر سمتھ کے بقول انگریزی فوج کا منصوبہ ہر طرح کی حکمت عملی کے خلاف تھا جیسے کسی عقل مند شخص کی بجائے اسے کسی پاگل نے تیار کیا ہو۔

اپریل 1839ء میں انگریزی فوجیں گزر کر قندھار پر قابض ہو گئیں اور جولائی تک غزنی بھی ان کے قبضہ میں آ گیا اور دوست محمد خاں کابل چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اور شاہ شجاع کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اب کابل کی حکومت بھی انگریزوں کے زیر سایہ چلنے لگی۔ جنرل ایلفنسٹون کو کابل میں مقیم افواج کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ جبکہ شاہ شجاع کا سیاسی مشیر میکناگھٹن (Macnughten) کو مقرر کیا۔

شاہ شجاع سالوں کی شکست خوردگی کا مارا حکومت سنبھالنے کے قابل نہ تھا۔ لہٰذا کابل میں غیرت مند افغانوں نے بغاوت کر دی اور برنیز کو قتل کر کے دوست محمد خاں کے بیٹے کو اپنا قائد بنا لیا جس نے صلح کی بات کا ڈول ڈالا اور اسی اثناء میں میکناگھٹن کو بھی قتل کر دیا گیا۔ آخر

کابل میں مقیم سولہ ہزار انگریزی فوج نے امن سے ملک چھوڑنے کی اجازت طلب کی۔ اکبر خاں نے اس فوج کو سرحد پر پہنچانے کی ذمہ داری قبول کی لیکن غلط فہمی پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے جنگ چھڑ گئی اور ساری فوج کاٹ ڈالی گئی صرف ایک خوش نصیب فرد زندہ بچ سکا۔ آک لینڈ کو نا اہل قرار دے کر اس کی جگہ لارڈ ایلن برا کو بھیجا گیا۔

انتقامی کاروائی : انتقام کے طور پر ایلن برا نے منصوبے بنائے۔ اور جنرل ناٹ (Notte) اور جنرل پلاک (Pullock) نے کابل سے غزنی واپس آتے ہوئے اکبر خاں کو "کابل خورد" کے قریب شکست دی اور ایک بار پھر بالا حصار کا انگریزی پرچم لہرا دیا۔ کابل کا مین بازار بارود سے اڑا دیا۔ غزنی میں بھی تباہی مچا دی اور محمود غزنوی' سومنات کے مندر کے جو دروازے اپنے ساتھ لے گیا تھا اور جو اس کے مقبرے کی تعمیر میں استعمال ہوئے تھے' واپس ہندوستان لائے گئے اور اعلان کیا گیا کہ ہندوؤں پر زیادتی کا بدلہ ہم نے لے لیا ہے۔ لیکن اس اعلان سے مسلمان سخت ناراض ہوئے۔

1839ء کا معاہدہ : افغانستان کی پہلی جنگ کی ناکامی کے بعد انگریز حکومت نے سندھی امیروں کو دبانا شروع کیا اور جنرل آک لینڈ نے اپنی ناکامی کا غصہ سندھی امیروں پر اس طرح نکالا کہ ان کے ساتھ زبردستی یہ معاہدہ کیا کہ :

1۔ ایک امدادی فوج انگریز افسروں کی کمان میں ٹھٹہ یا سندھ کے کسی اور اہم مقام پر مقیم رہے گی۔
2۔ سندھی حکمران اس فوج کے خرچہ بھتہ کے طور پر تین لاکھ روپے سالانہ کمپنی کو ادا کریں گے۔
3۔ اگر سندھ حکمرانوں کے درمیان کوئی نزاع اٹھ کھڑا ہوا تو انگریزی گورنر جنرل کو ان کے درمیان فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہو گا۔

اس طرح سندھ پر قدغنوں کا آغاز ہوا۔ اور سندھی امیروں پر غیر دوستانہ طرز عمل کا الزام لگا کر انگریزوں نے چارلس نیپئر (Charles Napier) کو نیا ریذیڈنٹ مقرر کیا کیونکہ پہلا ریذیڈنٹ میجر آوٹریم (Major Outram) ایک با اصول شخص تھا اور وہ انگریزوں کی زیادتیوں کی تائید کے حق میں نہ تھا۔

نیپئر نے ہر حیلے بہانے سے سندھ کی خود مختاری پر حملے شروع کر دیئے۔ انگریزی حکومت اس کی پشت پر تھی۔

اس لئے پہلے اس نے مطالبہ کیا کہ امدادی فوج کے اخراجات کے لئے سندھ کے بہت سے علاقے انگریزوں کے حوالے کئے جائیں۔

دوسرا مطالبہ یہ کیا کہ سندھ کے سکوں پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر بنائی جائے۔

تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ دریائے سندھ میں سے گزرنے والے جہازوں کو ایندھن مہیا کیا

جایا کرے۔

سندھی امیروں نے ساری شرائط تسلیم کر لیں لیکن اس کے باوجود نیپئر سندھ پر حملہ آور ہو کر سندھیوں کو غلام بنانا چاہتا تھا اس لئے پہلے اس نے امان گڑھ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور امیروں سے کہا کہ وہ حیدر آباد چلے جائیں۔ ساتھ ہی وہ خود بھی حیدر آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ سندھی عوام پہلے ہی بپھرے ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے انگریز افسروں پر حملہ کر دیا۔ انگریزی فوج منظم تھی جبکہ سندھی عوام اور سرکاری اہلکار غیر منظم انداز میں لڑ رہے تھے۔ چنانچہ فروری 1843ء میں دابو کی لڑائی میں بھی سندھیوں کو شکست ہوئی اور انگریزوں نے بڑھ کر حیدر آباد اور خیرپور پر قبضہ مستحکم کر لیا اور پھر اگست تک اپنی پوزیشن مستحکم کرتے رہے۔ جب ہر طرح سے اطمینان ہو گیا تو اگست 1843ء میں سندھ کے الحاق کا باقاعدہ اعلان کر کے امیران سندھ کو جلا وطن کر دیا گیا۔

الحاق سندھ کی مثال : ایلفنسٹون کے نزدیک سندھ پر قبضہ اور اس کے الحاق کی مثال ایسی تھی جیسے کسی شخص کو بازار میں کسی نے پیٹا ہو اور وہ مار کھا کر گھر پہنچے تو اپنا غصہ نکالنے کے لئے اپنی کمزور اور وفا شعار بیوی کو پیٹنا شروع کر دے۔ چنانچہ افغانستان کی پہلی لڑائی میں ناکامی کے بعد انگریزوں نے سندھ کا الحاق کر کے اپنے وقار کو بحال کرنے کی کوشش کی۔
حالانکہ امیران سندھ نے انگریزوں کے ناجائز مطالبات بھی تسلیم کر لئے تھے۔ لیکن بھیڑیا اور بھیڑ کا بچہ جب گفت و شنید میں حصہ لیتے ہیں تو فیصلہ صاف ظاہر ہے کہ کیا ہوتا ہے؟

پنجاب کی خودمختار حکومت اور سکھوں کا عروج و زوال

ویسے تو پنجاب بارہا بطور خود مختار صوبہ زندہ رہا۔ لیکن سکھوں کے عروج کے دور میں پنجاب کی حدود نہ صرف پنجاب سے باہر تک پھیل گئیں بلکہ اس کی خود مختاری کی ایک باوقار شان بھی تھی۔ اس کی تفصیلات کے لئے سکھوں کے عروج و زوال کی داستان بیان کرنا ہو گی۔

سکھ مذہب کا آغاز : اس پنتھ کے بانی باباگورو نانک 1469ء میں تلونڈی (موجودہ نام ننکانہ صاحب) میں پیدا ہوئے۔ یہ جگہ شاہکوٹ ضلع شیخوپورہ کے قریب واقع تھی۔ کہا جاتا ہے کہ باباگورو نانک شاہکوٹ کے مشہور مسلمان روحانی بزرگ شاہ ابوالخیر المعروف بہ بابا نولکھ ہزاری کی دعا یا ان کے روحانی فیض سے پیدا ہوئے اور بچپن سے ہی معرفت کی وادی میں سیر کرتے پائے گئے۔ ذرا بڑے ہوئے تو والد صاحب نے کاروبار کے لئے کچھ رقم دے کر مال خریدنے بھیجا۔ جسے انہوں نے فقراء میں تقسیم کر کے دلی اطمینان حاصل کیا۔ والد نے حساب مانگا تو فرمایا کہ میں نے سچا سودا کیا ہے۔ چنانچہ جس مقام پر یہ رقم فقراء میں لٹائی تھی اس جگہ کا نام آج کل سچا سودا ہے۔ یہ جگہ منڈی چوہڑ کانہ (موجودہ نام منڈی فاروق آباد) کے نزدیک ہی واقع ہے۔

باباگورو نانک نے اپنے بہنوئی کے پاس جہاں سکھوں کا یادگار گورو دروازہ بنا ہوا ہے' سلطان پور لودھی (نزد کپور تھلہ) میں کچھ عرصہ سرکاری ملازمت کی۔ وہ فارغ اوقات میں جنگلوں میں نکل جاتے اور اللہ اللہ کرتے رہتے۔ یہاں انہیں روشنی نظر آئی اور اللہ کی پہچان کا نسخہ کیمیا حاصل ہوا اور صلح کل کا مشرب اس بزرگ کو عطا ہوا۔ جس کی تبلیغ وہ عمر بھر کرتے رہے۔ آپ 1539ء میں وفات پا گئے اور احسان قریشی صابری کی تحقیق کے مطابق آپ کا جسد خاکی ایک "مسلمان" بزرگ کی حیثیت سے دفن کر دیا گیا۔ اس کی تفصیل راقم کی تاریخ پنجاب میں بھی بیان کی گئی ہے جسے شیخ محمد بشیر اینڈ سنز چوک اردو بازار لاہور نے شائع کیا ہے۔

(قدر آفاقی)

اس بارے میں روزنامہ "امروز" لاہور میں بعنوان "پس منظر" میں گورو نانک کے بارے میں اس طرح لکھا ہے کہ :

گورو نانک : سکھ مذہب کے بانی گورو نانک کے 504 ویں جنم دن کی تین روزہ تقاریب 8 نومبر سے گوردوارہ جنم استھان ننکانہ صاحب میں شروع ہو رہی ہیں۔ ان میں پاکستان کے علاوہ ایران' افغانستان' برطانیہ' کینیڈا اور امریکہ کے سکھ یاتری بھاری تعداد میں شرکت کر رہے ہیں۔ حکومت پاکستان یاتریوں کو ہر ممکن سہولت فراہم کر رہی ہے۔

گورو نانک جی 1469ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام "کالو" تھا۔ وہ ذات کے کھتری تھے۔ تلونڈی میں ان کی چھوٹی سی دکان تھی۔ ایک روایت کے مطابق وہ غلے کا کاروبار کرتے تھے۔ یہ بھی روایت ہے کہ گورو نانک نے سید حسن نامی ایک مسلمان سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔

باپ کی خواہش تھی کہ گورو نانک اپنے آبائی پیشے کی طرف راغب ہوں اور کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ مگر ان کی طبیعت ادھر نہ لگی۔ ان کا زیادہ تر وقت غورو فکر اور حق کی جستجو میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہوئے تو سیاحت کے ارادے سے گھر سے نکلے اور مختلف علاقوں کی سیر کی اور وہاں کافی عرصہ قیام کیا' تاہم گرنتھ صاحب کی پہلی پوتھی بھائی بالا اور سکھ مذہب کی دوسری کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سمندر پار کے بعض ملکوں میں بھی گئے تھے۔ مردانہ جو ایک مسلمان ربابی تھا اور بالا جو سندھ کا جاٹ تھا' ان کے رفیق سفر تھے۔ ایک اور شخص رام داس جو بڈھا کے لقب سے مشہور تھا' ان کا ہم سفر رہا۔

گورونانک ایک صلح کل اور صوفی منش شخص تھے۔ وہ گورو گورکھ ناتھ' بھگت کبیر اور بابا فرید الدین گنج شکر" کے خیالات سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی تعلیمات میں فرقہ واریت اور گروہ بندیوں کی مخالفت کی گئی ہے۔ ان کی زندگی کے دوران میں اور ان کے وصال کے بعد بھی ان کے مذہبی عقائد کے بارے میں متضاد خیالات کا اظہار کیا جاتا رہا ہے حتیٰ کہ ان کی وفات کے بعد ان کو دفنانے یا ہندوؤں کے طریقے کے مطابق جلانے کے متعلق تنازعے کی کئی روائتیں مشہور ہیں۔ بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ صوفی منش شخص تھے اور سب انسانوں کو اچھا سمجھتے تھے۔ وہ خدا کو حق یعنی "سچ" کہتے ہیں اور تشبہ اور تجسم کے قائل معلوم نہیں ہوتے۔ تاہم اکثر اہل علم نے ان کے اقوال سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ تناسخ کے قائل تھے۔ انہوں نے 1539ء میں تقریباً" ستر برس کی عمر میں وفات پائی۔

گورو نانک کی جائے ولادت کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگرچہ وہ تلونڈی کے رہنے والے تھے لیکن ان کی ولادت تلونڈی میں نہیں ہوئی۔ پنجاب کے اکثر حصوں میں رواج ہے کہ بچے کی پیدائش کے وقت سے کچھ عرصہ پہلے عورتوں کو میکے میں بھیج دیتے ہیں' خصوصاً" پہلونٹی کے بچے کی پیدائش پر یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ گورو نانک بھی ننھیال میں پیدا ہوئے اور چونکہ ان کا ننھیال کاہنا کاچھا میں تھا' اس لئے اکثر لوگ ننکانہ صاحب کی بجائے کاہنا کاچھا ہی کو ان کا مولد سمجھتے ہیں۔ اس خیال کی تائید ان کے نام سے بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ پنجاب کے ہندوؤں میں یہ رواج رہا ہے کہ اگر بچہ ننھیال میں پیدا ہو تو ان کا نام نانک رکھتے ہیں۔ اس قاعدے سے انحراف بھی ہوتا ہے مگر نانک اور نانکی سے عام طور پر یہی مطلب لیا جاتا ہے جو اوپر مذکور ہے۔ بہرحال اب ننکانہ صاحب ہی گورو نانک کا مقام پیدائش تسلیم کر لیا گیا ہے اور سینکڑوں برس سے یہیں ان کا جنم دن منایا جاتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے بھی یہ تقریب پہلے ہی کی طرح نہایت عقیدت و احترام سے منائی جا رہی ہے اور اقصائے عالم سے سکھ مذہب کے پیرو اس میں شرکت کرتے ہیں۔ اکھنڈ پاٹھ' کیرتن اور بھوگ میں حصہ لیتے ہیں۔ گورو نانک کی تعلیمات کا چرچا ہوتا ہے۔

(بحوالہ "پس منظر" مطبوعہ در روزنامہ "امروز" لاہور مورخہ 8 نومبر 1973ء)

گورو نانک کے بعد آپ کے دس جانشین ہوئے۔

پہلا جانشین گورو انگد تھا۔ وہ 13 سال خدمات انجام دے کر 1552ء میں فوت ہوا۔ اس نے اگلا گورو امرداس کو نامزد کیا وہ بائیس سال خدمت کر کے 1574ء میں فوت ہو گیا۔ اس گورو نے سکھوں کی مذہبی اور سیاسی تنظیم کی طرف توجہ کی اور سکھ ازم کی تبلیغ کے لئے اقدامات کئے۔ اسے ایک شاہی جاگیر بھی عطا ہوئی جس کے بعد سکھ ازم ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔

رام داس سکھوں کا چوتھا گورو تھا جو امرداس کا داماد بھی تھا یہ گورو اکبر بادشاہ کا مداح اور مددگار تھا۔ اس کے دور میں بھی سکھ ازم نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔ اکبر بادشاہ نے اس گورو کو 1577ء میں موجودہ امرتسر کے مقام پر پانچ سو بیگھوں کی جاگیر عطا کی۔ جہاں انہوں نے سکھوں کے لئے مذہبی تالاب تعمیر کروایا۔ تالاب کی تکمیل کا کام پانچویں گرو کے زمانے میں انجام پایا۔ تالاب کے درمیان میں سکھوں کی مرکزی عبادت گاہ کے طور پر "مندر" کی بنیاد رکھی گئی۔ اس طرح امرتسر کا گولڈن ٹمپل سکھوں کا مرکزی مذہبی مقام بن گیا۔

1581ء میں گورو ارجن اپنے باپ کی جگہ گدی پر بیٹھا۔اس نے سکھوں کی مذہبی کتاب "آدی گرنتھ" کی تدوین تکمیل کی اور یہ مذہبی کتاب 1604ء میں مکمل کی گئی۔

گورو ارجن نے مذہب اور دنیا داری کا ملاپ کر کے اپنا لقب "سچا بادشاہ" اختیار کیا اور ایسے اقدامات کئے جن سے سیاسی ہوس کا اظہار ہوتا تھا۔ اس نے تجارت میں اپنے چیلوں کی مدد کی اور مذہبی تبلیغ کے لئے برصغیر کے علاوہ افغانستان اور وسط ایشیا میں اپنے مبلغ بھیجے۔

1606ء میں گورو ارجن نے مغل شہزادہ خسرو کی مالی مدد کی جس نے جہانگیر کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ جسے شکست ہو گئی اور سیاسی سازباز کی پاداش میں گورو ارجن کو لاہور میں قید کر دیا گیا' جہاں وہ کچھ عرصہ بعد فوت ہو گیا۔

اگلے گورو ہرگووند تھے۔ جس نے 1606ء سے 1645ء تک سجادہ نشینی کا فریضہ انجام دیا۔ اس گورو نے پیداوار کا دسواں حصہ (عشر) تمام سکھوں پر بطور ٹیکس لگا دیا جسے وہ بطور مذہبی نذرانہ وصول کرتا تھا۔ اس طرح یہ گورو بہت مالدار ہو گیا جس نے شان و شوکت کا مظاہرہ بھی کیا۔ یہ گورو جہانگیر کے خلاف معاندانہ رویہ رکھتا تھا کیونکہ وہ جہانگیر کو اپنے باپ کی موت کا ذمہ دار سمجھتا تھا لہذا اس کی خواہش تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے جہانگیر سے انتقام لیا جائے۔ اس نے دریائے بیاس کے کنارے "ہرگووند پور" میں ایک قلعہ تعمیر کرایا جہاں عادی مجرموں کو پناہ دی گئی اور اس طرح ایک فوج اکٹھی کر لی۔

اب گورو جی کے اصطبل میں آٹھ سو گھوڑے تھے اور تین سو گھڑ سوار ہر وقت اس کی خدمت کے لئے تیار رہتے تھے اور ساٹھ توڑے دار بندوقچی گورو صاحب کی حفاظت پر مامور تھے۔

ان فوجی تیاریوں کی خبر سن کر جہانگیر نے اسے گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا تاہم اسے رہا کر دیا گیا۔ لیکن یہ واقعہ گورو صاحب کو جہانگیر کا دشمن بنا گیا۔ حتی کہ شاہجہان کے عہد

میں گورو صاحب نے کھلم کھلا بغاوت کر دی اور چھ سال کے عرصہ میں لاہور کے گورنر کی فوجوں کو تین بار شکست دی اور جب اس پر یلغار کی گئی تو جا کر پہاڑوں میں روپوش ہو گیا۔ جہاں اس نے 1645ء میں انتقال کیا۔

اس کے بعد اس کا پوتا ہررائے گدی پر بیٹھا۔ وہ خاموش طبع اور دیندار شخص تھا اور داراشکوہ اس کا دوست تھا۔ جب دارا 1658ء میں اورنگ زیب کے ڈر سے چھپتا پھر رہا تھا تو گورو ہررائے نے اس کی معاونت کی چنانچہ یہ گورو اورنگ زیب کے زیر عتاب آ گیا اور اس کی طلبی دہلی میں ہوئی۔ اس نے اپنے بیٹے رام رائے کو سکھوں کے پرامن رویہ کی ضمانت کے طور پر اپنے پاس رکھ لیا۔

1661ء میں ہررائے فوت ہو گیا تو اس کے چھ سالہ بیٹے ہرکشن کو گدی پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے خلاف رام رائے نے عالمگیر کے دربار میں نالش کر دی۔ ہرکشن کو دہلی میں بلایا گیا جہاں وہ 1664ء میں چیچک سے مر گیا۔ اس کے بعد سکھوں نے ہرگووند کے بیٹے تیغ بہادر کو گدی نشین بنا لیا۔ لیکن دوسرے کئی امیدوار اپنی اپنی جگہ گدی نشین بن بیٹھے۔ چنانچہ تیغ بہادر ناراض ہو کر کوہ شوالک کی طرف چلا گیا۔ وہاں اس نے انند پور کی بنیاد رکھی۔ وہ دکن کے طویل سفر پر بھی گیا۔ اس سفر میں پٹنہ کے مقام پر 1666ء میں اس کا بیٹا گووند رائے پیدا ہوا۔ پھر وہ پنجاب کی طرف چلا آیا اور چیلوں کے ذریعے لوٹ مار شروع کر دی۔ مغلوں نے اسے گرفتار کر کے دہلی پہنچایا جہاں 1675ء میں اسے موت کی سزا دے دی گئی۔

1675ء میں اس کا نو سالہ بیٹا گووند رائے گدی نشین ہوا جس نے سکھوں کو فوجی قوم بنا دیا۔ اس نے پانچ ککوں (کاف سے شروع ہونے والی پانچ اشیاء) کنگھا، کڑا، کچھا، کیس اور کرپان کو سکھ ازم کے لئے لازمی جزو قرار دے دیا۔ اس گورو نے سکھوں کے نام کے ساتھ سنگھ لگانا بھی لازمی قرار دیا اور سکھوں کے لئے "خالصہ" کا نام اپنایا۔

یہ دسواں گرو تھا۔ انند پور کے قلعہ میں اسے شاہی فوجوں نے گھیر لیا۔ اس کے بیوی بچے بھاگ کر سرہند پہنچے جہاں ہندو اہلکاروں نے اس کے دو بیٹوں کو قتل کر دیا اور یہ خود چھپتا چھپاتا چمکور ضلع انبالہ جا پہنچا جہاں سے بھاگ کر بھٹنڈہ کے ویرانوں میں چلا گیا۔ آخر فیروز پور میں مکتسر کے مقام پر پناہ گزین ہوا۔ جہاں اس نے آدی گرنتھ کی تکمیل کی اور دسم گرنتھ تصنیف کیا۔ 1707ء میں عالمگیر وفات پا گیا تو اس کے بیٹے بہادر شاہ نے گورو صاحب کو دکن کی فوجی کمان عطا کی۔ وہ چارج لینے پہنچا تو ناندیر کے مقام پر اکتوبر 1708ء میں ایک افغان ملازم کے ہاتھوں زخمی ہو کر مر گیا۔ اس کے بعد سکھوں کا کوئی قانونی گورو مقرر نہیں ہوا۔

بندہ بیراگی : یہ گورو گووند سنگھ کا چیلا تھا جس نے سکھوں کی فوجی قیادت سنبھال لی اور پنجاب میں آ گیا جہاں سکھ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ مغل حکومت زوال پذیر تھی۔ تخت نشینی کی جنگوں نے اس کی دھاک ختم کر دی۔ بندہ بیراگی لوٹ مار کرتا دہلی تک پہنچا اور پھر سرہند پر حملہ آور ہوا۔ 1710ء میں سکھوں نے سرہند پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں پر مظالم کی انتہا کر دی۔

بہادر شاہ دکن سے پنجاب آیا اور سکھ فوجوں کو شکست دی۔ بندہ بیراگی بھاگ کر پہاڑوں میں جا چھپا۔ 1712ء میں بہادر شاہ فوت ہوا اور اس کے بیٹے تخت کے لئے لڑنے لگے اور جاندار شاہ کامیاب ہوا۔ لیکن وہ گیارہ ماہ کے اندر فرخ سیر کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ سکھوں نے پنجاب میں تباہی مچا دی۔ پنجاب کے مغل گورنر عبدالصمد خاں نے بندہ بیراگی کو گرفتار کر کے دہلی بھجوا دیا۔ جہاں 1716ء میں پنجاب میں لرزہ خیز مظالم ڈھانے کی پاداش میں بندہ بیراگی کو قتل کر دیا گیا جو گووند سنگھ کے بعد سکھوں کا گیارھواں گورو بن بیٹھا تھا۔ فرخ سیر نے سکھوں کی سرکوبی کے لئے اقدامات کئے لیکن وہ پہاڑوں کی طرف جا کر روپوش ہو گئے۔

احمد شاہ ابدالی کے حملوں میں بھی سکھوں کو لوٹ مار کے موقعے ملے۔ اس کا بیٹا شہزادہ تیمور سکھوں کے خلاف تھا۔ اس نے سکھوں کے مرکز امرتسر پر 1756ء میں حملہ کر کے ہر مندر کو منہدم کر دیا جبکہ تالاب کو مٹی سے پر کروا دیا۔ اس کے بعد سکھوں نے تیمور شاہ کو لاہور سے نکال دیا اور لاہور پر قابض ہو کر سردار جسا سنگھ کلال کی قیادت میں حکومت کرنے لگے لیکن جب 1758ء میں مرہٹے لاہور پر قابض ہوئے تو سکھ لاہور چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

1761ء میں احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست دی تو لاہور پر ان کی گرفت قائم نہ رہ سکی۔ چنانچہ سکھوں نے پنجاب میں لوٹ مار مچا دی۔ 1762ء میں احمد شاہ دوبارہ حملہ آور ہوا تو لودھیانہ میں سکھوں کو شکست دی اور فوراً ہی قندھار واپس چلا گیا تاکہ وہاں بغاوت فرو کر سکے چنانچہ سکھ پھر نمودار ہو گئے اور 1763ء میں سکھوں نے سرہند کے افغان گورنر زین خاں کو شکست دی اور پھر وہ لاہور پر بھی قابض ہو گئے۔ پھر وہ 1764ء میں امرتسر میں جمع ہوئے اور وہاں سے خالصہ حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا اور مجلس گورو متہ قائم کر کے حکومت کی باگ ڈور اس کے حوالے کی اور اس طرح آزاد سکھ حکومت قائم ہو گئی۔

سکھ مسلوں کی حکومتیں : سکھ سردار خالصہ حکومت قائم کر کے اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی "مسجدیں" بنانے لگے اور ان کی حکومت بارہ خود مختار سکھ ریاستوں پر مشتمل تھی۔ یہ مسلیں آپس میں دست و گریباں رہتے تھے۔ لیکن ان میں سکر چکیہ مسل کا والی راجہ رنجیت سنگھ سب سکھ حکمرانوں پر غالب آ گیا اور اس نے پنجاب میں خالصہ حکومت قائم کر لی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ : وہ 2 نومبر 1780ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوا اس کا باپ مہان سنگھ ایک مغل "سکر چکیا" کا سربراہ تھا۔ رنجیت سنگھ' اکبر اعظم کی طرح ان پڑھ تھا تاہم اس کی انتظامی اور سیاسی صلاحیتیں معاون ثابت ہوئیں۔ وہ 12 سال کی عمر میں جنگی معرکوں میں شریک ہونے لگا۔ 1799ء میں احمد شاہ ابدالی کے پوتے زمان شاہ نے پنجاب سے واپسی کے وقت رنجیت سنگھ کے تعاون کا شکر ادا کرنے کے عوض اسے لاہور کا گورنر بنا دیا۔ رنجیت سنگھ نے لاہور کو اپنی راجدھانی کا مرکز بنا کر کئی ایک سکھوں مثلوں پر قبضہ کر لیا اور پنجاب میں سکھ راج کی بنیاد رکھی اور تیس ہزار کی فوج قائم کر کے امرتسر پر 1802ء میں قبضہ کر لیا۔ 1805ء

وہ دریائے ستلج تک کے علاقے کا بھی حکمران بن گیا۔ حتی کہ انگریزی حکومت بھی اس سے خوف کھانے لگی چنانچہ لارڈ منٹو نے چارلس منکاف کو رنجیت سنگھ کے دربار میں اپنا سفیر مقرر کیا جس نے کوشش کر کے انگریزوں اور سکھوں کے درمیان 1809ء میں معاہدہ امن طے کروا دیا۔ یہ پیکٹ معاہدہ امرتسر کے نام سے مشہور ہوا جس کی رو سے رنجیت سنگھ نے ستلج کے پار والے علاقوں کی طرف نہ جانے کا معاہدہ کر لیا اور ساتھ ہی یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ انگریزوں کے خلاف کسی اور یورپی قوم کو پنجاب میں آباد نہیں ہونے دے گا۔

1812ء میں سکھوں نے پھلور کے مقام پر ایک قلعہ تعمیر کیا۔ جس کا قلعدار محکم چند کو بنایا گیا۔ رنجیت سنگھ اور انگریز باہمی معاہدہ کی پابندی کر رہے تھے کیونکہ دونوں اپنی اپنی جگہ سرحدی محاذوں پر برسر پیکار تھے۔ 1812ء میں رنجیت سنگھ نے ایک طرف اٹک فتح کیا اور دوسری طرف کانگڑہ پر قبضہ کر لیا۔ 1814ء میں افغان حکمران شاہ شجاع رنجیت سنگھ کے پاس پناہ گزین ہوا جس سے کسی نہ کسی طرح رنجیت سنگھ نے کوہ نور ہیرا حاصل کر لیا۔

1818ء میں رنجیت سنگھ نے ملتان پر بھی زبردستی اور نہایت ظالمانہ انداز سے قبضہ کر لیا جس میں مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ اس طرح سکھ حکومت کافی وسیع ہو گئی۔ 1823ء میں وہ پشاور بھی فتح کر چکا تھا اور ان دنوں اسے سید احمد شہید کے اور اس کے ساتھیوں سے بھی نبرد آزما ہونا پڑا۔ اس طرح اس کی سلطنت مستحکم اور وسیع ہوتی رہی۔

پھر اس نے مسلمانوں کی ریاستوں پر بھی دھونس اور دھاندلی سے قبضہ کر لیا تھا اور قصور کی اسلامی راجدھانی پر اس نے اس کے حاکم نظام الدین خاں کو مجبور کر کے قبضہ جمایا اور اس کا الحاق لاہور سے ہو گیا۔

پھر وہ چنیوٹ اور جھنگ کی اسلامی راجدھانی کی طرف بڑھا۔ جہاں سردار احمد خاں سیال حکمران تھا اور پنڈی بھٹیاں کی ریاست میں سکھ سردار جسا سنگھ کی حکومت تھی۔ جسا سنگھ نے چنیوٹ پر حملہ کر کے قبضہ جما لیا۔ اس کی شکایت رنجیت سنگھ تک پہنچی تو اس نے چنیوٹ پر حملہ کر کے اسے اپنی رجدھانی میں مدغم کر لیا اور احمد خاں سیال کو اطاعت اور خراج گزاری کا پیغام بھیجا نیز اس نے ملتان کے حاکم مظفر خاں سے جو دفاعی معاہدہ کیا تھا اس کو ختم کرنے پر بھی زور دیا۔ جب احمد خاں نے معاہدہ توڑنے سے انکار کیا تو رنجیت سنگھ نے جنگ چھیڑ دی۔ آخر جھنگ فتح ہوا اور رنجیت سنگھ کی حکومت میں شامل کر لیا گیا۔

اسی طرح مسلمانوں کی ریاستیں جو سیالکوٹ' خوشاب اور وزیر آباد وغیرہ میں قائم تھیں رنجیت سنگھ کی یورش سے تاراج ہو کر سکھ حکومت کا حصہ بن گئیں۔

رنجیت سنگھ اور سندھ : رنجیت سنگھ سندھ پر قبضہ کے لئے پر تول رہا تھا اس کے لئے اس نے 1836ء میں ہری سنگھ نلوہ دیوان سوہن مل اور شہزادہ نونہال سنگھ کو فوجیں دے کر سندھ کے امیروں کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ اطاعت قبول کر کے خراج دینا مان لیں۔ لیکن انگریز آڑے آئے اور رنجیت سنگھ سندھ پر قبضہ نہ کر سکا بلکہ انگریزوں نے افغانستان کی پہلی جنگ میں

شکست کھانے کے بعد خود ہی سندھ پر قبضہ جمالیا جس کا حال پیچھے کہیں گزر چکا ہے۔

رنجیت سنگھ کے جانشین : رنجیت سنگھ جسے سکھوں نے شیر پنجاب کا نام دیا ہے ایک آمر اور ان پڑھ دانشور حاکم تھا وہ بہت متعصب تھا لیکن اس کے اہلکاروں میں ضرورت کے تحت مسلمان بھی شامل تھے۔ تاہم جب وہ 1839ء میں فوت ہو گیا تو اب اس کی سلطنت کے لئے قابل جانشین میسر نہ آسکا۔ آنجہانی کے بیٹے نونہال سنگھ کی بیوی سے پیدا ہونے والے متوقع بیٹے کو فرضی جانشین بنایا گیا جس کی سرپرست اس کی والدہ مائی چند کور کو مقرر کیا گیا اور وہ دھیان سنگھ نامی وزیر کی مدد سے حکومت چلاتی رہی۔ ادھر شیر سنگھ نے سکھ فوج کی مدد سے جنوری 1841ء میں سکھ ریاست پر قبضہ کر کے مہاراجہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ جون 1842ء کو مائی چند کور کو قتل کر دیا گیا۔ ستمبر 1842ء میں سکھ فوجیوں نے مہاراجہ شیر سنگھ کو بھی مار ڈالا اور دھیان سنگھ کو بھی ختم کر دیا گیا اب دھیان سنگھ کے بیٹے ہیرا سنگھ نے ایک نابالغ شہزادے دلیپ سنگھ کو گدی پر بٹھا دیا اور خود اس کا اتالیق بن کر حکومت چلانے لگا۔ یہ انتظام بھی زیادہ دیر تک نہ چلا سکا۔ دسمبر 1844ء میں ہیرا سنگھ کو بھی قتل کر دیا گیا اور حکومت پر جواہر سنگھ اور لال سنگھ کا قبضہ ہو گیا۔ دسمبر 1845ء میں جواہر سنگھ کو گولی مار دی گئی اور پورا اختیار لال سنگھ اور مائی جنداں نے سنبھال لیا۔ اب سکھ فوج بپھر چکی تھی اور اس پر کسی کا موثر کنٹرول نہ تھا چنانچہ جنداں اور لال سنگھ نے سکھ فوجوں کو انگریزوں سے لڑا دیا۔

سکھوں کی پہلی جنگ : چنانچہ دسمبر 1845ء میں سکھوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور دونوں فوجیں مدکی کے مقام پر ٹکرا گئیں۔ لال سنگھ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے میدان جنگ میں غداری کی اور سرجان لٹل کی سات ہزار فوج جسے وہ تیار کرنے پر متعین تھا کو کچھ نہ کہا۔ چنانچہ سکھ شکست کھا گئے۔

دوسرا معرکہ : یہ جنگ 21 دسمبر 1845ء کو فیروز شاہ کے مقام پر ہوئی اور سکھوں کا پلڑا بھاری نظر آنے لگا۔ اتنے میں سکھ کمانڈر تیجا سنگھ فوج کو بے لگام چھوڑ کر بھاگ گیا اور خالصہ فوج ایک ماہ تک بغیر قیادت کے لڑتی رہی' پھر رنجور سنگھ کو سالار بنایا گیا جس نے سرہنری سمتھ کو بدھیوال کے مقام پر شکست دی لیکن اس نے بدھیوال پر قبضہ نہ کیا اور نہ ہی انگریزی فوج کا تعاقب کیا گیا چنانچہ سمتھ نے بدھیوال پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

تیسرا معرکہ : یہ جنگ علی وال کے مقام پر ہوئی جس میں رنجور سنگھ بھگوڑا ہو گیا اور میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا۔

ان حالات میں گلاب سنگھ نے لاہور میں خاصا اقتدار جما لیا تھا۔ اس نے خفیہ طور پر انگریزوں سے ساز باز کی کہ اگر اسے کشمیر دے دیا جائے تو وہ لاہور پر انگریزوں کا قبضہ کروا دے گا۔

چوتھا معرکہ : یہ جنگ سبراؤں کے مقام پر ہوئی۔ اس میں تیجا سنگھ کمانڈر تھا۔ جو میدان

جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا اور اس جنگ میں بے شمار سکھ مارے گئے اور بہت سے ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ اس جنگ میں سکھوں کو شکست فاش ہوئی چنانچہ 20 فروری 1846ء کو انگریزوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔

معاہدہ لاہور : گلاب سنگھ غدار نے انگریزوں کے ساتھ معاہدہ لاہور کیا جس کی شرائط یہ تھیں۔

1۔ دلیپ سنگھ کو پنجاب کی گدی پر بٹھایا گیا۔
2۔ ستلج کے مشرقی جانب کی ریاستیں انگریزوں کے ماتحت قرار پائیں۔ نیز جالندھر اور دوآب کو انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔
3۔ ہزارہ کا ضلع بھی انگریزوں کو دے دیا گیا۔
4۔ سکھ حکومت نے ڈیڑھ کروڑ بطور تاوان جنگ ادا کرنا تسلیم کیا اس رقم میں سے ایک کروڑ کے عوض جموں و کشمیر کے علاقے گلاب سنگھ کے ہاتھ بیچ دیئے گئے اور پچاس لاکھ نقد ادا کیا گیا۔
5۔ سکھوں کی فوجی تعداد 25 بٹالیں اور 12 ہزار سواروں تک محدود کر دی گئی۔

لال سنگھ کی مزاحمت : اب لال سنگھ نے ریاست جموں و کشمیر کا قبضہ گلاب سنگھ کو دینے سے انکار کر دیا اور مائی جنداں نے اقتدار کے خواب دیکھنے شروع کر دیئے۔ اس داخلی انتشار سے انگریزوں نے فائدہ اٹھایا اور سکھ حکومت کے ساتھ ایک اور معاہدہ کر لیا۔

معاہدہ بھیروال : یہ معاہدۂ بھیروال کہلاتا ہے۔ جس کی رو سے طے پایا کہ :۔

1۔ لال سنگھ کو جلاوطن کر دیا جائے گا۔
2۔ دلیپ سنگھ (نابالغ) بطور حکمران قائم رہے گا۔
3۔ دلیپ سنگھ کی اتالیقی آٹھ رکنی کمیٹی کرے گی جو انگریزوں کی حامی ہو گی۔
4۔ سکھوں کو لاہور میں ایک انگریزی ریذیڈنٹ لازمی طور پر رکھنا ہو گا۔
5۔ ایک انگریزی فوج لاہور میں مقیم رہے گی جس کے خرچ بھتہ کے لئے سکھ حکومت 22 لاکھ روپے سالانہ انگریزوں کو ادا کرے گی۔

سکھوں کی دوسری لڑائی : اب سکھوں کو اپنی داخلی ناچاقی کا احساس ہوا جس نے انہیں شکست سے دوچار کیا تھا۔ لہذا اب نئے سرے سے وہ کوشش کرنے لگے۔

2۔ 48-1847ء میں انگریزوں نے اصلاحات کے نام پر سکھوں کو زک پہنچائی اور سکھوں میں بے چینی پھیل گئی۔
3۔ معاہدہ لاہور کی رو سے بے شمار سکھ فوجی فالتو قرار دے کر نکال دیئے گئے جس نے بغاوت کا راستہ ہموار کیا۔
4۔ مائی جنداں کو ایک سازش کی پاداش میں جلاوطن کر دیا گیا اور اسے چنار میں بھیج دیا گیا۔

5۔ ملتان کے گورنر مل راج نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس نے سکھوں کی پہلی جنگ کے دوران خراج کی رقم نہیں بھیجی تھی۔ انگریزوں نے اسے حکم دیا کہ وہ 2 لاکھ روپیہ اور ملتان ریاست کا ایک تہائی علاقہ سکھ کونسل کے حوالے کرے نیز آئندہ سے سالانہ خرچ کی رقم 12 لاکھ سے بڑھا کر 18 لاکھ کر دی گئی۔

ملراج نے اس مطالبے پر کان نہ دھرا۔ البتہ ایک سال کا حساب دینے کا عندیہ دیا۔ جب کہ انگریزوں نے پچھلے دس سال کے حسابات طلب کر لئے حالانکہ وہ چار سال پہلے ملتان کا گورنر مقرر ہوا تھا۔

واقعات : ایسی بے سروپا باتوں کے جواب میں اپنی کمزور پوزیشن کی وجہ سے ملراج نے ملتان کا قلعہ انگریزوں کے حوالے کرنے کی ٹھانی۔ چنانچہ 19 اپریل 1848 کو انگریزوں نے قلعہ کا چارج لے لیا۔ لیکن اگلے دن لوگوں نے دو انگریز افسروں کو قتل کر دیا اور پھر پورے پنجاب میں بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے۔

10 اکتوبر 1848ء کو لارڈ ڈلہوزی نے اعلان جنگ کیا۔ 22 نومبر کو رام نگر کے مقام پر جھڑپ ہوئی۔ پھر ملتان کا محاصرہ ہوا اور جنوری 1849ء کو ملتان پر انگریزی قبضہ ہو گیا۔ اسی ماہ چیلیانوالہ کے مقام پر بھی جنگ ہوئی جس میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ فروری 1849ء گجرات بھی فتح کر لیا گیا۔

پنجاب کا الحاق : چنانچہ 29 مارچ 1849ء کو انگریزی حکومت نے پنجاب کے الحاق کا فیصلہ کر لیا اور دلیپ سنگھ کے معزول کر کے پچاس ہزار پونڈ سالانہ دے کر پورے صوبہ پنجاب (سکھ سلطنت) کو برطانوی سلطنت کا حصہ قرار دے دیا گیا اور دلیپ سنگھ کو برطانیہ لے جایا گیا جہاں اس نے عیسائیت اختیار کر لی۔ سکھوں سے ہتھیار چھین لئے گئے اور پچاس سال اپنی بہار دکھانے کے بعد سکھ حکومت ختم ہو کر رہ گئی۔

مسلمانوں کے ساتھ سکھ حضرات کا معاندانہ رویہ : سکھ حضرات میں دانشوروں کی کمی نہیں۔ وہ باباجی گورو نانک کو صوفی منش بزرگ یا روحانی شخصیت مانتے ہیں۔ باباجی کی تعلیمات میں توحید و رسالت کا ذکر بھی ہے اور انسانی مساوات کی تعلیم بھی۔ وہ واقعی ایک روحانی شخصیت تھے لیکن ایک ہندو کھتری کے گھر پیدا ہونے کی وجہ سے ہندو حضرات نے انہیں ہمیشہ ہندو ہی سمجھا اور ان کے مذہب "سکھ ازم" کو ہمیشہ ہندو ازم کی ایک شاخ باور کرانے کی کوشش کی۔

مغل دور میں سکھ گورو صاحبان کو سرکاری طور پر جاگیروں اور دیگر انعامات سے نوازا گیا لیکن وہ مغل بادشاہ جو سلطنت کی حصول میں اپنے حقیقی بھائیوں کو تہ تیغ کرنے سے نہیں چوکتے تھے وہ سکھوں کے کسی گورو کو اپنے مخالف شہزادے کی طرفداری کرنے پر کیسے معاف کر سکتے تھے۔ چنانچہ بعض مغل بادشاہوں اور سکھوں میں چپقلش شروع ہوئی۔ جو وقت کے ساتھ

ساتھ بڑھتی رہی۔ لیکن بد قسمتی سے اس چپقلش کو سکھ مسلمان دشمنی کا روپ دے دیا گیا حالانکہ اس کے پیچھے ہندو ذہن کام کر رہا تھا۔ رنجیت سنگھ نے بھی جہاں اپنی حکومت کی شان و شوکت بڑھانے کی خاطر سکھ مسلوں کو ہڑپ کیا وہاں مسلمانوں کی جاگیروں اور ریاستوں کو بھی ہڑپ کیا۔ کیونکہ قانون بادشاہی میں یہ سب کچھ بعید نہیں ہوتا اس کے دور میں مسلمانوں کی تعمیر کردہ شاہی عمارات اور مقبرہ جات سے قیمتی پتھر اتار لیا گیا اور ان پتھروں سے اپنے دور میں تعمیرات کر کے اپنی یادگاریں قائم کیں۔ کنہیالال ہندوی نے تاریخ لاہور میں بیان کیا ہے کہ بادشاہی مسجد اور شاہی قلعہ کے درمیان حضوری باغ بنانے کے لئے لاہور کے متصل مقبروں سے سنگ مرمر اتروا کر باغ کے درمیان میں بارہ دری تعمیر کی گئی اور اس کے لئے مقبرہ نور جہاں' مقبرہ آصف جاہ اور مقبرہ جہانگیر وغیرہ سے سنگ مرمر حاصل کیا گیا اور دو سال میں یہ کام مکمل ہوا (تاریخ لاہور صفحہ 226 مطبوعہ مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور) راجہ رنجیت سنگھ نے ملکہ نور جہاں کا طلائی تابوت چرانے کا پروگرام بھی بنایا تھا اس بارے میں جناب احسان قریشی صابری نے بھرپور روشنی ڈالی ہے جس کی بنیاد صابری صاحب کی خاندانی سینہ بسینہ چلی آنے والی روایت ہے جس کی تصدیق ان کے خیال میں کسی تاریخی کتاب سے نہیں ہوتی لیکن راقم (قدر آفاقی) نے اپنی تالیف تاریخ پنجاب میں سکھ اتہاس کے حوالے سے مواد فراہم کیا ہے۔ جس سے احسان قریشی صابری کے تاریخی دعویٰ کی تصدیق بھی ہوتی ہے احسان قریشی صابری کا یہ مضمون نوائے وقت لاہور میں مورخہ 21 مارچ 1976ء کے اتوار ایڈیشن میں طبع ہوا تھا جس کی تفصیلات اس طرح ہیں :-

سکھ دور کا ایک اہم واقعہ

ملکہ نور جہاں کہاں دفن ہے؟

ایک من سونے کا صندوق اور طلائی زنجیر نورجہاں کے مقبرے سے کس نے نکالی تھی؟ (از احسان قریشی صابری)

انگریزی دور میں رائے بہادر کنہیا لال نے 1875ء میں جو "تاریخ لاہور" لکھی تھی۔ اس میں اس نے ملکہ نور جہاں کے مقبرے کے متعلق لکھا ہے کہ نور جہاں کی میت ایک سونے کے صندوق میں دفن کی گئی تھی اور ایک طلائی زنجیر بھی اس کے ساتھ معلق تھی۔ یہ طلائی صندوق ایک من وزنی تھا۔ قبر کا اصل تعویذ نچلے تہہ خانے میں ہے۔ جہاں سیڑھیوں کے ذریعے ایک راستہ جاتا ہے۔ سکھوں کے دور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کو کسی طریقہ سے علم ہو گیا کہ نور جہاں کی میت ایک من وزنی طلائی تابوت میں دفن ہے۔ ایک من سونے کے لالچ میں رنجیت سنگھ نے راتوں رات خفیہ خفیہ چند سکھ مزدوروں کو لے کر نچلی منزل (تہہ خانہ) میں پہنچ کر قبر کے اصل تعویذ کو اکھڑوا ڈالا۔ طلائی تابوت کو راتوں رات قلعہ لاہور میں اپنے محل میں لے آیا۔ سونے کے صندوق پر خود قبضہ کر لیا اور نورجہاں کی نعش قلعہ لاہور پر کہیں ساتھ ہی دفن کر دی۔ پس نور جہاں کی اصل آرام گاہ اب قلعہ لاہور میں ہے۔ شاہدرہ میں نہیں ہے۔

جہاں تک مہاراجہ رنجیت سنگھ کا تعلق ہے۔ رائے بہادر کنہیا لال نے یہ واقعہ "تاریخ لاہور" میں غلط شلط بیان کر ڈالا ہے۔ اصل واقعہ یوں تھا جس کو میں نے اپنے والد مرحوم قبلہ پیر محمد غنی قادری صابری سابق اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس کی زبانی سنا تھا۔ والد صاحب نے مجھے بتلایا تھا۔ کہ اصل واقعہ انہوں نے اپنے دادا (یعنی راقم الحروف کے پردادا) سائیں بہلول قادری المعروف پیر بھولے شاہ سے خود سنا تھا۔ میرے پردادا کی وفات 1910ء میں 105 سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ اصل واقعہ کے راوی وہی ہیں۔ رنجیت سنگھ نے اپنی کیبنٹ کا وزیراعظم فقیر سید عزیز الدین کو مقرر کیا ہوا تھا۔ باقی تمام وزراء سکھ تھے۔ اسی طرح لاہور شہر کا کوتوال (سپرنٹنڈنٹ پولیس) شیخ امام الدین تھا۔ اس کے ماتحت باقی تمام تھانیدار سکھ تھے۔ جو کہ شہر کے مختلف تھانوں میں مقرر تھے۔ لاہور کے کوتوال شیخ امام الدین راقم الحروف کے والد کے دادا (میرے پردادا) سائیں بہلول قادری المعروف پیر بھولے شاہ کے مرید تھے۔ میرے پردادا جب بھی سالانہ عرس حضرت شیخ علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش" کے موقع پر ڈھوڈہ سے لاہور جایا کرتے تھے تو اپنے مرید شیخ امام الدین کوتوال شہر کی حویلی میں ٹھہرا کرتے تھے۔ ہفتہ عشرہ لاہور میں رہ کر عرس کے

بعد واپس ڈھوڈہ (ضلع سیالکوٹ) چلے آتے تھے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ماتحتی میں امام الدین نامی دو مسلمان اعلیٰ آفیسران تھے۔ ایک تو شیخ امام الدین لاہور کے کوتوال جن کا میں یہاں ذکر کر رہا ہوں۔ دوسرے فقیر سید امام الدین جو قلعہ گوبند گڑھ واقعہ شہر امرتسر کے انچارج قلعہ دار تھے اور وزیراعظم فقیر عزیز الدین کے برادر خورد تھے۔

ان کا بیان ہے کہ رنجیت سنگھ نے جب بھی کوئی اہم کام سرانجام دینا ہوتا تھا تو وہ اپنے معتمد وزیراعظم فقیر عزیز الدین سے ضرور مشورہ کیا کرتا تھا۔ فقیر صاحب پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کو بے حد اعتماد تھا۔ یہ فقیر صاحب کی صحبت کا ہی اثر تھا کہ وہ جمعرات کو داتا گنج بخش ؒ کے مزار پر چادر چڑھاتا اور حاضری دیتا۔ اس سے اگلی جمعرات کو وہ مزار حضرت مادھو لال حسین (باغبانپورہ لاہور) پر باقاعدہ جلوس کی شکل میں ہاتھی پر سوار ہو کر جایا کرتا تھا اور وہاں بھی چادر چڑھایا کرتا تھا۔ اس سے اگلی جمعرات پھر دوبارہ داتا گنج بخش ؒ کی چوکھٹ پر حاضری دیتا تھا۔ فقیر سید عزیز الدین مہاراجہ کے ہاتھی کے پیچھے گھوڑے پر سوار ہوتے تھے۔ سوائے ایسے موقع کے کہ بارش ہو رہی ہو۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے اس معمول میں کبھی فرق نہیں آیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جب یہ سنا کہ ملکہ نور جہاں کی میت ایک طلائی تابوت میں دفن ہے اور ساتھ ہی ایک طلائی زنجیر بھی ہے اور سونے کے اس صندوق کا وزن ایک من ہے تو اس نے فقیر سید عزیز الدین سے مشورہ کیا کہ کیوں نہ اس طلائی تابوت پر قبضہ کر لیا جائے۔ اور نور جہاں کی میت وہیں ایک چوبی صندوق میں ڈال کر دوبارہ اسی جگہ دفن کر دی جائے؟ فقیر سید عزیز الدین نے مہاراجہ کے اس اقدام کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ اس اقدام پر مرحومہ کی بددعا رنگ لائے گی اور اس کی روح سخت انتقام لے گی۔ سکھ سلطنت پر اس کے نحس اثرات ثابت ہوں گے۔ انگریز پہلے ہی دریائے ستلج کے اس پار گھات لگا کر (باقی ہندوستان پر قبضہ کئے) بیٹھے ہیں۔ وہ پنجاب پر بھی قبضہ کر لیں گے۔ آپ صوفیاء فقراء اور سادھو درویشوں کے ماننے والے ہیں۔ قبر کی اس طرح بے حرمتی آپ کے شایان شان نہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے وزیراعظم کے اس مشورہ کو قبول کر لیا اور اس اقدام سے باز رہا۔ بدقسمتی سے یہ تمام گفتگو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا بیٹا کھڑک سنگھ سن رہا تھا۔ کھڑک سنگھ بہت لالچی انسان تھا اور طلائی تابوت کا نام سن کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد جب کھڑک سنگھ مہاراجہ بنا تو اس نے نور جہاں کے طلائی تابوت کو اکھاڑنے کے لئے ایک خفیہ پروگرام (چند مزدور سکھوں کے ساتھ) بنایا۔ فقیر سید عزیز الدین وزیراعظم کو کسی طریقہ سے علم ہو گیا۔ انہوں نے مہاراجہ کھڑک سنگھ کو اس شرمناک اقدام سے باز رکھنے کی انتہائی کوشش کی مگر کھڑک سنگھ نہ مانا۔ اس پر فقیر عزیز الدین نے وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا۔ چنانچہ کھڑک سنگھ نے فقیر صاحب کی بجائے راجہ دھیان سنگھ وزیر مالیات کو وزیراعظم مقرر کر دیا۔ فقیر عزیز الدین کی پیروی

کرتے ہوئے کوتوال شہر شیخ امام الدین نے بھی اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔ اور ان کی جگہ لاہور شہر کا سپرنٹنڈنٹ پولیس ایک سکھ کو مقرر کر دیا گیا جن کا نام اودھم سنگھ تھا۔ ان دونوں مسلمان اہل کاروں کے حکومت سے علیحدہ ہو جانے کے بعد نظم و ضبط کی وہ مٹی پلید ہوئی اور وہ افراتفری پھیلی جسے "سکھا شاہی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہی ایام میں کھڑک سنگھ نے راتوں رات چند سکھ درباری ساتھ لے کر نور جہاں کا طلائی تابوت اکھاڑ ڈالا۔ تابوت کو وہیں مشعلوں کی روشنی میں کھولا گیا۔ ملکہ کی میت یا ہڈیاں اسی جگہ ایک چوبی تابوت میں بند کر کے (قبر کی جگہ) دفن کر دی گئیں۔ اور خالی طلائی تابوت کو کھڑک سنگھ اپنے محل واقعہ قلعہ لاہور میں لے آیا۔ یہ طلائی تابوت واقعی ایک من وزنی تھا۔ اور خالص سونے کا تھا۔ اس کے ساتھ ایک طلائی زنجیر بھی معلق تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ طلائی زنجیر عدل جہانگیری سے منسوب سونے کی زنجیر تھی جسے فریادی لوگ کھینچا کرتے تھے۔ اور جہانگیر ان کی فریاد سنتا تھا۔ نور جہاں نے وصیت کی تھی کہ یہ زنجیر اس کے ساتھ ہی دفن کی جائے تاکہ اس کی نجات اخروی کا وسیلہ بنے۔ یہ تھا تمام واقعہ جو میں نے اپنے والد مرحوم کی زبانی سنا تھا۔ انہوں نے یہ واقعہ اپنے دادا کی زبانی سنا تھا۔ اور میرے پردادا نے یہ واقعہ اپنے مرید شیخ امام الدین سابق کوتوال شہر متعینہ لاہور سے سنا تھا۔ نور جہاں کی لڑکی لاڈلی بیگم کی میت چوبی صندوق میں دفن تھی۔ اسے جوں کا توں رہنے دیا گیا اسے چھیڑا نہیں گیا۔ اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ:

1۔ نورجہاں کے مزار کی بے حرمتی اور طلائی صندوں کا سرقہ رنجیت سنگھ نے نہیں بلکہ (اس کی وفات کے بعد) اس کے بیٹے کھڑک سنگھ نے کیا تھا۔
2۔ نورجہاں کی میت دوبارہ اسی جگہ چوبی تابوت میں بند کر کے دفن کر دی گئی تھی۔ جہاں پر آج شاہدرہ میں اس کا مزار ہے۔ اس کی میت کو قلعہ لاہور میں دفن نہیں کیا گیا تھا۔ جیسا کہ رائے بہادر کنہیا لال نے اپنی تصنیف "تاریخ لاہور" میں لکھا ہے۔
3۔ ان ایام میں فقیر سید عزیز الدین وزیراعظم نہیں تھے اور نہ ہی کوتوال شہر شیخ امام الدین تھے۔ ان ایام میں وزیراعظم دھیان سنگھ تھا جو کہ اس شرمناک قبیح اور ناروا اقدام میں مہاراجہ کھڑک سنگھ کے ساتھ شریک تھا۔ نیز کوتوال شہر ان ایام میں اودھم سنگھ تھا۔
4۔ مہاراجہ کھڑک سنگھ کا لڑکا (رنجیت سنگھ کا پوتا) کنور نونہال سنگھ بھی اس کام میں برابر کا شریک تھا۔

نورجہاں کی روح کا انتقام : فقیر سید عزیز الدین کی پیشگوئی سو فیصدی سچی ثابت ہوئی۔ نورجہاں کی میت کی بے حرمتی پر مرحومہ کی بددعا کس طرح رنگ لائی؟ نورجہاں کی روح نے ان سکھوں سے کیسے انتقام لیا؟ حق تعالیٰ نے ان چوروں پر کیسے اپنا قہر و غضب نازل کیا ہے؟ اسے بھی سنئے:

1۔ اس واقعہ کے پورے ایک سال بعد مہاراجہ کھڑک سنگھ کو زہر دیا گیا اور اس کا انتقال ہو گیا۔ "تحقیقات چشتی" کے مصنف مولوی نور احمد چشتی کا بیان ہے (صفحہ 171) کہ مہاراجہ کھڑک سنگھ کی ہلاکت میں اس کے اپنے لڑکے اور ولی عہد کنور نونہال سنگھ (مہاراجہ رنجیت سنگھ کے پوتے) کا بھی ہاتھ تھا۔ تاریخی کتاب "تحقیقات چشتی" مولوی نور احمد چشتی نظامی نے 1864ء میں لاہور سے شائع کی تھی۔ اس میں یہ واقعہ مفصل لکھا ہے۔

2۔ کنور نونہال سنگھ جب اپنے والد کی میت کو آگ سے جلانے کے بعد ماتمی جلوس کی شکل میں واپس جانے لگا تو اودھم سنگھ کوتوال شہر لاہور اس کے ساتھ تھا۔ جب دونوں روشنائی دروازہ کے نیچے سے گزرے (جو کہ حضوری باغ کے سامنے متصل قلعہ لاہور واقع ہے) تو معاً چھت سے ایک بھاری بھرکم پتھر کی سل نیچے ان دونوں سکھوں کے سر پر گری۔ یہ دونوں آناً فاناً اس کے نیچے کچلے گئے۔ دونوں کے چہرے اس بری طرح زخمی ہوئے اور اس بری طرح مسخ ہوئے کہ پہچاننا مشکل تھا۔ یہ دونوں کے دونوں نورجہاں کے مزار کی بے حرمتی کے مجرم تھے۔ ان کا حشر عبرت ناک ہوا۔ دونوں کے سر اس بری طرح کچلے گئے کہ دیکھنے والے سکھ بھی کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ یہ واقعہ نومبر 1840ء میں پیش آیا۔ چنانچہ مہاراجہ کھڑک سنگھ۔ اس کے لڑکے کنور نونہال سنگھ کوتوال شہر اودھم سنگھ تینوں کی ارتھی کو ایک ہی دن چتا میں جلایا گیا تھا یعنی صبح کے وقت کھڑک سنگھ کی ارتھی جلی اور شام کے وقت کنور نونہال سنگھ اور اودھم سنگھ سپرد آتش کر دیئے گئے۔

3۔ نورجہاں کے مزار کی بے حرمتی کا چوتھا مجرم راجہ دھیان سنگھ وزیراعظم ابھی تک بچا ہوا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ڈرا رہتا تھا۔ ان تینوں مجرموں کی عبرت ناک موت پر سہا سہا رہتا تھا اس پر دماغی دورے بھی پڑا کرتے تھے۔ پانچ سال کے بعد 1845ء میں اس کو بھی سردار جیت سنگھ سندھاوالیہ نے قلعہ لاہور میں اپنی کرپان سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور اس طرح لوح مزار نورجہاں کی بے حرمتی کا آخری مجرم 5 سال کے بعد عبرت ناک ہلاکت کے ذریعے اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔ پہلے تین مجرم تو واقعہ بے حرمتی کے ایک سال کے اندر اندر بری طرح ہلاک ہوئے تھے مگر اس آخری مجرم کو ختم ہوتے ہوتے پانچ سال کا عرصہ اس لئے لگا کہ اس واقعہ بے حرمتی کے ساتھ اس کا تعلق ان تینوں مجرمون سے ذرا کم تھا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے فقیر سید عزیز الدین وزیراعظم کی گدی سنبھال لی تھی۔ اس واقعہ کے وقت فقیر صاحب زندہ تھے اور دنیا سے کنارہ کش ہو کر یاد الٰہی میں مشغول رہا کرتے تھے۔ ان کے دوسرے بھائی حکیم سید نور الدین (جو کہ سکھ دربار کے شاہی طبیب تھے) نے بھی احتجاج کے طور پر استعفیٰ دے دیا تھا۔

نورجہاں کی روح نے ان ظالموں سے اپنے لوح مزار کی بے حرمتی کا جس طرح انتقام

لیا۔ وہ میں نے اوپر تفصیلاً بیان کر دیا ہے۔ یہ واقعہ لکھنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ تاریخ کے ایک طالب علم نے مجھ سے سوال کیا تھا کہ "تاریخ لاہور" مصنفہ رائے بہادر کنہیا لال میں لکھا ہے کہ نور جہاں کی میت کو رنجیت سنگھ نے مزار سے نکال کر قلعہ لاہور میں دفن کر دیا تھا۔ یہ واقعہ کہاں تک سچ ہے؟ میں نے اس طالب علم کو جواب دیا کہ نورجہاں کی میت وہیں شاہدرہ میں ہی دفن ہے۔ جہاں پر اس کا مزار ہے۔ قلعہ لاہور پر دفنانے کی روایت کنہیا لال نے غلط سلط لکھ دی ہے۔ نیز طلائی صندوق کو چوری کرنے کا الزام جو مہاراجہ رنجیت سنگھ پر تھوپا گیا ہے۔ وہ بھی غلط ہے۔ یہ قبیح حرکت مہاراجہ کے لڑکے اور ولی عہد کھڑک سنگھ نے (رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد) کی تھی۔ اور اس شرم ناک اقدام میں کھڑک سنگھ کا لڑکا کنور نونہال سنگھ (رنجیت سنگھ کا پوتا) کوتوال شہر لاہور اودھم سنگھ اور وزیراعظم دھیان سنگھ چاروں کے چاروں شریک تھے۔ اس طالب علم نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کی بیان کردہ روایت کسی تاریخی کتاب میں لکھی ہے؟ میں نے عرض کی میری بیان کردہ روایت کسی تاریخی کتاب میں درج نہیں۔ اس واقعہ کو پورے 136 سال گزر چکے ہیں۔ یہ روایت میں نے اپنے والد مرحوم سے سنی تھی۔ انہوں نے یہ اپنے دادا سے سنی تھی۔ دادا نے یہ روایت اپنے مرید شیخ امام الدین سابق کوتوال شہر لاہور سے سنی تھی۔ اب بیٹے تم خود فیصلہ کر لو کہ رائے بہادر کنہیا لال کی بیان کردہ روایت درست ہے یا میرے والد مرحوم کی بیان کردہ روایت درست ہے؟

اس طالب علم نے مجھے مشورہ دیا کہ اس واقعہ کو بھی قلم بند کرنا چاہئے۔ تاکہ رائے بہادر کنہیا لال کے بیان کردہ واقعہ (تاریخ لاہور صفحہ نمبر 93) کی تردید ہو جائے کہ نورجہاں کا جسد خاکی قلعہ لاہور میں دفن ہے۔ طالب علم مذکور نے ہنس کر یہ بھی کہا کہ شاید محکمہ آثار قدیم والوں نے کنہیا لال کی "تاریخ لاہور" کہیں سے پڑھ لی ہو گی۔ تب ہی تو وہ لوگ نورجہاں کے مزار کی سنگ مرمر سے مرمت کرتے ہوئے (آدھا مرمت شدہ مقبرہ) اسی حالت میں چھوڑ چھاڑ کر بھاگ گئے ہیں اور ایسے بھاگے ہیں کہ پندرہ سال سے اس مزار کو اسی طرح ہی چھوڑا ہوا ہے۔ وہ سوچتے ہوں گے کہ جب نورجہاں کا جسدِ خاکی (بقول کنہیا لال کے) یہاں دفن ہی نہیں ہے تو باقی ماندہ سنگ مرمر ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟ آپ کا فرض ہے کہ رائے بہادر کنہیا لال کی بیان کردہ داستان کی تردید کریں اور لکھیں کہ نورجہاں کا جسد خاکی (اسی جگہ شاہدرہ میں ہی دفن ہے) اور اپنے والد مرحوم کی روایت من و عن تحریر میں لائیں۔ تاکہ حقیقت حال کا عوام الناس کو علم ہو {

نام نیک رفتگاں ضائع مکن
تاکہ ماند نام نیکت برقرار

مجھے یہ تجویز بھلی معلوم ہوئی۔ میں نے دونوں روایات اوپر لکھ دی ہیں۔ اب یہ

قارئین کرام پر منحصر ہے کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ آیا رائے بہادر کنہیا لال کی "تاریخ لاہور" میں صفحہ نمبر 93 پر بیان کردہ روایت صحیح ہے یا کہ میرے والد مرحوم کی بیان کردہ روایت مستند ہے۔
آہ ! مظلومہ نورجہاں کی روح بھی کیا کہتی ہو گی؟ {

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از درحق بہر استقبال می آید !

(بحوالہ روزنامہ نوائے وقت لاہور 21 مارچ 1976ء بروز اتوار)

ہندو مورخ رائے بہادر کنہیا لال ہندی کی "تاریخ لاہور" کا ایک سیاہ باب جس کی تردید آپ نے ملاحظہ کی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندو مورخین اور دانشوروں نے کس طرح سکھوں اور مسلمانوں کے بیچ دشمنی کو فروغ دینے کی کوششیں کی ہیں اور کنہیا لال ہندی بھی اس مقصد میں پیچھے نہیں رہا۔

سکھوں کے عروج اور زوال (1469ء تا 1849ء) کا

خصوصی مطالعہ

بابا گورو نانک جی کے بارے میں سید سبط الحسن ضیغم نے لکھا تھا کہ بابا گورو نانک جی مہاراج (1539ء --- 1469ء) 527 سال پیشتر تلونڈی رائے بھوئے (ننکانہ صاحب) میں بیدی نسل کے ایک کھتری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مروجہ علوم کے مقابلہ میں گیان دھیان کے نتیجہ میں تیس سال کی عمر میں سلطان پور لودھی میں نور ازل کی جھلک دیکھ کر سچ کے پرچار کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ بابا جی کے بارے میں لکھنے والے اس بات پر متفق ہیں کہ پنجابی ان کی مادری زبان تو تھی ہی لیکن وہ عربی' فارسی اور سنسکرت کے بھی ودوان تھے اور جب بھی کسی کے ساتھ ڈایلاگ ہوتے' متعلقہ شخص سے اس کی زبان میں بات کرتے تھے تاکہ ابہام پیدا نہ ہو اور متعلقہ فرد ان کے گیان اور روحانی علم سے پورا پورا گیان حاصل کر سکے۔ دوسرے لفظوں میں مخاطب کو ان کی گفتگو کا پورا ادراک ہو سکے۔

پنجاب بنیادی طور پر ایسی دھرتی ہے جو دوابوں پر مشتمل ہے اور ہزاروں سالوں سے اپنی زرخیزی اور خود کفالت کی وجہ سے پوری دنیا' ایشیا اور یورپ کے تمام حصوں سے قومیں اور نسلیں نقل مکانی کر کے یہاں امن' سلامتی' خود کفالت اور خوشحالی کی دولت سے مالا مال ہونے کے لیے رہائش اختیار کرتی رہی ہیں۔ مقامی نسلوں اور باہر سے آکر آباد ہونے والے قبیلوں اور نسلوں کی تعداد ایک ہزار سے بھی کہیں زیادہ ہے جن کی "مل ورتن" اور میل سے پیدا ہونے والی نسل' ذات پات' دوئی' بت پرستی' نسلی برتری کی کبھی قائل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اندر کی قیادت میں ایران سے نکالے جانے والے آریائی قبیلوں کی نسلی باقیات کے آثار تو یہاں ملتے ہیں مگر ان کی فکری اور نظری سوچ کے اثرات قطعی طور پر دکھائی نہیں دیتے' اسی کے نتیجہ میں بدھ مت کو یہاں فروغ ملا کیونکہ بدھ مت آریائی مذاہب یعنی ہندو مت کے شدید ردعمل کا نتیجہ تھا اور اسلام بھی اسی خطہ میں پھیلا اور توحیدی فکر کو اور بھی مضبوط اور زیادہ جاندار طریقہ سے پیش کیا گیا جسے بلاجھجک تسلیم کر لیا گیا۔

ہندو مت اور اسلام کے ٹکراؤ کے فطری نتیجہ میں تخلیق ہونے والی شخصیت کو بابا گورو نانک جی مہاراج ہونے کا فخر ہے۔ انہوں نے دھرتی بانی کو اپنی مادری زبان پنجابی کے ذریعہ روشناس کرایا۔ یہ ایک ایسی کیفیتی تبدیلی تھی جس نے پنجاب میں تو اثر پذیر ہونا ہی تھا پورے بھارت کے تیرتھوں کو لرزہ براندام کر کے رکھ دیا کیونکہ بابا جی ہر تیرتھ پر گئے اور وہاں کے مذہبی

سکالروں سے ڈائیلاگ کر کے ان کے فکر و فلسفہ کو محبت سے دلائل دے کر باطل ثابت کیا اور تمام ہندو عبادات' رسم و رواج' اعتقادات کی گمراہی کو ترک کر کے "سچے مارگ" پر چلنے کو سلامتی قرار دیا۔ اس عہد کے مسلمان درویشوں' صوفیوں اور سکالروں سے بھی بابا جی نے ملاقاتیں کیں۔ وچار وٹاندرہ کیا۔ باباجی نے اپنے توحیدی خیالات کا پرچار جپ جی میں کیا ہے کہ خدا وہ ہے جس نے سب کو تخلیق کیا ہے۔ وہ غیر فانی ہے نہ کوئی اس کا خالق ہے اور نہ وہ تخلیق کیا گیا ہے۔ وہ قائم بالذات ہے بلکہ وہ ازل سے موجود ہے' عظیم ہے' مہربان ہے' اس کا نام سچ ہے۔ جپ جی توحیدی فلسفہ کا شاہکار اور نادر نمونہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی تمام صفات کو انتہائی مدلل' منطقی لیکن خوبصورت اور موثر شعری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

بابا جی کے جیون کو تین حصوں (1469/97ء) 28 سال) غور و فکر اور گیان دھیان (1521ء/ 1497ء) (24 سال) تبلیغی دوروں اور (1521/39ء) (18 سال) تبلیغی مرکز قائم کر کے اپنے پیغام کو پھیلانے کے زمانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ باباجی نے افغانستان' عرب و عجم اور پورے بھارت کے تمام اہم اور مقدس مقامات اور تیرتھوں پر پہنچے اور الٰہی پیغام کو اپنے انداز میں پیش کر کے جرات مندانہ اظہار کی راہ اپنائی۔ اس پورے عہد میں جتنے بھی صوفی درویش ان علاقوں میں تھے انہیں ملے۔ ان کی سنی اپنی سنائی۔

بابا جی کی بانی دو ذریعوں سے محفوظ کی گئی ہے۔ ایک تو شری گورو گرنتھ صاحب جسے پانچویں گورو ارجن دیو مہاراج نے 1604ء میں مرتب کیا دوسرا ذریعہ جنم ساکھی لٹریچر ہے جو پنجابی نثر و نظم کا مغل عہد کا شاہکار سوانحی لٹریچر ہے۔ ان میں جنم ساکھی بھائی بالا' جنم ساکھی بھائی منی سنگھ' جنم ساکھی حافظ آباد والی' جنم ساکھی میکالف والی' پراتن جنم ساکھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ انہی ماخذوں کی بنیاد پر ترتیب دی جانے والی تواریخ گورو خالصہ' سکھ اتہاس میکالف' مختصر و مکمل تاریخ گورو خالصہ' گورمت لیکچر نامی کتابوں میں ایسا منظوم کلام موجود بابا نانک "جی مہاراج" کا حصہ قرار دیا جاتا ہے۔

گورو بابا نانک جی مہاراج پنجابی اور سادھ بھاشا کا ایسا ملغوبہ ہے جس پر مغربی پنجابی کے غیر معمولی اثرات ہیں۔ عربی' فارسی الفاظ بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں' گرو گرنتھ صاحب میں بابا جی کی بانی 586 بندوں میں ہے' کہیں بند دو مصرعوں پر مشتمل ہے اور کہیں ہر بند میں دس دس مصرعے بھی ہیں' عروض کے لیے باباجی نے 19 راگوں سے استفادہ کیا ہے۔ وہ الٰہی پیار انسان دوستی کے پیار میں ڈوبی ہوئی کیفیت میں "دھرکی بانی" بیان کرتے ہیں' جس کے چند نمونوں سے کلام کی اس خوشبو تک آسانی کے ساتھ پہنچا جا سکتا ہے۔

دیا کپاہ' سنوکھ سوت

جت گندھی ست وٹ

ایہہ ہے جنیو جی کا
ہی تے پانڈے گھت
بابا مایا ساتھ نہ ہوئے
ان مایا جگ مویا
ورلا بجھے کوئے

مہر میت، صدق مصلیٰ، حق حلال قرآن
شرم، سنت، روزہ، ہوئے مسلمان
کرنی کعبہ سچ پیر، کلمہ کرم نواز
تسبیح، سا تس بھاوسی، نانک رکھے لاج
بابا دیکھے دھیان دھر، جلتی، سبھ پرتھری دس آئی
باجھ گرد غبار ہے، ہے ہے کردی، سنی لوکائی
بابا آکھے حاجیاں، شبھ عملاں، باجھوں دونویں روئی
ہندو مسلمان، دوئے، درگاہ اندر لین نہ ڈھوئی
مرن منسا سوریا، حق ہے، جو ہوئے مرن پروان
سورے سائی اگے آکھئے، درگاہ پاوے ساچ مان

راج، مال، روپ، جات، جوبن، پنجے ٹھگ
انہی ٹھگی، جگ ٹھگیا، کنے نہ رکھی لج

نال کراڑاں دوستی، کوڑے کوڑی پائے
مرن نہ جاپے مولیا! آوے کتے تھائے
آپے، چھینج پوائے، ملا کھڑا رچیا
تسمے بھڑ تھوپائے، گورکھ مچیا
من؛ مکھ مارے پچھاڑ، مورکھ کچیا
آپ بھڑے، آپے، آپے کا رخ رچیا

کل پروان قرآن کتب، پوتھی پنڈت رہے پوران
نانک! ناؤں بھیا رحمان، کر، کرتا، تو اکو جان

پیر، پیغمبر، سالک، صادق
چھوڑی دنیا تھائے پے

مں صلاحیت محمدی ' کھ ہی آکھو نت
خاصہ بنریا بجیا' سر متراں مت
م محمد من توں' من کتاباں چار
من خدائے رسول نوں' سچائی دربار

گویا باباجی نے پندرہویں اور سولہویں صدی میں پنجاب ہی نہیں ایک دنیا کو گورو بانی سے مسحور کر کے رکھ دیا جن کے اثرات میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک باقاعدہ ایک مذہبی سکول سامنے آیا جو آج سکھ دھرم سے معروف ہے لیکن باباجی اپنی فکر کی وجہ سے مسلمانوں میں بھی اسی قدر مقبول اور احترام کے پاتر ہیں فکری طور پر نانک بانی کے مسطورہ بالا مصرعے' اپنی گمبھیرتا کی وجہ سے الگ الگ مضامین بیان کرتے ہیں جس تفہیم اور تشریح کا یہ لیکھ متحمل نہیں ہو سکتا۔

(بحوالہ نوائے وقت لاہور' مورخہ 19 نومبر 1995ء بروز اتوار)

سکھ مت کی ابتداء اور عروج

اس کے بانی بابا گورو نانک 1469ء میں تلونڈی رائے بھولا میں پیدا ہوئے۔ جسے اب ننکانہ صاحب کہتے ہیں۔ تعلیم زیادہ نہ پائی۔ تاہم فطرت سلیم سے بہرہ مند تھے اور ہر وقت معرفت کی وادی میں سیر کرتے تھے اور دنیا داری سے لگاؤ بالکل نہ تھا۔ والد صاحب نے کچھ رقم سودا خریدنے کے لیے دی جو انہوں نے فقراء میں تقسیم کر دی۔ والد نے حساب مانگا تو کہا میں نے "سچا سودا" کیا ہے۔ جس مقام پر یہ واقعہ گزرا اسے سچا سودا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جو ضلع شیخوپورہ میں ایک قصبہ ہے' پھر والد نے سلطان پور (لودھی) کپور تھلہ (بھارت) کے نواب دولت خاں کے ہاں ملازمت دلا دی۔ جہاں سال ہا سال تک یہ فرائض انجام دیتے رہے لیکن فرصت کے لمحات میں جنگلوں میں نکل جاتے اور مراقبہ کرتے۔ ایک دن انہیں اللہ کا دیدار نصیب ہوا اور تبلیغ کا حکم ملا کہ اللہ واحد کے نام کا پرچار کرو۔ جو صرف ایک ہے۔ اس کا نام حق ہے۔ وہ خالق ہے۔ دشمنی اور خوف سے مبرا ہے۔ لافانی ہے۔ غیر مخلوق ہے۔ قائم بالذات ہے۔ اکبر (اعلیٰ) اور فیاض ہے۔" چنانچہ وہ ملازمت چھوڑ کر سیاحت کے لیے نکلے اور تیس سال کی عمر میں اپنے دین کی تبلیغ کرنے لگے۔ اس اثنا میں وہ ہندوؤں کے مقدس مقامات اور مسلمان اولیائے کرام کے مزارات پر حاضر ہوتے اور فیض پاتے اور پنڈتوں سے مباحثے کرکے انہیں شرک سے منع کرتے رہے۔ کہتے ہیں کہ بابا نانک نے ایران' افغانستان اور مکہ معظمہ اور بغداد شریف کا سفر بھی کیا۔ انہوں نے فارسی اور دینیات کی تعلیم ایک مقامی سید بزرگ سید حسن سے حاصل کی تھی۔ (سیر المتاخرین) بابا نانک نے آخری عمر میں ایک قصبہ کرتار پور بسا کر اس میں رہائش اختیار کر لی اور 1539ء میں فوت ہوئے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔

دو بیٹے : ایک کا نام لکھمی چند تھا۔ وہ دنیا داری کی طرف راغب تھا۔ دوسرا سری چند فقیری طریق پر گامزن ہوا اور اپنے طریقہ کا نام اوداسی رکھا۔ جس کے پیروکار لمبے بال رکھتے ہیں اور انہیں پگڑی کی جگہ سر پر باندھتے ہیں۔ پاجامہ یا تہہ نہیں پہنتے صرف لنگوٹا پہنتے ہیں۔ بدن پر راکھ ملتے ہیں۔ حجامت نہیں کرواتے۔ بدن کو استرا نہیں لگواتے۔

ایک دفعہ راقم (قدر آفاقی) کے والد محترم چودھری محمد علی مرحوم ولد رحمت اللہ ڈاکٹر ساکن کڑیال کلاں تحصیل نوشہرہ ورکاں ضلع گوجرانوالہ نے بابا نانک کے بارے میں اس طرح ذکر کیا تھا:

"کہتے ہیں کہ بابا نانک کے والدین شاہ کوٹ (ضلع شیخوپورہ) کے مسلمان بزرگ شاہ ابو الخیر عرف بابا نو لکھ ہزاری یا ان کے جانشین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اولاد نرینہ کے لیے دعا کی درخواست کی۔ صاحب کرامت ولی نے دعا کی اور ساتھ ہی کہا اللہ تعالیٰ تمہیں بیٹا دے گا دین تمہارا کم اور ہمارا زیادہ ہو گا۔ چنانچہ جب بابا نانک پیدا ہوئے اور بڑھے پلے تو اہل نظر نے معلوم

کیا کہ وہ مادر زاد ولی اللہ ہیں۔ کنھیا لال ہندی اپنی تاریخ پنجاب (صفحہ 18-19) میں لکھتے ہیں کہ چھ سات سال کی عمر میں نانک گھر سے باہر نہ نکلتا۔ نہ لڑکوں سے کھیلتا۔ اکثر خاموش رہتا۔ کوئی بلاتا تو بولتا ورنہ چپکا رہتا۔ اقرباء نے مریض جان کر طبیب کو بلایا۔ اس کے ساتھ عارفانہ باتیں ہوئیں وہ مریض عشق قرار دے کر چلا گیا۔ سولہ برس کی عمر میں اس کی شادی بٹالہ کے مولا کھتری کی بیٹی سلکھنی سے ہوئی۔ نانک جی کی بہن نانکی سلطان پور کے جے رام کھتری سے بیاہی گئی تھی۔ (یاد رہے کہ شاہ ابو الخیر عرف بابا نو لکھ ہزاری کے زمانہ حیات کے بارے میں راقم (قدر آفاقی) نے شیخوپورہ میں رہائش پذیر پنجابی ادب کے مشہور محقق اور مجلس وارث شاہ شیخوپورہ کے جنرل سیکرٹری اور تاریخ شیخوپورہ کے مولف جناب مقصود ناصر چودھری سے ٹیلیفون پر رابطہ قائم کیا تو مرحوم نے اپنی علالت کے باوجود تین چار بار کی یاد دہانیوں کے بعد مجھے بتایا کہ شاہ ابو الخیر مغل دور کے آغاز سے بھی پیشتر کے زمانہ سے متعلق تھے۔ میں نے ان کو یہ بات لکھ کر بھجوانے کی بھی درخواست کی تھی لیکن بوجہ شدید علالت وہ ایسا نہ کر سکے پھر پتہ چلا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ (قدر آفاقی)

بابا نانک جی چونکہ بابا نو لکھ ہزاری کی دعا یا فیض سے پیدا ہوئے تھے اس لیے وہ اسلام کی طرف مائل اور بت پرستی کے خلاف تھے۔ وہ توحید پرست' صلح کل' خدا دوست' صاحب کشف و کرامت' بے طمع اور صاحب عبادت و ریاضت بزرگ تھے۔ ایک مسلمان عقیدت مند بھائی مردانہ (مطرب = میراثی) ان کے ساتھ رہتا۔ وہ خدا تک پہنچنے کے لیے حضرت محمد مصطفیٰؐ کو وسیلہ قرار دیتے تھے۔ وفات کے بعد ان کی میت کے غائب ہو جانے پر مورخین متفق ہیں۔ جو ایک سربستہ راز تھا۔ ہندو حضرات بابا نانک جیسے مجذوب اور عاشق صادق ولی اللہ کی مجذوبیت سے فائدہ اٹھا کر انہیں ہندو قرار دیتے تھے جبکہ اہل اسلام کے نزدیک وہ ایک مجذوب اور اللہ کی محبت میں وارفتہ اور ایک پہنچے ہوئے مسلمان بزرگ تھے۔

(قدر آفاقی ایم اے مرتب کنندہ تاریخ پنجاب مطبوعہ لاہور 1997ء)

ایک راز سے پردہ اٹھتا ہے

کیا بابا نانک مسلمان درویش تھے اور دفن کیے گئے تھے؟

بہت سے مسلمان بزرگ بابا نانک کو مسلمان بزرگ ہی سمجھتے ہیں۔ بہرحال بابا نانک ایک صلح کل شخصیت کے مالک تھے۔ مسلمان ان کو مسلمان اور ہندو ان کو ہندو سمجھتے تھے۔ بھائی مردانہ جو ان کا ہر وقت کا ساتھی تھا مسلمان تھا۔ بابا جی توحید کی شراب میں مست رہتے تھے اور ان کے ارشادات سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا وسیلہ بھی مانتے تھے۔ وہ عشق الٰہی میں مستغرق رہتے تھے۔ جیسے ایک مجذوب ہوتا ہے۔

ستمبر 1974ء کے بعد کی بات ہے موڑ سمن آباد (لاہور) پر مدینہ کراکری مارٹ کے نام سے راقم (قدر آفاقی) کی پارٹ ٹائم دکان تھی۔ 1980ء کے بعد 85-1984ء تک کے عرصہ میں مکان شریف المعروف بہ رتڑ چھتڑ ضلع گورداسپور (بھارت) کے نقشبندی بزرگوں سید امام علی شاہ اور سید صادق علی شاہ مرحوم کے خاندان کے چشم و چراغ ایک سید صاحب تھے وہ موڑ سمن آباد کے قریب اردو نگر میں عبدالحمید بٹ کی کوٹھی کے ایک حصہ میں کرایہ پر رہتے تھے اور غالباً لیبر ڈیپارٹمنٹ میں افسر تھے۔ وہ اکثر شام کے وقت راقم کے پاس تشریف لے آتے اور میری دکانداری چونکہ نہ ہونے کے برابر تھی اس لیے گھنٹہ گھنٹہ بھر بیٹھ کر مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہتے۔ ان کے ساتھ مجھے محبت تھی کیونکہ سلسلہ نقشبندیہ کے مہر عالمتاب میاں شیر محمد صاحب "شرقپوری" کا بڑا پیر خانہ مکان شریف ہی تھا اور میرا پیر خانہ شرقپور شریف ہے ان شاہ صاحب کا نام غالباً شوکت صاحب یا کچھ اور تھا۔

مجھے ان شاہ نے ایک دفعہ باتوں باتوں میں بتایا تھا کہ "بابا گورو نانک کی وفات کے بعد مسلمانوں نے نہایت رازداری سے بابا جی کو رات کی تاریکی میں کہیں لے جا کر دفن کر دیا تھا' اور ان کی چارپائی پر چادر کے نیچے پھول رکھ دیئے تھے۔ جن کو بانٹ کر مسلمانوں نے دفن اور ہندوؤں نے نذر آتش کر دیا تھا۔"

یہ بات میرے لیے بڑی تعجب خیز تھی' لیکن میں چپ رہا کیونکہ ایسی بات کو آگے بڑھانا کسی طرح بھی قرین انصاف نہ تھا۔ چنانچہ ایک دن میں نے ان شاہ صاحب سے عرض کیا کہ آپ نے بابا نانک جی کے بارے میں جو واقعہ مجھے بتلایا تھا وہ ذرا دوبارہ بیان کریں تاکہ میں قلمبند کر لوں تو ان شاہ صاحب نے نہ صرف اس واقعہ سے کلی لاعلمی کا اظہار کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ انہوں نے ایسا کوئی واقعہ کبھی سنایا ہی نہ تھا۔ میں نے بہت یاد دہانی کروانے کی کوشش کی مگر بے سود۔۔۔ آخر میں نے جان لیا کہ سید صاحب مجھے اس واقعہ کو قلمبند کروانے سے گریزاں ہیں۔

بہرحال یہ واقعہ ان شاہ صاحب نے مجھے سنایا ضرور تھا۔

تاہم میں خاموش ہو رہا۔ (چند سال بعد ان سید صاحب کا انتقال ہو گیا۔)

1994ء کی بات ہے کہ میں ماہنامہ ایوارڈ سیالکوٹ بابت 1994ء (شمارہ 8 جلد 6 چیف ایڈیٹر جاوید احمد ضیائی) کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اس کے صفحہ نمبر 17 پر ڈاکٹر احسان قریشی صابری سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج آف کامرس سیالکوٹ کا آرٹیکل "بابا نانک سیالکوٹ میں دفن ہیں" دیکھا۔ اسے غور سے پڑھا تو وہی شاہ صاحب والی بات قلمبند کی ہوئی مل گئی۔ وہ آرٹیکل من و عن ذیل میں دیا جا رہا ہے تاکہ ایک راز ایک رسالے کی اشاعت میں دفن ہو کر ہی نہ رہ جائے۔ یاد رہے کہ رتڑ چھتڑ یعنی مکان شریف دریائے راوی کے بائیں کنارے جسڑ کے قریب بھارتی علاقہ میں واقع ہے' اور نقشبندی بزرگوں کے مزارات کے کلس پاکستانی سرحد سے صاف نظر آتے ہیں۔

(سینہ بہ سینہ چلا آنے والا پوشیدہ راز)۔

بابا نانک جی ضلع سیالکوٹ میں دفن ہیں!

از قلم ڈاکٹر احسان قریشی صابری سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج آف کامرس سیالکوٹ۔

کئی قارئین کرام یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ بابا نانک اوپر سے تو ہندو تھے مگر اندر سے مسلمان تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات کے بعد ہندو اور مسلمانوں میں سخت نزاع برپا ہوا کہ ان کو مسلمان سمجھ کر دفن کیا جائے یا ہندو سمجھ کر جلا دیا جائے۔

پیشتر اس کے میں تفصیلاً لکھوں کہ اصل واقعہ کیا ہوا تھا؟ کیونکر ہوا تھا؟ اور کیسے ہوا تھا؟ میں اس موضوع پر رائے بہادر کنہیا لال کی مشہور کتاب تاریخ پنجاب کے صفحہ 11 کی فوٹو کاپی پیش کر رہا ہوں جس میں میری تحقیقات کو (1/2) یعنی آدھا تو تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ کتاب 1875ء میں شائع ہوئی تھی۔ (انگریزوں نے پنجاب پر 1849ء) میں قبضہ کیا تھا۔ یہ کتاب پورے 26 سال بعد 1875ء میں شائع ہوئی۔ ان ایام میں رائے بہادر کنہیا لال۔ لاہور میں انجینئر تھے۔ وہ شعر و شاعری بھی فرما لیا کرتے تھے۔ ان کا تخلص "ہندی" تھا۔)

رائے بہادر نے لکھا ہے کہ بعد از وفات مسلمانوں اور ہندوؤں میں اس بات پر سخت تنازع یا نزاع برپا ہوا تھا کہ میت کو دفن کرنا ہے یا ہندو رسومات کے مطابق جلانا ہے۔ تلواریں بھی دونوں جانب کھنچیں۔

یہاں تک رائے بہادر نے بالکل صحیح لکھا ہے مگر آگے جا کر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ صحیح نہیں۔ قارئین کرام سب سے پہلے مذکورہ کتاب کے صفحہ 11 کی فوٹو کاپی (صحیح عکس) ملاحظہ فرمایئے اور مندرجات کو غور سے پڑھئے۔ (یہاں صرف اقتباس دے رہا ہوں) (قدر آفاقی)

تاریخ پنجاب مصنفہ رائے بہادر کنہیا لال (تخلص ہندی) مطبوعہ 1875ء صفحہ 11 کا اقتباس۔)

"طرح طرح کی نعمت کا خوان بن گیا جب یہ جواب پایا تو لڑکے خاموش ہو گئے۔ آخر گورو نانک بروز دسمی اسوج س م 1599 بکرمی 993 ھ اور 1538ء کو اس جہان فانی سے سفر کر گیا چونکہ گورو نانک ایک آدمی صلح کل ہندو مسلمان کے ساتھ برابر رکھتا تھا۔ بعد وفات اس کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں درباب جلانے یا دفن کرنے نعش اس کے سخت تنازع برپا ہوا کیونکہ مسلمان اس کو جانتے تھے کہ یہ فقیر خدا پرست ہے۔ اقوال اس کے مطابق آیات قرآن و حدیث پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہیں اس کو دفن کرنا چاہئے۔ جلا دینا ایسے مقبول شخص کی سراپا بے ادبی ہے اور ہندو بسبب اس کے کہ وہ ہندوؤں کے گھر پیدا ہوا اور ہندو تھا اپنے عقائد کے بموجب اس کی نعش کو جلا دینا ثواب تصور کرتے تھے۔ اس بات پر فریقین کے درمیان سخت نزاع برپا ہوئی اور تلواریں کھنچیں۔ ایسی حالت کے بعد بعض مردمان انصاف پرست درمیان

میں آ گئے اور فیصلہ اس بات پر ٹھہرا کہ گورونانک کی نعش نہ تو دفنائی جائے اور نہ داغ دیا جائے بلکہ دریائے راوی میں بعد کفن اور خوشبو لگانے کے بہا دی جائے۔ مسلمان اس بات پر راضی ہوئے اور غلبہ کر کے اس مقام پر جا گھسے جہاں بابا نانک کی نعش رکھی تھی۔ وہاں پہنچ کر چاہتے تھے کہ نعش کو اٹھائیں مگر جب چادر نعش سے اٹھائی تو نعش کو وہاں موجود نہ پایا۔ صرف چند پھول خوشبودار چادر کے نیچے پڑے ہوئے نظر آئے۔ ایسے حال کے وقوع میں آنے سے مسلمان نہایت شرمندہ ہوئے اور چاہا کہ اسی چادر اور پھولوں کو لے جا کر دفن کریں اتنے میں ہندو اجتماع کر کے آ پہنچے اور آدھی چادر انہوں نے مسلمانوں سے چھین لی۔ غرض وہی آدھی آدھی چادر مسلمانوں نے تو دفن کی اور ہندوؤں نے جلا دی اور گورونانک مع جسم جان دیدہ ظاہر بین سے پوشیدہ ہو کر بہشت میں منزل گزیں ہوا۔"

احسان قریشی لکھتے ہیں: بھارت کا قصبہ ڈیرہ بابا نانک ضلع گورداسپور ہمارے قصبہ جسڑ ضلع سیالکوٹ سے صرف پانچ میل دور ہے اور پاکستان بھارت کی سرحد پر واقع ہے۔ اس قصبہ کے گوردوارہ میں بابا نانک کی ایک قمیض تاحال محفوظ ہے جسے سکھ حضرات چولا صاحب کہتے ہیں۔ اس قمیض پر پورا کلمہ شریف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سنہری گوٹے میں لکھا ہوا آج بھی موجود ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے میں نے چولا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس زمانے میں میرے والد تحصیل بٹالہ گورداس پور کے اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر (ADI سکولز) تھے۔ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر ایک انگریز تھا۔ (مسٹر تھامس لیزرس (Lazrus-t) ڈیرہ بابا نانک کے تمام مڈل و ہائی سکول میرے والد مرحوم کے ماتحت تھے۔ کیونکہ ڈیرہ کا قصبہ بٹالہ تحصیل کا ہی ایک حصہ تھا۔ میرے والد بٹالہ سے ڈیرہ بابا نانک مدارس کا معائنہ کرنے اپنے موٹر سائیکل پر جایا کرتے تھے اور کئی بار مجھے بھی اپنے پیچھے بٹھا لیا کرتے تھے۔ راستے میں علی دال کاسی وال اور دھرم کوٹ بگہ کے قصبے آیا کرتے تھے۔ دھرم کوٹ بگہ کے قصبہ کے مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر منشی فقیر محمد اللہ قریشی ہوا کرتے تھے۔ یہ ہیڈ ماسٹر صاحب نہ صرف میرے والد کے ماتحت آفیسر تھے بلکہ ایک ہی برادری ہونے کی وجہ سے دوست بھی بن گئے تھے۔ ان کا صاحبزادہ انوار الحق قریشی (XEN محکمہ PWD) حال ہی میں فوت ہوا۔ لاہور شاہدرہ کا نیا پل (دریائے راوی والا) انوار الحق قریشی XEN ہی نے بنایا تھا۔ میرے والد منشی فقیر اللہ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ میرے لڑکے کا نام احسان الحق قریشی ہے اور تمہارے لڑکے کا نام انوار الحق قریشی ہے۔ میرا لڑکا پرنسپل گورنمنٹ کالج بنے گا اور تمہارا لڑکا انجینئر یعنی XEN بنے گا۔ (بعد میں ایسا ہی وقوع پذیر ہوا تھا) میرے والد کا نام پیر محمد غنی قریشی تھا اور وہ سلسلہ قادریہ میں قصور کے ایک ولی اللہ سے بیعت تھے۔ (درسلسلہ عالیہ حضرت سید بلھے شاہ قادری شطاری) انوار الحق قریشی چند سال سیالکوٹ میں بھی XEN رہے اور مجھے تقریباً روزانہ ملا کرتے تھے۔ افسوس کہ ان کا جلد انتقال ہو گیا۔

برصغیر ہندو پاک کی تین برگزیدہ ہستیوں نے اسلام کا (Openly) ظاہر طور پر اظہار

نہیں کیا۔ رات کو یہ تینوں حضرات اپنی نمازیں اکٹھی پڑھ لیا کرتے تھے۔ (1) بابا گورو نانک (2) بھگت کبیر (3) بھگت بھجو۔ ان تینوں حضرات نے چوری چوری حج بیت اللہ بھی کیا تھا۔ ان دنوں مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ جانا کارے دارد تھا۔ سفر کی بہت سی مشکلات تھیں۔ بادبانی جہاز تھے۔ سٹیمر نہیں ہوا کرتے تھے۔ پھر ان مشکلات کو پار کر کے یہ تینوں حضرات اپنے اپنے وقتوں میں حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے۔ آج تک کوئی غیر مسلم مکہ معظمہ نہیں جا سکا اور نہ ہی جائے گا۔ پھر یہ تین حضرات کیسے (اگر یہ غیر مسلم ہندو تھے) مکہ شریف پہنچ گئے؟ بابا نانک کے مسلمان ہونے کا سب سے بڑا ثبوت (ثبوت نمبر 2) یہی ہے کہ ہندو اور سکھ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ نانک جی مکہ گئے تھے۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر اور سکھوں کے دسویں گورو (گورو گوبند سنگھ) ہم عصر تھے۔ ایک سال تک ان دونوں کی آپس میں صلح رہی۔ بعد میں سخت مخالفت ہو گئی۔ شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کی حکومت کے دوران صوبہ سرہند کے گورنر نے (بغیر پوچھے عالمگیر سے) گورو گوبند سنگھ کے صاحبزادے زندہ دیوار میں چنوا دیئے تھے۔ بادشاہ سرہند کے گورنر پر بہت ناراض ہوا۔ گورنر کی اس حرکت سے اسے برا بھلا کہا (نیز) اسے کہا کہ یہ کام تو تو نے بغیر میری اجازت کے کیا مگر تاریخ کے اوراق میں یہ کام میرا لکھا جائے گا۔ گورنر سرہند نے بادشاہ سے معافی مانگی اور کہا گوبند دن بدن سرکش اور باغی ہوتا جا رہا ہے۔ اسے ٹھیک کرنے کی خاطر میں نے یہ کام کر ڈالا معذرت خواہ ہوں۔

قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اورنگ زیب عالمگیر شہنشاہ ہندوستان کا مزار اورنگ آباد ضلع حیدر آباد دکن میں ہے اور گورو گوبند سنگھ کی آخری مڑھی بھی صرف 20 میل دور قصبہ ناندیر ضلع حیدر آباد دکن میں ہے۔ جب گورو گوبند سنگھ نے اورنگزیب کی وفات کی خبر ہوشیار پور پنجاب میں سنی کہ وہ حیدر آباد دکن میں انتقال کر گیا ہے تو گورو کو یقین نہ آتا تھا۔ وہ خوشی اور مسرت کے جذبات میں بہہ کر بمعہ پانچ سو سکھ سواروں کے سیدھا حیدر آباد دکن پہنچا اورنگ آباد میں اورنگزیب کی قبر دیکھی تب اسے یقین آیا کہ بادشاہ فوت ہو چکا ہے۔

اس کے بعد وہ 20 میل دور قصبہ ناندیر میں سکھوں کے ایک گوردوارہ میں پہنچا۔ خوشی' مسرت اور جذبات بے خودی میں اسے شادی مرگ ہو گئی۔ دل کی حرکت بند ہو گئی اور وہ بھی مر گیا۔ دونوں دشمنوں کی آخری آرمگاہ پاس پاس ہی ہے۔ میں نے دونوں قبریں اپنی آنکھوں سے 1938ء میں دیکھی تھیں۔

صلح کے ایام میں گورو گوبند سنگھ نے اورنگزیب کی تعریف میں ایک فارسی کتابچہ "ظفر نامہ" لکھا تھا۔

گورو گوبند سنگھ اور اورنگ زیب میں لڑائی کی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گورو جی نے ایک مضمون میں کہا تھا کہ جب بابا نانک مکہ شریف گئے تو بجائے اس کے کہ نانک جی کعبہ کا طواف کرتے کعبہ نے خود گھوم کر گورو نانک کا طواف شروع کر دیا تھا۔ یہ من

گھڑت بات تھی جس کو پڑھ کر اورنگزیب عالمگیر سخت ناراض ہوا تھا۔
گورو گوبند سنگھ سے ایک بار نواب سعد اللہ خاں نے پوچھا کہ آپ کے اولین گورو بابا نانک تو مسلمان تھے کیونکہ انہوں نے حج بیت اللہ بھی کیا تھا۔ ان کے مکہ **معظمہ** کے سفر کا تاریخی ثبوت موجود ہے۔ کوئی غیر مسلم مکہ شریف میں داخل نہیں ہو سکتا پھر یہ کیسے مکہ میں داخل ہو گئے تھے؟ گورو گوبند سنگھ نے فوراً ایک ربائی گھڑی اور فرمایا:
"عرب کے بادشاہ نے ان کو غیر مسلم ہونے کے سبب گرفتار کر لیا تھا اور یوں پوچھا تھا کہ تمہارا مذہب کیا ہے؟ بابا نانک نے شعر میں جواب دیا تھا۔"

ہندو آکھاں تے ماریئے' میں مسلمان دی ناں
پنج تت دا پتلا تے نانک میرا ناں

اس پر گورنر مکہ مطمئن ہو گیا تھا۔ جب اس نے یہ جواب سنا کہ میں نہ ہی ہندو ہوں اور نہ ہی مسلمان تو گورنر مکہ نے بابا نانک کو شک کا فائدہ دے کر بری کر دیا تھا۔
یہ بات گورو گوبند سنگھ نے من گھڑت ہی بنا ڈالی تھی۔ گورنر مکہ تو پنجابی زبان یا پنجابی اشعار سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔
سچی اور سیدھی سادی بات یہ ہے کہ بابا نانک نے عام مسلمانوں کی طرح احرام پہن کر باقاعدہ طواف کعبہ کیا تھا اور تمام رسومات حج بھی ادا کی تھیں۔ بابا نانک کا مسلمان ملازم بھائی مردانہ قوال بھی تمام سفر میں بابا جی کے ساتھ رہا اور اس نے بھی بابا جی کے پیچھے پیچھے طواف کعبہ (دوران حج) کیا تھا۔
میں نے خود کئی سکھوں سے پوچھا کہ بابا نانک کی قمیض پر کلمہ شریف کیوں کندہ ہے؟ تو جواب دیتے ہیں کہ مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے بابے نے ایسا کیا تھا۔ جب پوچھو کہ حج بیت اللہ و طواف کعبہ کیوں بابا جی نے کیا تھا تو جواب ملتا ہے کہ یہ بھی بابے نے اپنے قوال بھائی محمد مردانہ کو خوش کرنے کے لیے کیا تھا۔
دراصل حضرت بابا نانک قصبہ دربار صاحب کرتار پور ضلع سیالکوٹ میں دفن ہیں۔ میں ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے کبھی کبھی دربار صاحب کرتار پور تحصیل شکر گڑھ ضلع سیالکوٹ چلا جاتا ہوں۔ بابا نانک 1539ء میں قصبہ دربار صاحب کرتار پور میں فوت ہوئے۔ ان ایام میں شیر شاہ سوری کی حکومت تھی۔ جس دن بابا جی کی وفات ہوئی اسی دن سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں آپس میں لڑائی ہونے لگی۔ ہندو کہنے لگے کہ ہم نے ہندوانہ رسوم کے مطابق ارتھی کو جلانا ہے۔ مسلمان کہنے لگے کہ ہم نے بابے کا جنازہ پڑھنا ہے۔ پھر بابے کو دفن کرنا ہے۔ بابا جی کو ہم نے کئی نمازیں پڑھتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بابے نے حج بیت اللہ بھی کیا تھا۔ ہم کسی صورت میں بابے کی میت کو جلانے نہیں دیں گے۔ یہ شیر شاہ سوری کا زمانہ تھا جس نے نصیر الدین ہمایوں بادشاہ سے سلطنت ہندوستان (عارضی طور پر) چھینی تھی۔ بعد میں شاہ ایران طہماسپ کی امداد سے ہمایوں بادشاہ نے دوبارہ سلطنت ہندوستان حاصل کر لی تھی۔ بہرحال قصبہ کرتار پور

نور کوٹ' چک قاضیاں اور جسٹر کے مسلمان اور ہندو آپس میں لڑنے لگے۔ بابا نانک کی میت نے سخت جھگڑا اختیار کیا۔ دو روز سے میت اسی طرح پڑی ہوئی تھی۔ آخر کار شکر گڑھ کے تعلقہ دار شاہ رحمان دیوان ثانی قصبہ کرتار پہنچے اور مسلمان نمبردار کو یوں کہا:

"ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت ہے۔ شیر شاہ سوری شہنشاہ ہندوستان ہے تم لوگ خواہ مخواہ ہندوؤں سے خائف ہو کر دب رہے ہو۔"

"ننگی تلواریں دونوں اطراف سے جلوہ گر ہیں تم اس طرح کرو کہ آٹھ دس مسلمان بعد از نماز عشاء بابا نانک دین کی میت کو چوری کر لیں اور باہر میدان میں لے جائیں۔ ہم دس بارہ لوگ ان کی نمازہ جنازہ خفیہ خفیہ اندھیرے میں ہی پڑھ لیں اور بابا نانک کو کفن دے کر سپرد خاک کر دیں۔ کسی اور کو کانوں کان علم نہ ہو۔ صبح سویرے تم شور مچا دینا کہ لوگو سنو! صبح صبح آسمان سے ایک عجیب مخلوق فرشتہ نما دیوتے اترے اور بابا نانک کی میت کو اٹھا کر آسمانوں پر لے گئے۔ چارپائی پر ایک ریشمی معطر چادر اور چند پھول چھوڑ گئے۔ اس چادر میں سے مشک وغیرہ کی خوشبوئیں اور اعلیٰ لپٹیں آ رہی ہیں۔ آؤ ہندو بھائیو! ہم آپس کی لڑائی اب بالکل ختم کر دیں۔ اب تو میت ہی مفقود ہے۔ بابا نانک غائب ہیں۔ دیوتاؤں کی لائی ہوئی چادر ہم دو ٹکڑے کر لیتے ہیں۔ آدھا ٹکڑا تم ہندو لوگ جلا دو اور وہاں پر بابا کی مڑھی یا پکی سمادھی بنا دو۔ باقی آدھی چادر ہم مسلمان لوگ دفن کر کے اس پر قبر بنا لیتے ہیں۔ چلو جھگڑا ختم شد۔ ہم بھی خوش تم بھی خوش۔"

چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ مسلمانوں نے میت چوری رات کے اندھیرے میں چوری چوری باہر میدان میں چپکے چپکے دبے الفاظ میں نماز جنازہ پڑھ لی اور بابا کو وہیں قصبہ کرتار پور میں راوی کے کنارے دفن کر دیا گیا۔ صبح صبح نمبردار قصبہ نے شور مچا دیا کہ بابا کی میت کو آسمانی فرشتے اور دیوتے اوپر آسمان پر لے گئے ہیں اور ان کی میت یا ارتھی کی بجائے یہ معطر چادر چارپائی پر چھوڑ گئے۔ یہ چادر آسمانی تحفہ ہی معلوم ہوتا ہے۔

نتیجتاً افہام و تفہیم سے ہندو باشندے راضی ہو گئے کہ آدھی چادر ہندوؤں کی رسومات منعقد کر کے سپرد آگ (آتش) کر دی جائے اور بقیہ آدھی معطر چادر مسلمان قبر کھود کے دفن کر دیں گے۔ چنانچہ ایسے ہی کیا گیا۔ ہندوؤں نے نصف چادر چتا بنا کر جلا ڈالی اور مسلمانوں نے بقیہ چادر عین اسی گڑھے میں دفن کر دی جہاں بابا نانک کا جسد خاکی گزشتہ شب چوری چوری جنازہ پڑھ کر دفن کر دیا گیا تھا۔

اس واقعہ کے وقت ہندوستان میں سکھ مذہب نہیں چلا تھا۔ اس وقت ایک بھی سکھ موجود نہ تھا۔ تمام ہندو ہی تھے۔ سکھ مذہب بابا کی وفات کے 150 سال بعد چلا۔ چار سو سال بعد مہاراجہ پٹیالہ نے بابا نانک کی چادر والی سمادہ پر (انگریزوں کے دور میں 1920ء یا 1912ء میں) سنگ مرمر کا گوردوارہ بنا دیا مگر مسلمانوں والی قبر ویسے کی ویسے ہی رہنے دی گئی۔ انجینئر رام میال تھے۔

سکھوں کی متبرک کتاب (جو کہ گورو گوبند سنگھ کے وقت میں معرض تحریر میں آئی تھی) بھی یہی واقعہ بتلاتی ہے کہ آسمانی دیوتے آئے تھے اور میت کو اوپر اٹھا کر لے گئے تھے۔ اس کتاب کا نام گورو گرنتھ صاحب رکھا گیا اور بابا نانک کے وصال کے ڈیڑھ سو سال بعد لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں بابا فرید الدین مسعود المعروف گنج شکر پاک پتنی کے بھی دو سو سے زائد شلوک (اشعار) موجود ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ میت دفن کی گئی تھی۔

یہ تمام واقعہ کسی تاریخی کتاب میں درج نہیں۔ میں نے یہ واقعہ اپنے دادا ابو پیر نبی بخش قادری صابری سے سنا تھا۔ میرے دادا ابو 120 سال کی عمر میں امرتسر میں فوت ہوئے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش 1809ء ہے اور تاریخ وفات 1929-9-9 ہے۔ انہوں نے بتلایا تھا کہ یہ واقعہ انہوں نے اپنے باپ پیر بھولے شاہ سے سنا تھا اور انہوں نے اپنے باپ سے سنا تھا۔ ہمارے جد امجد شاہ رحمان دیوان ثانی تھے جو ان ایام میں شکر گڑھ کے تعلقہ دار تھے انہوں نے ہی بابا نانک کا جنازہ پڑھا تھا۔ سارا انتظام جنازہ انہوں نے ہی کیا تھا۔ شاہ رحمٰن دیوان ثانی کی مکمل سوانح عمری میں پھر کسی فرصت کے وقت قلمبند کروں گا۔ میرے دادا ابو پیر نبی بخش قادری نے مجھے یوں کہا تھا۔

> "بیٹا احسان! تم میرے پوتے ہو۔ یہ واقعہ سینہ بہ سینہ ہمارے جد امجد شاہ رحمان دیوان ثانی کے وقت سے زبانی روایت پر ہی چلا آ رہا ہے۔ تم اسی طرح آگے زبانی ہی لا دینا۔ صفحہ قرطاس پر مت لانا کیونکہ پھر غیر مسلم ہمیں طعنے دیں گے کہ مسلمان کفن چور ہیں۔ انہوں نے بابا نانک کی میت چوری کر لی تھی اور بعد میں جنازہ بھی خفیہ ہی پڑھ لیا تھا۔ اب تم بتلاؤ کہ سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور حضور سرور کائنات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی بھی شخص جسدی حالت میں آسمان پر نہیں گیا۔"

بابا نانک کا آسمان پر چلے جانے کا قصہ مسلمانوں نے مجبوراً گھڑ لیا تھا تاکہ قصبہ کرتار پور میں ہندو مسلم فساد نہ ہو جائے۔

یہ روایت ہمارے خاندان میں نسلاً" بعد نسلاً" سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہے مگر صفحہ قرطاس پر میں یہ پہلی بار لکھ رہا ہوں۔ مجھے علم ہے کہ میرے بزرگوں کی روحیں مجھ سے سخت ناراض ہو جائیں گی کیونکہ ان کی نصیحت عرصہ سے چلی آ رہی ہے کہ اس واقعہ کو کاغذ پر مت لکھنا۔ زبانی ہی ہر باپ اپنے بیٹے کو بتلا دیا کرے' اور یہ سچی بات' صرف سینہ بہ سینہ ہی چلے۔ مندرجہ ذیل بزرگوں سے یہ بات مجھ تک پہنچی تھی۔

(1) شاہ رحمان دیوان ثانی قریشی صدیقی تعلقہ دار شکر گڑھ۔ جنہوں نے بابا نانک کی نماز جنازہ کرتار پور میں پڑھائی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی اولاد امجاد میں سے تھے۔ (2) پیر شیر محمد (3) پیر محمد یونس (4) پیر غلام غوث (5) پیر غلام مصطفیٰ (6) پیر غلام رسول (7) پیر بھولے شاہ

(8) پیر نبی بخش قادری صابری (9) پیر محمد غنی سابق ADI سکولز امرتسر (10) راقم الحروف ڈاکٹر احسان قریشی صابری سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج آف کامرس سیالکوٹ۔

جب اوپر کے تفصیلی واقعات مجھے میرے دادا ابو نے سنائے تھے اس وقت میں آٹھویں یا نویں کا طالب علم تھا' مگر ان کی باتیں مجھ پر نقش بر قلب ہو چکی تھیں۔ افسوس کہ وہ میرے میٹرک پاس کرنے سے پہلے ہی وفات پا گئے اور قصبہ جنڈیالہ گورو ضلع امرتسر میں دفن ہوئے جہاں پر ان دنوں میرے والد صاحب ADI سکولز جنڈیالہ سب ڈویژن تھے۔ دادا ابو نے 120 سال کی طویل عمر پائی۔ ان کی صحت آخر تک بہت اچھی رہی۔ انہوں نے اپنی جوانی میں رنجیت سنگھ کا دربار لاہور بھی دیکھا تھا۔ قیام پاکستان (1947ء) کے بعد ہمارا خاندان امرتسر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں دوبارہ آباد ہوا۔ دراصل دادا ابو اپنی جوانی میں ہی 1857ء کے بعد گھوڑے پر سوار ہو کر موضع ڈھوڈہ تحصیل پسرور سے ہجرت کر کے امرتسر چلے گئے تھے۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی سے کسی بات پر ناراض ہو گئے تھے۔ انہوں نے امرتسر میں ہی محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ جس وقت پنجاب میں ریلوے سسٹم کا نظام نافذ ہوا تب ان کی موجودگی در امرتسر کا ڈھوڈہ والوں کو پتہ چلا۔

جب میں گورنمنٹ کمرشل ٹریننگ کالج سیالکوٹ کا پرنسپل مقرر ہوا تو مجھے ایک سرکاری کام کے سلسلے میں شکر گڑھ جانا پڑا۔ جب گاڑی دربار صاحب کرتار پور اسٹیشن پہنچی تو معاً مجھے اپنے دادا ابو صوفی نبی بخش قادری صابری کی وہ تمام باتیں یاد آ گئیں جو انہوں نے بابا نانک کے متعلق میرے بچپن میں مجھے بتلائی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ انہوں نے کہا تھا کہ بابا نانک کی قبر دربار صاحب کرتار پور نامی قصبہ میں ہے۔ میں نے ارادہ کیا کہ دربار صاحب کرتار پور پہنچوں۔ وہاں بابا نانک کی قبر تلاش کروں اور فاتحہ پڑھوں۔

پاس ہی قصبہ چک قاضیاں تھا (ریلوے اسٹیشن نور کوٹ) وہاں ایک مشہور بزرگ رہائش پذیر تھے۔ جن کا تعلق سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ سے تھا۔ ان کا نام تو سید محمد اشرف تھا مگر ان کے مرشد خواجہ حسن نظامی نے ان کا نام بدل کر سید کشفی شاہ نظامی رکھ دیا تھا کیونکہ ان کو علم کشف القبور اور کاٹن (کذا) دسترس حاصل تھی۔ خواجہ حسن نظامی نے کشفی شاہ جی کو خلافت عالیہ چشتیہ نظامیہ سے بھی سرفراز کر دیا تھا۔ سید کشفی جی وہی بزرگ ہیں جو مشہور عالم قانون دان سید محمد ظفر سابق وزیر قانون ایوب خان کیبنٹ کے والد ماجد ہیں۔ افسوس ان کا بھی چند سال قبل انتقال ہو گیا۔ مزار پر انوار چک قاضیاں میں ہی ہے۔ ہر سال 13 ربیع الاول کو ان کا عرس ہوتا ہے۔ کلیئر شریف (انڈیا) میں عرس صابریہ بھی 13 ربیع الاول کو ہی ہوتا ہے۔ نیز دہلی میں عرس حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی خلیفہ خواجہ اجمیری بھی 13 ربیع الاول کو ہی ہوتا ہے۔ حضرت قطب الدین دوران سماع ہی فوت ہوئے تھے۔ یہ واقعہ دہلی کا ہے۔ سید کشفی نظامی نے ان (مندرجہ ذیل) حضرت کو خلافت عالیہ چشتیہ نظامیہ سے نوازا تھا۔

1۔ حضرت صوفی محمد صدیق اخوانی' رنگ پورہ۔ سیالکوٹ (مشہور رائٹر ابو طالب نظامی کے

والد ماجد) فوت شد۔

2۔ سید بشیر حسین شاہ چشتی نظامی صابری محلہ خواجگان' رنگ پورہ' سیالکوٹ (زندہ ہیں)

3۔ صاحبزادہ سید قدیر احمد شاہ' سجادہ نشین درگاہ کشفی شاہ نظامی' چک قاضیاں براستہ نورکورٹ ضلع سیالکوٹ۔ کشفی شاہ کے داماد (زندہ ہیں)

بہرصورت میں اصل مضمون کی طرف لوٹتا ہوں۔ میں سیدھا چک قاضیاں چلا گیا وہاں سید کشفی شاہ نظامی (خلیفہ خواجہ حسن نظامی دہلوی) سے ملا اور ان سے عندیہ ظاہر کیا کہ مجھے قصبہ دربار صاحب کرتار پور لے چلو جو کہ چک قاضیاں سے چند میل کے ہی فاصلہ پر واقع ہے۔ ہم دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر وہاں پہنچے۔

جس جگہ ہندوؤں نے بابا نانک کی معطر چادر نذر آتش کی تھی وہاں پر مہاراجہ پٹیالہ اور ان کے انجینئر لالہ شیام داس نے 1912ء میں سنگ مرمر سے ایک عالی شان گوردوارہ اور سمادھ بنائی تھی۔ اس کے باہر آدھے میل کے فاصلے پر دریائے راوی بہہ رہا تھا۔ جو کہ ضلع سیالکوٹ اور ضلع گورداسپور کے درمیان بین الاقوامی سرحد ہے۔ صرف ان دو اضلاع کے درمیان دریائے راوی کو سرحد مانا گیا ہے۔

گوردوارہ سے 50 گز دور سید کشفی شاہ نظامی مجھے ایک قبر کے پاس لے گئے اور مجھے کہا کہ یہ قبر بابا نانک کی ہے۔ انہوں نے اس قبر پر آدھ گھنٹہ تک مراقبہ کیا اور علم کشف القبور کے ذریعے مجھے بتلایا کہ انہوں نے بابا جی سے بات کی ہے۔ ان کا جسد خاکی اسی طرح محفوظ ہے جیسے تدفین کے وقت تھا۔ چونکہ بابا نانک مسلمان تھے اور حاجی تھے' وہ ولی اللہ بھی تھے' درویش کامل بھی تھے۔ سید کشفی شاہ نے مجھے بتلایا کہ بابا نانک نے تم کو سلام اور پیار دیا ہے اور کہا ہے کہ "یہ لڑکا شاہ رحمان دیوان ثانی تعلقہ دار شکر گڑھ کی دسویں پشت میں ہے۔ شاہ رحمان دیوان ثانی نے ہی بابا نانک کی میت کو لے جا کر اس رات چیدہ چیدہ مسلمان اہلکاروں کو مدعو کر کے رات کے اندھیرے میں ہی خود بابا نانک کا جنازہ پڑھایا تھا۔ راتوں رات ہی مجھے دفن کر دیا گیا تھا۔ اس عزت افزائی پر میں احسان قریشی صابری اور شاہ رحمان دیوان ثانی کے خاندان کا بے حد ممنون و مشکور ہوں۔ بعد میں شیر شاہ سوری شہنشاہ ہندوستان کو بھی اس اقدام کی اطلاع دے دی گئی تھی' مگر ہندوؤں کی ناراضگی کے خطرہ کے پیش نظر اس اقدام کو خفیہ رکھا گیا تھا۔

آج بھی تاریخ کا یہ ورق مخفی ہے اور چونکہ اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور پتہ نہیں کب بلاوا آ جائے اس لیے میں نے اس سچے تاریخی واقعہ کو سپرد قلم کر دیا ہے۔ کئی حضرات میری اس تحریر پر جزبز تو ہوں گے کہ نعوذ باللہ ایک کافر کو ولی اللہ لکھ مارا لیکن میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ بابا نانک مسلمان تھے۔ آخر کچھ تو بات تھی کہ ایک ہزار مسلمان 1539ء میں ننگی تلواریں لے کر نکل آئے تھے۔ کہ بابے کو جلانے نہیں دیں گے۔ باقاعدہ تدفین کریں گے۔ قصبہ دربار صاحب کرتار پور میں ہی بابا نانک دفن ہیں۔ ان کی قبر موجود ہے۔ میں اس قبر کی اب بھی نشاندہی کر سکتا ہوں۔

میں اہل ثروت حضرات سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ بابا نانک دین کے مزار پر ایک قبہ یا گنبد نما عمارت بنا دیں۔ اس عمارت کے باہر بابا جی کا اسم گرامی اور تاریخ وفات 1539ء کندہ کر دی جائے۔ 1530ء میں وہ اپنے قوال بھائی محمد مردانہ کے ساتھ حج کرنے گئے تھے لہذا سال 1530ء بھی کندہ کر دیا جائے۔ (بطور سال حج)

نام نیک رفتگاں ضائع مکن
تا بہ ماند نام نیکت برقرار

(ترجمہ) نیک بزرگان دین کے نام نامی کو ضائع مت کرنا۔ ان کا تذکرہ صفحہ قرطاس پر محفوظ رکھنا' پھر تیرا نام بھی حق تعالیٰ تا قیامت زندہ رکھے گا۔ تیرا یہ نیک کارنامہ اور تیرا نیک نام بھی تاریخ اسلام میں برقرار رہے گا۔

بابا نانک کی ایک رباعی ملاحظہ ہو۔ اس رباعی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک محمد کے اعداد 92 نکل آتے ہیں۔

عدد گنو جس انچھر کے کیھو چوگنے تا
دو ملاؤ پنج گن کیھو کا نوبیس بنا
باقی بچیں جو نوگن کیھو دو اس میں اور ملا
نانک ہر کے بچن سے محمد نام بنا

رباعی نمبر 2

جو ست گورو کی بات سنا دے
کہو نانک اسے کیا دیجے
سیس کاٹ بیٹھس کو دیجے
بن سر سیوا کریجے

(ترجمہ) جو شخص گوروؤں اور اولیاء اللہ پر ماتما' واہگورو و ایشور اور اللہ کے پیاروں کی باتیں بتا دے اور سوانح عمری لکھے اے نانک اس لیکھک (رائیٹر) کو کیا انعام دیا جائے؟

اس لیکھک کا کم از کم انعام یہ ہے کہ اپنا گلا کاٹ کر اس کے لیے کرسی بنائی جائے۔ اس کرسی پر اس لیکھک کو بٹھلا دیا جائے۔ پھر ہمارا انسانی دھڑ (بغیر گلے والا دھڑ) اس لیکھک کی سیوا کرے۔ اس لیکھک کی خدمت کرے۔

میں اپنا مضمون ختم کرنے سے پہلے بابا نانک کے چار مزید شلوک دربارہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پیش کرتا ہوں جن سے ان کی واحدانیت عشق رسول' ایک خدا پر ایمان اور تقویٰ ظاہر ہو گا۔

بابا نانک کے دیگر اشعار توحید : اور نعت رسول مقبول۔

نمبر 1

صاحب میرا ایکو ہے' ایکو ہے بھائی ایکو ہے

(آسا محلہ صفحہ نمبر1)

ترجمہ : میرا پروردگار ایک ہے۔ اے میرے بھائی وہ ایک ہی ہے۔ (قل ھو اللہ احد)

نمبر2

اکو سمرو نانکا جوجل تھل رہیا سمائے
دوجا کاہے سمریئے جو جمے تے مر جائے
پاک پڑھو کلمہ رب دا' محمد نال ملائے
ہویا معشوق خدایئے دا' ہویا تل الائے

(جنم ساکھی بھائی بلا (بالا) صفحہ 121)

ترجمہ : نانک ایک خدا کو مانو اور اس کی پوجا کرو۔ جو سمندر میں بھی سمایا ہے اور تھل (زمین) میں بھی سمایا ہے۔ کسی دوسرے کو خدا مت مانو وہ جو عورت سے پیدا ہو اور پھر مر جائے وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ کلمہ پاک پڑھا کرو جو کہ محمدؐ سے تمہیں ملا دے گا۔ محمدؐ نہ صرف اللہ کا پیارا نبی ہے بلکہ اللہ کا معشوق بھی ہے۔ وہ نبی ساری دنیا کا تارا ہے اور نور سے اوتار ہے۔

نمبر3

اول نام خدائے دا' در دربار رسول
شیخا نیت راس کر' تاں درگاہ پویں قبول

(جنم ساکھی ولائتیاں صفحہ 48)

ترجمہ : سب سے پہلے یعنی اول نام خدا کا لو اور رسولؐ کی ذات تو درمیان میں سلسلہ ملانے والی ہے جس طرح شاہی محل کا دربان بادشاہ سے ملا دیا کرتا ہے۔ اے شیخ حرم اپنی نیت صاف کر لے اگر تو نے حق تعالیٰ کی درگاہ میں شرف قبولیت حاصل کرنا ہے۔

نمبر4

اول اللہ نور او پایا قدرت کے سب بندے
اک نور تھیں جگ اپجیا' کون بھلے کون مندے؟

(محلہ مغویہ)

ترجمہ : یہ سب دنیا اللہ کے نور سے پیدا ہوئی۔ ایک ہی نور سے سارا جگ روشن ہوا۔ کچھ بندے نیک ہوئے کچھ "مندے" ہوئے مگر سب اپنی اپنی بولیاں بول کر پرندوں کی طرح اڑ گئے۔

(احسان قریشی صابری سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج آف کامرس سیالکوٹ)

مندرجہ بالا شہادت سے پتہ چلا کہ بابا نانک کی میت بظاہر گم ہو گئی تھی اور چادر اور پھولوں کا آدھا حصہ مسلمانوں نے دفن کر دیا اور بقیہ آدھا حصہ ہندوؤں نے جلا دیا تھا۔ اب یہ راز طشت ازبام ہو گیا ہے کہ بابا نانک جی روحانی طور پر اتنے متصرف بزرگ تھے کہ انہوں نے

اپنی میت کو جلوانا درست نہ جانا بلکہ حالات کے تحت بالآخر بطور مسلمان دفن ہونا قبول کیا اور ہندوؤں کی زبردستی کا علاج جو کیا وہ گویا ہندوؤں کی بے بسی کا مظہر تھا۔ پس بابا نانک مرحوم کو مسلمان صوفیاء نے ہمیشہ توحید پرست مسلمان اور مست الست موحد خیال کیا اور جب امرتسر کے تالاب وغیرہ کی بنیاد رکھی جانے لگی تو یہ فریضہ مشہور مسلمان صوفی بزرگ حضرت میاں میر قادری لاہوری نے انجام دیا لیکن ہندوؤں نے ہمیشہ بابا نانک جی کے پیروکاروں کو مسلمانوں کی بجائے ہندو ازم میں مدغم کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ حتیٰ کہ بھارتی مرکزی حکومت نے 1954ء میں "ہندو کوڈ بل" پاس کیا اس کوڈ بل "Code Bill" میں سکھوں کو ہندوؤں کا ہی ایک فرقہ بیان کیا گیا۔ جس کے خلاف سکھ حضرات نے غم و غصے کا اظہار کیا اور مطالبہ کیا کہ گورو گوبند سنگھ کے دور کی مرتب کردہ قانونی کتاب پریم آشرم کے مطابق سکھوں کو ایک الگ قوم تسلیم کر کے ان کا پرسنل لا اور الگ قانون وراثت تشکیل دیا جائے۔ ویسے بابا نانک جی کا ایک مشہور ارشاد اس طرح بھی ہے:

مہر میت' صدق مصلےٰ' حق حلال قرآن
شرم سنت' سیل روزہ ہوئے مسلمان

(بحوالہ پنجابی ادب دی کہانی' صفحہ 209 از عبدالغفور قریشی)

دوسرے گورو' انگد جی : بابا نانک جی نے 22 ستمبر 1539ء کو وفات پائی۔ مسلمانوں کے نزدیک وہ مسلمان اور ہندوؤں کی رائے کے مطابق وہ ہندو تھے۔ ہندوؤں میں ان کا جانشین گورو انگد جی کو مقرر کیا گیا۔ گورو انگد 13 سال جانشین رہ کر 1552ء میں وفات پا گئے اور اپنا جانشین امرداس کو نامزد کیا وہ بائیس سال تک خدمت نبھا کر 1574ء میں فوت ہوئے۔ امر داس نے سکھوں کی مذہبی اور سیاسی تنظیم کی طرف توجہ دی اور سکھ ازم کی تبلیغ باقاعدہ اور منظم طریقے سے شروع کی۔ یہ مذہب مساوات اور بھائی چارے کا پرچار کرتا تھا۔ چھوت چھات کا منکر تھا۔ امرداس کی اکبر بادشاہ سے بھی ملاقات ہوئی اور اپنی عارفانہ گفتگو سے مطمئن کیا۔ چنانچہ اکبر نے امرداس کو ایک جاگیر عطا کی۔

رام داس سکھوں کا چوتھا گورو تھا۔ جو امرداس کا چیلا اور داماد تھا۔ رام داس بادشاہ اکبر کا مداح اور ہر طرح سے اس کا مددگار تھا۔ چنانچہ اکبر نے 1577ء میں اسے پانچ سو بیگھے کی جاگیر عطا کی جہاں اس نے مقدس تالاب کی تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ جو بعد میں امرتسر کے نام سے مشہور ہوا۔ حالانکہ شروع میں اس کے قریب تعمیر کیے جانے قصبے کا نام رام داس پور رکھا گیا تھا۔ تالاب کی تکمیل اس کے بیٹے اور پانچویں گورو ارجن کے ہاتھوں انجام پائی۔ اس کے وسط میں "ھرمندر" کی بنیاد رکھی گئی اور سکھوں کے عام عبادت خانہ کے طور پر اسے وقف کر دیا گیا۔

یورپی مصنفین اسے "گولڈن ٹمپل آف امرتسر" کہتے ہیں۔ گورو صاحب نے اعلان کر دیا کہ اس تالاب میں اشنان کرنے والا گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ سکھوں کا روحانی مرکز بن گیا اور دربار صاحب کے نام سے مشہور و معروف ہوا۔

گورو ارجن 1581ء میں اپنے باپ کی گدی پر بیٹھا اور سکھوں کو ایک فرقہ کی حیثیت سے منظم کرنے کی کوشش میں مصروف ہوا۔ نیز اس نے سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب کی تدوین کی جس میں پچھلے تین گورو صاحبان کے علاوہ اپنی تحریریں بھی شامل کیں اور بابا نانک سے پہلے کے ہندو جوگیوں اور مسلمان صوفیاء کا کلام بھی اقتباسا" درج کیا۔

گرنتھ صاحب کو چھ سال میں 1604ء میں مکمل کیا اور اس کا نام آدی گرنتھ (قدیم صحیفہ) رکھا۔ گورو ارجن نے دنیا داری اور مذہب کو اکٹھا کر دیا اور گورو کے نام پر چندہ جمع کرنے کے لئے نمائندے اطراف و جوانب میں روانہ کیے۔ گورو ارجن نے اپنا لقب "سچا بادشاہ" اختیار کیا اور سیاسی جاہ طلبی کا اظہار بھی کیا۔ اس نے تجارت کے معاملے میں اپنے چیلوں کی حوصلہ افزائی کی۔ نیز اپنے مذہب کے مبلغوں کو افغانستان اور وسط ایشیا میں بھی بھیجا۔ 1606ء میں گورو ارجن نے مغل شہزادہ خسرو کی مالی مدد کی جس نے اپنے باپ جہانگیر کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ جسے شکست ہوئی اور سیاسی ساز باز کی پاداش میں گورو ارجن کو لاہور میں قید کر دیا گیا جہاں وہ جلد ہی وفات پا گیا۔

چھٹے گورو ارجن کے بیٹے ہرگووند مقرر ہوئے اور انہوں نے 1606ء سے 1645ء تک یہ فرض نبھایا۔ اس کے عہد میں سکھ مذہب اور قوم کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ اس نے پیداوار کا دسواں حصہ (عشر) ٹیکس (نذرانہ) نافذ کیا اس طرح وہ بڑا مالدار ہو گیا۔ وہ ایک بہادر سپاہی اور کھیلوں اور شکار کا رسیا تھا۔ وہ جہانگیر کے خلاف معاندانہ رویہ رکھنے لگا کیونکہ وہ اسے باپ کی موت کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ وہ جہانگیر سے انتقام لینا بھی چاہتا تھا اس لیے اس نے دریائے بیاس کے کنارے "ہرگووند پور" میں ایک قلعہ بھی بنایا اور ہر طرح کے عادی مجرموں کو اکٹھا کرکے جمعیت بھی فراہم کر لی۔ وہ قلعے کے نواح میں لوٹ مار کرتا۔ اب اس کے اصطبل میں آٹھ سو گھوڑے بھی تھے اور تین سو گھڑ سوار ہر وقت اس کی خدمت میں موجود رہتے اور ساٹھ توڑے دار بندوقچی اس کی حفاظت پر مامور تھے۔ اس فوجی تیاری کی خبر جہانگیر تک پہنچی تو اسے گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا اور کچھ عرصہ بعد اسے رہا کر دیا گیا۔ اس قید نے گورو کے دل میں مزید دشمنی پیدا کر دی۔ جہانگیر فوت ہوا تو شاہجہان کے عہد میں ہرگووند نے کھلم کھلا بغاوت کر دی اور چھ سال میں لاہور کے گورنر کی فوجوں کو تین بار شکست دی اور پھر پہاڑی علاقوں میں روپوش رہا۔ جہاں اس نے 1645ء میں انتقال کیا۔

گورو ہرگووند نے سکھوں کو ایک فوجی قوت بنانے کے لیے بڑا کام کیا۔ اس کے بعد اس کا پوتا "ہر رائے" گدی نشین ہوا جو بہت خاموش طبیعت گورو تھا۔ اس کے داراشکوہ کے ساتھ دوستانہ مراسم بھی تھے۔ چنانچہ جب داراشکوہ 1658ء میں اورنگزیب کی فوجوں سے بچنے کے لیے مارا مارا پھر رہا تھا تو گورو ہر رائے نے دریائے بیاس عبور کرنے اور کسی پناہ گاہ تک پہنچنے میں اس کی مدد کی۔ جس کی وجہ سے گورو ہر رائے اورنگزیب کے زیر عتاب آ گیا۔ اورنگزیب نے باز پرس کے لیے ہر رائے کو دہلی طلب کیا لیکن اس نے اپنے بیٹے رام رائے کو بھیج دیا۔

جسے اورنگزیب نے سکھوں کے پرامن رویہ کی ضمانت کے طور پر دہلی میں رکھ دیا۔ 1661ء میں ہر رائے وفات پا گیا تو اس کے چھ سالہ بیٹے ہرکشن کو گدی پر بٹھایا گیا۔ رام رائے نے بڑا بیٹا ہونے کے ناطے عالمگیر کے دربار میں ہرکشن کی گدی نشینی کو چیلنج کیا اور ہرکشن کو مقدمہ میں جواب دہی کے لیے دہلی بلایا گیا۔ جہاں وہ چیچک سے 1664ء میں فوت ہو گیا' اور بڑا جھگڑا پیدا ہوا کہ گدی نشین کون ہو؟ آخر کئی امیدواروں میں سے ہرگوند کے بیٹے تیغ بہادر کو گدی نشین گورو تسلیم کر لیا گیا۔

جبکہ بعض ناکام امیدوار بھی اپنی اپنی جگہ گورو بن بیٹھے چنانچہ تیغ بہادر ناراض ہو کر شوالک کی طرف کوچ کر گیا اور وہاں انند پور کی بنیاد رکھی۔ نیز اس نے مشرقی بنگال' دکن وغیرہ کا طویل سفر اختیار کیا۔ راستے میں پٹنہ میں قیام بھی کیا۔ جہاں سکھوں کا بہت بڑا تخت (مذہبی مقام) تھا۔ اس کا بیٹا گووند رائے 1666ء میں اسی جگہ پیدا ہوا۔ کچھ عرصہ بعد وہ پنجاب میں واپس آ گیا اور اپنے چیلوں کی پشت پناہی شروع کر دی۔ شاہی دستوں نے اسے گرفتار کر لیا اور دہلی لے گئے اور 1675ء میں اورنگزیب کے حکم سے سزائے موت دے دی گئی۔ 1675ء میں اس کا نو سالہ بیٹا گووند رائے گدی نشین ہوا جس نے سکھ قوم کو جنگجو اور فوجی قوم بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ اورنگزیب کا سخت دشمن بن گیا لیکن اسے سرکشی کی جرات نہ ہو سکی تاہم وہ سکون کی خاطر پہاڑوں کی طرف چلا گیا اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہبی علوم حاصل کرتا رہا۔

نیز مغلوں کی حکومت مٹانے کے منصوبے بناتا رہا۔ افرادی قوت کے لیے اس نے "پاہل" کی رسم جاری کی۔ جس کے ذریعے ہر کوئی سکھ مذہب میں شامل ہو کر باوقار زندگی گزار سکتا تھا۔ اس نے یکسانیت قائم کرنے کے لیے پانچ ککوں (کاف سے شروع ہونے والے پانچ لوازم) کنگھا' کیس' کچھا' کڑا اور کرپان کو لازمی قرار دیا تاکہ ذات پات کا تصور مٹایا جائے۔ نیز اس نے ہر سکھ کے نام کے آخر میں سنگھ کا لفظ شامل کرنے کا حکم دیا اور اپنا نام گووند سنگھ رکھا اور سکھوں کو "خالصہ" (خالص' برگزیدہ' آزاد کردہ) کا نام دیا۔

گووند سنگھ نے اپنی قوت میں اضافہ کر کے بار بار مغلوں سے انتقام لینے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہوتی رہی۔ البتہ لوٹ مار کی وارداتیں جاری رہیں۔ پہاڑی راجاؤں نے شاہی مدد طلب کی۔ اورنگزیب نے سرہند کے گورنر کو ان کی مدد کے لیے لکھا۔ چنانچہ لڑائی میں گورو جی کو شکست ہوئی۔ انند پور کے قلعہ میں 1701ء میں شاہی فوجوں نے اسے گھیر لیا۔ اس کے بہت سے پیروکار ساتھ چھوڑ گئے۔ اس کا خاندان اس کی والدہ' بیٹے' بیویاں وغیرہ بچ کر سرہند کی طرف نکل گئے لیکن وہاں ہندو اہلکاروں کی سازش سے اس کے دو بچے قتل کر دیئے گئے۔

گورو گووند سنگھ بھیس بدل کر چکور (ضلع انبالہ) کے قلعہ کی طرف بھاگ نکلا اور پھر ادھر ادھر چھپتا چھپاتا بھٹنڈہ کے ویرانوں میں پہنچ گیا اور فیروز پور میں مکتسر کے مقام پر پہنچا تو اسے تعاقب کرنے والوں سے نجات مل لہٰذا اس جگہ کا نام مکتسر (نجات دہندہ) رکھا گیا۔

اسی جگہ گرنتھ صاحب (آدی گرنتھ) کی تکمیل اور دسم گرنتھ تصنیف کیا۔ اسی اثنا میں

1707ء میں اورنگزیب نے وفات پائی اور اس کا بیٹا بہادر شاہ تخت نشین ہوا۔ جس نے گورو صاحب کو دکن کی فوجی کمان عطا کر دی۔ وہ چارج لینے وہاں پہنچا لیکن کسی افغان ملازم کی ذاتی رنجش کا نشانہ بن کر دریائے گوداوری کے کنارے "ناندیر" کے مقام پر اکتوبر 1707ء میں مقتول ہو گیا۔

یہ سکھوں کا دسواں گرو تھا۔ اپنے بعد اس نے کسی کو جانشین نامزد نہ کیا بلکہ آئندہ کے لیے جانشینی کا سلسلہ ختم کر دیا۔

بندہ بیراگی : یہ شخص گووند سنگھ کا چیلا تھا۔ اس نے سکھوں کے فوجی قائد کی جگہ حاصل کی۔ وہ کشمیری راجپوت تھا اور بیراگی سلسلے سے متعلق تھا۔ سکھ بننے کے بعد دکن میں ہی بندہ کا لقب اختیار کیا۔ گووند سنگھ نے اسے پنجاب میں جانے کا حکم دیا تھا تاکہ وہ مسلمانوں کا اقتدار ختم کرنے کے لیے سکھوں کو منظم کرے۔ پنجاب کے سکھ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس نے رہزنی شروع کر دی۔ مغلیہ سلطنت زوال کا شکار تھی۔ باہمی جنگوں نے اس کا وقار ختم کر دیا تھا۔ بندہ نے اپنا کام بلا روک ٹوک جاری رکھا۔ وہ لوٹ مار کرتا ہوا دہلی کے قریب تک جا پہنچا۔ مال غنیمت کی ہوس اور گورو کے بچوں کے انتقام نے سکھوں کو سرہند پر حملہ کرنے پر اکسایا۔ مئی 1710ء میں وہ کامیاب ہو گئے۔ سکھوں نے سرہند کے مسلمانوں پر ہیبت ناک مظالم توڑے۔ بہادر شاہ دکن میں تھا۔ اسے خبر ملی تو پنجاب کا رخ کیا اور بندہ کی فوجوں کو شاہی افواج نے شکست دی لیکن بندہ بیراگی بچ نکلنے میں کامیاب ہو کر پہاڑوں طرف بھاگ گیا۔ 1712ء میں بہادر شاہ نے وفات پائی تو اس کے بیٹے جانشینی کی جنگ میں الجھ گئے جس میں جہاں دار شاہ کو کامیابی ہوئی لیکن گیارہ ماہ کے اندر وہ فرخ سیر کے ہاتھوں قتل ہو گیا اور دہلی کا اقتدار ڈھلنے کے بعد غروب ہونے کے قریب آ گیا۔ ادھر سکھوں کی سرکشی تیز ہو گئی۔ بندہ بیراگی کے مظالم سے سارا پنجاب زچ تھا۔ آخر فرخ سیر نے پنجاب کے گورنر عبدالصمد خاں کو اس کی سرکوبی کا حکم دیا۔ یہ گورداسپور کے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ آخر پکڑا گیا اور اپنے ساتھ آٹھ سو ساتھیوں سمیت 1716ء میں دہلی لے جا کر اسے لرزہ خیز مظالم کی پاداش میں قتل کر دیا گیا۔ بندہ بیراگی سکھوں کے نزدیک بھی قابل تعظیم و تحسین نہیں تھا کیونکہ وہ مفسدانہ سرگرمیوں کا حامل انتہائی خود غرض قسم کا شخص تھا۔ وہ دسویں گورو کے حکم کے خلاف گیارہواں گورو بن بیٹھا تھا۔ چنانچہ گووند سنگھ کے مخلص چیلوں نے اس کے خلاف بغاوت بھی کر دی تھی۔ فرخ سیر کے عہد میں سکھوں کو قرار واقعی سزائیں دی گئیں اور لگتا تھا کہ سکھ مٹ جائیں گے لیکن وہ پہاڑیوں میں تتر بتر ہو گئے اور مغل راج کے کمزور ہوتے ہی پھر نمودار ہونے لگے۔

فرخ سیر کے عہد میں سکھوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا کیونکہ ان کے مظالم حد سے گزر گئے تھے۔ اس کے لاہور کے گورنر میر منو نے سختی کی پالیسی جاری رکھی۔ احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے بھی سکھوں کی کمر توڑنے میں خاصا کردار ادا کیا تھا لیکن مغلوں کی کمزوری نے انتشار کو جنم دیا۔ سکھوں کو لوٹ مار کا موقع ملا۔ جس سے انہوں نے مالیاتی طاقت بھی حاصل کر لی۔ ان کا

مرکز امرتسر تھا۔ شہزادہ تیمور احمد شاہ ابدالی کی طرح سکھوں کے خلاف تھا۔ اس نے 1756ء میں امرتسر پر حملہ کرکے "ھر مندر" کو منہدم کر دیا اور مذہبی تالاب (آب حیات کا تالاب) کو ملبے سے پر کر دیا۔ جس پر سکھوں نے شہزادے کو لاہور سے نکال دیا اور عارضی طور پر اس پر قابض بھی ہو گئے۔ سکھ سردار جسا سنگھ کلال نے اپنے نام کا سکہ جاری کر دیا لیکن راگھوبا کے زیر کمان مرہٹوں کی آمد پر وہ 1768ء میں لاہور سے نکل گئے اور احمد شاہ نے پنجاب کا رخ کیا اور پانی پت کے مقام پر 1761ء میں مرہٹوں کو عبرتناک شکست دی۔ اس عرصہ میں سکھ ادھر ادھر روپوش رہے۔ جونہی احمد شاہ واپس ہوا وہ اپنی کمین گاہوں سے نکل آئے اور پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ اگلے سال احمد شاہ ان کا زور توڑنے کے لیے پھر پنجاب میں وارد ہوا اور لدھیانے میں 1762ء میں سکھوں کو شکست فاش دی پھر اسے قندھار میں بغاوت فرو کرنے کے لیے واپس جانا پڑا چنانچہ سکھ پھر واپس آ گئے اور 1763ء میں سرہند شریف کے افغان گورنر زین خاں کو شکست دے کر سرہند کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بعد ازاں وہ لاہور پر بھی قابض ہو گئے اور اپنی گرفت ان علاقوں میں کافی مضبوط کر لی اور امرتسر میں اکٹھے ہو کر 1764ء میں پنجاب میں "خالصہ" حکومت کا اعلان کر دیا اور اقتدار اعلیٰ کے لیے قومی مجلس تشکیل دی جس کا نام "گرومتہ" رکھا اور اپنا سکہ جاری کیا جس پر یہ عبارت کندہ تھی۔

دیگ و تیغ و فتح و نصرت بے درنگ
یافت از نانک گرو گووند سنگھ

سکھ حکومت قائم ہوتے ہی وہ متعدد ریاستوں میں بٹ گئے جن کو مسلیں کہتے تھے۔ ان مسلون کی تعداد بارہ تھی۔ جن کا ہر سکھ سردار خودمختار ہو کر اپنے علاقے میں حکومت کرتا تھا۔ ان پر کوئی حاکم اعلیٰ مقرر نہ تھا۔ جو ان سے باز پرس کر سکے' اور سکھ ازم کے سوا ان میں کوئی چیز مشترک نہ تھی۔ چنانچہ ایک دوسرے پر تفوق حاصل کرنے کے لیے وہ آپس میں دست و گریبان رہتے۔ ان کی خانہ جنگیوں نے پنجاب کو مزید تباہی اور بربادی کے تحفے دیئے۔ تیس سال کا یہ سکھ عہد غیر مستقل حکومت کا علمبردار تھا۔

سکھوں کے فرقے : دو سکھ فرقے زیادہ مشہور ہیں۔ (1) سنگھ یا کیس دھاری (2) سہج دھاری۔

کیس دھاری سکھ وہ ہیں جو پاہل کی رسم ادا کر کے سکھ بنائے گئے تھے۔ یہ گرو گووند سنگھ (گوبند سنگھ) کے کٹر پیروکار ہیں۔ سہج دھاری فرقہ کے لوگوں نے "پاہل" کی رسم کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا بلکہ وہ بابا نانک کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر روحانی زندگی کو ترجیح دیتے تھے۔ انہوں نے جنگجو خالصاؤں کے جتھوں میں شامل ہونے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ ان کے علاوہ بعض دیگر فرقوں کے نام اس طرح ہیں۔

(1) **نانک پنتھی :** وہ گوبند سنگھ کی بنائی ہوئی رسموں کو نہیں مانتے یا انہیں ضروری خیال

نہیں کرتے۔ وہ قدیم گورو صاحبان کی پیروی کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ تمباکو نوشی کے بھی خلاف نہیں۔ لمبے بال رکھنے کو بھی ضروری نہیں سمجھتے۔ وہ "پاہل شدہ" نہیں ہوتے۔ گویا وہ سہج دھاری فرقے کے زیادہ قریب ہیں۔

(2) اداسی (تارج الدنیا) : یہ بھی سہج دھاری فرقے میں شامل سمجھے جاتے ہیں۔ یہ گورو نانک جی کے بیٹے سری چند کو رہبر مانتے ہیں۔ مجرد رہتے ہیں ان میں ہندوؤں کے راہبانہ مسلک کی جھلک بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔

(3) اکالی : (اکال' کبھی نہ مرنے والا غیر فانی' یعنی اللہ' خدائے لایزال کے پرستار) یہ لوگ گوبند سنگھ کے کٹر پیروکار اور جنگجو سکھ ہیں۔ جن میں جنگی روح اب تک باقی ہے۔ اسی پنتھ کے سکھوں نے 1947ء کے بٹوارے میں مسلمانوں کو نقصان پہنچایا۔

(4) بندائی یا بندہ پنتھی : یہ سکھ بندہ بیراگی کو گیارھواں گورو تسلیم کر کے اس کی پیروی کی مدعی ہیں مگر خالصے جٹ بندہ بیراگی کی بدعات کی بجائے گورو گوبند سنگھ کی پیروی کے سختی سے پابند ہیں۔

(5) مذہبی سکھ : (عام تلفظ مزبی ہے) یہ خاکروب طبقہ کے وہ سکھ ہیں جو پاہل کی رسم کے ذریعے سکھ ازم قبول کر کے سکھ بنائے گئے تھے۔

(6) رام داسی سکھ : وہ ان کی اولاد ہیں جو گورو رام داس کے ہاتھ پر سکھ ہوئے تھے اور ان کے نام کا اطلاق ان چماروں اور موچیوں پر بھی ہوتا ہے جنہوں نے پاہل کی رسم ادا کر کے سکھ ازم قبول کیا تھا۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد نمبر 11 صفحہ نمبر 107 تا 117 تلخیص)

لاہور (قلب پنجاب) پر چند بڑے حملے

کنہیال لال ہندی تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں کہ لاہور پر پہلا حملہ سلطان محمود غزنوی نے 413 ھ میں کیا۔ کیونکہ اس کے خراج گزار راجہ جے پال نے کالنجر کے راجہ کی فوج مقابلہ کے لیے بلا لی تھی۔ چنانچہ اسے شکست دے کر محمود واپس غزنی چلا گیا اور ملک ایاز کو بطور گورنر یہاں چھوڑ گیا۔ جس کے بہتر انتظامات کی وجہ سے لاہور علم و ادب کا گہوارہ بن گیا۔

2۔ دوسری بار لاہور پر شہاب الدین غوری نے خسرو ملک کو شکست دے کر قبضہ کیا اور غوری سلطنت قائم کی اور غزنوی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

3۔ سلطان غوری نے دہلی اور لاہور کو فتح کر کے قطب الدین ایبک نامی اپنے غلام کو کار مختار بنایا جبکہ کیچ اور مکران اور سندھ اور ملتان کی نیابت اپنے دوسرے غلام تاج الدین یلدوز کو عطا کی۔ سلطان غوری کی وفات کے بعد تاج الدین نے لاہور پر حملہ کر دیا مگر حاکم لاہور شکست کھا کر دہلی کی طرف بھاگ گیا۔ لاہور سے اسے کچھ نہ مل سکا۔ پھر اس کا مقابلہ دہلی سے آنے والے قطب الدین ایبک کے لشکر سے ہوا اور تاج الدین یلدوز مار کھا کر غزنی کی طرف بھاگ گیا۔ ایبک کی اچانک موت کے بعد تاج الدین یلدوز نے لاہور کو فتح کر لیا اور التمش کی طرف بڑھا جو دکن میں مصروف پیکار تھا۔ التمش نے اسے سرہند کے مقام پر آ لیا اور اسے شکست دے کر ملتان اور سندھ کی طرف بھگا دیا اور تعاقب کر کے سکھر کے قلعہ میں محصور کر دیا۔ جہاں سے بھاگتے وقت ملاحوں کی سازش سے ساتھیوں سمیت اسے غرق کر دیا گیا۔

4۔ لاہور پر چوتھی آفت جلال الدین فیروز شاہ خلجی کے دور میں آئی۔ جب امیر تیمور نے لاہور اور پنجاب کو تاراج کیا۔ التمش ان دنوں گجرات کی مہم میں مصروف تھا۔ آخر وہ تیموری لشکر پر چڑھ دوڑا اور دریائے ستلج پر اسے شکست دی۔ تاتاریوں نے اس دفعہ لاہور کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ التمش نے لاہور اور دیگر لٹی پٹی بستیوں کو دوبارہ آباد کیا اور دفاعی انتظام بھی خوب کیے کہ دوبارہ اس کے عہد میں کوئی پنجاب پر حملہ آور نہ ہو سکا۔

5۔ سلطان محمد تغلق کے عہد میں بے شمار تاتاری فوج مغرب کی جانب سے پنجاب پر چڑھ آئی۔ دیپال پور اور لاہور کو ہدف بنا کر خوب لوٹا۔ پھر تاتاری دہلی کی طرف بڑھے اور تاوان لے کر واپس گئے۔ تاتاری لشکر بہرام نامی حاکم ملتان کی شہہ پر حملہ آور ہوا تھا چنانچہ بعد میں سلطان نے اس کو سزا کے طور پر قتل کروا دیا۔

6۔ تاتاری مغل لشکر نے فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ایک بار پنجاب پر حملہ کیا اور لاہور کی رعیت کو بہت نقصان پہنچایا تاہم فیروز شاہ نے کانگڑہ کا قلعہ فتح کرتے ہی تاتاریوں کو آ لیا

اور وہ پنجاب سے بھاگ گئے۔

7۔ پھر محمد شاہ تغلق کے عہد میں کھکڑوں نے "سکھیا" نامی سربراہ کی قیادت میں پنجاب پر حملہ کیا اور شاہی اہلکاروں کو نکال دیا۔ لاہور کو بھی خوب لوٹا۔ کھکڑوں کی سرکوبی کے لیے شہزادے کی سرکردگی میں ایک لشکر بھیجا گیا لیکن اتنے میں محمد شاہ تغلق وفات پا گیا اور 796ھ میں محمود شاہ سلطان بنا۔ اس نے بھی مہم جاری رکھی اور سیکھا شکست کھا کر جموں کو بھاگ گیا۔ ادھر امیر تیمور کا بیٹا شہزادہ پیر محمد ملتان پر قابض ہو گیا جبکہ خود امیر تیمور دہلی میں براجمان ہوا۔ اسی کشمکش میں سیکھا نے لاہور پر قبضہ کر کے ظلم کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ امیر تیمور نے دہلی سے واپسی پر کوہ جموں میں مقیم ہو کر سلطان سکندر بت شکن بادشاہ کشمیر کو خلعت سے نوازا۔ اس موقعہ پر پنجاب کی رعایا نے سیکھا کھکڑ کے ظلم کی دہائی دی۔ چنانچہ دس ہزار کے لشکر نے سیکھا کو شکست دی جس میں وہ مارا گیا اور اس طرح لاہور میں امن بحال ہوا۔

8۔ خضر خاں کے بیٹے سلطان مبارک شاہ کے عہد میں لاہور پر افتاد پڑی جب امیر تیمور نے سیکھا کھکڑ کے قتل کے بعد پنجاب میں امن قائم کیا تو خضر خاں کو ہند کی نیابت سے نوازا۔ چنانچہ اس کی زندگی میں امن قائم رہا۔ 828ھ میں خضر خاں فوت ہوا تو مبارک شاہ دہلی کے تخت پر بیٹھا اور پنجاب میں کھکڑوں نے سیکھا کے بھائی جسرت کی قیادت میں اودھم مچا دیا اور لاہور پر حملہ آور ہوئے۔ ناظم شہر شکست کھا گیا لیکن شہریان لاہور نے مقابلہ جاری رکھا۔ دو ماہ بعد لاہور کو فتح کر لینے کے بعد کھکڑوں نے اسے خوب لوٹا اور پھر جلا کر خاکستر کر دیا۔ چنانچہ سرہند کے حاکم کو بادشاہ نے صورتحال سے نمٹنے کے لیے کہا لیکن وہ تعمیل ارشاد کی بجائے کھکڑوں سے مل گیا اور دہلی پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور چاہا کہ اکیلا ہی دہلی کے تخت پر قابض ہو جائے۔ اتنے میں بادشاہ خود جسرت کے مقابلے کو آ گیا اور اسے پہاڑوں کی طرف بھگا دیا اور خود لاہور آ گیا اور ویران شہر کو آباد کرنے کے لیے منادی کروا دی کہ جو کوئی شہر لاہور میں آباد ہو گا چھ ماہ کا خرچہ حکومت کی طرف سے پائے گا۔ اس طرح تین ماہ میں شہر آباد ہو گیا۔ پھر بادشاہ نے کھکڑوں کا علاقہ برباد کر دیا لیکن جسرت ہاتھ نہ آیا۔ واپسی پر سرہند کے قریب جسرت نے پھر بادشاہ کر حملہ کیا۔ ازیں پیشتر وہ جموں کے حاکم کو مخبری کی پاداش میں قتل کر چکا تھا۔ پھر جسرت نے کابل کے حاکم امیر شیخ علی کو ساتھ ملا کر دہلی پر حملہ کی کوشش کی اور پنجاب میں تباہی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ادھر شاہی فوج نے راستہ روکا۔ دوآبہ باری میں شیخ علی شکست دی اور پھر جسرت کے لشکر کا تیا پانچا کیا اور جسرت کی لاش تک نہ مل سکی۔ شیخ علی کا تعاقب پشاور تک کیا اور اس کی لڑکی سے بادشاہ نے نکاح کے عوض اسے معافی دے دی۔

9۔ پھر بابر کے دور میں پنجاب پر حملے ہوئے۔ لاہور کو فتح کیا اور پھر اپریل 1526ء میں پانی

لاہور (قلب پنجاب) پر چند بڑے حملے

کنھیال لال ہندی تاریخ لاہور میں لکھتے ہیں کہ لاہور پر پہلا حملہ سلطان محمود غزنوی نے 413 ھ میں کیا۔ کیونکہ اس کے خراج گزار راجہ جے پال نے کالنجر کے راجہ کی فوج مقابلہ کے لیے بلالی تھی۔ چنانچہ اسے شکست دے کر محمود واپس غزنی چلا گیا اور ملک ایاز کو بطور گورنر یہاں چھوڑ گیا۔ جس کے بہتر انتظامات کی وجہ سے لاہور علم و ادب کا گہوارہ بن گیا۔

2۔ دوسری بار لاہور پر شہاب الدین غوری نے خسرو ملک کو شکست دے کر قبضہ کیا اور غوری سلطنت قائم کی اور غزنوی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

3۔ سلطان غوری نے دہلی اور لاہور کو فتح کر کے قطب الدین ایبک نامی اپنے غلام کو کار مختار بنایا جبکہ کیچ اور مکران اور سندھ اور ملتان کی نیابت اپنے دوسرے غلام تاج الدین یلدوز کو عطا کی۔ سلطان غوری کی وفات کے بعد تاج الدین نے لاہور پر حملہ کر دیا مگر حاکم لاہور شکست کھا کر دہلی کی طرف بھاگ گیا۔ لاہور سے اسے کچھ نہ مل سکا۔ پھر اس کا مقابلہ دہلی سے آنے والے قطب الدین ایبک کے لشکر سے ہوا اور تاج الدین یلدوز مار کھا کر غزنی کی طرف بھاگ گیا۔ ایبک کی اچانک موت کے بعد تاج الدین یلدوز نے لاہور کو فتح کر لیا اور التمش کی طرف بڑھا جو دکن میں مصروف پیکار تھا۔ التمش نے اسے سرہند کے مقام پر آلیا اور اسے شکست دے کر ملتان اور سندھ کی طرف بھگا دیا اور تعاقب کر کے سکھر کے قلعہ میں محصور کر دیا۔ جہاں سے بھاگتے وقت ملاحوں کی سازش سے ساتھیوں سمیت اسے غرق کر دیا گیا۔

4۔ لاہور پر چوتھی آفت جلال الدین فیروز شاہ خلجیؒ کے دور میں آئی۔ جب امیر تیمور نے لاہور اور پنجاب کو تاراج کیا۔ التمش ان دنوں گجرات کی مہم میں مصروف تھا۔ آخر وہ تیموری لشکر پر چڑھ دوڑا اور دریائے ستلج پر اسے شکست دی۔ تاتاریوں نے اس دفعہ لاہور کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ التمش نے لاہور اور دیگر لٹی پٹی بستیوں کو دوبارہ آباد کیا اور دفاعی انتظام بھی خوب کیے کہ دوبارہ اس کے عہد میں کوئی پنجاب پر حملہ آور نہ ہو سکا۔

5۔ سلطان محمد تغلق کے عہد میں بے شمار تاتاری فوج مغرب کی جانب سے پنجاب پر چڑھ آئی۔ دیپال پور اور لاہور کو ہدف بنا کر خوب لوٹا۔ پھر تاتاری دہلی کی طرف بڑھے اور تاوان لے کر واپس گئے۔ تاتاری لشکر بہرام نامی حاکم ملتان کی شہہ پر حملہ آور ہوا تھا چنانچہ بعد میں سلطان نے اس کو سزا کے طور پر قتل کروا دیا۔

6۔ تاتاری مغل لشکر نے فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ایک بار پنجاب پر حملہ کیا اور لاہور کی رعیت کو بہت نقصان پہنچایا تاہم فیروز شاہ نے کانگڑہ کا قلعہ فتح کرتے ہی تاتاریوں کو آلیا

اور وہ پنجاب سے بھاگ گئے۔

7۔ پھر محمد شاہ تغلق کے عہد میں گکھڑوں نے "سکھیا" نامی سربراہ کی قیادت میں پنجاب پر حملہ کیا اور شاہی اہلکاروں کو نکال دیا۔ لاہور کو بھی خوب لوٹا۔ گکھڑوں کی سرکوبی کے لیے شہزادے کی سرکردگی میں ایک لشکر بھیجا گیا لیکن اتنے میں محمد شاہ تغلق وفات پا گیا اور 796ھ میں محمود شاہ سلطان بنا۔ اس نے بھی مہم جاری رکھی اور سیکھا شکست کھا کر جموں کو بھاگ گیا۔ ادھر امیر تیمور کا بیٹا شہزادہ پیر محمد ملتان پر قابض ہو گیا جبکہ خود امیر تیمور دہلی میں براجمان ہوا۔ اسی کشمکش میں سیکھا نے لاہور پر قبضہ کر کے ظلم کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ امیر تیمور نے دہلی سے واپسی پر کوہ جموں میں مقیم ہو کر سلطان سکندر بت شکن بادشاہ کشمیر کو خلعت سے نوازا۔ اس موقعہ پر پنجاب کی رعایا نے سیکھا گکھڑ کے ظلم کی دہائی دی۔ چنانچہ دس ہزار کے لشکر نے سیکھا کو شکست دی جس میں وہ مارا گیا اور اس طرح لاہور میں امن بحال ہوا۔

8۔ خضر خاں کے بیٹے سلطان مبارک شاہ کے عہد میں لاہور پر افتاد پڑی جب امیر تیمور نے سیکھا گکھڑ کے قتل کے بعد پنجاب میں امن قائم کیا تو خضر خاں کو ہند کی نیابت سے نوازا۔ چنانچہ اس کی زندگی میں امن قائم رہا۔ 828ھ میں خضر خاں فوت ہوا تو مبارک شاہ دہلی کے تخت پر بیٹھا اور پنجاب میں گکھڑوں نے سیکھا کے بھائی جسرت کی قیادت میں اودھم مچا دیا اور لاہور پر حملہ آور ہوئے۔ ناظم شہر شکست کھا گیا لیکن شہریان لاہور نے مقابلہ جاری رکھا۔ دو ماہ بعد لاہور کو فتح کر لینے کے بعد گکھڑوں نے اسے خوب لوٹا اور پھر جلا کر خاکستر کر دیا۔ چنانچہ سرہند کے حاکم کو بادشاہ نے صورتحال سے نمٹنے کے لیے کہا لیکن وہ تعمیل ارشاد کی بجائے گکھڑوں سے مل گیا اور دہلی پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور چاہا کہ اکیلا ہی دہلی کے تخت پر قابض ہو جائے۔ اتنے میں بادشاہ خود جسرت کے مقابلے کو آگیا اور اسے پہاڑوں کی طرف بھگا دیا اور خود لاہور آ گیا اور ویران شہر کو آباد کرنے کے لیے منادی کروا دی کہ جو کوئی شہر لاہور میں آباد ہو گا چھ ماہ کا خرچہ حکومت کی طرف سے پائے گا۔ اس طرح تین ماہ میں شہر آباد ہو گیا۔ پھر بادشاہ نے گکھڑوں کا علاقہ برباد کر دیا لیکن جسرت ہاتھ نہ آیا۔ واپسی پر سرہند کے قریب جسرت نے پھر بادشاہ کر حملہ کیا۔ ازیں پیشتر وہ جموں کے حاکم کو مخبری کی پاداش میں قتل کر چکا تھا۔ پھر جسرت نے کابل کے حاکم امیر شیخ علی کو ساتھ ملا کر دہلی پر حملہ کی کوشش کی اور پنجاب میں تباہی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ادھر شاہی فوج نے راستہ روکا۔ دوآبہ باری میں شیخ علی شکست دی اور پھر جسرت کے لشکر کا تیا پانچا کیا اور جسرت کی لاش تک نہ مل سکی۔ شیخ علی کا تعاقب پشاور تک کیا اور اس کی لڑکی سے بادشاہ نے نکاح کے عوض اسے معافی دے دی۔

9۔ پھر بابر کے دور میں پنجاب پر حملے ہوئے۔ لاہور کو فتح کیا اور پھر اپریل 1526ء میں پانی

پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کو شکست دے کر دہلی پر قابض ہو گیا۔

10۔ نادر شاہ ایرانی کے حملہ کے وقت بھی پنجاب اور لاہور پر افتاد پڑی اور حاکم لاہور زکریا خاں نے بیس لاکھ نقد اور دس ہاتھی بطور تاوان دے کر لاہور کو غارت گری سے بچا لیا۔

11۔ پھر احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے وقت بھی پنجاب اور لاہور پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے جب شاہ نواز خاں حاکم پنجاب کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ چنانچہ مغل پورہ کے محلّہ میں شاہی ارکان کی رہائش گاہوں سے لاکھوں کروڑوں کا مال غنیمت ہاتھ لگا۔

12۔ پھر معین الملک عرف میر منو کی شکست کے بعد احمد شاہ ابدالی نے لاہور میں اپنے بیٹے تیمور کو پنجاب کا ناظم بنایا۔ آدینہ بیگ نے مرہٹوں سے سازباز کر کے انھیں ساتھ ملا لیا۔ آخر احمد شاہ اور مرہٹوں کے درمیان پانی پت کے میدان میں جنگ ہوئی جس میں مرہٹوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ البتہ اس کے بعد سکھ عروج پکڑنے لگے۔

13۔ سکھوں کے عہد میں بھی لاہور کو برے دن دیکھنا پڑے۔ جب اس پر تین سکھ سردار حاکم بن بیٹھے، اور پھر لاہور اور پنجاب نے سکھا شاہی کے مظالم اس طرح جبراً برداشت کیے کہ حیا سرنگوں ہو گئی۔

سکھا شاہی دور میں سکھ مسلوں کا اجمالی تذکرہ

(1) **بھنگی مسل** : یہ بھنگی نسل کے سکھوں کی مسل تھی جس کا امرتسر' گجرات' چنیوٹ اور لاہور پر قبضہ تھا۔ اس کے پاس بارہ ہزار سوار تھے۔ ان کا بڑا چھجا سنگھ تھا جس نے گورو گوبند سنگھ کے ہاتھ پر سکھ ازم قبول کیا تھا۔ یہ بھنگ کا رسیا تھا اس لیے اس کے ساتھیوں کی مسل بھنگی کے نام سے مشہور ہوئی۔

لوٹ مار اور غارت گری کے لیے یہ مسل بہت بدنام تھی۔ رعایا کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ چھجا سنگھ کی موت کے بعد بھما سنگھ اس مسل کا سربراہ مقرر ہوا۔ اس کی موت کے بعد چندا سنگھ سربراہ بنا۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ یہ مرا تو اس کا لڑکا مہاں سنگھ سربراہ مقرر ہوا۔ اس کی موت کے بعد چندا سنگھ کو سربراہ بنایا گیا۔ اس نے بارہ ہزار سواروں سے جموں پر حملہ کیا۔ راجہ رنجیت دیو راجہ جموں نے مقابلہ کیا اور لڑائی میں چندا سنگھ کام آگیا۔ اس کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ چنانچہ گلاب سنگھ کے بیٹے گنڈا سنگھ کو مسل کا سردار بنایا گیا۔ اس وقت مہاراجہ رنجیت سنگھ لاہور پر قابض ہو چکا تھا۔ چنانچہ گنڈا سنگھ دوسری مسلوں کے سکھ سرداروں کے تعاون سے لاہور کی طرف بڑھا۔ بھسین کے مقام پر دونوں طرف کی فوجیں جمع ہو گئیں' لیکن جنگ سے پہلے ہی گلاب سنگھ کثرت شراب نوشی کی وجہ سے مرگیا۔ اس طرح سکھوں کا اتحاد ختم ہو گیا۔ پھر رنجیت سنگھ نے موقع پا کر امرتسر پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لی پھر بھنگی مسل کے سارے علاقے ایک ایک کر کے رنجیت سنگھ کی تحویل میں آ گئے۔

(2) **رام گڑھیا مسل** : اس کا سربراہ جسا سنگھ آدینہ بیگ کا تحصیلدار تھا۔ اس کی وفات کے بعد اپنے تفویض کردہ علاقے میں خودمختار بن بیٹھا۔ سردار جے سنگھ کنہیا نے اسے شکست دے کر ستلج سے پار بھگا دیا۔ جے سنگھ اور رنجیت سنگھ کے والد مہاں سنگھ میں ٹھن گئی۔ تو جسا سنگھ مہاں سنگھ کا حامی تھا۔ جے سنگھ کو شکست ہوئی اور جسا سنگھ کی اطاعت قبول کر کے باجگزاری اختیار کر لی۔ جودھ سنگھ مرا تو رنجیت سنگھ نے اس کے بیٹوں کی باہمی چپقلش سے فائدہ اٹھا کر اس کے علاقے کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا اور مال و دولت پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح نا اتفاقی کی سزا تینوں بھائیوں کو مل گئی۔

(3) **کنہیا مسل** : اس کا سردار جے سنگھ کنہیا تھا۔ جو کاہنہ (لاہور) کا رہنے والا تھا۔ اس نے فاقوں سے تنگ آ کر سکھ ازم قبول کر لیا اور سردار کپور سنگھ کی سرکردگی میں ڈاکے مارنے لگا۔ پھر اپنی بستی کے سکھ جوانوں کو ساتھ ملا کر الگ مسل کا بانی ہوا۔ جس کو مہاں سنگھ' جسا سنگھ اور سنسار چند نے مقابلہ کر کے اس کے مقبوضہ قلعہ کانگڑا پر سنسار چند کا قبضہ کروا دیا۔ اس جنگ میں جے سنگھ کا بیٹا مارا گیا اور جسا سنگھ بدستور اپنے علاقوں پر قابض رہا۔ 1819ء میں جے

سنگھ فوت ہوگیا تو اس کی بہو رانی سدا کنور زوجہ گوربخش سنگھ اس کے علاقے پر قابض ہو گئی۔ جس کو اس کے داماد رنجیت سنگھ نے قید کر کے اس علاقے کو اپنے علاقے میں شامل کر لیا۔

(4) نیکائی یا **نکئی مسل** : اس کا سردار ہیرا سنگھ تھا۔ اس نے بھی فاقوں سے تنگ آ کر اور سنگھ بن کر راہزنی کو اپنایا اور بہت سا مال و زر جمع کر لیا اور لشکر بھرتی کر کے اپنے علاقہ کا سردار بن گیا اور ملک نکہ (یہ نکہ گاؤں کا باسی تھا) کہلانے لگا اور علاقے میں استحکام پیدا کیا۔ اس کے ساتھ ہی پاک پتن کی ریاست تھی جس کا سربراہ بابا فرید شکر گنج کے خانوادہ میں سے میاں شیخ سبحان قریشی تھا۔ ہیرا سنگھ نے پاک پتن پر حملہ کر دیا جس میں ہیرا سنگھ مارا گیا۔ اس کا لشکر بھاگ کر بھیروال چلا گیا' پھر ہیرا سنگھ مسل میں باہمی نزاع نے سر اٹھایا۔ آخر رنجیت سنگھ نے اس مسل پر بھی قبضہ جما لیا۔

(5) آلووالیہ **مسل** . . . ں کا سربراہ بھاگ سنگھ شراب فروشی میں مندے کا شکار ہو کر ... بن گیا اور ... [illegible] اختیار ... چھوٹا سا لشکر تیار کر کے ایک علاقے پر حکمران بن بیٹھا۔ اس کا بھانجا جسا سنگھ پور سنگھ کے علاقے میں بااختیار افسر تھا۔ بھاگ سنگھ بے اولاد تھا اس لئے وفات کے بعد اس کی مسل پر جسا سنگھ کا قبضہ ہوگیا۔ جسا سنگھ آدینہ بیگ کا معتقد اور اطاعت گزار تھا۔ اس کی زندگی میں اس کا اقتدار قائم رہا۔ مگر آدینہ بیگ کے مرتے ہی سکھوں نے اس کے علاقے پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ جسا سنگھ نے سرہند کے قریب فتح آباد پر قبضہ جما لیا۔ پھر کپور تھلہ کی ریاست ابراہیم بھٹی سے چھین لی۔ جسا سنگھ نے احمد شاہ درانی سے دو سو ہندوستانی عورتوں کو آزادی بھی دلائی تھی جن کو وہ اپنے ساتھ زبردستی کابل لے جا رہا تھا۔ اس طرح اس کی نیک نامی میں بہت اضافہ ہوگیا۔ جسا سنگھ کی موت کے بعد بھاگ سنگھ اس مسل کا مہری بنا۔ یہ مرا تو اس کی جگہ سردار فتح سنگھ جانشین ہوا۔ فتح سنگھ راجہ رنجیت سنگھ کا حامی اور مددگار بن کر اس کی فتوحات میں اضافہ کا باعث بنا۔ جب سکھوں اور انگریزوں کے درمیان دریائے ستلج کو سرحد بنایا گیا تو رنجیت سنگھ کی نیت میں فتور آگیا لیکن بروقت اطلاع ہو جانے سے فتح سنگھ کپور تھلہ سے بھاگ کر انگریزی علاقے میں چلا گیا اور انگریزوں کو دوست بنا لیا۔ اس کی وفات کے بعد نہال سنگھ جانشین ہوا۔ اس کے عہد میں سکھوں اور انگریزوں کے درمیان جنگ ہوئی وہ غیر جانبدار رہنا چاہتا تھا مگر اس کی سکھ فوج انگریزوں کے خلاف ڈٹ گئی۔ تاہم انگریز فتح مند ہوئے اور کپور تھلہ وغیرہ پہ انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ نہال سنگھ نے عذر پیش کئے مگر بات نہ بن سکی۔ چنانچہ ایک لاکھ بتیس ہزار روپے نقد سالانہ خراج دینا منظور کیا اور راجہ کا خطاب پایا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا رندھیر سنگھ جانشین بنا۔ اس نے 1857ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کو فوجی امداد دی۔ چنانچہ ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی زمینداری اسے لکھنؤ کے علاقے میں انگریزوں نے عطا کی۔ جو اس کی وفات کے بعد 1884ء میں بحق سرکار قبضہ قرار پائی جسے بعد ازاں اس کے بیٹے کھڑک سنگھ کے نام منتقل کر دیا گیا۔

(6) ڈلے والیہ مسل : اس کا بانی ڈلے وال کا باسی گلا باکھتری تھا۔ جس نے سکھ ازم اختیار کر کے ڈاکے ڈالنے شروع کر دیئے اور گلاب سنگھ کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ مختصر مدت میں جمعیت تیار کر کے ایک علاقے پر حکمرانی کرنے لگا۔ وفات کے بعد تارا سنگھ چرواہے کو اس کا جانشین بنایا گیا کیونکہ گلاب سنگھ لاولد تھا۔ تارا سنگھ نے سکھ بن کر بھنگی مسل کے سرداروں کے ساتھ قصور کے حسین خاں کو شکست دی وہاں سے چار لاکھ کا زیور ہاتھ آیا تو دس ہزار سپاہ بھرتی کرلی۔ جب سکھوں نے مل کر سرہند کو تاراج کیا انہیں وہاں سے بہت سا خزانہ ملا۔ رنجیت سنگھ نے فتح سنگھ آلووالیہ کو کہا کہ تارا سنگھ سے اس کے علاقے چھین لے۔ یہ علاقے چھنتے ہی وہ اس غم میں موت کی آغوش میں چلا گیا۔

(7) نشان والیہ مسل : سنگت سنگھ اور مہر سنگھ نے دریائے ستلج کے علاقے میں ڈاکے مار کر دولت اکٹھی کی۔ اس نے دس ہزار سوار فراہم کرلئے۔ ایک دفعہ میرٹھ پر بھی یلغار لی اور دولت لوٹ کر لائے انبالہ اس مسل کا مرکز تھا۔ سنگت سنگھ مرا تو مہر سنگھ نے ساری مسل پر قبضہ جمالیا۔ وہ لاولد تھا۔ اس کی وفات کے بعد رنجیت سنگھ نے دیوان محکم چند کے ذریعے اس مسل کو بھی ہڑپ کرلیا اور بہت بڑا خزانہ رنجیت سنگھ کے ہاتھ لگا۔

(8) فیض اللہ پوریہ مسل : دوآبہ جالندھر میں فیض اللہ پور واقع ہے۔ یہاں کا کپور چند سکھ بنا تو نواب کپور سنگھ کے نام سے سکھوں کا پیشوا بھی بن گیا۔ پھر ہزاروں غیر مسلموں کو سکھ ازم کی آڑ میں اپنا حامی بنایا اور لوٹ مار شروع کی۔ اس نے بقول خود پانچ سو مسلمانوں کو قتل کیا تھا تاکہ اس کی نجات کا باعث بن سکیں۔ اس کی مسل میں 2500 سوار تھے۔ ستلج سے دہلی تک لوٹ مار کرنا اس کا کام تھا۔ اسے اپنے گاؤں کا نام فیض اللہ پور پسند نہ تھا کیونکہ اس میں اللہ کا نام تھا چنانچہ اس نے اپنے گاؤں کا نام سنگھ پور رکھا اور فیض اللہ پور کہنے والوں کو قتل کرنے کا اعلان کیا۔ کپور سنگھ مرا تو خوشحال سنگھ اس مسل پر قابض ہو گیا۔ آخر رنجیت سنگھ نے اس مسل کو بھی اپنے علاقے میں شامل کرلیا۔

(9) کروڑا سنگھیہ مسل : اس کا بانی کروڑی مل تھا جو سکھ ہو کر کروڑا سنگھ ہوا اور ڈاکہ زنی کو بطور پیشہ اپنا کر یہ مسل قائم کرلی۔ مرنے کے بعد بگھیل سنگھ جانشین ہوا۔ اس میں بارہ ہزار سپاہی تھے۔ دوآبہ بست جالندھر اور ستلج پار کا علاقہ بھی اس مسل میں شامل تھا بالآخر رنجیت سنگھ نے اس مسل پر بھی قبضہ کرلیا۔

(10) شہیدیہ مسل : گوربخش سنگھ اور کرم سنگھ اس کے بانی تھے جو دریائے ستلج کے مشرقی اضلاع پر مشتمل تھی۔ اس میں دو ہزار سپاہی تھے۔ اس کے بزرگ پٹیالہ کے نزدیک مسلمانوں نے دمدمہ کے مقام پر قتل کئے تھے۔ اس لئے اس مسل کو شہیدوں کی مسل کہا جانے لگا۔

(11) پھلکیاں مسل : اس کا بانی پھول قوم کا جاٹ تھا۔ پھول کی اولاد کی ملکیت' یہ مسل پھلکیاں (پھول والوں کی یا پھول سے نسبت والوں کی اور پنجابی میں پھول' پھل ہے لہذا اسے پھلکیاں کہا گیا) کی ٹھہری۔ پھول کی اولاد میں آلا سنگھ نے سکھ ہونے کے بعد سرہند پر چڑھائی کی اور اسے تباہ و برباد کیا۔ مالیر کوٹلہ کی مسلم ریاست کو بھی اس نے تاراج کیا۔ 1818ء میں احمد شاہ ابدالی نے پٹیالہ پر حملہ کیا تو آلا سنگھ نے چار لاکھ روپیہ نذرانہ دے کر جان بچائی۔ پھر اس کے جانشینوں نے بھی اپنا کام جاری رکھا۔ رنجیت سنگھ نے ریاست پٹیالہ' نابھہ "جنید اور مالیر کوٹلہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن انگریزوں کی حمایت آڑے آئی اور وہ کامیاب نہ ہوا سکھوں اور انگریزوں کی جنگ میں اس کا راجہ انگریزوں کا وفادار رہا۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں بھی وہ انگریزوں کا طرفدار تھا اور اس کی فوج دہلی گئی۔ چنانچہ انگریزوں نے بعد میں اس مسل کو اقتدار میں رہنے دیا۔ ریاست نابھہ بھی قائم رہ گئی اور ریاست نابھہ اور جنید کا حکمران ہیرا سنگھ کو مقرر کیا۔

(12) سکر چکیا کی مسل : اس کا بانی چڑھت سنگھ تھا جس کا مسکن سکر چک تھا لیکن یہ مسل کچھ عرصہ قصبہ مجیٹھ میں قائم رہی چڑھت سنگھ نے اپنی طاقت بڑھانے کے بعد وزیر آباد کو خوب لوٹا اور چکوال' جلال پور' رسول نگر وغیرہ کو اپنی مسل میں شامل کیا۔ جب وہ اپنے ہاتھوں گولی چل جانے سے مرگیا تو اس کا بیٹا مہاں سنگھ جانشین ہوا۔ اس نے رسول نگر اور علی پور پر قبضہ کیا اور نام بدل کر رام نگر اور اکال گڑھ رکھ دیئے۔ 17[illegible]2ء میں یہ فوت ہوا تو اس کا بیٹا رنجیت سنگھ جانشین ہوا۔ 1799ء میں رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کیا اور آہستہ آہستہ تمام پنجاب پر قابض ہو گیا اور 1839ء تک حکومت کر کے وفات پا گیا۔

سکھوں کی بارہ مثلیں (مسلیں)

(جملہ کارکردگی کی تفصیلات بحوالہ کنہیا لال کی تاریخ پنجاب)

(1) پہلی مثل بھنگی سکھوں کی ۔ اس خاندان کے سکھ شہر امرت سر، گجرات و چنیوٹ اور تیسرے حصے شہر لاہور پر قابض و حاکم تھے۔ سب سے پہلے انہی نے غارت گری میں ناموری پیدا کی اور بارہ ہزار سوار اس میں تھے۔ اس کا مورث اعلیٰ چھجا سنگھ تھا جس کی سکونت موضع پنج وڑ میں امرتسر سے بہت قریب تھی۔ اس نے گورو گوبند سنگھ کے ہاتھ سے پاہل لی اور سکھ بنا۔ چونکہ یہ شخص بھنگ بہت پیتا تھا اس لئے بھنگی کے خطاب سے مخاطب ہوا۔ اس سے مسمیان بھما سنگھ و نتھا سنگھ نے پاہل لی اور سکھ ہوئے۔ تینوں کا ایک جلا یعنی مجمع بنا۔ بعد ازاں مسمیان مہیان سنگھ جگت سنگھ و گلاب سنگھ ساکنان موضع دھوسہ نزد امرتسر اور کروڑ سنگھ ساکن موضع چوبھال (امرتسر) اور گورو بخش سنگھ ساکن اور انوالہ ذات جاٹ سندھو اور اگر سنگھ کنگوڑہ ساکن جے سنگھ والہ و ساون سنگھ رندھاوا ان کے ساتھ شامل ہوئے اور سب نے چھجا سنگھ سے پاہلیں لیں، پھر تو یہ خاص گروہ بن گیا اور چاہا کہ بہ موجب بشارت گرو گوبند سنگھ کے کہ "ہمارا خالصہ راج کرے گا۔" ہاتھ پاؤں ماریں اور قوت حاصل کر کے سلطنت چغتائی کو اپنے قبضے میں کرلیں اور گورو کی منادی تمام ہندوستان میں کرائیں۔

اس خیال پر انہوں نے غارت گری و رہزنی شروع کی اور بہت سے گاؤں لوٹ کر برباد کر دیئے۔ رعایا کا کوئی فریاد رس نہ تھا۔ چند سال کے بعد چھجا سنگھ بھنگی، جو بڑا افسر اور سپہ سالار تھا مر گیا۔ اس کے بعد بھما سنگھ مالک و سرپرست اس مثل کا بنا۔ یہ شخص اولاد نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے اس نے ہری سنگھ ساکن تجور کو متبنیٰ کیا اور اسے فرزند بنا کر اپنی جائیداد کا مالک کر دیا۔

جب بھما سنگھ مر گیا تو ہری سنگھ اس کی جگہ افسر تمام مثل کا قرار پایا۔ اس سے پہلے تو اس مثل کے رہزن رات کو ہی رہزنی کرتے تھے مگر اس نے روز روشن میں غارت گری شروع کر دی اور یہ سو سو کوس تک دھاوا کرتا۔ اچھے اچھے جوان سکھ اس نے نوکر رکھے اور گھوڑے سواری کے لئے مہیا کئے۔ چودھری ملا ساکن تجور کی دختر کے پیٹ سے گنڈا سنگھ و چندا سنگھ دو بیٹے اس کے گھر ہوئے اور دوسری عورت کے بطن سے چڑت سنگھ و دیوان سنگھ و دیسو سنگھ تین فرزند پیدا ہوئے۔ یہ پانچ فرزند بھی بڑے ہوشیار تھے۔ جب ہری سنگھ مر گیا تو ان پانچوں میں سے کسی کو سرداری نہ ملی اور مہیان سنگھ افسر بنا۔ ہری سنگھ کے پانچوں بیٹے اس کے ماتحت گھوڑا سوار بنے۔

جب مہیان سنگھ مر گیا تو گلاب سنگھ نے چاہا کہ میں سردار بنوں مگر چندا سنگھ و گنڈا سنگھ اپنی عقل و مردانگی سے سردار ہوئے اور مثل کے تمام سکھ ان دونوں کے تابع دار بن گئے۔ چندا سنگھ نے بارہ ہزار سواروں کے ساتھ جموں پر حملہ کیا۔ راجہ رنجیت دیو (راجہ جموں) میدان میں

آیا اور چندا سنگھ اسی لڑائی میں مارا گیا۔ اس کے کوئی اولاد نہ رہی اور گنڈا سنگھ پٹھان کوٹ کی لڑائی میں حقیقت سنگھ کمینہ کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ اگرچہ گنڈا سنگھ کے مارے جانے کے بعد اس کا بیٹا گلاب سنگھ وارث موجود تھا لیکن بہ سبب خورد سالی کے وہ سردار نہ بنا اور دیسو سنگھ' (چھوٹا بھائی گنڈا سنگھ کا) مثل میں سردار ہوا۔ جب دیسو سنگھ مرگیا تو گلاب سنگھ (گنڈا سنگھ کا بیٹا) سردار بنا۔ اس کے وقت میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور لے لیا تو اس کو کمال حسد ہوا اور چاہا کہ دوسری مثلوں کے ساتھ مل کر رنجیت سنگھ پر حملہ کر کے اس کو لاہور سے نکال دے۔ موضع بھسین کے میدان میں اس کا لشکر آکر اترا تو مہاراجہ رنجیت سنگھ بھی ان کے مقابلے کے لئے لاہور سے نکلا اور ابھی بڑا مقابلہ ہونے والا تھا کہ ایک رات گلاب سنگھ نے بہت سی شراب پی لی اور ایسا مست ہوا کہ پھر آنکھ نہ کھولی اور شب وہ مرگیا تو اس کی جمعیت متفرق ہوگئی۔ پھر اس کا بیٹا گوردت سنگھ مسند نشین ہوا۔ اس نے چاہا کہ پھر سکھوں کو جمع کر کے رنجیت سنگھ پر چڑھائی کرے مگر رنجیت سنگھ کو خبر ہوگئی اور اس نے اس کو امرتسر سے نکال دیا اور شہر پر قابض ہوگیا۔ چند گاؤں گزارے کے لئے اس کو دیئے' وہ بھی چند ماہ کے بعد ضبط کرلئے۔ جب گوردت سنگھ مر گیا تو دو بیٹے اس کے گنڈات سنگھ و مول سنگھ باقی رہے مگر وہ محض گمنام اور ابتر حال رہے۔ پھر خاندان نیست و نابود ہوگیا اور کرم سنگھ کا بیٹا جسا سنگھ بھنگی' جو اسی خاندان کا سردار چنیوٹ پر قابض تھا۔ اس کو بھی مہاراجہ رنجیت سنگھ نے وہاں سے بیدخل کر دیا اور صاحب سنگھ بھنگی' جو بڑا سردار گجرات کا مالک تھا اور بہت بڑا علاقہ اس کی حکومت میں تھا' اس کو بھی رنجیت سنگھ نے غالب ہوکر نیست و نابود کر دیا۔

(2) دوسری مثل رام گڑھی سکھوں کی : اس مثل کے ماتحت تین ہزار سوار تھے جو جواں مردی و غارت گری و تاراج و قتل و کشت و خون میں مشہور تھے۔ بانی مبانی اس مثل کا سردار جسا سنگھ بھگوانا گیانی کا بیٹا تھا جو موضع ایچوگل علاقہ ضلع لاہور میں رہتا تھا۔ ابتدائے عمر میں سنگھ بھی گیانیوں کے زمرے میں رہ کر اپنے باپ دادا کا کسب کرتا تھا۔ جب اس کام میں گزارہ نہ ہوا تو اس نے بھی گورو دیال سنگھ پنج گھریہ سے پاہل لی۔ (بعض لوگ کہتے ہیں کہ انند سنگھ روڑانوالی سے پاہل لے کر سکھ بنا) اور پیشہ قزاقی و رہزنی سے عزت و اثاثہ پیدا کر کے معتبر بن گیا اور داڑھی کے بال بہت بڑھا لئے۔ جب سکھان دوآبہ اور آدینہ بیگ خاں صوبہ دوآبہ جالندھر کے درمیان تنازع برپا ہوا تو سکھوں نے ایسے شخص کو معتبر تصور کر کے اپنا وکیل بنایا اور جواب و سوال کے لئے آدینہ بیگ خاں کے پاس بھیجا اس کی ہوشیاری اور خوش تقریری اور معتبر شکل دیکھ کر آدینہ بیگ خاں بہت خوش ہوا اور مشاہرہ معقول اس کو اپنے پاس نوکر رکھ لیا اور کام داری کا اس کے سپرد کیا جو آدینہ بیگ کے بعد تحصیل کا مالک و حاکم خودمختار بن بیٹھا۔ چند سال کے بعد اس کی عداوت سردار جے سنگھ کھنیا سے پیدا ہوئی اور جے سنگھ نے بہت سی لڑائیوں کے بعد اس کو بے دخل کر کے ستلج کے پار بھگا دیا۔
جہاں اس نے لوٹ مار کر کے گزارہ کیا۔ آخر جب سردار جے سنگھ کھنیا اور سردار مہان سنگھ (پدر

مہاراجہ رنجیت سنگھ) کے درمیان عداوات پیدا ہوئی تو مہان سنگھ نے جسا سنگھ کو اپنی امداد کے لئے طلب کیا۔ جب یہ آیا تو دونوں سرداروں میں سخت لڑائی ہوئی۔ آخر جے سنگھ نے شکست کھائی اور گورو بخش سنگھ (جے سنگھ کا بیٹا) عین لڑائی میں مارا گیا۔ اس فتح نمایاں کے بعد جسا سنگھ دوبارہ اپنے قدیمی علاقے پر قابض ہو گیا اور چند سال کے بعد مر گیا۔ اس کے بعد جودھ سنگھ کا بیٹا مالک و قابض علاقہ پدری کا ہوا۔

پھر جودھ سنگھ نے رنجیت سنگھ کی اطاعت قبول کرلی۔ اگرچہ کوئی تعداد باج سالانہ کی نہ تھی مگر رنجیت سنگھ جب تنگ کرتا' کچھ دے چھوڑتا۔ آخر جب جودھ سنگھ مرا تو اس کے بیٹے دیوان سنگھ' ہیرا سنگھ' بیر سنگھ باقی رہے۔ ان میں سے ہر ایک ریاست کی گدی اپنے لئے چاہتا تھا۔ آخر یہ بات ٹھہری کہ ملک و مال اور حصص کی تقسیم کے لئے مہاراجہ رنجیت سنگھ منصف و ثالث مقرر ہو۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ فی الفور اپنا لشکر لے کر ان کے علاقے میں داخل ہوا اور ایسی منصفی کی کہ ان کے تمام علاقے میں اپنے کارگزار بھیج دیئے اور خزانہ و دولت سب کچھ قبضہ میں کرلیا۔ وہ تینوں اس ایک کا منہ دیکھتے رہ گئے۔ باہمی لڑائی میں اپنی عزت کا فیصلہ دوسروں کے سپرد کرنے سے ایسے ہی نتائج سامنے آتے ہیں۔

(3) تیسری مثل سرداران کہنیا کی : اس مثل کا بانی سردار جے سنگھ کہنیا تھا۔ وہ موضع کاہنا کا تھا۔ جو لاہور سے جنوب کی طرف دس کوس پر آباد ہے' اس لئے اس کو سردار جے سنگھ کہنیا کہتے تھے' یعنی موضع کاہنہ کا رہنے والا۔ اصل حاصل اس مثل کا یہ ہے کہ مسمی خوشحال سندھو جاٹ کاہنا کا رہنے والا ایک غریب و مفلس آدمی تھا کہ اکثر اوقات گزارہ اس کا گدائی و دریوزہ گری کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ اس کے دو بیٹے جے سنگھ اور چندہ سنگھ تھے ان میں جے سنگھ' بڑا اولوالعزم و صاحب داعیہ نکلا۔ اس نے چاہا کہ کسی طرح مفلسی و فاقہ کشی کے عذاب سے نکل کر ہاتھ پاؤں ہلائے' شاید کہ خدا مہربان ہو' اسی فکر میں تھا کہ یکایک سکھوں کی فتح کا آوازہ عالمگیر ہوا۔ اس نے بھی سردار کپور سنگھ فیض اللہ پوریہ کی خدمت میں جاکر اس نے پاہل لی اور سکھ بن گیا۔ اس کی مثل کے ہمراہ ہو کر رہزنی و غارت گری میں سرگرم ہوا اور اپنے ہمسروں اور ہم چشموں سے بڑھ گیا۔ جب بہت سے آدمی اپنے بستی کے بھی اس نے سکھ بنا کر اپنی ساتھ شامل کرلئے تو اپنی مثل اس نے الگ بنائی اور دور دور جا کر پے در پے ڈاکے مارے۔ بڑے بڑے قصبے اور گاؤں لوٹے اور خوب جمعیت بہم پہنچائی۔

جب سلطنت شاہان دہلی اور کابل کی پنجاب سے بالکل نیست و نابود ہوگئی تو اس نے بھی بہت سا ملک اور سکھوں کی طرح دامن کوہ شمالی کا دبا لیا اور خیالات اس کے بہت بلند ہوگئے۔ چونکہ اس وقت مہاراجہ سنسار چند والی کوہستان بھی اپنے علاقے کی حدود بڑھانے میں مصروف تھا اور وہ قلعہ کانگڑہ پر بھی تسلط چاہتا تھا مگر نواب سیف علی خاں قلعدار کانگڑہ جو سلاطین چغتائی کے وقت سے قلعے پر قابض تھا۔ اس کو قلعے پر قابض ہونے نہیں دیتا تھا اس واسطے مہاراجہ سنسار چند نے سردار جے سنگھ کہنیا کو اپنی امداد پر بلایا۔ یہ فی الفور کانگڑے پہنچا اس کے

وہاں پہنچتے ہی خبر آئی کہ نواب سیف علی خاں قلعدار بہ قضائے الٰہی مرگیا ہے یہ خبر سن کر جے سنگھ نے قلعے والوں کو بہت ڈرایا اور دھمکایا اور سیف علی خاں کے بیٹے جیون خاں سے قلعہ خالی کرا لیا اور سردار جے سنگھ خود قلعے پر قابض ہو بیٹھا اور مہاراجہ سنسار چند چونکہ جمعیت سردار جے سنگھ کی مہاراجہ سنسار چند کی سپاہ سے اس وقت زیادہ تھی' علاوہ اس کے قلعے میں اپنا قرار واقعہ قبضہ کرلیا تھا' سنسار چندر ناچار خاموش رہا۔ یہ ترقی اور جاہ و جلال سردار جے سنگھ کا دیکھ کر سردار جسا سنگھ رام گڑھیہ کو کمال حسد ہوا اور اس کے علاقے سے مزاحمت کرنی شروع کی۔ جے سنگھ نے اس پر بھی فوج کشی کی اور لڑائی میں اس کو شکست دے کر ستلج کے پار اتار دیا۔ جب رام گڑھیوں کا علاقہ بھی جے سنگھ کے قبضے میں آگیا تو جے سنگھ بہت مغرور ہو گیا اور بابت حصہ مال اور اسباب غارت شہر جموں' سردار مہان سنگھ' (مہاراجہ رنجیت سنگھ کے باپ) کے ساتھ خصومت شروع کی۔ اگرچہ یہ دعویٰ اس کا سچا تھا کہ اس نے مہان سنگھ کی ہمراہی میں شہر جموں کو لوٹا تھا اور غارت کر کے پورا حصہ نہ پایا تھا مگر سردار مہان سنگھ کو اب وہ حصہ دینا مشکل ہو گیا۔ پہلے تو مہان سنگھ نے جے سنگھ کی بہت خوشامد کی اور چاہا کہ کسی طرح یہ اپنے دعوے سے باز آجائے۔ جب چاپلوسی سے کام نہ نکلا تو جنگ کی تیاری کی اور سردار جسا سنگھ رام گڑھیہ کو ستلج پار سے اپنی امداد پر طلب کیا اور مہاراجہ سنسار چند سے بھی دوستی کرلی۔ اب دو دشمن قوی زور اور تیسرا مہان سنگھ' جے سنگھ کی سرکوبی پر مستعد ہوگئے۔

یہ خبر جب جے سنگھ نے سنی تو مسمی گوربخش سنگھ دودیہ کو' فوج دے کر بھیجا تاکہ جسا سنگھ رام گڑھیہ کا راستہ روکے وہ ستلج پار اتر گیا اور قریب پٹیالہ کے لڑائی میں گوربخش دودیہ مارا گیا۔ دوسری لڑائی اس کی جے سنگھ کے بیٹے گوربخش سنگھ سے اس کے ملک کی سرحد پر ہوئی۔ اس لڑائی میں دوسرا گوربخش سنگھ (یعنی جے سنگھ کا بیٹا) بھی قتل ہوا۔ مہاراجہ سنسار چند نے پہاڑ سے اتر کر جے سنگھ کے علاقے کی ضبطی شروع کی۔ جب جے سنگھ پر چاروں طرف سے دشمنوں کا ہجوم ہو گیا تو سخت گھبرایا۔ چنانچہ فی الفور اس نے قلعہ کانگڑا مہاراجہ سنسار چند کو دے دیا اور اس کی مزاحمت سے رہائی پائی اور مہان سنگھ کے بیٹے رنجیت سنگھ کے ساتھ' جو آخر مہاراجہ رنجیت سنگھ والی پنجاب ہوا' اپنے پوتے گوربخش سنگھ کی بیٹی مسمات مہتاب کنور کا ناطہ کر کے اس سے بھی صلح کرلی۔ سردار مہان سنگھ نے انہی ایام میں اپنے فرزند رنجیت سنگھ کی شادی مہتاب کنور سے کرلی اور دو سرداروں میں اتحاد پیدا ہو گیا۔ اس وقت مہان سنگھ نے صلح اس شرط پر کی تھی اور ناطہ لیا تھا کہ سردار جسا سنگھ رام گڑھیہ بھی بہ دستور اپنے علاقے پر قابض و متصرف ہو جائے۔ چنانچہ وہ ہوگیا۔ سردار جے سنگھ اپنے بیٹے گوربخش سنگھ مقتول جو بڑا بہادر اور لائق تھا کے غم و الم میں سمت 1819 مطابق 1227ء ہجری میں مرگیا اس کے مرنے کے بعد رانی سدا کنور زوجہ گوربخش سنگھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ساس اس کے مقبوضہ علاقے پر قابض و متصرف رہی۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے لاہور پر یورش کی تو رانی سدا کنور مع اپنی فوج کے اس کے ہمراہ تھی اور مدت دراز تک اس کی مددگار و معاون رہی۔ آخر باہم نااتفاقی ہوگئی اور مہاراجہ

رنجیت سنگھ نے اس کا علاقہ کیریاں وغیرہ ضبط کر کے اس کو قید میں رکھا اور وہ قید ہی میں مرگئی اور خاندان سرداران کہنیا کا نیست و نابود ہو گیا۔

(4) چوتھی مثل نکئی سکھوں کی : اس مثل کا بانی ہیرا سنگھ قوم جاٹ گوت سندھو ایک غریب مفلس آدمی کا بیٹا تھا اور محنت و مزدوری پر گزارہ تھا۔ جب مزدوری نہ ملتی تو گدائی سے کام چلا لیتا۔ موضع بھڑوال سابق پرگنہ فرید آباد حال پرگنہ چونیاں واقع ملک نکہ میں اس کی سکونت تھی۔ جب وہ عیال دار ہوا اور گھر کے آدمی بڑھ گئے تو اس کا پیٹ اس کی محنت و مزدوری اور گدائی سے بھرتا نہ تھا۔ ایک ہفتے میں چار دفعہ فاقہ ہوتا تھا۔ جب اس سے کوئی صورت بن نہ پڑی تو اس نے پاہل لی اور سکھ بن گیا۔ اپنے گاؤں کے ہم عمر بھی بہت سے آدمی اپنے ہمراہ کر لیے اور ڈاکہ مارنا شروع کیا۔ پہلے پہلے تو نزدیک نزدیک کے گاؤں رات رات لوٹے' پھر آگے قدم بڑھایا اور دور دور کے ملکوں کو لوٹنے لگے۔ جب مال و دولت بہت سا چند سال میں جمع کرلیا تو گھر کے ملازم گھوڑ سوار نوکر رکھے اور سوار و پیادہ لشکر بہم پہنچایا اور اپنی حکومت کل علاقہ پر قائم کرلی۔ پھر آگے قدم بڑھایا اور دریائے ستلج کے کنارے کنارے دور دور تک ملک فتح کیا اور فرماں روائے ملک نکہ ہو گیا اور بڑے استحکام کے ساتھ ریاست قائم کی۔ چونکہ اسی علاقے میں ریاست و جاگیر شیخ سبحان قریشی سجادہ نشین خانقاہ فرید گنج شکر چشتی کی واقع تھی اور ان کے علاقے میں گاؤ کشی کا رواج تھا' یہ بات ہیرا سنگھ پر ناگوار گزری اور بڑی جمعیت کے ساتھ پاک پتن پر یورش کی۔ عین معرکے میں ایک ایسی گولی ہیر سنگھ کے مغز میں لگی کی سر پاش پاش ہو گیا۔ ہیرا سنگھ کے مارے جانے کے بعد لشکر اس کا بھڑوال کو واپس چلا گیا۔

شیخ سبحان نے چار ہزار سوار کے ساتھ ان کا تعاقب کیا مگر وہ دستیاب نہ ہوئے۔ ہیرا سنگھ مقتول کا بیٹا دل سنگھ اس وقت خرد سال تھا' اس لئے ناہو سنگھ برادر زادہ اس کا قائم مقام اس کا ہوا۔ اس کی مسند نشینی کو نو ماہ ہی گزرنے پائے تھے کہ تپدق سے مرگیا۔ اس کے بعد وزیر سنگھ (ناہر سنگھ کا چھوٹا بھائی) مالک ہوا۔ اس مثل کے ایک شخص سردار چتر سنگھ کی دختر دل سنگھ سے منسوب تھی۔ اتفاقاً چتر سنگھ مرگیا۔ دل سنگھ خرد سال داماد اس کا ان کی نصف ریاست کا حق دار تھا' لیکن وزیر سنگھ نے اس کی ریاست پر بھی قبضہ کرلیا اور دل سنگھ کو' جو ہیرا سنگھ اور اس کے دونوں چھوٹے بھائیوں گیان سنگھ اور خزان سنگھ کو بطور مدد معاش دے دیا۔

بھگوان سنگھ نے اپنی بیٹی راجکوراں کو (جس کے پیٹ سے مہاراجہ کھڑک سنگھ پیدا ہوا) مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ منسوب کردیا اور سردار مہان سنگھ کو اپنا مددگار بنایا۔ چونکہ عداوت سخت درمیان وزیر سنگھ اور بھگوان سنگھ کے برپا تھی آخر وزیر سنگھ کے ہاتھ سے بھگوان سنگھ مارا گیا اور اس کا چھوٹا بھائی گیان سنگھ اس کی جگہ بیٹھا۔ اور انہی دنوں وزیر سنگھ کو دل سنگھ نے قتل کر دیا مگر دل سنگھ بھی قتل گاہ سے جانے نہ پایا' اسی دم اور اسی مقام پر اس کو وزیر سنگھ کے ساتھیوں نے قتل کر دیا۔ غرض وزیر' سنگھ اور دل سنگھ دونوں ایک ہی دن کھیت رہے۔ مہر سنگھ اور دو بیٹے وزیر سنگھ کے باقی رہے اور گیان سنگھ کے بعد خزان سنگھ اس کا چھوٹا بیٹا جانشین ہوا

اور کانھا سنگھ' گیان سنگھ بہادر نے نکہ پر فتح یاب ہو کر سب سرداران کا ملک ضبط کرلیا اور بارہ ہزار روپے کی جاگیر خزان سنگھ و کانھا سنگھ کو عطا کی اور کچھ تھوڑا علاقہ مہر سنگھ' وزیر سنگھ کے بیٹے کے لئے مقرر کیا۔ کانھا سنگھ سردار بھی مر گیا تو اس کے بیٹوں کے لئے کچھ گزارہ سرکار انگریزی سے مقرر ہوا۔

(5) **پانچویں مثل آلووالیوں کی** : موضع آلوء ضلع لاہور میں ایک شخص بھاگو نہایت مفلس و پریشان حال رہتا تھا۔ پہلے وہ اپنے ہی گاؤں میں شراب فروشی کی دکان کرتا رہا۔ جب کام نہ چلا اور تنگ دستی نے بہت ستایا تو اس نے لاہور کے حصار کے باہر کی آبادی میں شراب فروشی کی دکان جاری کی۔ مگر اس میں بھی گزارہ نہ چلا۔

آخر اس نے اپنا تمام دکان کا اسباب فروخت کر کے ایک گھوڑا خریدا اور بمقام فیض اللہ پور سردار کپور سنگھ کے پاس جاکر پاہل لی۔اور سکھ بنا اور اس کی مثل کے ہمراہ ہو کر رہزنی و غارت و تاراج میں مصروف ہوا' اور تھوڑے ہی عرصے میں ایک چھوٹی سی جماعت کا سردار ہو گیا۔ دو سال کے عرصے میں اس نے بہت سے' لوگ اپنے گاؤں اور گرد و نواح کے دیہات کے اپنے ساتھ شامل کر کے جمعیت معقول بہم پہنچائی۔ سردار کپور سنگھ فیض اللہ پوری بھی اس پر کمال مہربان تھا۔ ایک روز کپور سنگھ' بھاگ سنگھ کے گھر گیا۔ وہاں اس نے بھاگ سنگھ کی بہن کو جو بیوہ تھی دیکھا کہ پاہل لے کر سکھنی ہوئی اور رباب لے کر گورو کی بانیاں گا رہی ہے۔ کپور سنگھ کو اس کی آواز بہت بھلی معلوم ہوئی۔ اس پر مہربان ہو کر پہلے تو اس کو کچھ نقد روپیہ انعام دیا اور پھر اس کے بیٹے جسا سنگھ کو اپنی پرورش میں لے لیا اور تھوڑے عرصے میں اپنی ریاست میں اس کو صاحب اختیار کردیا۔ یہاں تک کہ بھاگ سنگھ اس کے ماموں سے بھی اس کا رتبہ بڑھ گیا۔

آخر جب بھاگ سنگھ مر گیا اور اس کا کوئی صلبی بیٹا وارث نہ رہا تو جسا سنگھ ہی اس کا وارث قرار پایا اور کل جائیداد اندوختہ بھاگ سنگھ کی جسا سنگھ کو ہی مل گئی۔ چونکہ جسا سنگھ نہایت دانا آدمی تھا' کمال ہوشیاری و لیاقت کے سبب سے نواب آدینہ بیگ خاں ناظم و حاکم دوآبہ بست جالندھر کا مقرب و مصاحب بن گیا اور جب تک آدینہ بیگ خاں زندہ رہا۔ اس کی مصاحبت میں رہ کر بڑی عزت پائی جب آدینہ بیگ خاں مر گیا اور سکھوں نے ملک گیری شروع کی تو جسا سنگھ نے اول سرہند کی طرف کچھ فتوحات حاصل کیں اور شہر فتح آباد وغیرہ پر قبضہ کرلیا۔ پھر ایک چھوٹی سی لڑائی میں کپور تھلہ کا کچھ علاقہ اپنے ماتحت کرلیا۔ حتی کہ دولت' لشکر' فوج' خزانہ' ملک ہر ایک چیز اس کے پاس موجود ہو گئی۔

ایک مرتبہ احمد شاہ درانی جب ولایت کابل کو واپس جاتا تھا اور دو ہزار دو سو عورت ہندو ہندوستان کے ملک سے پکڑ کر اپنے ہمراہ قید کئے ہوئے لیے جا رہے تھا۔ یہ بات سکھوں کو ناگوار گزری مگر کسی کو یہ حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ بادشاہ کے پنجے سے ان قیدیوں کو چھڑا لائے۔ اس وقت جسا سنگھ نے جواں مردی کی اور احمد شاہ کی فوج پر اپنی جمعیت کے ساتھ رات کو جا پڑا اور تمام عورتوں کو چھڑا کر لے آیا اور ہر ایک کو خرچ دے کر ان کے گھروں میں پہنچا دیا جس

سے اس کی تمام پنجاب میں ناموری ہوگئی جب سردار جسا سنگھ مر گیا تو اس کا صلبی بیٹا وارث ریاست کا کوئی نہ رہا۔ صرف مہر سنگھ و بھاگ سنگھ رشتہ دار رہ گئے۔ ان میں سے سردار جے سنگھ کنہیا کی تجویز سے بھاگ سنگھ گدی نشین ہوا۔ یہ شخص بھی نہایت دانا اور جواں مرد تھا۔ جب اس نے بھی عالم فانی سے سفر کیا تو اس کی جگہ سردار فتح سنگھ جانشین ہوا۔ اس نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ دوستی پیدا کی اور ایک ایک مہم میں اس کا حامی و مددگار رہا۔ کبھی نافرمانی نہ کی۔ فتوحات ملک پنجاب' جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کو نصیب ہوئیں' سردار فتح سنگھ نے اس میں کمال جاں فشانیاں کیں۔

جب دریائے ستلج کو پنجاب اور انگریزی علاقہ کے درمیان حد فاصل بنایا گیا تو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی نیت اس کی طرف سے بھی بدل گئی اور چاہا کہ اس کو بھی اس علاقے سے بے دخل کر دیا جائے مگر اس کو وقت پر خبر ہوگئی اور کپور تھلہ سے صاحبان انگریزی کے علاقے میں چلا گیا۔ چونکہ وہ انگریزی عمل داری میں بھی جمی پانچ لاکھ کا موجود تھا لہٰذا گورنر جنرل کے یہاں سے ایک خط مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام جاری ہوا کہ چونکہ علاقہ سردار فتح سنگھ آلووالیہ کا سرکار انگریزی علاقہ تصور کیا گیا ہے۔ مہاراجہ صاحب بہادر والی پنجاب کو اختیار نہ ہوگا کہ وہ اس کے علاقے واقع دوآبہ جالندھر پر بھی دست اندازی کرے اور کوئی امر ایسا وقوع میں نہ لائیں جس سے دوستان محبت کیش کی دل شکنی ہو۔

یہ واقعہ 1826ء عیسوی میں گزرا۔ اس کے بعد سردار فتح سنگھ اپنی ریاست کپور تھلہ میں آ گیا۔ سردار فتح سنگھ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نہال سنگھ جانشین ہوا۔ اس سردار نے بڑی بڑی عمارتیں کپور تھلہ میں بنوائیں۔ اس کے وقت میں سکھوں اور انگریزوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ اگرچہ اس کا ارادہ مصمم تھا کہ کپور تھلہ کو چھوڑ کر ستلج پار کے ملک میں چلا جائے لیکن سکھ فوج نے جلوخانہ سردار کو گھیر لیا اور کہا کہ سردار کو سکھوں کی ہمراہی سے غلام محمد وزیر باز رکھتا ہے' وزیر کو ہم ضرور قتل کر ڈالیں گے۔ اگر سردار ان کی حمایت کرے گا تو اس کے بھی ہم دشمن ہیں لہٰذا اس نے وزیر کو رخصت کیا۔ وزیر غلام محمد المتخلص بہ غلامی بہت اچھا شاعر و عالم و فاضل و صاحب تدبیر مشیر تھا۔ اگرچہ داہنا ہاتھ اس کا بیکار تھا مگر وہ بائیں ہاتھ سے ایسا خوش خط لکھتا تھا کہ اپنا ثانی خوش خطی میں نہیں رکھتا تھا۔

جب وزیر کو سردار نے حسرت کے ساتھ رخصت کیا تو وہ برہنہ تلوار بائیں ہاتھ میں لے کر میدان میں تنہا آیا اور سکھوں کو آواز دی کہ میں ایک ہاتھ کا مالک ہوں' ایک ایک شخص میرے ساتھ لڑنے کے لئے آجائے۔ یہ سن کر ایک جوان سکھ اکال اکال کرتا ہوا اس پر آپڑا مگر وزیر نے ایک ہی تلوار کے وار سے اس کا کام تمام کیا۔ اسی طرح چند سکھوں کا کام وزیر نے جب تمام کیا تو سکھوں نے مل کر بندوقیں اس پر جھونک دیں اور شہید کر دیا۔

اس کو قتل کر کے فوج کا بلوہ موقوف ہوا۔ جب انگریز فتح یاب ہوئے اور سکھ میدان سے بھاگ کر اپنے اپنے گھروں میں آگئے اور دریائے ستلج پار کا کل علاقہ' جو اس ریاست کے

متصل تھا' ضبط کرلیا گیا۔ صرف وہ علاقہ جو دوآبہ بست جالندھر میں واقع تھا' باقی رہ گیا اور پانچ لاکھ کا علاقہ' جو دوآبہ بست جالندھر میں باقی رہ گیا تھا اس میں سے ایک لاکھ بتیس ہزار روپیہ نقد سالانہ رئیس کی طرف سے سرکار انگریزی کو نقد دینا قرار پایا۔

جب راجہ نہال سنگھ فوت ہوا تو اس کا بڑا بیٹا مہاراجہ رندھیر سنگھ جانشین ہوا۔ یہ شخص انگریزوں کا کمال خیر خواہ تھا۔ 1857ء میں جب فوج انگریزی بگڑ گئی اور ہندوستان میں سخت فساد برپا ہوا اور ہزاروں انگریزوں کو قتل کر ڈالا تو اس وقت رندھیر سنگھ نے اپنی فوج کے سمیت خدمت میں حاضر ہو اور بڑے بڑے کام کئے جس کے عوض سرکار انگریزی نے اس کو لکھنؤ میں ایک لاکھ روپے سالانہ کی زمینداری نصف جمع پر بہ صیغہ استمراری عطا فرمائی اور پچیس ہزار روپیہ سالانہ زرباج مقررہ سے کم کیا گیا اور ایک لاکھ بتیس ہزار روپیہ ایک سال کا' جو بہ ذمہ ریاست واجب الادا تھا۔ بالکل معاف ہوا اور دس ہزار روپے کا خلعت بر سر دربار بہ کمال عزت و احترام گورنر جنرل بہادر نے رئیس کو مرحمت کیا۔ علاوہ اس کے جاگیر جبھی پچیس ہزار روپیہ سالانہ اسی راجہ نہال سنگھ' جو علاقہ دوآبہ باری میں اس کے حین حیات تک واگزار تھی اور بعد وفات 1852ء سے ضبط ہوچکی تھی' وہ بھی دوبارہ بنام راجہ رندھیر سنگھ واگزار و معاف ہوئی اور مہاراجہ کا خطاب ملا۔ 1869ء میں مہاراجہ رندھیر سنگھ بہ عزم سیر ولایت انگلینڈ جہاز میں بیٹھ کر روانہ ہوا۔ جب جہاز شہر عدن تک پہنچا' مہاراجہ بیمار ہو کر مر گیا۔ اس کے مرنے کے بعد راجہ کھڑک سنگھ اس کا بڑا بیٹا جانشین ہوا۔

(6) چھٹی مثل ڈلی والے سکھوں کی : بانی اس مثل کا گلابا کھتری تھا جو موضع ڈلی والی میں دکان کرتا تھا۔ ایک رات اس کی دکان چوروں نے لوٹ لی اور یہ مفلس محض رہ گیا تو اس نے چاہا کہ دوبارہ کچھ روپیہ بہم پہنچا کر دکان جاری کرے مگر روپیہ اس کو کہیں سے نہ ملا آخر پاہل لے کر سکھ بن گیا اور غارت و رہزنی پر کمر باندھ لی۔ دس بیس آدمی خانہ بدوش بھی شامل ہوگئے اور نزدیک نزدیک کے گاؤں پر اس نے دست اندازی شروع کی۔ چونکہ موضع مسکن اس کا ڈیرہ بابا نانک کے قریب اور دریائے راوی کے کنارے پر واقع ہے اور موضع بوڑاڈلا بھی اس کو کہتے ہیں' دیہات قرب و جوار کے زمیندار اس کی دست اندازی سے تنگ آگئے اور سب نے مل کر بابا نانک کے ذریعے جا کر وہاں کے مسند نشین کے پاس اس کی فریاد کی۔ اس نے اس کو روبرو بلایا اور ممانعت کی کہ اگر تم سکھ ہوتے ہو اور غارت پر کمر باندھی ہے تو اپنے ہمسایوں کو مت لوٹو' دور دور کے علاقوں میں تمہارا اختیار ہے۔ چنانچہ گلاب سنگھ عرف گلابا نے دور دور کے ملکوں میں گردش و غارت شروع کی اور پانچ چار برس میں اچھی خاصی جمعیت بہم پہنچائی۔ جب مر گیا تو کوئی صلبی بیٹا اس کا موجود نہ تھا' اس لئے ایک شخص تارا سنگھ جس کا خطاب غیبہ تھا جانشین ہوا چونکہ غیبہ پنجابی میں ایسے آدمی کو کہتے ہیں جو بے سمجھے سوچے باتیں منہ سے نکالے اور ہر وقت بک بک کرتا رہے' اس سردار کو بھی اس صفت سے موصوف دیکھ کر اس کا خطاب غیبہ مقرر کر دیا گیا۔ یہ خطاب اس کا ایام مفلسی سے تھا۔

جب سرداران بھنگی نے قصور پر یورش کی اور حسین خاں قصور کا حاکم مارا گیا اور قصور غارت ہوا تو یہ بھی گلاب سنگھ کے ہمراہ تھا۔ اس کو قصور سے بڑا مال حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ علاوہ مال نقد کے چار لاکھ روپے کا تو زیور اس کو ملا۔ اس لئے اس نے اپنی مثل علیحدہ قائم کرلی اور اپنے خویش و اقربا اس نے سب سکھ بنا کر اپنے ساتھ شامل کرلئے مگر گوہر داس چودھری موضع گنگ کو' جو ایک موضع غربی کنارے دریائے ستلج کے واقع ہے' اپنے ساتھ مل کر سکھ بنالیا۔

جب گوہر داس سکھ بن کر گوہر سنگھ ہوا تو اس کے ساتھ اس تمام گاؤں بھی سکھ ہو گیا اور سب نے تارا سنگھ کی رفاقت پر کمر باندھ لی اور تارا سنگھ کی مثل میں دس ہزار سوار تھے۔ جب سکھوں نے سرہند کو لوٹا اور ایسے بڑے شہر کو جو بعد بربادی بندا بیراگی کے دوبارہ آباد ہو گیا تھا' بیخ سے اکھاڑ دیا تو وہاں سے بھی اس نے بڑا خزانہ پایا۔ جب وہاں سے لوٹ کر آیا تو بہت علاقے فتح آباد وغیرہ پر قابض و متصرف ہو گیا۔ پھر تو حاکم باستقلال و فرمان فرمائے خودمختار بن گیا۔ مدت تک حکومت کرتا رہا۔ سات ہزار سوار اس نے اور ملازم رکھے۔ آخر جب نیر اقبال مہاراجہ رنجیت سنگھ کا چمکا تو مہاراجہ رنجیت سنگھ نے سردار فتح سنگھ آلو والیہ کے نام حکم جاری کیا کہ تارا سنگھ غیبہ کو مغلوب کر کے اس کا ملک شامل ممالک محروسہ کے کرے۔

چنانچہ سردار فتح سنگھ نے اپنی فوج اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج کے ساتھ اس پر یورش کی مگر غیبہ ڈر گیا اور مقابلے سے بھاگ نکلا اور کل علاقہ اس کا مہاراجہ رنجیت سنگھ کی قلم رو میں داخل ہوا۔ چند ماہ کے بعد وہ اسی غم و غصہ میں مر گیا اور اس کے بیٹے' سندھا سنگھ و چندا سنگھ' مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خدمت میں آئے۔ مہاراجہ نے چند گاؤں ان کے گزارے کے لئے مقرر کر دیئے' مگر چند ماہ کے بعد بابا بکرم سنگھ بیدی نے دو گاؤں ان کی جاگیری کے بھی ضبط کر لئے اور مہاراجہ نے خاموشی اختیار کی اور اس مثل کی دولت مندی بہ اختتام پہنچی۔

(7) ساتویں مثل نشان والے سکھوں کی : اس مثل کے بانی سنگت سنگھ اور مہر سنگھ قوم جاٹ تھے۔ جنہوں نے دریائے ستلج کے علاقے میں قتل و غارت کا بازار گرم کر کے وسعت و دولت بہم پہنچائی۔ دس ہزار سوار کا مجمع اس مثل میں تھا اور بہت دور دور تک وہ ڈاکہ زنی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ شہر میرٹھ پر جا پڑے اور بڑی دولت لوٹ کر لائے۔ شہر انبالہ ان کا دارالحکومت تھا۔ چونکہ وہ اپنی مثل میں ایک اونچا نشان موجود رکھتے تھے۔ اس لئے تمام سکھ ان کو نشان والا کہتے تھے۔ ان دونوں میں سے پہلے سنگت سنگھ مر گیا اور کل ریاست مہر سنگھ کے قبضے میں رہی' پھر وہ بھی لاولد مر گیا۔ رئیس انبالہ کی وفات کی خبر سن کر مہاراجہ نے دیوان محکم چند کو مامور کیا کہ فی الفور انبالہ جاکر اپنا قبضہ کرلے۔ جب دیوان محکم چند کا لشکر انبالہ میں پہنچا' خفیف مقابلے کے بعد اس مثل کے سوار متفرق ہوگئے اور بڑا بھاری خزانہ و اسباب برسوں کا جمع کیا ہوا مہاراجہ رنجیت سنگھ کے قبضے میں آیا۔ بعد ازاں جب سرکاری انگریزی و مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درمیان حدود کا فیصلہ ہوکر دریائے ستلج حد قائم ہوگئی تو مہاراجہ کا اختیار ستلج پار کے کل

علاقوں سے جاتا رہا اور اس مثل کا قبضہ انگریزوں نے لے لیا۔

(8) آٹھویں مثل فیض اللہ پوریوں سکھوں کی : فیض اللہ پور ایک قصبہ سرزمین دوآبہ جالندھر میں واقع ہے۔ آج کل اس کو سنگھ پوری کہتے ہیں۔ اس گاؤں کے ایک شخص کپور چند نے پاہل لی اور سکھ بنا۔ غارت و رہزنی سے بہت سی دولت و حشمت بہم پہنچائی اور اپنے آپ کو نواب کے خطاب سے مخاطب کیا اور تمام زمانے میں نواب کپور سنگھ مشہور ہو گیا۔ تمام سکھ اس کو اپنا پیشوا تصور کرتے اور جو شخص اس کے ہاتھ سے پاہل لے کر سکھ بنتا وہ فخر کرتا کہ وہ میں وہ سکھ ہوں جس نے نواب کپور سنگھ سے پاہل لی ہے۔ ہزاروں جاٹ' ترکھان' بھنگی' کھتری' اروڑے اس نے سکھ کر ڈالے۔ اس کے سکھ بڑے بڑے دولت مند ہو کر والیاں ملک و صاحب دولت و حشمت ہو گئے۔ اس کا قول تھا کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے پانچ سو مسلمانوں کو قتل کیا ہے۔ یہ عمل میری نجات کا موجب ہو گا کہ میں نے گورو گوبند سنگھ کے حکم کی پوری پوری تعمیل کی ہے۔ اس کی مثل میں دو ہزار پانچ سو سوار حاضر رہا کرتے تھے۔ دریائے ستلج سے اتر کر شہر دہلی تک یہ ملک کو لوٹنے جاتا تھا۔ کسی کو اس کے ساتھ مقابلے کی طاقت نہ تھی۔ اس کے گاؤں کا نام فیض اللہ پور تھا۔ آخر اس نے گاؤں کا نام سنگھ پوری رکھا اور حکم دیا کہ آئندہ اس گاؤں کو کوئی فیض اللہ پور نہ کہے ورنہ قتل ہو گا۔ اس کی ریاست کا بہت سا علاقہ ستلج کے دونوں طرف تھا جس میں یہ بہت برس تک حکومت کرتا رہا۔

جب کپور سنگھ مر گیا تو خوشحال سنگھ قابض ہوا' پھر رنجیت سنگھ نے اس مثل کا علاقہ بھی قبض کر لیا۔ مگر بعد تقررِ حد فاصل کے' جس قدر مشرقی کنارے دریائے ستلج کے اس مثل کی ریاست تھی وہ صاحبان انگریزی نے واگزار کر دی۔

(9) نویں مثل کروڑی سکھوں کی : اس مثل کا بانی کروڑا سنگھ تھا۔ جس کا نام پہلے کروڑی مل تھا۔ جب اس نے پاہل لی اور سکھ بنا تو کروڑا سنگھ مشہور ہوا۔ سکھ ہو کر غارت گری و رہزنی بہت کی' ثروت و دولت بہم پہنچائی' ہزاروں گورو کے سکھ اس کے ساتھ شامل ہو کر رہزنی کرنے لگے۔ جب وہ مر گیا تو بگھیل سنگھ اس کی جگہ اس مثل کا سردار بنا۔ یہاں تک کہ بارہ ہزار سوار اس میں جمع ہو گئے اور بہت سا ملک ستلج دریا کے پار ان کے تصرف میں آ گیا۔ تھوڑا علاقہ دوآبہ بست جالندھر کا بھی اس مثل کے ماتحت تھا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پہلے ان کا تمام علاقہ اپنے تصرف میں کر لیا تھا' پھر بعد حدود بندی کے دریائے ستلج کے پار کے علاقہ وگزار ہو گیا۔ جس پر بگھیل سنگھ کی اولاد کسی قدر قابض و متصرف رہی۔

(10) دسویں مثل شہید بنگیوں کی : اس کے بانی مبانی گورو بخش سنگھ و کرم سنگھ تھے۔ اضلاع مشرقی دریائے ستلج پر ان کا قبضہ تھا۔ دو ہزار سوار ان کے ماتحت تھے۔ چونکہ ان کے بزرگ بمقام دمدمہ' (جو جنوب کی طرف پٹیالہ کے واقع ہے) مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے تھے' لہٰذا ان کا نام شہید بنگیوں کی مثل رکھا گیا۔

(11) گیارہویں مثل پھلکیوں کی : اس مثل کا بانی پھول قوم جاٹ گوت برار سندھو تھا۔ اس نے سلطنت چغتائی کے ضعف کے وقت اپنی دولت و حشمت کی ترقی میں کوشش بہت کی اور زمینداری حاصل کر کے بڑا عزت دار بن گیا' اور موضع پھول' (علاقہ نابھہ) اس نے آباد کر کے اپنے نام پر اس کا نام پھل رکھا۔ پھول کے چھ بیٹے تھے۔ تلوکا' راما' کتھوا' چندو' جستو' تخت مل' پھر راما کی اولاد میں سے پانچ بیٹے ہوئے۔ آلا سنگھ' دونا سنگھ' بخت مل' سوبھا سنگھ' لدھا سنگھ۔ ان میں سے آلا سنگھ نے سکھ ہو کر بہت ترقی کی اور دولت بے شمار بہم پہنچائی۔ ریاست کی بنیاد بھی اسی نے رکھی اور بہت سا ملک بزور شمشیر اپنے تصرف میں لے آیا۔ رئیس مالیر کوٹلہ پر بھی اس نے چڑھائی کی اور بڑے بڑے معرکوں کے بعد اس کو زیر کیا۔ شہر پٹیالہ کو بھی اس نے آباد کیا۔ 1818ء بکرمی میں جب احمد شاہ درانی نے ہند پر حملہ کیا تو اس علاقے میں آخر اول اس نے قلعہ پر نالہ کو لوٹا' پھر پٹیالہ کی طرف متوجہ ہوا۔ آلا سنگھ نے جانا کہ اب بادشاہ سے مقابلہ کرنا مشکل ہے' اطاعت کے ذریعے وقت گزار لینا چاہئے۔ چنانچہ فی الفور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور لشکر سلطانی کو اپنے علاقے سے رسد پہنچائی۔ چار لاکھ روپیہ نقد بادشاہ کو دے کر اپنے علاقے کو افغانوں کی غارت و قتل سے بچایا۔ احمد شاہ اس پر کمال مہربان ہوا اور خلعت فاخرہ دے کر راجگی کا خطاب بخشا اور شاہی سند لکھ دی۔ جب احمد شاہ چلا گیا تو آلا سنگھ نے سرہند پر حملہ کیا۔ اس شہر کی غارت سے اس کو بے انتہا دولت ملی اور سرہند کا علاقہ اس کے قبضہ و تصرف میں آ گیا۔

آلا سنگھ مرا تو سردول سنگھ اور سردول سنگھ کے بعد امر سنگھ جانشین ہوا۔ امر سنگھ نے قلعہ بٹھنڈہ فتح کر کے اپنے علاقے میں شامل کیا۔ جب وہ مر گیا تو اس کے بیٹے صاحب سنگھ نے ریاست پائی۔ اس کے دور میں ریاست پٹیالہ و نابھہ و جنید و مالیر کوٹلہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی زبردستی سے تنگ آ گئیں' اس لئے اس کے راجوں نے انگریزی حمایت حاصل کی اور مہاراجہ رنجیت سنگھ اس سے دست بردار ہو گیا۔ صاحب سنگھ کی وفات کے بعد مہاراجہ کرم سنگھ گدی نشین ہوا۔ اس کی وفات کے بعد مہاراجہ مہندر سنگھ مالک ریاست ہوا۔ یہ مہاراجہ باپ کے مرنے کے بعد نابالغ رہ گیا تھا۔ مگر یہ ذمہ داری اہلکاران نمک حلال کے انتظام ریاست کا بہ خوبی رہا۔ جب وہ بالغ ہوا تو اس نے بھی بہ وزارت خلیفہ سید محمد حسین کے خوب انتظام ریاست کا رکھا۔ 1876ء مہاراجہ عین جوانی کی عمر میں انتقال کر گیا اور بڑا بیٹا خرد سال مہاراجہ چندر سنگھ گدی نشین ہوا۔

جن دنوں سرکار نے گورکھوں پر یورش کی اور چاہا کہ ان کے لشکر کو کوہستان مابین پر دو دریائے ستلج و جمنا سے نکال دیں اور وہاں کے قدیمی راجوں و مسند نشینوں کو دوبارہ ریاستوں کا مالک و فرمانروا بنائیں تو اس وقت بھی پٹیالے کے رئیس نے لشکر و فوج سے کامل امداد سرکار انگریزی کو دی اور تا اختتام مہم گورکھیہ سرگرم امداد رہا' اور جزو علاقہ کیوتھل و بگھاٹ جمعی پینتیس ہزار روپیہ سالانہ بہ عوض مبلغ دو لاکھ اسی ہزار روپے کے اس نے انگریزوں سے خرید

لیا۔ پھر 1830ء میں انگریزی پہاڑی علاقہ شملہ کا اس رئیسؒ سے لے کر پرگنہ ترولی کا علاقہ اس کو دیا۔ جب انگریزوں کی سکھوں کے ساتھ جنگ ہوئی تو باوجود ہم مذہبی و ہم قومی کے یہ رئیس وفادار دوست سرکار انگریزی کا بنا رہا اور سرکار انگریزی نے تمام دعاوی خراج و مال گزاری و خرچہ فوج وغیرہ' جو اس رئیس کو سالانہ روپیہ دینا پڑا تھا' تمام و کمال معاف واگزار کیا۔ بلکہ ملک منضبط دس ہزار روپیہ سالانہ دوام کے لئے اس رئیس کو دیا' جس کے عوض میں یہ رئیس 1857ء میں انگریزوں کا مددگار رہا۔ اس کی فوج دہلی گئی اور دہلی کے راستے میں انتظام ڈاک کا قائم رکھا۔ گوالیار اور دھولپور میں بھی اس رئیس کی فوج نے خدمتیں کیں۔ زرنقد سے بھی یہ رئیس مددگار گورنمنٹ ہند کا رہا۔ جب بندوبست سرکار انگریزی کا دوبارہ ہندوستان میں ہو گیا تو سوائے اور انعامات کے پرگنہ نارنول علاقہ جھجر جمعی دو لاکھ روپیہ سالانہ اور حکومت علاقہ بھدور کی اس مہاراجہ کو ملی۔ بعد ازاں دو علاقے ایک جزو علاقہ پرگنہ کنود واقع علاقہ جھجر' دو متعلقہ گاؤں اس مہاراجہ کے ہاتھ بہ عوض اس زرنقد کے جو گورنمنٹ ہند نے قرضہ اصل و سود دینا تھا۔ اس رئیس کے ہاتھ فروخت کر ڈالے۔ غرض یہ ریاست' پنجاب کی ریاستوں میں قائم رہی۔

دوسری لڑی اولاد پھول کی ریاست نابھہ تھی مگر اس کی شاخ علیحدہ ہے۔ وہ اس طرح کہ پھول کا بڑا بیٹا تلوکا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا گوردت سنگھ' صاحب دولت و اقبال ہوا۔ اس نے آلا سنگھ (برادر چچا زاد) کے ساتھ مل کر ایک بڑا علاقہ اپنے زیر حکومت کر لیا۔ اس کے مرنے کے بعد صورت سنگھ اس کا بیٹا جانشین ہوا۔ صورت سنگھ کے بعد ہمیر سنگھ مالک بنا۔ ہمیر سنگھ نے نابھہ کی آبادی کی بنیاد رکھی۔ قلعہ بھی پختہ بنوایا۔ اس کے مرنے کے بعد جسونت سنگھ رئیس بنا۔ اس کے وقت صاحب سنگھ والی پٹیالہ اور اس کے درمیان ایک قطعہ زمین پر' جو اس نے مسمات نور النساء رائے الیاس کی عورت سے خریدی تھی' تنازعہ برپا ہوا چونکہ رنجیت سنگھ خاندان ریاست جنید کا دوہتا تھا' جسونت سنگھ نے اپنا حامی سمجھ کر اس کو بلایا۔ مہاراجہ پٹیالہ کا وکیل بھی رنجیت سنگھ کے پاس پہنچا۔ اس کی طلبی کے بہ موجب مہاراجہ رنجیت سنگھ فی الفور وہاں جا پہنچا اور زمین متنازعہ والی جنید کو دے کر لاہور کو چلا آیا۔ جسونت سنگھ کے بعد راجہ دیوندر سنگھ نے راج پایا۔ اس کے وقت معرکہ فوج سکھی کا صاحبان انگریز کے ساتھ وقوع میں آیا۔ اس ریاست کے رئیس نے انگریزوں کی اطاعت ترک کی اور سکھوں کا ساتھ دیا۔

جب انگریز فتح یاب ہوئے تو دیوندر سنگھ کو انگریزوں نے معزول کر کے تاحین حیات لاہور میں نظر بند کر دیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا جانشین ہوا۔ چنانچہ اس نے بہ حالت نظر بندی لاہور میں وفات پائی۔ پچاس ہزار روپیہ سالانہ اس کا ذاتی خرچ ریاست کے خزانے سے ملتا رہا۔ نیز چہارم حصہ ریاست کا سرکار انگریزی نے ضبط کر لیا اس ریاست نے سرکار انگریزی کو اپنی جاں فشانی سے کمال خوش کیا۔ جس کے عوض انگریزی سرکاری نے علاقہ کانٹی ملک منضبط نواب والی جھجر میں سے جمعی ایک لاکھ چھ ہزار روپیہ سالانہ اس رئیس کو مرحمت کیا۔ 1870ء میں راجہ بھرپور سنگھ لاولد مر گیا تو گورنمنٹ نے مہاراجہ پٹیالہ اور جنید کو اختیار دیا کہ وہ جس کو حق دار

تصور کریں مسند نشینی کے لئے تجویز کریں ان دونوں نے راجہ ہیرا سنگھ کو مسند نشین کرنا تجویز کیا اور گورنمنٹ نے اس کو گدی نشین کیا۔

تیسری ریاست جنید کا حکمران پھول زمیندار کی اولاد سے تھا۔ اس کا بڑا تلوکا کا بیٹا نین سنگھ ہوا۔ اس نے موضع "بالا والی" آباد کیا اور ریاست کی بنیاد رکھی۔ جب وہ مرگیا تو سردار گجپت سنگھ اس کا بیٹا صاحب ریاست بنا۔ اس نے بہت سا علاقہ فتح کر کے قصبہ گوہانہ میں سکونت اختیار کی۔ اس کے تین بیٹے مہر سنگھ' بھوپ سنگھ' بھاگ سنگھ تھے اور ایک دختر مسمات راج کور تھی۔ راج کور' سردار مہان سنگھ رئیس گوجرانوالہ (مہاراجہ رنجیت سنگھ کے باپ) کے ساتھ بیاہی گئی جس کے پیٹ سے مہاراجہ رنجیت سنگھ پیدا ہوا۔ گجپت سنگھ کے تینوں بیٹوں نے الگ الگ ریاست قائم کی۔ مہر سنگھ مالک ریاست کنہ کا ہوا۔ اس کے بعد ہری سنگھ اور ہری سنگھ کے بعد مسمات دیاکور جانشین ہوتے رہے۔ جب دیاکور زوجہ ہری سنگھ بھی لاولد مرگئی تو وہ ریاست سرکار انگریزی کی ضبطی میں آئی۔ بھوپ سنگھ نے اپنا قبضہ بارندہ پور کی ریاست پر کیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے دو بیٹے بساوا سنگھ و کرم سنگھ وارث ہوئے۔ سروپ سنگھ (کرم سنگھ کے بیٹے) نے آخر ریاست جنید کی پائی۔ گجپت سنگھ کا بیٹا بھاگ سنگھ باپ کے مرنے کے بعد رئیس ریاست جنید ولودھیانہ کا بنا۔ اس راجہ نے جنگ آزادی میں سرکار انگریزی کا ساتھ دیا۔

جب دہلی فتح ہوئی اور مرہٹہ فوج شکست کھا کر بھاگ گئی تو اس وقت بھی یہ رئیس لارڈ لیک صاحب کی خدمت میں حاضر تھا اور جب لارڈ لیک مہاراجہ جسونت راؤ ہولکر کے تعاقب میں دریائے ستلج تک آیا' تب بھی یہ رئیس اس کے ہم رکاب تھا۔ لارڈ لیک صاحب نے اس کی خدمات سے خوش ہوکر علاقہ فرید پور واقع ضلع پانی پت جمعی ستر ہزار روپے کا بطور جاگیر تاحین حیات کو اس کو دیا جو اس کی وفات کے بعد سرکار میں ضبط ہو گیا۔ بھاگ سنگھ کے تین بیٹے پرتاب سنگھ و مہتاب سنگھ و فتح سنگھ تھے۔ مہتاب سنگھ اور پرتاب سنگھ لاولد مرگئے اور فتح سنگھ بگدی نشین ہوا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ والی لاہور نے بہ لحاظ رشتہ داری کے کہ فتح سنگھ اس کا ماموں زاد بھائی تھا' کچھ جاگیر تاحین حیات اس کو دی جو اس کی زندگی تک واگزار رہی۔ فتح سنگھ کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سنگت سنگھ جانشین ہوا۔ مگر وہ لاولد مرگیا' اس لئے اس کا سارا علاقہ انگریزوں نے ضبط کرلیا۔

راجہ سروپ سنگھ بن کرم سنگھ بن بھوپ سنگھ بن گجپت سنگھ نے دعوی حصول اس ریاست کا نواب گورنر جنرل بہادر کے حضور میں کیا۔ چنانچہ علاقہ سفیدون و جیند و سنگروڑ بالا والی واگزار کر دیا اور اس طرح ریاست جنید دوبارہ بحالی ہوئی۔ پھر 1857ء میں راجہ جنید اول شخص تھا۔ جس کی فوج بطور پیش گارڈ یعنی فوج مقدم کے انگریزی لشکر کے آگے آگے کوچ کرتی ہوئی جاتی تھی اور انگریزی لشکر کے ہمراہ عین معرکہ جنگ میں بھی اس کی فوج حاضر و شامل رہی' بلکہ کسی قدر فوج س کی شہر کے حملے کے وقت بھی ہم رکاب تھی۔

ان خدمات کے عوض سرکار انگریزی نے ایک لاکھ سولہ ہزار آٹھ سو تیرہ روپے کا اور

علاقہ پرگنہ دادری میں اس کو مرحمت کیا اور تحصیل کنور ضلع جھجر کا کچھ علاقہ بھی اس کے پاس فروخت کر ڈالا۔ بعد میں رگھبیر سنگھ اس ریاست کا مالک ہوا۔

(12) بارہویں مثل سکر چکیوں سکھوں کی : اس مثل کی بنیاد سردار چڑت سنگھ نے قائم کی اور وہی سردار بنا۔ اس کے پاس دو ہزار پانچ سو سوار تھے۔ دوآبہ رچناب و بچ و سندھ ساگر میں انہوں نے بڑے بڑے ڈاکے مارے اور شہروں و قصبوں کو لوٹا۔ چونکہ سردار چڑت سنگھ موضع سکر چک میں رہتا تھا' اس لئے اس مثل کا نام' سکر چکیہ' مشہور تھا۔ اس کے باپ کا نام نودھا' قوم جاٹ' گوت سانسی تھا جو نہایت ناداری و افلاس کی حالت میں وقت گزارتا تھا۔ اس نے چاہا کہ سکھ بن کر آسودہ حال ہو مگر اس کے باپ ویسو کو منظور نہ تھا کہ نودھا سکھ ہو کر چوٹی کٹوائے اور زنار توڑے۔ اس نے نودھا کو سمجھایا کہ ایک چاہ اور اس کے متعلقہ زمین کا تیسرا حصہ اور دو بیل میرے پاس ہیں' وہ تو لے لے اور زمینداری کر کے اپنا گزارہ کر۔ سکھ ہو کر آخر تو بھی اور سکھوں کی طرح غارت گری پر کمر باندھے گا اور زمانے کو لوٹے گا' یہ کام اچھا نہیں ہے۔ مگر یہ باز نہ آیا اور پاہل کے کر سکھ بنا۔ چند روز کے بعد ویسو مرگیا اور اس کی جائیداد پر نودھا قابض ہوا' لیکن شادی کے لئے غریب جان کر اس کو کوئی لڑکی نہیں دیتا تھا۔ آخر گلاب سنگھ زمیندار ساکن مجیٹھ نے اپنی دختر کی شادی اس کے ساتھ کردی۔ شادی کے بعد نودھا سنگھ نے زمینداری کا کام بالکل چھوڑ دیا اور بیل دہل و زمین ورثہ پدری فروخت کر کے گھوڑا و تلوار ڈھال وغیرہ خرید لئے۔ پھر نواب کپور سنگھ فیض اللہ پوریہ کی مثل میں جاکر شامل ہوا۔ 1758ء میں جب نودھا سنگھ روہی کے ملک کی طرف فیض الہ پوریوں کی مثل کے ساتھ گیا اور قتل ہوا۔ اس کے بعد چڑت سنگھ اس کا بیٹا وارث ہوا۔

بعض مورخوں کا یہ قول ہے کہ نودھا غارت گری میں نہیں مارا گیا بلکہ اسے اپنی عورت مسمات مالاں کے ساتھ' جو بدصورت تھی' رغبت نہ تھی اور وہ اپنی خوبصورت سالی سے محبت بلکہ عشق رکھتا تھا۔ جب یہ راز فاش ہوا تو لالاں کے بھائیوں نے اس کو قتل کر ڈالا۔ اس کے مرنے کے بعد چڑت سنگھ دشمن داری کی وجہ سے موضع سکر چک سے اٹھ کر قصبہ راجہ سانسی میں (امرتسر سے پانچ کوس) سکونت پزیر ہوا۔ احمد شاہ درانی کے حملے کے وقت چڑت سنگھ بھی اور سکھوں کے ساتھ مدت مدید تک خانہ بدوش پھرتا رہا۔ پھر قصبہ مجیٹھ میں سکونت پذیر ہوا اور اپنے دوستوں و رفیقوں کو جمع کر کے اپنی مثل علیحدہ قرار دی اور خود افسر بن کر رہزنی میں مصروف ہوا۔

بعد ازاں جودھا سنگھ و دل سنگھ اپنے سالوں کو ساتھ لے کر گوجرانوالہ گیا اور اپنی سسرال کے گھر رہنے لگا۔ وہاں اس نے ایک کچا قلعہ بنایا اور لوٹ کے مال سے گزارہ کرتا رہا۔ ان دنوں خواجہ عبداللہ خاں' احمد شاہ ابدالی کی طرف سے صوبہ دار لاہور برائے نام تھا۔ اس لئے سکھ چاہتے تھے کہ اس کو لاہور سے نکال دیں۔ اس گروہ میں سرکردہ افسر یہی شخص تھا۔ جب وہ لاہور پر حملہ آور ہوا۔ آخر خواجہ شکست کھا کر بھاگ گیا اور سکھوں نے لاہور کو خوب لوٹا اور

بہت سی دولت حاصل کر کے گوجرانوالہ کو آیا۔

بعض مورخ لکھتے ہیں کہ نودھا سنگھ خود سکر چک سے اٹھ کر موضع راجا سانسی میں سکونت پذیر ہوا اور احمد شاہ درانی کے ڈر سے مدت تک خانہ بدوش پھرتا رہا پھر اس نے بمقام مجیٹھ جہاں اس کی سسرال تھی' سکونت اختیار کی اور سالی سے عشق کر کے اپنے سالوں کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ بعد اس کے چڑت سنگھ اس کا بیٹا اس کے تھوڑے سے ترکے کا مالک بنا اور مجیٹھ چاہتا تھا کہ گوجرانوالہ کو آئے' احمد شاہ کے آنے کی خبر ملی کہ چچا اور تمام سکھ جنگلوں میں بھاگ گئے ہیں۔ چڑت سنگھ بھی اپنے سالے گور بخش سنگھ کے ساتھ جنگل کو نکل گیا۔ جب احمد شاہ پنجاب سے چلا گیا تو یہ بھی گوجرانوالہ آیا جہاں اس کے خسر کا گھر تھا۔ وہاں اس کے ساتھ مسمیان دل سنگھ بدھ سنگھ' جو سکھوں میں بڑے جوان مرد مشہور تھے اور ان کی سواری کے گھوڑے ایک رات میں ساٹھ کوس تک راستہ طے کر لیتے تھے' اس کے ساتھ شامل ہوئے بڑھتے بڑھتے ایک سو سوار کے ساتھ ایمن آباد کو گئے۔ شاہی فوجدار چند آدمیوں کے ساتھ شہر کے باہر ان کو ملا اور حملہ کر کے اس کو قتل کر ڈالا اور شہر میں گھس کر جس قدر مال اٹھا سکے وہاں سے لوٹا۔ اچھے اچھے گھوڑے اور ہتھیار حسب پسند یہ ایمن آباد سے لے آئے اور بادشاہی اسلحہ خانہ سب لوٹ لیا۔ پھر تو یہ مثل بڑی مالدار و دلاور مشہور ہوگئی۔ ہر روز لوگ چڑت سنگھ کے پاس آتے اور ساتھ دینے کی درخواست کرتے مگر یہ کہتا کہ ہم سوائے سکھ کے کسی دوسرے کو شامل نہیں کریں گے۔ چنانچہ جو کوئی اس کے پاس آتا' پہلے یہ اپنے ہاتھ سے اس کو پاہل دے کر سکھ بناتا۔ جب بال اس کے بڑھ جاتے اور سکھوں کی سی شکل بن جاتی تو اس کو شامل کرتا۔ چنانچہ ایک سال میں بارہ سو سوار ہوگئے پھر لاہور آکر خواجہ عبداللہ صوبہ لاہور کی ساتھ جنگ کی اور لاہور سے مال لوٹ کر لے گیا۔ جب لاہور سے واپس ہوا تو گور بخش کے شہر وزیر آباد کو بھی لوٹا اور ملازمان شاہی کو وہاں سے نکال دیا اور یہ شہر گور بخش سنگھ کو بخش دیا۔ پھر احمد آباد کو گیا وہاں سے شاہی ملازم بھاگ گئے اور اس نے شہر کو خوب لوٹا۔ پھر وہ قصبہ بطور جاگیر دل سنگھ کو بخش دیا۔ پھر چڑت سنگھ اپنی فوج لے کر قلعہ رہتاس پر حملہ آور ہوا' قلعدار نور الدین خاں ہار کر میدان سے بھاگ گیا اور شہر کو لوٹ کر چڑت سنگھ نے برباد کر دیا۔ وہاں سے چل کر اس نے دھنی کا ملک فتح کیا اور لاکھوں روپوں کا مال وہاں سے لیا۔ پھر چکوال و جلال پور و رسول وغیرہ سے معقول نذرانہ لے کر ان قصبوں کو اپنی ریاست میں داخل کیا۔ پھر پنڈ داد نخاں کو گیا۔ وہاں کے حاکم صاحب خاں کھوکھر نے اطاعت قبول کی اور نذرانہ ادا کیا۔ وہاں سے آگے بڑھ کر اس نے قصبہ کوٹ صاحب خاں اور راجہ کا کوٹ دو قصبے فتح کیے۔ جب اس کی ترقی دیگر سکھوں نے دیکھی تو سب کو حسد پیدا ہوا۔ خصوصاً بھنگی مثل کے سردار اس کی ترقی دیکھ کر جل گئے اور چاہا کہ کسی طرح چڑت سنگھ کو لوٹ لیں۔ یہ خبر چڑت سنگھ کو بھی پہنچ گئی اور آپس میں کمال عداوت و بغض و عناد پیدا ہوا۔ انہی دنوں راجہ رنجیت دیو جموں کا حاکم تھا۔ اس کی رعیت اس وقت کمال آرام میں تھی اور شہر جموں اس وقت تمام پنجاب کے لئے جائے امن و امان بنا ہوا تھا کیوں کہ بہ خوف غارت

سکھوں کے بڑے بڑے اشراف و ساہو کار دولت مند پنجاب سے جلا وطن ہو کر وہاں قیام پذیر تھے۔ اس شہر پر سکھوں کی نظر تھی۔ سوئے اتفاق سے رنجیت دیو کا بڑا بیٹا برج راج دیو باپ کی اطاعت سے نکل گیا اور باپ بیٹے میں سخت نزاع برپا ہو کر نوبت کشت و خون تک پہنچی۔ ادھر برج راج دیو نے سردار چڑت سنگھ کی مثل کو بڑا بھاری نذرانہ دینا قبول کر کے اپنی مدد پر طلب کیا اور چڑت سنگھ نے سردار حقیقت سنگھ و سردار جے سنگھ کہنیا کو بھی اس مہم میں شامل کیا اور یہ دونوں مثلیں جموں کو روانہ ہوئیں۔ جب یہ خبر خراجہ رنجیت دیو کو پہنچی تو بہت ڈرا اور اس نے مناسب جانا کو بھنگیوں کی مثل کو اپنی حمایت پر طلب کرے۔ چنانچہ اس نے جھنڈا سنگھ و گنڈا سنگھ پسران سردار ہری سنگھ بھنگی کو اپنی مدد پر بلایا اور اس مثل کے سردار جموں کو روانہ ہوئے۔ اتفاق سے موضع داسو سارا علاقہ ظفروال کے قریب دونوں لشکروں کا مقابلہ ہو گیا اور چند روز فساد کی آگ مشتعل رہی۔ کوئی فریق مغلوب نہیں ہوا تھا کہ ایک روز چڑت سنگھ کی بندوق پھٹ گئی اور وہ مر گیا۔ چڑت سنگھ کے مر جانے سے سردار جے سنگھ و حقیقت سنگھ کی کمر ٹوٹ گئی اور وہ فتح سے ناامید ہو گئے تو ایک مذہبی سکھ کو' جو جھنڈا سنگھ بھنگی کا خدمتگار تھا' اپنے ساتھ ملالیا اور اس کو کئی ہزار روپیہ دینا کر کے اس کے مالک سردار جھنڈا سنگھ کو قتل کروا دیا۔ جھنڈا سنگھ کے قتل ہوتے ہی بھنگیوں کا نظام بگڑ گیا اور راجہ رنجیت دیو اپنی مراد سے ناامید ہو گیا اور سمجھا کہ اب جب تک سردار جے سنگھ کہنیا سے سازش نہ کی جائے' جان و مال و ملک کا بچنا محال ہے۔

چنانچہ پہلے اپنے بیٹے کو جانشینی کے وعدہ پر راضی کرلیا اور سردار جے سنگھ کہنیا کو ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ نذرانہ دے کر رخصت کیا۔ وہاں سے واپسی کے وقت سردار گنڈا سنگھ بھنگی برادر جھنڈا سنگھ مقتول اور سردار مہان سنگھ سردار چڑت سنگھ کے بیٹے کی آپس میں صلح ہو گئی' کیونکہ اس سفر میں ان دونوں مثلوں کو کمال نقصان پہنچا تھا۔ سرکردہ بھی انہی دونوں مثلوں کے ہلاک ہوئے اور کچھ فائدہ بھی نہ ہوا۔ جبکہ سوا لاکھ روپیہ نقد نذرانہ سردار جے سنگھ کہنیا لے گیا۔ ان دونوں آفت زدہ سرداروں نے آئندہ مناسب جانا کہ آپس میں صلح رہے۔

سال 1818ء میں نواب تکلم خاں بادشاہ کابل کے حکم سے ملتان کا صوبہ دار بن کر آیا (یہ غالباً" مرزا شریف بیگ تکلو تھا۔) چونکہ پہلا صوبہ دار خودمختار تھا اور بادشاہ کو کبھی کچھ نہیں دیتا تھا' اس کو صوبے دار کا آنا ناگوار گزرا اور اس نے سردار گنڈا سنگھ بھنگی کو اپنی امداد پر بلایا۔ اس نے اپنی ہمراہی کے لئے سردار مہان سنگھ' سردار چڑت سنگھ کے بیٹے کو طلب کیا اور دونوں کی فوج ملتان کو روانہ ہوئی یہ خبر سنتے ہی نواب تکلم خاں فی الفور کوچ کر کے کابل کو چلا گیا۔ یہ فوج جب ملتان پہنچی تو ملتان کے حاکم نے خالصہ کی بہت خاطر کی اور نذرانہ دے کر رخصت کیا۔ مگر انہوں نے فریب سے قلعہ ملتان کے اندر واقع "سری پہلا دجی" کے مندر کے درشن کرنا چاہئے۔

یہ التماس سن کر ملتان کے سادہ لوح حاکم نے کہلا بھیجا کہ کیا مضائقہ ہے' خالصہ جی پچاس پچاس آدمی آئیں اور درشن کر جائیں۔ یہ اجازت سن کر پچاس پچاس آدمی کا غول قلعے میں جانے لگا۔ مگر جب وہ باہر نکلتے دس آدمی ان میں سے قلعے میں رکھ لیے جاتے۔ اس طرح

سے بہت آدمی وہاں جمع ہو گئے۔ دروازہ قلعے کا تو کھلا ہی تھا' پھر سب فوج یک بار حملہ کر کے اندر چلی گئی اور قلعے پر قبضہ کرلیا۔ خزانہ و اسباب وغیرہ پر پہرے بٹھلا دیئے' نواب کو پکڑلیا گیا۔ جب وہ ہر ایک چیز سے دست بردار ہو گیا تو اس کو آزاد کر دیا۔ کچھ دن یہ سردار ملتان میں رہے اور شہر کو خوب لوٹا اور آخر ایک شخص جمیعت سنگھ کو وہاں صوبہ و قلعدار و حاکم اپنی طرف سے بنا کر وطن کو مراجعت کی' اور راستے میں پہلے موضع دھارا کو غارت کیا' پھر احمد آباد کے حاکم سے۔ وہ بڑی توپ چھین لی' جس کو قلعہ لاہور سے چڑت سنگھ لایا تھا اور بہ سبب اس کے وزن دار ہونے کے اپنے گھر تک نہ لے جاسکتا تھا۔ فتح ملتان اور توپ کے حاصل ہونے کے بعد گندا سنگھ مغرور ہو گیا۔ کیونکہ سردار مہان سنگھ بھی اس وقت گویا اس کے ماتحت تھا اور فی الحقیقت گنڈا سنگھ کی اس وقت کمال ترقی کا وقت تھا۔ جس طرف نظر کرتا کوئی اس کے روبرو دم نہیں مارتا تھا۔ اس اثناء میں سردار نسا سنگھ بھنگی' جو قصبہ پٹھان کوٹ کا حاکم تھا۔ مرگیا اور اس کی زوجہ نے تارا سنگھ (سردار حقیقت سنگھ کہنیا کے بھائی) کو گھر بلا کر اس سے شادی کرلی چونکہ سردار نسا سنگھ بھنگی نزدیکی رشتہ دار سردار گنڈا سنگھ کا تھا' اس بات میں سردار گنڈا سنگھ کی بڑی ہتک تھی گویا اب ریاست پٹھان کوٹ اس کی مثل سے نکل کر کہنیا مثل کی حکومت میں آگئی۔ سردار گنڈا سنگھ نے برافروختہ ہوکر حکم دیا کہ فی الفور دونوں مثلوں کے سوار پٹھان کوٹ کو کوچ کریں۔ چنانچہ جاتے ہی پٹھان کوٹ کے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔

عین لڑائی میں کسی سکھ نے قلعے کے اندر سے ایسے تاک کر گولی لگائی کہ سردار گنڈا سنگھ بھنگی کے مغز میں لگی اور مغز پاش پاش ہو گیا۔ سردار گنڈا سنگھ بھنگی کے مارے جانے سے اس کے لشکر میں ابتری پھیل گئی' اور اس کا چھوٹا بھائی دیسو سنگھ بھائی کی جگہ فرماں فرما مثل کا بن گیا اور وہ پٹھان کوٹ کا محاصرہ چھوڑ کر امرتسر کو واپس چلا آیا۔ انہی ایام میں تیمور شاہ (احمد شاہ بادشاہ کابل کا بیٹا) ڈیرہ جات کے راستے ملتان میں داخل ہوا۔ اس کے آنے سے تمام سکھ ملتان سے جان بچا کر بھاگ گئے۔ چند روز شہزادہ ملتان میں رہا اور نواب شجاع خاں بہادر کو صوبہ دار بنا کر کابل کو واپس چلا گیا' اور یوں ملتان سے حکومت مثل بھنگیوں کی برخاست ہوئی۔

ادھر دیسو سنگھ بھنگی' جو گنڈا سنگھ کی جگہ مالک ہوا تھا' عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ اس وقت سردار مہان سنگھ سکر چکیا نے اس سے علیحدگی اختیار کی اور اپنی مثل کے سواروں کو لے کر گوجرانوالہ آگیا اور فی الفور پنڈی بھٹیاں و ساہیوال و عیسیٰ خیل و موسیٰ خیل و علاقہ جھنگ پر یورش کر کے ان علاقوں کو لوٹا اور نذرانے وصول کیے اور دیسو سنگھ کچھ بھی اس کا تدارک نہ کر سکا۔ کیونکہ پنڈی بھٹیاں اور ساہیوال کو پہلے بھنگی سردار فتح کر چکے تھے اور وہاں ان کا تھانہ موجود تھا۔ چونکہ مہان سنگھ کے گھر ایک بہن راج کور ابھی کنواری تھی' اس کا رشتہ مہان سنگھ نے صاحب سنگھ بھنگی (گوجر سنگھ بھنگی کے بیٹے) کے ساتھ کر دیا یہ گوجر سنگھ سرداران بھنگی میں بڑا معزز تھا اور تیسرا حصہ ریاست شہر لاہور کا بھی اس کے قبضے میں تھا اور شہر گجرات اور بہت سے علاقے دوآبہ چناب میں اس کی حکومت میں تھے۔ صاحب سنگھ نے باپ کے برخلاف ہوکر سردار

مہان سنگھ کی مدد سے گجرات پر قبضہ کیا' پھر وہ تمام علاقے جہاں اس کا باپ حکمرانی کرتا تھا' اپنے تصرف میں لے لئے۔

اس وقت گوجر سنگھ لاہور میں تھا۔ جب اس نے اپنے صلبی بیٹے کی یہ حرکت سنی تو کمال غضب میں آیا اور اپنا لشکر جمع کر کے گجرات کا محاصرہ کرلیا۔ باپ بیٹوں میں خوب لڑائی ہوئی' اور دو سو آدمی فریقین کے مارے گئے۔ اس وقت سردار مہان سنگھ نے آکر دونوں میں صلح کرا دی اور تمام علاقہ گوجر سنگھ نے اپنے بیٹے سے واپس لے لیا۔ اسے صرف تعلقہ سودھرہ گزارے کے لئے دیا۔ اس کام سے فراغت پاکر سردار مہان سنگھ قلعہ شادی وال پہنچا اور قلعہ دار کو فریب سے اپنا پاس بلا کر قید کرلیا۔ پھر وہ رہتاس کی طرف بڑھا' اس پر بھی قبضہ کیا' پھر قصبہ کوٹلی (سیالکوٹ) پر کہ وہاں کی بنی ہوئی بندوق بہت مشہور تھی' یورش کی اور قصبے والوں کو سخت مجبور کر کے نذرانہ لیا اور قبضہ کیا' پھر قصبہ رام داس پور کو گیا۔ وہاں کی رعیت نے اطاعت قبول کی اور نذرانہ کافی داخل کیا۔ دو ماہ تک سردار نے وہاں قیام رکھا اور وہاں رہ کر ایک بڑا کام ایسا کیا کہ جس سے اکثر سرداران سکھ ہر ایک مثل و فرقے کے دب گئے یعنی اس نے بائیس سرداران کو ملاقات کے بہانے بلا کر اپنے پاس قید کرلیا اور ہر ایک سے مطابق ان کی حیثیت کے نذرانہ و مصادرہ لے کر ان کو چھوڑا۔

بعد ازاں اس نے رام داس پور سے کوچ کر کے قصبہ رسول نگر کا محاصرہ کیا کہ وہ بڑی توپ (احمد شاہی) سے لے جو گنڈا سنگھ بھنگی احمد آباد سے لایا تھا وہ توپ اس نے پیر محمد خاں زمیندار و حاکم رسول نگر کے حوالے کر دی تھی۔ اس سے سردار مہان سنگھ نے وہ توپ طلب کی' اس نے کہلا بھیجا کہ یہ امانت میرے پاس سرداران مثل بھنگی کی ہے' ان کے حوالے کروں گا۔ یہ جواب سن کر مہان سنگھ فی الفور رسول نگر جا پہنچا اور قصبے کا محاصرہ کرلیا۔ ایک ماہ تک آپس میں لڑائی رہی۔ بہت سے آدمی مارے گئے اور پیر محمد خاں میدان میں لڑتا رہا' پھر محصور ہو گیا۔ تین ماہ تک سردار مہان سنگھ نے اس قصبے کے محاصرہ رکھا۔ تمام علاقہ متعلقہ پیر محمد خاں کا سردار نے لوٹ لیا۔ کسی زمیندار کے گھر ایک دانہ غلہ کا باقی نہ چھوڑا۔ جب چار ماہ تک محاصرے کی مدت طول پکڑ گئی' پیر محمد خاں نے بہت سے خطوط اپنی امداد کے لئے دیسو سنگھ بھنگی کو لکھے مگر اس نے عیش و عشرت کی مستی میں جواب تک نہ دیا۔ جب مہان سنگھ بھی تنگ آگیا تو صلح کی تجویز کی اور "گرنتھ" کے ورق پر مہر لگا کر پیر محمد خان کے پاس بھیجا اور لکھا کہ میں ہرگز تجھ سے دغا نہ کروں گا' تو بے اندیشہ میرے پاس چلا آ۔ چنانچہ وہ ایماندار رئیس قسم پر اعتبار کر کے فی الفور حاضر ہو گیا مگر سردار مہان سنگھ نے آتے ہی اس کو نظر بند کر دیا اور شہر میں داخل ہو کر غارت گری کا بازار گرم کیا۔

رنجیت سنگھ کی پیدائش : مہان سنگھ رسول نگر کے محاصرے میں مصروف تھا' راجہ جنید کی لڑکی کے بطن سے' جو زوجہ سردار مہان سنگھ کی تھی' بہ مقام گوجرانوالہ سردار کے گھر بیٹا ہوا۔ رنجیت سنگھ اس کا نام رکھا اور قصبہ رسول نگر کا نام بدل کر رام نگر رکھا کہ رسول کا نام

زبان پر نہ آئے' اور دوسرا قصبہ علی پور' جو پیر محمد خاں کے قبضے سے چھڑایا تھا' اس کا نام بدل کر اکال گڑھ رکھا اور ان دونوں قصبوں کی حکومت دل سنگھ کو دے دی۔ تبرکات اسلامیہ جو پیر محمد نے رسول نگر میں رکھے ہوئے تھے' وہ بھی سردار مہان سنگھ کے ہاتھ آئے اور اس نے بہ کمال ادب گوجرانوالہ میں محفوظ رکھوا دیئے۔

سمت 1839ء بکری میں راجہ رنجیت دیو والی جموں مرگیا اور برج راج دیو اس کا بڑا بیٹا جانشین ہوا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو قید کرلیا اور عیش و عشرت میں پڑگیا۔ سردار مہان سنگھ مدت سے دل میں آرزو رکھتا تھا کہ شہر جموں کو غارت کر کے بے انتہا دولت حاصل کرے' چنانچہ بے خبری میں جموں جا پہنچا۔ راجہ برج راج دیو' شہر چھوڑ کر پہاڑ پر چڑھ گیا۔ روسائے جموں سردار کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نذرانہ دینا قبول کیا' مگر مہان سنگھ نے منظور نہ کیا اور کہا کہ ہم شہر لوٹنے نہیں آئے' تم خاطر جمع رکھو' ہم کو جموں کے راج سے غرض ہے۔ بعد ازاں شہر میں داخل ہوکر لوٹ مچا دی۔ تین دن تک شہر لٹتا رہا۔ شہر والے پارہ نان کے محتاج ہوگئے۔ بہت خلقت قتل ہوئی۔ بعد اس غارت و قتل کے مہان سنگھ راج نگر آیا۔ سمت 1844ء بکری میں سردار مہان سنگھ بہ تقریب غسل دیوالی کے امرت سر میں آیا۔ سردار جے سنگھ کہنیا بھی امرتسر میں پہنچا۔ مہان سنگھ کی دولت اور حشمت و ترقی دیکھ کر اس کمال حسد ہوا اور وکیل کے معرفت کہلا بھیجا کہ جو تم لاکھوں روپیہ نقد اور لاکھوں روپے کا اسباب و جواہرات جموں سے لوٹ کر لائے ہو وہ تمام خالصہ کا حق ہے۔ اس کا حصہ ہم کو بھی دو۔ مہان سنگھ نے انکار کیا تو دونوں سرداروں میں سخت لڑائی ہوئی۔

چونکہ یہ لڑائی امرتسر سے باہر نکل کر قصبہ مجیٹھ کے قریب ہوئی تھی' سردار جے سنگھ نے مغلوب ہوکر پہلے قصبے میں پناہ لی۔ پھر وہاں سے بھاگ کر دریائے بیاسا سے پار اتر گیا اور دوآبہ بست جالندھر میں پہنچ کر بہت سی فوج جمع کی اور چاہا کہ دوبارہ مہان سنگھ کے ساتھ لڑے۔ اس اجتماع کی خبر سن کر مہان سنگھ نے سردار جسا سنگھ راج گڑھیہ کو جگراؤں سے مدد کے لئے بلایا۔ جس کو سردار جے سنگھ کہنیا نے اس کے علاقے سے بے دخل کر کے ستلج پار اتار دیا تھا اور وہ بمقام جگراؤ (جگراؤں) پریشان حال سرگشتہ پڑا ہوا تھا۔

جسا سنگھ جب دریائے ستلج سے اترا تو پہلے سردار گور بخش سنگھ (ایک مصاحب سردار جے سنگھ کا تھا اور جے سنگھ نے اس کو اس بات کے لئے آگے روانہ کیا تھا کہ سردار جسا سنگھ کو اس طرف آنے سے روکے) اس کے مقابل ہوا اور لڑائی میں مارا گیا۔ پھر ایک اور سردار گور بخش سنگھ (سردار جے سنگھ کا بیٹا) بڑی فوج کے ساتھ اس کے سد راہ ہوا۔ جسا سنگھ نے بڑی جواں مردی کے ساتھ اس کے ساتھ بھی جنگ کی جس میں دوسرا گور بخش سنگھ بھی قتل ہوا اور وہ سردار مہان سنگھ کی فوج کے ساتھ شامل ہوگیا اور بمقام نوشہرہ جنگ ہوئی جس میں سردار مہان سنگھ نے فتح پائی اور جے سنگھ نور پور بھاگ گیا۔ مہان سنگھ تعاقب میں گیا۔ وہاں سے وہ دینا نگر میں آیا۔ جہاں مہاراجہ سنسار چند والی کوہستان قیام پذیر تھا۔ دونوں میں تپاک کے ساتھ ملاقات

ہوئی۔ راجہ سنسار چند نے سردار مہان سنگھ سے یہ آرزو کی کہ اگر آپ قلعہ کانگڑہ ' سردار جے سنگھ سے دوبارہ دلوا دیں تو میں کمال مشکور ہوں گا اور اس کام کے عوض نذرانہ دو لاکھ روپیہ خالصہ جی کی خدمت میں پیش کروں گا۔ سردار مہان سنگھ نے وعدہ کیا کہ جب میں گوجرانوالہ پہنچ جاؤں گا' اپنی فوج قلعہ کانگڑہ کی فتح کے لئے مامور کروں گا۔

اس وعدے کے بعد سردار مہان سنگھ گوجرانوالہ گیا اور حسب وعدہ دیا رام و محمد صالح کو حکم دیا کہ مہاراجہ سنسار چند کو قلعہ کانگڑہ پر دخل دلا کر دو لاکھ روپیہ وصول کر لائیں۔ یہ فوج کانگڑہ جا پہنچی۔ چونکہ سردار مہاں سنگھ کی فوج کے ساتھ خزانہ نہ تھا لہٰذا خرچہ کے لئے عرضی اپنے سردار کے نام لکھ بھیجی۔ سردار نے یہ لکھا کہ دو لاکھ روپیہ جو مہاراجہ سنسار چند نے دینا کیا ہے اس میں سے پچاس ہزار روپے لے کر خرچ کرو۔ اس پر دونوں افسروں نے مہاراجہ سنسار چند سے روپیہ طلب کیا تو اس نے کہا کہ جب تک قلعہ فتح نہ ہو جائے' میں ایک کوڑی نہ دوں گا۔ اس جواب سوال میں بگاڑ پیدا ہو گیا اور تلوار چل پڑی اور خوب لڑائی ہوئی' جس میں محمد صالح مارا گیا اور دیا رام بہ حالت زار شکستہ و خستہ فوج کو ہمراہ لے کر گوجرانوالہ میں آیا۔ سردار مہان سنگھ کو غصہ تو آیا چونکہ فی الحال راجہ سنسار چند سے بدلہ نہیں لے سکتا تھا' خاموش رہا۔

راجہ سنسار چند نے قلعہ کا محاصرہ کئے رکھا اور پھر سردار جے سنگھ کو فریب سے کہلا بھیجا کہ اگر تم قلعہ ہم کو خالی کر دو تو ہم اور تم دونوں مل کر سردار مہان سنگھ کو شکست دے کر پنجاب سے نکال دیں اور اس کا مال و اسباب باہم بانٹ لیں۔ اس فریب میں سردار جے سنگھ آ گیا اور بلا استحکام عہد و بیان کے قلعہ مہاراجہ سنسار چند کے حوالے کر دیا اور اس نے اپنے اقرار سے برگشتہ ہو کر صاف جواب دے دیا۔ یہ جواب پایا تو سردار جے سنگھ قلعہ دینے پر سخت پچھتایا اور وہ اور سردار مہان سنگھ دونوں مہاراجہ سنسار چند کے جانی دشمن ہو گئے۔ انہی ایام میں سردار مہان سنگھ نے سنا کہ شہر جموں دوبارہ آباد ہو گیا ہے۔ جو لوگ اپنا مال و اسباب لے کر شہر سے بھاگ گئے تھے وہ اب شہر میں آ گئے ہیں۔ راجہ برج راج دیو بھاگنے کے وقت اپنا خزانہ و املاک ساتھ لے گیا تھا' وہ بھی سب جموں میں موجود ہے۔

یہ خبر پا کر سردار مہان سنگھ دوسری مرتبہ بے خبر جموں پر چڑھ گیا اور جاتے ہی اس نے شہر میں لشکر بھیج دیا اور غارت شروع کر دی۔ سکھوں نے ایک روز میں شہر لوٹ لیا۔ راجہ کا خزانہ بھی سب لے لیا۔ سامان ریاست کا بندوقیں' تلواریں سب اٹھا لیں' بارود کو آگ لگا دی۔ غرض تمام شہر اور ریاست کو خاک میں ملا دیا' وہاں سے جب مراجعت کی تو قصبہ بہادر کی طرف توجہ کی۔ عالم سنگھ اکھنور وغیرہ سرداران دامن کوہ خدمت میں حاضر آئے اور سب نے نذرانہ دے کر اپنے ملک کو غارت و قتل سے بچایا۔

چونکہ رنجیت سنگھ مہان سنگھ کا بیٹا خرد سال بھی اس سفر میں ہمراہ تھا اس مقام پر اس کو چیچک نکل آئی' کہ زندگی کی امید باقی نہ رہی' اس وقت سردار بہت گھبرایا اور فی الفور رام نگر

پہنچا۔ وہاں اس نے بہت سی خیرات کی اور اور بہت سا اسباب نقد و جنس جوالا مکھی دیوی کے آستان پر بھیجا۔ کانگڑہ کے قلعے میں جس دیوی کا استان ہے وہاں بھی بہت مال روانہ کیا اور حکم دیا کہ وہاں جا کر غربا اور فقراء کو تقسیم کیا جائے۔ ایک گروہ برہمنوں کا بیدخوانی کے لئے اور مسلمانوں کو قرآنی خوانی کے لئے بلا کر التجا کی کہ تمام دن خدا کا کلام پڑھیں اور بیمار کے حق میں شفا کی دعا کریں۔

اکیس روز کے بعد رنجیت سنگھ نے غسل صحت کیا۔ اس بیماری میں ایک آنکھ بالکل بیکار ہوگئی۔ بعد غسل صحت لڑکے کے سردار نے بڑا جشن کیا تھا اور دور دور سے سردار اس کے گھر مبارک باد دینے آئے تھے' سردار جے سنگھ کہنیا جو راجہ سنسار چند کے ہاتھ سے نالاں تھا بھی سردار مہان سنگھ کے پاس آیا اور التجا کی کہ آئندہ سردار مہان سنگھ اس کا حامی و دوست بنا رہے۔ سردار مہان سنگھ نے بھی اس کی التجا قبول کی اور کہا کہ سردار جے سنگھ کہنیا اپنی پوتی (سردار گوربخش کی بیٹی) کی نسبت اس کے بیٹے رنجیت سنگھ کے ساتھ کردے۔ یہ بات سردار جے سنگھ نے بخوشی خاطر منظور کی اور گور بخش سنگھ کی بیٹی مہتاب کور رنجیت سنگھ کے ساتھ بیاہی گئی' 1785ء میں یہ شادی ہوئی۔ مگر یہ رشتہ سردار جسا سنگھ رام گڑھیہ کو برا لگا جس کی دشمنی جے سنگھ کے ساتھ تھی اور سردار مہان سنگھ کی مدد کی خاطر وہ ستلج پار سے آیا تھا اور میدان جنگ میں جے سنگھ کے ساتھ لڑ کر اس کے بیٹے گور بخش سنگھ کو قتل کیا تھا۔ سردار مہان سنگھ نے محسوس کر کے سردار جے سنگھ کو کہہ کر اس کا تمام علاقہ بھی جو جے سنگھ کے قبضے میں تھا' رہا کرا دیا اور سردار جے سنگھ نے یہ بڑی مردانگی کی کہ سردار مہان سنگھ کے کہنے سے اتنا بڑا علاقہ مقبوضہ سالہا سال کے بعد چھوڑ دیا۔ چنانچہ فی الفور عملی درآمد ہو گیا' مگر سردار جسا سنگھ کے دل سے غبار نہ گیا۔ اگرچہ وہ بظاہر صلح و صفائی کر چکا تھا۔

جب مہان سنگھ شادی وغیرہ سے فارغ ہوا تو اس نے چاہا کہ اپنے ملک میں دورہ کرے۔ چنانچہ روانہ ہوا اور سردار جسا سنگھ کو رام نگر چھوڑا دو روز بعد جسا سنگھ کا ارادہ ہوا کہ اپنی مثل کے سواروں کے ساتھ مہان سنگھ پر یورش کرے وہ اس کے پیچھے روانہ ہوا۔ جودھ سنگھ رام گڑھیہ اس کا مصاحب بھی کربستہ ہمراہ تھا۔ جسا سنگھ شکست کھا کر پسپا ہوا۔ 1791ء میں سردار گوجر سنگھ بھنگی مرگیا اور اس کا بیٹا صاحب سنگھ اس کی جگہ شہر گجرات میں گدی نشین ہوا اور اپنے باپ کی جائیداد کے قبضے کے لئے وہ لاہور کو گیا۔ سردار مہان سنگھ نے موقع پاکر چاہا کہ قلعہ ' سودھرہ' جو صاحب سنگھ کے قبضے میں ہے' چھین لے۔ چنانچہ اس ارادے پر بہت سی فوج لے کر قلعہ سودھرہ پر فوج کشی کی۔ اگرچہ صاحب سنگھ کے ساتھ سردار چڑت سنگھ کی بیٹی یعنی مہاں سنگھ کی ہمشیرہ بیاہی ہوئی تھی' مگر مہاں سنگھ نے کوئی لحاظ نہ کیا۔

اس لڑائی کے موقع پر سردار مہان سنگھ بیمار ہوگیا۔ جب جانا کہ اب زندگی باقی نہیں ہے تو رنجیت سنگھ کو بعمر دس سال اپنے ہاتھ سے دستار ریاست کی پہنا کر اور سردار دل سنگھ کالیانوالہ کو' رنجیت سنگھ کا اتالیق بنا کر خود گوجرانوالہ کو روانہ ہوا' اور بعد روانگی سردار مہان

سنگھ کے رنجیت سنگھ بدستور قلعے والوں سے لڑتا رہا۔

اتنے میں خبر پہنچی کہ ایک لشکر سکھوں کا سردار کرم سنگھ دولو دل سنگھ وجودہ سنگھ بھنگی سنگھ جسا سردار کی کمان میں آرہا ہے چنانچہ رجیت سنگھ نے یہ خبر سنتے ہی قلعہ سودھرہ کا محاصرہ چھوڑ دیا اور ان کا راستہ روکنے کے لئے روانہ ہوا۔ موضع کوٹ مہاراجہ کے پاس دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا اور تین گھنٹے تک خوب لڑائی ہوئی۔ اگرچہ اس وقت فوج رنجیت سنگھ کی دشمن کی فوج سے آدھی تھی مگر فتح خدا داد ہے۔ آخر دشمن بھاگ نکلے اور اس نے تین کوس تک ان کا تعاقب کیا۔ سردار چتر سنگھ کلاں والیہ اس لڑائی میں مارا گیا۔ ایک توپ خانہ اور زنبورک خانہ سرداران بھنگیوں کا مع بہت سے اسباب کے رنجیت سنگھ کے قبضے میں آیا۔

ابھی رنجیت سنگھ اسی مقام پر مقیم تھا کہ سردار مہان سنگھ کی موت کی خبر ملی۔ وہ فی الفور گوجرانوالہ میں آیا اور باپ کی نعش کو چتا کی نذر کیا۔

(کنہیا لال کی کتاب تاریخ پنجاب سے تلخیص و استفادہ کیا)

ایم اے سیاسیات کے لیے ہماری کتب

1- مشرق و مغرب کے سیاسی افکار — از سید اصغر علی شاہ جعفری
2- مغربی سیاسی افکار — از ایس ایم شاہد
3- مسلمانوں کے سیاسی افکار — از جاوید اقبال
4- مسلمانوں کے سیاسی افکار و ادارے — از ایس ایم شاہد
5- تقابلی سیاسی نظام — از ایس ایم شاہد
6- حکومت اور سیاست — از مجاہد فاروق
7- پاکستان، نظریہ حکومت و سیاست — از ایس ایم شاہد
8- تحریک پاکستان — از اصغر علی شاہ جعفری
9- تعمیر پاکستان — از ایس ایم شاہد
10- پاکستان کی خارجہ پالیسی — از زاہد حسین انجم
11- امام غزالی اور ابن خلدون کے سیاسی افکار — از ایس ایم شاہد
12- شاہ ولی اللہ اور اقبالؒ کے سیاسی افکار — از ایس ایم شاہد
13- افلاطون، ارسطو کے سیاسی افکار — از مجاہد فاروق
14- مقامی حکومتیں و ادارے — از ایس ایم شاہد
15- نظم و نسق عامہ — از ایس ایم شاہد
16- جدید دساتیر عالم — از تنویر بخاری
17- بین الاقوامی تنظیمیں — از ایس ایم شاہد
18- سیاسیات عالم — از صفدر حیات صفدر
19- بین الاقوامی تعلقات — از نعیم اکبر نیین
20- بین الاقوامی تعلقات — از ایس ایم شاہد
21- جدید مسلم مفکرین — از ایس ایم شاہد
22- تقابلی سیاست — از عمانوئل یونس
23- تقابلی و ترقیاتی سیاست — از ایس ایم شاہد
24- جدید تقابلی سیاست — از مسعود احمد خاں
25- بڑی طاقتوں کی خارجہ پالیسی — عبداللہ صدیقی
26- قانون بین الاقوامی معہ مسلم قوانین — از ایس ایم شاہد
مضامین علوم سیاسیات — از تنویر بخاری

ماسٹر گائیڈ ایم-اے سیاسیات جمیل پال

پبلشر نیو بک پیلس چوک اردو بازار، لاہور- فون: 7224925

شاکسٹ فاروق سنز الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

ایل ایل بی ماسٹر گائیڈ سیریز

سال اول

- پرچہ نمبر 1: ماسٹر گائیڈ "انگلش اصول قانون" از تنویر بخاری
- پرچہ نمبر 2: ماسٹر گائیڈ "قانون معاہدہ و بیع مال" از تنویر بخاری
- پرچہ نمبر 3: ماسٹر گائیڈ "اصول قانون اسلام" از تنویر بخاری
- پرچہ نمبر 4: ماسٹر گائیڈ "قانون ٹارٹ و قانون آسائش" از تنویر بخاری
- پرچہ نمبر 5: ماسٹر گائیڈ "تعزیرات پاکستان" از تنویر بخاری
- پرچہ نمبر 6: ماسٹر گائیڈ "دستور برطانیہ و امریکہ" از تنویر بخاری

سال دوم

- پرچہ نمبر 1: ماسٹر گائیڈ "دستور پاکستان" از تنویر بخاری
- پرچہ نمبر 2: ماسٹر گائیڈ "اصول نصفت" از تنویر بخاری
- پرچہ نمبر 3: ماسٹر گائیڈ "قانون تجارت' بیع' شرکی' شراکت" از تنویر بخاری
- پرچہ نمبر 4: ماسٹر گائیڈ "قانون انتقال جائیداد" از تنویر بخاری
- پرچہ نمبر 5: ماسٹر گائیڈ "اسلامی محضی قانون" از تنویر بخاری
- پرچہ نمبر 6: ماسٹر گائیڈ "قانون بین الاقوام" از تنویر بخاری
- پرچہ نمبر 7: ماسٹر گائیڈ "خصوصی مقامی قوانین" از تنویر بخاری

سال سوئم

- پرچہ نمبر 1: ماسٹر گائیڈ "قانون ضابطہ دیوانی" از تنویر بخاری
- پرچہ نمبر 2: ماسٹر گائیڈ "ضابطہ فوجداری و طبی اصول قانون" از تنویر بخاری
- پرچہ نمبر 3: ماسٹر گائیڈ "قانون شہادت و قانون ضابطہ اخلاق" از تنویر بخاری
- پرچہ نمبر 4: ماسٹر گائیڈ "قانون عرضی دعویٰ و توضیح تحریری قوانین" از تنویر بخاری
- پرچہ نمبر 5: ماسٹر گائیڈ "تنظیمی قوانین" از تنویر بخاری
- پرچہ نمبر 6: ماسٹر گائیڈ "قانون خورد" از تنویر بخاری
- پرچہ نمبر 7: ماسٹر گائیڈ "قوانین لیبر و ٹیکس قوانین" از تنویر بخاری

نیو بک پیلس

اردو بازار' لاہور (فون: 7224925)

M. A. English Guide Series

PART I

Paper 1 :	MASTER GUIDE	*Classical Poetry*
Paper 2 :	MASTER GUIDE	*Drama*
Paper 3 :	MASTER GUIDE	*Novel*
Paper 4 :	MASTER GUIDE	*Prose*
Paper 5 :	MASTER GUIDE	*American Literature*

PART II

Paper 1.	MASTER GUIDE	*Poetry II*
Paper 2.	MASTER GUIDE	*Drama II*
Paper 3.	MASTER GUIDE	*Novel II*
Paper 4.	MASTER GUIDE	*Literary criticism*
Paper 5.	MASTER GUIDE	*Short Story*
Paper 6.	MASTER GUIDE	*Linguistics*
Paper 7.	MASTER GUIDE	*The Teaching of English*
Paper 8.	MASTER GUIDE	*Essay*